جوہر اسپیشل سیریز

مرتبہ:
سید رئیس احمد جعفری

محمد علی اکیڈمی

طبع اول دسمبر ۱۹۶۳ء

قیمت : پندرہ روپے

طابع و ناشر:
زیڈ ۔ اے ۔ فاروقی
سکریٹری محمد علی اکیڈمی ۱۵ ۔ نیلہ گنبد ۔ لاہور

مطبوعہ: اشرف پریس ۔ لاہور

معاونینِ خصوصی

۱: مسٹر جسٹس الٰہی بخش خمیسانی۔ کراچی

۲: مسٹر اے۔ کے بروہی، سابق وزیرِ قانون حکومتِ پاکستان کراچی

۳: مسٹر انور عادل۔ سی۔ ایس پی کمشنر کوئٹہ

۴: مسٹر منظور قادر سابق وزیر خارجہ حکومت پاکستان۔ لاہور

۵: مسٹر ظفر احمد فاروقی۔ (ندوی)

ارکانِ دوامی

۱: حکیم تیسیر الدین ندوی، نظامی دواخانہ کراچی

۲: رئیس احمد جعفری (ندوی)

۳: بشیر احمد مالک نذیر پرنٹنگ پریس۔ کراچی

۴۔ علاء الدین خالد مالک اردو اکادمی، کراچی

۵: شیخ نیاز احمد مالک شیخ غلام علی اینڈ سنز۔ لاہور

۶: کموڈور خالد جمیل۔ کراچی

۷: فقیر وحید الدین۔ کراچی، لاہور

۸: سید سبطین فضلی، مالک فضلی فلمز۔ لاہور

۹: حکیم عبد الواسع ندوی مالک بلی دواخانہ پشاور

۱۰: آثم ملک بی اے ایل ایل بی ایڈووکیٹ۔ کوئٹہ

۱۱: ڈاکٹر محمد ایوب۔ پرنس روڈ۔ کوئٹہ

۱۲: سید فصیح اقبال مالک روزنامہ "زمانہ" کوئٹہ

۱۳: نواب مشتاق احمد خاں ایجنٹ جنرل حیدرآباد پاکستان لاہور

۱۴: سید علی نواز گردیزی ڈائریکٹر ٹیمن کمپنی لاہور

۱۵: پیرزادہ سید شریف الدین ایڈووکیٹ سپریم کورٹ کراچی

۱۶: ذوالفقار علی مالک ذوالفقار سوپ فیکٹری کراچی

۱۷: حبیب احمد ندوی۔ پیر الٰہی بخش کالونی۔ کراچی

۱۸: شیخ عنایت اللہ مینیجنگ ڈائریکٹر تاج کمپنی لمیٹڈ۔ کراچی

۱۹: حافظ سلطان احمد۔ ایڈووکیٹ۔ کراچی

۲۰: میر خلیل الرحمٰن مالک روزنامہ "جنگ" کراچی

۲۱: عبد الوحید خاں وزیر ریلوے حکومت مغربی پاکستان

۲۲: حاجی متین احمد۔ لاہور

۲۳: محمد یوسف کھتوریہ مالک کے بی جوزف اینڈ کمپنی لاہور

۲۴: نواب مشکور احمد مالک شاہین ہوٹل کراچی

۲۵: ایس ایم یوسف باغیتی ایشیا بینٹ۔ لاہور

۲۶: شمشیر علی خاں مالک لیڈیز اون چوائس لاہور

۲۷: آفتاب بیگم جعفری

ممتاز حسن

پاکستان کے اعلیٰ سرکاری حلقوں میں ایک ہستی ایسی ہے جو ادیب بھی ہے ادب نواز بھی اور ادیب دوست بھی یہ شخصیت مسٹر ممتاز حسن کی جن کے دم سے نہ جانے کتنے ادارے قائم ہیں، جو نہ جانے کتنی انجمنوں کی روح رواں ہیں اور جو خود اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں!

ممتاز صاحب کی ذات ہمیشہ میرے لیے مایوسی کے اندھیرے میں امید کی روشنی ثابت ہوئی ہے، اُن کے دل میں اُردو کا درد ہے، ملک کا درد ہے، قوم کا درد ہے، انھیں اپنے ماضی سے محبت ہے اپنی تاریخ سے محبت ہے، اپنے اسلاف اور اکابر سے محبت ہے۔

قوم کے اکابر کی یہ داستان، قوم کی تاریخ کا فراموش شدہ یہ باب ممتاز صاحب کی وساطت سے قوم کے سامنے پیش کرتا ہوں۔

رئیس احمد جعفری

سپاس و تشکر!

ایک ایسے شخص کے لیے جس کے کشکول میں حوصلے اور آرزو کے سوا کچھ نہ ہو، جس کی رسائی نہ ایوانوں کے آستانے تک ہو نہ حکام والا مقام کی بارگاہ میں۔ اتنے بڑے کام کا بیڑا اٹھا لینا اور اسے انجام تک پہنچا دینا صرف فضل ربی ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس معرکے کو سر کرنے میں یہ عقیدہ اور زیادہ پختہ ہو گیا کہ اللہ پر بھروسہ اگر کیا جائے تو ناکامی نہیں ہوتی، جو مشرکوں، کافروں، ملحدوں اور [illegible] تک کو اپنے رحم و کرم سے محروم نہیں کرتا وہ اس شخص کو کیوں مایوس کر دیتا جو اس کے ایک بندے کے کارناموں کو اجاگر کرنا چاہتا تھا جو اپنے رب کے لیے ساری خدائی سے لڑتا رہا۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

اور کون کہہ سکتا ہے کہ محمد علی نے زندگی کی آخری سانس تک دو عالم سے خفگی صرف خدا کے لیے نہیں کی۔؟

اس نیک اور قومی کام میں جن حضرات نے پورے خلوص کے ساتھ تعاون کیا وہ محمد علی اکیڈمی کے لائف ممبر صاحبان ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں جن سے میرے دیرینہ، دوستانہ، عزیزانہ یا نیازمندانہ تعلقات ہیں۔ ان سے میں نے کہا اور انھوں نے بغیر کوئی سوال کیے میری بات مان لی۔ مجھ جیسے بے مایہ شخص پر ان اصحاب کا یہ اعتماد خدا کی بہت بڑی نعمت ہے، جس کا شکر ادا کرنے سے زبان قاصر ہے۔

اس سلسلے میں اصحاب ذیل کا شکریہ خاص طور پر واجب ہے جنھوں نے نہ صرف میری ہمت افزائی کی بلکہ اس راہ کی بہت سی دشواریوں کے حل کرنے میں دل و جان سے میرے شریک رہے۔

جسٹس خمیسانی سب سے پہلا نام مسٹر جسٹس الٰہی بخش خمیسانی کا ـــ میں جانتا ہوں وہ اسے پسند نہیں کریں گے ـــ لینے پر مجبور ہوں۔ اگر ان کی توجہ شامل نہ ہوتی تو یہ مرحلہ صعب کسی طرح طے نہیں ہو سکتا تھا۔

حکیم نصیر الدین ندوی حکیم نصیر الدین ندوی مالک نظامی دواخانہ کراچی میرے ندوہ کے ساتھیوں میں ہیں۔ ہم دونوں کی محبت اور خلوص کا سلسلہ بچپن سے آج تک قائم چلا آرہا ہے اس کتاب کی طبع و اشاعت کے سلسلے میں انھوں نے سرگرم حصہ لیا۔

مسٹر اے کے بروہی پاکستان کے سابق وزیر قانون مسٹر اے کے بروہی بھی۔ گو ان سے میری کوئی خاص شناسائی نہ تھی، اپنے ایک دوست کی وساطت سے میرے لیے خضر راہ ثابت ہوئے، ان کا بھی دل سے شکر گزار ہوں۔

مسٹر انور عادل مسٹر انور عادل سی۔ ایس۔ پی کمشنر کوئٹہ ڈویژن میرے مخصوص کرم فرماؤں میں ہیں۔ ان کی محبت، شرافت اور خلوص کا یہ عالم ہے کہ خود کرید کرید کر میری مشکلات معلوم کرتے اور انھیں حل کرنے کی سعی و تدبیر میں حصہ لیتے رہتے ہیں۔ اس پر مجھے ناز بھی ہے اور فخر بھی!

ظفر احمد فاروقی ندوی ظفر احمد فاروقی میرے ندوے کے ساتھیوں میں ہیں۔ ندوے کے بعد ہم دونوں میں جدائی ہوگئی۔

او بصحرا رفت و ما در کوچہ ہا رسوا شدیم!

تقریباً تیس سال کی جدائی کے بعد ایک روز دفعتاً لاہور میں ملاقات ہوئی۔ اور ایسا معلوم ہوا جیسے ہماری جدائی کو تیس گھنٹے بھی نہیں گزرے ہیں ان سے ملتے ہی عہد ماضی واپس آگیا۔

فاروقی صاحب نے میری دشواریوں کا بوجھ اس طرح اپنے اوپر اٹھالیا جیسے یہ بوجھ میرا نہیں ان کا تھا!

مسٹر ثناء اللہ بھٹہ مسٹر ثناء اللہ بھٹہ مالک بساط ادب لاہور نے جس خلوص سے ہر دشوار مرحلے پر میرا ہاتھ بٹایا وہ ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے!

م۔ ع۔ سلام مکتبہ آئینہ ادب لاہور کے مالک م۔ ع۔ سلام میرے پرانے دوستوں اور کرم فرماؤں میں ہیں۔ عین ایسے وقت جب کہ یہ گاڑی چلتے چلتے رک گئی تھی وہ آگے بڑھے اور مجھے بہت بڑی زحمت سے نجات دلائی۔

ابن انشا اپنے دوست اور بھائی ابن انشا کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہوں۔ ان سے میرے تعلقات کی نوعیت عزیزانہ حد تک پہنچ چکی ہے۔ یہی کیفیت ان کے (اور میرے بھی) دونوں بھائیوں سردار محمود اور محمود ریاض کی ہے۔ ان کے نزدیک میرا ہر کام انہی کا ہے، بلکہ صرف ان کا!

علاء الدین خالد پیارا، اچھا اور کھرا دوست:

خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست!

—★—

آغازِ سخن

۱۹۳۳ء میں "سیرت محمدی" کے نام سے میری پہلی کتاب شائع ہوئی تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں زیرِ تعلیم تھا۔ اس کتاب کے بارے میں قاضی ولی محمد صاحب چیف سیکرٹری ریاست بھوپال (مصنف سفرنامہ اندلس) نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے تحریر فرمایا تھا۔ "اسے کالجوں کے نصاب میں شامل ہونا چاہیئے"

کتاب لکھنے کے چند سال بعد میں روزنامہ خلافت کا ایڈیٹر ہو کر بمبئی چلا گیا۔ مولانا شوکت علی کی وفات تک انہی کے دامن شفقت سے وابستہ رہا۔ پھر خلافت سے الگ ہو کر روزنامہ ہندوستان اور روزنامہ انقلاب کی ادارت سنبھالی۔ تقسیم ہند تک میرا قیام بمبئی میں رہا۔ اس کے بعد بھی میرا ترکِ وطن کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ لیکن بمبئی کے ہوم منسٹر مرارجی ڈیسائی نے ——— جو بعد میں بمبئی کے وزیر اعظم، پھر حکومت ہند کے وزیر خزانہ بنے ——— مجھے، میری تقسیم ہند سے پہلے کی بعض تحریروں پر برافروختہ ہو کر فرمایا، "تمہارا پاکستان بن گیا تم اپنے وطن کیوں نہیں چلے جاتے؟"

میں نے عرض کیا، "پاکستان میرا وطن نہیں ہے، میں اپنے وطن میں ہوں، اور اسے چھوڑنا نہیں چاہتا،"

فرمایا "اگر پاکستان تمہارا وطن نہیں ہے تو تم نے اس کی تائید حمایت کے لئے اپنا قلم کیوں وقف کر رکھا تھا؟"

میں نے جواب میں کہا میں نے مسلم اکثریت کے حق خود ارادیت کی حمایت کی تھی۔ اور یہ میرا اخلاقی فریضہ تھا۔ اور میں نے یہ اقدام کر کے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ جب طرابلس کے مسلمانوں پر قیامت ٹوٹی، جب بلقان کے مسلمانوں پر حوادث کے تیر پڑے۔ جب ترکوں کو چکی کے دو پاٹوں میں پیسا گیا، جب ایران پر آفت آئی، جب عراق پر کوہ الم ٹوٹا تو ہم مسلمانوں نے ان مظلوم مسلمانوں کی تائید و حمایت حلقوم و گلو اور کلک خوں چکاں کی پوری قوت سے مظلوم مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا، اور اسلام میں برحق مطالبات کی تائید کی تھی، انگریز نے ہم سے کبھی یہ نہیں کہا کہ طرابلس چلے جاؤ، ترکیہ میں اقامت اختیار کر لو، عراق میں جا بسو، ایران کے شہری بن جاؤ، آپ مجھے پاکستان کیوں بھیج رہے ہیں؟"

یہ پریس کمیٹی کا جلسہ تھا، جس میں مرحوم سید عبداللہ بریلوی ایڈیٹر بمبئی کرانیکل، مسٹر سر فرانسس ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا، اور گجراتی اخبار جنم بھومی کے ہندو ایڈیٹر ——— جن کا نام بھول رہا ہوں ——— تھے

مرارجی خلاف معمول اس کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہوئے تھے، اور کرسی صدارت پر رونق افروز ہو گئے تھے۔ انہوں نے میرا جواب سن کر سلسلۂ گفتگو یہیں ختم فرمایا۔

"آپ کا قلب ہندوستان میں نہیں ہے، آپ اب بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے"

میں نے بصد ادب دریافت کیا۔ اب مجھ سے کونسا جرم سرزد ہو رہا ہے؟ مرار جی کے سامنے تین پرچے مختلف تاریخوں کے پڑے ہوئے تھے، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک پرچہ اٹھایا اور کہا آپ نے اپنے اداریے میں لکھا ہے کہ جب فتح ہوا تھا تو دنیا کے سب سے بڑے انسان نے ان لوگوں کو جنہوں نے اسے ہجرت پر مجبور کر دیا تھا غیر مشروط رہائی دے دی تھی، اور یہاں یہ حال ہے کہ خلیق الزماں ترنگے جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں تو پٹیل صاحب طعنہ دیتے ہیں " ۲۴ گھنٹے کے اندر کوئی شخص اپنے سیاسی معتقدات سے دستبردار ہو سکتا ہے؟ ہمیں اسے نہیں مانتا" ۔ یہ ان لوگوں کی حالت ہے جنہیں عنانِ حکومت ہاتھ میں لئے، صرف چند روز ہوتے ہیں، یہ ہم سے وفاداری کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور جب ہم اعلان وفاداری کرتے ہیں تو اسے ماننے سے انکار کر دیتے ہیں، حالانکہ اس ملک پر ایک ہزار سال تک ہم نے بھی حکومت کی تھی، اور اس شان سے کی تھی کہ باغیوں کو بار بار معاف کیا، سرکشوں کو نظر انداز کیا، امتیاز نسل و قوم کے بغیر سب کے ساتھ عدل کا برتاؤ کیا۔ یہی چیز تھی جس سے متاثر ہو کر بڑے بڑے رجواڑے، مسلمان بادشاہوں نے رشتہ و پیوند تک کے تعلقات خوشی اور فخر کے ساتھ قائم کرنے لگے۔

میری عبارت کا انگریزی ترجمہ مرار جی کے ہاتھ میں تھا وہ اسے زور زور سے پڑھ رہے تھے اور ان کا سرخ و سفید چہرہ، گلنار ہوتا جا رہا تھا پھر انہوں نے اشتعال کی حالت میں کہا۔

"آپ نے رشتہ و پیوند والی بات لکھی ہے۔ یہ وہ بات ہے جس کا اب کبھی اعادہ نہیں ہوگا۔ یہ وہ بات ہے جس کا ذکر تلخی کا سبب ہے۔ اور جو ہندو مسلم اختلافات کا سبب بن سکتی ہے۔ آپ نے سردار پٹیل پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور یہ بات ہماری حکومت برداشت نہیں کر سکتی۔

میں نے عرض کیا۔

"لیکن سردار پٹیل آپ سے بڑے وزیر ہیں وہ خود اپنی مدافعت کر سکتے اور مجھے سزا دے سکتے ہیں۔ آپ ان کی طرف سے کیوں وکالت کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔"

بغیر کسی جھجک کے مرار جی نے کہا، سردار پٹیل ہندوستان کی سب سے بڑی اور عظیم قوم کے ہیرو ہیں۔ ان کے خلاف کچھ کہنا، ہندو مسلم منافرت پیدا کرنا ہے۔ اور میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔

اب میں لاجواب ہوگیا۔ اور بالآخر میں پاکستان آگیا۔

تقسیمِ ہند سے لے کر اس وقت تک تحریک آزادیٔ ہند سے متعلق مسٹر وی پی مینن وغیرہ کی درجنوں کتابیں شائع ہو چکی ہیں ان کتابوں کی اشاعت ہند اور بیرون ہند میں زور شور سے ہو رہی ہے۔ غیر ملکی صحافی اور مؤرخ انہی کو بنیادی اساس بنا کر، اور ماخذ قرار دے کر مقالے اور کتابیں لکھتے ہیں ان کتابوں کے مطالعہ سے صرف ایک ہی بات واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ ہندوستان کی تحریک آزادی کا شاندار آغاز اور کامیاب انجام تمام تر رہین منت ہے گاندھی جی موتی لال جواہر لال، پٹیل اور دوسرے ہندو لیڈروں کا۔ دنیا اس سفید جھوٹ کو سچ سمجھنے پر مجبور ہے۔ کیونکہ تصویر کا دوسرا رخ اس کے سامنے نہیں ہے۔

درحقیقت امر واقعہ یہ ہے کہ وہ علی برادران تھے۔ جنہوں نے مجلس خلافت کے سرمایہ سے گاندھی جی کو مسلمانوں کا زعیم ہیرو بنایا وہ مجلس خلافت تھی جس کے بل بوتے پر کانگرس برلوں، اور مارواڑیوں کے قبضہ سے نکلی اور حریت خواہوں کے ہاتھ میں آئی۔

آخر تاریخ کا یہ صفحہ سادہ کیوں ہے؟

خوش قسمتی سے میرے پاس اس سلسلہ میں ایسا غیر مطبوعہ نیز مطبوعہ لیکن نایاب مواد موجود تھا جو بعض معنوں میں تصویر کا دوسرا رخ ہے یہ مواد کچھ میرے پاس تھا۔ زیادہ تر حضرت جمال میاں فرنگی محلی کی کرم فرمائی سے میرے ہاتھ آیا۔

یہ بوسیدہ اوراق تحریک خلافت، تحریک آزادی ہند اور ہندوستان کے شعور سیاسی کی تاریخ نہیں ہیں۔ لیکن ان عنوانات پر کوئی تاریخ پایۂ استناد نہیں حاصل کر سکتی جب تک مورخ کے سامنے ماخذ کے طور پر یہ اوراق نہ ہوں

یہ اوراق مشتمل ہیں۔

۱۔ علی برادران کے ان غیر مطبوعہ خطوط پر جو انہوں نے مہرولی، چھندواڑہ، لینسڈاؤن اور بیتول جیل سے پانچ سال کی نظر بندی اور قید کے زمانے میں اپنے پیر و مرشد مولانا عبدالباری کو لکھے۔ یہ خطوط تاریخ کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔

۲۔ کچھ ایسے خطوط بھی ہیں، جو عرصہ ہوا، بعض مجموعوں میں شائع ہو چکے ہیں، لیکن تسلسل کے لئے میں نے انہیں بھی شامل کر لیا ہے۔

۳۔ آج سے پچاس سال پہلے کے یعنی ۱۹۱۳ء کے ہمدرد سے میں نے وہ اہم مقالات لے لئے ہیں جن سے مسلمانوں کے شعور سیاسی، اور کاروان آزادی کے قدم بہ قدم بڑھنے کی پوری تاریخ نظر کے سامنے آجاتی ہے۔ تحریک قدامت، حادثہ مسجد کانپور، وفد خلافت یورپ، طبی وفد برائے ترکیہ یہ ساری وہ چیزیں ہیں، جنہوں نے ہندوستان کی اور مسلمانوں کی تاریخ بنائی۔ یہ تاریخ زمانے کے ہاتھوں ختم ہو چلی تھی، ہمدرد کا فائل اب کبریت احمر کا حکم رکھتا ہے۔ میں نے یہ مقالات درج کر کے آنے والے مورخ کے لئے بہت قیمتی سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔

۴۔ اردو صحافت میں ہمدرد سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ پہلا اردو روزنامہ تھا جو ٹائپ میں چھپتا تھا۔ جس میں عربی فارسی، انگریزی کے غیر ملکی بلند پایہ اخبارات سے تراشے شائع ہوتے تھے جس میں سیاست ہند اور سیاسیات بین الاقوام سے متعلق گراں بہا معلوماتی مقالے شائع ہوتے تھے۔ ہمدرد کا مقام تھا، اگر ہمدرد کے اس خصوصی پہلو سے میں آپ کو متعارف نہ کراتا۔

۵۔ ہمدرد کی بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ رائے عامہ پر چلتا نہیں تھا، بلکہ رائے عامہ پیدا کرتا تھا، وہ اپنے ناظرین کی سنسنی خیز خبروں اور چٹخارے دار مضامین سے تواضع نہیں کرتا تھا، ان کی صحیح سیاسی تربیت کرتا تھا۔ اور ان کے سامنے وہ مواد پیش کرتا تھا جس سے ان میں بصیرت پیدا ہو، خود رائے قائم کرنے کی صلاحیت اور استعداد پیدا ہو۔ نمونے کے طور پر میں نے اس طرح کی چیزیں بھی شامل کر دی ہیں۔

۶۔ ہمدرد کے مقالات ادارت، آج سے پچاس سال پہلے جتنے پر مغز، مدلل، معلومات آفریں، اور ساتھ ہی ساتھ سنجیدگی و متانت کے ساتھ لطیف کے حامل ہوتے تھے وہ اسی کا حصہ ہوتے تھے، میں نے اس طرح کے اداریے بھی پیش کئے ہیں تاکہ آج کی صحافت سے آج سے پچاس برس پہلے کی صحافت کا تقابل ہو سکے۔

۷۔ ایسی دستاویز چیزیں بھی اس کتاب میں میں نے شامل کر دی ہیں، جن سے بہت سے واقعات کا پس منظر سمجھ میں

قارئین کرام کو مدد ملے گی۔

غرض اس اشاعت میں جو مواد پیش کیا جا رہا ہے، وہ کئی نسلوں کے لئے ایک اور انکشاف، معماران پاکستان کے لئے ایک دعوت فکر، اور مستقبل کے مورخ کے لئے مستند ترین ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔ میں خوش ہوں کہ خدا نے مجھے یہ کام انجام دینے کی توفیق مرحمت فرمائی۔

شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

ضرورت اس کی ہے کہ اس مواد سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ جب تک ہم اپنے ماضی سے، اور اپنے اسلاف و اکابر کے کارناموں سے واقف نہ ہوں، نہ ہمارے اندر جذبۂ عمل پیدا ہو سکتا ہے، نہ جوش کردار۔ آگے بڑھنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیں۔

رئیس احمد جعفری

ترتیب

مقالات ، ۱۷

اوراقِ پارینہ

شوکت علی

ہمدرد۔ سیاست وصحافت، تاریخ وادب، شعروافسانہ کی انجمن

شخصیات

معلومات اور وقائع

افسانے

شعر وسخن

ہمدرد کا دورِ ثانی

ٹرکش میڈیکل مشن

ہنگامہ زار کانپور

خطوط و مقالات مولانا شوکت علی

خطوط و مقالات مولانا محمد علی

ضمیمے

روپیہ بچایئے
حبیب بینک لمیٹڈ

★ ★ ★
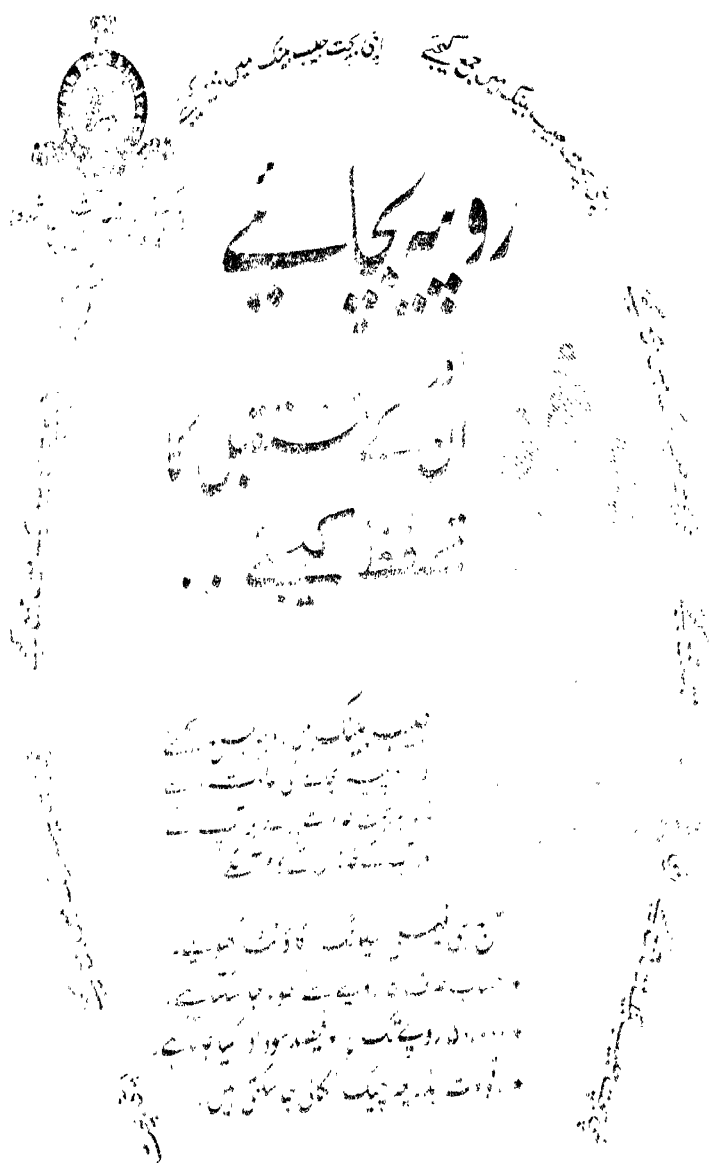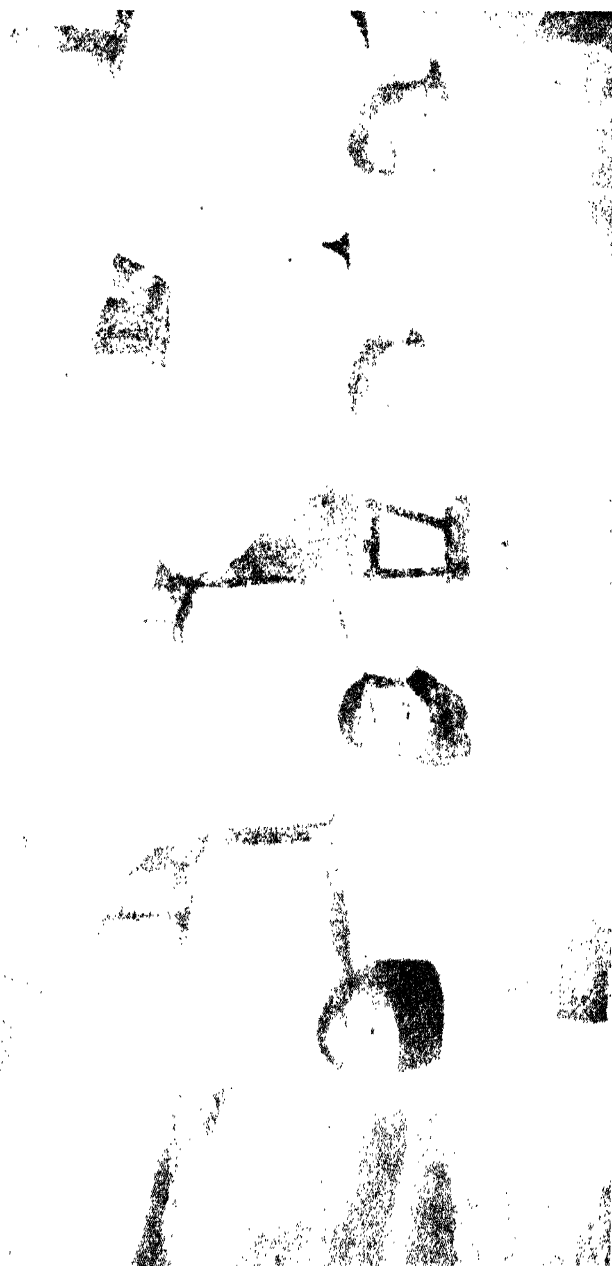
مقالات

اس عنوان کے ماتحت وہ مقالات درج کیے گئے ہیں
جو اس کتاب کے لیے خاص طور پر تحریر فرمائے گئے ہیں
ان مقالات کے مطالعے سے محمد علی کی زندگی کے
بعض بالکل نئے پہلو سامنے آتے ہیں، جو اب تک
کہیں اور شائع نہیں ہوئے اس لیے ان کی
افادیت اور اہمیت بہت زیادہ بڑھ گئی ہے!

حضرت مولانا محمد طیب صاحب
مہتمم دارالعلوم دیوبند

مولانا محمد علی جوہر (مرحوم)

مولانا محمد علی مرحوم ہندوستان ہی میں نہیں بیرونِ ہند میں بھی محتاجِ تعارف نہیں تھے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کا بچہ بچہ ان کے نام سے واقف تھا۔ وہ ہندوستان کے مخلص زعیم اور سچے جذبات کے لیڈر تھے۔ تحریکِ خلافت کے اولین بانیوں میں سے تھے۔ اسٹیج اور پلیٹ فارم پر سب سے پہلے انہوں نے ہی برطانیہ کے خلاف ہندوستان کو جگایا۔ اور دلیری کے ساتھ ملک کو ایک ایسی حکومت کے مقابلہ پر دلیر بنا دیا جس کی عملداری میں کسی وقت بھی آفتاب غروب نہ ہوتا تھا۔ مجھے مولانا محمد علی مرحوم سے ملنے جلنے کا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوا ہے اور شاید دو ایک بار ہی اس کی نوبت آئی ہے کہ آمنے سامنے ہو کر میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل کر سکا۔ میری پہلی ملاقات ان سے بمبئی میں ہوئی ہے۔ میں اپنے والد مرحوم کے ساتھ حضرت مرشدی شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب نور اللہ مرقدہ کے استقبال کے لیے بمبئی پہنچا جب حضرت مالٹا کی اسیری سے رہا ہو کر ہندوستان وارد ہوئے۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی مرحوم خلافت کمیٹی بمبئی کی جانب سے حضرت شیخ کے استقبال اور جلوس کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ کسی موقعہ پر اچانک آمنا سامنا ہوا اور میں اور میرے چھوٹے بھائی مولوی طاہر مرحوم ان سے ملے مصافحہ کیا۔ کسی نے ہمارا تعارف کرایا تو بڑی محبت سے ہم دونوں سے لپٹ گئے اور فرمانے لگے میں حیران تھا کہ یہ ترکوں کے بچے ہندوستان میں کہاں سے آگئے۔ یہ اس لیے فرمایا تھا کہ میرے بھائی مرحوم تو بہت ہی سرخ سفید اور گورے چٹے تھے اور میرا رنگ بھی موجودہ رنگت کے مقابلہ میں کافی اجلا اور روشن تھا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ ان میں بزرگانہ شفقت کے علاوہ اپنے چھوٹوں کو آگے بڑھانے اور حوصلہ افزائی کے خاص جذبات تھے۔

دوسری ملاقات دیوبند ہی میں ہوئی۔ جب کہ وہ تحریکِ خلافت کے سلسلہ میں دورہ کرتے ہوئے دیوبند تشریف لائے تو والد مرحوم کے مہمان ہوئے اور میرے مکان میں قیام فرمایا جو اس وقت نیا مکان کہلاتا تھا۔ اولاً دارالعلوم تشریف لائے۔ حضرت مولانا حبیب الرحمن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نائب مہتمم دارالعلوم نے دارالعلوم کا معائنہ کرایا اور بزرگوں کے زمانہ کے کچھ پرانے کاغذات دکھلائے۔ ان میں حضرت بانیٔ دارالعلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم قدس سرہ کے دستِ مبارک کے لکھے ہوئے وہ آٹھ اصول بھی دکھلائے جو حضرت نے بطور اساس مدرسہ و مدارس تحریر فرمائے تھے۔ مولانا انہیں پڑھ کر اس قدر متاثر ہوئے کہ بے ساختہ ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے اور کہا کہ ان اصول کو عقل سے کیا تعلق یہ تو خالص معرفت اور الہام کے اصول ہیں۔ اور حیرت سے کہا کہ سو برس دھکے کھا کر ہم لوگ یہاں آج پہنچے ہیں یہ بزرگ وہاں سو برس پہلے ہی پہنچ چکے تھے جب کہ حالات [illegible]
[illegible]

ان کی بہادری کا تو یہ عالم تھا کہ برطانوی حکومت سے بے جھجک ٹکر لیتے رہے۔ تھے جب کہ قید و بند جیل اور پھانسی کا تختہ سامنے تھا، اور ادھر ساتھ ہی رقت قلب کا یہ عالم کہ تقریروں میں اکثر روتے تھے اور کوئی بھی دین و آخرت کی بات سامنے آجاتی تھی تو فوراً ان کی آنکھیں لبریز ہو جاتی تھیں۔ یہ دو وصف اسی شخص میں جمع ہو سکتے ہیں جو دنیاوی زندگی کے ساتھ آخرت کو بھی پیش نظر رکھتا ہو۔ شجاعت قلب کا یہ عالم تھا کہ طلب آزادی کی راہ میں جب انہوں نے انگلستان کا آخری سفر کیا اور [illegible] پارلیمنٹ میں تقریر کی تو کنگ جارج کو بے دھڑک خطاب کرتے ہوئے کہا کہ [illegible] مجھے ہندوستان کی آزادی نہیں دے سکتے تو مرنے کے لیے دو گز زمین تو انگلستان ہی میں دے سکے گا۔ یہ الفاظ کچھ ایسے درد و تاثیر سے [illegible] کہ پارلیمنٹ تو جس حد تک متاثر ہوئی وہ ہوئی خود ان کے حق میں وہ الفاظ واقعہ بن گئے۔ اور وہیں انگلینڈ میں غالباً اسی شب میں وفات پا گئے حق تعالیٰ نے انہیں اور ان کے [illegible] السابقون [illegible] مقبولین کی جنت اور مرتبہ [illegible] ایک نصیب فرمائی۔ ان کی نعش انگلستان سے بیت المقدس لائی گئی [illegible] انبیاء علیہم السلام کی مقدس زمین میں انبیاء کے جوار میں دفن کیے گئے۔ یہ جہاں ان کی قبولیت عند اللہ کی دلیل ہے وہیں ان کی پاک طینتی کی حجت بھی ہے۔ کیونکہ حدیث نبوی میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو شخص جہاں دفن ہوتا ہے وہی اس کی مٹی بھی ہوتی ہے جس سے اس کا خمیر کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مٹی کو قرآن نے "ارض مقدس" فرمایا ہے اس لیے اس کی طینت کا خاک مقدس سے لیا جانا واضح ہے جو ان کی پاک طینتی کی دلیل ہے۔ گو اس خاک مقدس سے کفار بھی پیدا ہوتے ہیں اور وہیں وہ سپرد خاک بھی کیے جاتے ہیں لیکن ایمانی استعداد کو کھو کر وہ اس کی تقدیس خود زائل کر دیتے ہیں جو خود ان کا قصور ہے۔ ارض مقدس کی تقدیس کا قصور نہیں۔ وہ تو اپنی ذات سے پاک ہے ناپاکی ملانے والے کا قصور ہے کہ اسے ناپاک بنا دے۔ حجر اسود بہ نص حدیث جنت کا پتھر ہے جس کا رنگ سفید براق تھا جسے [illegible] بنی آدم کے گناہوں نے اگر اس کا رنگ سیاہ کر دیا تو یہ گناہ گاروں کا قصور ہے نہ کہ حجر مقدس کا یا اس کی شفافی کا۔ بہر حال محمد علی کی طینت پاک تھی جو ارض مقدس سے لی گئی تھی ایمان نے اس کی پاکی کو قائم رکھا اور اسے وہیں پہنچا دیا جہاں سے وہ اٹھائی گئی تھی۔

ع۔ پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا

بہر حال مولانا محمد علی نے حضرت نانوتوی قدس سرہ کے تحریر فرمودہ اصول پر روتے ہوئے اظہار خیال کیا اور کہا کہ آج کی دنیا جس مقام پہ آج سو برس دھکے کھا کر پہنچی ہے یہ روشن ضمیر بزرگ اس مقام پر سو برس پہلے محض اپنی روشن ضمیری سے پہنچ چکے تھے۔ اسی مجلس میں تمام اساتذۂ دارالعلوم کو بھی حضرت والد مرحوم نے جمع فرما لیا تھا۔ یہ احقر بھی اس مجلس میں موجود تھا۔ مولانا محمد علی مرحوم سے یہ دوسری ملاقات تھی جو بمبئی کے بعد دیوبند میں ہوئی اور انہیں زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہ مجلس ظہر عصر کے درمیان میں ہوئی۔

بعد نماز عصر مسجد دارالعلوم میں ان کی تقریر کا اعلان تھا۔ مولانا نے تقریر شروع کی اور انگریزوں کے ہاتھوں خلافت اسلامیہ کی پامالی کی داستان سنائی۔ [illegible] انگریزوں [illegible] کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کے اکابر کو متوجہ کیا کہ اس [illegible] سرنگوں ہو چکے

بڑھ گئے۔ اور آخر کار اس سلسلہ میں قیادت ہی اُن کی ہو گئی۔ جس نجا جی جلسوں میں اکابر دیوبند خود جا جا کر شریک ہوتے گئے۔ یہ احقر بھی منگلور، کاندھلہ، پور قاضی وغیرہ آس پاس کے قصبات میں طالب علمانہ انداز سے تحریک خلافت کے سلسلہ میں جایا کرتا تھا۔

مولانا محمد علی نے اس تقریر میں نہایت ہی درد انگیز لب و لہجہ میں حضرات صحابہ کی ہمت و سربلندی اور ان تھک مجاہدانہ روش عملی پر تاریخی حیثیت سے روشنی ڈالتے ہوئے بار بار اس آیت کو دہراتے ہوئے پیش کیا فما ضعفوا وما استکانوا اس کا ترجمہ کرتے جاتے تھے کہ یہ حضرات صحابہ اعلائے کلمۃ اللہ اور جہاد فی سبیل اللہ کے راستہ میں نہ کمزور پڑے اور نہ جھکے اور روتے جاتے تھے۔ بہر حال ایک طرف اُن کی شجاعت قلب اور ایک طرف رقت قلب دو متضاد سی چیزیں تھیں مگر اللہ نے اُن میں جمع فرما دی تھیں جو بڑوں ہی کو نصیب ہوتی ہیں۔ پھر اس کے بعد دوسری تقریر بیٹری منڈی میں عشا کے بعد شہر کے جلسۂ عام میں ہوئی جس میں اُنہوں نے قرنِ اول کے مسلمانوں کے مجاہدانہ کارناموں کے ساتھ اُن کی سادگی، بے تکلفی اور لاامتیازی کے جذبات کو بہت ہی اچھے اور مؤثر انداز سے بیان کیا۔ مجھے یاد ہے کہ اُنہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا وہ واقعہ ذکر کیا جس میں وہ مدینہ سے بیت المقدس تشریف لے گئے تھے۔ جبکہ حضرات صحابہ نے بیت المقدس کا محاصرہ کیا ہوا تھا۔ اور حضرت ممدوح کے پہنچنے پر صلحاً بیت المقدس فتح ہو گیا اور مسلمان بیت المقدس میں حضرت عمرؓ کے ساتھ داخل ہو گئے۔ یہ سفر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک اونٹنی پر کیا تھا۔ صرف ایک غلام ساتھ تھا۔ اور وہ بھی اس طرح اُترتے چڑھتے سفر طے ہوا ایک مسافت کی حد تک امیر المؤمنین سوار ہوتے تھے غلام اونٹنی کی نکیل تھام کر چلتا تھا اور ایک مسافت کی حد تک غلام اونٹنی پر سوار ہوتا تھا اور امیر المؤمنین اونٹنی کی نکیل تھام کر چلتے تھے۔ اس سچی اور حقیقی مساوات کے واقعہ کو مولانا محمد علی نے نظم کیا تھا جس کے اشعار اس جلسہ میں پڑھ کر سنائے۔ مجھے صرف ایک مصرعہ یاد رہ گیا جسے مولانا بڑے والہانہ انداز میں بار بار پڑھ رہے تھے اور درد دل کے ساتھ رو رہے تھے۔ ع

چلے جاتے تھے یوں چڑھتے اُترتے

یہ گویا تیسری ملاقات تھی جو عمومی رنگ سے ہوئی۔

تحریک خلافت اور مولانا محمد علی جوہر کے دیوبند آنے اور ملنے سے علی گڈھ اور دیوبند باہم بہت قریب ہو گئے تھے۔ ایک نے دوسرے کو پہچانا اور وہ بُعد جو اس سے قبل تھا بہت حد تک رفع ہو گیا۔ سرسید کے معتقدات سے اختلاف رہا لیکن اداروں کی حیثیت سے بُعد باقی نہیں رہا۔ تا آنکہ رفتہ رفتہ وہ وقت بھی آ گیا کہ علی گڈھ یونیورسٹی علماء دیوبند کو دعوتیں دے دے کر بلانے لگی اور وہاں کے حلقوں کے مواعظ سے بطوع و رغبت استفادہ کرنے لگا۔ مجھے خود بھی بارہا علی گڈھ کی دعوتوں پر جانے آنے اور علی گڈھ کے ہالوں میں تقریریں کرنے کی نوبت آئی جنھیں وہاں کے بزرگوں اور خوردوں نے محبت و خلوص اور شوق و میلان کے ساتھ سنا اور اس

کہ اس طویل و عریض خط کا نقطہ جو مولانا محمد علی مرحوم کی دیوبند میں آمد اور ان کا مجاہدانہ اقدام ہے جو دارالعلوم دیوبند کی طرف جھکتے اور یہاں کے بزرگوں سے میل ملاپ قائم کرنے کی صورت میں نمودار ہوا۔

مولانا محمد علی مرحوم اپنے ابتدائی دور میں جب وہ علی گڈھ سے فارغ ہو کر باہر آئے ہیں مغربی تہذیب کا ایک چلتا پھرتا نمونہ تھے۔ ان کی اُس دور کی تصاویر دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ تہذیب و تمدن کے لحاظ سے اُن میں اور انگلستان کے ایک ٹھیٹ فرنگی میں کوئی خاص فرق نہ تھا۔ ڈاڑھی صاف مونچھیں چڑھی ہوئیں، کوٹ پتلون سے جسم آراستہ۔ لیکن ان کی بنیادی طینت اور خمیر کی پاکیزگی بالآخر رنگ لائی، دین اور دینی جذبات اُبھرے اور وہ مقاصد معین کی طرف گویا کشاں کشاں لائے گئے تو پھر یہ مخلوق نے دیکھا کہ کوٹ پتلون کے بجائے اُن کے کندھوں پر عربی عبا رہتی تھی۔ ڈاڑھی سینہ تک آئی ہوئی۔ گورے چٹے پہلے سے تھے۔ اس خاص دینی ہیئت نے اُن کے چہرے پر ایک عجیب نورانیت پیدا کر دی تھی۔ اور وہ انگلستانی ٹائپ کے آدمی ہونے کے بجائے خالص عربستانی باشندے محسوس ہوتے تھے۔ آخر میں اُن کی زندگی نہایت بے تکلف بن گئی تھی۔ قناعت کا رنگ غالب آ گیا تھا۔ اور اُن کی مجلس ادیبانہ اور صحابیانہ رنگ کی ہو گئی تھی اور کہا جا سکتا ہے کہ آخر کار مولانا محمد علی کی زندگی اسلام کی کامل زندگی بن گئی تھی اور وہ صحیح معنی میں مسٹر محمد علی کے بجائے اب مولانا محمد علی تھے اور اسی بہترین اور پاکیزہ حالت پر اُن کا خاتمہ ہوا رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

مجھے مولانا محمد علی کی معیت کی ساعتیں مذکورہ ساعتوں کے سوا زیادہ نہیں ملیں اس لیے اُن کی زندگی کے واقعات پر عبور بھی نہیں ہے۔ یہ دو تین واقعات سامنے تھے جو رئیس احمد صاحب جعفری کی فرمائش پر معرض تحریر میں آ گئے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

از افادات
مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
امیر جماعت اسلامی پاکستان

مولانا محمد علی: ایک پرانی داستان

مولانا محمد علی سے میرے روابط کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ میرے سب سے بڑے بھائی ابو محمد صاحب مرحوم جو بھوپال میں مقیم تھے، مولانا مرحوم کے دوستوں میں سے تھے اور دوستی کے یہ روابط خاصے گہرے اور مضبوط تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم، ڈاکٹر عبدالرحمان، شعیب قریشی اور عبدالرحمان سندھی (صدیقی) صاحب سے بھی ان کے بڑے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ اور موخرالذکر دونوں حضرات تو بسا اوقات مہینوں ہمارے ہاں مہمان رہے ہیں۔ یہ مخلص لوگ تھے، علی گڑھ کی مخصوص تہذیب اور شائستگی کا نمونہ۔ قومی درد رکھتے تھے، ایثار کا جذبہ انہیں گھیرے ہوئے تھا۔ یہ بیرسٹر تھے۔ انگریزی کے صاحب طرز ادیب تھے۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں خطابت کے جوہر دکھاتے تھے، ان کی قابلیت اپنے لیے نہیں تھی، قوم کے لیے تھی، خود میرے بھائی ابو محمد صاحب بھی اس حلقہ اخوان الصفا کے ایک رکن تھے، ان لوگوں میں خوب نبھتی تھی، اور اس مجمع رندان کے پیر مغاں محمد علی کو سب چاہتے بھی تھے، اور ان کی عظمت کے آگے سر بھی جھکاتے تھے۔

سنہ ۱۹۲۴ء میں جب مولانا محمد علی دوبارہ ہمدرد جاری کرنے کے انتظامات کر رہے تھے، بھائی ابو محمد صاحب مرحوم نے مجھے رائے دی کہ میں اس کے ادارہ سے وابستہ ہو جاؤں۔ اس سے پہلے میں متعدد اخباروں میں کام کر چکا تھا۔ میں نے بھی اس کو غنیمت سمجھا کہ مجھے مولانا محمد علی جیسے شخص کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے، چنانچہ میں بھائی صاحب کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی

ایک بزرگ اپنے چھوٹے کے ساتھ جس محبت و شفقت کے ساتھ پیش آ سکتا ہے، اس سے کچھ زیادہ ہی محبت و شفقت مجھے محمد علی کی ذات سے ملی، کیونکہ وہ ہر معاملہ میں بالخصوص دوستی و محبت کے معاملہ میں بہت زیادہ انتہا پسند تھے۔ چنانچہ اس کے بعد بارہا اُن کی خدمت میں حاضری کا موقع ملتا رہا اور ہمیشہ یہی محسوس ہوا کہ میں ایک بڑے لیڈر سے نہیں بلکہ اپنے بڑے بھائی سے مل رہا ہوں۔

ابھی ہمدرد کے اجرا کے انتظامات ہی ہو رہے تھے کہ میں نے اس سے وابستہ ہونے کا ارادہ ترک کر دیا۔ دراصل چند ہی روز بعد میں نے محسوس کر لیا تھا کہ فکر کی ہم آہنگی، جذباتی عقیدت، اور سیاسی معاملات میں تمام تر اتفاق رائے کے باوجود میرا اور اُن کا نباہ نہیں ہو سکتا۔ اُن کی "[illegible]" میں "جدیدیت" بھی شامل تھا، اور وہ بھی پوری شدت اور انتہا پسندی کے ساتھ۔ میری پرورش جس ماحول میں ہوئی تھی، اُس نے خود میرے مزاج اور افتاد طبع کا بھی ایک نہ ٹوٹنے والا سانچہ بنا دیا تھا۔ اگر ساتھ رہتا تو اندیشہ تھا کہ یہ سانچہ ٹوٹ نہ جائے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کر لیا کہ ہمدرد کے عملہ ادارت سے وابستگی نہ اختیار کروں گا، البتہ اس سے باہر رہ کر جو خدمت بھی [illegible] بن آئے گی کروں گا۔

اتفاق کی بات اُسی زمانہ میں جمعیۃ علمائے ہند کو، اپنے آرگن روزنامہ "الجمعیۃ" کے لیے ایک ایڈیٹر کی ضرورت پیش آئی۔ ہندوستانی سیاست کا داخلی اور خارجی اعتبار سے یہ بڑا اہم اور نازک دور تھا۔ اربابِ جمعیۃ کو ایسے ایڈیٹر کی تلاش تھی جو واقعات و مسائل اور حوادث و افکار پر اپنے اداریوں میں جن خیالات کا اظہار کرے ایک طرف وہ جدید معیارِ صحافت پر اپنے عمق کے اعتبار سے پورے اُترتے ہوں دوسری طرف مذہبی نقطۂ نظر بھی پورے توازن کے ساتھ ان میں سمویا ہوا ہو۔ اس مقصد کے لیے اربابِ جمعیت کی نگاہِ انتخاب مجھ پر پڑی، کیونکہ وہ پہلے سے مجھ پر اعتماد رکھتے تھے۔ اور میں سنہ ۲۲ء سنہ ۲۳ء میں اُن کے اخبار "مسلم" کا ایڈیٹر رہ چکا تھا، اور میں نے بھی ہمدرد کے بجائے "الجمعیۃ" کی پیشکش قبول کرنے کو ترجیح دی، کیونکہ یہاں میں خود پرچے کو چلانے کا ذمہ دار تھا، کسی دوسرے کی ماتحتی میں مجھے کام کرنا نہ تھا۔

سنہ ۱۹۲۴ء سے سنہ ۱۹۲۸ء تک میں یہ ذمہ داری انجام دیتا رہا۔ اس عرصہ میں میں محمد علی سے استفادے کا، ان سے فیضِ صحبت حاصل کرنے کا، اور ان کی شخصیت کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کا مجھے موقع ملا۔ بندہ ول سے: دنیا نہ کبھی خالی رہی ہے، نہ رہے گی، لیکن اس درویش خدامست کی قیادت شان ہی کچھ اور رکھتی تھی، پھر اس کے بعد آج تک مسلمانوں میں کوئی لیڈر ایسا نظر نہیں آیا جو سیاسی بصیرت کے ساتھ ایسا گہرا دینی جذبہ بھی رکھتا ہو اور دینی جذبہ سے اپنی تحریک کے ڈھانچے میں بھی دینی روح پھونک سکتا ہو۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ الجمعیۃ نے پورے دورِ ادارت میں ہر زمانہ پورے خلوص و استقلال و استقامت کے ساتھ محمد علی کی ہمنوائی کی، مخالفوں کی یلغار میں اس کا ساتھ دیا۔ جب اس پر تیروں کی بارش ہوتی تھی تو اس کی ایک ڈھال الجمعیۃ بھی تھی۔

محمد علی کا سا نابغہ غلام آبادیِ ہندوستان نے شاید کوئی نہیں پیدا کیا۔ وہ مدارس کا نواب تھا، لیکن آخر تک وہ جیسا کہ محمود آباد اس کے تصور میں جھلک کر آتے تھے۔ وہ اقلیت کا ایک فرد تھا، لیکن اکثریت کا سب سے بڑا لیڈر ـــــ گاندھی ـــــ اس کی جیب میں تھا، موتی لال نہرو، جواہر لال، راجندر پرشاد وغیرہ اس سے نیچے درجے پر تھے۔ وہ ایک غلام ملک کا باشندہ تھا، لیکن دنیا کی سب سے بڑی سامراجی حکومت اس سے ڈرتی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے اگر چاہتا تو کم از کم وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر تو بن ہی سکتا تھا۔ لیکن ان مناصبِ عالیہ پر اس نے کبھی نگاہِ غلط انداز ڈالنی بھی گوارا نہ کیا۔ اس کی زندگی کا مقصد بحالیِ خلافت اور ہند پر [illegible] قیام تھا۔ وہ پابندی سے نماز پڑھتا تھا، پابندی سے روزے رکھتا تھا، اور رسالت مآب سے اس کے عشق اور شیفتگی کی یہ کیفیت تھی کہ ـــــ جب نام نامی آتا تب اشک بھر آتے۔ اس کی دوستی بھی اللہ کے لیے تھی اور دشمنی بھی اللہ کے لیے۔ اسی لیے وہ دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو دوست بنا لیتا تھا۔ وہ بغاوت کے جرم میں جیل بھی گیا، وہ اس جرم میں پھانسی کا مشتاق بھی رہا، خود ہی کہتا ہے

مستحقِ دار کو حکمِ نظر بندی ملا
کیا کہوں کیسے رہائی ہوتے ہوتے رہ گئی

مولانا محمد علی کا ایک معمول یہ تھا کہ ہر جمعہ کو نماز کے بعد جامع مسجد میں، اُس منبر پر جو صحن میں تھا کھڑے ہو کر حالاتِ حاضرہ پر تقریر کیا کرتے تھے۔ میں اُن کی یہ ہفتہ وار تقریر پابندی سے سنتا تھا، اور مجھے اس حقیقت کے اظہار میں کوئی تامل نہیں کہ ان تقریروں سے میں نے فکری طور پر بہت فائدہ اُٹھایا، اور یہی وجہ تھی کہ ایک سامع کی حیثیت سے شاید ہی اپنے دورانِ قیام دہلی میں کوئی تقریر میں نے ناغہ کی ہو۔

۱۹۲۶ء میں سوامی شردھانند کو ایک مسلمان نے قتل کر دیا، یہ بڑا سخت حادثہ تھا، ہندو مسلم اتحاد کی بنیادیں ویسے ہی ایک عرصہ سے ہل رہی تھیں، اب تقریباً منہدم ہو گئیں، ہر طرف سے مسلمانوں پر حملے ہونے لگے کہ یہ متعصب ہیں، وحشی ہیں، خون آشام ہیں، حتّٰی کہ گاندھی جی تک بے ساختہ کہہ اُٹھے کہ مسلمانوں کی سرشت میں خونریزی شامل ہے۔ مولانا محمد علی مسلسل اپنی تقریروں میں اسلام کا دفاع کرتے رہے، مستشرقینِ فرنگ اور متعصبینِ ہند کا جواب اپنے مبلغ علم کے مطابق دیتے رہے۔ ایک روز اُنھوں نے اپنی تقریر میں فرمایا:

"کاش کوئی شخص اسلام کے خلاف ان افترا پردازیوں کا جواب دلائل و براہین کے ساتھ کتاب و سنت کی روشنی میں لکھ کر، اسلام کے جہاد کی حقیقت دنیا کے سامنے آشکارا کر سکے۔"

وہیں بیٹھے بیٹھے میرے دل میں خیال آیا، وہ شخص میں ہی کیوں نہ بن جاؤں؟

واپس آ کر میں نے اس موضوع سے متعلق جتنی بھی معتبر اور مستند کتابیں فراہم ہو سکیں نقل جمع کیں، اور چند روز بعد "الجمعیۃ" میں "الجہاد فی الاسلام" کے عنوان سے ایک سلسلۂ مقالات شروع کر دیا۔ جب ۲۳ مضامین شائع ہو چکے تو میں نے محسوس کیا کہ موضوع اتنا اہم ہے کہ مقالات کا متحمل نہیں ہو سکتا، یہ ایک مستقل تصنیف کا طالب ہے۔ چنانچہ مزید دو تین سال کی تحقیق و مطالعہ کے بعد اس نام سے ایک کتاب مکمل کر لی جس کا پہلا ایڈیشن دار المصنفین اعظم گڑھ سے مولانا سید سلیمان ندوی نے شائع کیا تھا۔ بعد میں مزید اضافوں اور نظر ثانی کے بعد میں نے خود اسے شائع کیا۔

۱۹۳۰ء میں حق اور سچائی پر ہونے کے باوجود محمد علی بالکل بے یار و تنہا رہ گئے تھے۔ گاندھی جی اور جواہر لال کی قیادت میں کانگریس نے اُن کے خلاف زبردست مورچہ قائم کر لیا تھا، زندگی بھر کے ساتھی جنہیں اُنھوں نے لیڈر بنایا تھا، اُن کا ساتھ چھوڑ کر کانگریس سے جا ملے تھے، اور مل ہی نہیں گئے تھے بلکہ محمد علی کی سیاست ہی پر نہیں بلکہ اُن کے خلوص و دیانت پر بھی حملے کر رہے تھے۔ محمد علی ان سب پر بھی بھاری تھے، دل کے بار بار حملے ہوتے تھے۔ ذیابیطس نے نڈھال کر دیا تھا، ساتھیوں کی بے وفائی نے زندگی سے بددل کر دیا تھا، اسی حالت میں وہ بھوپال آئے۔ وزیرِ ریاست شعیب قریشی کے ہاں جو اُن کے داماد بھی تھے ٹھہرے، لیکن نواب حمید اللہ خاں نے انہیں زبردستی اپنا مہمان بنایا۔ میں بھی اسی زمانے میں بیمار ہو کر اپنے بڑے بھائی کے ہاں گیا ہوا تھا، محمد علی بسترِ علالت پر دراز تھے، اور یہی بسترِ علالت اُن کے لیے بالآخر بسترِ مرگ ثابت ہوا۔ میں اکثر اُن کی خدمت میں پہنچ جاتا، اور وہ فسانۂ غم دل سے کہہ بیٹھ جاتے، یہ فسانۂ غم دل سُن کر غیروں کا دل دو نیم ہو جاتا تھا، تو خود اُن پر کیا کچھ نہ گزر رہی ہو گی؟ انہیں اپنی بیماری کی فکر نہ تھی، اپنے چہیتے اور پرانے ساتھیوں کی بے وفائی

[illegible]

یہی چیز تھی جس نے انہیں مجبور کر دیا کہ بسترِ مرگ پر لندن جائیں، گئے اور وہاں جا کر اعلان کیا کہ اگر آزادی نہ ملی تو غلام دیس میں زندہ واپس نہیں جائیں گے۔ آزادی نہیں ملی، اور گو غلام دیس کی خاک نے انہیں اپنی طرف کھینچا لیکن،

خاکِ قدس اورا بآغوشِ تمنا در گرفت

رفت در فردوس زاں راہے کہ پیغمبر گذشت

نہ جانے کہ اقبال کا یہ بہترین مرثیہ اُن کے مجموعۂ کلام میں کیوں نہیں شامل کیا گیا؟

محمد علی کی موت پر سب روئے، دوست بھی اور دشمن بھی، اور یہ آنسو سب کے چشمِ دل سے ٹپکے تھے، جن لوگوں کو محمد علی سے، اُن کی سیاست سے، اور اُن کی صحافت سے اختلاف تھا وہ بھی محسوس کرتے تھے کہ محمد علی متحدہ ہندوستان کا انمول ہیرا تھا جسے موت نے چھین لیا۔

میرا یہ حال تھا کہ یہ خبر سنتے ہی ضبطِ گریہ ناممکن ہو گیا، کئی دن تک یہ عالم رہا، محمد علی کی یاد آئی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہوئے، اور ایسا دن بھر میں کئی کئی مرتبہ ہوتا تھا، بہت دنوں کے بعد طبیعت سنبھلی، لیکن اب تک یہ کیفیت ہے کہ جب محمد علی کا ذکر چھڑتا ہے، اس کا نام سنتا ہوں، اس کی کوئی تحریر نظر سے گذرتی ہے، تو دل میں عقیدت کا ایک گہرا جذبہ بیدار ہو جاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خیال پچھلے قدموں دوڑتا ہوا ماضی میں پہنچ گیا ہے، اور وہ مجاہدِ صف شکن مصروفِ جہاد ہے، برطانوی استعمار سے بھی، ہندو سامراج سے بھی اور منافقانِ ملت سے بھی، وہی قیامت، وہی جیلیں، وہی تیور، وہی دبدبہ، اللہ اُن پر رحمت کرے، اللہ ہمیں پھر کوئی محمد علی پیدا کر دے کہ جتنی محمد علی جیسے لیڈر کی آج ضرورت ہے، آج سے چالیس برس پہلے نہ تھی!

مولانا امین احسن صاحب اصلاحی مدظلہ

مولانا محمد علی مدرسۃ الاصلاح میں

فاضل محترم مولانا انیس احمد جعفری نے مجھ سے فرمائش کی ہے کہ مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق میں چند تاثرات قلم بند کروں۔ میں اس فرمائش کی تعمیل کے لیے آمادہ تو ہو گیا ہوں لیکن یہ بات مضمون کے پہلے مرحلہ ہی میں واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے مولانا سے صرف نسبت غائبانہ عقیدت ہی کی حاصل ہے، ان سے ملنے جلنے کے مواقع تو درکنار ان کو دور دور سے دیکھ لینے کی سعادت بھی شاید دو تین بار سے زیادہ مجھے حاصل نہیں ہوئی ہے۔ تحریک خلافت کے شباب کے زمانے میں، سن ٹھیک طرح یاد نہیں (غالباً ۲۱ء یا ۲۲ء میں) مولانا مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر ضلع اعظم گڑھ یو۔پی) [illegible] کے سالانہ جلسہ میں تشریف لائے۔ میں اس وقت مدرسۃ الاصلاح میں آخری درجوں کا طالب علم تھا۔ اس جلسہ میں مجھے یاد ہے کہ مولانا کا نام سن کر مدرسہ کے وسیع میدان میں بے پناہ خلقت جمع ہوئی۔ مولانا کے ساتھ وقت کے بعض دوسرے علماء و مشاہیر بھی تشریف لائے تھے۔ میرے استاذ مولانا حمید الدین فراہی کسی جلسہ میں کبھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے لیکن اس جلسہ میں وہ بھی شریک ہوئے۔ بڑا عظیم اجتماع تھا، میں نے اس سے پہلے اس سے بڑا اجتماع کوئی نہیں دیکھا تھا۔ گرمی کے دن تھے۔ ہوا نہایت تند چل رہی تھی۔ اس زمانہ تک لاؤڈ سپیکر کا رواج نہیں ہوا تھا۔ اس وجہ سے اندیشہ تھا کہ مولانا کی تقریر سنی نہ جا سکے گی جس سے جلسہ میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ لیکن جب مولانا تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کے رعب و دبدبہ نے ہر شخص کو اس طرح مرعوب و مسحور کر دیا کہ جو شخص جس جگہ کھڑا یا بیٹھا تھا وہیں پیکر تصویر بن کر رہ گیا ——— مولانا کی بلند اور پرشکوہ آواز ہوا کی تندی اور مجمع کی غیر معمولی وسعت کے باوجود ہر گوشہ میں پہنچنے لگی۔ اور تقریر کے اثر کا عالم یہ ہوا کہ تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک آنکھ بھی ایسی نہ تھی جو رو نہ رہی ہو۔ مجمع جو زیادہ تر دیہاتیوں کا تھا، اس میں پڑھے لکھے لوگ بہت تھوڑے سے تھے، ان دیہاتیوں کے لیے مولانا محمد علی جیسے شخص کی تقریر کو سمجھنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ لیکن ان کی تقریر میں ایمان و یقین کی ایسی گرمی اور سوز و درد کی ایسی حلاوت تھی کہ ان سے متاثر ہونے کے لیے شاید اس کو زیادہ سمجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

اس موقع کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے جو قابل ذکر ہے۔ مولانا رح کی تقریر جب ختم ہو گئی تو ہم نے دیکھا کہ مجمع کے ایک گوشہ سے ایک بوڑھا دیہاتی اٹھا اور وہ مجمع کو چیرتا پھاڑتا سیدھا اسٹیج کی طرف چلا۔ اگرچہ اسٹیج تک پہنچنے میں اس کو سخت مزاحمتوں سے سابقہ پیش آیا لیکن وہ اپنی دھن کا ایسا نکلا کہ اس نے مولانا رح کے پاس پہنچ کر ہی دم لیا۔ اور پہنچتے ہی ان کی داڑھی پر ہاتھ رکھ کر اپنے مخصوص لہجہ میں بولا کہ:

یہ کہہ کر جب وہ واپس مڑا تو مولانا نے فرمایا کہ:

"اس طرح کی داد بھی آپ کے سوا مجھے کسی اور سے نہیں ملی۔"

اس موقع پر مولانا کی عظمت کا ایک اور پہلو میرے سامنے اپنے استاذ مولانا فراہی رح کے تاثرات سے واضح ہوا۔ اس جلسہ میں تقریر کر کے مولانا محمد علی رح اعظم گڑھ شہر کے لیے روانہ ہو گئے جہاں شب میں ان کو ایک جلسۂ عام میں تقریر کرنی تھی، وہ گئے تو ان کے ساتھ مدرسۃ الاصلاح کا سارا جلسہ بھی چلا گیا، یہاں تک کہ خود مولانا فراہی بھی جو مدرسہ کے ناظم تھے ان کی تقریر میں شرکت کے لیے ان کے ساتھ چلے گئے۔ انہوں نے چلتے وقت ہمیں یہ ہدایت کی کہ کچھ کٹے ہوئے کاغذ اور چند اچھی پنسلیں ان کے سامان میں رکھ دی جائیں تاکہ وہ اعظم گڑھ میں ہونے والی مولانا محمد علی رح کی تقریر نوٹ کر سکیں۔ یہ معاملہ میرے لیے نہایت حیرت انگیز تھا، میں اس بات سے تو واقف تھا کہ مولانا فراہی رح، مولانا محمد علی رح [illegible] آزادی سے [illegible] کی تقریر سے مولانا کا اس درجہ متاثر ہونا کہ وہ خود اس کے نوٹ کرنے کا اہتمام کریں میرے لیے تعجب [illegible] مولانا نہ تو جذباتی آدمی تھے، نہ کوئی سیاسی آدمی۔ وہ ایک محقق ایک فلسفی اور ایک حکیم تھے۔ وہ [illegible] میں نے [illegible] وعظ و تقریر کے جلسوں میں، خواہ وہ مذہبی ہوں یا سیاسی کبھی مشکل ہی سے شریک ہوتے تھے، لیکن مولانا محمد علی رح کی تقریر میں شریک ہونے کے لیے نہ صرف یہ کہ سفر کے لیے آمادہ ہو گئے بلکہ ان کی تقریر کے نوٹ لینے کے لیے یہ اہتمام فرمایا۔ مولانا کے اس اہتمام نے میرے دل میں مولانا محمد علی رح کی عظمت بہت بڑھا دی۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ [illegible] معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی ایک عظیم سیاسی لیڈر ہی نہیں بلکہ وہ علمی و عقلی اعتبار سے بھی ایسے بلند پایہ [illegible] ہیں کہ مولانا فراہی جیسے لوگ بھی ان کی تقریروں کو یہ درجہ دیتے ہیں کہ ان کے نوٹ لیتے ہیں۔

اس واقعہ نے دوسرے ہی دن مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ مولانا محمد علی رح کی تقریر میں وہ کیا چیز تھی جس سے استاذ مرحوم اس درجہ متاثر ہوئے۔ دوسری صبح کو جب مولانا فراہی رح مدرسہ پر واپس آئے تو منتظمین میں سے بعض نے ان سے دبی زبان سے یہ شکایت کی کہ مولانا محمد علی کے ساتھ ان کے چلے جانے کے سبب سے خود مدرسہ کا جلسہ درہم برہم ہو کر رہ گیا۔ مولانا نے اس کا جواب یہ دیا کہ:

"جو کام کی باتیں تھیں، وہ محمد علی نے اپنی تقریر میں کہہ دی تھیں، اس کے بعد کسی اور تقریر کی اب کیا ضرورت باقی رہی تھی۔"

مولانا نے یہ بات اس [illegible] سے فرمائی کہ ہر شخص پر یہ بات واضح ہو گئی کہ مولانا [illegible] کے جلسہ کے درہم برہم ہو جانے [illegible] تھے، ان کے نزدیک سننے کی باتیں وہی تھیں جو مولانا محمد علی نے کہہ دی تھیں اور لوگوں نے وہ [illegible] بعد جلسہ کا [illegible] ان کے نزدیک گویا اضاعت وقت کے حکم میں تھا۔

مولانا نے اس کے بعد متعدد [illegible] مولانا محمد علی کی تقریر پر اپنی پسندیدگی کا اظہار فرماتے ہوئے یہ بھی کہا کہ:

"محمد علی کی تقریر میں ایمان تو ہے [illegible]

[illegible]

کسی شخص کے اخلاق و کردار، سیرت و شخصیت، اور صفات و خصائص کے سمجھنے کے لیے بڑی مدت درکار ہے، لیکن محمد علی کو اس سے بھی کم مدت میں سمجھا جا سکتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھپا سکنے کی صلاحیت سے یکسر محروم تھے، وہ ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح پڑھے جا سکتے تھے، ان کا مطالعہ بڑی آسانی سے بہت کم وقت کیا جا سکتا تھا، اس میں نہ کوئی پیچیدگی تھی نہ اغلاق، ان کی دوستی اور دشمنی، خفگی اور خوشی، تکدر اور انبساط، اختلاف اور اتفاق ہر چیز اتنی ہی واضح اور نمایاں تھی جتنے وہ خود،

محمد علی نے مجھے سلطان احمد کے مکان پر ٹھہرایا تھا، جن کا شمار کلکتہ ہائی کورٹ کے سربرآوردہ اور ممتاز بیرسٹروں میں ہوتا تھا، لیکن وقت کا بڑا حصہ دفتر کامریڈ ہی میں صرف ہوتا تھا، آخر اُن کے پاس آیا تھا، اور اُن ہی کا بلایا ہوا آیا تھا،

محمد علی بے حد جذباتی آدمی تھے، ایک مرتبہ وہ بالائی منزل پر بیٹھے ہم لوگوں سے باتیں کر رہے تھے، اتنے میں دوسری منزل سے جہاں اُن کے اہل خانہ رہتے تھے، کچھ ہنگامے کی آواز آئی، اور پھر ایک دردناک چیخ، معلوم ہوا، محمد علی کی دو بچیوں میں کسی بات پر لڑائی ہوئی، ایک لڑکی نے پوری قوت کے ساتھ دوسری پر سروتا کھینچ مارا جو اگر ٹھیک پڑتا تو حد درجہ خطرناک ثابت ہوتا، یہ سنتے محمد علی اپنے بھاری بھرکم تن و توش کے باوجود بڑی تیزی اور پھرتی سے اوپر پہنچے مظلوم کی حمایت میں ظالم کو دو تین تمانچے مارے اور ہانپتے ہوئے واپس آ گئے۔

محمد علی کی برہمی، تشفقہ مزاجی اور تلخ نوائی کا ایک منظر میں نے کلکتہ میں دیکھا، یہ دل چسپ بھی تھا اور میرے لیے سبق آموز بھی۔

متحدہ بنگال اسمبلی کے سپیکر عبدالحکیم صاحب کے بھائی، عبدالرحیم صاحب کامریڈ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے، دبلے پتلے، کمزور سے آدمی تھے، چلتے تھے تو شاخ گل کی طرح لچکتے ہوئے، اُن کے بارے میں محمد علی کو اطلاع ملی کہ ایک برہمو سماج لڑکی کو دل دے بیٹھے ہیں، اور ایسے عشق صادق میں مبتلا ہیں کہ ممکن ہے خود برہمو سماج میں داخل ہو جائیں۔

یہ خبر سن کر محمد علی نے یہ نہیں سوچا کہ

عشق زین بسیار کردہ است و کند
شیخ را زنار کردہ است و کند

آگ بگولہ ہو گئے، فوراً عبدالرحیم صاحب کی طلبی ہوئی، اور مجرم عشق پر عتاب طلب ہوا، وہ بے چارے لرزتے کانپتے محمد علی کے سامنے۔ اور وہ بھی اس وقت جب ڈھیرے بیٹھے ہوں کچھ کہنا آسان بھی تو نہیں تھا، وہ خاموش تھے، اور محمد علی گرج رہے تھے، برس رہے تھے، سخت سے سخت لہجے میں درشت اور نا ملائم الفاظ کا ایک سیل رواں تھا جس میں عبدالرحیم صاحب تنکے کی طرح بہے چلے جا رہے تھے۔ محمد علی اسے برداشت ہی نہیں کر سکتے تھے کہ عشق کی خاطر مذہب بدل جائے، اور یہ مذہب بدلنے والا اگر مسلمان اور کامریڈ کے عملہ ادارت کا ایک رکن ہو تو محمد علی کے قہر و جلال کو نقطۂ عروج پر پہنچنا ہی چاہیے تھا۔ چنانچہ وہ پہنچا اور بے چارے عبدالرحیم صاحب پھر کامریڈ کے دفتر میں نظر نہیں آئے۔

بلقان یا طرابلس کی جنگ کے زمانہ میں، ہم نے فرنگی محل کی حرمت کا فتویٰ بعض علماء سے لیا، اور مولانا حسرت موہانی نے پریس میں چھپوایا۔ یہ علی گڑھ کی مشہور ... کا زمانہ تھا، اور ماسٹرز میں یہ دکان انگریزوں کی تھیں جن پر لیڈر طالب علموں اور بعض استادوں کے ساتھ مل کر پکٹنگ کی۔ ... اس کے خلاف یہ پہلی پکٹنگ تھی، جس کا آغاز علی گڑھ نے کیا تھا۔ اس واقعہ نے اتنی اہمیت حاصل کی کہ صوبہ کا لفٹیننٹ گورنر سر جیمس مسٹن اپنا دورہ کرا کر علی گڑھ آیا اور اس کے دور رس اثرات رونما نہ ہو سکیں، اس جدوجہد میں مصروف ہو گیا۔

محمد علی نے اسی زمانے میں یہ تحریک ہمدرد کے ذریعہ شروع کی تھی کہ مسلمان ہمدرد کے جاری کیے ہوئے بانڈز خریدیں، اور جو روپیہ اس طرح جمع ہو وہ ترکوں کو بھیجا جائے، تاکہ وہ سامان جنگ خرید سکیں، اور اپنی فوج تیار رکھیں زیادہ مستحکم طور پر شروع کر سکیں۔ انہوں نے ایک مقالہ "قرضہ یا بانڈ یا بائیکاٹ" کے عنوان سے لکھا اور اس بات پر زور دیا کہ یہ زمانہ تحریری ... کا نہیں تعمیری جوش کردار کا طالب ہے۔ انگریزوں کو مالی نقصان پہنچا کر، اور ان کے مال کا بائیکاٹ کر کے ہم ترکوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، لیکن اگر سب روپیہ ترکوں کی جیب میں ڈال دیں تو وہ اپنے فرنگی حریفوں سے ٹکر لے کر جنگ جیت سکتے ہیں۔

اس مضمون کے خلاف میں نے ایک سخت مضمون لکھ کر زمیندار میں بھیج دیا، جو فوراً شائع ہو گیا، احتیاط یہ کی تھی کہ مقالہ نگار کی حیثیت سے اپنے بھائی سید مطلبی کا نام ڈال دیا تھا، لیکن یہ احتیاط کچھ کام نہ آئی، محمد علی سمجھ گئے کہ مضمون نگار کون ہے۔ چند روز بعد کسی کام سے میرا دہلی جانا ہوا، دریا گنج سے گزر رہا تھا کہ سامنے سے ایک فٹن ... محمد علی جا رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی انہوں نے فٹن روک لی اور فرمایا:

"مطلبی صاحب مضمون لکھیں، ..."

میں بہت شرمندہ ہوا اور عرض کیا:

"اب تو جو ہونا تھا ہو گیا، اس جرم کی سزا دے لیجیے۔ جرمانہ کر دیجیے۔"

کہنے لگے "ہاں جرمانہ تمہیں دینا پڑے گا۔"

پھر انہوں نے ایک رسالہ ... عنایت فرمایا، یہ فرنچ زبان میں پیرس سے نکلتا تھا، میں تھوڑی بہت فرنچ جانتا تھا، حکم ہوا:

"جرمانہ یہ ہے، اس کا ترجمہ پابندی سے کر کے ہمدرد میں بھیجتے رہا کرو۔"

میں نے یہ جرمانہ خوشی سے قبول کر لیا۔

اسی زمانے میں ... میں نے ایک جذباتی نظم لکھی، محمد علی کو وہ اتنی پسند آئی کہ بڑے اہتمام سے نمایاں طور پر اسے ہمدرد میں شائع کیا۔ ترکوں کی مدد کے لیے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں محمد علی نے جو میڈیکل مشن بھیجا تھا اس موقع پر بھی میں نے ایک نظم لکھی تھی جس کا یہ مصرع بہت مشہور ہوا۔

لطف مرنے کا اگر چاہے تو چل بلقان چل!

یہ بھی ہمدرد میں چھپی اور بہت مقبول ہوئی۔ میں نے محمد علی پر بھی ایک نظم لکھی تھی جب وہ چھندواڑہ میں نظر بند تھے، اس

خدا بخشے......

(شاہ محمد جعفر ندوی کے قلم سے)

کسی شاعر کا مصرعہ ہے کہ "غم حسینؓ نہیں ہے غم حسنؓ سے جدا" مولانا محمد علی جوہر کا جب ذکر آئے گا تو مولانا شوکت علی کو نظر انداز کردینا دشوار ہوگا۔ میں ان دونوں کی پوری زندگی کی واقفیت نہیں رکھتا اس لیے پوری سوانح عمری نہیں لکھوں گا۔ صرف چند ملاقاتوں ہی کا ذکر کروں گا۔ ان میں میرے ذاتی تاثرات کا بیان بھی ذکر ہوگا وہاں یکطرفہ گفتگو نہیں ہوگی تلخی کا بھی ذکر ہوگا اور شیرینی کا بھی۔ ایک بات کی آپ سے معافی بھی چاہتا ہوں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی مصنف کسی اہم شخصیت کا ذکر کرتا ہے تو اس میں وہ مصنف خود زیادہ ہوتا ہے اور وہ بیچاری شخصیت کم ہوتی ہے۔ ممکن ہے آپ کو میری تحریر میں بھی یہ عیب نظر آئے۔ لیکن میں جہاں بھی اپنا ذکر کروں گا اس سے اپنی ذات کی کوئی نمائش مقصود نہیں ہوگی بلکہ وہ ناگزیر ہوگی اور زائد از ضرورت نہ ہوگی۔

مولانا شوکت علی میرے گھر پر

۱۹۲۱ء کا ذکر ہے کہ منگلور سے میرے بڑے بھائی مولانا شاہ [illegible] میاںؒ کا خط آیا کہ "حضرت مولانا شوکت علی فلاں تاریخ کو پھلواری شریف آرہے ہیں اور وہ سیدھے تمہارے پاس آئیں گے۔ میں اور حضرت قبلہ والد ماجد منگلور میں ہیں اور اس وقت تک گھر نہیں پہنچ سکیں گے۔ حسنین سلمہ پٹنہ سٹی میں اپنی پڑھائی میں لگے ہوئے ہیں۔ اس وقت گھر پر تنہا تم ہی ہو۔ دیکھو ان کے استقبال اور خاطر داری میں کوئی کمی نہ ہونے پائے۔"

میری عمر سولہ سال کی تھی۔ ناتجربہ کار ہونے کے باوجود مجھے کوئی گھبراہٹ نہ ہوئی کیونکہ محلے کے بزرگوں اور بستی کے رضا کاروں نے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میرے صرف پچاس روپے صرف ہوئے تھے لیکن ناشتے چائے وغیرہ کا جو اہتمام اس وقت اس مختصر سی رقم میں ہوا تھا وہ آج پانچ سو روپے میں بھی نہیں ہو سکتا۔ تقریباً دس بجے دن کے سینکڑوں آدمیوں کے ہجوم اور فلک شگاف نعروں کے ساتھ مولانا شوکت علی اس گلی میں داخل ہوئے جو خانقاہ سلیمانیہ سے ہوتی ہوئی ہمارے دوسرے مکان جماعت خانہ تک آتی ہے۔ جب میں نعروں کی آواز سنکر جماعت خانے سے باہر نکل آیا۔ میرے ساتھ بھی عوام اور رضا کاروں کا ایک ہجوم تھا۔ شوق و بیقراری نے مجھے سب سے آگے کر دیا اور میری وجہ سے نہیں بلکہ مولانا کی خاطر ہجوم نے پھٹ کر بیچ میں راستہ بنا دیا اور گلی کے وسط میں میرا ان کا سامنا ہوا۔ ایک بزرگ نے تعارف کرایا اور میں آگے بڑھ کر ان سے بڑے ادب سے جھک کر ملا۔ جھکتے ہی ان کے سیاہ بوٹ پر میری نظر پڑی۔ اتنے لمبے چوڑے آدمی کے بھی پہلی بار میں نے اتنا وسیع و عریض بوٹ دیکھا تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اگر میں [illegible] چھپتا ہوا ان کے بوٹ میں چھپ جاؤں تو مجھے آسانی سے نہیں ڈھونڈا جا سکے گا۔ گاندھی جی ان کی جیب میں اور میں صرف ایک بوٹ میں۔

مولانا "ہجوم مومنین" اور نعروں کے ساتھ جماعت خانے میں داخل ہوئے اور بڑے ہال میں بیٹھ گئے۔ کچھ فرماتے رہے لیکن میں نے کچھ نہیں سنا کیونکہ مجھے دستر خوان کی سجاوٹ کے علاوہ اس کی فکر تھی کہ کہیں کچھ گھٹ نہ جائے۔ مجھے صرف "حصہ بقدرِ جثہ" کی فکر نہ تھی بلکہ یہ فکر تھی کہ معلوم نہیں کتنے لوگ اندر گھس آئیں گے۔ ذرا دیر بعد مولانا کو دوسرے ہال میں ناشتے کے لیے بلایا گیا۔ ان کے ساتھ خوانده اور ناخوانده سب ہی تشریف لے آئے مگر پھر بھی بہت کچھ بچ گیا۔ مولانا کو میں زیادہ غور سے دیکھ رہا تھا۔ اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے کسی "تکلف" سے کام نہیں لیا۔

اس کے بعد پورے ہجوم کے ساتھ نعرے لگاتا اور لگواتا ہوا انہیں بازار کے چوراہے تک لے گیا۔ جہاں سے انہیں رخصت کر کے اطمینان کی سانس لیتا ہوا گھر واپس آگیا۔

دوبارہ میرے گھر پر

۱۹[illegible]ء میں یہ دوبارہ تشریف لائے۔ اب کے بہت زیادہ ہجوم تھا کیونکہ گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد اور سوامی شردھانند وغیرہ بھی ساتھ تھے۔ کچھ دیر خانقاہ سیمابیہ میں بیٹھے رہے اور حضرت قبلہ والد ماجدؒ سے گفتگو کرتے رہے۔ گاندھی جی نے کہا کہ آپ کے بچے انگریزی اسکولوں میں نہیں پڑھ سکتے کیونکہ ہم نے آپ سے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے۔ حضرت قبلہؒ نے فرمایا کہ آپ کے کہنے سے بہت پہلے میں اپنے بچوں کو ہٹا چکا ہوں۔ میرا ایک لڑکا مولانا شاہ غلام حسنین بی اے میں پڑھتا تھا اور دوسرا راقم الحروف میٹرکولیشن میں۔ دونوں نے اپنے کالج اور اسکول چھوڑ دیئے ہیں۔ نیز اپنے ایک دوسرے مکان زجماعت خانے میں ایک ہائی اسکول کھول رہا ہوں۔ اچھا ہے آپ لوگ آگئے ہیں آج ہی اس کا افتتاح کرائے دیتا ہوں۔ اتنے میں چائے کا ایک دور چلا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کتب خانہ دیکھنے لگے اور مجھے ابھی فوراً یاد ہے کہ انہوں نے تفسیر بیضاوی کی شرح [illegible] نکالی اور اسی ہجوم میں کنارے بیٹھ کر دیکھنے لگے۔ ذرا دیر بعد مولانا شوکت علی نے جلدی مچائی اور سب لوگ جماعت خانے کی طرف [illegible] ہوئے۔ حضرت قبلہؒ سب سے آگے ہاتھ میں چابی لئے جا رہے تھے اور مولانا آزاد سب سے پیچھے آرہے تھے۔ جب مولانا دروازے کے قریب آگئے تو حضرت قبلہؒ نے انہی کے ہاتھ میں چابی دی اور فرمایا۔ ذالک بذالک یہ اس کا معاوضہ ہے۔ مولانا سمجھ گئے اور تبسم فرمایا۔ یہ قصہ یوں تھا کہ مولانا آزاد جس زمانے میں رانچی میں نظر بند تھے تو وہاں انہوں نے ایک مدرسہ جاری کیا تھا۔ اور اس کے افتتاح کے لئے حضرت قبلہؒ ہی کو مدعو کیا تھا۔ اس کا قدرت نے آج بدلہ لیا [illegible] اور نیشنل اسکول کا افتتاح مولانا کے ہاتھ سے کرایا گیا۔ یہاں اس وقت بڑا ہجوم تھا۔ ایک تقریر گاندھی جی نے کی اور ایک تقریر مولانا آزاد نے کی۔ [illegible] سال [illegible] کے ایک جلسے میں گاندھی جی نے حضرت قبلہؒ کے گھٹنے پکڑ کر کہا تھا کہ گائے کی قربانی آپ اپنی قوم سے چھڑوا دیجئے کیونکہ اس سے ہندو مسلم منافرت بہت پیدا ہوتی ہے۔ حضرت قبلہؒ نے فرمایا کہ یہ کام میں کرلوں گا اور ایک کام آپ بھی کیجئے اور وہ یہ ہے کہ اپنی قوم سے بت پرستی چھڑوا دیجئے۔ ہندو مسلم میں بڑی وجہ منافرت یہی ہے۔ گاندھی جی نے کہا یہ بہت مشکل ہے۔ حضرت قبلہؒ نے فرمایا مشکل تو یہ بھی ہے۔ اس کے باوجود حضرت قبلہ نے ایک ضخیم رسالہ قربانی گاؤ پر لکھا کہ حصول آزادی اور قیام خلافت کے لیے [illegible] اگر اپنی خوشی سے مسلمان گائے کی قربانی چھوڑ دیں تو کوئی شرعی قباحت نہیں۔ بعض لوگوں نے اس کی بڑی مخالفت کی لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ [illegible] جبراً ترک کرا دیا جائے گا۔ اب وہی حضرات حکومت ہند کی خوشامد میں اور خوف سے ترک فرما چکے ہیں۔

[illegible]

قطب الدین بریہاری، مولانا خلیل داس سیوانی، مولانا نثار احمد صاحب کانپوری، غازی محمود دھرمپال وغیرہ کے طوفانی دورے، مواعظ اور مناظرے ہوتے تھے۔ آخرالذکر کے سوا یہ سب صوفی العقیدہ اور نجدیت کے مخالف تھے۔ ان سبھوں کے ساتھ بے شمار جگہ میرے بھی مواعظ ہوتے رہے ہیں۔ ایک بار تو مجھے سخت حیرت ہوئی؟ اُس کا بازار ضلع گورکھپور میں عظیم الشان جلسہ تھا۔ یہ سارے علما، فضلا اور صوفیہ موجود تھے۔ جمعہ کا دن تھا۔ یہ سب حضرات مسجد کے اندر بیٹھے تھے اور میں باہر صحن کی پچھلی صفوں میں بیٹھا تھا یکایک ایک مولانا رغالباً مولانا قمرالدین دھنگوی) مجمع کو چیرتے ہوئے میرے پاس آئے اور کہا کہ آپ سے جمعہ پڑھانے کی درخواست کی جارہی ہے۔ میں نے عرض کیا آخر میں نے کون ایسا جرم کیا ہے جو مجھے یہ سزا دی جارہی ہے؟ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور سیدھے منبر پر جاکر بٹھا دیا۔ اس وقت علما کی صف میں سامنے ہی مولانا احمد اشرف کچھوچھوی بیٹھے تھے۔ ان کا آبنوسی عصا منبر کے پاس ہی رکھا تھا۔ میں نے بلا اجازت وہ عصا پکڑ لیا اور اذان کے بعد خطبۂ جمعہ شروع کردیا۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کتاب دیکھ کر خطبہ نہیں پڑھا اور نہ کسی کا لکھا ہوا خطبہ پڑھا۔ ہمیشہ مختلف موضوعات پر اپنے ہی تصنیف کردہ خطبات جمعہ زبانی دیتا رہا۔ یہ سارے خطبے عربی ہی میں ہوتے تھے اور کبھی برجستہ جمعہ پڑھانے میں مجھے ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد محسوس ہوا کہ اردو مادری زبان میں خطبہ دینا زیادہ مفید ہے۔ پھلواری شریف کی ہفت صد سالہ تاریخ میں یہ شرف اللہ تعالیٰ نے صرف مجھے بخشا ہے کہ آج تک میں نے کسی دوسرے کا لکھا ہوا خطبہ نہیں پڑھا اور نہ کبھی کتاب دیکھ کر خطبہ دیا۔ برسوں پھلواری کی جامع مسجد میں جمعہ پڑھایا لیکن ہر ہفتہ کو اپنا تصنیف کردہ خطبہ دیا۔ اس کے بعد بڑی بڑی مشکلوں کا سامنا کرنے کے بعد یہ نوبت آئی کہ اردو خطبۂ جمعہ بھی پھلواری میں مقبول ہو گیا۔ مجھے اس میں بڑی تدریج اختیار کرنی پڑی۔ اگر کہیں ابتدا ہی میں اردو خطبہ شروع کرتا تو یقیناً قتل کردیا جاتا۔

"اس کا بازار" کا خطبہ عربی ہی زبان میں تھا۔ اور وہ کچھ ایسا خطبہ ہوا کہ علمائے کرام ہی ہکے بکے رہ گئے۔ نہ جانے کیا کیا دعائیں دیں کیونکہ نہیں اس سے پہلے یہ گمان بالکل نہ تھا کہ کوئی شخص زبانی اور وہ بھی اپنا تصنیف کردہ خطبہ بھی دے سکتا ہے۔

ہاں تو ذکر ہو رہا تھا کانپور کے جلسے کا۔ مولانا محمد علی ہی نے غالباً شاردا ایکٹ کے خلاف تجویز پیش کی۔ اس وقت کسی کی زبان سے "شاردا بل" کا لفظ زبان سے نکلا۔ مولانا محمد علی نے کہا کہ لوگ "بل" کیوں کہتے ہیں؟ ابھی تو ایکٹ ہے۔ اسمبلی میں پاس ہونے اور حکومت کی منظوری دینے کے بعد "بل" ہوگا۔ دوران تقریر میں ایک صاحب نے اٹھ کر سوال کیا کہ یہ قانون پاس ہونے کے بعد اسے بدلے گا کون؟ بس مولانا کو جلال آگیا۔ کہنے لگے۔ یہ کیا سوال ہے کہ بدلے گا کون؟ ارے انہی لوگوں کو بدلنا چاہئیے جنہوں نے پیش کیا ہے اور جو اسے پاس کرانا چاہتے ہیں۔ جو خدا ایک آیت نازل کرتا ہے وہی دوسری آیت سے اسے منسوخ بھی کردیتا ہے۔ جس خدا نے توریت و انجیل بھیجی اسی نے محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو بھیج کر قرآن کے ذریعے اپنی ہی کتابوں کو منسوخ کر دیا۔ مولانا کی تقریر سے واہ واہ اور تالیوں کا اتنا شور ہوا کہ تقریر کے بہت سے الفاظ اسی شور میں دب گئے۔ اور سوال کرنے والے صاحب بھی اپنی جگہ مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔

مولانا محمد علی کی تقریر میں روانی کے علاوہ جو مغز، مواد، جوش، برجستگی، درجہ ربط اور نکتہ آفرینی ہوتی تھی وہ میری نگاہ میں کسی دوسرے کو حاصل نہ ہو سکی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ عملی طور پر تمام قربانیوں میں پیش پیش ہونے کے بعد ایک دور ایسا بھی مسلمانوں پر آیا تھا کہ متحدہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں شریک ہونے اور ثمرہ آزادی حاصل ہونے کے بعد مسلمان قوم اپنے تحفظ کی ضمانت چاہتی تھی۔ مسلمانوں

کے سامنے ایک بہت بڑا خطرہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ آزادیٔ ہند ہمارے لیے صرف آقاؤں کی تبدیلی ثابت ہو۔ انگریز اپنی عقل و سیاست سے حکمرانی کر رہا تھا۔ اور قوموں کو پھاڑ کر اپنی چودھراہٹ قائم کئے ہوئے تھا۔ لیکن اس کے جانے کے بعد غالب اکثریت رکھنے والی ہندو قوم اپنی اکثریت کے بل بوتے پر ہمیشہ حکومت کرے گی اور بد قسمتی سے یہ اس قدر تنگ دل اور متعصب واقع ہوئی ہے کہ اس سے مسلمانوں کے محفوظ رہنے کی توقع نہیں۔ سوامی شردھانند کی تحریک نے ہندوؤں میں مسلمان دشمنی کی کافی تخم ریزی کر دی تھی اور علانیہ یہ کہا جاتا تھا کہ مسلمانوں کو ہندوستان سے اس طرح ختم کر دیا جائے گا جس طرح ہسپانیہ سے ختم کیا گیا۔ جب ”مورے مولا بلالے مدینے مجھے“ کا ریکارڈ بجتا تھا تو کہا جاتا تھا کہ لو اب مسلمان ہندوستان سے چلے۔ انتہا یہ کہ ایک دریدہ دہن یہ بھی بولا تھا کہ ہم کعبے پر اوم کا جھنڈا گاڑیں گے۔ لیکن یہ تمام باتیں اتنی مضر نہ تھیں بلکہ مسلمانوں کو ہوشیار و بیدار کر رہی تھیں۔ انتہائی خطرناک گاندھی جی کی وہ میٹھی مگر زہر آلود پالیسی تھی جو مسلمانوں کو سلا سلا کر کامل غفلت میں رکھنا چاہتی تھی۔ وہ ”بلینک چیک“ تو دینے پر آمادہ تھے لیکن تحفظ کی کوئی ضمانت دینے کو کبھی تیار نہ تھے۔ وائٹ پیپر میں اچھوتوں کو جداگانہ نمائندگی دی جانے لگی تو گاندھی صاحب نے مرن برت شروع کر دیا اور چھ دن تک فاقے کر کر کے نڈھال ہو گئے لیکن مسلمانوں کے تحفظ کے لیے انہوں نے کبھی ایک گھنٹے کا بھی مرن برت نہ رکھا۔ قائداعظم محمد علی جناح چودہ سال کانگریس میں رہے اور وہاں ان کی پوجا ہوتی تھی۔ انہوں نے ان کے اندر ڈوب کر ہندو ذہنیت کا جائزہ لیا اور آخر کار اس نتیجے پر پہنچے کہ اس قوم سے امید وفا نہیں اس کی تنگ دلی کبھی دور نہیں کی جا سکتی اور اس کے وعدوں پر اعتبار کرنا ایک فریب ہے۔ وہ شروع ہی سے ان تمام باتوں کو محسوس کر رہے تھے اور آخر انہوں نے چودہ نکات قلمبند کئے۔ جو کسی قوم کے تحفظ کی مکمل ضمانت تھے۔ محمد علی جناح نے اسے مرتب کیا اور محمد علی جوہر نے اسے اجلاس لکھنؤ میں پیش کیا۔ سب کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کی یہ پیش کش ٹھکرا دی گئی اور ٹھکرانے والوں میں سب سے زیادہ فراخدل ہندو پنڈت موتی لال نہرو ہی تھے۔

اس موقع پر ہم دو شخصیتوں کو فراموش نہیں کر سکتے۔ ایک سبھاش چندر بوس اور دوسرے راجگوپال اچاریہ۔ یہ دونوں مسلمان قوم کے حق میں نسبتاً فراخ دل رہے ہیں۔ بوس کا کہنا تھا کہ مسلمان ۳۳ ٪ حقوق مانگتے ہیں انہیں پچاس فیصد دے دو۔ آخر وہ بھی تمہارے ہی دیس کے ہیں۔ انہیں یہاں مطمئن کر دو گے تو پھر یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے حقوق کے لیے کوئی بیرونی امداد افغانستان وغیرہ سے لیں گے۔ بوس کی اس فراخ دلی کی سزا انہیں یہ ملی کہ وہ بیک بینی و دو گوش کانگریس سے نکال دیئے گئے۔ یہی حال اچاریہ کا ہوا۔ انہوں نے ایک مختلف فارمولے سے تقسیم ہند کی سب سے پہلے تائید کی تو انہیں بھی کانگریس سے بے دخل کر دیا گیا۔ ہمیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ اخراج کس بااثر شخصیت کے ایما سے ہوا۔

ایسے ایسے بیسیوں واقعات ہیں جن کی وجہ سے ہندو اکثریت سے سوئے ظن پیدا کرنے میں مسلمان حق بجانب تھے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ قیام پاکستان میں اس قوم کی تنگدلی کو زیادہ دخل ہے۔ اگر ہندو قوم فراخدل ہوتی تو پاکستان کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ مصر کی جنگ آزادی میں بھی انگریزوں نے مصریوں کو پھاڑنا چاہا تھا۔ ان کے اشارے سے وہاں کے عیسائیوں نے سعد زغلول پاشا کے سامنے اپنا مطالبہ پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم اس وقت تک جنگ آزادی میں شرکت نہیں کریں گے جب تک ہمارے تناسب آبادی کے مطابق ہمیں سات فیصد حقوق کے تحفظ کی ضمانت نہ دے دی جائے۔ زغلول نے کاغذ منگوایا اور ان کی توقع اور مطالبے سے کہیں زیادہ یعنی دس فیصد حقوق کا ضمانت نامہ لکھ کر دے دیا۔ اس کے بعد وہ عیسائی کیا کہہ سکتے تھے؟ وہ خوش خوش واپس چلے گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ہل چلاتے ہوئے شخص کے پاس انگریز بہکانے کے لیے جاتے تو وہ یہ دو ٹوک جواب دے دیتا تھا کہ ہم زغلول پاشا

کے ساتھ ہیں۔ — لیکن متحدہ ہندوستان میں یہ معاملہ تھا کہ تحفظ حقوق کا کوئی معاہدہ نہ کرو بلینک چیک لے لو تفصیلات کا فیصلہ آزادی ملنے کے بعد کیا جائے گا۔ گویا ضمانت تینتیس فیصد کی تو الگ رہی ایک فیصد کی بھی نہیں دی جائے گی۔

اس وقت مسلمانوں میں دو گروہ تھے۔ بڑے بڑے کانگریسی علماء کا فتویٰ تھا کہ ہندوؤں سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ حقوق کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔ اس وقت تو آزادی حاصل کر لو۔ لیکن مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی تحریروں کے بعد کانگریسی کارپردازوں کے اس فیصلے کے خلاف تھے۔ کمال یہ کہ لوگوں نے علی برادران کو "ٹوڈی بچہ" کہنا شروع کر دیا تھا۔ اس کا جواب ایک جلسے میں شوکت علی نے یہ دیا تھا کہ ہم ٹوڈی بچے ہیں تو تم "دھوتی بچے" ہو۔

اسی اثنا میں امروہہ میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس کے مقابلہ میں وہیں اور انہی تاریخوں میں کانگریسی علماء نے بھی اپنا ایک جلسہ کیا تھا۔ جن لوگوں نے ان دونوں جلسوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ان سے پوچھ لیجئے کہ کانگریسیوں کے جلسے کی کتنی حاضری تھی اور ادھر مسلمانوں کے جلسے میں جہاں بڑے بڑے لیڈر اور علماء مشائخ تھے وہاں مولانا محمد علی جوہر کی بھاری بھرکم شخصیت سبھوں پر چھائی ہوئی تھی۔ اس جلسے میں مولانا نے جو تقریر کی بہت دن کبھی دلوں سے محو نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ اس نے ایک مسئلے کا ہمیشہ کے لئے ایک فیصلہ ہی کر دیا تھا۔ مولانا اپنی تقریر کے دوران اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر علماء مشائخ لیڈر اور پوری قوم کی طرف مخاطب ہوتے اور ایک سوال کیا۔

> اگر ہم مسلمان ہیں تو کیا ہمیں ہر معاملے میں اسوۂ محمدی کا اتباع نہیں کرنا چاہیے؟ کیا قرآن نے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ اسی لئے نہیں کہا تھا کہ ہم دینی، معاشرتی، سیاسی، معاشی ہر معاملے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل کو اختیار کریں؟ میں صرف سوال نہیں کرنا چاہتا بلکہ واضح لفظوں میں اس کا اثبات میں اس کا جواب چاہتا ہوں۔

ہر طرف سے تائید میں ایک شور ہوا کہ بے شک اسوۂ محمدی کا اتباع ضروری ہے۔ لیکن مولانا کیا کہنا چاہتے تھے اس کی طرف کسی کا ذہن بھی نہیں گیا تھا۔ ہر طرف سے واضح تائید اور جواب ملنے کے بعد انہوں نے نہیں بلکہ عشق و محبت نے قوم و ملت اپنی پوری قوت کے ساتھ تاریخ اسلامی کی یہ فراموش کردہ حقیقت سامنے لا کر رکھ دی اور پوچھا کہ:

کیا پوری سیرت محمدی میں کوئی ایک نظیر بھی ایسی ملتی ہے کہ حضور نے کسی قوم سے کوئی اتحاد عمل فرمایا ہو جب تک پہلے تحریری معاہدہ نہ فرما لیا ہو۔ یہ بجلی تھی جو گویا ایسا سوال تھا جس نے پورے مجمع پر سناٹا طاری کر دیا۔ اذہان میں جلد جلد تاریخ کے ورق الٹنے لگے۔ یہود مدینہ کے معاہدے سے لے کر صلح حدیبیہ تک کے سارے تحریری معاہدے ایک ایک کر کے سامنے آ گئے۔ لیکن ایک مثال بھی ایسی نظر نہ آئی کہ حضور نے کسی غیر مسلم قوم کے صرف لیڈر کے زبانی وعدے پر اعتماد کر کے اتحاد عمل فرمایا ہو۔ چند سیکنڈ تک اس سوال کے جواب میں دماغوں نے پوری تاریخ اسلامی کو ٹٹول لیا اور نفی میں جواب پانے کے بعد مدہوش سکوت کا طلسم دفعتہً ٹوٹا اور دیر تک سارا مجمع اس طرح تحسین و آفرین کی صدائیں بلند کرتا رہا کہ جوہر کے لیے اپنا مزید مطلب پیش کرنا مشکل ہو گیا۔ مولانا محمد علی کی اس نکتہ رسی کا کوئی شافی جواب آج تک نہ مل سکا اور یہ پہلا دن تھا جب کہ مسلم لیگ کے آئندہ پیش آنے والے موقف میں نئی روح پھونکنے کے لیے ایک لازوال مواد مہیا ہو گیا۔

مولانا محمد علی کی ہر تقریر میں اسی طرح ایسے ایسے نکات ہوتے تھے جو پہلے سننے میں نہ آئے تھے۔ میرے ایک محترم بھائی حافظ

نتیجے میں ابن سعود حجاز پر چڑھ دوڑے۔ شریف حسین وہاں سے بھاگا اور اپنی بقیہ عمر انگریزوں کی قید میں بمقام جزیرہ قبرص گزاری۔ سعودیوں نے حجاز پر تسلط حاصل کرتے ہی اپنے بعض عقائد کا کچھ ایسا عملی مظاہرہ کیا جس سے دنیا کی کثیر "خوش عقیدہ" آبادی میں آگ سی لگ گئی۔ ایک گروہ کو صرف اس لئے ابن سعود سے اختلاف تھا کہ اس نے مزارات کیوں کھدوائے اور قبے کیوں تڑوائے۔ میرا شمار بھی اسی وقت اس گروہ میں تھا۔ ان ایام میں قبروں کے پختہ کرنے اور ان پر کوئی عمارت بنانے کے متعلق بڑی زبردست بحثیں اخباروں میں چلتی رہیں۔ اس سلسلے میں میری کتابیں تلقین حق، اثبات حق اور باطل شکن بہت مشہور ہوئیں۔ مورخانہ کتاب نے تو اس سلسلے کی تمام کتابوں میں اولین مقام حاصل کیا بہت سے مضامین مختلف اخباروں میں شائع ہوئے۔ ایک مضمون خاص طور پر مرکز توجہ بنا اس کا عنوان تھا شجرۃ الرضوان۔ اس میں یہ ثابت کیا تھا کہ طبقات ابن سعد کی یہ روایت بالکل غلط ہے کہ سیدنا عمر بن خطاب نے وہ درخت کٹوا دیا تھا جس کے سائے میں بیٹھ کر چودہ سو مہاجرین و انصار نے حضور سے بیعت کی تھی۔ بخاری کی روایت کے مطابق وہ درخت دوسرے ہی سال سیلاب سے یا کسی وجہ سے غائب ہو گیا تھا۔ البتہ حضرت عمرؓ نے وہ درخت کٹوا دیا تھا جو دراصل جعلی تھا اور لوگوں نے اسے خواہ مخواہ شجرۃ الرضوان فرض کر لیا۔ یہ مضمون پہلے پھلواری شریف کے نیم روزہ اخبار غریب نواز میں شائع ہوا تھا۔ اس سے لے کر ہفت روزہ "سچ" (جو بعد میں اب صدق جدید ہے) نے شائع کیا۔ پھر بہت سے اخباروں نے اسے نقل کر کے شائع کیا۔

دوسرا گروہ وہ تھا جسے ابن سعود سے اس لئے اختلاف تھا کہ وہ اسے انگریزوں کا پٹھو سمجھتا تھا۔ مولانا حسرت موہانی اسی گروہ کے سربراہ تھے اور آخر تک اس موقف پر قائم رہے۔ حسرت موہانی عجیب شخصیت کے مالک تھے ان کے نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مادر گیتی کا کوئی فرزند ایسا نہیں جو حسرت کے خلوص سے انکار کر سکے۔ حسرت نے کبھی قوم کا ایک پیسہ بھی غبن نہیں کیا۔ ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کرتے اور اپنا اسباب خود ہی اٹھا کر چلتے۔ حجاز کانفرنس کے ایک جلسے کی صدارت استقبالیہ کی۔ لکھنؤ سے انہیں سو روپے کرایہ آمد و رفت خطبہ صدارت اور زاد راہ کے لئے بھیجا گیا۔ انہوں نے چوبیس روپے کچھ آنے کا حساب لکھ کر باقی رقم واپس کر دی۔ اخراجات میں چارباغ اسٹیشن سے امین آباد تک کا ٹم ٹم کا کرایہ پانچ پیسے بھی درج تھا۔ ایک بار میں اور مولانا حسرت کانپور سے لکھنؤ روانہ ہوئے۔ لکھنؤ پہنچ کر سواری ملنے میں دشواری محسوس ہوئی تو کہنے لگے اسباب نہ میرے پاس ہے نہ آپ کے پاس۔ چلئے پھر ٹہلتے ہوئے چلیں۔ میں تیار ہو گیا اور دونوں روانہ ہوئے۔ مولانا نے اپنی چھتری کھولی اور اس کا زیادہ حصہ مجھ پر سایہ فگن کر دیا۔ میں نے عرض کیا کہ یا تو آپ مجھے چھتری دے دیں کہ میں آپ کو لگاؤں یا پھر مجھ سے الگ ہو کر چلئے۔ مگر اس اللہ کے بندے نے ایک نہ سنی۔ خادموں اور مریدوں کی طرح اسٹیشن سے قیصر باغ تک مجھ پر چھتری تانے چلے آئے اور مجھے گھر پہنچا کر خود راجہ صاحب محمود آباد کے ہاں چلے گئے۔ یہ میری زندگی کا وہ واقعہ ہے جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کتنا بے نفس انسان ہے۔ ایسے شخص کے خلوص میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اور یہ جامع الاضداد دی تو آج تک سمجھ میں نہیں آسکی کہ ایک طرف تو وہ نظری لحاظ سے کمیونسٹ تھے۔ اور دوسری طرف بعض قیدیوں کو یا شیخ عبدالقادر شیئاً للہ کا وظیفہ بھی بتاتے تھے اور خود تہجد گزار بھی تھے۔ اپنی دھن کے جیسے پکے تھے اس کی تفصیلات کے لئے ایک دفتر چاہئے۔

بہرحال یہ نجدیوں کے سخت مخالف تھے زیادہ تر اس لئے کہ وہ ابن سعود کو انگریزوں کا پٹھو سمجھتے تھے اور کچھ اس لئے کہ مزارات کھودنے اور قبے توڑنے کے بھی مخالف تھے۔

مولانا محمد علی جوہر ابتدا میں نجدیوں کے حامی تھے اور اس کی دو بڑی وجہیں تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ شریف حسین کی غداری سے سخت نالاں تھے

کہ ابن سعود ان کو اس کے مقابلے میں غنیمت معلوم ہوا۔ دوسرے اس لیے کہ ابن سعود نے ابتدا میں ایک "موتمر" کا اعلان کیا تھا اور اس اعلان سے یہ توقع تھی کہ حجاز کا نظام حکومت جمہوری انداز کا ہوگا۔ اور غالباً دنیا کے بیشتر ممالک کو اس میں نمائندگی حاصل ہوگی۔ مولانا محمد علی بڑی شدت سے سعودی حکومت کے حامی تھے اور اس اخلاص میں بعض اوقات حدود سے بھی متجاوز ہو گئے تھے۔ چنانچہ سیتا پور کی ایک تقریر میں وہ بولے تھے کہ: مولانا عبد الباری (فرنگی محلی) ڈھولک بجاتے ہیں اور شاہ سلیمان (پھلواروی) ناچتے ہیں"۔ مجھے اس وقت بڑا طیش آیا تھا اس لیے کہ انہوں نے نہ اپنے پیر و مرشد (مولانا عبد الباری) کو چھوڑا نہ میرے پیر و مرشد (شاہ سلیمان) کو۔ میں نے اٹاوے کی ایک تقریر میں جس کے صدر مولانا حسرت موہانی تھے مولانا محمد علی جوہر کے خلاف بڑی تیز و تند تقریر کی۔ مولانا حسرت نے اپنی تقریر میں مجھے سمجھایا کہ مولانا محمد علی کی زبان سے یہ جملہ ضرور نکلا ہے لیکن ان کی نسبت کے بارے میں نیک گمان رکھنا چاہیئے۔ بعد میں مولانا حسرت موہانی کی بات کی تصدیق بھی ہو گئی۔

وہ اس طرح کہ ایک طرف تو جناب شعیب قریشی اور مولانا محمد علی نے حجاز سے لوٹ کر ابن سعود کے خلاف رپورٹ دی اور ابن سعود اور نجدیوں کے سخت مخالف ہو گئے دوسرے اعلان موتمر کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد ابن سعود نے ملوکیت کا اعلان کر دیا۔ ان دو باتوں کے بعد مولانا محمد علی کا پارہ چڑھ گیا۔ اور پہلے جس قدر ابن سعود کے حامی تھے اسی قدر اس کے مخالف ہو گئے

یہاں ایک بات قابل ذکر ہے۔ جس زمانے میں سارے خوش عقیدہ ہندوستانی مسلمانوں میں ابن سعود کے خلاف ایک تحریک اٹھی ہوئی تھی اس وقت بھی مولانا محمد علی جوہر، قوم کی مخالفت سے بالکل بے پروا تھے اور ان کی یہ ایمانی جرأت بلاشبہ قابل قدر تھی۔ اسی دوران میں پھلواری شریف کے اخبار غریب نواز نے ایک عجیب اداریہ لکھ کر مولانا محمد علی کو ان کی ایک تقریر کی طرف متوجہ کیا تھا۔ یہ تقریر انہوں نے کراچی کی خلافت کانفرنس ۱۹۲۱ء میں کی تھی اور تمام اخباروں میں شائع ہو چکی تھی۔ اس میں مولانا نے یہ انکشاف کیا تھا کہ

> انگریزوں کی سیاسی پالیسی بڑی دور رس ہے اور "تفریق پیدا کر کے حکومت کرو" کے اصول پر مبنی ہے۔ پہلے تو انہوں نے شریف حسین کو رشوت دے کر ترکوں کے خلاف ابھارا لیکن ان کی پیش بندی دیکھیے کہ وہ شاہ نجد ابن سعود کو بھی محض اس لیے پچھتر ہزار روپے کا وظیفہ دے رہے ہیں کہ اگر کسی وقت شریف حسین انگریزی معاہدہ پورے نہ ہونے کی وجہ سے بغاوت کرے تو فوراً ابن سعود کو اشارہ کر دیں اور وہ اس پر چڑھ دوڑے۔

مولانا محمد علی کی معلومات، خبر اور سیاسی بصیرت کا اس تقریر سے اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ چار سال بعد حرف بحرف مشہود ہو گیا۔ لیکن خدا جانے کیوں مولانا کو اپنا بیان یاد نہ رہا؟ میرا خیال ہے کہ مولانا کو یہ حقیقت بھول نہیں تھی لیکن وہ اس لیے خاموش رہے کہ مولانا کو ابن سعود کو شریف حسین سے بہتر سمجھتے تھے۔ دوسرے ان کا خیال تھا کہ یہ ملوکیت کی بجائے جمہوری حکومت ہوگی لیکن جب ابن سعود نے ملوکیت کا اعلان کیا اور جناب شعیب قریشی کی بھی رپورٹ بھی مل گئی تو مولانا ابن سعود کے سخت مخالف ہو گئے اور انہوں نے اس کی کوئی پروا نہ کی کہ لوگ یہ طعنہ دیں گے کہ کل کچھ کہہ رہے تھے اور آج کچھ کہنے لگے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی موافقت بھی خلوص پر مبنی تھی اور مخالفت بھی اخلاص ہی کی بنا پر تھی۔

اس دوران میں دو واقعے اور بھی ہوئے اور دونوں موقعوں پر مولانا محمد علی سے میری ملاقات بھی ہوئی۔ ایک تو یہ کہ علماء اور

مولانا سید سلیمان ندوی اگرچہ ابن سعود کے حامیوں میں تھے۔ لیکن اس جلسے میں شریک تھے۔ مولانا محمد علی بھی اپنے بدلتے ہوئے تصورات کے مانند شریک اجلاس تھے۔ یہ حجاز سے لوٹ کر آئے تھے۔ اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر باہر آئے تھے۔ اور ابن سعود کو تبلیغ کی بڑی جرأت کے ساتھ منا آئے تھے۔ حجاز کانفرنس میں انہوں نے بھی تقریر کی جس میں جب لے انہیں رو تے ہوئے بھی دیکھا۔ اس تقریر میں انہوں نے وہ سب کچھ کہہ دیا جسے چھپایا کر دیا جو وہ اپنی آنکھوں سے حجاز میں دیکھ کر آئے تھے۔ مقدس مزاروں قبروں اور شکستہ قبوں کے علاوہ انہوں نے ابن سعود کی سیاسی غلطیاں بھی بتائیں۔ خلافت تحریک اور اس کے بعد کے زمانے میں میں نے مولانا کی بہت سی تقریریں سنی تھیں۔ خلافت کانفرنس میں انہوں نے سات گھنٹے تقریر کی تھی جس میں سیاسی اور علمی معلومات کا سمندر بہتا تھا۔ اس کے علاوہ خطابت کے جوہر دکھتے تھے۔ لطائف، فصاحت بیان، اور ادبی لطافتیں ایسی تھیں کہ جواب نہ تھا۔ اشعار تو وہ ایسا برمحل پڑھتے تھے کہ گویا شاعر نے ٹھیک اسی موقع کے لئے کہے ہیں۔ خلافت کانفرنس لکھنؤ میں وہ انگریزوں کی چالاکیاں بیان کرتے ہوئے نہایت برمحل غالب کا یہ شعر پڑھا تھا کہ

ہو چاہ تو نظر سے اٹھایا جو کا   کیوں کر سمجھوں کہ اس میں تلوار نہیں

آل مسلم پارٹیز کانفرنس منعقدہ امرتسر ۱۹۲۹ء میں میں بھی شریک تھا۔ شریف حسین نے اپنے بیٹے کی طرف سے ایک وفد طاہر الدباغ کی سرکردگی میں بھیجا تھا جو اس کانفرنس کے موقع پر امرتسر میں موجود تھا۔ مولانا محمد علی نے ان سے ملاقات کی تھی۔ اثنائے گفتگو میں کہیں مولانا ان سے پوچھ بیٹھے کہ آپ کو پارلیمنٹ کے قواعد و اصول بھی معلوم ہیں؟ دباغ صاحب نے جوش میں آ کر بغیر ہی پوچھا کہ آپ کس جگہ کی پارلیمنٹ کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں؟ اس کے بعد دباغ نے انگلستان، امریکہ، فرانس اور خدا جانے کہاں کہاں کے اصول و قواعد بتانے شروع کئے۔ مولانا ان کی گفتگو اور وسیع معلومات سن سن کر حیران ہو رہے تھے اور وہ جب اٹھے تو یہ اعتراف کر کے اٹھے کہ میں نے آج پہلی مرتبہ اتنا وسیع المعلومات عرب دیکھا ہے۔

اس کانفرنس کے کرتا دھرتا تین آدمی تھے میر غلام بھیک نیرنگ، مولانا عبد الماجد بدایونی اور ڈاکٹر کچلو۔ تمام فرقوں اور تمام سیاسی پارٹیوں کے لوگ اس میں شریک تھے۔ علی برادران بھی شریک تھے۔ مولانا شوکت علی اور میر غلام بھیک نیرنگ میں کچھ نوک جھونک بھی ہوئی۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ علی برادران کے ایک سگے بھائی ذوالفقار علی صاحب بھی موجود تھے۔ یہ قادیانی تھے اور یہ علی برادران کی طرح مشہور نہ تھے ڈیل ڈول سے تو واقعی یہ علی برادران کے بھائی ہی نظر آتے تھے لیکن تصورات میں آسمان و زمین کا فرق تھا۔ مولانا محمد علی نے اپنی تقریر میں ان پر بھی ہاتھ صاف کیا اور یہ کہا تھا کہ یہ ہیں میرے بھائی مگر میں انہیں بالکل گمراہ سمجھتا ہوں۔

پہلے یا دوسرے اجلاس کے بعد میں باہر آیا، میرے ساتھ مولانا صبغۃ اللہ شہید فرنگی محلی تھے۔ باہر نکلے تو دیکھا کہ مولانا محمد علی موٹر پر بیٹھے ہیں اور بہت سے لوگ انہیں گھیرے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں نے بھی دیکھا۔ کے بعد انہوں نے پوچھا کہ آپ لوگ کدھر جا رہے ہیں۔ مولانا صبغۃ اللہ نے کہا نماز عصر ادا کرنے۔ مولانا محمد علی نے اس وقت ایک شعر پڑھا جو مجھے اب تک یاد ہے۔ شعر یہ تھا:

نماز آتی ہے مجھ کو نہ وضو آتا ہے   سجدہ کر لیتا ہوں جب سامنے تو آتا ہے

مولانا محمد علی خود بہت اچھے شاعر تھے۔ مشکل ہی سے کوئی ایسا آدمی دکھائی دے گا جو مولانا جیسا جامع الصفات ہو۔ تقریر و تحریر، نظم و نثر، انگریزی اور اردو اور فارسی، مذہب اور سیاست غرض ہر لحاظ سے وہ یکساں قابلیت رکھتے تھے۔ اس دور میں متحدہ ہندوستان کے تین آدمی ایسے

عرشی امرتسری

محمد علی کی نذر

"کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو"

نصف صدی پہلے کا ہندوستان

جون کے سائے ہیں، قلم کاغذ ہاتھ میں لیے چارپائی بچھائے ہوئے بیٹھا ہوں۔ پاس ہی رہٹ چل رہا ہے۔ اردگرد گیہوں کے کھیت ہیں، کاشتکار بیلوں کو ہانک رہے ہیں اور حقہ بھی پیے جا رہا ہے۔ خوش گوار ہوا جسم کو سہلاتے ہوئے چلی جا رہی ہے۔ آنکھیں اس صحت اور سکون بخش منظر کو دیکھ رہی ہیں۔ لیکن خیال اپنی غیر مادی رفتار سے انھی لمبے چوڑے وسیع و بسیط میدانوں میں گھوم رہا ہے —— جسم یہاں ہے اور خیال کہاں۔ ان دونوں کا یہ نہایت بعد، یہ انتہائی اتصال بیک وقت ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں آج تقریباً نصف صدی پیچھے مڑ کر [illegible] کے ایک ہنگامۂ گرم کے نظارے میں محو ہیں۔ غیر منقسم ہندوستان ایک عظیم و ضخیم ہیجان و بحران میں گزر رہا ہے۔ راعی رعایا کے تعلقات میں کشیدگی نے ہر طرف نفرت کے بادل چھا رکھے ہیں۔ ہنگامے تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے ہیں۔ آتشیں تقریریں دھڑلے سے کی جا رہی ہیں۔ جلوس نکلتے ہیں۔ گرفتاریاں ہوتی ہیں۔ [illegible] مجرموں سے بھی زیادہ مورد عتاب ہو کر حکومت وقت کی عدالتوں میں پیش ہوتے ہیں۔ در قید و بند کی سزائیں سن کر زنداں [illegible] میں [illegible] کے لیے محبوس ہو جاتے ہیں۔ پھر جب اپنی مدت [illegible] ختم کر کے چھوٹی جیل سے وسیع ملکی جیل خانے میں منتقل ہوتے ہیں تو اسی جرم کا پہلے سے زیادہ جوش کے ساتھ اعادہ کرتے ہیں جس کی وجہ سے دار و رسن کا امتحان دے گزرے تھے۔

خوگر [illegible] سے ہے صرف محتسب!
[illegible] اور [illegible] سزا کے بعد

ملک کے ہر گوشے میں دار و گیر کی آندھیاں چل رہی ہیں۔ کل زید کی گرفتاری کی خبر آئی تھی تو آج بکر کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں۔ ایک رہا ہوتا ہے تو چار ماخوذ ہو جاتے ہیں۔ ایسی کشاکش و وادی سے گزرتے ہوئے خیال کا مسافر ۱۹۱۹ء کے آخری مہینے میں جا پہنچتا ہے۔ دسمبر ختم ہونے کو ہے، انڈین نیشنل کانگریس کا جلسہ زیر [illegible] امرتسر میں منعقد ہو رہا ہے۔ عین اس وقت علی برادران کی رہائی کی خبر بجلی کی سی سرعت سے ملک بھر میں پھیل جاتی ہے۔ "جعفر و صادق" کی قسم کے غدار کاسہ لیسوں کے سوا ہر قریہ و شہر میں دلوں کے پیمانے مسرت کے شربت سے چھلک [illegible]

ہیں جیسے سورج کے سامنے ستارے ناپید۔ امرتسر کا عروج و زیبائی تمام امصار و بلاد میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے براتیوں میں نوشہ۔ شمع حریت کے پروانے ہزارہا میل کے فاصلے طے کر کے عاشقانہ بے تابیوں سے لبریز دلوں کے ساتھ یہاں پہنچ رہے ہیں۔

علی برادران

بشری فطرت کا عام تقاضا تو یہ تھا کہ اہل و عیال سے برسوں جدا رہنے کے بعد رہا ہوتے ہی اپنے پیاروں کا منہ دیکھنے کے لیے بیتاب ہو جاتے اور وطن کا رخ کرتے۔ لیکن نہیں بلند الشان کے بلند نصب العین اس کی مہلت کہاں دیتے ہیں۔ علی برادران چھندواڑہ جیل سے نکلتے ہی ہزار بارہ سو میل کا سفر کر کے سیدھے امرتسر پہنچے۔ کانگریس کے اجلاس میں ان کی شرکت گویا دس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی شرکت تھی۔ کانگریس کے پنڈال میں دونوں بھائی نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے داخل ہوئے۔ تو ان کے پیچھے پیچھے عقیدت مندوں کا ایک بڑا لشکر بھی تھا۔ "یا علی" کے نعروں کی گونج عالم میں پھیل رہی تھی۔ ("علی" دونوں بھائیوں کے نام کا جزو اہم ہے)

جلیانوالہ امرتسر

جلیانوالہ باغ جو صفحات تاریخ میں انگریزی مظالم کی [illegible] اور سیاہ کاریوں پر آخری مہر ثابت ہوا، مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔ ملک کے دور دراز گوشوں سے مختلف [illegible] بولنے والے مشتاقان دید ہجوم در ہجوم اس کی طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں۔ اندر داخل ہونے کا تنگ راستہ بہت تنگ ثابت ہو رہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین نے اپنے خزانے اگل دیے ہیں۔ گذشتہ و موجودہ تمام [illegible] میں محشور ہو رہے ہیں۔ ہجوم کے وسط میں دو سر سب مردوں سے اونچے دکھائی دے رہے ہیں۔ چہروں پر اسلامیت کا وقار اور عزم و وجاہت کا نور جھلک رہا ہے۔ دور سے دیکھنے والے کو بے حد و شمار پیادہ مخلوقات میں دو گھوڑ سوار نرم رفتار سے بھیڑ کو چیرتے آگے بڑھتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ قریب پہنچنے پر دیکھا کہ قامت کی بلندی نے گھوڑے کی سواری کا منظر پیدا کر دیا تھا۔ یہ تھے مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی، بڑے بھائی جو [illegible] سب سے زیادہ بلند تھے۔

اس رہائی کے موقع پر شاعر مشرق (اقبال) کا دل نور مسرت سے چمک اٹھا۔ اس چمک کی چند کرنیں چند لازوال اشعار کی صورت میں نمودار ہوئی ہیں:-

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند — اقبال

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند — حافظ

حضرت جوہر تو ان کی لفظ آرائیوں سے آگے بڑھ کر حال کے معرکے میں مردانہ سبقت کر رہے تھے۔

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

ان کا نصب العین بن چکا تھا، اقبال کے اعتراف کمال کے باوجود جوہر کی مجاہدانہ روح ان کی گوشہ گیری اور راحت پسندی پر معترض ہوئی۔ وہ اس اعتراض کی تردید تو کیا کرتے، ان کی دیانت نے اس کی صحت کے اعتراف میں کبھی جھجک محسوس نہ کی۔

"وہ اک مرد تن آساں تھا، تن آساں کے کام آیا"

ــہ

تخم کہ دارے ز خاک ما نہ زاد"

یہ اعتراف بھی تو اس "بے عملی" انسان کا ایک عمل ہی ہے، پھر اس کی "بے عملی" نے اپنی جگر گداز نواؤں سے جتنے باعمل انسان پیدا کیے دنیا کے کسی ایک شاعر کو بھی وہ نصیب نہ ہو سکے۔ اس کا اعتراف خود علی برادران نے بھی کیا کہ ان کے اسلام میں ابوالکلام کی نثر اور اقبال کی نظم کا بڑا حصہ ہے۔

یہ وہ وقت تھا جب ساری مسلم قوم کے افکار و عزائم کی باگ تنہا محمد علی کی مٹھی میں تھی۔ جدھر چاہتے موڑ دیتے کانگرس میں تھے تو مسلمانوں کا اوڑھنا بچھونا کانگرس تھی، گاندھی جی ان کو اپنے قومی قائد معلوم ہوتے تھے، کانگرس کے رازدروں سے آگاہ ہو کر اس بھری بزم سے الگ ہوئے۔ تو مسلم اکثریت کو ساتھ لے کر اپنا الگ محاذ قائم کیا، غلطی پر مطلع ہو جانے کے بعد اس پر جمے رہنا محمد علی کی فطرت کے خلاف تھا۔ جس خلوص اور عزم و جرأت سے وہ کانگرس اور گاندھی جی کے حامی تھے، اسی دلیری سے اس کی مخالفت میں ڈٹ گئے۔ لیکن مشترکہ نصب العین (حصولِ آزادی) سے آخر دم ایک لمحے کے لیے بھی دست کش نہیں ہوئے۔

اینی بیسنٹ، گاندھی، جناح۔

حافظے کے پرانے کباڑ خانے سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ٹوٹی پھوٹی اور گھسی مٹی ہوئی چیزیں نکال رہا ہوں۔ اوپر کانگرس کے جس اجلاس منعقدہ امرت سر دسمبر ۱۹۱۹ء کا ذکر ہوا۔ اسی موقع پر خلافت کانفرنس اور مسلم لیگ کے اجلاس بھی ہوئے۔ انہی مختلف اجلاسوں میں بڑے بڑے لیڈروں کے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ جن کے نام آج تاریخ کی زینت بن چکے ہیں۔ تھیوسوفی کل سوسائٹی (کلکتہ) کی بانی اور صدر مسز اینی بیسنٹ کو دیکھا اور سنا تھا، بڑھاپے میں جوانی کے جوش کے ساتھ بولتی تھیں۔ ان کا قد طول میں کم اور عرض میں زیادہ آج بھی چشم تصور کے سامنے ہے۔ گاندھی جی اس زمانے میں تمام اقوام ہند کے قائد مانے جاتے تھے۔ کرسی پر بیٹھ کر چادر اوڑھے ہوئے بے تکلفانہ سیدھی سادی اردو میں تقریر کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دور و نزدیک ان کی آواز یکساں پہنچ رہی ہے۔ مقررانہ کرتب، دست و بازو کی جنبش، آواز کا اتار چڑھاؤ، جوش و جذبات کا اظہار وغیرہ تصنع کی کوئی علامت نظر نہیں آ رہی تھی ــــ قائد اعظم جو ان دنوں صرف مسٹر جناح یا محمد علی جناح تھے اپنا دبلا پتلا لانبا قد لیے ہوئے اسٹیج پر نمودار ہوئے۔ اور نہایت رواں دواں انگریزی میں تقریر کی۔ مولانا حسرت موہانی کو بھی (شاید)

اب یاد نہیں ان بزرگ ہستیوں کے علاوہ کس کس کو دیکھا اور کس کس کو سنا۔

مسئلۂ قتل مرتد

۲۴-۱۹۲۵ء کا ایک ہنگامہ یاد آگیا (شاید) افغانستان میں دو قادیانیوں کے قتل کی بنا پر مسئلہ قتل مرتد کی بحث چھڑی چھوٹے چھوٹے حلقہ ہائے بحث کے علاوہ دو بڑے اور ملک گیر حلقے قائم ہوئے۔ دونوں طرف سے دو پہلوان خم ٹھونک کر میدان میں آگئے۔ "ہمدرد" کا مسلک یہ تھا کہ قتل مرتد نا جائز ہے اور "زمیندار" قتل مرتد کے وجوب میں دلائل فراہم کر رہا تھا۔ اس طرف محمد علی خود بڑے بڑے لمبے اداریے لکھ رہے تھے۔ ادھر ایڈیٹر کے پردے میں مولانا غلام رسول مہر اپنی جوانی اور مذہبیت کا جوش دکھا رہے تھے۔ اس بحث نے کافی طول اختیار کیا میں دلچسپی سے دونوں حریفوں کے دلائل پڑھتا تھا اور دل ہی دل میں محمد علی کے حلقۂ عقیدت میں شامل ہو رہا تھا۔ مہر صاحب کے پر مغز پر معلومات اور حوالوں سے پر مقالے مجھ پر کچھ اثر نہ کرتے تھے۔ قرآن کریم کی ایک آیت جو محمد علی کی دست آویز تھی ایک طرف اور فقہا کے رنگا رنگ اختلافات و تضادات کی معرکہ آرائیاں دوسری طرف ۔۔۔ آخر اللہ ہی کو اللہ ماننا پڑے گا۔ چنانچہ پچھلے دنوں میرے سامنے ایک خاص صحبت میں مولانا مہر صاحب نے خود بھی اپنے تبدیل موقف کا اعتراف کر لیا میں اس کو ان کی بلندی اور سلیم الطبعی سمجھتا ہوں۔

حسن نظامی اور محمد علی

حافظے کا ایک اور ورق الٹتا ہوں۔ یہ ۱۹۲۵ء ہی کا واقعہ ہے۔ خواجہ حسن نظامی اور مولانا محمد علی میں ٹھن گئی۔ یہ تو یاد نہیں کہ آغاز کس بات سے ہوا تھا۔ اتنا یاد ہے کہ ذاتیات پر حملے کرنے میں کمی کسی طرف سے نہیں ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محمد علی خواجہ صاحب کی خواجگی کو ختم کر کے چھوڑیں گے۔ اور خواجہ صاحب محمد علی کی لیڈری کو بے کفن دفن کر دینے کے درپے تھے۔ دونوں طرف سے خوب خوب چلتی رہی۔ میں اس نوک جھونک کو ان بزرگوں کی شان کے خلاف سمجھنے کے باوجود چٹخارے لے لے کر پڑھتا تھا۔ بعض دفعہ ایسا مان لیتا تھا کہ بھٹیارنوں کی لڑائی یاد آجاتی تھی۔

اگر یہ دونوں مجموعہ ہائے مضامین (قتل مرتد اور خواجگی و لیڈری) فراہم کر کے شائع کر دیے جائیں تو تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لیں گے۔

حجاز میں قبہ شکنی

ہاں یاد آیا۔ ابن سعود کی قبہ شکنی بھی انہی دنوں کا واقعہ ہے۔ محمد علی ابن سعود کے زبردست حامیوں میں سے تھے اس لیے کہ اس نے محمد علی کے دشمن انگریز اور انگریز کے پروردہ شریف مکہ کے اثر سے سرزمین حجاز کو پاک کیا۔ تمام ہندی مسلمان بلا اختلاف ابن سعود کے اس اقدام سے متفق تھے۔ پھر جب سعودی حکومت نے قبوں پر ہاتھ صاف کیا تو دو گروہ ہو گئے۔ اہل حدیث کے ہاں تو خوشیاں ہو گئیں۔ لیکن صوفیوں، عام حنفیوں اور شیعوں کے ہاں صف ماتم بچھ گئی۔ اس تصادم نے زیادہ سے زیادہ شدت کی صورت اختیار کر لی۔ محمد علی سیاست میں بے شک غالی تھے۔ لیکن مذہب میں اعتدال پسند تھے اور یہ غلو و اعتدال اپنے اپنے محل پر ٹھیک ہی تھا۔ آخر اس قبہ شکنی سے پیدا شدہ صورت حال نے محمد علی

بھی متاثر کیا، وہ ابن سعود کے خلاف لکھنے اور بولنے لگے۔ ظفر علی خاں ابن سعود کی حمایت میں سینہ سپر ہو گئے۔ دونوں طرف سے بہت گرما گرم نظم و نثر کے ہنگامے ظہور میں آئے۔ اس موقع پر مجھے ظفر علی خان کی روش اسلامی تعلیم کے موافق معلوم ہوئی۔ میں نے بھی محمد علی کے خلاف ابن سعود کی حمایت میں چند شعر لکھے جو زمیندار میں شائع ہوئے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ہمدرد میں ایک ایک شعر پر مولانا محمد علی کی تنقید شائع ہوئی۔ انہوں نے حسب عادت بھی تنقید کی تھی۔ اس وقت مجھے اپنا ایک مصرعہ بھی یاد نہیں نہ ہی تنقید کا کوئی جزو ذہن میں رہ گیا۔ اتنا یاد ہے کہ اسی زمانے میں ایک جدید سیاح توفیق شریف ابن سعود کی طرف سے ہندوستان میں وارد ہوا۔ اس نے ابن سعود کے حامی علماء و قائدین کی ہمت افزائی کی اور کچھ ہدیے تحفے بھی تقسیم کیے۔ مشہور اہل حدیث مولوی محمد علی پیر واعظ مرحوم بھاٹی گیٹ امرتسری کے نسبتی عزیز عبدالرحمن غالب نے کسی مجلس میں میرے مذکورہ بالا اشعار کا ذکر توفیق شریف کے گوش گزار کیا، تو اس نے میرے لیے بھی ایک جبہ تجویز کیا۔ غالب صاحب نے کہا کہ شاعر مولوی ہے نہ صوفی، جبہ اس کے کس کام آئے گا؟ اس کے لیے دستار مناسب رہے گی۔ چنانچہ وہ بیش قیمت دستار مدتوں میرے زیر استعمال رہی۔

محمد علی کی فراست

محمد علی کی فراست کا ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ امرتسر کا ایک شخص ڈاکٹر م۔ ح۔ خالص اشتہاری ڈاکٹر، اشتہاری واعظ اور اشتہاری لیڈر تھا۔ اس کی زبان میں جادو تھا۔ سامعین کے دل مٹھی میں لے لیتا تھا۔ ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں ان کی جیبیں خالی کرا لیتا تھا۔ لیکن اس کی زندگی کا ہر شعبہ محض فراڈ تھا۔ سگرٹوں کی شکل میں چرس اور مکسچر کی صورت میں شراب جیب میں رکھتا تھا۔ دین اور اخلاق تو اس کی عملی زندگی پر سایہ بھی نہ ڈالتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ اپنا کاروباری دورہ کرتے ہوئے محمد علی کے پاس جا پہنچا۔ چند اشتہار اور پمفلٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ امرتسر میں ایک تبلیغی ادارہ بزم توحید کے نام سے قائم ہوا ہے۔ چند مشاہیر کے نام لیے کہ وہ اس کے صدر و نائب وغیرہ ہیں اور بندہ اس کا سفیر ہے۔ چندہ فراہم کرنے کے لیے شہر بہ شہر دورہ کر رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ محمد علی کو اپنی لسانی سے مسحور کرنے کی پوری کوشش کی۔ انہوں نے دوسرے وقت آنے کو کہہ کر رخصت کر دیا اور بذریعہ تار مولوی محمد عبداللہ مہاس مرحوم ایڈووکیٹ سے دریافت حال کی۔ انہوں نے جواب دیا کہ یہاں اس نام کی کوئی انجمن نہیں اور شخص مذکور مشہور جعل ساز ہے۔ اس سے مناسب برتاؤ کیجیے۔ اگلے دن ڈاکٹر م۔ ح دفتر کامریڈ میں محمد علی سے چندہ وصول کرنے کی امید پر پہنچا تو پولیس کو موجود پایا۔ فوراً ہتھکڑی لگ گئی حوالات میں داخل کیا گیا۔ امرتسر خبر پہنچی تو اس کے رشتہ داروں پر صف ماتم بچھ گئی۔ واقعہ کے جزئیات تو یاد نہیں۔ اتنا خیال ہے کہ کچھ دوڑ دھوپ اور کوشش کے بعد اس کی جان چھوٹی۔ اور پھر اپنے کاروبار میں منہمک ہو گیا۔

تنظیم کمیٹی

۱۹۲۵-۲۶ء کے لگ بھگ ڈاکٹر کچلو نے اپنی تنظیم کمیٹی کا آغاز کیا۔ اور اسی نام کا ایک روزنامہ جاری کیا۔ اس ضمن میں انہوں نے امرتسر میں آل مسلم پارٹیز کا ایک اجلاس بلایا جس میں محمد علی بھی شریک ہوئے۔ اجلاس اسلامیہ ہائی

تھے۔ میری سمجھ میں پوری طرح نہیں آرہا تھا کہ کیا کہتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ میں سٹیج سے دور ایک کونے میں بیٹھا تھا۔
مسلم تنظیم کی وجہ سے کچلو صاحب گاندھی جی اور کانگریس کی نظر میں ایسے معتوب ہوئے کہ پھر وہ پہلا سا مقام حاصل نہ کر سکے۔

جب محمد علی کانگریس سے بیزار ہو کر خالص اسلامی پلیٹ فارم پر آ گئے تو متحدہ قومیت والے ان سے بیزار ہو گئے احرار آخر تک متحدہ قومیت کے علم بردار رہے۔ انہوں نے محمد علی کو مسلمانوں کی نظر سے گرانے کی انتہائی کوشش کی۔ اور ان کے جلسوں کو ناکام بنانے اور اپنے حواریوں کی طرف سے ان کی تذلیل میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ——— پھر جب مسجد شہید گنج کی تحریک میں احرار کا ستارہ غروب ہوا اور عوام میں ان کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی تو ان کے مخالفوں نے ان کو زمانے میں پورا زور صرف کر کے بیجا بجا ان پر آوازے کسے جاتے تھے۔ اسی دوران میں ایک احراری قائد مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری نے محمد علی کے سامنے دل کا دکھ ظاہر کیا تو انہوں نے برجستہ کہا۔
"یہ لوگ تمہارے ہی سکھائے ہوئے تو ہیں۔ تم نے جو ہتھیار ان کو ہمارے خلاف چلانے کے لیے دیا تھا آج وہی تم پر چلا رہے ہیں۔"

محمد علی اور مرتبۂ ولایت

خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ (مولد چاچڑاں۔ مدفن کوٹ مٹھن) اعلیٰ درجہ کے شاعر اور مشہور صوفی ہیں۔ ان کے دوہے اور کافیاں ملک بھر میں معروف و مقبول ہیں۔ ان کے ایک دوہے کا سرائیکی سا ترجمہ یہ ہے۔ کہا گیا ہے۔

ڈکھاں دی میں سیج وچھائی ڈکھاں ہار بنائے
یار فرید او دکھ مبارک جنہاں وچ وی یار ملدے

یعنی میں نے دکھوں کا بستر ہی بچھایا، دکھوں کے ہار بنا کے گلے میں ڈالے۔ اے فرید! وہ دکھ مبارک ہیں جن کے ذریعے سے محبوب کا وصال میسر ہو ——— نظیری نے بھی کہا ہے:

آں را کہ بود پسند نازد
دل در غم زاریش گستہ باید

پیر رومؒ فرماتے ہیں:

چوں خدا خواہد کہ ماں یاری کند
میل ما را جانب زاری کند

قرآن مجید کی کئی آیات بھی اسی سوز و گداز کی تائید کر رہی ہیں ——— علامہ اقبال کی زندگی کے آخری چند سال اسی حقیقت کی مشاہداتی شہادت پیش کرتے ہیں۔ یہی چیز بدرجۂ کمال محمد علی کے ایام اسیری میں نظر آتی ہے۔ ان پہ

پے در پے مصائب کے پہاڑ ٹوٹے ۔ داخلی اور خارجی، ذاتی اور قومی دکھوں نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن اُن کی روح کے آئینے سے زنگ و غبار دور ہوتا گیا۔ وہ ایسی صاف و شفاف ہوتی گئی کہ عالمِ بالا کی تجلیات اس میں منعکس نظر آنے لگیں۔

—— وہ ملک و قوم کی مجالس سے دور، احباب و اقارب سے جُدا اور اپنے اہلِ بیت سے مہجور بیجاپور میں طویل قیدِ فرنگ کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ اولادِ نرینہ ان کی قسمت میں نہ تھی۔ چار لڑکیاں تھیں جن سے بے حد محبت کرتے تھے۔ جواں سال شادی شدہ آمنہ مرضِ دق میں مبتلا ہو گئی۔ کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ آخر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ مجبور و مقید باپ کو جیل کی چار دیواری میں اطلاع پہنچی۔ شاعر محمد علی، دردمند محمد علی، جذبات سے بھرے ہوئے محمد علی کی بے بسی اور اندوہ ناکی کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ صدمات و آلام کے زینوں پر چڑھتے ہوئے معراجِ ربانی کی فضا میں رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ اس وقت اُن کے قلب پر چند اشعار نازل ہوتے ہیں۔ جو شاعری سے ماوراکسی اور عالم کی خبر دے رہے ہیں۔ ان سطور کا لکھنے والا آج بھی ان میں وہی لذت و تازگی پاتا ہے جو آج سے ۲۴ سال پہلے حاصل ہوئی تھی۔ اور ان اشعار کی یہ روح افزا تازگی ہمیشہ ہی اللہ والوں کے قلوب و ارواح میں انس و عشقِ الٰہی کی حرارت بھڑکاتی رہے گی۔ اور ساتھ ہی تسلیم و رضا کا بہترین درس دیتی رہے گی۔

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی، وہ تو مگر دور نہیں
امتحاں سخت سہی، پر دلِ مومن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں

اللہ اکبر! کیا ثبات اور کتنا استقلال ہے؟ یہ دولت سرمدی اولیاء اللہ ہی کا حصہ ہے۔

ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

المدد! جا یہ استقامت دیکھیے ۔

تو تو مردوں کو جِلا سکتا ہے قرآں میں کہا

آہ وہ دل، جس دل سے یہ شعلے شعروں کا روپ دھار کر نکل رہے ہیں :۔

میری اولاد کو بھی مجھ سے ملا دے یا رب!
تو ہی کہہ دے! تیری رحمت کا یہ دستور نہیں؟

لیکن وہ تو ارحم الراحمین ہونے کے ساتھ احکم الحاکمین اور علیم و حکیم بھی ہیں، ہمارا محدود علم ان کی انتھاہ حکمت کی گہرائیوں کے سامنے کیا حقیقت رکھتا ہے۔ وہاں تو پیغمبرانہ عظمتیں بھی سربسجود اور دم بخود نظر آتی ہیں۔ اس موقع پر شیخ شیراز کی زبان سے محزون و مغموم پیغمبر کنعان کی ایک واردات یاد آ رہی ہے :۔

یکے پرسید ازاں گم کردہ فرزند — کہ اے روشن گہر پیر خرد مند!
ز مصرش بوئے پیراہن شنیدی — چرا در چاہ کنعانش ندیدی؟
بگفت احوالِ ما برقِ جہان است — دمے پیدا و دیگر دم نہان است
گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینیم — گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینیم
اگر درویش بر حالے بماندے
سر دست از دو عالم بر فشاندے

محمد علی نے جیل میں رہ کر جو اشعار کہے، وہ جیل سے باہر رہ کر وجود میں آ ہی نہیں سکتے تھے۔ اسی زمانے میں اُن کے اشعار ذیل شائع ہوئے جو ان کی جسمانی قید کے ساتھ روحانی عروج کی شہادت دے رہے ہیں :۔

تنہائی کے سب دن ہیں، تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں اُن سے خلوت میں ملاقاتیں

"ہمدرد" اور "کامریڈ" کے دفتر میں۔ ہنگاموں بھری زندگی میں۔ اعزہ و اقربا اور ارادت مندوں کے ہجوم میں یہ روحانی دولت کہاں میسر آ سکتی؟ اس کے لیے اُسوۂ یوسفی ہی کی راہوں سے گزرنا ضروری تھا :۔

ہر لحظہ تشفی ہے، ہر آن تسلی ہے
ہر وقت ہے دل جوئی، ہر دم ہیں مداراتیں

سبحان اللہ۔ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ اے قصرِ امارت کے مکینو! اے ناز و نعمت کے پروردو! تمہیں کیا خبر کہ "صبر جمیل" کی دنیا کے باشندے کس ذوق و [illegible] عافیت [illegible]

احساس عبدیت کی شدت ساتھ نہ رہے تو پھر معراج ہی کیا ــــــ سبحان الذی اسریٰ بعبدہٖ الآیہ

بے مایہ سہی لیکن، شاید وہ بلا بھیجیں
بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

محمد علی کا مرتبۂ شاعری

محمد علی نے شاعری کو اپنا پیشہ نہیں بنایا، لیکن انہوں نے جتنے شعر کہے، وہ فنی معیار پہ کسی کہنہ مشق شاعر سے کم درجے کے نہیں۔ بالکل علامہ شبلی کی طرح جو مورخ تھے، متکلم تھے، فقیہ تھے، ادیب تھے، بہت کچھ تھے لیکن مولانا آزاد اور خواجہ عزیز لکھنوی کی طرح شاعری اُن کا اوڑھنا بچھونا نہیں تھی۔ تاہم فارسی کی ــــــ تھوڑی سی غزلیں جو اُن کے قلم سے نکلیں ان مشہور مسلّم استادوں کی غزل سے اُن کا پلّہ بھاری ہے۔ محمد علی کی مختصر شاعری میں بھی ان کی [illegible] واردات زندگی اور قومی الام سے ساتھ نظر آتے ہیں۔ دو ایک شعر آپ سنیے:-

کیا ڈر ہے جو ہو ساری خدائی بھی مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے
توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

شاعری کی معراج یہ ہے کہ وہ "جزویست از پیغمبری" کی بلندی تک پہنچ جائے۔ اور یہ مرتبہ بہت کم شاعروں کو نصیب ہوا۔ محمد علی بہت کم گو ہونے کے باوجود اس مرتبے پہ پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان کا یہ شعر الہامی پیشگوئی کا درجہ حاصل کر چکا ہے:-

ہے رشک ایک خلق کو جوہر کی موت پر
یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

[illegible] ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے قبلۂ اول میں دفن ہونے کا شرف آج تک محمد علی کے سوا کسی کو حاصل نہ ہو سکا۔

یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار دے

〰〰〰

آکسفرڈ کے گریجویٹ

باغی عدالت کے کمرے میں

از مولانا عبد القدوس ہاشمی (ندوی)
(مرکزی ادارۂ تحقیقات اسلامی (کراچی)

مولانا محمد علی

(ذاتی تاثرات)

مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ تعالیٰ کو میں نے سب سے پہلی بار ۱۹۲۱ء میں دیکھا، اس وقت میری عمر دس سال تھی۔ اور مدرسہ عالیہ مئو ناتھ بھنجن ضلع اعظم گڑھ میں فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا۔ تحریک خلافت اور ترک موالات کے ہنگاموں سے زمین و آسمان گونج رہے تھے۔ شاید اسی سلسلہ کا ایک بڑا ہی عظیم الشان جلسہ ہوا، واقعی عظیم الشان، اتنا عظیم الشان کہ بوڑھے پرانے کہتے تھے، اتنا بڑا جلسہ اس قصبہ میں تو کیا، اس سارے ضلع میں آج تک کہیں نہیں ہوا۔ یہ جلسہ قصبہ سے باہر ایک بڑے میدان میں منعقد ہوا تھا، بڑے اہتمام سے اس کے لیے اسٹیج بنایا گیا تھا اور بڑے اخلاص کے ساتھ مسلمانوں نے اسے سجایا تھا۔

نماز عشاء کے بعد مرحوم علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا محمد علی مرحوم ایک ساتھ ہی جلسہ گاہ میں رونق افروز ہوئے، یہ لوگ چند ہی منٹ پہلے اعظم گڑھ سے مئو پہنچے تھے۔ اس جلسہ میں ان بزرگوں کو خیر مقدم کہنے کی خدمت جس بچے کے سپرد تھی وہ میں تھا۔ اللہ تعالیٰ اپنی رحمتوں میں جگہ دے استاد مرحوم مولانا عبد الرحمٰن نے چند سطریں لکھ کر مجھے یاد کرا دی تھیں، اور میں نے شہ نشین پر کھڑے ہوکر وہ عبارت سنا دی، جب واپس آنے لگا تو مولانا محمد علی نے دونوں بازو پکڑ کر اٹھا لیا، اور میری ٹوپی پر لگے ہوئے چاند کو دکھا کر باواز بلند کہا "چھوٹا سا خادم کعبہ"۔

اور آخری ملاقات مولانا مرحوم سے ریاست رامپور کے ریلوے اسٹیشن پر ہوئی سنہ ۱۹۳۰ء میں جب کہ مولانا گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ یہ ان کا "سفر خدمت" بھی تھا، اور سفر آخرت بھی، ان کے عزیز و اقارب، شجاعت علی خاں، شاکر علی خاں اور شیخوں کے احاطہ کے بہت سے لوگ ان کو رخصت کرنے آئے تھے۔ یہ ریاستوں کی دنیا بھی عجیب دنیا ہوتی ہے، مولانا محمد علی چونکہ کوئی سرکاری عہدہ دار نہ تھے اس لیے دربار سرکار سے تعلق رکھنے والا شاید ہی اللہ کا کوئی نیک بندہ رہا ہو، اگرچہ مولانا محمد علی کی شخصیت پر فخر کرنے میں یہ لوگ بھی لذت محسوس کرتے تھے، اور بارہا ان کی محفلوں میں مولانا کے رامپوری ہونے پر ان کو فخر کرتے ہوئے میں نے خود سنا ہے، لیکن کیا کیا جائے کہ درباری مزاج کی یہ خصوصیت ہے،

[illegible]

یہ تو دیکھا گیا ہے کہ کسی خاص ماحول کا اثر اگر آدمی پر موافق نہ پڑ سکے تو ایک سخت قسم کا ذہنی ردِ عمل شروع ہو جاتا ہے اور ذہنی توازن باقی نہیں رہتا، یہودی سود خواروں کے ماحول میں پرورش پا کر ایک شخص یا تو ان جیسا ہو سکتا ہے یا پھر اتنا سخت ردِ عمل اس کے ذہن میں ہوگا کہ کارل مارکس ہو جائے گا۔ خود اپنے معاصرین میں دیکھیے بیسیوں مثالیں مشاہیر میں مل جائیں گی یا تو ماحول نے اُن پر اس طرح قابو پا لیا ہے کہ وہ اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، یا پھر اتنا سخت ردِ عمل ہوا ہے کہ نفرت نے اعتدالِ ذہنی کو ختم کر کے دوسرے کنارے پر کھڑا کر دیا ہے، ذہنی اعتدال بڑی حد تک مفقود ہو گیا ہے۔
لیکن مولانا محمد علی کا ذہن اس سلسلہ میں بڑا بے مثال تھا نہ وہ درباری اثرات کی وجہ سے اشرافیت کے غلام تھے اور نہ ردِ عمل کی وجہ سے اشتراکیت کے شیدا، وہ ایک مسلمان تھے، اور سراپا مسلمان، سچی بات یہ ہے کہ مولانا مرحوم کی حقیقی تعریف صرف اسی لفظ سے ہو سکتی ہے کہ وہ افکار و اعمال میں ایک مسلمان تھے، اور یہ بہت بڑی بات ہے صدیوں میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جن کی تعریف میں یہ بات کہی جا سکے۔

سنہ ۱۹۲۱ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک کے عرصہ میں مولانا مرحوم کو دیکھنے اور ایک ادنیٰ رضا کار کی حیثیت سے اُن کی خدمت بجا لانے کے بہت سے مواقع میسر آئے، دو تین بار سفر میں بھی ہمرکابی کا شرف حاصل ہوا، اُن کے افکارِ عالیہ، اُن کی غیر معمولی قابلیت، اُن کی جرأتِ ایمانی، خدام پر شفقت کی نظر، احکامِ شرعی کی پابندی، فراستِ ایمانی، اور ساری دنیا سے خصوصاً دنیائے اسلام سے اُن کی سچی ہمدردی، یہ وہ خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے ہر ملاقات کے بعد عقیدت میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔
مولانا محمد علی مرحوم کو بار بار دیکھنے اور اُن کے اعمال و افکار پر غور کرتے رہنے کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ قیادت و زعامت کا ایک معیار ذہن میں قائم ہو گیا، ایسا معیار کہ پچھلے تیس بتیس سال کے عرصہ میں بہت سے مسلم و غیر مسلم قائدین کو دیکھا، اُن کے اعمال و افکار کا جائزہ لیا، نہ صرف جزیرہ نمائے پاک و ہند میں بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک میں آنا جانا رہا مگر اکثر بڑے بڑے نامور قائدین کو دیکھنے کے بعد جب اُن کو اپنے ذہنی معیار پر جانچا تو بے ساختہ یہ کہنا پڑا کہ ؎

جلوہ کوئی آنکھوں میں سماتا ہی نہیں ہے
اور دل کا کوئی ناز بھاتا ہی نہیں ہے

نام بنام گنوانا اچھا نہیں، مختصراً یہ کہہ سکتا ہوں کہ سنہ ۱۹۳۰ء کے بعد سے میری زندگی کا بڑا حصہ اس طرح گزرا ہے کہ کبھی میں سبھاس چندر بوس سے ملاقات کر رہا ہوں اور کبھی مہاتما گاندھی کے آشرم میں مہمان بنا ہوا ہوں، کبھی نواب بہادر یار جنگ کا رفیقِ کار ہوا، اور کبھی حسن البنا (مرحوم) کی خدمت میں حاضر، اسی طرح چین، ملایا، انڈونیشیا، تونس، الجیریا،

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ
رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

جلسہ گاہ میں اضطراب و بے چینی کے الفاظ بولنے کے علاوہ شاید ہی کسی کو قوم کے دکھ درد کا احساس رہتا ہو، لیکن مولانا محمد علی مرحوم کا ایک واقعہ سنیے، میرے سامنے یہ واقعہ ہوا ہے۔

ایک دن پچھلی رات کو مولانا کی خواب گاہ سے روتے گڑگڑانے اور ہچکیوں کی آوازیں سنی گئیں، اور جب اس کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی گئی تو معلوم یہ ہوا کہ مولانا سجدے میں پڑے ہوئے رو رو کر خداوند تعالے سے فریاد کر رہے ہیں، اپنے لیے نہیں، اپنی اولاد کے لیے نہیں، بلکہ لیبیا میں مسلمانوں پر اٹالیہ کی طرف سے جو دردناک مظالم ہو رہے ہیں، اس کی فریاد کر رہے ہیں۔

دوسرا واقعہ سنیے، مہاراجہ الور کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے، مسلمان فریاد کرنے کو دہلی آتے ہیں، پریشان حال بے خانماں، مولانا محمد علی اپنی بیماری کو بھول کر، مہاراجہ الور سے دوستانہ تعلقات کو نظر انداز کر کے، ہر خطرے سے بے پروا ہو کر، ان مسلمانوں کے دکھ درد میں شریک ہو جاتے ہیں، روتے جاتے ہیں، اپنا سکھ اور اپنا آرام قربان کر کے ان مسلمانوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ مہاراجہ کے مقرر کیے ہوئے لوگ مولانا محمد علی کی توہین کرتے ہیں حتیٰ کہ جان کی دھمکی دیتے ہیں لیکن محمد علی کو حقیقتاً اضطراب اور واقعی بے چینی ہے۔ جلسہ گاہ میں اسٹیج پر بے چینی نہیں بلکہ حقیقی اضطراب و بے چینی، وہ ان دھمکیوں کی پروا نہیں کر سکتے تھے۔

تیسرا واقعہ سنیے، اندھیری رات ہے، بارش ہو رہی ہے، جمنا چڑھی ہوئی ہے، سیلاب ہے، سیلاب ہے، سیلاب، دہلی کے نشیبی حصوں میں قیامت بپا ہے۔ خبر گیری کا فرض تو حکومت پر عائد ہوتا ہے لیکن دہلی کے گمشدہ و زندہ [illegible] جو [illegible] جھنجھوڑ کر امدادی کام پر تیار کر رہا ہے وہ ہے اللہ کا وہ بندہ جس [illegible] محمد علی اور جو خود شدید بخار میں مبتلا ہونے کے باوجود پانی میں بھیگتا ہوا ایک گروہ کو ساتھ لیے ہوئے سرکاری امداد پہنچنے سے پہلے ہی آفت رسیدہ سیلابیوں کی امداد کے لیے پہنچتا ہے وہ ہے محمد علی۔

مولانا محمد علی کی ساری زندگی میں ایسے واقعات نہ جانے کتنے ہوں گے، لیکن ایک واقعہ اپنے ذاتی مفاد کو فراموش کر کے حق گوئی کا درس دیتا ہے، میں خود اس واقعہ کا عینی شاہد ہوں۔

سلطان ابن سعود نے شریف علی کو شکست دے کر جب حجاز پر قبضہ کیا تو نجدیوں نے بہت سے مقبروں اور گنبدوں کو تعمیر ناجائز قرار دے کر مسمار کر دیا۔ ہندوستان میں اس کے خلاف آوازیں اٹھیں اور بڑے زور شور کے ساتھ اٹھیں، لکھنؤ میں ایک حجاز کانفرنس ہوئی۔ ہم لوگ ندوۃ العلماء کے طلبہ بھی تماشائی تھے۔ اس کانفرنس میں بانیان [illegible] ایک تجویز کی تحریک پاس کرانے کی کوشش کی، ان کی نظر میں یہ تجویز سلطان ابن سعود کے خلاف ایک مؤثر قدم تھا [illegible]

ہونے کی حیثیت سے اس خطرہ کو روکنے کے لیے قدم بڑھایا ہے۔ اس تار کی اطلاع ملتے ہی مولانا محمد علی نے بڑے ہی سخت الفاظ میں اس کی مخالفت کی، مولانا سے مہاراجہ کے تعلقات بہت اچھے تھے، مولانا کے مالی و ذاتی مفادات اُن سے وابستہ تھے۔ خود مہاراجہ صاحب کو بھی یہ یقین تھا کہ مولانا محمد علی اُن کے خلاف کچھ نہ کہیں گے، لیکن معاملہ برعکس نکلا لکھنؤ میں مہاراجہ کے خلاف ایک جلسہ عام ہونا قرار پایا، مولانا ظفر علی خاں مرحوم اور مولانا محمد علی سے سخت اختلافات تھے، پھر بھی مولانا محمد علی نے مولانا ظفر علی خاں کا ساتھ دیا، دونوں بزرگ لکھنؤ تشریف لے آئے۔

لکھنؤ شہر میں اور مہاراجہ محمود آباد کے خلاف جلسہ عام؟ مہاراجہ کے نمک خواروں کی لکھنؤ میں کوئی کمی تھی؟ آستینیں چڑھ گئیں، چیلنج کیا گیا کہ جلسہ نہیں ہونے دیا جائے گا، ہم لوگ یعنی ملیا مولانا محمد علی کے ساتھ تھے، ہم نے جلسہ عام منعقد کیا اور نہایت کامیاب جلسہ ہوا مولانا محمد علی نے مہاراجہ کی اس حرکت کے خلاف بڑی سخت تقریر کی، اور مولانا ظفر علی خاں نے اپنی وہ فی البدیہہ کہی ہوئی نظم پڑھی جس کا ایک شعر ہے۔

حریم کعبہ پہ تثلیث کا اُڑے پرچم
یہ لکھنؤ سے نصاریٰ کو نامہ دیتے ہیں

پھر کیا ہوا مولانا محمد علی کو اپنی آمدنی کھونی پڑی۔ تعلقات خراب ہوئے، لیکن اللہ کے بندے کی پیشانی پر بل نہیں آیا۔ مولانا محمد علی مرحوم کی زندگی میں سینکڑوں ایسے مواقع آئے جہاں صادق و کاذب کا فرق ظاہر ہو جاتا ہے اور ان مواقع پر محمد علی صادق دکھائی دیئے۔

مرحوم علامہ اقبال کا یہ شعر تو ہم سب نے پڑھا بھی اور سنا بھی

آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

جلال و جبروت کے سامنے کھڑے ہو کر حق و بے باکی کو افضل جہاد بھی کہا گیا ہے۔ لیکن یہ کچھ آسان کام نہیں ہے۔ اچھے اچھے [illegible] حضرات کے لب و لہجہ میں ایسی نرمی پیدا ہو جاتی ہے کہ حق و صداقت کی آنکھوں سے خون کے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں یہ روزمرہ کی بات ہے ان بزرگوں کے اقوال کو مداہنت نہ کہیے لیکن تسامح اور بے جا نیت تو بہر حال کہا جائے گا۔ حقیقۃً یہ بڑا مشکل کام ہے کہ جلال و جبروت کے منہ پر تھوک کر حق و صدق کو زندہ رکھا جائے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امت اسلامیہ میں ہر زمانہ میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے اور ان شاء اللہ پیدا ہوتے ہی رہیں گے لیکن ان خاصان خدا کی تعداد عہد صحابہ کے بعد سے برابر گھٹتی ہی جا رہی ہے تاریخ اسلام نے عہد صحابہ و تابعین کے بعد جب [illegible] کے امتحانات بہت کم دیکھے ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی زندگی میں بھی ایسے چند مواقع آئے جہاں صداقت، کا جلال شاہی سے مقابلہ پڑ گیا، یہ بڑے امتحان کا وقت تھا لیکن مولانا ان امتحانوں میں ہمیشہ پورے اترے۔ ایک موقع تو ۱۹۲۶ء میں مکہ مکرمہ میں پیش آیا جب کہ ان کے لیے چپ رہ جانا اعزاز واکرام کا سبب ہو سکتا تھا، اور حق گوئی و بے باکی میں اگر جان کا نہیں تو اعزاز واکرام کے ضیاع کا خطرہ تھا ہی، بلکہ ذلت و حقارت کا خطرہ بھی موجود تھا۔ آپ نے حقیقتاً مولانا کو گزرنا پڑا، یہ تاریخی تقریر اس قدر مدلل اتنی تلخ اور اس طرح حق گوئی کا کمال ہے کہ سارا مجمع انگشت بدنداں رہ گیا۔ دوسرا موقع گول میز کانفرنس لندن میں افتتاحی اجلاس ہے جہاں مولانا نے شاہ برطانیہ کو وکٹوریہ کے پوتے کہہ کر خطاب کیا ہے اور اپنی زندگی کی آخری تقریر کی ہے۔ یہ تقریر جہاں فصاحت و بلاغت کا بے مثال نمونہ ہے، خطابت اور زور بیان کا شاہکار ہے وہاں حق گوئی و بے باکی کی ایسی مثال ہے کہ ہر زمانہ میں اس سے سبق حاصل کیا جا سکتا ہے۔

اللہ اپنی رحمت فراواں میں جگہ دے، مولانا محمد علی مرحوم ایک اچھے مسلمان تھے، صحیح العقیدہ اور پابند اعمال، خوش اخلاق ہنس مکھ اور شفیق۔ وہ بہترین خطیب تھے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے، ایک اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز تھے اردو اور انگریزی دونوں زبانوں کے۔ ایک بہترین سخن سنج و سخن فہم تھے، اور ایک اچھے شاعر تھے۔ ایک مرتا فقیر کا دل رکھتے تھے اور ایک صاحب تاج وکلاہ کا دماغ۔ وہ حاتم طائی کی طرح سخی تھے، اور حضرت ابوذر غفاری کی طرح بے درہم و دینار تھے۔ وہ عالموں کی طرح عبا پہنتے تھے، عابدوں کی طرح عبادت کیا کرتے تھے، انہوں نے قرآن مجید جیل میں حفظ کر لیا تھا۔ اور ان ساری خوبیوں کے ساتھ وہ رامپور کے اولڈ ہیں جو انگریزی میں تقریر کرتے تھے اور ونسٹن چرچل سے بہتر انگریزی تحریر لکھتے تھے۔ انہیں کچھ دنوں تک قریب سے دیکھنے کے بعد یہ محسوس ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے کمال کے پورے ایک شہر کو ایک محمد علی کی ذات میں سمو دیا ہے۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

جناب عبدالرؤف صاحب عباسی
ایڈیٹر روزنامہ "حق"، لکھنؤ (بھارت)

مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ

نام کے برکات

سرور کائنات نبی کریم علیہ التحیۃ والتسلیم کا ارشاد گرامی ہے "کوئی شخص میری کنیت کو اپنے نام میں شامل نہ کرے۔ البتہ اگر اُس کے ہاں دو بیٹے ہوں تو کم از کم ایک کے نام میں محمدؐ ضرور ہو۔"

اسی ارشاد کی یہ برکت تھی کہ مولانا ایک مدت تک "مسٹر" رہنے کے باوجود (اپنی زندگی کے کسی دور میں) "محمدؐ کی برکت سے محروم نہ رہے، اور آخر میں جب مولانا ہوئے تب تو برکات کی بارش ہی ہونے لگی۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں کہ

سرورِ کیفِ لاتحزن کو بُشرے سے عیاں پایا
اسیرِ قیدِ تنہائی کو مست و شادماں پایا

اسی سلسلہ میں اپنی دین داری کا اعلان یہ کہہ کر فرماتے ہیں

دار نے اِک سگِ دنیا کو دیا ہے یہ عروج
ہے فرشتوں میں بھی چرچا مری دینداری کا

اسی نام کی برکت تھی کہ جس نے اسلام کا شیدائی بنا کر گناہوں کی گرانباری سے گویا کہ بے خوف کر دیا تھا اور رحمت خداوندی سایہ افگن تھی۔ خود فرماتے ہیں۔

ڈر نہیں مجھ کو گناہوں کی گرانباری کا
تیری رحمت ہے سبب میری سبکساری کا

موصوف الصدر کو اتباعِ سنت کا خیال بدرجۂ اتم تھا، بیماری میں بھی کبھی صوم و صلوٰۃ سے غفلت نہیں برتی۔ علیہ الرحمۃ والرضوان۔

مولانا کے نام کے بشمول تخلص تین اجزا ہیں اور تینوں اسم با مسمیٰ۔ نام محمدؐ کی برکت۔ نام علی کی شجاعت، اور جوہر
[illegible]

ہو) برائے نام بھی نہ تھا، بکی شہادت ان کی زندگی (سیاسی ہو یا غیر سیاسی) پیش کرتی ہے، اور ہمہ دوام ثبت کر گئی ہے۔

دہلی کا قیام اور ہمدرد کا اجرا

اس مقالہ میں مجھے مولانا کے سیاسی زندگی کو پیش نہیں کرنا ہے کیونکہ وہ اظہر من الشمس ہے۔ اس کے علاوہ اس مبحث پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ بقول کہ :-

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی را سخن پایاں
بمیرد تشنہ مستسقی و دریا ہمچناں باقی

مجھے اس موقع پر اُن کے ایثار و کردار اور برگزیدہ اعمال کے چند نقوش پیش کرنے ہیں۔

مولانا مغفور کلکتہ کا قیام ترک کر کے جب دہلی آئے اور علاوہ کامریڈ (انگریزی روزنامہ) کے اُنہوں نے ایک اُردو اخبار "ہمدرد" کے نام سے نکالا۔ اس وقت پہلا کام یہ کیا کہ انگریزی لباس کلیۃً ترک کر کے اسلامی لباس اختیار کیا۔

یہ اقدام ایسا نہ تھا کہ آگے نہ بڑھتا، بڑھا، تیزی سے بڑھا اور بڑھتا ہی گیا۔ وضع میں یہ تبدیلی بھی اُن کے مذہبی جذبات کی آئینہ داری کرتی رہی۔

ہمدرد نے دہلی کے بُز قصابوں کے مطالبہ کو صداقت پر مبنی پا کے، اُن کی ہمدردی کا بیڑا اُٹھایا۔ اس سلسلہ میں بُز قصابوں سے جو ہڑتال کرائی وہ دہلی کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ یہ مکمل ہڑتال کامل ایک ماہ جاری رہی۔ دہلی میں گوشت کبریت احمر ہو گیا۔ دہلی والے گوشت کو ترس گئے۔ چند ہی افراد تھے کہ جو غازی آباد اور رہتک اور دیگر مقامات سے چُرا چھپا کے گوشت لے آتے تھے۔ ورنہ بیشتر صبر شکر کر کے بیٹھے رہے۔

عمالِ حکومت خصوصاً دہلی کا ڈپٹی کمشنر کہ جو اس وقت تک بخیالِ خود دہلی کا ڈکٹیٹر اور فعال مایرید تھا۔ اب جواس باختہ تھا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ مولانا پر اسی نوعیت کا مقدمہ دائر کر دے کہ جیسا کامریڈ پر چل چکا تھا لیکن اُس کے انگریز قانونی مشیروں نے اُس کو اس غلط اقدام سے باز رکھا۔

آخر کار بُز قصابوں کے مطالبات پورے کرنا پڑے۔ ہڑتال کامیابی سے ختم ہوئی اور حالات اعتدال پر آ گئے۔

اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَالْبُغْضُ لِلّٰہِ

مولانا ئے مغفور مغضوب الغضب ضرور تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ الحب للہ والبغض للہ پر کاربند تھے۔ ان کا غصہ و غضب بے سبب نہیں ہوتا تھا لیکن اگر سبب ہوتا تھا تو وہ جذبات سے مغلوب ہو جاتے تھے۔ خود فرماتے ہیں :-

"جوہر" —— "علی برادران"
کراچی کے قیدی

وفد خلافت یورپ

وقتاً فوقتاً دیتے رہتے تھے۔ اور وہ اُن کو محفوظ رکھتا گیا۔ اب وہ وقت آیا کہ ایک معاملہ میں خواجہ صاحب سے مخالفت پیدا ہو گئی۔ پمفلٹ باز نے خواجہ صاحب کے کارناموں کی تفصیل جو دستاویزی شکل میں مرتب کر چکا تھا مولانا کو بھیج دی۔ مسئلہ ذاتی نہیں تھا۔ قومی اور ملکی تھا۔ مولانا کسی طرح نہ برداشت کر سکے تو وہ دستاویز کہ جو خواجہ صاحب کے کارناموں کا مرقع تھی، لے کر حکیم مسیح الملک رح کے سامنے رکھ دی اور کہا کہ یہ مراسلات ایسے نہیں ہیں کہ جو نظر انداز کیے جا سکیں۔ حکیم اجمل خاں سلیم الطبع، مرنجاں مرنج، ٹھوس کام کرنے والے بزرگ، اُنھوں نے بہت کچھ سمجھایا کہ لنا اعمالنا ولکم اعمالکم۔ خواجہ صاحب کا کردار ہمارے پیش نظر ہے، تم اس قضیہ میں نہ پڑو۔ جو کام تم کر رہے ہو وہ بہت اہم ہے اُسی میں مصروف رہو۔ ترک موالات کی تحریک بہت دور رس ہے۔ اس میں پوری ہمت سے لگے رہو۔ لیکن مولانا مغفور نے ایک نہ سُنی اور ہمدرد کے کالموں کو افشائے راز کے لیے وقف کر دیا۔

اس کا جو نتیجہ ہوا وہ دنیا جانتی ہے، یہاں اس کی توضیح مزید بے محل ہے۔

مولانا کا ایک جعلی خط اور سی۔ آئی۔ ڈی

مولانا پر جو الزامات انگریزی حکومت عائد کر رہی تھی وہ روز افزوں تھے۔ الزامات صحیح بھی ہوتے تھے اور غلط بھی ہوتے تھے۔ ان کی تہ میں وہ جعل ہوتا تھا کہ جو سی۔ آئی۔ ڈی تصنیف کرتی رہتی تھی۔

چنانچہ مولانا کا ایک خط بنام حبیب اللہ خاں والی افغانستان پکڑا گیا۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ تحریک ترک موالات" اور خلافت پورے شباب پر تھی۔ اس خط میں گویا کہ امیر کو دعوت دی گئی تھی کہ ہندوستان پر حملہ کریں۔ اور یہ وعدہ بھی تھا کہ ہندوستانی مسلمان ہر امکانی امداد دیں گے۔

اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کا جذبہ اور اس سلسلہ کا جوش و خروش مولانا کا رہین منت ہے۔ فرماتے ہیں کہ قید غلامی بدترین قید ہے۔ جذبہ حصول آزادی کو یوں اُبھارتے ہیں :-

قید ہے قید غلامی، دو برس کی قید کیا
دیکھو کب ہوتا ہے خاتمہ اس قید بے میعاد کا

ساتھ ہی ملک کی آزادی سے مایوس نہیں ہیں، فرماتے ہیں :-

حق کے آتے ہی ہوا کعبے سے باطل رخصت
چند دن اور ہیں دہلی میں بتانِ دہلی

مولانا [illegible] زندگی [illegible] لو [illegible] اور محمد [illegible] دہلی کے [illegible] کردہ خط [illegible] کوئی

ہندو مسلم اتحاد پر ضرب کاری تھی۔ یہی وہ قیامت تھی جس نے ہندوستان میں حکومت برطانیہ کی بنیادیں ہلا دی تھیں

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا۔

کی یہ زندہ مثال تھی۔

کانپور کی مسجد اور شہدائے کانپور

مولانا کا ارشاد ہے:۔

مسرور خلد میں ہیں شہیدان کانپور — ہوں گے شریک بزم شہیدان کلکتہ
شبلی سا شخص نوحہ گر کانپور تھا — لاریب آج تھا وہی شیدایان کلکتہ

کانپور کی مسجد کا ہنگامہ معمولی نہ تھا، برطانوی عہد کا یہ خونی واقعہ آج تک دنیا نہیں بھولی ہے۔ حکومت نے اپنی بہیمانہ قوت صرف کر کے مسلمانوں کے اسلامی جذبہ کے ساتھ دل کھول کر ہولی کھیلی۔ نیچے سے اوپر تک سب ہی حکام انگریز تھے اور ایک دوسرے کے حامی و معاون۔ مسلمانوں کو قصوروار قرار دے دیا تھا۔ مسجد کی حرمت کی حیثیت کیوں ہوتی۔ مسٹن کی حکومت گویا انصاف پر تلی تھی۔ چنانچہ یو۔پی کے گورنر مسٹن (بعد میں لارڈ مسٹن) معائنہ موقع اور مشاہدۂ حالات کے لیے کانپور گئے۔ ایک معزز عہدہ دار کی روایت ہے کہ لارڈ صاحب ڈنر کی میز پر تھے کہ ان کے سیکریٹری یا خانساماں نے ان سے کہا کہ اس وقت کی گاڑی سے مسٹر محمد علی آ گئے ہیں۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ سنتے ہی گورنر کے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ گیا، گورنر کو اس حد تک مرعوب دیکھ کر خانساماں مسٹر محمد علی کے لیے پریشان ہو گیا۔ اس نے اسی وقت کسی نہ کسی ذریعہ سے مولانا سے یہ واقعہ کہلا کر یہ التجا کی کہ وہ اسی وقت کانپور سے چلے جائیں۔ ایسا نہ ہو کہ حکومت کوئی حرکت مذبوحی کر گزرے۔ اور مولانا کو کوئی نقصان پہنچ جائے۔

نفس الامر میں اس وقت تک کوئی عام تحریک حکومت کے خلاف شروع نہیں ہوئی تھی۔ بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ حالات عام تحریک کا پیش خیمہ تھے جس کے نتیجہ میں جیل بھر گئے۔ اور جس نے لوگوں کو گولیوں سے بے خوف اور جیلوں کا دلدادہ بنا دیا۔

عمومی تحریک ترک موالات اور تحریک خلافت

عوامی زبان میں مخالفت کو خلافت بھی کہہ دیتے ہیں۔ اس بنا پر تحریک خلافت کو اگر اس مفہوم میں لیا جائے تو وہی تحریک ترک موالات ہو جاتی ہے۔ اس میں مبالغہ کا شائبہ بھی نہیں ہے کہ تحریک ترک موالات کو دل پسند عوام بنانے کا سہرا حضرت مولانا ہی کے سر رہتا ہے۔ انہی کی ذات گرامی تھی کہ جس نے اس کی گونج ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دی۔ اور بہ استثنا بعض اعتدال پسند یا انگریز پسند افراد کے ہر متنفس نے اس تحریک کو اپنا عقیدہ بنا کر انگریزوں کو ملک سے نکالنے کا بیڑا اٹھا لیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جیل خانے تنگ ہو گئے۔ درسگاہیں خالی ہو گئیں۔ عدالتوں سے وکیل غائب ہو گئے۔ تعلیمی بائیکاٹ کی کامیابی مولانائے مغفور کی رہین منت ہے۔ اس کی زندہ اور ترقی یافتہ یادگار جامعہ ملیہ دہلی و نیا

از غلام احمد فرقت کاکوروی

رئیس الاحرار مولانا محمد علی مرحوم

رئیس الاحرار مولانا محمد علی کو پہلی بار میں نے ۱۹۲۱ء میں لکھنؤ رفاہ عام کے ایک جلسہ میں دیکھا تھا۔ میں اس وقت اسکول میں پڑھتا تھا۔ تھوڑے دن پہلے والد صاحب کا انتقال ایسے ناگہانی حالات میں ہوا کہ بھائی بہنوں اور والدہ کی کفالت کے لیے انہوں نے کوئی اثاثہ بھی نہ چھوڑا تھا۔ اس لیے مجھے شہر کے گلی کوچوں میں بطور ہاکر اخبار حقیقت بیچنا پڑتا تھا۔ جس سے میرے تعلیمی اخراجات اور گھر میں کھانے پکانے کا کام چلتا تھا۔ اگر ایسا نہ کرتا تو نہ پڑھ پاتا اور نہ گھر کا خرچ چل پاتا۔ اخبار حقیقت یوں تو اس وقت ہفتہ وار تھا۔ مگر جس روز ملک میں کوئی خبر یا کوئی سیاسی ہنگامہ ہو جاتا اس روز دوپہر سے شام اس کا ضمیمہ شائع ہوتا اور پکوڑیوں کی طرح ایک ایک پیسہ میں شہر بھر میں بک جاتا۔ انیس احمد عباسی اس کے پروپرائٹر تھے۔ اور حکیم شفیق احمد تسنیم [illegible] اس کے ایڈیٹر تھے۔ جو انیس احمد صاحب عباسی کے چھوٹے بھائی تھے۔ مجھے چار آنہ روپیہ کمیشن ملتا تھا۔ سویرے دس بجے سے ۲ بجے دن تک اخبار بیچتا اور اسکول چلا جاتا۔ اور دوپہر سے شام تک بیچتا۔ اگر شام کو بھی کوئی ضمیمہ نکلتا تو اسے دس گیارہ بجے رات تک بیچتا۔ اس میں بھی ڈیڑھ دو روپیہ مل جاتے تھے۔ اس زمانہ کے دو ڈھائی روپیہ اس دور کی گرانی کے پیش نظر بارہ چودہ روپیہ سے کم نہ تھے۔ کیونکہ ڈیڑھ روپیہ کا گیہوں اور دو آنہ تین پیسے گز کھدر بکتا تھا۔ اس زمانہ میں حریت کا دور دورہ تھا کہ ملک کے ذرہ ذرہ سے جان نثار حریت پر مرنے کی آوازیں بلند ہوتی تھیں۔ رفاہ عام کے جس جلسہ کا میں نے شروع میں ذکر کیا ہے وہ ایک بہت بڑے پنڈال میں ہو رہا تھا۔ اس میں جو محبان وطن شریک تھے ان میں مہاتما گاندھی۔ مولانا شوکت علی محمد علی۔ بی اماں۔ سی۔ آر۔ داس۔ ڈاکٹر انصاری۔ کستورا بائی۔ چودھری خلیق الزماں۔ مولانا عبدالباری فرنگی محلی مرحوم وغیرہ شریک تھے۔ رفاہ عام میں اب بھی وہ املی کا پیڑ موجود ہے۔ جس کے نیچے یہ پنڈال بنا تھا۔ اور اب بھی جب لکھنؤ جاتا ہوں اور ادھر سے گزرتا ہوں تو بہت سے سیاسی محبان وطن کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ رفاہ عام کے پھاٹک پر جگہ جگہ الاؤ جل رہے تھے جن میں بدیسی کپڑوں کو لوگ اتار اتار کر نذر آتش کرتے اور چہار طرف مجمع کھڑا تالیاں بجاتا۔ دروازہ پر پولیس کے تلنگے کھڑے مسکراتے۔ اسی دن شام کو میں نے اپنا ایک امریکن پرانا کوٹ جسے میں نے نخاس سے ڈیڑھ روپے میں خریدا تھا مارے جوش کے آگ میں جھونک دیا تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ بہت سے

بیٹھی تھیں۔ ان کے بغل میں کستورا بائی اور گرد و پیش ڈائس پر دوسرے لیڈر بیٹھے تھے۔ میں نے دیکھا کہ نہ صرف مولانا
محمد علی اور شوکت علی کو پہلی بار دیکھا تھا۔ مولانا مرحوم اور ان کے بڑے بھائی مولانا شوکت علی ٹوپیاں پہنے تھے۔ ان پر
ہلال بنا ہوا تھا کوئی دس گیارہ بجے رات کا وقت ہو گا کہ پنڈال سے فلک شگاف نعرہ ہائے تکبیر کی آوازیں بلند
ہونا شروع ہوئیں اور مجمع میں بے حد جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ اس وقت نعروں کی گونج میں مولانا محمد علی مرحوم ڈائس پر
تشریف لا رہے تھے۔ اپنی ابتدائی تقریر میں مولانا نے ہندو مسلم اتحاد ان کے روابط پر زور دیا۔ اس کے بعد جب وہ
برطانوی سیاست کے تار پود بکھیرنے پر آئے تو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی سنسان جنگل میں ایک شیر دہاڑ رہا ہے۔ درمیان
میں مجمع کا جوش و خروش اس منزل پہ پہنچ چکا تھا کہ کئی کئی منٹ تک پنڈال نعرہ ہائے تکبیر اور علی برادران زندہ باد کے
نعروں سے اس طرح گونجنے لگتا کہ بعض اوقات یہ خطرہ محسوس ہوتا کہ کہیں پنڈال ہوا میں نہ اڑنے لگے۔ جب مولانا کی
تقریر اپنے پورے شباب پر تھی تو ایک طرف سے آوازیں آنا شروع ہوئیں کہ "سنائی نہیں دے رہا ہے"۔ اس پر مولانا
نے ڈپٹ کر کہا کہ "جن لوگوں تک میری آواز نہیں پہنچ رہی ہے ان کے کانوں میں برطانوی حکومت کی مہریں لگی ہیں۔ وہ میری
تقریر کبھی نہ سن سکیں گے۔ لہذا خاموش ہو جائیں۔" اس کے بعد پنڈال قہقہوں سے گونج اٹھا۔ مجھے صرف اتنا یاد ہے
کہ مولانا بار بار اپنے چہرے سے پسینہ پونچھتے جاتے تھے اور آوازیں زیادہ سے زیادہ تیز ہوتی جاتی اور کرختگی پیدا ہوتی
جاتی تھی۔ انہوں نے کامل سوا گھنٹہ تقریر کی۔ ان کی تقریر کے ایک ایک فقرے کو پریس رپورٹر والے اگلی صف میں اور
بعض بیچ جلسے میں بیٹھے نوٹ کر رہے تھے۔ بس یہ پہلی اور آخری تقریر تھی جو میں نے ان کی سنی اور انہیں قریب سے دیکھا
اس کے بعد کراچی میں علی برادران اور دوسرے رہنماؤں کی گرفتاری کے بعد جو رفاہ عام میں جلسے ہوئے ان میں ان دونوں
بھائیوں کو کبھی ساتھ نہیں دیکھا۔ مولانا شوکت علی سے بعد میں [illegible] میں بارہا ملاقاتیں ہوئیں۔ ان سے باتیں بھی ہوئیں اور
بحثیں بھی مگر مولانا محمد علی سے میری بالمشافہ کبھی ملاقات نہ ہوئی کیونکہ ۱۹۳۱ء میں جب لندن میں گول میز کانفرنس میں تقریر
کرنے کے بعد ان کا انتقال ہوا تو میں [illegible] تھا۔ البتہ مولانا شوکت علی مرحوم سے باقاعدہ میری ملاقات ۱۹۳۷ء کے
جنرل الیکشن کے موقع پر محلہ شکتیا باغ کے ایک جلسہ میں ہوئی۔ مولانا شوکت علی اس وقت نہایت کٹر قسم کے مسلم لیگ کے
حامی ہو چکے تھے۔ اور ہم لوگ پورے جوش و خروش کے ساتھ رفیع احمد قدوائی کی قیادت میں کانگریس میں شریک تھے۔
۱۹۳۷ء کا الیکشن ہندوستان کی تاریخ میں ان معنوں میں ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ ملک بھر میں جو الیکشن لڑے
جا رہے تھے۔ ان کے نتائج سے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت کانگرس کی حامی ہے یا ہندوستانی مسلمانوں کی صحیح
نمائندگی مسلم لیگ کر رہی ہے۔ یوں تو اس الیکشن میں متعدد نشستیں ایسی تھیں جن کو حاصل کرنے کے لیے مسلم لیگ اور
کانگریس دونوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا تھا۔ ورنہ صرف ان کے حاصل کرنے کے لیے روپیہ ہی پانی کی طرح لٹایا
جا رہا تھا بلکہ ہر دو فریق کے لیڈروں نے ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ ان اہم نشستوں میں ایک نشست

تھیں۔ عالم یہ تھا کہ راجہ صاحب محمود آباد۔ اور مولانا شوکت علی اور دوسرے مسلم لیگی رہنما کلام پاک ہاتھوں پر لیے جلسہ کا دیں۔ اور لوگوں کے گھروں پر فرداً فرداً جاتے اور کہتے کہ اس وقت الیکشن کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ کلام ربانی کی عزت کا سوال ہے۔ جس پر مولانا شوکت علی مرحوم کا تو یہ عالم تھا کہ وہ مولانا محمد علی مرحوم کی روح کا واسطہ بھی مسلمانوں کو دیتے جاتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ محلہ صحبتا باغ میں جب ماجدہ بانو کی حمایت میں ایک زبردست جلسہ ہونے والا تھا۔ اس جلسہ میں مجھے بھی تقریر کرنا تھی۔ جلسہ شروع ہونے سے قبل مولانا شوکت علی بھی پہنچ گئے۔ ان کے گلے میں کلام پاک پڑا تھا۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگے۔ میرے بھائی! تم مجھے جانتے ہو کہ میں محمد علی کا بڑا بھائی ہوں۔ آج میرے چھوٹے بھائی کی روح عالم بالا سے تمہارے ووٹ کی طالب ہے۔"

بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ بات محمد علی مرحوم سے شروع ہوئی تھی اور مولانا شوکت علی کے توسط سے ۱۹۳۷ء کے الیکشن تک پہنچ گئی۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ مولانا محمد علی کو صرف میں نے ایک ہی بار دیکھا تھا اور اُن کی تقریر بھی رفاہ عام کے جلسے میں پہلی اور آخری بار سنی تھی۔ مگر اس تقریر سے میں اس درجہ متاثر تھا کہ گھر پر آکر میں اور میرے پھوپھی زاد بھائی حافظ محمد داؤد خلف مولانا ظفر الملک علوی مرحوم دونوں ایک مونڈھے پر یکے بعد دیگرے ڈٹ کر اُسی انداز میں گھر میں عورتوں کے سامنے اور محلے میں دوکانوں کے سامنے تقریریں کرتے اور مولانا کے لب ولہجہ کی نقل اتارنے کی کوشش کرتے۔

۱۹۳۸ء میں جب میں حقیقت اخبار میں آگیا۔ اور جس اخبار کو گلی کوچوں میں بیچتا تھا اُسی کا جوائنٹ ایڈیٹر ہوگیا۔ تو اس کے بعد نہایت باقاعدگی کے ساتھ میں نے تمام سیاسی لیڈروں کی زندگی کا مطالعہ کیا۔ چونکہ مولانا ظفر الملک علوی مرحوم میرے حقیقی پھوپھا تھے اور وہ مولانا محمد علی مرحوم کی بہت سی باتیں بیان کرتے تھے۔ اس لیے وہ اکثر مولانا کے بارے میں بھی بہت سی دلچسپ باتیں بتاتے تھے۔

مولانا محمد علی مرحوم اگر ایک طرف حد درجہ جذباتی تھے تو دوسری طرف بے حد بذلہ سنج اور خوش مزاج بھی تھے۔ چنانچہ اکثر لیڈروں پر ان کی پھبتیاں بہت مشہور ہیں۔ مولانا ظفر الملک علوی ایک خاص وضع اور مزاج کے انسان تھے مولانا محمد علی مرحوم کو ان کے سیاسی نظریات سے اس وجہ سے اختلاف تھا کہ وہ حد درجہ ضدی واقع ہوئے تھے۔ مقصد یہ کہ جس بات کو وہ ایک بار صحیح سمجھ لیتے تھے اسے آخر دم تک صحیح سمجھتے تھے۔ جن لوگوں نے انہیں قریب سے دیکھا ہے وہ ان کے اس کٹرپن سے بخوبی واقف ہیں۔ چنانچہ مولانا محمد علی ان کے بارے میں کہا کرتے تھے کہ عام لوگ تو المُاحقُ کے قائل ہیں مگر مولانا خود الحق مُر ہیں۔ اسی طرح ان کا ایک دوسرا لطیفہ مشہور ہے کہ مولانا ظفر الملک صاحب ایک جلسہ میں جس میں مولانا محمد علی بھی شریک تھے۔ جب سر پر سبز پگڑی اور روئی کا سبز لبادہ پہنے پہنچے۔ تو مولانا محمد علی نے دیکھتے ہی کہا کہ یہاں یہ ہریل کہاں سے آگیا۔

اسی طرح مسٹر ضیاء الدین برنی نے اپنے ایک مضمون میں مولانا محمد علی کے لطائف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ "حکومت ہند میں ایک زمانہ میں سر ڈین برے ہوم ممبر تھے۔ اپنے اخبار کامریڈ میں محمد علی نے لکھا۔ "کون کہتا ہے کہ اسمبلی میں

گدھے نہیں ہوتے۔ وہاں بھی ایک گدھا ہے کیا تم نے اُسے (Bray یعنی رینگنے) نہیں سنا۔ یہ مذاق لندن ٹائمس میں بھی نقل ہوا تھا۔

مولانا کے غیر معمولی حافظہ کے بارے میں مسلم کلب لکھنؤ کے ایک جلسہ میں مولانا صبغت اللہ شہید انصاری فرنگی محلی نے جب سید جالب دہلوی سے درخواست کی کہ وہ حقہ کی ایجاد پر روشنی ڈالیں تو سید صاحب نے اپنی انتہائی انکساری ظاہر کرتے ہوئے حقہ کی ایجاد پر ڈیڑھ گھنٹہ تقریر کرنے کے بعد اور مختلف وضع کے حقوں کی ایجاد اور کوئلوں کی قسمیں بتاتے ہوئے کہا کہ میرا حافظہ اس قدر کمزور ہے کہ مجھے کچھ یاد نہیں رہتا۔ لیکن حافظہ تو مولانا محمد علی کا ہے۔ جنہیں وہ سب کتابیں حفظ ہی نہیں ہو جاتیں جنہیں وہ ایک مرتبہ پڑھ لیتے ہیں بلکہ اُن کتابوں کے صفحے اور سطریں تک یاد رہتی ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ مولانا نے ایک مرتبہ سید صاحب سے امریکن کول مائنس پر مضمون لکھنے کو کہا تو سید صاحب نے فرمایا کہ امریکہ کی کوئلے کی کانوں کے بارے میں ان کے معلومات بہت محدود ہیں۔ اس پر مولانا محمد علی نے اُنہیں کئی کتابوں کے نام بتاتے ہوئے وہ صفحات بھی بتائے جہاں کوئلوں کی خصوصیات کے بارے میں مصنف نے تفصیل سے لکھا تھا۔

خود مولانا نے جو اپنی سوانح حیات لکھی ہے۔ اس میں بھی انہوں نے بڑے دلچسپ انداز میں اپنے بچپن کے واقعات لکھے ہیں۔ جس میں ایک عجیب وغریب بات بی اماں (والدہ محمد علی) کے بارے میں لکھی ہے کہ انہوں نے شادی کے بعد اردو کیسے پڑھی۔ اور ان کا کس بلا کا حافظہ تھا۔ مولانا محمد علی مرحوم کے والد ایک پرانی وضع کے انسان تھے۔ جس کی وجہ سے ان کے گھر کا ماحول بھی بے حد رجعت پسندانہ تھا۔ مسلمان گھروں میں اس دور میں لڑکیوں کو صرف عربی میں کلام پاک پڑھا دیا جاتا تھا یا مذہبی باتیں زبانی بتا دی جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ ناول یا افسانوں کی اردو کتاب بھی اُن تک نہیں پہنچ پاتی تھی۔ مولانا محمد علی کے والد باوجود سخت رجعت پسند ہونے کے ہر قسم کی اردو فارسی، عربی اور انگریزی کی کتابیں پڑھتے تھے۔ اور چونکہ گھر سے خوش حال تھے اس لیے سارا وقت یا تو مطالعہ میں گذرتا تھا یا دوست احباب سے بیٹھک میں مذہبی امور پر بحثیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ اردو کا کوئی ناول پڑھ رہے تھے کہ پڑھتے پڑھتے شب کی نشست برخاست ہونے کے بعد زنان خانہ میں اس خیال سے لے آئے کہ سونے سے قبل وہ اُسے پڑھ کر ختم کر دیں گے۔ مگر وہ رات میں اُسے پڑھ نہ سکے اور سویرے اپنے ہمراہ اُسے لے جانا بھی بھول گئے۔ دوسرے روز مولانا کے چچازاد بھائی نے جب وہ کتاب دیکھی تو وہ ایک اردو ناول تھا۔ اُنہوں نے بی اماں کو اُس کے بعض اقتباسات سنائے جو بے حد دلچسپ تھے۔ اور جو بی اماں کو بھی بہت اچھے معلوم ہوئے۔ اس کے بعد رات کو جب بی اماں سو گئیں تو سوتے میں اُن کے منہ سے اُس کتاب کے وہی اقتباسات من وعن نکلنا شروع ہوئے۔ اتفاق سے مولانا کے والد اس وقت جاگ رہے تھے۔ اُنہوں نے جب سوتے میں بیوی کے منہ سے اردو ناول کے وہ اقتباسات سنے تو دنگ ہو کر رہ گئے۔ بعد میں بی اماں نے مولانا کے چچازاد بھائی سے شوہر سے چھپ کر اپنی اردو پڑھائی کہ شوہر کی زندگی میں ٹوٹی پھوٹی اردو

لکھنے پڑھنے لگی تھیں۔ پھر بعد میں تو انہوں نے باقاعدہ اردو پڑھی۔ اور تحریک خلافت میں جب وہ شریک ہوئیں تو ان کا شمار اچھے قسم کے مقررین میں کیا جاتا تھا۔

محمد علی جتنے بڑے صاحب علم تھے ویسے ہی صاحب کردار بھی تھے۔ چنانچہ جب دلی میں خواجہ حسن نظامی پکڑے گئے اور اتفاقاً ان کے سسر اس میں شہید ہو گئے تو پولیس نے تحقیقات میں بہت بے احتیاطی سے کام لیا۔ بھیا احسان حق جو خواجہ حسن نظامی اور مولانا محمد علی دونوں کے دوست تھے۔ سیدھے محمد علی کے پاس پہنچے۔ اور انہیں صورت حال بتائی۔ یہ وہ زمانہ ہے جب خواجہ صاحب اور محمد علی میں قلمی جنگ ہو رہی تھی۔ لیکن ذاتی تعصبات کو بالائے طاق رکھ کر انہوں نے دلی کے ڈپٹی کمشنر بیڈن سے ٹیلیفون پر ایک گھنٹہ تک گفتگو کی۔ اور انہیں معاملے کے نشیب و فراز سے آگاہ کیا اور یہ زور دیا کہ اس قتل کی پوری پوری تحقیق کی جائے۔ اور مجرموں کو قرار واقعی سزا دی جائے محمد علی کے کیرکٹر کی اس بلندی کا ذکر آج بھی ان کے ان دوستوں کی زبان پر ہے۔ جو ابھی حیات ہیں۔

افسوس ہے کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں آزادی وطن کے اس مجاہد کو اس طرح فراموش کر رکھا ہے کہ جیسے اس نام کا کوئی انسان ہی نہیں گزرا۔ مگر آج بھی فضا میں اس کی وہ تقریر محفوظ ہے۔ جس میں اس نے کہا تھا کہ وہ ایک غلام ملک میں اب سانس لینا بھی اپنی توہین سمجھتا ہے۔ اور ایک آزاد ملک میں مرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ انہوں نے ایک آزاد ہی ملک میں اپنی جان اپنے مالک حقیقی کے سپرد کر دی ؎

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

غلام احمد فرقت کاکوروی
۱۷۰۵، پہاڑی بھوجلہ۔ دلی
۹ مارچ ۱۹۶۳ء

بی پی
ڈبل روٹی
کھانے میں عمدہ
صحت کے لئے مفید
B.P

نزلہ زکام کھانسی کی زود اثر دوا
جوشاندی
جوشاندی
سالہا سال سے نزلہ زکام کے مریضوں کو فائدہ پہنچا رہی ہے
نہ جوش دینے کی قباحت — نہ چھاننے کی ضرورت
صرف ایک پیالی تیز گرم پانی میں دو ٹکیاں ملا کر استعمال کریں۔
صدیوں کے آزمودہ جوشاندے کی ترقی یافتہ شکل
جس میں جوشاندے کے تمام تر فوائد موجود ہیں
ہر موسم میں استعمال ہوتی ہے
ہر جگہ ملتی ہے
JOSHANDI

اوراقِ پارینہ
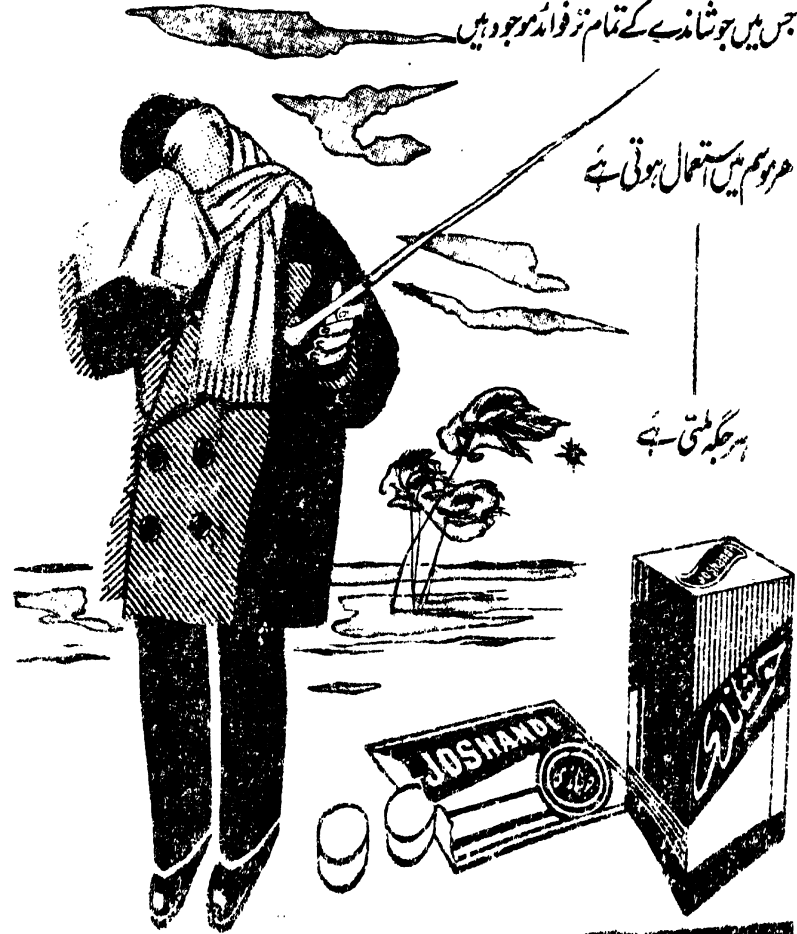
اس عنوان کے تحت محمد علی اور کہیں کہیں شوکت علی کے
بھی وہ احوال اور واقعات درج کیے جا رہے ہیں جو
آج سے تقریباً ۳۵۔۴۰ سال پہلے شائع ہوئے تھے،
اور اب اتنے نادر ہیں کہ کبریتِ احمر کا حکم رکھتے ہیں،
ان میں وہ مقالات بھی شامل ہیں جو محمد علی کے دوستوں اور
ساتھیوں نے تحریر فرمائے تھے اور جو نتیجہ تھے ذاتی
تاثرات و مشاہدات کا! نیز "سیرتِ محمد علی" کے بعض
پہلو جو خصوصی حیثیت رکھتے ہیں شامل ہیں۔
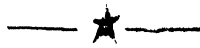
———★———

(از سید محفوظ علی بی اے بدایونی)

محمد علی کا اور میرا ساتھ سب سے پہلے ۱۸۸۹ء میں ہوا جب ان کی عمر دس برس کی تھی اور وہ ذوالفقار بھائی، نوازش مرحوم اور شوکت، اپنے ان حقیقی بھائیوں امتیاز اور امجد اپنے عزیزوں کے ساتھ بریلی اسکول میں پڑھنے آئے اور بورڈنگ ہاؤس میں میرے کمرے سے دو کمرے چھوڑ کر مقیم ہوئے۔ دو برس بعد وہ شوکت کی معیت میں علی گڑھ چلے گئے جہاں ۱۸۹۴ء میں میں بھی پہنچا۔ اور پھر ساتھ ہوا۔ ۱۸۹۵ء میں فارغ ہو کر علی گڑھ سے چلا آیا اور دو تین سال بعد انہوں نے بی اے کیا۔ ولایت گئے اور واپس آئے ۱۹۰۲ء میں جب وہ بڑودہ میں تھے، ہم دونوں پھر ملے اور عرصہ تک بمبئی میں ——— دو ایک دن ایک ہی جگہ قیام ہوتا رہا۔ اس کے بعد ستمبر ۱۹۱۲ء سے یعنی جب سے کامریڈ دہلی آیا نظر بندی کے وقت تک ۲۴ گھنٹہ یکجائی رہی لہٰذا میں کہہ سکتا ہوں کہ محمد علی کی کتاب زندگی کے اول کے دو اور بیچ کے دس گیارہ اوراق چھوڑ کر میرے پیش نظر ہے بلکہ اس کے اکثر باب میرے سامنے رکھے گئے ہیں۔

لیکن میں یہاں نہ اس کتاب کی تلخیص لکھنا چاہتا ہوں نہ اس پر نقد و تبصرہ بلکہ اپنے ایک نہایت ہی عزیز بھائی کی تربت پر محبت کے پھول چڑھاتا چاہتا ہوں۔

محمد علی اوائل عمر میں بظاہر ان جذبات عالم سے بیگانہ نظر آتے تھے جنہوں نے آگے چل کر محمد علی کو محمد علی بنا دیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ وہ ذرہ جو بیابان اور وہ قطرہ جو سمندر بن کر ساری دنیا کو اپنے حدود کے پنہاں اور اپنے ساحل کی آغوش میں سمیٹ لینے والا تھا شروع ہی سے ان کے دل کے کسی غیر آباد گوشے میں خاموش پرورش پا رہا تھا۔

جب وہ ولایت روانہ ہوئے تو ان کے دماغ پر عقل مآل اندیش کا قبضہ تھا مگر ان کے دل پر عشق مصلحت ناشناس کا غلبہ تھا اور ان کے مستقبل کی تشکیل میں دونوں کی رقابت و منافرت کارفرما تھی۔ عقل کی رائے تھی کہ وہ مسٹر ایم علی آئی سی ایس بنائے جائیں مگر عشق کی صلاح تھی کہ رئیس الاحرار مولانا حاجی محمد علی بنیں۔ عقل کی مرضی تھی کہ وہ انصاف کی کرسی پر بٹھائے جائیں مگر عشق کی خوشی تھی کہ الزام کے کٹہرے میں کھڑے ہوں۔ عقل نے انہیں سزا دینے کا طریقہ بتایا مگر عشق نے انہیں سزا پانے کا سلیقہ سکھانا چاہا۔ عقل نے ان کے لئے جج کا چغہ اور وزارت کا خلعت مگر عشق نے جیل کا کرتا اور صبح کا احرام پہنانا چاہا۔ عقل کا مشورہ تھا کہ وہ برنڈلا اور رانگر سال کے زمرہ کا شاگردی میں مگر عشق کا حکم کہ اویسؓ و بلالؓ کے حلقہ غلامی میں آئیں۔ غرض عقل کا فیصلہ تھا کہ وہ یزید

ہیں کہ عشق کا فتویٰ ہے شہید ہوں۔ اس کشاکش میں پایان کار عشق ہی کامیاب ہوا۔ یعنی محمد علی سول سروس کے امتحان میں ناکامیاب ہوئے یہ اس میدان کی پہلی فتح اور اس حکمت کا پہلا سبق تھا۔ آگے آگے دیکھئے۔

اندکے اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

آپ سمجھے کہ یہ کس کا عشق تھا؟ ابتدا میں شاید محمد علی بھی نہ سمجھے ہوں گے۔ یہ عشق تھا اسلام کا، خدمت و نصرت دین کا، امت مرحوم کی حفاظت و ناموس کا، ایک ایک مسلمان کی صلاح و فلاح اور سود و بہبود کا۔ اس کے ایک معمولی اشارہ نے بڑودہ کی ملازمت سے پہلے برداشتہ خاطر اور بیزار کیا۔ مجھے اس کی تفصیل عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔ انگریزی گورنمنٹ کے ایک سابق اعلیٰ عہدہ دار اور ملک کے مشہور مصنف، ادیب اور سیاسی مورخ برادر وطن، بڑودہ کے رکن حکومت مقرر ہو کر یورپ دیس سے آئے۔ ایک موقع سے دوران گفتگو میں سلطنت مغلیہ کا تذکرہ چھڑا۔ رکن حکومت نے اسی کوتاہ نظری بلکہ بے بصری سے جو یورپی مورخوں کی بنائی ہوئی عینک کا خاصہ ہے مارشمن، جیمز اور الفنسٹن کے بے بنیاد مطاعن، اورنگ زیب علیہ الرحمۃ کے ظلم و تعصب کے افسانے گنانے شروع کئے۔ محمد علی کہ جو علامہ شبلی مرحوم کے مضامین عالمگیر پڑھ چکے تھے، یہ دل نے ضبط کہاں، فوراً الجھ پڑے اور متکلم و مخاطب کے تفاوت درجات کو ٹھکرا کر وہ دندان شکن بحث کی کہ مخالف کو نہ صرف خاموش ہونا پڑا بلکہ قبولنا پڑا۔ اس کی دسترس اصل فارسی تاریخوں تک تھی، جو اس مبحث پر سب سے زیادہ قابل وثوق و استدلال ہیں۔ محمد علی نے چاہا تھا کہ اورنگ زیب کے عہد کی مفصل تاریخ یا کم از کم ان کی سوانح عمری لکھیں چنانچہ کچھ مواد بھی فراہم کیا اور نوٹ بھی لکھے مگر سیاسیات کی آندھی میں یہ سب تنکے اڑ گئے۔

بحث کی تلخی سے دونوں میں اس درجہ بدمزگی بڑھ گئی تھی کہ رکن حکومت کی کدورت اور محمد علی کی بددلی میں اضافہ ہی ہوتا رہا جس کا اظہار وہ اکثر کیا کرتے تھے۔ میرے پاس ان کے خطوط کا سرمایہ تھا جس کا زیادہ حصہ میری عمر کی طرح بے پروائی کی نذر ہو گیا۔ اب جو تھوڑے سے رہ گئے ہیں وہ بہت زیادہ عزیز اور قابل قدر ہیں۔ ۲۴ جنوری ۱۹۱۰ء کے ایک خط میں فرماتے ہیں:

"تمہارے جانے کے بعد یہ ہوا کہ کونسل نے باتفاق رائے فیصلہ کیا کہ افیون کی کاشت میں کمی کے مسئلہ پر محمد علی کس طرح جواب دہ نہیں ہیں اس کے بعد میں نے اپنی ترقی کی درخواست دی، یہ معاملہ ٹالا ہوتی رہی۔ اس عرصہ میں مسٹر .... (رکن حکومت) کا نزول ہوا۔ انہوں نے کچھ مگر ٹھیلنے کا بہانہ" ان کی رائے میری ترقی کے خلاف ہوئی۔ اس لیے مجھے کوئی جواب نہ ملا۔ اس عرصہ میں ٹائمز آف انڈیا میں چند مضامین میرے شائع ہوئے جن میں مسلمانوں کے حقوق کی پیروی کی گئی تھی اور مسٹر .... کی دوستی نادشمنی کا پردہ فاش کیا گیا تھا مسٹر .... (رکن حکومت) سخت ناراض ہوئے اور میرا جواب طلب کیا گیا میں نے جواب بقدر دندان شکن دیا کہ پنچ پون ٹہر کونسل میں جواب پیش ہوا اور کچھ نتیجہ نہ نکلا سوا اس کے کہ ایک عام سرکلر شائع کیا جائے اور وہ بھی تنبیہ کہ سرکاری عہدہ داروں کو ایسے مضامین لکھنا مناسب نہیں ہیں جن کی وجہ سے مختلف مذاہب و اقوام میں مخالفت پیدا ہو .... ریاست سے سخت بیزار ہوں .... نوکری سے بیزار ہوں .... موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں۔"

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ریاست سے بیزاری، نوکری سے بیزاری، یہاں تک کہ زندگی سے بیزاری بالآخر یہ دنیا سے برداشتہ خاطری کیوں ہے؟ کیا صاف نظر نہیں آتا کہ کوئی مصلحت ناشناسی تعلقات کی بیڑیوں کو کاٹ کر معلوم، متعارف و مستعمل شاہراہ سے جبراً ہٹا کر کسی نامعلوم و نادیدہ راستہ پر چلانا اور کسی نئی جگہ پہنچانا چاہتا ہے؟

اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را

یہ خط مجھے وطن میں ملا تھا چونکہ اصرار و تقاضے سے بلایا تھا لہذا نوساری پہنچا۔ ملاقات ہوئی۔ وہی دکھڑا، وہی ملازمت سے بیزاری اور وہی رکن حکومت کے خلاف شکوہ مسلم بیزاری۔ ان جدید کوششوں اور نئی امیدوں کے متعلق بھی گفتگو ہوئی جو نظر کے سامنے پھول کھلا رہی تھیں اور جس کا خط میں تذکرہ تھا۔ نوساری سے بمبئی آئے۔ ٹائمز کے دفتر میں گئے۔ ایڈیٹر نے ان کے مضامین کی داد دے کر کہا "مسٹر محمد علی اب اپنے قلم سے کام لیتے اور ہمیں مدد دیتے رہیں۔ یہ تو ہم کہہ کیسے کہہ سکیں کہ آپ ہمارے اسٹاف میں آجائیں مگر یہ کہہ سکتے ہیں کہ جہاں رہیں ہمیں قلمی امداد دیتے رہیں۔ ہم خدمت کو حاضر ہیں۔" آفس سے باہر نکل کر کہنے لگے "بھائی سنا کیا کہتا تھا" میں نے جواب دیا

"ہاں سنا، جب نوکری سے اتنا بیزار ہو تو چھوڑ چھاڑ کر اپنا اخبار کیوں نہیں نکالتے، خدا جانے یہ الفاظ قبولیت کا وقت تک کر اور اجازت وعدہ لے کر آئے تھے۔ ادھر زبان سے نکلے اور ادھر دل میں بیٹھ گئے۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے دل میں پہلے ہی سے یہ خیال ہو۔ بہر کیف راستہ بھر یہی باتیں رہیں کہ مذہب اور ملک کی خدمت کا ایک زبردست اور مؤثر ذریعہ اخبار بھی ہے اور جب قلم پر پوری قدرت بھی اور طبیعت کو مناسبت بھی ہے تو اسی ذریعہ سے خدمت کیوں نہ کی جائے۔ گھر پہنچ کر بھی سونے کے وقت تک یہی باتیں رہیں۔ دوسری صبح کو دروازے سے قدم باہر رکھتے ہی یہ منصوبہ بھی خیال کے احاطہ سے نکل کر عمل کی سرحد میں داخل ہو گیا۔ یعنی ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار کے اخراجات کا اندازہ کرنے کے لیے جان ڈکنسن کمپنی کے یہاں گئے۔ اس شام کو مسٹر محمد علی اپنے عزم راسخ میں دنیاوی بہشت کو دوزخ میں ڈال کر اپنی ہستی کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر چکے تھے۔ کامریڈ تو عرصہ کے انتظار اور پورے انتظام کے بعد کہیں کلکتہ سے نکلا مگر مجھے فخر ہے کہ مذہب و ملک و ملت کی خدمت کے میدان میں محمد علی کا سب سے پہلا قدم جو اٹھا وہ غریب خانہ ہی سے اٹھا یعنی انگریزی اخبار نکالنے کی تعمیم وہیں سے ہوئی۔

اس کے بعد ملازمت سے بوضع تنخواہ رخصت لی۔ جو استعفے کی محض نظر فریب شکل تھی، مذہب و ملک کی خدمت کے لیے کمر باندھی، کلکتے گئے۔ کامریڈ نکالا، دہلی آئے، کامریڈ کے ساتھ ہمدرد جاری کیا۔ جنگ طرابلس میں چندہ فراہم کیا۔ بلقان میں طبی مشن بھیجا، انجمن خدام کعبہ کی بنیاد ڈالی۔ مسجد کانپور کے سلسلہ میں ولایت گئے۔ نظربند ہوئے، قید ہوئے، اخبار بند کرایا، گھر بار لٹایا، حاجی ہوئے اور آخر میں دارالکفر میں جان دے کر، دارالایمان اور مدینۃ الانبیاء میں زندگی جاوید پائی۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کس طرح اندک اندک عشق در کار آورد بیگانہ را۔

بڑودہ، بمبئی کلکتہ اور دہلی میں مرحوم خفیف سی علالت میں بھی دیار غیر میں مارا وطن سے دور مار کر بے کسی کی شرم رکھ لینے پر غالب کے الفاظ میں خدا کا ہمیشہ شکر ادا کیا کرتے تھے۔ خدا کی قدرت دیکھئے کہ موت دیار غیر ہی میں آئی۔ جہاں بے کسی کی شرم رہ گئی۔ کیونکہ سوائے چند خاص عزیزوں کے نہ وہاں ہم نشین تھے، نہ ہم زبان اور نہ تیماردار تھے نہ نوحہ خواں۔ مگر اس دیار غیر میں عاشق کا جنازہ جس دھوم سے نکلا تھا اور شبیہہ کے کفن کے بنا ڈپر جس چادر سے وہاں حوروں کی آنکھ پڑتی تھی اسے دیکھ کر تو شاید اکثر رفقاء کو سخت شکوہ بھی پیدا ہوا کہ جب آئے ہیں نہ رہے گی تو پھر آج ہی کیوں نہ آ گئی۔

اسلام کی نصرت کا جذبہ مرحوم کی طبیعت میں پہلے شوق بنا، پھر ولولہ اور آخر میں جنون، یہی جنون تھا جو کامریڈ کے مضمون پر اور جامع مسجد کے ممبر پر قلم اور زبان سے اہل احتساب کو دعوت گیر و دار دیتا تھا۔

طفلان شہر بے خبر انداز جنون ما
با ایں جنوں ہنوز سزاوار سنگ نیست

جنوں کی سرکار سے سب سے بڑا انعام، خلعت سہ پارچہ عطا ہوا، اور ادب میں پہاڑ کا سا استقلال، طبیعت میں دریا کا سا بہاؤ، اور جذبات میں طوفان کا سا جوش تھا۔ اسی کی بدولت تو تھا کہ خدمت مذہب کے جو نوذہن پر آئے اس کی بجا آوری پورے التفات، استقلال، نہایت تیزی و روانی اور شدید جوش و انہماک سے کی۔

قید و بند کی جو سختیاں جھیلنی پڑیں وہ نہ تو کسی دوسرے شخص کے اعمال و افعال کی پاداش تھی نہ ناگہانی افتاد ہیں کہ بلا علم و اطلاع اتفاقیہ سر پر آپڑی ہوں بلکہ خود ان کی اپنی ہی تحریروں اور تقریروں کے جرائم کی سزائیں تھیں۔ اور یہ جرم وہ تھے جن کا ارتکاب انہوں نے کسی قدر جوش یا وقتی اشتعال کی حالت میں نہیں بلکہ خوب سوچ سمجھ کر اور اچھی طرح جان بوجھ کر کیا تھا۔ چنانچہ سزا بھگتنے اور ہر کڑی جھیلنے کے بعد ان کا رد نکتہ رونگٹا بھی پکارتا تھا۔

آں قدر زخمے دل من داشت در پیکاں نہ بود

اور یہ میں آج نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ ایک دیوانہ اب سے بارہ برس پہلے ہی الفاظ ان کی رہائی کے دن کہہ چکا ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خود انہوں نے اسی لطیف تر پیرایہ میں ادا کیا ہے ؎

بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد[1]

خدا کے خوف کے ساتھ، دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے بے خوفی ایک مسلمان کی خصوصیت امتیازی اگر آج نہیں تو پہلے کسی زمانہ میں تو تھی۔ دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے ان کی بے خوفی کے واقعات تو دنیا بھر کے علم و ذہن میں ہوں گے مگر خدا کے خوف کے متعلق یہ آنکھیں آج اور اس وقت گواہی دینے کو موجود ہیں کہ —— ماضی قریب میں نہیں جب کہ محمد علی کی ہیئت کذائی خشوع و خضوع کی قد آدم تصویر بن گئی تھی۔ بلکہ ماضی بعید میں جب کہ سوٹ بوٹ، منڈی ڈاڑھی، اور

---

[1] یہ مصرعہ مولانا حالی کا ہے پورا شعر یہ ہے۔

تعزیر عشق جرم ہے بے ضربہ محتسب
بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

جوہر مرحوم نے اپنی نظر بندی کے زمانہ میں جو غزل اس ضمن میں کہی اس کا شعر یہ ہے۔

لذت ہنوز مائدہ عشق میں نہیں
آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد

قیصر کی مونچھیں بظاہر خدا سے بے خوفی کا پورا مجسمہ پیش کرتی تھیں ۔۔۔۔۔ فجر کی قضا نماز کے بعد سجدے کی جگہ کو تر ہوتے، دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو کانپتے، سائل کو دیتے کے لیے جیب سے رقم کے ساتھ آنکھوں سے آنسو نکلتے دیکھا ہے دل کے اسی گداز نے دکھا دیا کہ دنیا کے خریدار مسٹر محمد علی کو معمورۂ لندن سے خالی ہاتھ لوٹے مگر دین کے طلب گار مولانا محمد علی خزانہ مہر دلی سے جھولی بھر لے گئے۔

بستند رہ جرعہ آبے بہ سکندر
دریوزہ گر مے کدہ صہبا بہ کدو برد

مولانا محمد علی عجیب خوش نصیب شخص تھے جنہیں جینا بھی خوب آتا تھا اور مرنا بھی خوب آیا۔ جو عملاً دکھلا گئے کہ زندگی چاہے شروع اپنے ذاتی عیش ہی کے خیال سے کی جائے مگر ختم دوسروں کے آرام کی خاطر ہونی چاہیئے۔ چونکہ قسمت میں اس کے خدا پرست مسلمان کی زندگی لکھی تھی اور ایک مجاہد کی موت۔ جو اللہ کے عاشق تھے۔ اللہ کے رسولؐ کے عاشق تھے رسولؐ کی امت کے عاشق تھے۔ امت کے ہر فرد کے عاشق تھے۔ اور اسی لیے ساری دنیا کے محبوب سردار، رسول اللہؐ کے مخصوص خادم اور اللہ کے مرحوم بندے تھے۔ واللہ یختص برحمتہ من یشاء واللہ ذوالفضل العظیم

خادمِ کعبہ مولانا شوکت علی

(از: مولانا صبغۃ اللہ شہید فرنگی محلی)

۱۹۱۲ء کا ایک ٹھنڈا دن تھا کہ حضرت مولانا عبدالباری قدس سرہ کی نشست گاہ میں ایک جوان کو دیکھا بھاری بھرکم، ملیاقد متاثر کرنے والا بشرہ، پیشانی درخشاں، آنکھیں چمکدار، سر پر بالوں دار ٹوپی، داڑھی بالکل صاف، مونچھیں بڑی، جن کی نوکیں اوپر کو بلند قیمتی سوٹ، اور اعلیٰ درجہ کا بوٹ پہنے ہوئے، نہایت چست چوڑی دار پاجامہ، رفتار تیز، ہاتھ میں سگار، چہرے پر عجیب دلکشی اور علی گڑھی انداز سے زبان پر "السلام علیکم"۔

یہ تھے مسٹر شوکت علی بی۔ اے علیگ، علی گڑھ کے انجمن طلبائے قدیم کے نامور سیکرٹری، ہندوستان کے مشہور ترین کرکٹ باز اور باؤلر اور حکومت ہند کے محکمۂ افیوں کے ایک اعلیٰ افسر جو اپنی فیشن آبی، بذلہ سنجی، ظرافت و ذہانت، حسنِ انتظام، مقبولیت عامہ اور اسی کے ساتھ کسی سے نہ دبنے والے بلکہ انگریز تک کو انتقاماً دھکا دے دینے اور طمانچہ تک مار دینے والے نڈر اور بے باک سپاہی جو مسلم یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کرنے یا لکھنؤ کے اعیان سے تبادلۂ خیالات کرنے تشریف لائے تھے، اور ان کے طالع سعید نے انہیں فرنگی محل پہنچا دیا تھا۔

میں ان کے مختصر حالات سے کچھ واقف تھا اور ابھی دو ہی برس کی بات تھی کہ ایک تقریب عقد میں جو بنارس میں ہوئی تھی میرے چچا مولانا عنایت اللہ نے ان کی بذلہ سنجی، سخن فہمی اور خاموش نہ رہنے دینے والی ذہانت، اور اس سے "محفل پر چھا جانے" کے خاص ڈھب کو آنکھوں سے دیکھ کر ہم لوگوں میں کچھ اس طرح ان کا ذکر کر دیا تھا کہ میں ان کا مشتاق ہونے کے ساتھ ان سے مرعوب تھا، یہ روح افزا صحبت دیر تک رہی جس میں یونیورسٹی، جنگ طرابلس اور شاہ ٹلی کی اس دھمکی کا بھی ذکر ہوا جو اس نے خانہ کعبہ کو ڈھا دینے کی دی تھی، گفتگو زیادہ تر مذہبی معاملات پر رہی جس سے گفتگو کرنے والوں کی اسلامی تڑپ اور حمیت کا اندازہ ہوتا تھا، صحبت برخواست ہونے پر شوکت، نے حضرتؒ سے ادب کے ساتھ مصافحہ کیا اور ہم حاضرین محفل سے باری باری ہاتھ ملایا، ایک انگریزی تعلیم یافتہ ملکہ [illegible] یا انگریز کے اس پرخلوص برتاؤ نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں دور تک ان کی مشایعت کرتا رہا۔

اس کے بعد لکھنؤ کے مختلف اجتماعات میں ان سے ملاقاتیں ہوئیں اور اس زمانہ کے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کے دستور کے خلاف انہیں سلام و کلام میں ہمیشہ پیش قدمی ہی کرتے پایا، اس کے بعد خدام کعبہ کا باقاعدہ کام شروع ہو گیا اور وہ اس کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے اور اس سلسلہ میں سال میں کئی بار وہ لکھنؤ آئے اور حضرت مولانا عبدالباریؒ کے جو اس انجمن کے خادم الخدام (صدر) تھے مہمان ہوتے اور ان سے بے تکلفانہ ملاقاتیں برابر ہوتی رہتیں، جس سے ان کی بڑھتی ہوئی مذہبی تڑپ کا بھی اندازہ ہوتا اب کوٹ کے اوپر "خادم کعبہ" کا بیج نمایاں ہوتا اور ان کی کلاہ افتخار کا طرہ بھی خادم کعبہ نما یعنی ان کی ٹوپی پر بھی بیج نوبدار نمایاں ہوتا۔

دوسری طرف وہ سلسلہ مسلم یونیورسٹی سر آغا خان کے سیکرٹری کی حیثیت سے برابر دورے بھی کرتے رہے اور ان خاص صلاحیتوں

اور پرتاثیر شخصیت اور گفتار نے وہاں سے لاکھوں دلائے جہاں سے ہزاروں کی امید ہوتی ایک دن اطلاع ملی کہ علی برادران قانون تحفظ ہند کے ماتحت نظربند کر دیے گئے اور مہرولی میں انہیں قیام کرنے کا حکم دیا گیا۔ ان نظربندی کے زمانہ میں جب کہ وہ لینسڈاؤن میں تھے حضرت مولانا عبدالباریؒ سے مشرف بہ بیعت ہوئے اور اب میرے ان کے تعلقات اتنے ہوگئے تھے کہ وہ مجھے گرامی ناموں سے ممتاز کرتے۔ وہ چھندواڑے میں تھے اور میری ان کی خط و کتابت جاری تھی کہ ایک دن ان کے خط کے ساتھ ایک گروپ بھی آیا جس میں ایک ضعیفہ سراپا نور خاتون کرسی پر تشریف رکھتی تھیں اور کرسی کے پیچھے دو جوان بہ ادب استادہ تھے جن کی داڑھیاں جاذب نظر اور وہ خود سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود کی ایمان آفریں تصویر تھے ان میں بلند قامت نوجوان ہمارے شوکت بھائی تھے اور دوسرے مولانا محمد علی اور یہ ضعیفہ بی اماں یعنی ان کی والدہ محترمہ تھیں اور نیچے انگریزی میں لکھا ہوا تھا لائنس اینڈ کبس یعنی شیرنی اور اس کے بچے۔ اس نظربندی میں ان کی آنکھیں جس طرح کھلی ہیں ان کا صحیح اندازہ ان مکاتیب سے ہوگا جن میں آمد ہی آمد ہے آورد کا نام ہی نہیں۔

نظربندی سے دسمبر ۱۹۱۹ء میں رہائی کے بعد وہ اور مولانا محمد علی سیدھے امرتسر پہنچے اور کانگریس کے اس اجلاس میں شریک ہوئے جو موتی لال کی صدارت میں وہاں ہو رہا تھا اور یہیں یہ دونوں بھائی جمعیۃ علما کے اس بنیادی جلسہ میں آئے جو حاجی محمد شریف تاجر چرم کے مکان پر ہو رہا تھا، یاد رہے کہ جمعیۃ علما کا پہلا جلسہ امرتسر میں ہوا تھا اور وہیں اس کی بنیاد پڑی تھی، اور راقم الحروف کو فخر ہے کہ وہ بھی اس جمعیت کا تاسیسی ممبر تھا۔

اب یہ دونوں بھائی کانگریس کے باقاعدہ ممبر تھے اور گاندھی جی کے دونوں ہاتھ، اس کے بعد ہر تحریک، ہر عمل اور ہر اقدام میں دونوں بھائی ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح منسلک تھے جیسے ایک جسم میں دماغ اور جوارح، اور اسی لیے ۱۹۱۹ء سے لے کر مولانا محمد علی کی وفات تک ذاتی حالات کو چھوڑ کر دونوں بھائیوں کی سوانح عمری تقریباً ایک ہے، کانگریس میں دونوں ایک ساتھ شریک ہوئے تحریک خلافت دونوں ہی کا نام ہے، جمعیۃ علما کے دونوں کرتا دھرتا۔ نظربندی اور جیل میں دونوں ایک دوسرے کے قوت بازو۔ دونوں ایک ساتھ شرف بیعت سے مشرف ہوئے۔ اور دونوں ایک ساتھ مولانا ہوئے، مجھے خوب یاد ہے کہ جس اجتماع میں ان دونوں بھائیوں کو مولانا کی سند دی گئی اس میں میری ایک نظم بھی پڑھی گئی جس کا ٹیپ کا ایک بند تھا

شوکت دین محمدﷺ کا یہ ساماں کر لو　　　　اپنے ساقی سے تم اب بیعت رضواں کر لو

تو دونوں بھائیوں کے سر پل رہے تھے اور دونوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے۔ انگریز کے دونوں باغی، انگریزی فوج میں شمول کی حرمت کے اعلان میں دونوں ہم آواز اور پھر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں دونوں کلمہ حق عند سلطان جائر میں دو نغمے تھے جن سے ایک آواز نکل رہی تھی۔

کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہماری حیات قومی اشاعت اسلامی اور حریت وطنی کے لیے دونوں ان دو آنکھوں کی طرح تھے جو دو ہونے کے باوجود کسی چیز کو دیکھنے میں ایک ہی ہیں ان دونوں بھائیوں میں موازنہ بے انتہا ہونے کے ساتھ مشکل ہے ہی مولانا شوکت علی اپنے نامور بھائی سے اتنا بڑے تھے کہ محمد علی کی تربیت و تعلیم میں ان کا بڑا حصہ رہا اور چونکہ یہ دونوں بھائی یتیمی میں پروان چڑھے اس لیے مولانا شوکت علی مولانا محمد علی کے باپ کے بجائے بھی سمجھے جا سکتے ہیں بہرحال آزادی وطن مسلمانوں میں شعور اسلامی

★ مولانا عبدالماجد دریا بادی ★

●

مولانا عبدالماجد دریا بادی محمد علی کے چھوٹے دوست اور میرے سراپا شفقت بزرگ ہیں۔ ندوۃالعلماء کی طالب علمی کے زمانے سے اب تک میں انکی شفقتوں اور کرم فرمائیوں سے بہرہ ور ہوتا رہا ہوں۔

جوہر سیریز کی پیش کش " علی برادران " کے لئے میری پہلی درخواست پر صاحب موصوف نے علی برادران سے متعلق وہ سارا ذخیرہ مجھے مرحمت فرما دیا جو ان کے پاس موجود تھا۔

کس منہ سے شکر کیجئے اس لطف خاص کا

رئیس احمد جعفری

اور ہندوستان میں انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کی جو بھی تاریخ کبھی لکھی جائے گی اس میں یہ دونوں بھائی اس شان سے ملیں گے کہ
اکثر و بیشتر ایک کے مجاہدات وہی ہیں جو دوسرے کے ہیں یہ ضرور ہے کہ بعض حیثیات سے ایک بھائی کو دوسرے پر فضیلت بھی تھی
مثلاً علمی حیثیت سے چھوٹے بھائی برتر تھے مگر بڑے بھائی بھی عملی حیثیت سے غیر معمولی برتری رکھتے تھے دماغی حیثیت سے اگر مولانا
محمد علی کی عظمت مسلم ہے تو تنظیمی قابلیت میں مولانا شوکت علی یکتائے عہد تھے اگر اہم اور پیچیدہ مسائل اور قانونی موشگافیوں
میں مولانا محمد علی فرد تھے تو میدان عمل کے یہ بھی مرد میدان رہے۔ مولانا محمد علی کی خطابت اور زور استدلال اگر بے مثال تھا تو بڑے
بھائی کی مختصر گفتگو بھی دل نشینی میں بے نظیر غرض ان دو بھائیوں کے گہرے مطالعہ کے بعد دونوں کا باہمی فرق سیاسی زندگی
میں بتاتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ چھوٹے لیڈروں کے لیڈر تھے اور بڑے عوام کے محبوب راہنما۔

یوں تو جمعیت مرکزیہ خلافت کے ایک رکن اور تحریک خلافت و ترک موالات کے ایک مبلغ کی حیثیت سے مجھے شوکت
بھائی کے ساتھ کام کرنے کا فخر کئی سال حاصل رہا لیکن مجھے یہ بھی شرف حاصل ہے کہ کئی مہینے مرکزی خلافت کے دفتر بمبئی میں
اس کے شعبہ نشر و اشاعت سے وابستہ رہنے کا اعزازی طور پر تقریباً چھ مہینے مجھے موقع ملا اس عرصے میں مجھے مولانا شوکت علی کا
گہرا اور مسلسل مطالعہ کرنے ہی کا موقع نہیں ملا بلکہ مجھے ان کا ہم پیالہ و ہم نوالہ رہنے کا شرف بھی حاصل ہوا ہم دونوں ایک
ہی بلڈنگ میں رہتے ایک ساتھ کھانا کھاتے۔ اس زمانہ قیام کے چند واقعات اور چند تاثرات ان کی سیرت کی آئینہ نمائی
کریں گے۔ مولانا تو تھے ہی اس لیے لوگ انہیں مفتی اور شیخ طریقت بھی سمجھتے نہ معلوم کتنے لوگ ان کے پاس استفتے بھیجتے جو
مجھے اور مولانا مظہر الدین شیرکوٹی کو دے دیے جاتے اور ہم لوگ جواب لکھ دیتے۔ لوگ ان سے بیعت کی درخواست کرتے اور
تعویذ کے تقاضے بھی آتے ایک دن میں نے پوچھا آپ ان خطوں کے کیا جواب دیتے ہیں؟ فرمانے لگے طلب گاران بیعت
کو لکھ دیتا ہوں کہ خلافت کا کام مستعدی سے کرتے رہو تم میرے مرید ہی نہیں خلیفہ بھی ہو اور انگورہ فنڈ کے لیے خوب چندہ
جمع کرو یہی میرا نذرانہ ہے۔" میں نے پوچھا تعویذ آپ کیا لکھتے ہیں ہنس کے اور عجب انداز سے بلکہ جھوم کے کہا کسی کاغذ پر
اپنا نام اور اس پر "حضرت قبلہ و کعبہ" کا نام اللہ کے اور بند کر کے بھیج دیتا ہوں اور تم یقین کرو کہ بعد کو آنے والے بہت سے خطوط
بتاتے ہیں کہ یہ تعویذ کارگر ہوئے۔

انہوں نے اپنی جائداد کا زیادہ حصہ ضبط کر دیا تھا ان کی رہائی کی مل بند پڑی ہوئی تھی بظاہر ان کا کوئی ذریعہ آمدنی
نہیں تھا پنشن بھی بند کیا ضبط تھی لیکن میں نے اس بے تشالی کے باوجود ان کی زبان سے کبھی عسرت اور مالی پریشانی کا ایک حرف
نہیں سنا۔ آپ کی غذا بھی عموماً بہت سیدھی سادی ہوتی۔ کھدر کے پائجامے اور کرتے میں عموماً ملبوس ہوتے اور قیمتی سگار جن کے وہ عادی
تھے اب نظر نہیں آتے۔ اچھے کھانے اور میووں کے وہ شوقین تھے لیکن اب وہ وہی دفتر کا کھانا کھاتے جو تقریباً چار پانچ درجن
کارکنان خلافت آفس کے لیے پکتا اور ختم ماہ پر اپنے کھانے کا پورا حساب کر دیتے لیکن دوسرے کارکنان خلافت اور اعیان کار کی
ضرورتوں اور جائز و ناجائز مطالبات کو کبھی نہ ٹالتے میں بہت سے ممتاز کارکنان خلافت و کانگریس اور قابل ذکر مبلغین و علماء کو
جانتا ہوں جن کی وہ برابر امداد و خدمت کیا کرتے تھے ایک دن صبح سے غائب ہونے کے بعد شام کو تھکے ماندے تشریف لائے
ان کے آنے کے چند ہی منٹ کے بعد میں ان کے کمرہ میں چلا گیا یاد رہے کہ یہی مختصر کمرہ ان کا خوابگاہ بھی تھا اور دفتر بھی۔ لازم

اور تعلقات سے خاص مدد لیتے اور دوسری ملاقات میں اپنی کوششوں کے نتائج سے بھی آگاہ کرتے۔
معاملات کو سلجھانے کی ان میں بے پایاں صلاحیت تھی مقامی خلافت کمیٹیوں کے اندرونی انتشار کو جھوڑ دیتے جن کو معلوم کرتے
پر چٹکی بجاتے دور کر دیتے تھے، جمعیہ مرکزیہ کے اختلافات، آج یہ ٹولی خفا ہے کل فلاں صوبہ یہ تہیہ کر کے آیا، پرسوں فلاں بڑا صدمہ
بڑے کے اقتدار کو ختم کر دے گا، مگر مولانا شوکت کے تدبر، عقدہ کشائی و فراست، اس سے زیادہ ان کے خلوص اور دیانت پر اعتماد
اور ان کی بے مثال محبوبیت کے ہاتھوں یہ گتھیاں سلجھ جاتیں، کچھ وہ بھی تھے جو ان کی وجاہت اور مقبولیت عامہ پر حسد کرتے اور
بقول خود بت "شوکت" کو توڑنا چاہتے تھے لیکن ان سب کے ساتھ مولانا کا سلوک اور رویہ کچھ محبت اخلاص کا ہوتا کہ ان
کے سامنے سپر انداز ہو جاتے۔

اسی اخلاص اور بے لوثی کا یہ فیض تھا کہ وہ دوسروں کی غلطیوں پر دوسروں کو عجب دلپذیر انداز سے متنبہ کر دینے میں
جھجکتے نہیں میں نے کئی بار انہیں مولانا محمد علی کو ٹوکتے اور آگاہ کرتے دیکھا جب کہ وہ مولانا محمد علی کی دماغی برتری کے معترف بھی
تھے، اور تو اور ان ہی مکتوبات میں ناظرین دیکھیں گے کہ وہ اپنے پیر و مرشد کی رائے سے بعض معاملات میں اختلاف کرتے ہیں
اور بعض دفعہ تو وہ واضح لفظوں میں ان کے کسی طرز عمل کی صحت و معقولیت سے انکار کرتے، اور یہی طرز عمل ان کا مہاتما گاندھی
کے ساتھ تھا جن کو یقیناً وہ ہندوستان کا مخلص ترین راہنما سمجھتے تھے پس بدیگراں چہ رسد

اور یقیناً یہ بھی ان کا خلوص تھا کہ مہاتما گاندھی ایسے مردم شناس کی نگاہ رہنمایان مسلمین میں سب سے پہلے ان ہی پر پڑی
چنانچہ گاندھی جی کے ابتدائی دوروں میں ہمارے مولانا ان کے رفیق اور قوت بازو رہے [illegible] گے گاندھی جی کے تعلقات اعیان
مسلمین میں سے اکثر کے ساتھ ان ہی نے تعارف و تعلقات ہوئے انتہا یہ ہے کہ حضرت مولانا عبدالباری کی جلالت و اہمیت سے
گاندھی جی کو اور گاندھی جی کے اخلاص اور بے غرضی سے انہوں نے حضرت کو آگاہ کیا اور طرفین میں تعلقات خصوصی کے بعد
گاندھی جی کو فرنگی محل آنے پر آمادہ کیا گاندھی جی اور مولانا کے درمیان نقطہ اتحاد ہندو مسلم اتحاد تھا
تھا وہ کانگریس کے نہ صرف پرجوش حامی تھے بلکہ جب کبھی پیدا ہوتی کانگریس کے اندرونی حالات کی
پردہ کشائی کرے گی تو اسے لکھنا پڑے گا کہ کانگریس کو مسلمانوں میں مقبول بنانے اور گاندھی جی کو مسلمانوں
کا محبوب اور معتمد علیہ بنانے میں ان دونوں بھائیوں کا کتنا ہاتھ ہے یقیناً گیا (بہار) کے اجلاس میں نان
کواپریشن منظور نہ ہوتا اور مہاتما گاندھی کی قیادت کو عام طور پر مسلمان نہ مانتے اگر ان دو بھائیوں کی مسلسل
کوششیں اور علما کو اس طرف مائل کرنے کی تدبیریں نہ ہوتیں اور جاننے والے یہ بھی جانتے ہیں کہ کانگریس
کے پرچار نان کواپریشن کی تبلیغ اور ہندو زعما کے دوروں پر خلافت فنڈ کا کتنا روپیہ خرچ ہوا ہے اس کے
حاصل کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ مولانا شوکت علی کا ہے۔

یہ دوسری بات ہے کہ خود مہاتما گاندھی فرمایا کرتے تھے کہ میں مولانا شوکت علی کی جیب میں ہوں"
لیکن وہ خود اپنے کو "اللہ کے ایک سپاہی" کعبہ کے ایک خادم اور آزادی وطن کے ایک [illegible] سے زیادہ
نہیں سمجھتے تھے اور ان دوروں میں وہ اپنے لیے ذرا امتیاز پسند نہیں کرتے تھے گاندھی جی کے ایک

نقیب اور زیادہ سے زیادہ لفٹیننٹ بنا رہنا انہیں زیادہ پسند تھا۔ اسی لیے وہ اجتماعوں میں بہت مختصر تقریر کرتے، بہت کم نمایاں ہونے کی کوشش کرتے اور جلسوں کی صدارت کرتے تو شاید ہی ان کو کسی نے دیکھا ہوگا۔ اسی بے نفسی اور متطوعانہ شان کے ساتھ وہ ہر تحریک میں شریک ہوئے۔

وہ سپاہی تھے اس لیے کام زیادہ کرتے اور تقریریں کم کرتے لیکن مسلم لیگ کے سلسلہ میں اس کے باوجود ان کی باعظمت شخصیت سے مسلم لیگ نے ابتدائی الیکشنوں اور خصوصاً بجنور کے الیکشن میں غیر معمولی فائدہ اٹھایا وہ لیگ کے لیے اس قدر ضروری اور قیمتی تھے کہ ان کے دفن کے وقت ان کی تربت کے پاس محمد علی جناح بیٹھے ہوئے آنسو بہا رہے تھے جبکہ جناح صاحب کو کسی کے فراق پر اشک بار نہیں دیکھا گیا۔ اور لیگ ہی کے حکم پر اپنے دستور کے خلاف وہ مرکزی اسمبلی کی ممبری کے لیے لکھنؤ سے کھڑے اور بے زری کے باوجود انہوں نے شاندار کامیابی حاصل کی۔

آخر لمحۂ حیات تک، انہوں نے اپنی خصوصیات کو قائم رکھا ان کی سبز عبا پر خادم کعبہ کا بیج برابر رہا جب کہ خود یہ تحریک برسوں ہوئے ختم ہو چکی تھی۔ ہندو مسلم اتحاد کے وہ برابر علمبردار رہے جبکہ ۱۹۲۳ء کے بعد سے ان کے یوم وفات تک اس اتحاد کے برقرار رہنے کے حالات و اسباب روز بروز کم ہی ہوتے گئے۔ جن لوگوں سے ان کے تعلقات جس شان کے اول روز سے انہیں تبدیلی حالات کے باوجود برابر قائم رکھا۔

تحریک خلافت گیا خود ترکی سے خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا لیکن خلافت ہاؤس بدستور ان کے دم سے آباد رہا اور اسی طرح وہ روزنامہ خلافت بھی ناسازگار حالات کے باوجود چلاتے رہے کھدر جو انہوں نے ۱۹ء سے پہنا تھا آخر وقت تک ان کا ملبوس رہا اور شاید کفن بھی ان کو کھدر کا دیا گیا۔

آخر ۲۱ دسمبر ۱۹۳۹ء کو اس مجاہد اعظم، اس اللہ کے سپاہی، اس عمل مجسم اور سراپا اخلاص و محبت نے انتقال فرمایا اور دہلی میں قلعہ اور مسجد شاہ جہانی کے درمیان دفن ہوئے کسی نے خوب کہا کہ طبیعت ہنگامہ جو اور عوام سے ارتباط ان کا طرۂ امتیاز رہا اس لیے دفن کے لیے ان کو وہ مقام ملا جہاں ہنگامہ اور اجتماع ہر وقت رہتا ہے۔ مزار مبارک مرجع خاص و عام ہے اور اس کے قریب ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے فاتحہ پڑھنے والوں کا اب بھی ہجوم رہتا ہے اور جمعرات کو قوالی بھی اس چشتی زعیم کے مزار پر ہوتی ہے۔

جب وہ دفن کیے جا رہے تھے تو ایک سرمست نے سرمد کی یہ رباعی عجب انداز سے پڑھی جس سے شرکائے بزم ماتم میں ایک عجب قسم کا تاثر ہوا اور حقیقت میں یہ ان کے احوال سے مطابق بھی تھی۔

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند　　سوز دل پروانہ مگس را ندہند

تا سر نہ دہی بہ سرفرازی نرسی　　ایں دولت سرمد ہمہ کس را ندہند

انتقال کے وقت انہوں نے دو صاحبزادے چھوڑے ایک جناب الحاج زاہد شوکت علی سلمہٗ جو ماشاءاللہ بہت سے پارچہ خصوصیات کے مالک ہیں اخبار خلافت کو بھی چلا رہے ہیں اور خلافت ہاؤس کے دروازے بھی ان کے دم سے کھلے ہوئے ہیں ماشاءاللہ پابند اوقات اور خوش اخلاق ہیں ان کی عمر تقریباً ساٹھ سال ہے اب تندرستی ٹھیک نہیں رہتی، کئی قلبی دورے پڑ چکے ہیں یہ مولانا محمد علی کے داماد بھی ہیں۔

دوسرے عابد سلمہٗ جن کو بڑے ارمانوں کے ساتھ انہوں نے فرنگی محل میں قرآن حفظ کرایا تھا۔ یہ بنگال میں مشغول کاروبار ہیں اور دنیا سے الگ، زندگی بسر کرتے ہیں۔

ان خطوط کے ابتدائی دور میں خدام کعبہ کا بہت ذکر آیا ہے تو اس انجمن کی تاسیس حضرت مولانا عبدالباریؒ کے دولت خانہ پر ۱۹۱۲ء میں ہوئی مقصد نام سے ظاہر ہے بعد کو اس کا صدر دفتر دہلی کوچہ چیلاں میں منتقل ہو گیا، جن خوش نصیبوں نے یوم تاسیس میں خدمت کعبہ کا عہد کیا تھا وہ ارکان اصلی کہلاتے تھے مثلاً خود حضرت مولانا، حکیم عبدالولی مرحوم لکھنوی، مولانا شوکت علی، مولانا احمد اشرف کچھوچھوی فیض آباد وغیرہم ورحمۃ اللہ علیہم، اس جمعیۃ کا صدر، صدر نہیں کہلاتا بلکہ "خادم الخدام" ممبران خدام کعبہ میں بعض وہ خوش نصیب بھی تھے جنہوں نے خدمت کعبہ کا زندگی بھر کے لیے عہد کیا تھا یہ لوگ شیدائی کہلاتے ان میں اقبال شیدائی اور ایوب احمد صابر کا ذکر ان مکاتیب میں بھی ہے۔

از حضرت مولانا صبغۃ اللہ شہید فرنگی محل

مولانا محمد علی کے کچھ واقعات

عربی کا ایک مشہور شعر ہے :-

لیس علی اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

"اس قادر مطلق کے لیے یہ کچھ دشوار اور عجیب بات نہیں ہے کہ وہ ایک دنیا کو فرد واحد میں جمع فرما دے"۔ یہ شعر کسی تردید کے خوف کے بغیر حضرت مولانا محمد علی رحمۃ اللہ کے ذکر مبارک کے سلسلہ میں پڑھا جا سکتا ہے۔ لاریب کہ اس خلاق عالم نے آں مرحوم میں اتنی خصوصیات اور اتنے مناقب جمع کر دیئے تھے جن کو برسوں سے فرد واحد میں یکجا ہوتے ہم نے نہیں دیکھا۔

حافظ قرآن کلام پاک پر گہری نظر۔ اس کا برمحل اقتباس اور اس سے استشہاد صحیح حاجی و زائر۔ مولانا مجاہد مبلغ کلمۂ حق برسر میدان جاری بلا خطرات آسودہ نے لیے مایۂ نازش ریختہ میں انشاء نویس بے نظیر خطیب دیوانۂ اسلام فدائی رسول صلی اللہ علیہ وسلم نغمہ گو شاعر ذہین و حاضر جواب ذہانت مجسم و نکتہ رس اور عالی دماغ مفکر مہمان نواز اور متوکل علی الذات۔

ان کو لکھنؤ میں نے قریب سے غالباً ۱۹۱۶ء میں دیکھا جب وہ مسلم یونیورسٹی کی فاؤنڈیشن کمیٹی میں شرکت فرمانے قیصر باغ کی بارہ دری میں تشریف لائے۔ بہت سے زعمائے ملت اور اعیان مسلمین آ چکے تھے اور ان کا حسب حیثیت والنٹیروں اور منتظمین نے پرجوش استقبال بھی کیا۔ مونچھیں اٹھی اور کتری ہوئی داڑھی صاف رنگ کھلتا ہوا ترکی کوٹ زیب بدن۔ جس کے کوٹ میں دونوں طرف ہلال درخشاں سر پر کالی کے قسم کی ٹوپی جس پر ہلال نور پاش معلوم ہو رہا تھا کہ ایک ترک جنرل تشریف لا رہا ہے۔ رفتار میں متانت اور شان کہ پہلے آہستہ آہستہ پھر بلند آواز سے محمد علی کامریڈ کی آوازیں آنے لگیں۔ عام حاضرین ادب سے محمد علی کو دیکھنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اسٹیج والوں کی نگاہیں اٹھنے لگیں۔ اور گویا ہر شخص زبان حال سے کہہ رہا ہے

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

میں مجاہدین جنگ بلقان کے لیے دروازے پر امدادی صندوق لیے کھڑا تھا۔ میں نے کچھ کہے بغیر اور کہتا کیسے میں تو ان کی شخصیت سے مرعوب و مسحور سا ہو چکا تھا۔ صندوق آگے بڑھا دیا تو انہوں نے فرمایا "میں شیخ شاہد حسین کے یہاں

ٹھہرا ہوں۔ آپ پہلی میٹنگ کے بعد وہیں آجائیے۔ میں حاضر ہوا تو انہوں نے ایک گنّی میرے صندوق میں ڈالنے کے بعد مجھ سے یہ تعارف چاہا۔ میرے صندوق میں ڈالے ہوئے سکوں میں یہ سب سے بڑی رقم تھی۔ اس کے بعد ان کی وہ تقریر ہوئی جس کے لیے اجتماع ہمہ تن گوش تھا۔

اٹلی کے طرابلس الغرب پر حملے کے بعد ہندوستان کے فرزندانِ اسلام کو اس لیے بھی خانہ کعبہ کی حفاظت کی زیادہ فکر پیدا ہوگئی تھی کہ عثمانوی شاہ اطالیہ نے ایک موقع پر یہ بھی کہا تھا کہ ہمارے ہوائی جہاز مسلمانوں کے کعبہ سے بھی نپٹ سکتے ہیں۔ اس اضطراب کے ماتحت ایک انجمن حفاظتِ کعبہ کے لیے قائم کی گئی تھی جس کا نام تھا خدامِ کعبہ۔ حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی اس کے خادم الخدام، مولانا شوکت علی جو اس وقت تک مسٹر شوکت علی تھے، اس کے معتمد عمومی اور اس کا صدر دفتر دہلی میں تھا۔ قطعِ سخن کرتے یہ کیوں نہ بتادوں کہ ہمارے شوکت بھائی ہیں ان کے یہ بھائی بننے کے پہلے ہی سے ان کو بھائی کہتا تھا۔ کو خادم کعبہ کا لقب اس قدر پسند تھا کہ آخر وقت تک وہ اپنے کو خادم لکھتے اور لیتے رہے اور وہ ہلال بھی ان سے کفر نے جدا کیا جو ان کی سبز عبا اور کلاہ مبارک پر نور ریز رہتا تھا۔

مسٹر محمد علی جمعیۃ خدامِ کعبہ کے ارکانِ اعلیٰ میں تھے۔ اور جب اس جمعیۃ کے جلسے لکھنؤ میں ہوتے تو وہ فرنگی محل تشریف لاتے۔ چھپانے کی کیا ضرورت ہے کہ وہ اتنے اونچے اور بلند تھے کہ وہ باوجودیکہ کبھی کبھی فقیر نا نیہ پر عم مرحوم مولانا سلامت اللہ کے پاس تشریف لاتے۔ مگر فرطِ ادب و مرعوبیت کی وجہ سے میں ان کے سامنے سنّی ہی بنا رہتا۔ یعنی ان کے فرمودات ہی کو آویزہ گوش بناتا۔ مگر اس کے برعکس مولانا شوکت علی ہمارے بھائی بھی تھے اور ایک دوست بھی۔ جن سے شعر و شاعری بھی ہوتی اور تفریحی گفتگو بھی۔

ہمدرد شان سے نکل رہا تھا کہ اس پر سنسر بٹھایا گیا۔ جس نے اس پر نفرانس زنی شروع کردی۔ یہاں تک کہ ایک "چڑے اور چڑیا" کی کہانی کا اڈیٹوریل بھی اس کی زد میں آگیا۔ پھر چند مہینوں کے بعد یہ دونوں شیرانِ اسلام دہلی کے قریب یہ دلی میں نظر بند کردیے گئے۔ دلی کے بعد وہ چھندواڑہ اور بیتول میں رہے۔ اس عرصے میں انھوں نے جو خطوط حضرت مولانا عبدالباری قدس سرہ کو لکھے تھے وہ میں نے ایک فائل میں منضبط کرنے کے لیے حرف بحرف پڑھے ہیں۔ ہر خط دوسرے خط سے زیادہ کاتب محترم کی جلالتِ شان توکل علی اللہ حب رسولؐ اور افزوں جذبۂ خدمتِ اسلام کا آئینہ دار تھا۔ ان ہی خطوں نے بتایا کہ وہ پابندی سے قرآن مجید حفظ کررہے ہیں۔ سیرتِ نبوی اور احادیث کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔ انگریزی میں سرور عالمؐ پر ایک کتاب لکھنا شروع کردی ہے اور ماہ ربیع الاول میں ترتیب وار تقریریں ہوا کرتی ہیں یعنی پہلے ولادت باسعادت پھر حیاتِ مقدس کے ابتدائی دور پھر بعثت پھر مکہ کی زندگی پھر ہجرت۔ غرض اس طرح انہوں نے اپنے والہانہ انداز میں سیرتِ پاک و مطہر پر ایسی تقریریں مختلف مساجد میں فرمائیں کہ اسلامیت اور حب رسولؐ کی ایک بہار اس بستی میں آگئی۔ جہاں مشکل سے چار فی صد مسلمان تھے۔

میرے پرانے البم میں شاید اب بھی وہ فوٹو محفوظ ہے جو اس زمانے میں شوکت بھائی مرحوم نے مجھے بھیجا تھا۔ اس پر لکھا ہوا ہے LIONESS AND HER CUBS یعنی ببر شیرنی اور اس کے بچے اس کے نیچے "بی اماں" (علی برادران اپنی والدہ معظمہ کو

بی اماں کہتے اور آخر میں آں مرحوم کا بھی نام پڑ گیا تھا، شرعی پردے کے ساتھ ایک کرسی پر تشریف فرما ہیں اور پیچھے بھائی محمد علی اور شوکت علی کھڑے ہیں۔ دونوں کے داڑھیاں ہیں۔ داڑھی محمد علی کے چہرے پر ہیں اور شیرانہ تیور اور اس طرح نور چہرے سے ٹپک رہا ہے کہ بی اماں بہت ہی نیک دل تھیں۔ انہوں نے ۔۔۔ جلائے شدید اور سخت آزمائش اسلامی پر پہنچے دونوں شیروں کو متوالا رہتے ہیں جنہیں روحانی اور سیاست اقدار کا سامان بہم فرمایا تھا۔ خدمت عالم کے لیے وقف کر دیے تھے۔ اور اس سے بیشتر ان کی جوانی دنیا بھی ایسے ان تینوں کو جو تربیت اسلامی ثانی و خود اپنی مثال ہے۔ لیکن مجھے تو اس شیرنی کے ایک خاص واقعہ کا ذکر کرنا ہے۔ نظر بندی کا دور طویل ہو گیا اور ان مجاہدان عشق اسلام میں روز بروز "شدت علی الکفار" اور پامردی مجاہدانہ میں اور اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ حکومت کو شاید اپنی غلطی کا احساس ہوا یا ندامت جرم کی وجہ سے اس نے چاہا کہ کچھ علی برادران دبیں اور کچھ ہم نرم پڑیں۔ اور نظر بندی یہ حیلہ لطیف ختم ہو جائے۔ اس کے لیے ہوم آفس نے حکم پر ایک اعلیٰ مسلمان افسر پہ بیگانہ وار علی برادران نظر بندی مقام سے ملا اور بعد کو ڈورے ڈالنا شروع کیے اور آخر میں کھل کے کہہ گزرا کہ اگر آپ دونوں بھائی دبے لفظوں ہی میں سہی مستقبل میں اپنا طرز عمل بدلنے کا وعدہ کر لیں۔ تو قفس کا در فوراً کھل جائے۔ یہ افسر سرِ گفتگو کے بعد ناکام ہی واپس ہوتا۔ کیونکہ ان شیرانِ اسلام کا ہر انداز پکار کے کہتا تھا

باطل سے دبنے والے اے آسمان نہیں ہم
سو بار کر چکا ہے تو امتحان ہمارا

ظاہر ہے کہ یہ گفتگو مردانے میں ہوتی تھی۔ یہ مفاوضہ پڑھنے کے بعد ایک دن "بچوں نے" مختصر طور پر بی اماں کے ادراک کے مطابق ان سے بھی ان کا ذکر کر دیا۔ شیرنی اس پر بپھر پڑی۔ اس نے پوچھا تم نے کیا کہا؟ بچوں نے عرض کیا وہی جو ہمارے دودھ کے اثر کے مطابق ہونا چاہیئے تھا۔ ماں نے کہا بیٹا میں نے تمہیں اس لیے پالا تھا کہ تم اسلام کے سپاہی ہو گے۔ بچو! اگر تم نے ذرا لینت یا پست ہمتی دکھائی تو نہ صرف یہ کہ میں دودھ نہیں بخشوں گی۔ بلکہ ایسے کسی تحریری وعدہ پر تمہارے دستخط کے لیے قلم اٹھانے کے پہلے ان بڈھے ہاتھوں سے جن میں اب صرف ہڈیاں ہی رہ گئی ہیں۔ میں تم دونوں کا گلا گھونٹ دوں گی۔"

غور کرو یہ الفاظ اس بیوہ ضعیفہ کے ہیں جس کے یہ مایۂ افتخار اور فخر اسلاف فرزند اس مجازی دنیا میں سب کچھ ہیں اور یہ بچے وہ ہیں کہ جن کو پالنے اور پڑھانے لکھانے کے لیے جوانی میں بیوہ ہو جانے والی خاتون نے کیا کیا کاوشیں کی تھیں۔ فنعم لها اللہ۔

اسی نظر بندی کے زمانے میں ان دونوں بھائیوں کو "مراحم خسروانہ" اپنے مکانوں کی مرمت کرانے اور دوسرے خانگی معاملات کو طے کرنے کے لیے چند روزہ کی چھٹی ملی۔ اور چند روز رام پور میں قیام کرنے کی اجازت مل گئی ظاہر ہے C.P سے رام پور جانے میں لکھنؤ اسٹیشن کا پڑنا ضروری تھا۔ فرنگی محل میں اطلاع پہنچ گئی۔ اور بعض اور احباب کو علی برادران کے ادھر سے گزرنے کا مژدہ مل گیا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ جب میں اسٹیشن پر پہنچا تو وہاں اچھا خاصا مجمع تھا۔ یہ انسانی مجمع تو خیر۔ کھانے کے بہت سے برتن

نظر آئے۔ گاڑی کے پہنچتے ہی مصافحہ اور معانقہ اور ضروری باتوں کے بعد دسترخوان چنا گیا۔ جلد جلد باتیں بھی ہوتی رہیں اور لطف کے ساتھ کھانا بھی ابھی پوری طرح ہاتھ بھی نہیں دھلے تھے کہ سگنل ڈاؤن ہو گیا۔ گر انگریز سپرنٹنڈنٹ نے جس نے اس مساوات محبت اور بے تکلفی کا منظر کبھی نہیں دیکھا تھا ٹرین رکوا دی اور علی برادران سر کر مہ سے اپنے معمول دیرینہ کے مطابق مصافحہ کر کے سلام کرتے ہوئے ٹرین میں بیٹھ گئے۔ اور مخلصوں نے تکبیر کے بعد بلند نعروں کے بعد کہا کہ

دیدہ و سعدی دل ہمراہ تست

تا نہ پنداری کہ تنہا مے روی

چلنے کے پہلے ہی حضرت سے رام پور تشریف لانے اور ہم نوا جوانان فرنگی محل سے بھائی تم بھی ضرور آنا کے لفظوں میں حضرت کی ہمرکابی کا وعدہ لے لیا گیا تھا چنانچہ تین ہی چار روز کے بعد فرنگی محل کا قافلہ رام پور کے اسٹیشن پر تھا۔ اور ریاست کی سواریاں باہر ہاتھوں ہاتھ ان کے ہم گھر پہنچے جو بے شک بہت قابل مرمت اور شکستہ گر مالکان مکان کے دل کی طرح بہت فراخ تھا۔ پرتکلف ناشتے کے بعد شوکت بھائی نے فرمایا محمد علی کو قبلہ و کعبہ سے باتیں کرتے دو دریہ دونوں بھائی حضرت کو قبلہ و کعبہ کہتے اور ان ہی لفظوں سے مخاطب بھی کرتے۔ ہم لوگ اُدھر چلیں یہ کہہ کے انہوں نے دوسرے وسیع کمرہ کی طرف اشارہ کیا اور ہم لوگ ان کے ساتھ اٹھ کر وہاں پہنچے۔ اب تفریحی باتیں بھی اور شوکت بھائی کی بذلہ سنجیاں بھی اور بعض اوقات خوش لحنی کے ساتھ اشعار بھی۔ غرض ایک بے تکلف ماحول میں پرتکلف مہمان داری کی لذتیں اور دونوں طرف سے بے پایاں خلوص و محبت کے مظاہرے ہوئے۔

مولانا محمد علی کو میں نے جب سے قریب اور گہری نظر سے دیکھنا شروع کیا تھا وہ خوش اور مطمئن تو ضرور تھے مگر خوش حال نہیں تھے اور آخر دور میں تو لنبلونکم بشئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات کے مخاطب صحیح۔ لیکن اندرونی احوال کا تفحص کرنے سے جو حقیقتیں ۔۔۔ سامنے آتیں ان کی تردید ہمیشہ ان کا دسترخوان کر دیا کرتا۔ میں رام پور کے اس سفر کے بعد بہت بار دہلی میں بھی ان کا مہمان ہوا ہوں مگر دسترخوان کا معیار یکساں بلند ہی پایا اور یہ انداز کہ مہمان کی تواضع جتنی ہو سکے کی جائے۔ ان کو ذیابیطس مدت سے تھا اور ان کے مخلصین کو یہ گلہ تھا کہ محمد علی کتنے ہی پرہیز کار ہوں مگر بڑے بدپرہیز ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس بدپرہیزی میں بڑا دخل ان کی بلند مہمان نوازی کو تھا۔ مہمان کو اچھا کھلانے کے سلسلہ میں انہیں اکثر خود بھی بے اعتدالی کرنی پڑتی۔ اور مہمان داری کا سلسلہ برابر ہی جاری رہتا۔ اس لیے صحیح احتیاط بہت مشکل ہے۔

ان کی اس مہمان داری کے سلسلہ میں ایک واقعہ ایسا ہے جو نہیں بھولتا اور شاید کبھی نہ بھولے ۱۹۲۶ء میں حجاز پر ابن سعود کے تسلط کے بعد ہم کارکنان و حامیان خدام الحرمین اور ذاتی طور پر مجھ سے اور ان سے افسوس ناک علیحدگی بلکہ رنج دہ کشمکش ہو گئی تھی۔ اور ہم نے یعنی حامیان خدام الحرمین نے ان کے ہم خیالوں کے بلائے ہوئے ان دو جلسوں کو بھی ناکام کر دیا تھا۔ جن میں وہ خود بھی شریک تھے۔ اسی زمانہ میں میں ایک بار دہلی گیا۔ دہلی کے اسٹیشن پر پہنچنے کے بعد خیال ہوا کہ ان حالات اور اختلافات کے بعد مولانا کے یہاں جانا انہیں شکر رنجی کو اور نہ بڑھا دے اور خراب نتائج نہ برآمد ہوں۔ مگر پھر خیال آیا کہ ان کو میرے دہلی

ذرا ... ہو گئی تو کہیں ان کو رنج و شکایت نہ ہو اور یہ خیال مرحوم کی وسیع القلبی دیرینہ محبت اور پرانے تعلقات کی بنا پر
... ہوئے دفتر خلافت جہاں ان کا قیام اور ہمدرد کا دفتر تھا، پہنچا۔ دفتر میں تشریف رکھتے تھے۔ اطلاع ہوتے ہی
آئے۔ اور ... سے معانقہ کیا تھا وہی اخلاص ... احوال اور وہی احباب فرنگی محل کی دریافت خیریت۔ رات کا کھانا
... تکلفات سے خالی نہیں تھا۔ کھانے پر بھی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ اور ان کے ہر انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ
والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس خوب یاد ہے۔

چلتے بات کرتے ردِ سحر کا زمانہ ختم ہوا اور وہ دور شروع ہوا جس میں ان سے تنہائی میں برابر ملاقاتیں ہوتی تھیں،
جس میں ہر آن تسلی ہے تشفی اور ... وقت اور ... ملاقاتیں ہوتی تھیں جس میں ان کے جوہر کھل رہے تھے۔ جس میں رحمت
دو عالم نے کئی بار خواب میں ان سے بحث نفیسہ بیدار فرمایا تھا۔ جس میں بے مائگی کے باوجود درودوں کی سوغاتیں بلائے جانے
کی منابر پیش کی جاتی تھیں۔ اور جس میں (بقول خود) ایک "فاجر و فاسق" سے علانیہ کرامتیں صادر ہوتی تھیں۔ جس کی بدولت
ہماروں پر معراج کی سی کیفیت حاصل تھی (یاد کیجیے) حضرت مولانا کی وہ بے مثال غزل جس کا ایمان آفرین مطلع ہے:-

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

اس غزل میں عشق رسول کا آئینہ دار کتنا روشن و نورانی شعر فرمایا ہے

بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں — بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

اور دسمبر ۱۹۱۹ء کا آخری ہفتہ آ گیا اور کانگریس کے اجلاس کی تیاریاں امرتسر میں مکمل ہو گئیں۔ جہاں اسی
ان جلیانوالا باغ میں بید... دی کے ساتھ دفتری اقتدار نے کمال بہیمیت سے اس وقت تک ہندوستانیوں پر
گولیاں برسائی ہیں جب تک ... جنرل ڈائر کا میگزین خالی نہیں ہو گیا تھا۔ اور جہاں مارشل لا نافذ کر کے ہندوستانیوں کی وہ
تذلیل کی گئی تھی جس پر ہر شریف انگریز آج بھی پشیمان ہوگا۔ معلوم ہوا کہ اسی عشرہ میں علی برادران کا دور نظربندی ختم ہوگا
اور ..... رہائی پاتے ہی وہ امرتسر کے لیے روانہ ہو جائیں گے۔ میں کانگریس کے اجلاس شروع ہونے کے ایک روز
قبل ... کانگریس میں شرکت کرنے سے زیادہ علی برادران کی دست بوسی کے لیے امرتسر پہنچ گیا۔ میرے پہنچنے کے
دوسرے روز یہ برادران محترم امرتسر تشریف لائے۔ سکھوں ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتنا شاندار اجتماع امرتسر
کے اسٹیشن نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ عقیدت و محبت کے بے مثال مظاہروں میں ان نظربندان اسلام کا عظیم الشان جلوس
بازاروں ... اسٹیشنوں میں بڑھتا ہی گیا۔ جدھر سے وہ گزر رہا تھا۔

دن ہی کو اعلان ہو گیا تھا کہ رات کے اجلاس میں مولانا محمد علی کی تقریر ہوگی۔ مغرب کے بعد ہی پنڈال بھرنے لگا۔ یہاں
تک کہ جب یہ باعزت بھائی تشریف لائے تو وہاں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ کرسی صدارت پر صدر موتی لال نہرو جی تھے، سے
ان کا ... شاندار استقبال ... اعتراف خدمات وطن کے بعد آخر عمر میں گوشہ گیر ہو جانے کے باوجود علامہ اقبال سامنے
... اور انہوں نے اپنا مشہور قطعہ ختم کرتے ہوئے فرمایا۔

شہباز زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
این سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند

اور "شہباز و شاہین" کہتے ہوئے جب ان دونوں بھائیوں کی طرف اشارہ کیا تو نعرہ ہائے تکبیر کا سلسلہ شروع ہو گیا جو اس وقت ختم ہوا جب یہ شہباز منظر عام پر تشریف لے آیا اور محمد علی شوکت علی زندہ باد کے نعرے شروع ہو گئے۔

یاد رہے کہ اس وقت سنگٹھن کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں اور ملکانوں اور دوسرے ضعیف مسلمانوں کی بستیوں میں اس زمانے میں فتنہ ارتداد اچھی خاصی رونما ہو چکا تھا۔ مولانا محمد علی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی فرمایا "جب ہم نظر بند کیے گئے تھے۔ اس وقت ملک کی بہار شباب پر تھی۔ اب باہر نکلے ہیں تو نفاق و اختلاف کی باد سموم چل رہی ہے۔ اگر ملک کی خزاں زدگی کا یہی عالم رہا تو ہم اپنے محبوب وطن میں نہ رہیں گے۔ چاہے بعد کو ہمارے مساجد ویران ہو جائیں۔ ہمارے مدارس اور خانقاہیں سونی ہو جائیں اور ہمارے قبرستان مسمار۔ مگر ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے جانے کے بعد ہندو بھائی ہمارے آثار اور پس ماندہ یادگاروں کی حفاظت کریں گے۔ اس تقریر کے اثنا میں ایک عجیب خاموشی طاری رہی اور بعض آنکھیں آنسو بہاتی رہیں"۔

مولانا ابھی بیٹھنے بھی نہیں پائے تھے کہ نبی دہر پاٹھک نامی ایک خوش بیان مقرر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے مولانا کو مخاطب کر کے عجب پرسوز آواز میں کہنا شروع کیا یہ آپ نے کیا فرمایا کہ آپ اس غلامستان سے تشریف لے جائیں گے مولانا آپ تنہا نہیں جائیں گے۔ ہم بھی آپ کے ساتھ جائیں گے۔ پھر جہاں مسجدیں مقفل ہوں گی۔ وہاں مندر اور ہماری عبادت گاہوں پر بھی تالے لگ جائیں گے۔ اس تقریر نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔

میں نے مولانا کے استقبال اور مظاہر عقیدت کے بہت سے شاندار مناظر دیکھے ہیں۔ لیکن امرتسر کے ایسے زریں مناظر کبھی نہیں دیکھے۔

لکھنو اس وقت مسلمانان ہند کا مرکز سیاسی تھا۔ یہاں ان کے بہت سے احباب اور معتقدین تھے۔ یہاں ان کے پیر و مرشدؒ تشریف فرما تھے۔ اور یہاں کی ایک محل سرا میں وہ اپنے گھر کی ایسی بے تکلفی سے قیام پذیر ہوتے۔ مگر ایک بار ان کی آمد اس محل سرائے فرنگی محل میں خاص نوعیت اور روح نوازشاں کی تھی۔ آج علی برادران یہاں اس لیے آ رہے تھے کہ انہیں فرنگی محل کی مشہور تعلیم گاہ مدرسہ عالیہ نظامیہ سے آخری علمی سند "مولانا" کی ڈگری اعزازی طور پر ملنے والی تھی ان کا اس اعزاز پر شادماں ہونا تو ظاہر ہے۔ مگر ہم سند یافتگان مدرسہ مذکور آج غیر معمولی افتخار محسوس کر رہے تھے۔ اور میں بے انتہا جذبۂ نازش کے عالم ایک واقعہ یاد کر رہا تھا۔ جو سنہ یا گیارہ میں پیش آیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا عبدالباری قدس سرہ کے بعض مخلصین کے دو تین لڑکے علی گڑھ کے اسلامیہ سکول میں داخل ہوئے۔ اور بورڈنگ میں قیام پذیر۔ علی گڑھ میں ڈائننگ ہال میں سب بچے یک جا ہو کے میزوں پر کھانا کھاتے۔ حضرت مولانا میز کرسی پہ کھانا کھانے کو نہ صرف ناپسند کرتے بلکہ اس کو خلاف سنت بھی سمجھتے۔ حضرت نے اس کے متعلق نواب وقار الملک کو لکھا کہ وہ بچے جو کھانے کے اس انداز کو شرعی نقطۂ نظر سے ناپسند کرتے ہیں انہیں ڈائننگ ہال کی حاضری سے مستثنیٰ کر دیا جائے۔

اُدھر جواب نفی میں آیا۔ پھر ادھر سے جواب گیا۔ غرض ایک لمبی مراسلت ہو گئی جو آخر میں ٹرسٹیوں کے بورڈ کے سامنے پیش ہوئی۔ اس اجتماع میں مولانا محمد علی بھی شریک تھے۔ انہوں نے اس خواہش کو مسترد کرتے ہوئے فرمایا "فرنگیوں کو مسلمان کر لینا سہل ہے۔ مگر فرنگی محلیوں کو سمجھا لینا سخت مشکل"۔ لیکن آج کا مبارک دن وہ تھا جس میں وہ خود فرنگی محل کی علمی برادری میں شامل ہو رہے تھے یہ اجتماع بہت پُرکیف رہا۔ ایک مختصر تقریر کے بعد مرحوم معصوم صاحب نے انہیں مولانا کی سند دی اور انہوں نے اس اعزاز پر آج تک دل کو گرما دینے والی تقریر فرمائی۔ معصوم کی تقریر کے بعد میری ایک نظم ساقی نامہ ہوئی۔ جس کی ایک بیت پر تمام بھائیوں کے چہروں سے تاثر خاص نمایاں ہو رہا تھا۔ بیت تھی ؎

اپنے ساقی سے تم اب بیعت رضواں کر لو
شوکت دین محمد کا یہ ساماں کر لو

ابھی فرنگی اور فرنگی محلیوں کا ذکر آیا۔ مرحوم کی ذہانت اور بذلہ سنجی بھی ضرب المثل تھی۔ ایک اہم مسئلہ میں مولانا ابوالکلام کی غلط خاموشی پر فرمایا مولانا ابوالکلام اس وقت ابوالسکوت بنے بیٹھے ہیں۔ رام پور ان کا وطن تھا۔ ایک بار سیتا پور کے ذکر میں فرمایا۔ سیتا پور ہم رام پوریوں کی سسرال ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین کے یہاں دعوت میں شریفے (میٹھا پھل) کھڑے کھڑے کھا رہے تھے۔ اور اس کے بیج زمین پر گر رہے تھے۔ کسی نے اس کی طرف توجہ دلائی تو فرمایا میں علی گڑھ میں شریفوں کی تخم پاشی کر رہا ہوں اپنے ایک دوست کو تخم الغبی کہتے۔ کیونکہ تحریری صورت میں ان کا نام اس سے مشابہ تھا۔ اسی طرح ایک دریدہ دہن رسالے کو "بیسوا" بے تکلفی کی نشستوں میں فرماتے۔ ایک لٹھ باز ایڈیٹر کے ذکر میں فرماتے ؎

حبیب خستہ لٹھ باندھے ہوئے پھرتا ہے گلیوں میں۔

اس ایڈیٹر کا نام حبیب تھا۔ حجاز کی موتمر اسلامی سے واپس آئے تو اس موتمر میں شریک ہونے والے خاص نمایندہ کے "عضو مخصوص" کہے جانے کو عجب انداز سے بیان کرتے اور اس پر مسکراتے۔ اسی طرح ہمارے قبائل غطفان اور دخنہ کا تبسم آفریں انداز سے ذکر کرتے۔ منادی، ۱۸ ہی اور ہمدرد کی وہ جنگ عظیم (جس کو بعد میں خواجہ حسن نظامی نے جنگ "صفین" کے نام سے کتابی شکل میں شائع کیا) کا ذکر فرماتے کہتے ہیں آج کل ختم خواجگاں میں مشغول ہوں"۔ انگریزی فوج میں داخلے کو حرام بتانے کے جرم میں کراچی کے خالق دینا ہال میں ان پر اور ان کے ساتھیوں یعنی اس تجویز کی تائید کرنے والوں پر ۱۹۲۱ء میں وہ مقدمہ چل رہا تھا جس کی سزا کے متعلق قانون دان یہ سمجھتے تھے کہ کم از کم چودہ سال قید با مشقت ہوگی۔ دوران مقدمہ میں سی۔ آئی۔ ڈی کے سب انسپکٹر نے جس کا نام لخت حسنین تھا۔ عدالت کی توجہ ایک کاغذ کی طرف دلاتے ہوئے کہا "حضور یہ کاغذ پن کے ذریعہ میری پشت پر لگا یا گیا ہے۔ اور یہ میرے لیے سخت توہین آمیز ہے۔ کاغذ پر لکھا ہوا تھا ؎

محمد کا دشمن علی کا عدو
نہ کہہ اپنے کو لخت حسنین تو

ظاہر ہے کہ یہ شعر اسی کا ہو سکتا ہے جو شدید سے شدید ابتلا میں ہمالیہ کی طرح ثابت قدم رہا اور جو فرما چکا ہے۔ "ہر حال میں راضی برضا ہو تو مزا دیکھ"۔ کیونکہ توازن دماغی کا برقرار رہنا اور فطری ذہانت کا کارفرما رہنا ان حالات میں ہر شخص کا

کام نہیں تھا۔

یہ مقدمہ بھی ہندوستان کی تحریک آزادی اور انگریزی اقتدار پر ضرب کاری لگائے جانے کی اہم ترین یادگار ہے۔ ان بدبخت ہندوستانی مسلمانوں سے جو بقول لارڈ ایلنبائی فلسطین کو عالم اسلامی کے سایہ سے محروم کرنے اور برطانیہ کے پنجۂ استبداد میں دے دینے والی فوج کے جزو تھے۔ اور جنہوں نے ٹرکی، مصر، عراق اور خدا معلوم کن کن اسلامی محاذوں پر چند ماہوار پر اپنا ایمان فروخت کیا تھا۔ ان سے برطانیہ کی فوج سے علیحدگی کو کہنا مولانا اور ان کے شیر دل ساتھیوں مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد، سیف الدین کچلو اور شنکر اچاریہ اور مولانا نثار احمد کانپوری کا ہی کام تھا اور آزاد ہندوستان ان کو صدیوں دعائیں دے گا کہ انھوں نے برطانوی فوجی اقتدار پر جس کے رکن رکین ہم بدبخت مسلمان تھے ضرب کاری لگا کے اس کی چولیں ہلا دیں۔ مولانا نے جواب دیتے ہوئے جو مجاہدانہ بیان دیا تھا وہ ایک وہی سچا مسلمان دے سکتا ہے۔ جس کی آنکھوں کے سامنے وہ سب ہو جو حضرت عمر فاروقؓ کے ایران بھیجے ہوئے ناظم اسلام نے شاہ ایران کے دربار میں کہا اور کیا تھا ؎

یہ مرتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

میرے حقیقی چچا مولانا عنایت اللہ المغفور جو دینی اور فقہی معاملات میں مشورہ دینے کے لیے اس موقع پر کراچی گئے ہوئے فرماتے تھے۔ ہندوستان لرزہ بر اندام تھا کہ اس مقدمہ کا انجام کیا ہوگا۔ مگر ان جلیل القدر اسیران کراچی نے دیو استبداد کی آخری ہچکی اور فرعونی اسٹیج کے ایک سین سے زیادہ اس کو نہیں سمجھا۔ اور چونکہ اس تجویز کے محرک مولانا محمد علی تھے۔ اس لیے خیال تھا کہ ان کو اپنے بہادر رہنا ساتھیوں سے بھی کچھ زیادہ سزا ملے گی۔ مگر ان کے تیور وہی شیرانہ تھے۔ ان کی باتیں اتنی ہی دلچسپ تھیں۔ اور ان کے کسی انداز سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ابتلائے عظیم اور گویا سولی کے تختے پر ہیں۔ اس کھیل کا ڈراپ سین ہوا ان حق پرستوں کی دو دو سال کی قید پر اور ہندوستان کی فضا گونج اٹھی ؎

کہہ رہے ہیں کراچی کے قیدی   ہم تو جاتے ہیں دو دو برس

مولانا ابھی قید کے مصائب جھیل رہے تھے کہ ان کی صاحبزادی آمنہ جو اپنے والد ماجد سے صورتاً اور سیرتاً بہت مشابہ تھیں بخار میں مبتلا ہوئیں۔ جس نے بڑھ کے دق (T.B) کی ہولناک شکل اختیار کی۔ دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے۔ ان کے کوئی فرزند نہ تھا۔ لے دے کے یہی بچیاں تھیں جو ان کے قلب کی تسکین اور دکھ درد کا سہارا تھیں۔ انہیں گھر میں بیٹھنا کب نصیب ہوا۔ ان کی رونق تھیں۔ جن کا غم زدہ بے بس اور مجبور باپ "میں تو مجبور ہوں اللہ تو مجبور نہیں" کہہ کے اپنے دل کو تسکین دیا کرتا۔ زیادہ بے چین ہوتا تو اپنے قلب خاشع اور مضطرب کو یہ کہہ کے اطمینان دلا دیتا ؎

تیری قدرت سے خدایا تیری رحمت نہیں کم   آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

مگر مرض بڑھتا ہی گیا، دعائیں کیں تخماج الحي من المیت فرمانے والے سے خدا معلوم کن کن لفظوں میں التماس شفا کی پیسہ پاس ہی کب تھا مگر جیل میں بیٹھے بیٹھے اپنی حیثیت سے دوا علاج کرایا۔ تدبیروں کی ناکامیوں کے عالم میں قید کی میعاد پوری کر کے آزاد ہوئے تو رفتار علاج اور تدابیر صحت اور تیز ہو گئے۔ اسی علالت شدیدہ کے عالم میں آمنہ کو مخاطب کر کے

وہ کہہ گذرے جس سے ان کے ظرف عالی نوالی علی اللہ تعالیٰ کی مرضی پر راضی رہنے اور شان تسلیم و بندگی کو عالم آشکارا کر دیا۔ ایسے موقعوں پر یعنی دل سے لگی ہوئی تمناؤں کے پورا نہ ہونے کے بعد دوروں کو چھوڑیے مسلمان تک بد عادات و اعمال مشرکانہ کے ارتکاب اور غیر دینی تدابیر اور غیر شرعی منتوں کے دام وار مرتکب ہو جاتے ہیں۔ مگر حضرت محمد رسول اللہ سے مناسبت رسمی رکھنے والا کروڑوں افراد پر مشتمل ہے۔ یا وہ اس قادر مطلق پر اپنے تمام امور اسی کے حوالے کر دینے کا ارادہ فرماتا ہے۔ جو ان کانوں نے کبھی نہیں سنا تھا ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

شئی مطلوب کے نہ حاصل ہونے پر صبر کر لینا ہی بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن ہمارا مطلوب اگر ہمارا مطلوب نہیں تو ہم ارحم الراحمین ہی ہے تو ہم کو بھی مطلوب نہیں منظور"۔ کہنا اور دل سے کہنا اولیاء اللہ اور خاصان خدا ہی کا کام ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ شعر سیدنا ابوالقاسم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان غیر فانی ارشادات کی اردو میں مکمل ترجمانی ہے جو آں حضور نے اپنے آخری صاحبزادے سیدنا ابراہیم کے نزع کے عالم میں فرمائے تھے۔ یہ شعر اس دنیا میں صرف وہی کہہ سکتا تھا جس نے اردو نظم میں توحید کی یہ مکمل اور بے نظیر تشریح فرمائی ہے ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

ہاں وہ اللہ کے لیے بادشاہوں سے لڑ جاتے۔ وزرائے اعظم سے خفا ہو جاتے۔ دنیا کی سب سے بڑی حکومت سے بگڑ جاتے۔ اپنی پارٹی سے روٹھ جاتے۔ اور شاید اسی وجہ سے ان تمام سیاسی جماعتوں میں جن سے ان کا تعلق، اقتدار و احترام کے ساتھ رہا آں مرحوم اپنی پارٹی کبھی نہ بنا سکے۔ اور حد یہ ہے کہ جذبہ للٰہیت انہیں اپنے خاص دوستوں اور رفقاء کی غلط مروت اور طرف داری سے دوچار رہا۔ اسی وجہ سے وہ کوئی لیڈر کبھی نہیں بن سکے۔

کلمہ حق عند سلطان جائر جہاد ہی نہیں افضل الجہاد ہے۔ لیکن مامورین جہاد میں کتنوں کو یہ شرف حاصل ہوا ہے۔ ہماری یاد میں اس دور میں تو مولانا ہی سب ان کے سب سے بڑے سورما تھے۔ یاد کیجیے۔ جب خلافت کمیٹی کا وفد سیٹھ چھوٹانی کی قیادت میں لندن پہنچا مولانا المغفور اس کے خطیب تھے۔ اس وقت برطانیہ عظمیٰ کے فرعون صفت وزیر اعظم لائڈ جارج سے جس مساویانہ دلیرانہ بلکہ بے باکانہ انداز سے گفتگو فرمائی اور خلافت اور سلطنت عثمانیہ کے بارے میں انگریزوں کی ابلیسانہ اور بربرانہ پالیسی کے جس طرح چیتھڑے اڑائے ہیں۔ اس کی کوئی مثال نہ اس وقت پیش کی جا سکتی تھی نہ آج ممکن ہے اس گفتگو کی تفصیل بتاتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا کہ میں نے اس سے کہا سیاسی مطالبات میں لین دین بھی ہوتا ہے۔ دنیاوی معاملات میں طرفین تھوڑا بہت دب کے مفاہمت کر لیتے ہیں۔ لیکن خلافت اور جزیرۃ العرب کا مسئلہ خالص دینی ہے۔ اور حسب ارشاد قرآن دین مکمل اور نعمت الٰہی کا اتمام ہو چکا ہے۔ ہم اپنے مطالبات میں ذرا سی کمی کر کے مجرم ہو جائیں گے۔

[illegible] ایک بدبخت قادیانیت کے جرم میں [illegible] افغانستان [illegible] سے سنگسار کیا گیا۔ علمائے اسلام نے خاص طور پر [illegible] نے عام طور پر اس سزا کو جائز اور اس کی معقولیت کا اعتراف کیا۔ لیکن مولانا [illegible] شاید تمام [illegible] میں تنہا اس فعل کو غیر شرعی اور غلط بتایا۔ یہاں تک کہ کہنے والے کہہ گذرے کہ یہ سب اپنے ایک [illegible] کی محبت کی وجہ سے ہے۔ جو قادیانی تھے۔ مگر ان کے نزدیک جو حق تھا اس کے اظہار میں [illegible] کی ذرہ برابر پروا نہیں کی۔

ملعون راج پال نے ایک شیطانی کتاب میں جس کا نام بھی لیتے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں حضرت رسول طاہر و مطہر کی شان اقدس میں انتہا گستاخیاں کیں حکومت پنجاب نے اس پر مقدمہ چلایا اور نیچے کی عدالتوں سے اسے جب سزا ہوگئی تو اس نے ہائی کورٹ میں اپیل کردی۔ یہاں جسٹس دلیپ سنگھ نے جو اسماً ہندو اور مذہباً عیسائی تھے اسے رہا کر دیا۔ تمام اسلامی دنیا ماچا اٹھی کہ دلیپ سنگھ نے مذہبی ہمدردی کی بنا پر رہا کر دیا ہے۔ مگر ایک ہمدرد ہی کا اڈیٹر تھا جو بڑی جسارت کے ساتھ چیخ چیخ کے فرما رہا تھا "نقص قانون کا ہے۔ اس جج پر غصہ کرنے کے بدلے اس دفعہ کو بدلوانے کی کوشش ہونی چاہیئے۔ جس کے ناقص ہونے کی بنا پر یہ ملعون رہا ہو گیا۔"

اسی طرح شاردا ایکٹ کے نفاذ کو اس اسلامی پرسنل لا میں مداخلت خیال فرماتے تھے۔ جس نے مرد و عورت کیلئے نکاح کی عمر کی کوئی تعیین نہیں فرمائی ہے۔ اس مسئلہ میں ان کو ایڈیٹر ہونے کے باوجود وہ گورنر جنرل سے ملے اور صداقت بے باک نے اس وقت ان کی زبان سے وہ سب کھلوا دیا جو صرف وہی فرما سکتے تھے۔

یہ سب تو ایک دستوری اور باقاعدہ حکومت کے مقابلہ میں تھا ۱۹۲۶ء میں ان کا سامنا شخصی اور خالص استبدادی حکومت سے ہوگیا۔ ابن سعود نے ۱۹۲۶ء میں حرمین شریفین پر قبضہ کر لینے کے بعد اعلان کیا کہ میرا قبضہ تو عارضی ہے۔ حجاز تمام عالم اسلامی کا ہے مسلمان جو کچھ اس کا فیصلہ کریں گے وہی نافذ ہوگا۔ اس گھڑی گھڑی اعلان کردہ پالیسی کی لاج رکھنے کے لیے ابن سعود نے آخر ایک موتمر اسلامی مکہ معظمہ میں موسم حج پر طلب بھی کر دی۔ ہمارے مولانا بھی خلافت کمیٹی کے وفد کے ایک رکن تھے۔ اور غالباً وہی ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے زیادہ بولنے کا حق رکھتے تھے اس لیے کہ انہوں نے اس حکومت کا اس کے اعلانوں کی روشنی میں اچھا خاصا خیر مقدم کیا تھا۔ اور بے غرضی کے ساتھ اس کی حمایت کرتے ہوئے اپنے بہت سے عزیز دوستوں اور مسلمانوں کی ایک خاصی تعداد کی مخالفتوں کی بھی پروا نہیں کی تھی۔ انہوں نے اس حکومت کے نظام حجاز کے وعدوں کے جواب خوب پرخچے اڑائے اور اس حکومت کو شخصی اور [illegible] حکومت کہتے ہوئے انہیں اس حکومت کی [illegible] روش [illegible] مخالفت کرنی پڑی۔

آخر اس حکومت کی پولیس سے ان کی [illegible] ہو گئی۔ اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ اس دوسرے [illegible] جج سے فارغ [illegible] مدینہ منورہ [illegible] مناقشوں اور [illegible] اور مسلسل [illegible] کے بعد حاضر ہوئے۔ وہاں پہنچتے ہی غسل کیے اور معطر کپڑے پہن کے مسجد نبوی حرم نبوی میں حاضر خدمت ہوئے اور مواجہہ اقدس [illegible] پولیس ان کے دماغ تو آزاد [illegible] سے [illegible] انہوں نے [illegible] پر اپنا سر رکھ دیا۔ [illegible] کا [illegible]

واللہ ھن ہ بن مۃ " کہتا ہُوا انہیں دھکا دے کے ہٹانے کے لیے آگے بڑھا تو انہوں نے صاحب مزار پاک کو مخاطب کرتے ہوئے عرض کیا ؎

عشق خود بدعت و سرمایۂ صد بدعت ہے
رحم کر رحم کہ عاشق تیرا مجبور ہے آج

پھر کورہ دل نجدی نے کہا ایک گز رجانے والے کے آگے جھکنا شرک ہے۔ تو انہوں نے فرمایا ؎

چھوڑ فقہی کے لیے مسئلہ موت و حیات
ایک جلوہ ہے عیاں تھا کبھی مستور ہے آج

یہ حق گوئی ان کی اپنوں اور اپنے محترموں کے سامنے بھی اسی شان کے ساتھ تھی۔ ان کے مرشد برحق حضرت مولانا عبدالباری قدس سرہ کا پہلا عرس تھا۔ جس کی شرکت کے لیے علالت کے باوجود وہ فرنگی محل آئے۔ عرس کے سلسلہ میں وہ قوالی میں بھی شریک ہوئے۔ اور حضرت کے جانشین مولانا قطب میاں المغفور کو برابر نذریں دیتے رہے کہ قوال نے گاتے گاتے یہ شعر گایا ؎

نکیرین آکے پوچھیں گے تو کہہ دونگا کہ بندہ ہوں
قیام الملۃ والدین محمد عبد باری کا

لفظ "بندہ" وہ برداشت نہ کر سکے اور فرمایا "پیرو" کہو اور قوالی کے بعد انہوں نے حضرت کے جانشین محترم سے بھی اس کے متعلق گفتگو فرمائی۔

کاتب الحروف پورے وثوق سے کہتا ہے کہ مولانا المرحوم کو اپنے مرشد برحق سے بے انتہا محبت تھی اور ان کے احترام و ادب و عقیدت اور منت پذیری میں وہ اپنے بہت سے برادران طریقت سے آگے تھے۔ وہ حضرت کے علمی و روحانی درجہ بلند کا صحیح اندازہ کرکے مشرف بہ بیعت ہوئے تھے۔ اس لیے وہ حضرت کی خوشنودی اور رضامندی کو بہت اہم سمجھتے۔ اور ایک والہانہ انداز سے ان کے دعاگو اور خیر سگال تھے۔ حضرت موصوف نے ایک مختصر علالت کے بعد ۴ رجب ۱۳۴۴ھ ۱۹۲۶ء کو وصال فرمایا۔ اپنی مولانا المرحوم علالت کے باوجود جلد از جلد تعزیت کے لیے فرنگی محل تشریف لائے۔ بے انتہا مغموم، حد سے زیادہ رنجیدہ دبے قابو۔ فاتحہ کے بعد حضرت کی تربت پاک پر پہنچ کے وہ حال سے بدحال ہو گئے۔ حضرت کے سیوم میں بھی وہ برابر اشکبار رہے۔ حضرت کی ذات تو ان کی منتہائے نیاز اخلاص تھی ان کے اعزہ کے ساتھ ان کا تعلق عزیزوں کا سا تھا۔ وہ حضرت سے محبت کرنے والوں سے بھی یگانگی سے ملتے۔ اس محبت اور بے پایاں اخلاص کا اندازہ ہوتا۔ جب دونوں میں اختلاف ہو جاتا۔ یا مرشد برحق کو اپنے مرید باصفا کے کسی طرز عمل پر ناگواری ہوتی اور وہ اس کا اظہار اپنے معمول کے مطابق مولانا سے صاف صاف کر دیتے۔ مجھے ایسے دو مواقع خوب یاد ہیں۔ جن میں انہوں نے سرنگونی اور معذرت کا وہ انداز اختیار کیا۔ جس کو محمد علی کو جاننے والے مشکل سے باور کریں گے اور کس قدر قیامت انگیز تھی۔ وہ کشمکش جو دونوں محترموں میں نجدی تسلط حجاز کے بعد

تقریباً ایک سال رہی۔ ہمارے مخالفین نے کیا کیا سازشیں کیا کیا ریشہ دوانیاں اور کیا کیا فتنہ انگیزیاں نہیں کیں۔ مگر مولانا مرحوم و مغفور نے قطع تعلق کرنا کجا اپنے اخبار میں کبھی اس کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ اور نہ کبھی یاران "ناشناس" کو حقیقتی سے جھڑک دیا جو "فرنگی محلیت" کو جرم اور قابل استیصال سمجھتے تھے۔

"ہم" سے ان کا تعلق کس اندازہ کا تھا اس کا اندازہ ایک خاص واقعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ ۱۹۲۴ء میں علی برادران کے لیے آم خوری کا ایک پروگرام بنایا گیا۔ آم تو نام کو تھے۔ اصل مقصد اس تحریک خلافت کو ابھارنا تھا جو روز بروز سرد ہوتی جاتی تھی فرنگی محل کی دعوت کے بعد بارہ بنکی کے مختلف مقامات دعوتیں ہوئیں۔ آخر میں علی برادران مولانا عبدالماجد صاحب کے یہاں ان کی دعوت پر دریاباد تشریف لے گئے۔ اس زمانہ میں مولانا عبدالماجد صاحب کو قوالی سے خاصی دلچسپی تھی۔ اور علی برادران کو بھی اس کا ذوق بلند تھا۔ قوالی شروع ہوئی۔ اب نذر کی باری آئی۔ نذر تو بزرگوں کو دی جاتی ہے۔ یہاں جو علی برادران سے زیادہ محترم کون تھا۔ مگر یہ مسئلہ قوالی شروع ہونے کے بعد یوں حل ہو گیا کہ وہ اٹھے اور انہوں نے حضرت مولانا عبدالباری قدس سرہ کے بیٹھنے کے ایک اس ہیچمیرز کو نذر دی جس نے بیعت لے باوجود حضرت سے کچھ حاصل نہیں کیا تھا اور جس نے ان سے پڑھنے کے زمانے میں کبھی جی لگا کے نہیں پڑھا تھا۔ اور جس کو عملی بے بضاعتی کی وجہ سے اب بھی حضرت سے اپنے تعلق بیعت و تلمذ کو ظاہر کرتے شرم آتی ہے۔

ان کی پریشانیاں، بیماریاں، مخالفتیں برابر بڑھتی رہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت قریب آگیا جس میں رب غیور نے ہم ناقدر شناسوں اور محسن کشوں سے اس جوہر گراں قیمت کو واپس لے لینا مقدر فرمایا تھا۔ شدید علالت بے انتہا افکار اور دیدۂ ظاہری کی بے نوری کے باوجود ؎

انقلابات سپہر و سیاہ عالم سے
دل تو روشن تھا گر دیدۂ ظاہر بے نور

۱۹۳۰ء کے آخر میں راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں شرکت فرمانے لندن تشریف لے گئے۔ اس کے اجتماعوں اور کمیٹیوں میں جس انداز سے وہ ہندوستان کے لیے مردانہ وار لڑے ہیں۔ جس ہمت مجاہدانہ کے انہوں نے ثبوت دیئے ہیں۔ اور اپنے تدبر عالی دماغی اور نکتہ رسی کے جو باعظمت و غیر فانی مظاہرے فرمائے ہیں وہ بڑے سے بڑے ہندوستانی کے مقدر میں نہیں تھے۔ لیکن وہ تو کئی سال پہلے اس کی پیشین گوئی فرما چکے تھے۔

یہ مرتبۂ بلند ملا جس کو [illegible] ملا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

یہ تو انہیں کا ظرف، ان ہی کی روشن ضمیری انہیں کی ہمت ان ہی کے دل کی لگن تھی کہ وہ یہ فرما دیں
"میں اب غلام ہندوستان میں واپس نہیں جاؤں گا یا تو ہندوستان کو آزادی دیجئے یا مجھے قبر کے لیے دو گز زمین۔"

ہائے کہ وہ ہندوستان واپس نہیں آئے اور ۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو اس رحمن کے پاس واپس گئے جس کی آغوش رحمت ان کے لیے کھلی تھی۔

کر دیا ہے کہ سیدھا بدایوں آتا ہوں۔ چنانچہ ۔ جولائی ۱۹۱۲ء کو بدایوں تشریف لائے۔ جناب والد صاحب سے عرض معروض کی۔ انہوں نے اپنی ضعیفی اور تنہائی کے باعث جائداد کے انتظام کا بار اٹھانے سے مجبوری ظاہر کی۔ مگر محمد علی کب ماننے والے تھے۔ خوشامد کی۔ ہاتھ جوڑے اور آخر مرحوم و مغفور سے وعدہ لے ہی لیا کہ حالات سازگار ہوئے تو انشاءاللہ اجازت دے ہی دی جائے گی۔

ابتدا ہی سے طے ہوا تھا کہ محمد علی (بیا اصلاح) کی آواز مسلمانوں تک پہنچانے کے لیے ایک اردو اخبار اور مسلمانوں کی آواز گورنمنٹ تک پہنچانے کے لیے ایک انگریزی اخبار نکالا جائے گا۔ یہ بھی طے ہوا تھا کہ اردو اخبار کی ایڈیٹری مولوی عبدالحق بی اے موجودہ سیکرٹری انجمن ترقی اردو کیا کریں گے۔ اور ان کے مددگار مولوی احتشام الدین دہلوی اور سید ہاشمی فرید آبادی ہوں گے۔ مولوی عبدالحق نے آخر میں ان سے معذوری ظاہر کی اور اپنی جگہ مولوی عبدالحلیم شرر لکھنوی کا نام تجویز کیا چنانچہ میں ۱۱ اگست ۱۹۱۲ء کو بدایوں سے لکھنؤ گیا اور انہیں آنے پر رضامند کیا۔

کلکتہ سے [illegible] آخری پرچہ جو ۱۲ ستمبر ۱۹۱۲ء کو نکلا اس کے بعد کامریڈ دہلی آ گیا۔ میں بھی بدایوں سے دہلی پہنچا۔ یہاں سے پہلا پرچہ [illegible] ۱۲ اکتوبر کو نکلا۔

اردو اخبار [illegible] نام ہمدرد تجویز ہوا تھا۔ ابھی نکلنے نہ پایا تھا کہ مولانا شرر [illegible] مقیم رشاہرو یا سب [illegible] اپنی فرودگاہ [illegible] سید ہاشمی [illegible] چلے گئے۔

ہمدرد کے [illegible] یہ تھا [illegible] ٹائپ بہت [illegible] جو پورے اخبار چھاپنے کے لئے کسی طرح کافی نہ تھا۔ ایک روز حکیم اجمل خاں تشریف لائے [illegible] محمد علی نے کہا ابھی تک پورے اخبار کے لیے ٹائپ نہیں آ سکا ہے۔ فرمانے لگے [illegible] کل [illegible] ضرورت ہے۔ اگر پورا اخبار نہ نکل سکے [illegible] دو صفحوں کا نکال دیجیے۔ آمدنی بھی ہوگی اور پبلک کی خدمت بھی۔ محمد علی نے [illegible] کہنا مان لیا۔ اور ہمدرد کا خاص سلسلہ ۲۴ فروری ۱۹۱۳ء [illegible] عام طور پر تقسیم [illegible] ہاتھوں ہاتھ بک جاتا تھا۔ [illegible] ۱۳ جون ۱۹۱۳ء تک [illegible]

پھر جون ۱۹۱۳ء میں مسجد کانپور کا قصہ شروع ہوا۔ ۸ جولائی ۱۹۱۳ء کے ہمدرد میں مسجد کانپور کے متعلق تھا۔ جو افتتاحیہ بھی ہے [illegible] محمد علی [illegible] مسجد کانپور کے متعلق ہوئی تھی۔

ڈاکٹر جانسن کے متعلق باسویل یا کہیں اور دیکھا تھا جس کا دھندلا سا خیال ذہن میں ہے۔ ایک دن ڈاکٹر [illegible] کے بڑے کمرہ میں [illegible] اور دوسرے دوستوں بلکہ نیازمندوں کے زمرہ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ یکایک اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر سب نے انتظار کیا۔ اس کے بعد فکر ہوئی کہ دفعتاً اٹھ کر کہاں گئے۔ مگر جانسن کے احباب جتنی ان سے محبت کرتے تھے اتنا ہی ڈرتے بھی تھے۔ لہذا دفعتاً اندر نہ گئے بلکہ باہر ہی سے کواڑ کے شیشوں سے جھانکنے لگے۔ دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب کمرے کے اندر اکیلے کودتے جاتے ہیں۔ اور کھلکھلا کر ہنستے جاتے ہیں۔ سب دبے پاؤں لوٹ آئے۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب بھی آ گئے اور تو کسی کی ہمت نہ پڑی۔ باسویل نے جو بہت منہ چڑھے نیازمند تھے۔ جسارت کر کے پوچھا کہ حضرت یہ کیا حرکت تھی

فرمانے لگے۔ مجھے ایک بات یاد آگئی تھی۔ جس سے طبیعت کو بہت خوشی ہوئی اور چونکہ ہم اپنے جذبات کو ضبط کرنا نہیں چاہتے
تھے لہٰذا کمرہ میں بیٹھے اور کودے۔ سب کے سامنے یہ حرکت اس لئے نہیں کی کہ تم کہتے جانسن پاگل ہو گیا۔

محمد علی مرحوم بھی جذبات کا مجموعہ تھے اور اسے خامی کہئے یا خوبی کہ اکثر اوقات وہ اپنے جذبات کو ضبط نہیں کر سکتے تھے میں
نے ان کو انبساطی اور انقباضی دونوں حالتوں میں دیکھا، کہ اگر وہ اپنے جذبات کو ضبط کرتے تو پھر بھی کوشش درخت طاقت کے
باہر تھا۔ آپ ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء والے جلسے میں دیکھیں کہ کس خوشی میں خوب ناچا اور کودا اور مولانا مرحوم محمد علی کو اس میں شریک کیا
آپ فرمائیں گے محض مبالغۃً اور استعارۃً لکھا ہے۔ شاید ایسا ہو مگر میں نے واقعات دیکھے ہیں کہ وہ خوشی کی حالت میں بھی آپے سے
باہر ہو گئے ہیں اور غصہ و رنج کی حالت میں بھی۔ ایک مرقع پیش کرتا ہوں۔ جس میں اتفاق سے دونوں منظر ایک ساتھ کھنچ گئے ہیں۔

مسلم یونیورسٹی کے سلسلہ میں قیصر باغ میں جلسہ ہوا۔ اس وقت یونیورسٹی کے متعلق (پنجابی ارباب صحافت کے محاورہ میں)
"نرم" اور "گرم" جماعتیں تھیں۔ راجہ صاحب محمود آباد نرم جماعت کے قائد تھے۔ اور محمد علی گرم جماعت کے روحِ رواں
مگر شب درمیان میں کچھ ان کی رائے میں "نرمی" آ گئی۔ اس سے الہلال مرحوم نے حدیث الغاشیہ کے عنوان سے ایک دھواں
دھار مضمون لکھا۔ جس میں شب تار اور تاریخ متاع کا سوال باندھ کر آخر میں یہ چبھتا ہوا شعر لکھ دیا۔

۵ معشوق ما بمذہب ہر کس مطابق ست — با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد

محمد علی کہیں باہر گئے تھے۔ واپس آ کر جب دیکھا تو چونکہ ان کے خیال سے، واقعات کو الٹ پھیر کر دکھایا گیا تھا، لہٰذا غصہ
سے عجیب حالت تھی۔ کہنے لگے "محفوظ اس کے جواب میں کوئی شعر بتاؤ" میں نہ شاعر ہوں نہ شعراء کے کلام کا حافظ۔ بھلا ایک
منٹ میں شعر کیا کہہ سکتا تھا۔ مگر ان کی حالت دیکھ کر کہہ دیا۔ اچھا ابھی بتاتا ہوں۔ اتفاق کی بات سعدی کا ایک شعر ذہن میں
آ گیا۔ گرچہ بے تکلف مناسب موقع ہو سکتا تھا مگر اس وقت مقتضائے مصلحت یہی تھا کہ شعر پڑھ ضرور دیا جائے۔ چنانچہ میں نے کہا کہ

بر کفے جام شریعت بر کفے سندان عشق — ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

یا تو وہ حالت تھی کہ غصہ میں آنکھوں سے شعلے برس رہے تھے یا دفعتاً منہ سے پھول جھڑنے لگے۔ مسکرانے ہنسنے، نعرہ
لگایا، پھڑک اٹھے اور جوش میں آ کر مجھے گود میں اٹھا کر سارے ہال میں گھومتے پھرے۔ لاہور سے کسی جلسہ میں شرکت کی دعوت
آئی تھی۔ جس کا جواب دفتر سے جا رہا تھا کہ کام کی کثرت کے باعث شرکت سے معذوری ہے۔ شعر سننے کے بعد فوراً حکم دیا کہ وہ
جواب نہ دیا جائے۔ بلکہ تار دیا جائے کہ آج شام چل کر کل لاہور پہنچوں گا۔ چنانچہ جلسہ میں پہنچ کر دورانِ تقریر میں الہلال کے احترام
کا نہایت مسرور و مسکت جواب دیا۔ اپنی بظاہر تبدیلی کی توجیہہ کی اور معشوق والا شعر پڑھ کر اس کے جواب میں سعدی کا شعر
نہایت مزے لے لے کر پڑھا اور کہا کہ ہم پر الزام دیا جاتا ہے کہ ہم نے دونوں فریق کا جی رکھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم نے جس طرح
دو مسلکوں میں تطابق کیا اور جام و سندان کو لڑا کر نغمہ پیدا کیا ہر ہوسناک کا دماغ نہیں کہ اسے سمجھ بھی سکے۔

اس کے ساتھ ارادے کی مضبوطی اور رائے کے استقلال کا عالم یہ تھا کہ جو بات غور و فکر کے بعد اپنے نزدیک صحیح سمجھ کر طے کر لی تھی پھر اسی سے
تجاوز کرنا بعید از امکان تھا۔ اس کی ایک مثال "ہمدرد" کا اجراء ہے کہ کوڑی پاس نہیں مگر اتنے بڑے کام کو شروع کر دیا۔

دو اور مثالیں ذہن میں ہیں۔

(۱) کامریڈ کے دہلی آنے کے بعد ہی جب سید امیر علی اور سر آغا خاں کے بحری تار آنے شروع ہوئے اور ترکوں کی لڑائی (جنگ بلقان میں) سب سے زیادہ ضرورت طبی مدد کی ہے۔ تو ڈاکٹر انصاری نے چاہا کہ وہ ہندوستان سے ایک طبی وفد لے جائیں اور لڑائی میں زخمیوں کی مرہم پٹی کر کے ترکوں کا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ انہوں نے بطور خود ایک تخمینہ اخراجات بھی تیار کیا۔ اور سید امیر علی اور اپنے ان ہندوستانی احباب (ڈاکٹر عبدالرحمن اور ڈاکٹر نیفی وغیرہ) سے جو ولایت میں طبی تعلیم ختم کر چکے تھے اسی بارے میں مراسلت کی۔ اس دوران میں انہوں نے یہ تجویز محمد علی کے سامنے پیش کی۔ جسے محمد علی نے بہت پسند کیا اور ہر قسم کی مدد دینے پر آمادگی ظاہر کی۔ دہلی میں ترکوں کی امداد کے لئے ایک انجمن ہلال احمر قائم ہوئی تھی۔ اس کے جلسہ میں محمد علی نے اس تجویز کو پیش کیا۔ انجمن نے اتفاق کیا اور پندرہ ہزار کی رقم جو عثمانی کانسل جنرل مقیم بمبئی کو بھیج دی تھی۔ تار کے ذریعہ واپس مانگی تاکہ طبی وفد کے اخراجات میں لگا دی جائے۔ مگر دوسرے ہفتہ کے جلسہ میں اپنی رائے بدل دی۔ اور طے کیا کہ ان کی رقم کانسل جنرل ہی کے ذریعہ ٹرکی کے وزیر اعظم کی خدمت میں بھیج دی جائے۔ محمد علی نے بہت سمجھایا مگر جب دہلی والوں نے اپنی رائے میں تبدیلی نہ کی تو جلسہ ہی میں مجھ سے پوچھا "ہمارے پاس کتنی رقم ہے؟" میں نے کہا "اتنے ہزار اتنے سو روپے" کہنے لگے "الحمد للہ! ہمارے پاس کافی رقم ہے۔ انصاری میں نے طے کر لیا ہے کہ انشاء اللہ مشن جائے گا اور ضرور جائے گا۔ میرے پاس دس روپے ہوتے تب بھی ہمت نہ ہارتا۔ اور اسی دن سے تحریک شروع کر کے سارے ہندوستان سے رقم فراہم کرتا۔ اب تو خدا کے فضل سے اس قدر موجود ہے۔ تم اللہ کا نام لے کر انتظام کرو۔ رقم کی فراہمی میرے ذمے۔" اسی رات کو اس عرب شاعر کی طرح جس نے اپنے لڑکے سے کہا تھا "آج ذرا چراغ میں تیل زیادہ ڈال دینا۔ فلاں قبیلہ کی ہجو تیار کر رہا ہے۔" انہوں نے اپنے خدمت گار محمد حسین سے کہا "جا کر میرے کمرے میں لیمپ تو جلا دے (اس وقت تک بجلی کے تار کمروں میں نہ لگ سکے تھے)۔ کمرے میں جا کر کامریڈ کے لئے مضمون لکھا جس میں مسلمانوں سے طبی مشن کے چندہ کے لئے وہ دل ہلا دینے والی اپیل کی جس نے کامریڈ کے دفتر میں روپوں کی بارش شروع کر دی۔ کامریڈ کے فائل گواہ ہیں کہ ایک ایک دن میں دس دس پندرہ پندرہ ہزار روپے وصول ہوتے تھے۔ اور میں گواہ ہوں کہ منی آرڈروں اور پارسلوں پر دستخط کرتے کرتے میرا ہاتھ شل ہو گیا ہے۔

(۲) لندن ٹائمس میں ایک مضمون "چوائس آف دی ٹرکس" کے عنوان سے شائع ہوا جس میں ترکوں کو دھمکیاں دی گئی تھیں بلکہ حکم دیا گیا تھا کہ اس جنگ میں جو شروع ہوئی ہے، غیر جانبدار رہیں ورنہ ان کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔ اس زمانہ میں بیگم محمد علی سخت علیل تھیں محمد علی کو مریضہ کی تیمارداری میں رات بھر جاگتے گذرتی تھی۔ حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بار بار آ کر دیکھتے تھے۔ اسی رات میں محمد علی نے ٹائمس ہی کے عنوان سے وہ مضمون لکھا جو ان کی زندگی کے دریا کا رخ بدل دینے والا ثابت ہوا۔ محمد علی کے مدراسی زود نویس (اسٹینو گرافر) مسٹر آئیسر نے راجہ غلام حسین مرحوم سب ایڈیٹر کامریڈ سے چپکے سے کہہ دیا۔ کہ محمد علی صاحب ایک نہایت سخت اور تلخ مضمون لکھوا رہے ہیں۔ راجہ مرحوم نے مضمون دیکھ حکیم صاحب اور ڈاکٹر صاحب سے اس کا تذکرہ کیا اور کہا کہ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی مضمون پڑھ کر اور حکیم صاحب نے اس کا مطلب سن کر یہی رائے دی کہ مضمون اس وقت ہرگز شائع نہ کیا جائے مگر محمد علی کب ماننے والے تھے۔ راجہ بے چارے نے گھبراہٹ میں مجھے دہلی کا تار دیا کہ فوراً آؤ۔ میں پہنچا اور نرم الفاظ میں اپنی ہیچ میرز رائے دی۔ مگر محمد علی نے ایک نہ سنی۔ جب میں نے زیادہ کہا کہنے لگے "میں جانتا ہوں کہ میں نے اپنی موت کے وارنٹ پر دستخط کئے ہیں۔ مگر اب میں

رائے قائم کر چکا ہوں جو ہونا تھا وہ ہو چکا اب کچھ نہیں ہو سکتا "

محمد علی بالطبع سست نہ تھے مگر کاہل ضرور تھے۔ وہ خود تو اپنے آپ کو کام چور کہتے تھے لیکن کام چور نہ تھے تو ٹال مٹول تو یقیناً تھے۔ منٹوں کا کام دنوں بلکہ ہفتوں میں کرتے تھے۔ مگر جب کرنے پر آجاتے تھے تو مہینوں کا کام منٹوں نہیں تو گھنٹوں میں تو ضرور کر ڈالتے تھے۔

دہلی آکر کامریڈ کبھی وقت پر نہ نکلا۔ صبح کا ناشتہ کرنے کے بعد محمد علی سنجیدگی اور پختہ نیت کے ساتھ کام کرنے یعنی مضمون لکھنے بیٹھتے ہی تھے کہ چپراسی نے اطلاع کی کہ فلاں صاحب تشریف لائے ہیں، وہ صاحب آکے بیٹھے ہی تھے کہ مسٹر فلاں بھی تشریف لے آئے اب مجلس گرم ہوئی۔ دوپہر ہو گئی کبھی کھانے میں شریک ہوئے کبھی ویسے ہی چلے گئے۔ دوپہر کا کھانا شروع ہوا۔ کوئی سلسلہ چھڑ گیا تو سہ پہر کی چائے پر ختم ہوا۔ باہر جانے کا وقت ہوا۔ غالب کے الفاظ میں "فلاں صاحب کا ایک آنہ دینا ہے" تشریف لے گئے۔ اور کھانے کے وقت واپس تشریف لائے۔ ہم غصہ میں بھرے منہ بنائے بیٹھے ہیں۔ پہلے تو خیال نہ ہوا پھر فرمانے لگے "بھائی صاحب یہ آج مزاج کا پارہ کیوں چڑھا ہے۔ کس پر خفگی ہے۔ کسی نے زبان چلائی ہے۔ زبان نکال لوں۔ آنکھ دکھائی آنکھ پھوڑ دوں۔ ناک چڑھائی ہو ناک توڑ دوں۔ کان ہلائے ہوں "کان کاٹ لوں"۔ اب ہمارے ضبط کا پیالہ چھلک گیا اور جو کچھ منہ میں آیا بکنا شروع کیا "محمد علی تم کاہل ہو، باتونی ہو، بیہودہ ہو، کمپازیٹر اور پریس مین مفت کی تنخواہ پا رہے ہیں۔ تمہارا نقصان ہو رہا ہے۔ کامریڈ کے وقت سے نہ نکلنے کی بدنامی ہو رہی ہے۔ آخر ادور ٹائم دے کر پرچہ چھاپنا پڑے گا"۔ اسی سلسلہ میں زبان سے نکل گیا "کام وام تو کرتے نہیں، آرام کرسی پر پڑے انگڑائیاں لیتے رہتے ہو۔ انگڑائی کا لفظ سنتے ہی کہنے لگے "ہمارا نظام رامپوری کہتا ہے، دیکھو کیا بانکا شعر ہے۔ سہ

انگڑائی بھی وہ نہ لینے پائے اٹھا کے ہاتھ
دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ

ہائے ظالم نے کیا تصویر کھینچ دی ہے۔

ہم بھاڑ میں جائے تمہارا ہاتھ"، کہتے ہوئے جلے بھنے اٹھ آئے اور اپنے کمرے میں جا کر سو رہے۔ صبح کو ناشتے پر بلائے گئے: "بھائی جان کچھ غصہ کم ہوا، خاک کم ہوا۔ دسواں کم ہوا اب ہم بدایوں جاتے ہیں" "بھائی خفا کیوں ہوتے ہو۔ یہ لو مضمون یا کسی کی جان لو گے یہ کہہ کر ایک پلندا پھینک دیا۔ دیکھا تو کامریڈ کے نئے "گپ" کا ایک نہایت ہی لچھے دار مضمون تھا۔

کامریڈ کی ضبطی ضمانت کے سلسلہ میں محمد علی نے دہلی کی عدالت میں خود بحث کی۔ دوران بحث میں دہلی کے وکیلوں اور بیرسٹروں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے اور ہر شخص دم بخود تقریر کا حرف حرف دل کے کانوں سے سن رہا تھا۔ باہر نکلے آکر چند رسپال بیرسٹر کے منہ سے بیک بینی جملہ نکلا کہ "مسٹر محمد علی کاش آپ بیرسٹر ہوتے"۔ محمد علی نے جواب دیا کہ "اب بھی جو کچھ ہوں اس کی کتنی قدر ہو رہی ہے جو بیرسٹری میں ہوتی"۔

ایک کہانی ——— ایک ایسی کہانی جو آدم کے وقت سے شروع ہوئی اور اب تک جاری ہے۔ اور قیامت تک جاری رہے گی۔ محبت کی کہانی ——— لکھی جا ئیں گی کتاب دل کی تفسیریں بہت! کتاب دل کی یہ تفسیریں ازل سے لکھی جا رہی ہیں اور ابد تک لکھی جاتی رہیں گی۔ کتاب دل کی یہ داستان لکھتے وقت کبھی قلم کا کلیجہ شق ہوتا ہے، کبھی اس سے الفاظ کے بجائے پھول ٹپکتے ہیں۔

اس داستان میں آنسو بھی ہیں اور آہیں بھی، خوشی کے نغمے بھی اور نشاط کے ترانے بھی۔ اور ملاپ کی مسرت بھی، بدگمانی کا غبار بھی۔ اور اعتماد کا نکھار بھی۔

یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جس کے بارے میں جگرؔ نے کہا ہے:

"یہ شاخِ گل بھی ہے تلوار بھی ہے۔"

اس میں شاخ گل کی لچک بھی تھی اور تلوار کی کاٹ بھی۔ پہاڑ کا وقار بھی اور سمندر کی گہرائی بھی ——— عزم و استقلال، وفا اور استقامت کی غیر فانی کہانی۔ رئیس احمد جعفری کے قلم سے۔

ضخامت ۴۰۰ صفحے

قیمت چھ روپے

عبدالماجد دریابادی

محمد علی علیگ

محمد علی کے نام کے ساتھ آکسن اس کثرت سے لکھا گیا کہ گویا ان کے نام کا جزو بن گیا۔ یہاں تک کہ ان کے وطن رام پور کے ایک تار بابو نے ان کے نام کے تار کے پتہ پر (OXON) پڑھ کر اور اسے آکسن (OXEN) سمجھ کر اس کا ترجمہ بھی "بیل والا" کر ڈالا لیکن سچ یہ کہ محمد علی کو فخر اپنے آکسن ہونے پر نہیں۔ اپنے علیگ ہونے پر تھا۔ علی گڑھ سے انہیں بے پناہ محبت تھی۔ اسلام کے بعد انہیں عشق اگر کسی سے تھا تو علی گڑھ سے۔ اور یہ تو یقینی ہے کہ عشاق علی گڑھ یا شیدائیان علی گڑھ کی اگر کبھی کوئی مختصر سی مختصر فہرست بھی تیار ہوئی تو سر سید اور محسن الملک کے بعد اور آفتاب احمد خاں اور ضیاء الدین احمد کی صف میں لکھنے والے کو ایک نام محمد علی کا بھی رکھنا ہوگا۔

یہ میں آپ کے میگزین کے علی گڑھ نمبر کے لیے کوئی مضمون لکھنے نہیں بیٹھا ہوں (وقت اس کے لیے کہاں سے لاؤں) صرف ایک آدھ بات بطور اشارہ یا نکتہ کے لکھے بھیجتا ہوں۔ اس کی روشنی میں کسی صاحب توفیق و صاحب ہمت کو پکڑیے۔ اور اس سے مستقل مضمون محمد علی اور علی گڑھ پر لکھوا لیجیے۔

علی گڑھ وہ اپنے بچپن میں جب سے آئے اسکول اور کالج کی ہر تحریک اور ہر شوخی و شرارت میں اپنی عمر و بساط بھر بڑھ چڑھ کر ہی سے حصہ لیتے رہے۔ پھر جب سے انگریزی لکھنا آگئی۔ میگزین میں لکھنے بھی لگے۔ اور کچھ نہ سہی تو کالج کے کھیل کود ہی پر، علی گڑھ کے کرکٹ ہی پر۔ پھر جب آکسفورڈ گئے۔ تو وہاں سے بھی میگزین کے نقش ثانی (منتھلی) کے لیے لکھ لکھ کر بھیجتے رہے۔

لکھنے والے کو تھوڑی بہت ریسرچ کرنا ضروری ہے۔ اس وقت کا جتنا بھی مطبوعہ و قلمی ذخیرہ لٹن لائبریری میں یونین کے کاغذات میں، اولڈ بوائز کے دفتر میں۔ جہاں کہیں بھی مل جائے سب کا ایک ایک ورق چھانٹنا پڑے گا۔

مذہبیات میں سر سید کے ہم عقیدہ کبھی نہ رہے۔ اور نہ کبھی نیچری کہلائے۔ باوجود اس کے انھیں سر سید سے محبت و عقیدت ہی نہیں عشق تھا۔ اور اگر "محمدی ہونے کے بعد" وہ کسی بھی نسبت پر فخر کرتے تو اپنے کو شاید "سید احمد خانی" ہی کہلاتے۔ سنہ ۱۹۰۷ء میں علی گڑھ کے پہلے اور مشہور اسٹرائک کے بعد جب ان کا سن پورے ۳۰ سال کا بھی نہ تھا، سر سید کی برسی کے موقع پر ایک نظم کہی۔ اس میں یا اپنی روداد قلب سناتے ہیں:۔

بیاں کس طرح ہو اے سید احمد خاں کہ کیا تم ہو — ہمارے عاشق دلدادہ، تم ہو، دل ربا تم ہو

بحر قوم کی کشتی کی گو کشتی سے باہر ہو — ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا، ہمارے ناخدا تم ہو

یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں تنگ رہا تم کو — وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول دعا تم ہو

کرو اس قوم کے حق میں دعا اے سید احمد خاں — کہ محبوب الٰہی تم ہیں یا مقبول خدا تم ہو

بہت تھے باخدا دنیا میں جب تم ایک کافر تھے　　مگر دارالجزاء میں شک نہیں اک باخدا تم ہو

ساری نظم انھیں جذبات سے گلزار ہے۔

محمد علی نے اپنی زندگی میں بے شمار دکھ جھیلے۔ اور صدمے اٹھائے اور ان کی عمر ہی کہنا چاہیے کہ مجاہدات اختیاری و اضطراری کی نظر رہی۔ لیکن ان کے اختیاری مجاہدوں میں شاید سب سے بڑے مجاہدہ کا دن وہ تھا۔ جب وہ علی گڑھ کو توڑنے کے لیے سنہ ۱۹۲۰ء میں علی گڑھ میں داخل ہوگئے ہیں۔ محمد علی اور علی گڑھ کو توڑیں! آہ تاریخ کی غلط اندیشیاں اور کج فہمیاں۔

کتنا غلط یہ حرف بھی مشہور ہو گیا۔

خیر محمد علی تو علی گڑھ کے پرستار تھے۔ فدائی تھے۔ ان کے دل سے تو یہ لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح ان کا علی گڑھ بھی انہی کی طرح تحریک خلافت و ترک موالات کا علم ہاتھ میں لے کر سب کی رہنمائی کرنے لگے۔ ان کا دل اس کے لیے تڑپ رہا تھا کہ جس مقصد کو وہ اپنے عقیدہ میں ملک و ملت کا بہترین و برترین مقصد سمجھے ہوئے ہیں۔ اس کے لیے جد وجہد میں ان کے علی گڑھ کا بھی قدم کسی سے پیچھے نہ رہنے پائے۔ بس یہی دھن۔ یہی چاہ تھی جو انہیں علی گڑھ لے گئی۔ اور اس نے ان سے جامعہ کو علی گڑھ سے باہر نہیں خاص علی گڑھ میں قائم کرایا۔ انہیں امید تھی کہ علی گڑھ والوں کا دل کچھ دنوں میں پسیجے گا۔ اور جب مسلم یونیورسٹی جامعہ کے قریب آجائے گی تو وہ جامعہ کو ختم کر کے اسے اپنے قدیم علی گڑھ (مسلم یونیورسٹی) سے ملا دیں گے۔

یہ ایک الگ سوال ہے کہ ان کی یہ امید بھی ان کی سینکڑوں دوسری امیدوں اور آرزوؤں کی طرح سرسبز ہو سکی لیکن جو شے ان کے ذہن میں کام کر رہی تھی وہ یہی تھی اور یہیں سے اس راز کی گرہ کھل جاتی ہے کہ وہ جامعہ کو علی گڑھ سے ہٹانے اور دہلی لے جانے پر کسی طرح رضامند نہیں ہوتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری اور حکیم اجمل خاں جیسے مخلص با اثر دوستوں کے اصرار کے باوجود بھی جامعہ کے انتقال مکان پر آمادہ نہیں ہو رہے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دہلی منتقل ہو کر پھر کوئی امکان جامعہ کا مسلم یونیورسٹی سے ادغام کا باقی نہ رہ جائے گا۔ سنہ ۲۴ تک وہ برابر یہی خواب دیکھتے رہے۔

محمد علی کی زندگی اور موت، دونوں
انکی انفرادی اور شخصی افتاد طبع کی ایک جلوہ گری
تھی اور شخصیت کی اسی جلوہ گری کا نام آرٹ ہے
صحیح اور گراں مایہ ″　　رشید احمد صدیقی

دیکھی تھی کہ سب سے پہلے آکسفورڈ کے تعلیم یافتہ محمد علی کے سوٹ کی تراش اور سوٹ کے ساتھ موزوں اور جوتوں کے رنگ و ربط سے مانوس ہوئی۔ باقی جو کچھ دیکھا وہ بعد میں دیکھا۔ اس وقت میری ۲۲ سال کی عمر تھی جس کا ایک حصہ سرکاری ملازمت میں گزرا لیکن یہ زمانہ اس قدر مختصر تھا کہ میں سرکاری ملازمت کے سانچے میں ڈھل نہ سکا تھا۔ اپنی نظر [illegible] طرف بھی قائم نہ تھا۔ میں کامریڈ کے مضامین پڑھا کرتا تھا اور ان مضامین کے مطلب سے زیادہ تحریر کی زبان پر محمد علی کے قلم کی ندرت کو دیکھ کر جھوما کرتا تھا میرا دل اور میری طرح اس زمانہ کے ہزارہا نوجوانوں کا دل جدید نظریوں کی وسعتوں اور خیالات کی بلندیوں سے آشنا تھا۔ ہمدرد کے شعبہ ادارت میں جب میں ایک ادنیٰ شاگرد بن کر محمد علی کے سامنے بیٹھا تب کہیں میں نے ان چنگاریوں کی گرمی محسوس کی جو کامریڈ کے جوان سال اور بے باک ایڈیٹر کی شخصیت سے نکل کر ان کے نوجوان شاگردوں کو اذیت کوشی کی دعوت دیتی تھیں۔ ۲۲ فروری ۱۹۱۳ء کو ہمدرد کا ایک ورقہ نقیب ہمدرد کے نام سے شائع ہوا۔ اس وقت تک بیرونِ [illegible] سے ٹائپ کی کافی مقدار وصول نہ ہوئی تھی۔ اس لئے یکم جون ۱۹۱۳ء سے پہلے ہمدرد اپنے پورے حجم کے ساتھ شائع نہ ہو سکا۔ یکم جون ۱۹۱۳ء کے بعد سے شعبہ ادارت کا پورا کام شروع ہوا اور میں نے پہلی دفعہ محمد علی کے مددگار کی حیثیت سے صحافت کے میدان میں قدم رکھا۔ جب تک ۱۹۱۴ء کی جنگ کا ہنگامہ شروع نہ ہوا اور محمد علی کی مدبرانہ حیثیت قومی قیادت کے کاموں میں منتقل نہ ہوئی وہ ہمدرد کے شعبہ ادارت کی نگرانی کرتے رہے یہی زمانہ تھا کہ ایک ایسے استاد کی طرح جو بیک وقت شفیق بھی تھا اور سخت گیر بھی انہوں نے صحافت کے ابتدائی اصول اپنے نوجوان مددگاروں کو بتائے۔ طریقِ کار یہ تھا کہ ہفتہ میں صرف ایک دو مضامین لکھوائے جاتے تھے۔ ہر روز شام کو شعبہ ادارت کے اراکین کی ایک مجلسِ مشاورت چیف ایڈیٹر کے کمرے میں منعقد ہوتی تھی۔ اس مجلس میں مرحوم اپنے ہر مددگار کے لئے ایک مضمون تجویز کرتے تھے اور بار بار اس اصول کو ذہن نشین کرایا کرتے تھے کہ لکھنے سے پہلے اور لکھنے سے زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہے۔ بعض دفعہ دس بارہ کتابیں پڑھنے کے بعد ایک اداریہ لکھنا ہوتا تھا۔ میرا پہلا اداریہ ہمدرد کی پہلی جلد کے آٹھویں پرچے میں ۱۰ جون کو شائع ہوا تھا اس کا عنوان [illegible] مصر تھا۔ یہ اداریہ کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا لیکن میں یہ بتاؤں کہ وہ کیونکر تحریر کیا گیا تھا۔ اور فنِ صحافت میں محمد علی کے شاگرد کس طرح تربیت حاصل کرتے تھے۔ دس بارہ کتابیں مجھے دی گئی تھیں تاکہ میں ان سب کو پڑھ لوں کچھ نوٹ خود محمد علی لے لکھ تے تھے۔ آٹھ دس دن میں مضمون کی تیاری کرتا رہا پھر جب ایک حصہ لکھا تو مسودہ ان کے پاس لایا مجھے یاد ہے کہ تین ہی سطریں پڑھنے کے بعد انہوں نے منہ بنایا اور یہ کہہ کر مسودہ پھینک دیا کہ "بالکل فضولیات گھسیٹ کر لائے ہو" میں کیا کہوں کہ اس دن ایک ناتجربہ کار نوجوان کی کس قدر دل شکنی ہوئی جس کو اپنے خیال میں بڑا ناز تھا۔ اس بات پر کہ وہ ہمدرد کے ادارتی شعبہ میں بغیر اپنی خواہش کے ادارت کے ساتھ شریک کیا گیا ہے۔ حالانکہ عمر اور تجربہ میں وہ محمد علی کے تمام دوسرے مددگاروں سے کم تھا۔ اب اگر چیف ایڈیٹر فرماتے ہیں کہ پہلے ہی مضمون کا مسودہ فضولیات قرار پایا تو ظاہر ہے کہ اس نوجوان کی خود بینی کو جس قدر بھی صدمہ پہنچا ہو وہ کم ہے۔ بڑی ذلت اور شرمندگی محسوس ہوئی۔ کچھ غصہ بھی آیا مگر اتنی جرأت نہ تھی کہ اس غصہ کا ذرہ بھی اظہار کیا جاتا۔ پھر ایک گھنٹہ تک ان کا لیکچر سنا۔ پھر بہت کوشش کر کے ان کے خیالات کے مطابق از سرِ نو وہ مضمون لکھا پھر بھی وہ ناپسند ہوا مگر اتنا زیادہ نہیں جتنا کہ پہلی دفعہ۔ ہدایت ہوئی کہ ایک دفعہ پھر لکھو۔ رات بھر بیٹھ کر پھر لکھا اور

صبح کو پیش کیا۔ پورا مضمون پڑھا اور گلے سے لگالیا۔ تعریفوں کے پل باندھ دیئے پہلے جس قدر ان کی تنقید سے شرمندہ ہوا تھا اب ان کی تحسین سے شرمندہ ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ تنقید کی تلخی ہی میں شہد اور دودھ کی لبریز نہریں بہا کرتی ہیں ہفتوں میرے مضامین کی تعریف ہوتی رہی۔ جو ملنے والا آتا اس سے سوال ہوتا دیکھا آپ نے ہمدرد کا مضمون غفار نے لکھا ہے۔ قلم توڑ دیے ہیں۔ چنانچہ حوصلہ بڑھا اور خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ اب ان کی بات سمجھ میں آنے لگی۔ ان کا سا حافظہ یا ان کی سی ذہانت تو نصیب نہ ہوئی تھی، اس لئے بلا مبالغہ سینکڑوں اور ہزاروں کتابیں اس طرح پڑھیں کہ پنسل اور نوٹ بک پاس رکھی ہے۔ کام کی باتیں نوٹ کیا جاتا ہوں۔ ہر مسئلہ کے متعلق حاصل کردہ معلومات کو ایک علیحدہ فائل میں محفوظ کر دیتا ہوں اور ضرورت کے وقت اس سے کام لیتا ہوں۔ مضمون لکھتا ہوں تو زیادہ کوشش اس بات کی کرتا ہوں کہ وہ معلومات سے پر ہو اور معلومات بھی ایسی جو صحیح ہو۔

خود محمد علی کو جب کوئی اہم مضمون لکھنا ہوتا تھا تو راتوں کو اس طرح جاگتے تھے کہ ان کے بستر پر کتابیں اخباروں رسالوں اور تراشوں کا ایک انبار ہوتا تھا۔ اور سرخ پنسل ہاتھ میں ہوتی تھی۔ ان تیاریوں کے بعد لکھنے بیٹھتے تھے تو اپنے طرز نگارش کے ساتھ اپنی بے پناہ معلومات سے دلائل کے وزن میں اضافہ کرتے تھے اور بعض اوقات تو میں سمجھتا تھا کہ وہ بال کی کھال نکال رہے ہیں۔ لیکن بعد کو معلوم ہوتا تھا کہ انہیں چھوٹی چھوٹی تفصیلات سے بڑے بڑے دلائل مستحکم کئے جاتے ہیں۔

ہر شریک کار کو ان کے خلوص اور محبت سے بھرے ہوئے دل میں جگہ ملتی تھی۔ ظاہری عتاب اور غصہ (جو آخر میں اعصابی امراض کی وجہ سے بہت زیادہ ہوگیا تھا) محض عارضی ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ان کے ایک مضمون کا ایک پروف میں نے دیکھا تھا اس میں کوئی غلطی رہ گئی مزاج برہم ہوگیا۔ دفتر میں آکر مجھ پر برس پڑے میں بھی بگڑ پڑا اور اسی وقت اپنا استعفیٰ دے کر گھر چلا آیا۔ دوسرے دن شوکت بھائی زبردستی پکڑ کر لے گئے۔ اور میں گیا بھی تو یہ کہہ کر کہ کل سے محمد علی نے کھانا نہیں کھایا ہے اور بہت مغموم ہیں۔ ان کے سامنے پہونچا تو شکایت حکایت تو کجا بے تکلف اس طرح رونے لگے کہ مجھ پر ہزاروں گھڑے پانی پڑ گیا۔ میری شکایت ندامت بن گئی۔ اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کی محبت کے جواب میں وہ محبت مانگا کرتے تھے اور اگر ہم اپنی کم فہمی سے ان کی کسی شکایت اور غصے کو ناروا قرار دے کر خفا ہو جاتے تھے تو ان کے قلب صافی کی سادگی ایسی تھی کہ وہ خود بھی حیران ہو جاتے تھے کہ یہ ہم نے کیا کیا۔ صحافت ان کی زندگی کا کوئی واحد مقصد نہ تھا۔ ہمدرد کے اجراء کے چند ہی روز بعد ان کی قومی مصروفیت نے اپنے لئے بڑے بڑے میدان اور خارزار پیدا کر لئے۔ اس لئے صحافت کو وہ اب اپنی نظر میں اس سے زیادہ کچھ نہ سمجھتے تھے کہ۔

"مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موج خوں یہ بھی"

چنانچہ رفتہ رفتہ کامریڈ اور ہمدرد کے کاموں سے ان کا تعلق برائے نام ہوگیا۔ اور "ہمدرد" کی ذمہ داریاں بڑی حد تک مجھ پر اور کامریڈ کی ذمہ داریاں مرحوم راجہ غلام حسین پر عائد ہوگئیں ان کی نظر بندی کے بعد بھی کچھ عرصہ تک میں "ہمدرد" سے وابستہ رہا لیکن بعد میں کلکتہ جا کر وہاں سے روزنامہ "جمہور" جاری کیا۔ اس طرح میں ان سے جدا ہوگیا۔ میری صحافت کلکتہ میں بھی بہت کامیاب رہی اور جو کچھ محمد علی سے سیکھا تھا وہی کام آیا۔

یہ تھے محمد علی علی گڑھ کے ایک قابل فخر سپوت ان کی صحیفہ نگاری نے اردو صحافت کا ایک نیا دور شروع کیا تھا اور وہ اردو کی پس ماندہ صحافت میں بعض اہم اصلاحات کے بانی تھے مثلاً "ہمدرد" پہلا روزنامہ تھا جو لیتھو کے بجائے ٹائپ میں چھاپا گیا۔ ہمدرد پہلا روزنامہ تھا جس کے مضامین کا معیار اس زمانہ کی عام صحافت سے بہت زیادہ بلند تھا۔ بہت سے مشہور شعراء اور ادیبوں کو جو صحافت سے دور رہتے تھے محمد علی کی شخصیت نے پہلی دفعہ ہمدرد کے صحافت پر پیش کیا۔ حالی، اقبال اور شبلی کی نظمیں اور پریم چند کے افسانے غالباً پہلی دفعہ اسی اردو روزنامہ میں شائع ہوئے۔ اور مزاح نگاری کا ایک ایسا معیار ہمدرد نے قائم کیا جس کا اس سے پہلے اردو صحافت میں کوئی وجود نہ تھا برق اور محفوظ علی دونوں علی گڑھ کے اس فن کے استاد مانے گئے اور آج بھی جو اچھے مزاح نگار یا طنز نگار ہیں انہوں نے ہمدرد کی روایات سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ یہ سب محمد علی کی شخصیت کا کرشمہ تھا۔ میں سوچا کرتا ہوں کہ وہ اگر سیاسی اختلافات کی الجھنوں میں نہ پھنس گئے ہوتے اور صحافت اور تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ رجوع ہوتے تو خدا جانے وہ کیا ہوتے۔

علی گڑھ کے سلسلے میں ان کا ذکر کرنا میرے لئے اس وجہ سے مشکل ہے کہ وہ میرے ہم عصر نہ تھے لیکن بعد میں علی گڑھ سے اور علی گڑھ کے مسائل سے ان کی شخصیت بار بار ٹکرائی۔ اس تصادم کا ایک نتیجہ جامعہ ملیہ کا قیام تھا۔ اس داستان کا یہ حصہ بہت زیادہ سیاسی ہو جائے گا۔ اس لئے اس زمانے کے حالات کا کچھ زیادہ ذکر نہیں کرتا سوائے اس کے کہ علی گڑھ کی تحریک کے بہت بڑے حامی ہوتے ہوئے وہ علی گڑھ کے بڑے بڑے لیڈروں سے ٹکراتے رہے۔ محسن الملک اور وقار الملک اور آپ کے جانشین اور انگریز اسٹاف سب ہی ان کی تنقید کی زد میں آئے لیکن تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کے ہنگامے میں وہ علی گڑھ سے گذر کر دوسرے میدانوں میں چلے گئے۔ تاہم آخر تک ان کے دل کو علی گڑھ کی بہت فکر رہی۔

علی گڑھ کے کمانڈروں کے سردار تو شوکت علی تھے لیکن محمد علی اس زمانے کے نوجوان دانشوروں میں علی گڑھ کی پالیسی میں تھے۔ وہ عرصہ تک سر سید کے مسلک کے داعی رہے لیکن سر سید کے جانشینوں سے ان کی ترقی پسندی بار بار ٹکرائی۔ ایک زمانہ ہوگا کہ ان کا بس چلتا تو علی گڑھ کا سارا نقشہ بدل دیتے۔ جس وقت علی گڑھ کا انگریزی اسٹاف حکومت کا نمائندہ بن کر اپنے اقتدار کو علی گڑھ پر مسلط کر رہا تھا تو محمد علی علی گڑھ کے قدیم دوستوں سے بغاوت کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ان کی آواز عوامی زندگی میں وزن رکھتی تھی اور جب بلند ہوتی تھی تو بہت گونجتی تھی۔ مزاج، قلم اور زبان کی شدت میں بہت اضافہ ہوگیا۔ اس کی ایک مثال ان کے وہ خطوط ہیں جو اس زمانے میں وہ علی گڑھ کے ارباب کار کو لکھتے تھے۔ جس وقت نواب محسن الملک مرحوم پر انگریز اسٹاف اور حکومت کا دباؤ بڑھ رہا تھا تو محمد علی اس بات پر زور دے رہے تھے کہ جو اسٹاف بورڈ اور ٹرسٹیز اور سکریٹری سے سرتابی کرے تو اسے نکال دینا چاہیئے چنانچہ ایک خط میں نواب محسن الملک کو لکھتے ہیں کہ۔

اب آپ عمر کی اس منزل پر آگئے ہیں کہ ذرا گردن اٹھا کر عالم بالا کی بھی سیر کیجئے آپ کی نظر میں یہاں کے انعام صلے اور چھوٹے سلے ستارے سے زیادہ وقعت نہ رکھیں گے۔ جو راستہ آپ نے اختیار کیا ہے وہ آپ کو منزل مقصود تک ہرگز نہ پہنچائے گا یہ کعبہ کی راہ نہیں ہے ترکستان کا راستہ ہے۔ غلطی آپ کے

دل کی نہیں دماغ کی ہے۔" (خطوط محمد علی مرتبہ پروفیسر سرور)

قائد ملت محمد علی کے متعلق تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن نہ تو صحیفہ نگار محمد علی کے متعلق ابھی کچھ لکھا گیا اور نہ علی گڈھ کی تحریک سے محمد علی کی آویزش کی تفصیلات قلمبند ہوئی ہیں جب کبھی وہ یاد آتے ہیں تو اس عہد رفتہ کے بہت سے مردے گرد میں بدلتے ہیں۔ علی گڈھ والوں کے لئے آج بھی ان کا نام اپنے اندر ایک بے پناہ جاذبیت رکھتا ہے۔ علی گڈھ کا محمد علی اس وقت کیا تھا اس کا تصور کیجئے جس طرح میں آج سنہ ۱۹۱۱ء کے زمانے کو دیکھتا ہوں اور پھر آج سنہ ۵۸ء پر نظر کرتا ہوں ۲۲ سال کے نوجوان کو یاد کرتا ہوں۔ اور پھر ۶۹ سال کے بڈھے کے احساسات کا تجزیہ کرتا ہوں۔ محمد علی محو خواب ابد ہیں اور علی گڈھ بوڑھا ہو چلا ہے۔ جو طے ہو چکا اور کس طرح اس راہ پر قافلے گذرے چلے جاتے ہیں۔ اب جو دیکھتا ہوں تو اس دور کے تمام نقش قدم مٹے جا رہے ہیں۔ دس بیس سال بعد ہماری نئی نسلوں کو شاید یہ معلوم بھی نہ ہو کہ محمد علی کون تھے اور کیا تھے انصاری کون تھے۔ اجمل خاں کون تھے۔ اس گذرے ہوئے قافلہ کے جو شکستہ پا مسافر باقی رہ گئے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ

بصحرائے عدم آباد بر ہر نقش پا محوی
بیاد کارواں ہائے گذشتہ نالہائے کرد
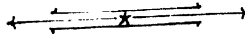
"عقل کی مرضی تھی کہ محمد علی انصاف کی کرسی پر بٹھائے جائیں مگر عشق کی خوشی کہ الزام کے کٹہرے میں کھڑے ہوں۔ عقل نے انہیں سزا دینے کا طریقہ مگر عشق نے سزا پانے کا سلیقہ سکھانا چاہا۔ عقل نے ان کے لئے ججی کا جُبّہ اور وزارت کا خلعت مگر عشق نے جیل کا کُرتا اور حج کا احرام بنانا چاہا۔ عقل کا مشورہ تھا کہ وہ بریڈلا اور انگرسال کے زمرۂ شاگردی میں مگر عشق کا حکم کہ ادریس و بلال کے حلقۂ غلامی میں آئیں۔ غرض کہ عقل کا فیصلہ تھا کہ وہ یزید مگر عشق کا فتویٰ کہ شہید ہوں۔ اس کشاکش میں پایانِ کار عشق ہی کامیاب ہوا۔"

(میر محفوظ علی)

دوست کا ماتم

(سید سجاد حیدر بی اے (علیگ) انڈپورٹ بلیر)

"اس کشتۂ تغافل ملت کو اب یاد کیا جا رہا ہے۔ اس کی زندگی میں اس پر بدگمانیاں تھیں، طعنے تھے، سرد مہری تھی، مخالفت تھی، اب ایک سیلاب عقیدت ہے کہ چاروں طرف سے اُمڈ آرہا ہے۔

غالب کا شعر؎

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

کسی پر اتنا صادق نہیں آیا جتنا بے چارے محمد علی پر
مرحوم میرا کالج فیلو ہی نہ تھا، مجھے یہ فخر ہے کہ میرا کلاس فیلو بھی تھا اور وہ باوجود اس کے کہ دنیا کی بزرگ ترین ہستیوں میں شمار ہوتا تھا، اپنے پرانے ہیچ میرز کلاس فیلو سے آخر رات تک اس پرانے ارتباط اور بے تکلفی سے ملا کیا۔ آہ اب ہمارا مایۂ ناز کلاس فیلو کہاں ہے؟"

LOU PIDOU

SAINT MATHIEU

GRASSE A.-M.

[illegible]

[illegible handwritten letter]

[illegible]

ایچ جی ویلز کے
خط کا عکس جو علی [illegible]
کے متعلق

TELEGRAMS, SOCIALIST, [illegible] LONDON
TELEPHONE, WHITEHALL [illegible]

[illegible] WHITEHALL COURT, LONDON, [illegible]

6th May 1932.

Dear Sir,

My acquaintance with Mohammed Ali was limited to a conversation at my house at which we discussed the possibility of a Reformation in Islam somewhat like the Christian reformation led by Martin Luther. We agreed, I think, that a Back to Mahomet movement was needed to rescue Islam from the ruts which it has been digging for itself for some centuries past. I found M.A's company very congenial; and as your letter encourages me to believe that mine was not altogether disagreeable to him, I flatter myself we parted friends.

His personality left such an impression on me that when the news of his death came I felt that Islam had lost a very valuable living force.

That is all I can say about him from personal knowledge.

Faithfully

مولانا شوکت علی

کراچی جیل سے نکل کر پولیس وین (Van) کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ جو انہیں عدالت ہال لیجائے گی۔ جہاں ان کے خلاف مقدمہ بغاوت کی سماعت ہو رہی تھی۔

شوکت علی

ذاتی تاثرات و مشاہدات کی روشنی میں

جس جائے سراپا پہ نظر جائے ہے اس کے،
آوے ہے یہی جی میں یہیں عمر بسر کر

ایک انوکھی، البیلی اور پیاری شخصیت کا مرقع

از

رئیس احمد جعفری

یکم دسمبر ۱۹۳۳ء!

مرکزی خلافت کمیٹی بمبئی کے سیکریٹری غازی صاحب عرصہ سے کوشش کر رہے تھے کہ میں روزنامہ خلافت سے وابستہ ہو جاؤں۔ یہ پیش کش میرے لیے بڑی مسحور کن تھی۔

بمبئی!

خوابوں کی دنیا!

کس کا جی نہ چاہے گا، بمبئی جانے کا!

لیکن شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین (جو اب جمہوریہ ہند کے نائب صدر ہیں) کی اجازت اور ایما کے بغیر میں یہ پیش کش منظور نہیں کر سکتا تھا۔ اور وہ کسی طرح اجازت دینے پر تیار نہیں تھے۔ بس یہ تیار تھے کہ وہ خود دہلی سے اخبار نکالیں اور مجھے اس کا ایڈیٹر بنا دیں۔ لیکن اس وقت جب میں تعلیم مکمل کر لوں۔

محبت اور شفقت کا یہ بندھن ایسا نہیں تھا جسے غازی صاحب کی خاطر —— گو ان کی خاطر مجھے عزیز تھی —— میں توڑ دیتا غازی صاحب کے ہر خط کے جواب میں میرا معذرت نامہ چلا جاتا۔ ایک مرتبہ وہ خود بمبئی سے دہلی آئے اور ڈاکٹر صاحب سے مجھے "مانگا"۔ لیکن بے انتہا با مروّت ہونے کے باوجود انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ میں دروازے کے پیچھے دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ ذاکر صاحب کے انکار نے غازی صاحب کو مایوس کر دیا۔ پھر انہوں نے مجھ سے بمبئی چلنے کو نہیں کہا۔

ذاکر صاحب کے مجھ پر بڑے احسانات تھے۔ ایک دفعہ وہ ندوۃ العلماء تشریف لائے۔ طلبہ کی طرف سے ان کا استقبال کیا گیا۔ میں نے خیر مقدمی تقریر کی۔ انہیں میری تقریر کچھ ایسی پسند آئی کہ اسی تقریر نے جامعہ کے دروازے میرے لیے کھول دیے۔ تمام دشواریاں ختم ہو گئیں۔ جو سہولتیں ندوے میں حاصل تھیں اس سے کہیں زیادہ ذاکر صاحب کی کرم فرمائیوں سے حاصل ہو گئیں۔

میرے لیے کس طرح ممکن تھا کہ میں ان کی مرضی کے خلاف کوئی قدم اٹھاتا۔

لیکن انسان سوچتا کچھ ہے ہوتا کچھ ہے۔ ۱۹۳۳ء کی آخری ششماہی میرے لیے مصیبتوں کا ایک طوفان ساتھ لائی۔ گھر کے حالات دگرگوں ہو گئے اور مجھے سنجیدگی سے بار بار سوچنا پڑا کہ تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے زندگی کے سمندر میں جلد از جلد کود پڑنا چاہیے۔

میری خواہش تھی کہ دہلی ہی میں مجھے کوئی کام مل جائے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ قاضی عبدالغفار —— مصنف لیلیٰ کے خطوط —— نے ذاکر صاحب کی سفارش پر حیات اجمل کے لیے مجھے عربی کے بہت سے خطوط اور بعض مقالات کا ترجمہ کرنے کو دیا تھا لیکن وہ خود ہی گردش بلا میں گرفتار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے تو ان کی مدد —— ترجمہ کر کے —— کر دی۔ مگر وہ میری مدد —— معاوضہ ادا کر کے —— نہ کر سکے۔

اسی اثنا میں بڑے دن کی تعطیل میں میرا لکھنؤ جانا ہوا۔ اتفاق کی بات اسی زمانے میں وہاں سید مرتضیٰ بہادر کی زیر صدارت آل انڈیا خلافت کمیٹی کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ میں نے دو روز کے لیے خیرآباد جانا ملتوی کیا۔ اور ندوے میں ٹھہر گیا کہ اجلاس کی بہار دیکھ کر وطن جاؤں گا۔

کانفرنس کے پنڈال میں پہنچا تو غازی صاحب سے ملا۔ انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور بڑے داعیہ سے کہا

"دیکھنا ہے اب تم کیسے بچ کر جاتے ہو!"

یہ کہہ کر وہ مجھے مولانا شوکت علی کی خدمت میں لے گئے۔ اور کہا۔

"یہ سیرت محمد علی کے مصنف جعفری صاحب ہیں۔ میری بات تو یہ بار بار ٹھکرا چکے ہیں۔ اب آپ حکم دے کر دیکھ لیجیے۔"

شوکت صاحب نے مجھ پر ایک سرسری سی نظر ڈالی اور فرمایا

"خلافت میں نے بند کر دیا ہے۔ سب نالائق دل کے تھے۔ نکمے! بمبئی آؤ اور خلافت جاری کرو۔"

پھر دفعۃً اپنی بڑی بڑی دل میں اتر جانے والی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور کہا

"ہمیں تم جیسے نوجوانوں کی ضرورت ہے ——!"

پھر سوال کیا: "کب آرہے ہو؟"

میں ذاکر صاحب کو پیر نہ بنا سکا۔ کوئی عذر نہ پیش کر سکا۔ مرعوب اور مبہوت ہو کر جواب دیا

"جب آپ فرمائیں!"

غازی صاحب سے فرمایا "انہیں کرایہ دے دو!"

مجھ سے ارشاد ہوا "ایک ہفتہ کے اندر پہنچ جاؤ۔"

کرایہ لے کر ندوے آیا۔ وہاں سے خیرآباد پہنچا، اور ضروری تیاریاں کرکے بمبئی روانہ ہو گیا۔

یکم جنوری ۳۴ء کو میں بمبئی پہنچا۔ خلافت کمیٹی کے اکاؤنٹنٹ مسٹر جعفر علی خاں لوری بندر پر میرے استقبال کے لیے موجود تھے۔ کھدر کے سفید لباس سے میں نے، اور ایک بوکھلائے ہوئے مسافر کی حیثیت سے انہوں نے مجھے پہچان لیا۔ میں ان کے ساتھ ساتھ باہر آیا۔ خلافت کی کار کھڑی تھی۔ سامان رکھوایا۔ اور ہم دونوں کوئی پندرہ منٹ میں خلافت ہاؤس پہنچ گئے۔

مجھ سے پہلے خلافت کی کرسی ادارت پر بڑے بڑے لوگ متمکن ہو چکے تھے۔ مسٹر عبدالغنی بی۔ اے (علیگ)، قمر احمد بی۔ اے ایل ایل بی (علیگ) اور آج اسی کرسی پر ۲۱ سال کا ایک نوجوان جس نے ابھی کالج کی تعلیم بھی ختم نہیں کی تھی، اور جس نے کسی اخبار میں ایک دن بھی کام نہیں کیا تھا، بیٹھا تھا —— انقلابات ہیں زمانے کے!

میرے آنے سے پہلے غازی صاحب نے کاتبوں کا انتظام کر لیا تھا لیکن اسٹاف کا انتظام نہیں کر پائے تھے۔ نہ کوئی مترجم تھا، نہ سب ایڈیٹر، نہ رپورٹر نہ پروف ریڈر۔ مصر کے اخبارات میں الاہرام، المقطم، البلاغ وغیرہ تبادلے میں آتے تھے۔ بغداد سے "الاوقات العراقیہ" اور حجاز سے "ام القریٰ" آتے تھے۔ صبح صبح ان اخبارات کو لے کر میں بیٹھا۔ اور "عالم اسلام" کے نام سے ایک "خبرنامہ" تیار کر لیا۔ ٹائمز آف انڈیا، فری پریس جرنل، اور بمبئی کرانیکل سے "مقتبسات" لے لیے۔ "شذرات" کے عنوان

سے چند چھوٹے چھوٹے نوٹ لکھے۔ درمیان میں افتتاحیہ بھی تیار کر ڈالا۔ دو بجے تک صفحے تیار ہو گئے۔ تقریباً ایک صفحے کے اشتہار تھے۔ چوتھا صفحہ بیرونِ بمبئی کے اردو اخبارات کی چیدہ چیدہ خبروں سے بھر دیا۔ یہ سارا کام میں نے بارہ بجے تک ختم کر ڈالا۔ اتنے میں اطلاع ملی کھانا تیار ہے۔ ڈائننگ ہال پہنچا۔ وہاں سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ بہت تھک گیا تھا۔ اتنے میں اطلاع ملی کہ کاتب صاحبان قلم دوات لے کر آ گئے ہیں۔ جیسے تیسے دفتر پہنچا۔ ہیڈ کاتب خواجہ قیام الدین صاحب کو سارے مضمون دے دیے۔ انہوں نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا میٹر تو کافی ہے لیکن چار صفحے اس سے پورے نہیں ہوں گے۔ آدھے صفحہ سے کچھ کم مضمون اور دے دیں۔ سامنے مراسلات کا ڈھیر رکھا تھا۔ مراسلات کے پڑھنے اور چھانٹنے میں کافی وقت صرف ہو گیا بہرحال چار صفحے پورے کر دیے۔ جو مضمون ختم ہوتا تھا تصحیح کے لیے میرے پاس آ جاتا تھا۔ ساتھ ساتھ میں تصحیح بھی کرتا جاتا تھا۔ پانچ بجے کے قریب مولانا عرفان فنانس سیکریٹری خلافت کمیٹی میرے کمرے میں آئے اور فرمایا۔

"چلو تمہیں سیر کرا لائیں!"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ فوراً اٹھا اور ان کے ساتھ ہو لیا۔

مولانا عرفان صوبۂ سرحد کے رہنے والے تھے۔ بہت بڑے عالم تھے۔ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا۔ عربی زبان عربوں کی طرح بولتے تھے۔ تحریکِ خلافت میں پورے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ جیل کی تکلیفیں سہیں، مصیبتیں جھیلیں، کلفتیں برداشت کیں لیکن ماتھے پر بل نہ آیا۔ چیف کمشنر نے صوبۂ سرحد میں داخلہ بند کر دیا۔ کچھ پروا نہ کی۔ علی برادران کے شیدائی تھے۔ ان کی دوستی میں مفتی کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید جیسے رفقا سے قدم سے قدم توڑ لیا۔ بے انتہا بے تکلف اور بے جھجک قسم کے آدمی تھے۔ چند منٹ میں تفاوتِ عمر و علم کے باوجود اس طرح گھل مل گئے جیسے پرانے اور بے تکلف دوست ہیں لیکن میں نے حدِ ادب سے باہر قدم نہیں نکالا۔

مولانا نے ورلی کا ساحل دکھایا۔ اپالو بندر کی سیر کرائی۔ چوپاٹی کا چکر لگوایا۔ بڑی اچھی ڈرائیونگ کرتے تھے۔ ان سب مرحلوں سے فراغت پانے کے بعد اب ہماری کار فراٹے بھرتی ساحل جوہو کی طرف بھاگ رہی تھی ——— یہ ایک دنیا تھی رنگ و بو کی۔ حسن و جمال کی۔ عشوہ و ادا کی۔ جذب و تحرک کی۔ یہودی۔ عیسائی۔ ہندو، مسلمان، ارمنی، جرمنی، جاپانی، امریکی، انگریزی، چینی، برمی، ہر ملک اور ہر قوم کے معیارِ حسن کی نمائندگی یہاں موجود۔

اس دنیا نے مجھے اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ کتنی عجیب، کتنی سحر طراز، اور کتنی کشش انگیز تھی یہ دنیا

کنارِ آب انبوہِ حسیناں
ہر اک جانب ہجومِ مہ جبیناں
سنہری تھالیاں چومک سے روشن
بتاشے، درب، تلسی، دھوپ، چندن
مٹھائی، ناریل، پھول اور چاول
گوری، کالے تل، سیندور، ٹوکی

جو نہاتی ہیں نہانے میں لب آب
جہاں دیکھو وہاں پوجا کا اسباب
ڈوب پر ڈوبتے دیکھتے ستارے
لب ساحل چمکتے چاند تارے
کوئی گوری ہے کوئی سانولی ہے
کہیں جمنا، کہیں گنگا جلی ہے
نہانے دھونے میں بھی چلبلا پن
ٹپکتا تھا سبھی ان آب جو پن
بھرے مانگوں میں سیندور اور صندل
گلابی مدھ بھری آنکھوں میں کاجل
گندھی زلفیں بندھے جوڑے، کھلے بال
کہیں مٹی، کہیں پھیلا ہوا جال
نشیلی انکھڑیاں، نیچی نگاہیں
پھنسانے کی، بہکانے کی راہیں
ادا سے بوٹی بوٹی کا پھڑکنا
بگڑنا خود بخود رکنا، جھجکنا
ہنسی میں آپ ہی وہ لوٹ جانا
پھر آپ ہی شرم سے گردن جھکانا

یہ دنیا تھی یا قیامت؟

۸ بجے رات کو خلافت ہاؤس میں واپس آیا۔ کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں ۹ بجے کے قریب خاموشی سے آ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اردو اخبارات میں خلافت وہ پہلا روزنامہ تھا جو ایسوسی ایٹڈ پریس اور رائٹر سے خبریں خرید تا تھا۔ ٹیلی پرنٹر کا استعمال ابھی شروع نہیں ہوا تھا۔ ہر ایک گھنٹے کے بعد چپڑاسی سائیکل پر جاتا تھا اور خبروں کا ایک پلندہ لے کر واپس آتا تھا۔ یہ سلسلہ سات بجے شام سے شروع ہوتا تھا اور رات کے دو بجے تک جاری رہتا تھا۔

خبروں کے کئی پلندے میرے سامنے رکھے تھے۔

جوہو کی ساری سحر طرازیاں فراموش ہو چکی تھیں۔ خبروں کے اس ڈھیر میں کون سی خبر قابل اشاعت ہے، کون سی قابل رد کسے مختصر کرنا چاہیے اور کسے تمام و کمال دینا چاہیے؟ یہ گتھی کسی طرح سلجھ ہی نہیں رہی تھی کہ اسنے میں ایک اور پلندہ آ گیا۔ میرے پاؤں تلے سے زمین نکلی جا رہی تھی، میرا سر گھوم رہا تھا، میری آنکھیں پرنم تھیں۔

یہ آج معلوم ہوا کہ خبروں کا پڑھ لینا اور سمجھ لینا آسان ہے ترجمہ کرنا مشکل۔ اور تیزی سے ترجمہ کرنا تو بہت زیادہ مشکل ہے۔ وہ بھی اس شخص کے لیے جو کالج کی کتابیں بند کرنے کے بعد پہلی بار ترجمہ کر رہا ہو۔

آج میرا امتحان تھا۔

آنے والے چند گھنٹے میرے مستقبل کے لیے فیصلہ کن تھے۔

خلافت ہاؤس میں آئے ہوئے ابھی مجھے ۲۴ گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ مختلف قسم کی افواہوں اور خبروں نے جو خلافت کے رضاکار اور کارکن شہر سے لا لاکر پہنچا رہے تھے، مجھے حواس باختہ کر دیا تھا۔

خلافت کا برخاست شدہ عملہ مجھے ذلیل کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ جامعہ کا یہ نو خیز طالب علم جسے صحافت کا کوئی تجربہ نہیں ہے اور جس کا کوئی ساتھی نہیں ہے ہرگز آٹھ صفحے کا اخبار تن تنہا نہیں مرتب کر سکے گا۔ اور اتنے دنوں تک بند رہنے کے بعد اگر اخبار آٹھ صفحے پر نہ نکلا یا چھپ کا نکلا، یا کوئی اہم خبر رہ گئی تو اخبار پٹ جائے گا۔

صرف چھ گھنٹے باقی تھے۔ اس مدت میں مجھے آٹھ صفحوں کے بقدر خبروں کا ترجمہ کر ڈالنا چاہیے تھا۔

قلم ہاتھ میں تھا خبریں سامنے تھیں، دماغ کہیں اور تھا۔

دن بھر مولانا شوکت علی سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ وہ کسی کام سے احمد آباد گئے تھے۔ رات کو واپس آئے اور سیدھے میرے کمرے میں پہنچے۔ خیریت دریافت کی اور پھر میرے سامنے خبروں کا انبار دیکھ کر فرمایا۔

"ڈٹے رہو!"

اور چلے گئے۔

"ڈٹے رہو" یہ دو لفظ تھے۔ لیکن ان میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ میرا سارا اضطراب رفع ہو گیا۔ شوکت صاحب کے جاتے ہی میں "ڈٹ" گیا اور سر جھکا کر خبروں کا بے تکان ترجمہ شروع کر دیا۔ جیسے کسی نے میرے قلم میں بجلی بھر دی تھی۔ ایک ایک سلپ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے کاتبوں کے کمرے میں پہنچ رہی تھی۔ اور تبرک کی طرح تقسیم ہو رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا میں نے کتنی خبریں ترجمہ کیں؟ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ترجمہ کیسا کیا ہے؟ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کتنی دیر سے ترجمہ کر رہا ہوں۔ یکایک میں نے محسوس کیا کوئی شخص میز کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا ہے۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو خواجہ قیام الدین ہیڈ کاتب تھے۔ انھوں نے میرا قلم پکڑ لیا اور کہا

"بس" آخری کاپی دو دو صفحے کی کاپی چھپتی تھی ابھی پوری ہو گئی۔"

خواجہ صاحب کی آنکھوں میں محبت اور خلوص کی چمک تھی۔ میں نے قلم روک لیا۔ گھڑی پر نظر ڈالی تو چار بج رہے تھے۔ یعنی صبح ہونے والی تھی۔ میں گھبرا گیا۔ میں نے کہا۔

لیکن کاپی تو لیٹ ہو گئی۔ اسے ۳ بجے جانا چاہیے تھا۔

خواجہ صاحب نے مجھے دلاسا دیتے ہوئے کہا

خلافت پریس کا شین بڑا ہوشیار آدمی ہے اطمینان رکھیے وہ پرچہ لیٹ نہیں ہونے دے گا! —— خدا کی قسم آپ

نے کمائی کر دیا۔ منہ دیکھ کر رہ جائیں گے سارے مخالف کل۔"

ان حوصلہ افزا الفاظ سے میری کچھ زیادہ تسلی نہیں ہوئی۔ لیکن تھک کر چور ہو چکا تھا۔ اپنے کمرے میں آیا، بستر پر لیٹا۔ اور لیٹتے ہی سو گیا۔ اس کمرے کے دو مکین تھے۔ ایک مولانا عرفان دوسرا میں۔ مولانا عرفان بڑھاپے میں جوانی کی نیند سو رہے تھے۔

میرے بالاخانے کے بالکل سامنے ایک دوسرا بالاخانہ تھا جو مولانا شوکت علی کا مسکن تھا۔ دونوں بالاخانوں کی کھڑکیاں آمنے سامنے تھیں۔ اور فاصلہ اتنا کم تھا کہ نیچے اترے بغیر ایک بالاخانے کا آدمی دوسرے بالاخانے کے آدمی سے بات کر سکتا تھا۔ اور ایک دوسرے کو بخوبی دیکھ سکتا تھا۔

صبح آٹھ بجے کے قریب مولانا شوکت علی کی آواز آئی۔

"عرفان، عرفان!"

میں کچھ کچھ جاگ گیا۔ مولانا عرفان نے وہیں سے جواب دیا

"فرمائیے ——

مولانا شوکت علی نے پوچھا

"جعفری کہاں ہیں؟"

مولانا عرفان نے فرمایا

"خواب شیریں کے مزے لوٹ رہے ہیں"

مولانا شوکت علی کی آواز گونجی

"جب اٹھیں تو میری طرف سے مبارکباد دینا ماشاءاللہ ماشاءاللہ پرچہ بہت کامیاب نکالا ہے۔ جی خوش ہو گیا۔"

جاگ تو میں گیا ہی تھا لیکن سوتا بنا پڑا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد اٹھا تو مولانا عرفان نے اپنی طرف سے چند حوصلہ افزا الفاظ بڑھا کر مولانا شوکت علی کا پیام مجھ تک پہنچا دیا۔

ناشتے وغیرہ سے فارغ ہو کر پھر اپنے کمرے میں جا رہا تھا کہ میں نے دیکھا خلافت ہاؤس کے صحن میں سلیپنگ سوٹ پہنے مولانا شوکت علی ایک بنچ پر بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی آواز دی۔

"جعفری جعفری ——

میں ان کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ شفقت اور محبت کی نظروں سے مجھے دیکھا اور وہی الفاظ دہرائے جو مولانا عرفان سے کہے تھے پھر تسلی دیتے ہوئے کہا

"اتنی زیادہ محنت تمہیں صرف چند روز کرنا پڑے گی۔ تمہاری مدد کے لیے میں آدمیوں کا انتظام کر رہا ہوں۔"

پھر فرمایا "پنسل کاغذ لے آؤ میں کچھ لکھواؤں گا۔"

میں پنسل کاغذ لے کر پہنچا اور مولانا نے ایک مضمون لکھوانا شروع کر دیا۔ اب میری ایک ڈیوٹی یہ بھی تھی کہ مولانا کے مضامین املا کیا کروں۔

غرض اس ایک دن کے کام نے میری جھجک دُور کر دی۔ مولانا کی حوصلہ افزائی نے میرے اندر ایک نیا ولولہ، ایک نیا جذبہ ایک نئی امنگ اور ایک نیا جوش پیدا کر دیا۔ میری سراسیمگی اور دہشت دُور ہو چکی تھی۔ مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہو چکی تھی۔

چند روز تک مجھے تن تنہا سارا اخبار مرتب کرنا پڑا۔ لیکن رفتہ رفتہ میرا بوجھ ہلکا ہوتا گیا۔ میں نے ندوے کے ایک دوست اور ساتھی عبدالسلام صاحب قدوائی کو (جو اب جامعہ میں شیخ التفسیر ہیں) شوکت صاحب سے اجازت لے کر بمبئی بلا لیا تھا۔ وہ سب ایڈیٹر ہو گئے۔ ایک اور ندوی دوست ابراہیم عمادی کو بھی ادارے میں شریک کر لیا۔ یہ عربی اخبارات کے تراجم کرنے لگے۔ ندوے کے سفیر کی حیثیت سے حبیب احمد ندوی میرے ساتھ لکھنؤ سے آئے تھے اور میرے ہی ساتھ مقیم تھے۔ میں نے انہیں بھی شوکت صاحب کے پی اے کی حیثیت سے نوکر کرا دیا۔ عبدالعلیم نامی علی گڑھ کے گریجویٹ تھے۔ تلاش روزگار میں بمبئی آئے تھے۔ انہیں میں نے رات کی خبروں پر لگا دیا۔ لیکن یہ چار صفحے کی خبروں کا ترجمہ ایک آدمی کے بس کا روگ نہ تھا۔ لہذا بہار کے ایک صاحب حکیم محمد نعیم ایوبی کو بھی جو انگریزی سے برجستہ ترجمہ کرنے کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے رکھ لیا۔ مشہور افسانہ نگار رفیعی اجمیری جنہوں نے بعد میں اپنا نام اعظمی اجمیری رکھ لیا تھا مزاحیہ کالم لکھنے لگے۔ رپورٹنگ کا کام خلافت کے ایک رضا کار غلام جیلانی کے سپرد کر دیا۔ میرا کام اب صرف یہ تھا کہ اگر کسی دن کوئی مترجم غیر حاضر ہو تو رات کی خبروں کے ترجمے میں شریک ہو جاؤں۔ ورنہ مقالہ افتتاحیہ اور شذرات لکھ کر باقی وقت مطالعۂ کتب، سیر و تفریح اور اخبار کی عام نگرانی میں صرف کروں۔

اب میں بہت مطمئن تھا اور بڑے اطمینان اور یکسوئی کے ساتھ اپنے فرائض انجام دے رہا تھا۔

لیکن بہت جلد، بلکہ کہنا چاہیے رفتہ رفتہ مگر تھوڑی ہی مدت میں، خلافت ہاؤس کے بہت سے اسرار سربستہ مجھ پر منکشف ہونا شروع ہو گئے۔

مجھے سارے خلافت ہاؤس میں ایک دو کے سوا کوئی ایسا آدمی نظر نہیں آیا جو دل سے خلافت اور شوکت صاحب کا وفادار ہو۔ سب اپنی غرض کے بندے تھے۔ اور جب غرض پوری نہیں ہوتی تھی تو مخالفوں سے ساز باز کرنے میں بھی تامل نہیں کرتے تھے۔

خلافت کی مالی حالت سقیم تھی۔ پریس نقصان سے چل رہا تھا۔ اخبار میں بھی گھاٹا تھا۔ خلافت اب عوامی تحریک نہیں رہ گئی تھی۔ لہذا عام چندوں کا سلسلہ بھی بند تھا۔ شوکت صاحب اس درگاہ کے مجاور بنے بیٹھے تھے۔ کشکول گدائی لے کر نکلتے تھے۔ جو کچھ ملتا تھا اسی پر صرف کر دیتے تھے۔ لیکن حالت یہ تھی کہ کئی کئی مہینے تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ کاغذ والے کی خاصی رقم چڑھ گئی تھی۔ وہ بھی آنا کانی کرنے لگا تھا جس سے بعض دفعہ اخبار کی اشاعت رُک جاتی تھی۔ روشنائی والے کی خاصی رقم چڑھ گئی تھی۔ ان کے تقاضے پر تقاضے ہو رہے تھے۔ بے پروائی، فرض ناشناسی، اور بددلی کا ہر شخص شکار تھا۔ میرے جوش اور ولولے کو دیکھ کر یہ لوگ مذاق اڑایا کرتے تھے۔ ایک روز تو ایک صاحب نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرما ہی دیا

ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے

دیکھیں گے کب تک ثابت قدم رہتے ہو!

ظاہر ہے میں حالات سے مجبور ہو کر یہاں آیا تھا۔ کئی کئی مہینے تک تنخواہ نہ ملنے سے اضطراب اور تشویش کا میں بھی شکار

تھا۔ لیکن شوکت صاحب کو دیکھ کر اپنی ہر بپتا بھول جاتا تھا۔ دوسرے لیڈروں اور مالکان اخبار کی طرح شوکت صاحب کا یہ رویہ نہیں تھا کہ خود تر مال اڑائیں اور اسٹاف فاقہ کرے۔ اگر ہم فاقہ کرتے تھے تو وہ بھی فاقہ کرتے تھے۔ ہم پھٹے کپڑے پہنتے تھے تو ان کے لباس میں بھی پیوند لگتے تھے۔ ہماری جیب اگر خالی تھی تو شوکت صاحب کی جیب میں بھی کچھ نہ تھا۔ لیکن ہم میں اور ان میں فرق یہ تھا کہ ہم مایوس تھے، دل برداشتہ تھے، وہ مگن تھے، خوش تھے۔ ایک روز کا واقعہ تو میں کسی طرح نہیں بھول سکتا۔ صبح کو ناشتہ کے لیے نہ انڈا تھا نہ مکھن۔ نہ ٹوسٹ نہ چائے۔ میں صبح ۸ بجے ڈکٹیشن لینے ان کے پاس پہنچ جایا کرتا تھا۔ وہ بار بار ناشتے کا تقاضہ کر رہے تھے مگر ناشتہ نہ اب آتا ہے نہ جب۔ آخر سمجھ گئے ماجرا کیا ہے۔ اپنے ذاتی خدمت گار لڈن سے فرمایا

"رات کا بچا ہوا کچھ ہے؟"

اس نے ایک باسی روٹی، اور تھوڑی سی کھڑی مسور کی باسی دال لاکر سامنے رکھ دی۔ شوکت صاحب نے پہلا لقمہ توڑتے ہی باسی روٹی اور باسی دال کی لذت پر قصیدہ پڑھنا شروع کر دیا۔ تعریف کرتے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے جیسے واقعی من و سلویٰ ہو۔

میں یہ منظر دیکھ رہا تھا اور میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔

یہ باسی روٹی اور باسی دال وہ شخص کھا رہا تھا کبھی جس کے کتوں کے لیے ہر روز نہ جانے کتنا گوشت آیا کرتا تھا جو انگریزوں کی طرح رہتا تھا اور ان سے زیادہ ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتا تھا۔ جو ہزاروں روپے ماہوار کماتا تھا اور کھانے کھلانے پر صرف کر دیتا تھا۔ جس کی خوش خوراکی اور خوش ذوقی کا دور دور چرچا تھا۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں کا بہت بڑا لیڈر رہ چکا تھا۔ جو مسلمانان ہند کا سرتاج تھا۔ جس کی "جیب" میں رہنا گاندھی جی اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ کیا قوم بے لوث اور سچی خدمت کا صلہ اسی طرح دیتی ہے؟ شوکت نے بعض دوسرے لیڈروں کی طرح قوم کے روپے سے اپنا گھر بھر لیا ہوتا۔ تو آج ان کا ایک بیٹا (عابد صاحب) کلکتہ میں اور دوسرا بیٹا (زاہد صاحب) دلی میں خود کفیل بننے کی جدوجہد میں مصروف نہ ہوتا۔ زاہد صاحب سے شوکت صاحب کو عشق تھا۔ زمیندار نے ان کا نام "پرنس آف سیوری" رکھا تھا۔ لیکن باپ کی چاہت بھی بیٹے کی مالی حالت درست نہ کر سکی۔

پنسل میرے ہاتھ میں تھی۔ سادہ کاغذ سامنے تھا۔ دماغ کہیں اور تھا ——— میں اپنی پریشانیاں بھول گیا۔ خلافت ہاؤس کے کچن میں ہفتوں سے صرف دال روٹی پک رہی تھی۔ گوشت کا ذائقہ فراموش ہوتا جا رہا تھا۔ بتیاں تک خلافت ہاؤس چھوڑ گئی تھیں۔ اور اس کا ردِ عمل حد درجہ تلخ اور ناگوار صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ لیکن شوکت صاحب کا یہ ناشتہ اور اس ناشتے کے ساتھ ان کا والہانہ شغف دیکھ کر ساری تلخی اور ناگواری فراموش ہو گئی۔ اور دل نے جیسے عزم سا کر لیا کہ خلافت میں رہنا ہے اور تنگی ترشی کی زندگی بسر کر کے کام کرنا ہے۔ اتنی دیر میں شوکت صاحب ناشتہ سے فارغ ہو چکے تھے اور انہوں نے مضمون لکھانا شروع کر دیا تھا۔

شوکت صاحب سے اب میں روز بروز قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ ان کی زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح میرے سامنے تھی۔ جس کا ہر صفحہ بخط جلی مرقوم تھا۔ وہ حد درجہ دوست پرور تھے بے انتہا دریا دل اور کھلے تھے۔ انہا سے جزن انداز

اور بیانات دہی میری نظر سے کوئی نہیں گزرا۔ شوکت علی یہ بیان تو ہمالہ سے ٹکرا جائیں۔ بڑھنے پر آئیں تو سمندر کی سطح پر فلک بوس موجوں سے کود جائیں۔ ہندو کا روپیہ، انگریز کا دبدبہ، نہ انہیں خرید سکا نہ مرعوب کر سکا۔ وہ مسلمان تھے۔ خدا کے پرستار اور رسول کے عاشق۔ مسلم مفاد کے لیے بڑی سے بڑی طاقت و قوت سے ٹکرا جاتے۔ ذاتی منفعت، ذاتی مفاد، یہ ان کے لیے بے معنی الفاظ تھے۔ مصلحت کے ذرا بھی قائل نہ تھے۔ جو بات سچ سمجھتے ببانگ دہل اس کا اعلان کرنا فرض سمجھتے تھے۔ جو فیصلہ کر لیا دنیا کی کوئی طاقت پھر انہیں اس سے منحرف نہیں کر سکتی تھی۔ یاروں کے یار، مخالفوں کے سر پر تلوار، دشمن کے لیے تلوار، بزم احباب میں باغ و بہار۔ جن لوگوں سے خلوص اور محبت کا تعلق رہ چکا تھا، مخالفت کے باوجود ان کے ہمدرد، دوست اور مددگار۔ ڈاکٹر محمود خلافت سے کٹ کر کانگریس کے ہو گئے تھے۔ تصدق احمد خاں شیروانی کا بھی یہی حال تھا۔ ظہیر الدین کا قصہ تو ہم ہی ایک دردناک واقعہ تھا۔ مجھ سے ان بن تھی لیکن شوکت کا دل ان سب کی محبت سے معمور تھا۔ بڑے سے بڑا اختلاف بھی ان پرانے دوستوں کی محبت ان کے دل سے نہ کھرچ سکا۔

بمبئی کی کہانی ایک مستقل داستان ہے جسے نسبتاً تفصیل سے میں اپنی "خود گزشت" میں لکھ رہا ہوں۔ اس مضمون میں زیادہ تر شوکت صاحب اور کسی حد تک ـــ پس منظر کے طور پر ـــ خلافت ہاؤس کا ذکر کرنا ہے۔ لہٰذا میں اسی موضوع تک اپنی گفتگو کو محدود رکھوں گا۔

خلافت کی ادارت جس زمانے میں مجھے سنبھالنے کی سعادت حاصل ہوئی یہ بڑا نازک زمانہ تھا۔ مولانا شوکت علی پر ہر طرف سے یورش ہو رہی تھی۔ وہ اپنی دھن میں مست اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔ لیکن انہیں ہر طرف سے ہدف طعن و تعریض بنایا جا رہا تھا۔ جواہر لال، گاندھی جی وغیرہ اگر شوکت صاحب کے خلاف بیانات دے رہے تھے، یا کانگریسی ہندوؤں نے اگر ان کے خلاف مورچہ قائم کر رکھا تھا تو مقام حیرت نہ تھا۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جن لوگوں کو شوکت صاحب نے بنایا تھا، ابھارا تھا، جن کی تعمیر درحقیقت تمام تر شوکت صاحب کی رہین منت تھی، وہی سب سے زیادہ شوکت صاحب اور مجلس خلافت کے خلاف سرگرم عمل تھے۔ شوکت صاحب کا ڈیل ڈول جتنا بڑا تھا، اس سے بڑا ان کا دل تھا۔ یہ تمام واردات مسکرا مسکرا کر سہہ رہے تھے۔ تصدق احمد خان شیروانی جب آتے تھے شوکت صاحب سے ضرور ملتے تھے۔ اور شوکت صاحب ان کی دعوت ضرور کرتے تھے۔ یہی صورت نیتی؟ نریمان کے ساتھ تھی۔ ڈاکٹر محمود نے کانگریس کو اپنا دین و ایمان بنا لیا تھا بیشتر بیت تھے۔ خاص ابوالکلامی انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ لیکن خلافت ہاؤس میں وہ بھی قدم رنجہ فرماتے تھے۔ اور شوکت صاحب خندہ پیشانی سے ان کا خیر مقدم کرتے تھے۔ ان لوگوں سے کبھی انہوں نے اپنی طرف سے تلخی یا سختی کی گفتگو نہیں چھیڑی۔ خود انہوں نے چھیڑ دی تو بات تک کوئی کمی بھی نہیں اٹھا رکھی۔

مولانا شوکت علی کی قومی اور ملی خدمات تو جو ہیں وہ سب جانتے ہیں لیکن اس بات کی طرف کسی نے توجہ نہیں کی کہ اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں مولانا شوکت علی صاحب کا عملی حصہ بابائے اردو عبدالحق سے کچھ زیادہ ہی تھا۔ بابائے اردو زندگی بھر ہندوؤں سے اور غیروں سے اردو کے لیے لڑتے رہے مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ لیکن شوکت علی نے بمبئی کو مجلس خلافت کا مرکز بنا کر وہاں مسلسل عظیم الشان پبلک جلسے کر کے ـــ جن میں تقریریں اردو ہی میں ہوا کرتی تھیں ـــ

خلافت اخبار نکال کے، اردو کو بمبئی کی دوسری بڑی زبان بنا دیا۔ اگر بمبئی میں مجلس خلافت کا صدر دفتر نہ ہوتا، اور خلافت اخبار وہاں سے نہ نکلتا تو اردو کا وہاں کوئی خاص مقام نہیں تھا۔ یہ مولانا شوکت علی کا طفیل ہے کہ آج دلی کے ویران ہونے، حیدرآباد کے مٹ جانے اور لکھنؤ سے جلا وطن ہونے کے باوجود بمبئی میں اردو نہ صرف موجود ہے بلکہ بہت زیادہ شان و تجمل کے ساتھ موجود ہے۔

میرے زمانے میں بمبئی سے خلافت کے علاوہ اردو کے کئی اخبار نکل رہے تھے۔ اور یہ سب خلافت اور شوکت صاحب کے مخالف تھے۔

روزنامہ اجمل کے ایڈیٹر معین الدین حارث تھے۔ یہ جامعہ کے گریجویٹ تھے۔ ان کی اردو صحافت کا آغاز خلافت سے ہوا تھا۔ یہ خلافت سے الگ ہو گئے اور کانگرس کی حمایت میں اجمل جاری کر دیا۔ یہ مخالف تھے مگر شریف۔ ان کی مخالفت اصولی ہوتی تھی۔

دوسرا روزنامہ ہلال تھا۔ اس کے ایڈیٹر حافظ علی بہادر خاں تھے۔ یہ ایک عرصے تک خلافت کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ قابل اور منجھے ہوئے صحافی اور کارکن تھے لیکن کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ انہیں خلافت کی ادارت سے الگ ہونا پڑا۔ بمبئی جو آجائے پھر اس کا واپس جانے کو جی نہیں چاہتا۔ یہیں رہ پڑے اور اپنا اخبار روزنامہ "ہلال" نکالا۔ جو کانگریس کا زبردست نقیب اور خلافت کا زبردست مخالف اور شوکت صاحب کا بدترین دشمن تھا۔ اس اخبار کی مخالفت اصول اور آداب صحافت کو بالائے طاق رکھ کر بالکل ذاتی ہوتی تھی۔ اور انداز بیان سوقیانہ اور عامیانہ۔ غلام احمد خاں آرزو اس اخبار کے سب ایڈیٹر تھے۔ جو کمی حافظ صاحب سے رہ جاتی تھی یہ پوری کر دیتے تھے۔

ایک اور اخبار "الہلال" تھا۔ اس کے ایڈیٹر احسن صاحب تھے۔ یہ مرادآباد کے رہنے والے تھے۔ ان کے چچا سے اور شوکت صاحب سے علی گڑھ سے مراسم چلے آرہے تھے۔ یہی وجہ انہیں خلافت میں لانے کی ہوئی تھی۔ لیکن نہ انہیں خلافت سے دلچسپی تھی نہ شوکت صاحب سے عقیدت۔ خلافت ہاؤس میں بیٹھ کر، خلافت کی برائیاں کرتے اور شوکت صاحب کی لیڈری کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ یہی وجوہ تھے کہ شوکت صاحب انہیں مع ان کے عملہ کے خلافت سے علیحدہ کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ میں انہی کا جانشین بن کر آیا تھا۔ خلافت میں یہ کانگریس کی مخالفت کرتے تھے۔ الہلال کے ایڈیٹر بنتے ہی کانگرس کے قصیدے پڑھنے لگے۔ اب کراچی میں ہیں۔ ان کی بھانجی کا عقد ثانی بہاولپور کے حسن محمود ری پبلکن لیڈر سے ہوا ہے۔ وہیں متعین۔

بمبئی کرانیکل خالص کانگرسی اخبار تھا۔ اس کے ایڈیٹر سید عبداللہ بریلوی نہایت شریف اور بااصول آدمی تھے۔ وہ بے لوث اور دیانتداری کے ساتھ کانگرس کے ہم نوا، اور خلافت کے مخالف تھے۔ ذاتیات سے انہیں کوئی دلچسپی ہی نہ تھی صرف اصولی بحث پر اکتفا کرتے تھے لیکن اسی کرانیکل میں ایک سابق خلافتی باسط صاحب تھے یہ پرانے خلافتی تھے۔ ڈاکٹر انصاری مرحوم کے عزیز قریب تھے۔ اور اس تعلق سے ان کے اور شوکت صاحب کے تعلقات خورد اور بزرگ کے تھے۔ کرانیکل کا مزاحیہ کالم یہی لکھتے تھے۔ اور شوکت صاحب اور خلافت کا جب ذکر کرتے تھے تو پھکڑ پن اور گھٹیا طرز تحریر کا ریکارڈ قائم کر دیتے تھے۔

بمبئی سے باہر کے اخبارات میں زمیندار لاہور مولانا شوکت علی پر اکثر برسا کرتا تھا۔ مولانا ظفر علی خاں کی طبیعت کچھ ہوتی

نظموں کا سلسلہ بھی برابر جاری تھا۔ لاہور ہی کا ایک دوسرا اخبار انقلاب تھا۔ اس کے ایڈیٹر سالک مرحوم اور مہر صاحب تھے۔ مہر صاحب اپنے مقالات ادارت میں شوکت صاحب پر بے رحمی اور بے انصافی کے ساتھ بھرپور حملے کرتے تھے اذکار و حوادث میں سالک صاحب کی بھی گل افشانیاں جاری رہتی تھیں۔ روزنامہ سیاست بھی لاہور سے نکلتا تھا۔ اس کے مدیر سید حبیب مرحوم تھے۔ انھوں نے تو مستقل طور پر شوکت صاحب کو ہدف مطاعن بنا رکھا تھا۔ لکھنؤ سے روزنامہ ہمدم نکلتا تھا۔ اس کے ایڈیٹر عبداللہ خاں کسمنڈوی تھے۔ بڑے شیوہ طراز بزرگ تھے۔ لیکن مجلس خلافت اور شوکت صاحب سے خار کھائے ہوئے تھے۔ کلکتہ سے مولانا عبدالرزاق ندوی ملیح آبادی روزنامہ ہند نکال رہے تھے۔ جس کے مربی اور سرپرست مولانا ابوالکلام آزاد تھے۔ ملیح آبادی صاحب مستقل اور مسلسل نکتہ چینی مجلس خلافت اور مولانا شوکت علی پر انتہائی تلخ اور عامیانہ لب ولہجہ میں کرتے تھے۔ دہلی سے روزنامہ الجمعیۃ نکلتا تھا جس کے ایڈیٹر ہلال احمد زبیری تھے ——— جواب پاکستان آچکے ہیں اور ممتاز حسن قزلباش کی عنایت سے خیرپور میں بڑے اطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں ——— الجمعیۃ نہ صرف کانگرس کا زبردست نقیب اور مبلغ تھا، بلکہ مجلس خلافت اور شوکت صاحب کا پرجوش مخالف اور نکتہ چین بھی تھا۔ خواجہ حسن نظامی کا منادی بھی اپنی طرف سے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا تھا۔ حیدرآباد سے قاضی عبدالغفار نے کچھ ہی عرصہ پہلے روزنامہ پیام جاری کیا تھا۔

قاضی عبدالغفار ہمدرد کے عملۂ ادارت میں برسہابرس رہ چکے تھے۔ "شوکت بھیا" کے تو خاص طور پر دالا و شیدا تھے۔ لیکن جب طبیہ کالج کی سیکریٹری شپ سے حکیم اجمل خاں نے انہیں الگ کیا اور طبیہ کالج کے سرمایہ سے جو "حیات اجمل" انھوں نے لکھی تھی اسے لے کر وہ دہلی سے رخصت ہوئے۔ تو ان کا ارادہ بمبئی میں اقامت گزین ہونے کا ہوا، اور وہاں "شوکت بھیا" کے علاوہ کوئی سہارا نہ تھا۔ لیکن حالات اتنے دگرگوں تھے کہ شوکت صاحب۔ قاضی صاحب کو خلافت میں رکھ کر ان کے مصارف کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ داغ ایسا لگا کہ پھر قاضی صاحب نے شوکت بھیا کو ان کے جیتے جی معاف نہیں کیا۔ اپنے مزاحیہ کالم "سرراہے" میں حد درجہ عامیانہ اور سوقیانہ لب ولہجہ میں وہ شوکت صاحب کی "دھجیاں" اڑایا کرتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی کہ "نقش فرنگ" اور "لیلی کے خطوط" کا شائستہ اور شستہ مصنف اپنے درجے سے جوش انتقام میں اتنا بھی گر سکتا ہے۔

ہندو اخبارات تیج، ملاپ، پرتاب وغیرہ کو تو مخالف ہونا ہی چاہیے تھا۔

شوکت صاحب کا لمبا چوڑا سینہ ان تیروں سے چھد رہا تھا۔ مگر وہ مسکرا مسکرا کر یہ تیر جھیل رہے تھے۔ ان کے دل میں کسی کے خلاف نفرت نہیں تھی، وہ اپنی دھن میں مست تھے۔ اپنے کام میں لگے ہوئے تھے۔

جب خلیفۃ المسلمین نہ رہے تو خلافت سے عوام کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ پھر جب کہ خلافت کے خلاف ہر طرف سے یورش اور یلغار ہو رہی ہو، عام چندہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ خواص سے کوئی مدد نہ پہلے کبھی ملی تھی۔ (الاماشاء اللہ)۔ نہ اب کوئی سوال تھا۔ مالی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی تھی۔ ملازمین اور اسٹاف کی تنخواہیں چڑھتی جا رہی تھیں۔ کاغذ والے، اور روشنائی والے کے قرض میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میونسپلٹی کے ٹیکس کی رقم کے بار بار تقاضے آ رہے تھے۔ بجلی کمپنی اور ٹیلیفون کی بھی کافی رقمیں چڑھی ہوئی تھیں۔ لوگوں کو امید تھی خلافت پریس قرق ہو جائے گا۔ خلافت ہاؤس نیلام ہو جائے گا۔ اسٹاف کے

لوگ بے ٹکٹ اپنے اپنے گھر واپس جائیں گے۔ یقیناً یہ سب کچھ ہوتا، اگر شوکت صاحب نہ ہوتے۔ شوکت صاحب میں یہ عجیب صفت تھی کہ وہ مایوس ہونا نہیں جانتے تھے۔ شکست قبول کرنا اور ہار ماننا بھی ان کا شیوہ نہ تھا۔ چندہ وصول کرنے کے فن میں وہ یکتا تھے۔ سارے ہندوستان میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ وہ جس کی جیب میں ہاتھ ڈال دیتے جو کچھ ہوتا نکال لاتے۔ وہ چار آنے کا چندہ بھی اس خوشی سے قبول کرتے تھے جیسے چار ہزار مل گئے ہوں۔ دوستوں سے قرض لے کر، عقیدت مندوں کی جیب پر ڈاکہ ڈال کر، اپنے بے تکلف علیگ اور غیر علیگ دوستوں سے عطایا وصول کرکے وہ اس خرابے کو آباد کیے ہوئے تھے۔ اس بھاری بوجھ کو کھینچے جا رہے تھے۔ دل دونیم تھا۔ بازو شل تھے۔ پاؤں زخمی تھے۔ لیکن ہمت جوان تھی۔ عزم جوان تھا۔ جوش کار جوان تھا۔ ایک کھلاڑی کی طرح وہ چوٹ کھاتے تھے۔ مگر کھیل کے میدان سے بھاگتے نہیں تھے۔ وہ تھے بھی تو بہت اچھے اور بہت بڑے کھلاڑی۔ اپنے وقت کے کرکٹ کے مانے ہوئے ہیرو۔

مسلمانوں کو سوشلزم اور کمیونزم کی دعوت دی جا رہی تھی۔ انھیں روٹی اور محنت کے نام پر آمادۂ عمل کیا جا رہا تھا۔ وطن اور قوم کی وفاداری اور جاں نثاری کی دعوت دی جا رہی تھی۔ تمام بڑے بڑے مسلمان لیڈر یا کانگرس کے کیمپ میں تھے، یا کانگرس سے مرعوب ہو کر خاموش بیٹھے تھے، یا انگریزوں کے ثنا خواں اور مدّاح تھے۔

شوکت صاحب کی دعوت ان سب سے الگ تھی۔ وہ منہاج خلافت راشدہ پر احیاء خلافت کے لیے سرگرم کار تھے۔ ان کا مذہب سیاست نہ تھا۔ ان کی سیاست مذہب کے زیر نگین تھی۔ حریف اور حلیف ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ انھیں گالیاں دیتے تھے۔ ان کے راستے میں سنگ گراں بن کر حائل ہوتے تھے۔ لیکن وہ ان سب سے بے پروا، ان سب سے بے نیاز اپنی راہ چل رہے تھے۔ خود ان کے بقول "محمد علی ان کا بیٹا بھی تھا، بھائی بھی، دوست بھی اور ساتھی بھی"، لیکن قوم کے غم میں وہ محمد علی کا غم بھول گئے تھے۔ وہ ہر وقت مرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ لیکن اپنے کام میں اس طرح منہمک تھے جیسے کبھی نہیں مریں گے۔

شوکت صاحب کی ایک اور بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ "انسان ساز" تھے۔ بہت سے کام کے آدمی ان سے بچھڑ گئے۔ کچھ اصولی اختلاف کے باعث، کچھ ذاتی کدورتوں کے سبب، لیکن جو گیا اس سے اچھا کارکن انھوں نے اپنی من موہن آنکھوں کے جادو سے پیدا کر لیا، اور آگے بڑھا دیا۔

شوکت صاحب میں وہ خطابت نہ تھی جو مولانا ابوالکلام آزاد میں تھی۔ وہ سیاسی بصیرت نہ تھی جو جواہر لال نہرو میں تھی۔ وہ فصاحت و بلاغت نہ تھی جو گاندھی جی میں تھی۔ وہ دولت نہ تھی جو مہاراجہ محمود آباد کے پاس تھی۔ وہ قلم نہ تھا جو ظفر علی خاں کے پاس تھا۔ وہ شعریت نہ تھی جس کے حسرت موہانی مالک تھے۔ وہ طلاقت لسانی نہ تھی جو صرف مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کا حصہ تھی۔ وہ علم نہ تھا جو مفتی کفایت اللہ کے پاس تھا۔ وہ قدوسیت نہ تھی جو مولانا حسین احمد کے لیے خاص تھی۔ وعظ و تذکیر کا وہ جوہر نہ تھا جو مولانا احمد سعید کی خصوصیت تھی۔ وہ صلاحیت نہ تھی جو ڈاکٹر انصاری میں تھی۔ وہ داؤں پیچ نہ تھے جن کے ڈاکٹر ضیاء الدین ماہر خصوصی تھے۔ لیکن ایک چیز ایسی تھی جو صرف شوکت صاحب کے پاس تھی۔ اور مذکورہ بالا اکابر میں سے کسی کے پاس نہ تھی۔ وہ تھی اسلام کے راستے میں اور مسلمانوں کے لیے ان کا خلوص بے پروا، ان کی دیوانگی اور آشفتہ سری۔ یہی ایک چیز تھی جسے لے کر وہ میدان میں آئے اور سب پر غالب رہے۔ مخالف مجمعوں میں

پہنچے اور چھا گئے۔ ہر معرکہ میں جیتے اور ہر جنگ میں فتحیاب ہوئے۔ جہاں ہوں تو ان کے خلاف سازشیں ہوتی تھیں۔ ان کے خلاف دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں۔ ان پر سنگین الزامات لگائے جاتے تھے۔ مگر وہ پہنچے اور انہوں نے ہاری ہوئی بازی جیت لی۔ بڑے سے بڑا مخالف مجمع ان کے ہاتھ چومنے لگتا تھا۔ زندہ باد کے نعرے لگنے لگتا تھا۔ ان کے اشارے پر مرنے اور مارنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ کیا یہ شخص جادوگر نہیں تھا؟

ان تمام باتوں کے ساتھ حد درجہ بھولے بھی تھے۔ بہار کے قیامت آفریں زلزلے (۱۹۳۴ء) کی خبر ان پر بجلی بن کر گری۔ سارے کام چھوڑے اور صوبہ بہار کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ جس شہر اور جس جگہ جاتے وہاں کے حالات و تاثرات ایک خط میں مجھے لکھتے۔ میں وہ خط خلافت میں شائع کر دیتا۔ پٹنہ میں عزیز ملت سید عبدالعزیز بیرسٹر کے ہاں قیام کیا۔ وہاں سے بھی مجھے ایک خط لکھا اس خط میں کوئی خاص بات نہ تھی۔ میں نے اسے شائع نہیں کیا۔

کافی عرصے کے بعد جب دورے سے واپس آئے تو حسب معمول بمبئی سے غیر حاضری کے زمانے کا سارا فائل خلافت کا پیش کیا گیا۔ وہ خلافت کا ایک ایک حرف پڑھتے تھے۔ دوسرے دن مجھے بلایا اور کہا

"میں نے پٹنہ سے ایک خط تمہیں لکھا تھا وہ شایع نہیں کیا؟"

انداز گفتگو میں کچھ شکایت بھی تھی، کچھ خفگی بھی۔ میں گھبرا گیا۔ میں نے کہا غلطی سے رہ گیا۔ اسی لہجہ میں فرمایا

"بہت ضروری خط تھا۔ ضرور شایع ہونا چاہیے تھا۔"

واپس آکر میں نے کاغذات میں تلاش کیا تو خط ندارد۔ بہت تلاش کیا مگر کہیں نہ ملا۔ میرے اوپر پریشانی اور دہشت کی کیفیت طاری تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کل کیا جواب دوں گا؟ آخر قلم دوات لے کر بیٹھ گیا اور ذہن کے اندر ہی اپنے نام ایک خط ڈیڑھ کالم کا گھسیٹ ڈالا۔ اور کاتب کو کتابت کے لیے دے دیا۔ سونے کے لیے لیٹا تو دل دھڑک رہا تھا کہ دیکھیے اس "جعل سازی" کا انجام کیا ہوتا ہے؟

دوسرے روز معمول کے مطابق پنسل کاغذ لے کر صبح صبح حاضر خدمت ہوا کہ کچھ لکھانا ہو تو لکھتا جاؤں۔ دیکھتے ہی مسکرائے اور فرمایا

"کتنا اہم خط تھا جو تم نے نہیں چھاپا تھا۔ ایسے خط ضرور چھاپ دیا کرو۔"

اس خط میں جو ان کے نام سے چھپا تھا ایک حرف بھی ان کا نہ تھا۔ لیکن اپنا خط پڑھ کر کے بالکل مطمئن ہو گئے۔ اور ساری خفگی دور ہو گئی تھی۔ میں بڑی سعادت مندی سے بیٹھا پروانۂ خوشنودی حاصل کر رہا تھا۔

کبھی کبھی شوکت صاحب سینما بھی دیکھ لیا کرتے تھے۔ ایک روز رات کے کھانے کے بعد مولانا عرفان نے فرمائش کی

"چلیے سینما دیکھ آئیں آج!"

تیار ہو گئے۔ میری طرف دیکھتے ہوئے فرمایا

"تم بھی تیار ہو جاؤ"

ہم لوگ امپیریل سینما پہنچے۔ منیجر نے زیادہ زور دار استقبال کیا۔ ایک کیبن میں لے جا کر ہمیں بٹھا دیا۔

نماز کے بعد حکیم صاحب نے مجھ سے فرمایا

"کل تم مجھ سے ملو آکر۔ کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

دوسرے روز میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان کے پاس ۱۳-۱۴ برس کا ایک نہایت خوب صورت اور مہذب لڑکا بیٹھا تھا۔ حکیم صاحب نے مجھ سے پوچھا

"خلافت کا کیا حال ہے؟ سنا ہے لوگوں کو کئی کئی مہینے کی تنخواہیں نہیں ملی ہیں؟"

میں نے کہا جی ہاں خلافت کی مالی حالت بہت کمزور ہے۔

"تم کیسے گزارہ کر رہے ہو؟"

"جس طرح دوسرے کر رہے ہیں۔"

"کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے؟"

"جب تک شوکت صاحب خود رخصت نہ کر دیں میں انہیں چھوڑ نہیں سکتا۔ میں ان سے محبت کرتا ہوں۔ وہ میرے لیڈر ہیں۔"

حکیم صاحب مسکرائے۔ کہنے لگے۔ "ابھی لڑکے ہو بچتے سمجھتے سمجھو گے۔"

پھر اس لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا

"یہ ہمارے عبدالمجید سالک کا لڑکا ہے۔ ابھی لندن سے آیا ہے۔ انگریزی بولتا ہے۔ اردو بالکل نہیں جانتا۔ اور انگریزی بھی صرف بولنا جانتا ہے نہ لکھ سکتا ہے نہ پڑھ سکتا ہے۔ ایسا کرو روز صبح صبح۔ بس نماز فجر کے بعد ایک گھنٹے کے لیے آجایا کرو۔ اسے اردو بولنا سکھا دو۔ اور انگریزی کی گرامر سکھا دو۔ اور دو چار ریڈر پڑھا دو۔ چالیس روپے ماہوار تمہیں ملیں گے۔"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں۔ بغیر کسی پس و پیش کے میں نے یہ پیش کش قبول کر لی۔ حکیم صاحب معاملے کے اتنے کھرے تھے کہ مہینہ کی پہلی تاریخ کو بے مانگے میری فیس دیدیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں حکیم علی محمد خاں مالک اجمل میڈیکل ہال کو ٹھاری مینشن نے ——— اب سرگودھا میں مقیم ہیں ——— ایک ہفتے وار اخبار نکالا۔ ایڈیٹری میں نام ان کا تھا لیکن ادارت مجھے سپرد کر دی۔ پچاس روپے ماہوار وہ دے رہے تھے۔ یہ بھی معاملے کے بڑے کھرے تھے۔ مہینہ پورا ہوا اور انہوں نے تنخواہ ہاتھ پر رکھی۔

ایک روز شام کو میں باہر نکلا تو شوکت صاحب اپنے بالاخانے کی کھڑکی پر دونوں ہاتھ ٹیکے کھڑے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی فرمایا

"جعفری یہاں آؤ میرے پاس۔"

میں حاضر خدمت ہوا تو فرمایا

"ہر مہینے قرض کا بوجھ بڑھتا جاتا ہے۔ تنخواہیں چڑھتی جاتی ہیں۔ میں اب تھک گیا ہوں۔ یہ کھتا میرے بھرے اب نہیں بھرا جاتا۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اخبار اور پریس بند کر دوں۔"

میرے چہرے سے انہوں نے نہ جانے کیا پڑھا کہ دفعتہً فرمایا:
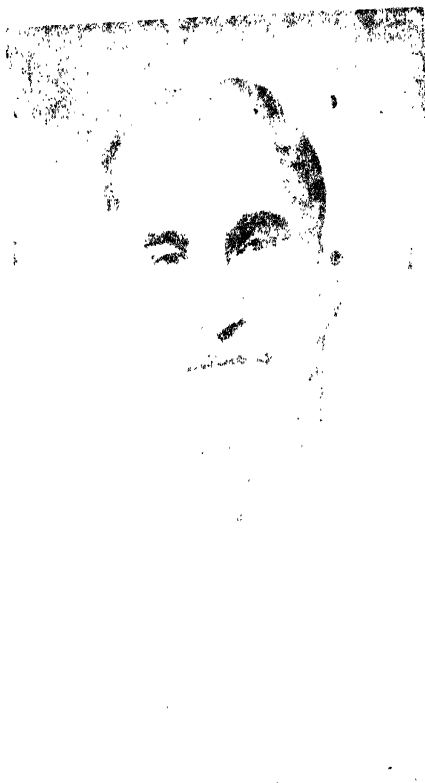
رئیس احمد جعفری

... کی صاحبزادی اختر بیگم جعفری
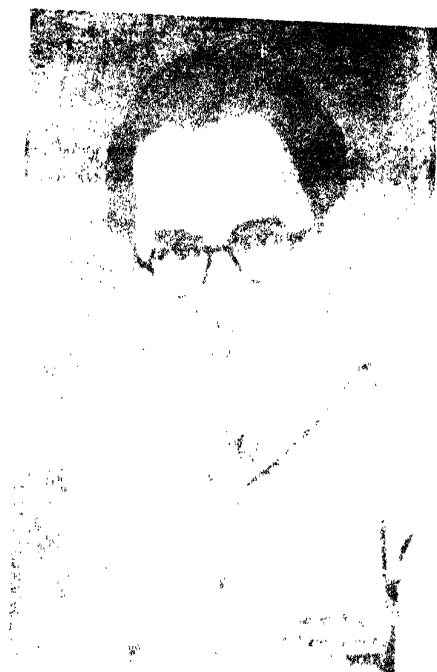
"لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ سَو روپے تمہاری تنخواہ ہے۔ تمہیں اپنا پرائیویٹ سیکریٹری بنا لوں گا۔ اور بھی تنخواہ دیتا رہوں گا۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا

"کیا آپ ایک تجربہ کرنے کو تیار ہیں؟"

فرمایا "تجربہ کیسا؟"

میں نے کہا "درحقیقت نہ پریس خسارے میں ہے نہ اخبار۔ یہ خسارہ صرف بدانتظامی، طوائف الملوکی اور تنظیم کا رنہ ہونے کے سبب ہے۔ آپ اخبار میرے حوالے کر دیں۔ نفع ہو تو آپ کا، نقصان ہو تو میں تنخواہ کا مطالبہ نہیں کروں گا۔ نہ اسٹاف کے لوگ۔ لیکن شرط یہ ہے کہ میرے معاملات میں کوئی ——— آپ بھی ——— دخل نہ دے۔ بلوں پر میرے دستخط ہوں گے۔ وصول یابی میرے ذمہ ہو گی۔ اور ایک پائی بھی کیشیئر بغیر میری اجازت کے کسی کے حکم سے بھی کسی کو ادا نہیں کرے گا۔ خلافت اخبار، خلافت پریس میں چھپتا ہے میں اس کی چھپائی بھی بازار کے نرخ سے ادا کرتا رہوں گا۔ اگر آپ تک شکایت پہنچے کہ کسی کو وقت پر تنخواہ نہیں ملی یا کسی کا بل ادا نہیں ہوا تو فوراً مجھے برخاست کر دیجئے ——— میں اخبار کو اسی اصول پر چلاؤں گا جس اصول پر ذاکر صاحب جامعہ کو چلا رہے ہیں۔

شوکت صاحب خاموشی سے یہ باتیں سنتے رہے۔ پھر انہوں نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا

"میں یہ تجربہ کروں گا۔"

اسی وقت دفتر سے انہوں نے آرڈر بک منگائی، اور ایک حکم لکھ کر خلافت کے تمام انتظامی معاملات کا مجھے واحد منتظم بنا دیا۔

یہ بڑی نازک اور کٹھن ذمے داری تھی جسے میں نے قبول کر لیا۔ لیکن اپنے حق میں کانٹے بو لیے۔ جن لوگوں کا مفاد اس نئی تنظیم سے مجروح ہو رہا تھا۔ وہ میرے بدترین مخالف بن گئے۔ جو لوگ مجھ سے عمر میں کہیں بڑے تھے، اور برسوں سے کام کر رہے تھے۔ انہوں نے میری بالادستی کو اپنی شکست اور توہین سمجھا۔ لیکن شوکت صاحب کے سامنے دم مارنے کی کسی کو مجال نہ تھی۔

میں نے کام شروع کر دیا

روزانہ کی سیل، فرموں اور کمپنیوں کے چیک براہِ راست بنک میں بھیجے جانے لگے۔ جو لوگ صرف اس لیے ملازم تھے کہ کام کچھ نہ کریں۔ صرف تنخواہ وصول کیا کریں۔ انہیں جواب مل گیا۔ روزانہ کی آمدنی جس بے پروائی سے دوسرے غیر متعلق مصارف میں صرف کر دی جاتی تھی؛ اس کا سلسلہ یک قلم منقطع ہو گیا۔ فرموں اور کمپنیوں کے بلوں کی وصول یابی پر کوئی خاص توجہ نہیں کی جاتی تھی، میں نے براہِ راست ربط پیدا کیا۔ اور تقاضے شروع کر دیے۔ ضرورت ہوتی تو خود بھی جاتا۔ اس طرح ایک بڑی رقم وصول ہو گئی۔ اور آئندہ باقاعدگی سے وصول ہونے لگی۔ ہر مہینے کافی ردّی اردو انگریزی، اور غیر ملکی اخبارات کی جمع ہو جاتی تھی اور غائب ہو جاتی تھی۔ میں نے ضروری اخبارات کے فائل مرتب کیے اور باقی ردّی فروخت کر کے ہر ماہ اس کی آمدنی دفتر میں داخل کرنے لگا۔ کاغذ اندھا دھند ادھار آ جاتا تھا جس کا کوئی حساب کتاب نہیں تھا۔ میں نے کاغذ کی آمد و خرچ کا باقاعدہ رجسٹر

نہیں آسکتی۔ یہ میری اتنی بڑی "ناکامی" تھی جو شوکت صاحب کی نظر میں مجھے ذلیل کرنے اور نااہل ثابت کرنے کے لیے ضرورت سے زیادہ تھی۔ دم بدم ان کا غصہ بڑھ رہا تھا، اور وہ بپھرے ہوئے شیر کی طرح گرج رہے تھے۔

یہ ساری باتیں عین اس وقت جب خلافت ہاؤس کے پھاٹک پر میں پہنچا ایک دوست نے جو شاید اسی لیے وہاں ٹہل رہے تھے کہ مجھے قبل از وقت مطلع کر دیں، بتائیں۔ یہ موقع بحث و گفتگو کرنے یا صفائی پیش کرنے کا نہ تھا۔ میں وہیں سے واپس ہوا اور ٹیکسی کر کے سیدھا بجلی کمپنی کے دفتر پہنچا جو قلابہ میں تھا۔ دفتر بند تھا صرف ایک پٹھان چپراسی موجود تھا۔ میں نے پوچھا منیجر صاحب کہاں ملیں گے؟ میرا خیال تھا وہ کمپنی کے آس پاس رہتے ہوں گے۔ اسی لیے ٹیکسی رخصت کر دی تھی۔ چپراسی نے جو جگہ بتائی وہ نصف میل سے کم نہ تھی۔ اب دفعتاً موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔ ٹیکسی ندارد۔ میں بھیگتا ہوا مسٹر مہالکشمی والا جنرل منیجر کے دولت کدے پر پہنچا۔ وہ موجود نہ تھے۔ پھر بھیگتا ہوا کمپنی کے دفتر واپس آیا۔ چپراسی سے نائب منیجر کا مکان پوچھا۔ یہ کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ پھر بھی ایک فرلانگ سے کم نہ تھا۔ لت پت وہاں پہنچا۔ ان صاحب کا نام مسٹر کانگا تھا۔ یہ اپنے بنگلے کے برآمدے میں اپنی بیوی اور لڑکیوں کے ساتھ بیٹھے بمبئی کی سحر طراز بارش کا لطف لے رہے تھے۔ ایک اجنبی شخص کو پانی میں شرابور اپنی طرف آتے دیکھا تو کچھ گھبرائے، کچھ حیران ہوئے، پوچھا

"آپ کون ہیں، کس سے ملنا چاہتے ہیں؟"

میں نے کہا "میں خلافت اخبار کا ایڈیٹر اور خلافت پریس کا منیجر ہوں۔ مسٹر کانگا سے ملنا چاہتا ہوں"

انہیں یقین نہ آیا کہ ایک بڑے اخبار کا ایڈیٹر اور ایک بڑے پریس کا منیجر، بایں حال زار ان کے دولت خانے پر اتنے نا وقت حاضر ہو سکتا ہے۔ مشتبہ نظروں سے مجھے گھورا، پھر سوال کیا۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟"

میں نے انہیں بتایا کہ کچھ پچھلی رقومات باقی ہیں لیکن دو سو روپے ابھی دو تین دن ہوئے ادا کر چکا ہوں پھر بھی بجلی کٹ گئی جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اخبار نہ نکل سکے گا اور اس طرح بڑا نقصان ہو جائے گا۔

مسٹر کانگا پارسی تھے۔ مسلمانوں سے ہمدردی اور دلچسپی رکھتے تھے۔ خلافت کا عہد شباب دیکھ چکے تھے۔ اور یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمانوں کے قومی ادارے مالی اعتبار سے کتنے کمزور ہیں۔ کچھ یہ سوچ کر کچھ میری حالت پر رحم کھا کر انہوں نے مجھے عزت کے ساتھ بٹھایا۔ چائے کی پیالی پیش کی۔ اور فون کر کے کسی شخص کو طلب کیا۔ پھر مجھ سے کہا

"آپ ایسا کیجیے۔ میں اس وقت کنکشن لگوائے دیتا ہوں۔ لیکن باقی رقم کل ادا کر دیجیے۔"

میں نے کہا یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ مجھے کم از کم ایک ہفتہ کی مہلت دیجیے۔ اس عرصے میں ساری رقم بیباق کر دوں گا۔"

میرے وعدے میں انہیں صداقت کی جھلک نظر آئی۔ کہنے لگے

"دس روز ہی سہی۔ لیکن قطعیً۔"

میں انہیں اطمینان دلا رہا تھا کہ ایک شخص آیا۔ اس سے مسٹر کانگا نے کہا

"خلافت پریس کی بجلی کا کنکشن ابھی بحال کر دو۔ اور دس روز تک اگر رقم بیباق نہ ہو تو مجھے رپورٹ کرو۔"

وہ شخص سائیکل پر آیا تھا۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ پیدل چلے۔ کانگا صاحب نے کہا "ٹھہریے" پھر مجھ سے کہا
"لگاتار بارش ہو رہی ہے۔ سواری ملنا مشکل ہے۔ آپ ان کی کار پر چلے جایئے۔"

میں اس شخص کے ساتھ کار میں بیٹھا۔ دفتر سے اس نے الیکٹریشن کو جو رات کی ڈیوٹی پر تھا ساتھ لیا۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ خلافت ہاؤس پہنچ گئے۔ پریس بند تھا۔ کمرے تاریک تھے۔ باورچی خانے میں چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ شوکت صاحب کے بالا خانے پر ایک لیمپ جل رہا تھا۔ میری اس طویل غیر حاضری نے انہیں اور زیادہ چراغ پا کر رکھا تھا۔ مجھے ڈانٹ لیتے تو شاید یہ دل کی کچھ بھڑاس نکل جاتی۔ میں نے بھی ڈرامہ کھیلنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کانگا صاحب کی کار باہر رکوائی۔ الیکٹریشن کو لے کر پچھلے سے پریس میں جو پھاٹک سے بالکل متصل تھا داخل ہوا۔ ایک منٹ کے اندر خلافت ہاؤس بقعۂ نور بن گیا۔ میں نے الیکٹریشن کو پانچ روپے انعام کے دیے اور شوکت صاحب کے بالا خانے پر بھیگے ہوئے کپڑوں کے ساتھ پہنچا۔ شوکت صاحب نے مجھے دیکھا اور فرمایا

"یہ کیا ہو گیا تھا۔ بجلی کیوں کٹ گئی تھی؟"

شاید وہ کچھ اور کہتے۔ میں نے ڈپازٹ کی دو سو روپے کی رسید دکھائی۔ رسید دیکھ کر حیرت سے پوچھا

"پھر بجلی کیوں کاٹی گئی؟"

میں نے ساری کتھا از اول تا آخر سنا دی۔ دفتر کے کلرک کا بلوں کو چھپا کے رکھنا، مجھے تقاضے کی اطلاع بھی نہ دینا، پھر مسٹر مہتا منشی والا کے ہاں جانا، وہاں سے کانگا صاحب کے یہاں پہنچنا، وہاں سے الیکٹریشن کو لے کر آنا، سب بتا دیا۔

اب شوکت صاحب کی کیفیت دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ سمجھ گئے میں سازش در خلافت کا ہدف بنایا جا رہا ہوں۔ مجھ سے صرف یہ کہا

"جاؤ کپڑے بدل کر آؤ۔ مہمان اب آتے ہوں گے۔"

اور پھر جو شکایت کرنے والوں کی خبر لی ہے تو اللہ دے اور بندہ لے۔

طوفان کے بادل چھٹ گئے تھے۔

لیکن ابھی ایک دوسرا طوفان میرے سر پر منڈلا رہا تھا۔

مئی ۳۵ء میں کوئٹہ ایک ہولناک زلزلے کی زد میں آیا۔ کوئٹہ مٹ گیا۔ زمین کے برابر ہو گیا۔ ہزاروں آدمی مر گئے۔ ہزاروں آدمی مجروح ہو گئے۔ شاید ہی کوئی گھر سلامت رہا ہو۔ فوج نے شہر کو اپنے چارج میں لے لیا۔ جو لوگ ابھی زندہ تھے وہ ملبے کے نیچے سسک رہے تھے۔ انہیں نکالا جا رہا تھا۔ جو مر گئے تھے ان کی لاشیں دفن کی جا رہی تھیں۔ زلزلے کے فوراً بعد قسی القلب لٹیروں نے زخمیوں اور لاشوں کی جیبیں ٹٹولنا، اور کھنڈرات سے مال و دولت، از قبیل زر نقد و زیورات وغیرہ سمیٹنا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں فوج کے سپاہی بھی متہم کیے گئے کہ وہ بھی اس لوٹ میں برابر کے شریک ہیں۔

میں نے اس واقعہ پر ایک ادارتی نوٹ لکھا اور حکومت سے مطالبہ کیا کہ اگر یہ خبر غلط ہے تو واضح الفاظ میں تردید کرے اور اگر صحیح ہے تو ان سپاہیوں کو عبرت انگیز سزا دے تاکہ لوگوں میں جو تباہ و برباد ہو چکے ہیں اعتماد کی فضا پیدا ہو۔ حکومت بمبئی کے ہوم ممبر سر رابرٹ بیل تھے۔ انہوں نے تین ہزار روپے کی ضمانت اخبار سے اور تین ہزار کی ضمانت پریس سے طلب کر لی۔

ضمانت طلبی کے واقعہ نے میرے مخالفوں کو ایک زرین موقعہ فراہم کر دیا۔ وہ پھر شوکت صاحب کی خدمت میں پہنچے، اور میرے متعلق کہا یہ شخص خلافت کو تباہ کر دے گا۔ آخر آپ نے اسے کیوں اتنی بڑی ذمہ داری سونپ رکھی ہے؟ خلافت کے پرانے پرانے، عمر رسیدہ، کار آزمودہ، کارکن موجود ہیں، انہیں نظر انداز کر کے آپ نے ایک نوجوان کو سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا ہے۔ اس موقعہ پر زاہد صاحب اور یٰسین نوری صاحب ——— جو بعد میں کانگرس میں شریک ہو گئے اور وزیر بنے ——— بھی موجود تھے۔ ان دونوں نے میری حمایت کی۔ اور شوکت صاحب سے کہا جعفری نے جس خوبی سے کام سنبھالا ہے وہ ہر طرح سے ہمت آزمائی کا مستحق ہے نہ کہ تعزیر و ملامت کا۔ شوکت صاحب کی خود بھی یہی رائے تھی۔ انہوں نے کہا میں خود بھی اس واقعہ پر اگر لکھتا تو وہی لکھتا جو جعفری نے لکھا ہے۔ حکومت تو خلافت پر وار کرنے کے بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ اگر [illegible] سے "چڑیا چڑے" کی کہانی پر ضمانت طلب کی جا سکتی تھی تو خلافت سے کوسوں دور کے اس دلفگار حادثے پر کیوں نہیں طلب کی جا سکتی؟ رہے وہ پرانے اور کار آزمودہ کارکن جن کا تم ذکر کرتے ہو تو ان سے مایوس ہونے کے بعد ہی میں نے اس نوجوان کو یہ ذمہ داری سونپی ہے۔ اور جب سے اس نے کام سنبھالا ہے مجھے ایک پیسہ بھی اخبار یا پریس کے سلسلے میں باہر سے لا کر نہیں دینا پڑا ہے۔

۱۹۳۵ء ہی میں شہنشاہ جارج پنجم کی سلور جوبلی ہوئی۔ بمبئی کے سرکار پرست لوگوں نے بڑی دھوم دھام سے جشن مسرت منانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان میں پیش پیش سر سلیمان قاسم مٹھا تھے جو شوکت صاحب کے دوست، خلافت کے مالی معاون اور بمبئی کے مشہور تاجر تھے۔ انہیں انگریزوں سے عشق تھا۔ تو صادق نہ تھا کیونکہ کانگرس میں وزارت قائم ہوتے ہی کانگرسی بن گئے اور اب تک کانگرسی ہیں۔ سرکاری حکام و عمال اور روزنامہ ٹائمز جشن کو کامیاب بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے تھے۔

میں نے اس جشن کی تیاریوں کے سلسلے میں جو خیالات موافقت یا مخالفت میں آئے شائع کر دیے۔ اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ شوکت صاحب دورے پر باہر گئے ہوئے تھے۔ سر سلیمان وغیرہ کی مخالفت کرنا مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے سوچا شوکت صاحب آ جائیں تو وہ خود ہی اس سلسلے میں پالیسی متعین کریں گے۔

لیکن اسی اثنا میں ایک واقعہ ایسا ہوا جس نے میری مہر سکوت توڑ دی۔ اور میں نے مسلسل کئی پُر زور مقالات جشن جوبلی کے سلسلے میں لکھ ڈالے۔ بات یہ ہوئی کہ سر سلیمان اور سر شاہ نواز بھٹو نے جو سندھ کے نمائندے کی حیثیت سے منسٹر لوکل سیلف گورنمنٹ تھے، متولیانِ اوقاف کو راضی کر لیا کہ اپنی اپنی مسجدوں میں چراغاں بھی کریں اور جامع مسجد میں بھی چراغاں کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سر سلیمان اور سر شاہ نواز بھٹو کی طرف سے میرے پاس پیام پہنچا کہ میں خاموش رہوں۔ اور اس مسئلے پر کچھ نہ کروں۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ شوکت صاحب چونکہ کانگرس سے الگ ہو چکے ہیں، لہٰذا وہ بیک وقت حکومت اور کانگرس سے مخالفت مول لینا پسند نہیں کریں گے۔ میں نے اپنا کام جاری رکھا یعنی ایڈیٹوریل مخالفت میں لکھتا رہا۔ اور متولیوں کو شرم دلاتا رہا کہ وہ اپنے گھر پر تو چراغاں کر سکتے ہیں لیکن خانۂ خدا کو اس کام کے لیے نہیں استعمال کر سکتے۔ اور اگر انہوں نے ایسا کیا تو مسلمان کوئی عملی اقدام کرنے پر مجبور ہوں گے۔

جب میں نے اپنی روش میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا کی تو شوکت صاحب کو تار دے کر بلایا گیا۔ تیسرے روز وہ بمبئی پہنچے۔ لیڈی مند،

اسٹیشن پر سر شاہنواز بھٹو، سر سلیمان قاسم مٹھا، اور بعض دوسرے لوگ موجود تھے۔ رسمی معانقے اور مصافحے کے بعد یہ لوگ بھی خلافت ہاؤس میں وارد ہوئے۔ آگے آگے شوکت صاحب کی کار، پیچھے پیچھے یہ حضرات۔ سر شاہنواز بھٹو نے کار سے اترتے ہی شوکت صاحب سے کہا "میں وزیر کی حیثیت سے نہیں دوست کی حیثیت سے heart to heart talk کرنا چاہتا ہوں۔" پھر انہوں نے heart to heart talk شروع کر دی۔ اور آمادہ کیا کہ جشن جوبلی کی اگر تائید نہ کریں تو کم از کم مخالفت ہرگز نہ کریں۔ سر سلیمان نے بھی اسی طرح کی باتیں کہیں۔ شوکت صاحب سب کی سنتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا

"میں ابھی آیا ہوں، خود مجھے حالات کا جائزہ لینے دیجیے۔ لیکن بہرحال کل کے اخبار میں اپنی پالیسی کا میں اعلان کر دوں گا۔"

ان لوگوں کے جانے کے بعد شوکت صاحب نے مجھے طلب کیا اور پوچھا

"تم نے کیا لکھا ہے بہت شاکی ہیں یہ لوگ۔"

میں نے جو کچھ لکھا تھا سامنے رکھ دیا۔ میں کھڑا تھا اور شوکت صاحب میرے لکھے ہوئے مقالات ملاحظہ فرما رہے تھے۔ میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ ایک ایسے شخص کی قسمت کا فیصلہ آج ہونے والا تھا جس کا نہ خلافت ہاؤس میں کوئی پشت پناہ تھا نہ خلافت ہاؤس سے باہر۔ صرف زاہد صاحب ایسے تھے جو ہمیشہ میرا ساتھ دیا کرتے تھے مگر وہ بمبئی سے باہر تھے۔ شکایت جن لوگوں نے کی تھی وہ بھی معمولی آدمی نہ تھے۔ شوکت صاحب کے ذاتی دوست بھی اور صاحب جاہ و منصب و مال و زر بھی۔

شوکت صاحب مضامین پڑھ چکے تو مجھ سے فرمایا

"پنسل کاغذ لاؤ۔ کل کا ایڈیٹوریل میرے نام سے شائع ہوگا۔"

میں گیا اور پنسل کاغذ لے کر حاضر ہو گیا۔ وہ بولتے رہے تھے میں لکھ رہا تھا۔ شوکت صاحب نے لکھایا

"بادشاہ سلامت کا جشن جوبلی منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مسجدوں پر اس سلسلے میں چراغاں کرنے کی تحریک بھی جاری ہے۔ میں کہتا ہوں یہ اس قوم کا بادشاہ ہے جس نے مسلمانوں کو کہیں کا نہیں رکھا۔ اس کی قوم نے ہر جگہ مسلمانوں کی آزادی چھینی۔ اور انہیں مٹانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اور یہ بادشاہ صرف بادشاہ ہی نہیں ہے "ڈیفنڈر آف دی فیتھ" (محافظ دین عیسوی) بھی ہے۔ اس سے یا اس کی جوبلی سے ہمیں کوئی سروکار نہیں۔ دنیا دار ان سرکار جو چاہیں کریں۔ لیکن جو لوگ مسجدوں میں چراغاں کرنے کی کوشش کریں گے اس کی مزاحمت کی جائے گی۔ ایسے لوگوں کا منہ دین میں بھی کالا ہوگا اور دنیا میں بھی۔"

میں نے یہ مقالۂ ادارت جلی حروف میں شائع کیا۔ سارے شہر میں ہلچل مچ گئی۔ پھر کسی متولی وقف کی ہمت نہیں پڑی کہ چراغاں کرتا کیونکہ خدا کے ہاں تو اس کا منہ بعد میں کالا ہوتا۔ بمبئی میں اسی دن ہو جاتا۔

شوکت صاحب نے یہ مضمون لکھ کر ثابت کر دیا کہ وہ کانگرس کے لاکھ مخالف ہوں لیکن اس مخالفت کی قیمت انگریز سے لینے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے یہ مضمون لکھ کر اپنے اخبار کے حقیر اور کم مایہ ایڈیٹر کا دل بڑھایا اور اسے فلک الافلاک پر پہنچا دیا۔

ڈر، جھجک، مصلحت، یہ چیزیں شوکت صاحب کی فطرت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی تھیں۔ وہ صاف دل تھے، صاف گو تھے۔ ان کی کوئی بات پرائیویٹ نہ تھی۔ ان کا کوئی کام پرائیویٹ نہیں تھا۔

بائیکلہ مسجد کے سلسلے میں جب ہندو مسلم فساد ہوا اور پولیس نے گولی چلائی تو شوکت صاحب بے قرار ہو گئے۔ انہوں نے

کہ خلافت کے رضاکاروں کے پاس سے خون آلود چھرے برآمد ہوئے ہیں۔ اور یہ رضاکار شوکت صاحب کی شہ پر فسادات میں عملی حصہ لیتے ہیں۔ اسی روز بمبئی کارپوریشن کے میئر نے ایک مجلس امن طلب کی جس میں ہندو مسلم لیڈر مدعو تھے۔ شوکت صاحب بھی تشریف لے گئے۔ وہاں مسٹر پرشوتم داس ٹھاکر داس نے فری پریس جرنل کی وہ خبر پڑھ کر کہا۔ ایک طرف تو لوگ فساد پھیلاتے ہیں۔ پھر امن کی باتیں کرتے ہیں۔ یہ چوٹ شوکت صاحب پر تھی، وہ بھلا کب چپ رہنے والے تھے۔ انہوں نے کھڑے ہو کر کہا فسادی تم ہو۔ تم غنڈوں کو روپے دے کر مسلمانوں کو قتل کراتے ہو۔ تم پر اور تمہاری امن کمیٹی پر لعنت بھیجتا ہوں۔ یہ کہہ کر واک آؤٹ کر گئے۔ اور دوسرے روز سدانند پر انہوں نے ازالہ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا۔ سدانند خود بھی دولت مند تھا اور اس کی پشت پناہی تمام بڑے بڑے سرمایہ دار کر رہے تھے۔ شوکت صاحب کے پاس وکیل کو فیس دینے کے روپے بھی نہیں تھے۔ یٰسین نوری صاحب بیرسٹر سے شوکت صاحب کے عزیزانہ تعلقات تھے اور وہ خلافت کے دیرینہ کارکن اور علی برادران کے شیدائی تھے۔ احمد آباد میں پریکٹس کرتے تھے۔ فیس کا تو سوال ہی نہ تھا۔ البتہ کرایہ آمد و رفت کے سلسلے میں شوکت صاحب ہر پیشی پر ان کی جیب میں کچھ ڈال دیا کرتے تھے۔ یہ مقدمہ بہت دن تک چلا۔ بعد میں سعید حسن صاحب بیرسٹر جو جنوبی افریقہ میں پریکٹس کرتے تھے بمبئی میں بود و باش اختیار کرنے آ گئے۔ قیام خلافت ہاؤس میں رہا۔ ان سے بھی عزیزانہ تعلقات تھے۔ یہ مسٹر غلام حسین ہدایت اللہ ـــــ جو بعد میں ہائیکورٹ آف انڈیا کے جج ہوئے ـــــ کے قریبی عزیز تھے۔ اور ان سے شوکت صاحب کے گہرے مراسم تھے۔ جو عزیز داری کی حد سے بھی آگے بڑھے ہوئے تھے۔ آخر یہ مقدمہ سعید حسن نے لیا۔ اور بڑی قابلیت سے لڑا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سدانند کو تا برخاست عدالت قید اور جرمانے کی سزا ہوئی۔ شوکت صاحب کی اس کامیابی نے سدانند کا چراغ گل کر دیا، اور مسٹر پرشوتم داس ٹھاکر داس بتاشے کی طرح بیٹھ گئے۔

مراد آباد سے شوکت صاحب مرکزی اسمبلی کی ممبری کے لیے کھڑے ہوئے۔ اس حلقہ سے سر یعقوب ہمیشہ سے ممبر ہوتے چلے آ رہے تھے۔ وفادار سرکار تھے۔ حکام و عمال سے گاڑھی چھنتی تھی۔ پہلے تو انہوں نے ایک حد درجہ نیاز مندانہ خط لکھ کر استدعا کی وہ کوئی اور حلقہ منتخب کر لیں مگر شوکت صاحب کیوں ماننے؟ آخر انہوں نے ریٹرننگ آفیسر کو ملا کر کاغذات نامزدگی مسترد کرانے کی کوشش کی۔ شوکت صاحب فوراً بذریعۂ کار دہلی پہنچے اور سر ہینری کریک سے ـــــ بعد میں پنجاب کے گورنر ـــــ جو گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ممبر تھے شکایت کی۔ سر ہینری کریک نے پندار کے ساتھ جواب دیا،

"میں اپنے فیتھلس کی شکایت نہیں سننا چاہتا۔"

شوکت صاحب نے اپنا آہنی ڈنڈا اس کے سر کی طرف گھماتے ہوئے کہا،

"سنے گا کیسے نہیں؟ پھر تو سے کس دن کی دوا؟"
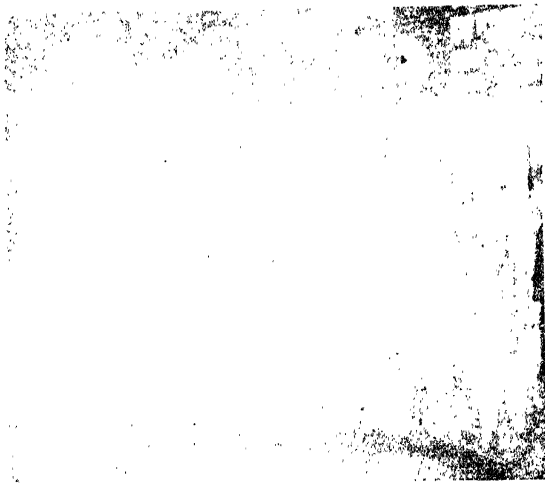
اگر سر ہینری کریک اور مولانا صاحب ڈٹے ہوئے فوراً کھسک نہ جائیں، تو پھر "با میرا گر بیان چاک یا دامن یزداں چاک" کا منظر ساری دنیا دیکھ لیتی۔ لیکن شوکت صاحب نے اس پرائیویٹ کارنامے کو بھی راز نہیں رکھا۔ دوسرے دن اخبارات میں ان کا بیان شایع ہوا جس میں یہ ساری تفصیل درج تھی۔

پناہ دینے کے معاملے میں شوکت صاحب خالص "عرب" تھے۔ رامپور کے ایک صاحب ارشاد علی بمبئی میں ٹیکسی چلاتے

تھے۔ خلافت ہاؤس میں اکثر آمد و رفت رہتی تھی۔ زاہد صاحب ان کی سرپرستی کیا کرتے تھے۔ شوکت صاحب ان سے کچھ زیادہ خوش نہ تھے۔ ان کا ایک پارسی لڑکی سے عشق چل رہا تھا۔ لڑکی نے اسلام قبول کر لیا۔ اور دونوں نے باہمی رضامندی سے شادی کر لی۔ بپھرے ہوئے پارسیوں سے نمٹنا، اور قید و بند، گرفتاری و ضمانت، عدالت اور مقدمہ کے مراحل سے گزرنا ان کے بس سے باہر تھا۔ اپنی بیوی کو لے کر سیدھے خلافت ہاؤس پہنچے۔ اور سارا واقعہ گوش گزار کر کے امداد کے طالب ہوئے۔ شوکت صاحب نے لڑکی کا بیان سنا اور جب مطمئن ہو گئے کہ لڑکی واقعی دل سے مسلمان ہو گئی ہے اور واقعی اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے تو ارشاد صاحب سے ان کی خفگی دور ہو گئی۔ انہوں نے اپنی بہو کی طرح لڑکی کو خلافت ہاؤس میں رکھا۔ چھوٹے بڑے پارسیوں کا خلافت ہاؤس میں تانتا لگ گیا۔ لڑکی کے والدین بھی آئے۔ دھمکیاں بھی دیں۔ خون خرابے کی نوید بھی سنائی۔ لیکن شوکت صاحب جنہے پناہ دے چکے تھے، اس کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ کسی کی ایک نہیں سنی۔ کسی کی نہیں چلنے دی۔ ارشاد صاحب کو صرف ایک خوبصورت اور خوب سیرت بیوی ہی نہیں ملی۔ ایک قلعہ بھی مل گیا جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ ایک سرپرست بھی مل گیا جو ہر بڑی سے بڑی طاقت سے پنجہ آزمائی کو تیار تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ روز کے بعد مخالفت کا طوفان دب گیا۔ اور ارشاد صاحب دن عید اور رات شبرات کے مزے لوٹنے لگے۔

۴۷ء کا واقعہ ہے کہ میرے ندوے کے ساتھی حافظ عمران خاں ازہر یونیورسٹی مصر میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ وہ بضد تھے کہ میں مصر آجاؤں اور سند فراغت لے لوں۔ وہ اتنے ایثار پر آمادہ تھے کہ انہوں نے لکھ دیا تھا کہ مجھے اپنی جیب سے مصر میں ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرنا پڑے گا۔ وہ وظیفہ کا بندوبست کر چکے ہیں۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ جہاز پر بیٹھوں اور مصر پہنچ جاؤں۔ میری خود بھی آرزو یہی تھی۔ میں نے پاسپورٹ بنوایا۔ ٹکٹ کا بندوبست کیا۔ جہاز سے سیٹ بک کرا لی۔ اور شوکت صاحب کو جو مرکزی اسمبلی کے اجلاس کے سلسلے میں دہلی گئے ہوئے تھے اپنا استعفا لکھ کر بھیج دیا۔

شوکت صاحب نے میرے خط کے جواب میں تار دے کر مجھے دہلی طلب کیا۔ میں پہنچا اور قرول باغ میں بیگم محمد علی کی قیام گاہ پر شوکت صاحب کے پاس ٹھہرا۔ پہلے دن انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ دوسرے روز جب اسمبلی جانے لگے تو مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ خود ایوان میں جا کر بیٹھ گئے مجھے پریس گیلری کا پاس دیدیا۔ میں وہاں جا کر بیٹھ گیا اور کارروائی دیکھنے لگا۔ لنچ کے وقت اپنے دو دوستوں مسٹر حسن علی (مشہور کرکٹیر) اور مسٹر مصباح العثمان (ڈپٹی کمشنر ناگپور) کے ساتھ وہ صنوبر خاں کے ہوٹل میں پہنچے۔ میں بھی ساتھ تھا کھانے کے ساتھ ساتھ گپ شپ ہوتی رہی۔ میں خاموشی سے ان بڑوں کی دلچسپ اور پُرلطف باتیں سنتا رہا۔

سہ پہر کو امپیریل ہوٹل تشریف لے گئے۔ ضمیمہ کی طرح میں بھی ساتھ تھا۔ یہاں بھولا بھائی ڈیسائی نے ایک پارٹی دی تھی۔ سر شاہ سلیمان جج فیڈرل کورٹ کو سب سے پہلے میں نے یہیں دیکھا۔ اس پارٹی سے فارغ ہو کر شوکت صاحب مجھے لیے ہوئے مسٹر غلام محمد (سابق گورنر جنرل پاکستان) کے بنگلے پر لے گئے جن سے ان کے دیرینہ تعلقات تھے۔ کچھ دیر وہاں بیٹھے ان پر فقرے سر کرتے رہے ان کی بیماری کا مذاق اڑاتے رہے۔ وہاں سے اٹھے تو میاں غیاث الدین ممبر اسمبلی کے ہاں پہنچے۔ اب رات ہو چلی تھی یہاں میں نے دیکھا مسٹر سکندر حیات نہایت مضمحل اور اداس بیٹھے ہیں۔ سر ضیاء الدین وغیرہ تشریف فرما تھے۔ شوکت صاحب کے پہنچتے ہی مجلس باغ و بہار بن گئی۔ مسٹر سکندر کا موڈ بھی بدل گیا۔ میاں غیاث الدین نے سر سکندر کے تدبر اور فہم و فراست کا قصیدہ پڑھنا شروع کیا

حاضرین میں سے کسی نے کہا

تھے۔ اگر تم مجھے اپنا لیڈر مانتے ہو تو میرے لیڈر کو بھی لیڈر مانو۔ خلافت کے زمانے میں اگر جناح نے غلطی کی تھی تو اب اس کی تلافی بھی کر رہے ہیں۔ یہی بڑی شخصیت مسلمانوں کا بیڑا پار کر سکتی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر شوکت صاحب قائد اعظم کی قیادت عظمیٰ کو تسلیم نہ کرتے تو اس میں بڑے بڑے رخنے پڑتے اور مسلم لیگ کی وہ مرکزیت قائم نہ ہو پاتی جو شوکت صاحب کے تعاون سے قائم ہوئی تھی۔ خود قائد اعظم بھی اسے محسوس فرماتے تھے۔ ان کی واضح ہدایت تھی کہ مسلم لیگ کا ممبر کسی دوسری سیاسی جماعت کا ممبر نہیں بن سکتا لیکن جو لوگ خلافت کے ممبر تھے ان کو اور علی برادران سے کبھی اس بارے میں نہیں پوچھا۔

اس سفر سے واپس آیا تو گیارہ بجے شوکت صاحب کی قیام گاہ پر پہنچا۔ بہت تھک گئے تھے جاتے ہی بستر پر دراز ہو گئے۔ تو میں سونے کی تیاری کر رہا تھا کہ اتنے میں شوکت صاحب نے آواز دے کر مجھے بلایا۔ میں حاضر ہوا۔ انہوں نے پوچھا

"کیا تم نے واپس جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟"

میں نے عرض کیا "اگر آپ اجازت دیں گے تو چلا جاؤں گا"

فرمایا "میرا ساتھ نہ چھوڑو، کچھ دن صبر کرو، میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر مصر جاؤں گا۔ اور تمہارے لیے بہت اچھا بندوبست کر دوں گا۔"

میں خاموش ہو گیا۔ ان کے سامنے زبان کھولنے کا یارا نہ تھا۔ پھر فرمایا

"جاؤ سو رہو۔ اور کل بمبئی واپس جاؤ۔ جی لگا کر کام کرتے رہو۔"

پریس کا انتظام جب میں نے اپنے ہاتھ میں لیا تو اس کا سختی سے لحاظ رکھا کہ جاب ورک زیادہ سے زیادہ آئے۔ کام اچھا چھپے۔ اور وعدہ خلافی کبھی نہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مقامی ہفتہ وار اخبارات خلافت پریس میں چھپنے لگے۔ جی آئی پی ریلوے، بی بی اینڈ سی آئی ریلوے، فلم کمپنیوں اور سینما ہاؤسوں کے ہینڈ بل اور پوسٹر چھپنے کے لیے آنے لگے۔ مغل لائن کے ڈائرکٹر مسٹر براؤن سے شوکت صاحب کے بڑے گہرے روابط تھے۔ لیکن ان کا اردو کا کام ہمیشہ دوسرے پریسوں میں چھپتا تھا۔ میں نے یہ کام بھی حاصل کیا۔ میری اس کامیابی سے شوکت صاحب بہت خوش تھے۔ لیکن میرے کرم فرمایانِ خصوصی اتنے ہی ناخوش تھے۔ یہ لوگ زاہد صاحب کو تو میرے خلاف نہ توڑ سکے۔ لیکن مولانا عرفان کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر انہیں ہموار کر لیا۔ مولانا بڑے مخلص، بڑے نیک، بڑے ایماندار آدمی تھے۔ لیکن کانوں کے کچے تھے۔ چونکہ میری کامیابیوں کا ان کے اقتدار پر براہِ راست اثر پڑتا تھا اس لیے مجھ سے خوش بھی نہ تھے۔ اس چیز نے دراندازوں کا حوصلہ بڑھا دیا اور وہ میرے خلاف انہیں استعمال کرنے لگے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو بظاہر مجھ سے بڑے تپاک اور گرمجوشی سے ملتے تھے۔ میرے کاموں کی داد دیتے تھے لیکن پیٹھ پیچھے نیچا دکھانے کی تدبیریں سوچتے رہتے تھے۔

خلافت پریس کا کام اب بڑھ گیا تھا۔ چھپائی پتھروں پر ہوتی تھی۔ پتھر اب ضرورت سے کم تھے۔ پندرہ بیس برس پہلے ایک نسخہ قرآن مجید خلافت پریس میں چھپا تھا۔ اس کے پتھر محفوظ تھے لیکن نامکمل۔ کئی پاروں کے پتھر غائب تھے۔ یہ پتھر برسوں سے بیکار پڑے تھے۔ مجھے بڑے پتھروں کی ضرورت تھی۔ یہ کافی گھس چکے تھے۔ میں نئے پتھر چاہتا تھا۔ میں نے عرفان صاحب سے ایک روز برسبیل تذکرہ کہا "کیوں نہ یہ پتھر فروخت کر کے نئے پتھر خرید لیے جائیں؟" مولانا نے جواب دیا "نہیں! پورا نسخہ رہے۔"

حجازی پریس کے مالک مولانا عطاء اللہ قرآن چھاپنا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں آمادہ کیا کہ یہ پتھر خرید لیں۔ جو بار سے کم ہیں ان کا اپنے طور پر انتظام کر لیں۔ اس طرح ان کا کام جلد ہو سکتا تھا۔ اور وہ بہت سی زحمتوں سے بچ سکتے تھے۔ وہ فوراً آمادہ ہو گئے بڑے متدین اور برگزیدہ شخص تھے۔ انھوں نے آ کر پتھروں کا معائنہ کیا۔ جو قیمت لگائی وہ اگرچہ نامناسب نہ تھی مگر میرے اصرار سے انھوں نے اپنی پیش کش میں میرے حسب دل خواہ اضافہ کر دیا۔ اور کراس چیک دے دیا۔ میں نے پتھر ان کے حوالے کر دیے۔ شوکت صاحب، دہلی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔

کوئی ڈیڑھ ماہ کے بعد واپس آئے۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا وہم کر رہا تھا کہ میری طلبی ہوئی۔ میں نے دیکھا مرکزی دفتر میں شوکت صاحب تشریف فرما ہیں اور دفتر کی ساری کرسیوں پر میرے مہربانانِ قدیم متمکن ہیں۔ مولانا عرفان بھی تشریف رکھتے تھے۔ یہ ایک وفد تھا اور بلاشبہ یہ سب شوکت صاحب کے اور خلافت کے فدائی تھے۔ اس وفد نے مجھ پر سنگین الزامات عاید کیے تھے۔ جو خود رائی اور خود مختاری کی شکایت پر مبنی تھے۔ ان الزامات میں سرِ فہرست پتھروں کی فروخت کا معاملہ تھا گویا میں نے تختِ طاؤس کوڑیوں کے دام فروخت کر دیا تھا۔

میں نے جواب میں ساری تفصیل سنا دی۔ اور کہا اگر کوئی صاحب ان پتھروں کو زیادہ قیمت پر فروخت کر سکتے ہیں تو وہ گاہک لائیں۔ میں مولانا عطاء اللہ سے ان کی قیمت واپس کر کے پتھر واپس لے آؤں گا۔ رہی میری خود سری اور خود مختاری تو مولانا عرفان بیٹھے ہیں ان سے دریافت کر لیجیے۔ یہ اقدام کرنے سے پہلے میں نے ان سے مشورہ کر لیا تھا یا نہیں؟ مولانا میرے سامنے میرے اس دعوے کی تردید نہیں کر سکتے تھے خاموش رہے۔

شوکت صاحب نے میری صداقت محسوس کر لی، اور حاضرین کرام کے سامنے مجھے مخاطب کر کے فرمایا

"بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے نہ خود کام کر سکتے ہیں نہ دوسروں کو کرنے دیتے ہیں"

اور پھر ممبرانِ وفد سے مخاطب ہو کر فرمایا

"جس روز سے اس نے کام سنبھالا ہے میرے پاس کوئی تقاضہ کرنے والا نہیں آیا۔ دفتر کے حسابات کا گوشوارہ ہر مہینے میرے سامنے پیش ہوتا ہے۔ اخبار یا پریس پر کوئی قرض نہیں ہے۔ سب کی تنخواہیں وقت پر ادا ہوتی ہیں۔ میں ہزاروں روپے بھیک مانگ مانگ کر دوستوں سے لاتا تھا مگر قرضہ کسی طرح ادا نہیں ہوتا تھا۔ اگر میں اسے نکال دوں تو کون ذمہ لیتا ہے کہ مجھے ہر جھنجھٹ سے الگ رکھ کر کام اسی طرح چلاتا رہے گا؟ مجھے کام چاہیے باتیں نہیں چاہییں۔"

سب کے منہ اتر گئے۔ بڑے بڑے جبّہ پوش سرنگوں تھے۔ جنہیں اپنے ارشاد "ناطق" کی قطعیت پر بھروسہ تھا وہ گونگے نظر آ رہے تھے۔ جنہیں یہ "افتخار" حاصل تھا کہ شوکت صاحب کے سامنے بے جھجک جو چاہیں کہہ سکتے ہیں، وہ پہلو بدل رہے تھے ——— یہ تھے شوکت صاحب۔

جس آدمی پر اعتماد کر لیں۔ دنیا کی کوئی طاقت ان کی رائے اس کے بارے میں نہیں بدل سکتی تھی، کوئی نہیں بدل سکتا تھا۔ ان کے فدائی، ساتھی، اور جاں نثار بھی نہیں۔

مولانا عرفان کی قیادت سے مایوس ہو کر ان حضرات نے ایک مرتبہ زاہد صاحب کو بھی مجھ سے فرنٹ کر دیا۔

بمبئی کے جرمن قونصل مسٹر کپ تھے۔ ان کے پاس ہر ہفتے چھوٹے چھوٹے "رائٹ اپ" برلن سے آیا کرتے تھے۔ جو جرمنی کی اقتصادی صنعتی اور اختراعی ترقیوں کی تفصیل پر مشتمل ہوتے تھے۔ مسٹر کپ ان مضامین کو "ورناکیولر اخبارات" یعنی گجراتی، مرہٹی اور اردو میں بطور مراسلات یا مقالات چھپوایا کرتے تھے۔ گجراتی اور مرہٹی کے مترجم تو انہیں حاصل تھے کوئی اردو مترجم نہیں تھا۔ "ٹائمز آف انڈیا" کے مسٹر امیر حسن نے مجھے مسٹر کپ سے متعارف کرایا۔ انہوں نے مجھ سے فرمایا

"ان مضامین میں سے جو ہر ہفتے آپ کو ملا کریں گے۔ جو آپ کو پسند آجائے یا جسے آپ اردو دان پبلک کے لیے مناسب سمجھیں، کسی بھی اردو اخبار میں اشاعت کے لیے دیدیا کریں۔ ترجمے کا معاوضہ فی مضمون تین روپے ہوگا۔"

میں نے کام شروع کردیا۔ مسٹر بکتیانی ایک سندھی ہندو مسٹر کپ کے سیکریٹری تھے۔ وہ ہر ہفتے مجھے مضمون دے دیتے ان میں سے کوئی معلوماتی مضمون ترجمہ کرکے کچھ خلافت میں کچھ دوسرے اخباروں میں اپنے نام سے شایع کرادیتا۔

ایک روز شوکت صاحب نے مجھے کچھ لکھوانے کے لیے بلایا۔ میں پنسل کاغذ لے کر سامنے بیٹھ گیا۔ ابھی انہوں نے مضمون بولنا شروع نہیں کیا تھا کہ زاہد صاحب تشریف لے آئے اور انہوں نے آتے ہی کہا

"سنا ہے آپ جرمن قونصل خانے کے مضمون ترجمہ کرکے شایع کرتے ہیں۔"

میں سمجھ گیا کہ یہ سوال کس طوفان کی تمہید ہے۔ شوکت صاحب نے بات ٹالنا چاہی مگر میں نے پنسل میز پر رکھ دی اور کہا

"اس مسئلہ کا فیصلہ ہوجانا چاہیے! زاہد صاحب آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

انہوں نے فرمایا "ان مضامین کا جو معاوضہ ملتا ہے وہ خلافت فنڈ میں داخل ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا "آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ مضامین خلافت میں نہیں شایع ہوسکتے۔ میں مان لوں گا۔ میرے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ یہ خلافت ہی میں چھپیں۔ ہندوستان کے متعدد دوسرے اخبارات میں بھی بھیجتا ہوں اور یہ چھپتے ہیں۔ جنھیں نہیں بھیجتا، ان میں سے کئی معلوماتی ہونے کے باعث انہیں نقل بھی کرتے ہیں۔ آئندہ سے میں خلافت کو کوئی مضمون نہیں دوں گا۔ دوسرے اخبارات کو بھیجتا رہوں گا۔"

زاہد صاحب نے کہا "لیکن آپ خلافت کے پورے وقت کے ملازم ہیں، دوسرے اخبارات میں بھی نہیں بھیج سکتے۔"

میں نے کہا "اگر آپ کا یہ خیال ہے تو میں استعفا دینے کو تیار ہوں، اپنی ڈیوٹی ادا کرنے کے بعد جو کام چاہوں کروں، یہ میرا حق ہے۔"

شوکت صاحب خاموشی سے یہ باتیں سنتے رہے۔ پھر انہوں نے فرمایا

"زاہد تم چپ رہو۔ یہ بے چارہ اپنی ہمت سے بہت زیادہ کام کرتا ہے۔ اور ہم اسے تنخواہ کیا دیتے ہیں؟ صرف

سو روپے۔ یہ مطالبہ اس سے [illegible] نہیں کر سکتے تھے جب اس کی محنت کے مطابق تنخواہ دے سکتے! ——
پھر انہوں نے مضمون لکھنا ختم [illegible] دیا [illegible]۔

[illegible] شوکت صاحب [illegible] ۔ [illegible] اب بالکل عمر اور سر اسر غیر معروف شخص کی حمایت اس شان سے کر رہے تھے۔

جلا وطن خلیفۃ [illegible] زندگی بسر کر رہے تھے [illegible]

شوکت صاحب [illegible] ۔ [illegible] علیحدہ [illegible] منظم جاہ [illegible] اور بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔

شوکت صاحب نے یہ رشتہ [illegible] کرا دیا تھا۔ لیکن نظام ممنون تھے۔ اعظم جاہ اور معظم جاہ نے شوکت صاحب کی پنشن مقرر کرنے کا نظام سے مطالبہ کیا۔ [illegible] سر اکبر حیدری کے سامنے پیش ہوئے۔ ان کے نوٹ پر نظام کو فیصلہ کرنا تھا۔

اس اثنا میں [illegible] کورٹ [illegible] اجلاس ہوا۔ [illegible] سر ضیاء الدین امیدوار تھے۔ شوکت صاحب سر ضیاء الدین اور ان کی سیاست کے سخت مخالف تھے۔ [illegible] قیمت پر بھی ان کی تائید حمایت نہیں کر سکتے تھے۔ دلی کے [illegible] قیام میں — سر سکندر [illegible] کے بعد جس کا میں تذکرہ کر چکا ہوں میں نے دیکھا ایک روز صبح صبح ڈاکٹر صاحب شوکت صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے۔ میں نے اطلاع کی ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ فرمایا بلا لاؤ۔ وہ ناشتے پر بیٹھ چکے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی شریک کر لیا۔ ناشتے کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی "کنویسنگ" شروع کر دی۔ شوکت صاحب سب کچھ سنتے رہے۔ پھر بے جھجک کہہ دیا

"نہیں بھائی یہ نہیں ہو سکتا ہے۔ اسماعیل خاں کو ووٹ دوں گا۔"

ڈاکٹر صاحب کی پشت پناہی حکومت ہند کر رہی تھی۔ سر اکبر حیدری، حیدرآباد کے ممبران کورٹ کو اپنے ساتھ لے کر علی گڑھ ڈاکٹر صاحب کی تائید کرنے پہنچے۔ نواب رامپور بھی ڈاکٹر صاحب کے حامی تھے۔ شوکت صاحب کے لیے یہ بڑا نازک موقع تھا۔ اگر اپنی رائے پر قائم رہتے ہیں تو حیدرآباد کا پنشن جاتی ہے۔ اور نواب [illegible] سے تعلقات مزید تلخ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس امتحان سے وہ کامیابی سے گزر گئے۔ [illegible] نے نہ صرف ڈاکٹر صاحب کی مخالفت کی بلکہ کورٹ کے بھرے اجلاس میں سر اکبر حیدری اور نواب صاحب رامپور پر سخت نکتہ چینی کی کہ یہ لوگ مسلمانوں کی آزاد تعلیم گاہ پر اپنے سرکاری عہدے یا زر [illegible] کی وجہ سے [illegible] کے انتخابات پر [illegible] کی مداخلت کرتے ہیں۔ [illegible] طرح کا پبلک بیان شائع کیا۔

اور سر اکبر حیدری کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ [illegible] نظام اور [illegible] نے مجھے بلوا کر لکھایا۔ اور پبلک بیان سے زیادہ سخت الفاظ میں سر اکبر حیدر [illegible] اور ڈاکٹر صاحب کی نا اہلیت پر اظہار خیال کیا۔ کاش میں نے اس خط کی نقل

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ سے پہلے دوسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے کافی عرصے بعد لندن میں جوائنٹ سلیکٹ پارلیمنٹری کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ہندو مسلم مندوب مدعو کیے گئے۔ مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے حکومت برطانیہ نے جن لوگوں کو مدعو کیا ان میں حسین شہید سہروردی بھی تھے۔

سہروردی صاحب ہمیشہ سے شوکت صاحب کے چہیتوں کی فہرست میں داخل تھے۔ نہرو رپورٹ کے سلسلے میں خلافت اور کانگرس کے مابین نہ صرف مکمل ترک تعلق ہو چکا تھا بلکہ سخت و شدید مخالفت بھی شروع ہو چکی تھی۔ دسمبر ۱۹۲۸ء میں کانگرس کا سالانہ جلسہ کلکتہ میں ہوا جس کے روح رواں سوبھاش چندر بوس تھے۔ صدر اجلاس پنڈت موتی لال نہرو منتخب ہوئے تھے۔

اس وقت تک مسلم لیگ بھی نہرو رپورٹ کی اگر حامی نہیں تو مخالف بھی نہیں تھی۔ البرٹ ہال میں اس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ صدارت کے لیے قرعۂ فال مہاراجہ محمود آباد کے نام پڑا تھا۔ نیشنل کنونشن کا اجلاس ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ اس کے کرتا دھرتا بھی بوس اور گپتا تھے۔ کنونشن کا مقصد نہرو رپورٹ کی توثیق تھی۔ کانگرسی، مہا سبھائی، لبرل، سارے ہندو نہرو رپورٹ کے موید تھے۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کی پوری جماعت جس میں خلیق الزمان، رفیع احمد قدوائی، ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر سید محمود، عبدالمجید خواجہ، تصدق احمد خاں شروانی، ڈاکٹر کچلو، مولانا ظفر علی خاں، اور ڈاکٹر عالم وغیرہ سب نہرو کے ہم نوا اور گاندھی کے رفیق اور کانگرس کے ساتھ تھے۔ اس موقع پر سہروردی صاحب نے خلافت کا سالانہ اجلاس —— جس کے صدر منتخب مولانا محمد علی تھے —— کلکتہ میں منعقد کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے دن رات ایک کر کے ہالیڈے پارک میں —— جو بعد میں محمد علی پارک سے موسوم ہوا —— ایسے شاندار پیمانے پر خلافت کا اجلاس منعقد کیا کہ سارے مسلمان اسی میں سمٹ آئے۔ علی برادران کی شخصیت اور سہروردی کی ہمت نے نیشنلسٹ مسلمانوں کے اثر و نفوذ کا طلسم باطل کر دیا۔ میں ندوۃ العلماء میں پڑھتا تھا۔ لیکن قومیات سے دلچسپی رکھتا تھا۔ اس تو می میلے کی سیر کے لیے اپنے دو منچلے دوستوں حبیب احمد عثمانی اور مطلوب الرحمٰن نگرامی کے ساتھ کلکتہ جا پہنچا تھا۔ یہ سارے واقعات میرے چشم دید ہیں۔ داستان طویل ہے تفصیل کا موقع نہیں۔ مختصر یہ کہ اجلاس کامیاب ہوا۔ سارے ہندوستان میں دھوم مچ گئی اور مسلمانوں نے من حیث القوم نہرو رپورٹ کو مسترد کر دیا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اسی زمانے میں اور اسی موقع پر کہا تھا

کلکتہ کے افق میں کچھ ایسا ہوا غزب
ان دونوں بھائیوں کا ستارا کہ ہائے ہائے

لیکن صورت حال بالکل برعکس تھی۔ تنہا خلافت کمیٹی نے ہندو امپیریلزم اور مسلم نیشنلزم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئی، اور بالآخر ۱۹۲۹ء کے اجلاس لاہور میں کانگرس کو یہ رپورٹ "زائدالمیعاد" قرار دے کر واپس لینی پڑی۔

سہروردی صاحب کے ان خدمات کا شوکت صاحب پر بہت گہرا اثر تھا۔ وہ لندن جانے کے لیے بمبئی آئے اور خلافت ہاؤس میں ٹھہرے۔ خلافت کی مالی حالت بے حد سقیم تھی۔ اس معزز مہمان کو بھی تقریباً ہفتہ بھر دال روٹی پر گزارا کرنا پڑا۔

سامنے مہمان کے جو تھا ماحضر رکھ دیا

چلتے وقت سہروردی صاحب نے خلافت فنڈ کے لیے ایک نوٹ شوکت صاحب کو دیا۔ یاد نہیں کتنے کا تھا۔ شوکت صاحب
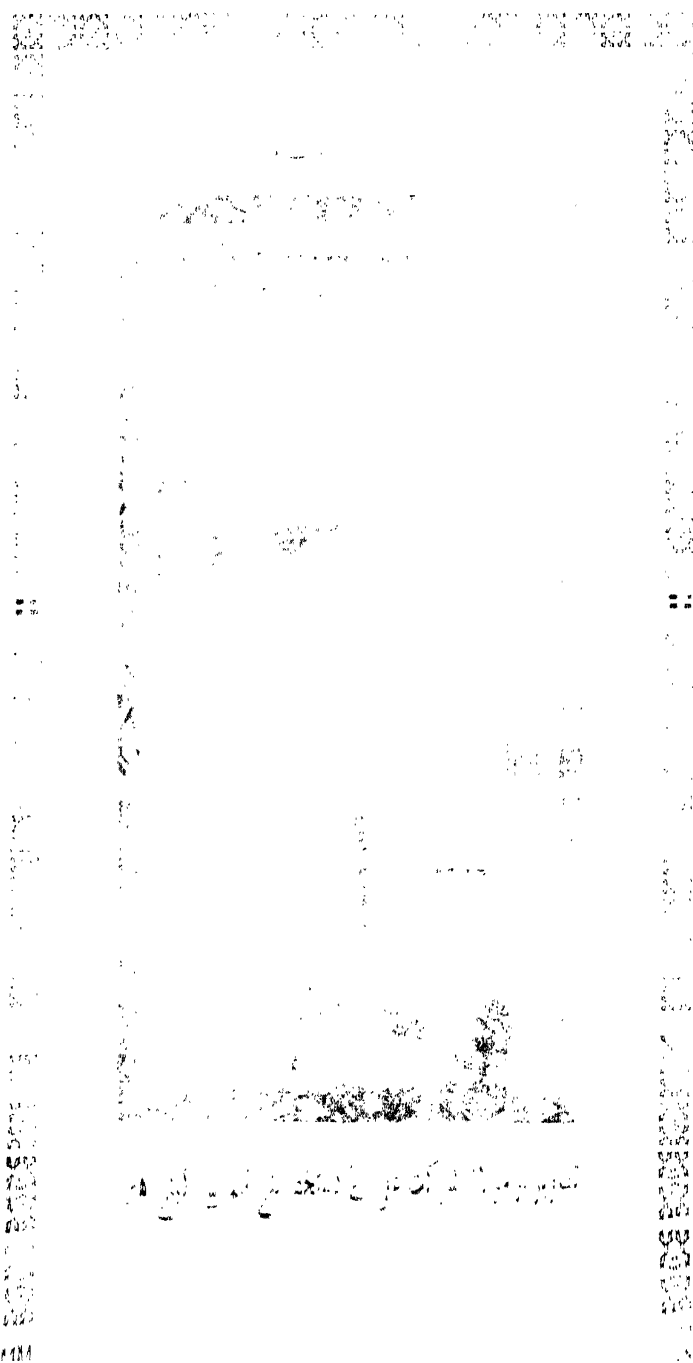
وہ نوٹ لے کر بالاخانے کی کھڑکی میں جا کھڑے ہوئے۔ نیچے مولانا عرفان بیٹھے تھے۔ نوٹ لہراتے ہوئے انہوں نے فرمایا

"عرفان یہ دیکھیے!"

نوٹ کی ایک جھلک دکھائی اور ان کی طرف پھینک دیا۔ پھر بڑے محبت بھرے لہجہ میں کہا

"یہ ہمدردی کا چندہ ہے۔"

انہوں نے قومی کام کے لیے جب کوئی مدد ملتی تھی خواہ وہ کتنی ہی حقیر ہو۔ وفورِ مسرت سے ان کے بند قبا ٹوٹنے لگتے تھے۔ یہی کیفیت اس موقع پر ہوئی۔

نہرو رپورٹ کا ذکر آ گیا ہے تو مختصر سی داستان اس کی بھی سن لیجیے۔ لارڈ برکن ہیڈ نے —— جنہیں مولانا محمد علی "بروکن ہیڈ" لکھا کرتے تھے —— طعنہ دیا کہ ہندوستانی ایک متفقہ دستور تو بنا نہیں سکتے آزادی کیا لیں گے؟

اس چیلنج کا جواب دینے کے لیے کانگرس نے نہرو کمیٹی کی تشکیل کی جس کے مسلمان ممبر شوکت صاحب کے اصرار سے شعیب قریشی رکھے گئے۔ شعیب قریشی ایک زمانے میں گاندھی جی کے اتنے چہیتے تھے کہ جب وہ جیل گئے تو اپنے اخبار "ینگ انڈیا" کی ایڈیٹری شعیب صاحب کو سونپ گئے۔ مگر اب ان سے خفا تھے۔ ان کا خیال تھا شعیب متعصب مسلمان ہیں۔ لیکن مولانا شوکت کے خلاف بھی نہیں جا سکتے تھے۔ شعیب کو رکھنا پڑا۔ شعیب صاحب کے موتی لال اور جواہر لال سے بڑے گہرے اور عزیزانہ و برادرانہ تعلقات تھے لیکن ان کا نیشنلزم مسلم مفاد سے دست بردار ہونے کو تیار نہ تھا۔ انہوں نے چاہا کہ نہرو رپورٹ مسلمانوں کے کم از کم وہ مطالبات منظور کرے جو گزشتہ سال کے مدراس کانگرس سیشن میں آل انڈیا کانگرس منظور کر چکی تھی۔ یعنی سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے جداگانہ صوبے کی حیثیت سے قیام، سرحد کو چیف کمشنر کا صوبہ بنے رہنے دینے کے بجائے گورنر کا صوبہ بنایا جائے۔ اور وہاں مجلس آئین ساز قائم کی جائے۔ مرکزی مجلس آئین ساز میں مسلمانوں کی نشستیں ۳۳ فی صدی ہوں۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی عددی اکثریت کا تحفظ اس طرح کیا جائے کہ تناسب آبادی کے اعتبار سے ان کی نشستیں محفوظ کر دی جائیں۔ پھر جداگانہ کے بجائے مخلوط انتخاب رائج کر دیا جائے۔ مگر موتی لال نے یہ ساری تجویزیں مسترد کر دیں۔ ان کا دعویٰ تھا کہ سندھ خود کفیل صوبہ نہیں بن سکتا۔ سرحد میں بھی صوبائی خود مختاری چلانے کی صلاحیت نہیں پیدا ہوئی۔ مسلمان ہندوستان میں ۲۵ فی صد ہیں انہیں ۳۳ فی صد نشستیں نہیں دی جا سکتیں۔ پنجاب و بنگال میں مخلوط انتخاب ہوگا۔ لیکن مسلمانوں کی نشستیں محفوظ نہیں کی جا سکتیں۔ کیونکہ یہ بات نیشنلزم کے خلاف ہے۔ شعیب صاحب نے احتجاج اور اختلاف کیا۔ اور کہا پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت اتنی کم ہے اور وہ سیاسی اعتبار سے اتنے پسماندہ ہیں، اور وہاں کی تمام سرکاری اسامیوں، صنعتوں اور کاروبار پر ہندو اور سکھ اس طرح قابض ہیں کہ بڑی آسانی سے چھوٹی سی مسلم اکثریت کو مخلوط انتخاب کی صورت میں بے دریغ روپیہ صرف کر کے اقلیت میں تبدیل کر دیں گے۔ موتی لال نے ایک نہ سنی اور جب دیکھا کہ شعیب کسی طرح رام نہیں ہوتے تو اپنے اختیارات خصوصی سے کام لے کر خلیق الزماں کو نہرو کمیٹی کا ممبر بنا لیا۔ رپورٹ پر شعیب نے احتجاجی نوٹ لکھا۔ موتی لال نے اسے بھی شائع نہیں کیا۔ خلیق صاحب نے تائید کے دستخط ثبت کر دیے۔

اگست ۱۹۲۸ء میں لکھنؤ کی قیصر باغ بارہ دری میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا [illegible]

منعقد ہوا۔ جس میں تمام سیاسی پارٹیاں مدعو تھیں۔ مولانا محمد علی علاج کے سلسلے میں یورپ گئے ہوئے تھے۔ شوکت صاحب شریک اجلاس ہوئے۔ لوگوں کا خیال تھا شوکت صاحب محمد علی کے بغیر کچھ نہیں ہیں۔ نہ ان کے پاس دماغ ہے نہ زبان، نہ قلم۔ یہ ساری چیزیں جس کے پاس ہیں وہ رنجوری تن کا علاج کرنے جرمنی گیا ہوا ہے۔ لہذا پالا مار لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ ادھر مولانا آزاد نے پنجاب کے مندوبین ڈاکٹر عالم وغیرہ کو توڑ لیا۔ یہ سب ہی نہرو رپورٹ کے ایک بات میں حامی بن گئے۔ پنجاب کی اس روش کے بعد شوکت صاحب کی پوزیشن بڑی نازک ہو گئی۔ لیکن انہوں نے سوچا اگر وہ محمد علی کا انتظار کرتے ہیں اور پنجاب و بنگال کی حقیر مسلم اقلیت کو ہندو سیاست کا محکوم اور دست نگر کر دیتے ہیں تو بہت بڑے قومی جرم کے مرتکب ہوں گے۔

آل پارٹیز کانفرنس کا ایوان اطراف و اکناف ہند کی سیاسی پارٹیوں کے مندوبین سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کانگرس کو ندوۃ العلماء کے طلبا رضاکار کی صورت میں ہمیشہ بڑی آسانی سے دستیاب ہو جاتے تھے۔ اس مرتبہ بھی ندوی طلبہ کی ایک جماعت رضاکار کی حیثیت سے مصروف خدمت تھی۔ میری ڈیوٹی ڈائس پر زعمائے کرام کو پانی پلانے کی تھی۔

کرسی صدارت پر ڈاکٹر انصاری متمکن تھے۔ ایک طرف مہاراجہ محمود آباد دوسری جانب پنڈت مالوی، بعد کی کرسیوں پر موتی لال، جواہر لال۔ بپن چندر پال۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی۔ سوبھاش چندر بوس، جے۔ ایم سین گپتا، سر تیج بہادر سپرو، مسز اینی بسنت، مسز سروجنی نائیڈو، [illegible] نواب علی، مسٹر محمد علی کریم چھاگلہ ——— جو ابھی حال میں حکومت ہند کے وزیر تعلیم بنے ہیں ——— اور دوسرے اکابر موجود تھے

سب سے پہلے پنڈت نہرو کے "شکریہ" کی تجویز پیش ہوئی۔ یہ رسمی سی تجویز تھی اس کے بعد اس رپورٹ پر بحث و گفتگو ہوئی تھی۔

نہرو رپورٹ پر بحث و گفتگو کے دوران میں ڈاکٹر عالم نے مندوبین پنجاب کی طرف سے غیر مشروط [illegible] اور نہرو رپورٹ کو منظور کر لینے کا اعلان کیا۔ اب خلافت کمیٹی کی طرف سے مولانا شوکت علی کی باری آئی۔ مولانا کی نشست جے۔ ایم سین گپتا اور سوبھاش چندر بوس کے بیچ میں تھی۔ مولانا کیا کہنے والے ہیں ان دونوں نے بھانپ لیا تھا۔ یہ منظر بھلائے نہیں بھولتا کہ بوس اور گپتا ہاتھ جوڑ جوڑ کر مولانا سے مخالفت نہ کرنے کی استدعا کر رہے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے آپ نے مخالفت کی تو سارا کھیل بگڑ جائے گا مولانا نے بپھرے ہوئے لہجے میں جواب دیا

"میں مسلمانوں کو بیچ نہیں سکتا"۔

مولانا ہمالہ کی عظمت، اور ہمالہ کا جسم لیے ہوئے اسٹیج پر تشریف لائے۔ وہ آئے تو حاضرین نے دیر تک مسلسل چیئرز سے ان کا خیر مقدم کیا۔ سب کو یقین تھا کہ وہ تائید کرنے آئے ہیں۔ لیکن انہوں نے نہ صرف مخالفت کی بلکہ اعلان جنگ کر دیا کہ مسلمان کبھی اور کسی حالت میں اسے قبول نہیں کر سکتے۔ جب تک سندھ اور سرحد کو مستقل صوبہ نہ بنا لیا جائے۔ اور پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی عددی اکثریت کا تحفظ نہ کیا جائے۔

ڈاکٹر عالم کھڑے ہوئے اور انہوں نے مولانا کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا

"مولانا پنجاب کے نمائندے رپورٹ منظور کر چکے ہیں"۔

مولانا نے انہیں ایسا ڈانٹا کہ ان کی سٹی گم ہو گئی۔ انہوں نے کہا

"تم پنجاب نہیں ہو، تم مسلمانان پنجاب کے نمائندے نہیں ہو۔ تم پنجاب کے مسلمانوں کو فروخت کرنے کا حق نہیں رکھتے اور اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو تو چلو میرے ساتھ پنجاب کا دورہ کرو۔ پھر تمہیں معلوم ہو جائے گا پنجاب کس کے ساتھ ہے؟

ڈاکٹر عالم بتاشے کی طرح بیٹھ گئے۔

اس کے بعد مولانا نے خلافت میں ایک سلسلہ مضامین لکھا جس کا آغاز اس شعر سے کیا

کس کس طرح ستاتے ہیں یہ بت ہمیں نظام
ہم ایسے ہیں کہ جیسے کسی کا خدا نہ ہو

اور پھر نہرو رپورٹ کی اور اس کے حامیوں کی دھجیاں بکھیر دیں۔

مولانا کے ان مضامین کا جواب مولانا ابوالکلام آزاد نے "زمیندار" کے کئی نمبروں میں دیا۔ اور خطابت وانشاء، طنز و تعریض، فصاحت و بلاغت، اور تشبیہات و استعارات کی پوری ہنرمندی کے ساتھ دیا۔ ڈاکٹر انصاری جو ہندوستان کے بہترین سرجن تھے، انہوں نے بھی قلم اٹھایا اور اس سے نشتر کا کام لیا۔ تصدق احمد خاں شیروانی، خلیق الزمان، ڈاکٹر محمود نے قلم کی سنانیں اور زبان کی تلواریں سنبھالیں۔ شوکت صاحب کے جو ساتھی اور دوست تھے، مولانا محمد علی کے انتظار میں وہ بھی خاموش تھے۔ جو مخالف اور معاند تھے وہ مدت کے اس ناقابل تسخیر قلعہ پر تسلسل اور تواتر کے ساتھ گولہ باری کر رہے تھے۔ لیکن کوئی بھی اس قلعہ کو سر نہ کر سکا۔

پھر شوکت صاحب نے ملک گیر دورہ کیا اور رائے عامہ کو بڑی حد تک اپنا موافق بنا لیا۔ اور دوست دشمن سب نے اعتراف کر لیا کہ وہ حقیقی معنی میں Big Brother ہیں۔ محمد علی کے بغیر بھی وہ بہت کچھ ہیں۔ ان کی قوت تنظیم اور ان کا جذبۂ اخلاص، ابوالکلام کی خطابت، ظفر علی خاں کی شاعری، ڈاکٹر انصاری کی قلم کاری ——— اور محمد علی کی کمی پر جو بہت بری طرح محسوس ہو رہی تھی غالب آ گیا۔

لکھنؤ سے مولانا شوکت علی جب بمبئی پہنچے تو سر کاوس جی جہانگیر ہال میں ایک جلسہ نہرو رپورٹ کی حمایت میں منعقد ہوا۔ مولانا نے یہاں بھی زبردست مخالفت کی۔ اس جلسہ میں مسلمان خال خال اور ہندو زیادہ تھے۔ ایک ہندو نے جوش سے بے قابو ہو کر مولانا کے منہ پر تھوک دیا۔ مولانا نے اس سے کوئی انتقام نہیں لیا۔ لیکن بمبئی کے مسلمانوں میں آگ لگ گئی۔ وہ اپنے اس چہیتے زعیم کی جو ہر آڑے وقت میں ان کے کام آتا رہا تھا توہین نہیں برداشت کر سکتے تھے۔ ہر ہر محلے میں جلسے ہوئے اور نہرو رپورٹ بمبئی کے مسلمانوں نے یکسر مسترد کر دی۔ یہی دوسرے شہروں میں بھی ہوا۔

گاندھی جی فخریہ کئی مرتبہ "ینگ انڈیا" میں کہہ چکے تھے، اور پبلک جلسوں میں کہہ چکے تھے مولانا شوکت علی کی لمبی چوڑی جیب میرا مسکن ہے۔

ایک دفعہ مولانا بمبئی سے لکھنؤ جا رہے تھے۔ اسی گاڑی میں گاندھی جی بھی بھوپال جا رہے تھے۔ ٹرین ایک تھی کمپارٹمنٹ الگ الگ تھے۔ گاندھی جی کو جب معلوم ہوا کہ شوکت صاحب بھی اسی ٹرین سے جا رہے ہیں تو ایک سٹیشن پر وہ شوکت صاحب کے

کمپ رُمنٹ میں آئے۔ اس طرح آئے جیسے کوئی مخالفت ہی نہیں تھی۔ باتیں کرتے کرتے انہوں نے مولانا شوکت علی کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ کچھ روپے نکلے۔ وہ انہوں نے نکال لیے اور کہا

"آپ کی جیب میں میرے سوا کچھ اور نہ ہونا چاہیے۔ آخر آپ نے کیوں مجھے اپنی جیب سے نکال پھینکا ہے؟"

مولانا نے جواب دیا "میں نے نہیں نکالا آپ تو نکل بھاگے۔"

گاندھی جی بڑی دیر تک شوکت صاحب کو رام کرنے کی کوشش کرتے رہے لیکن وہ مرد زیرک اس دام میں نہ آیا

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ
کہ عنقا را بلند است آشیانہ

خلافت اردو کا پہلا روزنامہ تھا جس نے ۱۹۲۰ء میں خاص طور پر ایسے معلوماتی مقالات کا سلسلہ معقول معاوضہ دے کر شروع کیا جس کا رواج اردو صحافت میں بالکل نہیں تھا۔

ہمارے ایک سابق خلافتی کارکن عبدالباری ساقی بمبئی آئے ہوئے تھے۔ وہ تلاش معاش میں سرگرداں تھے۔ یہ نہرو رپورٹ کے زمانے میں خلافت سے لٹ کر پروفیسر عبدالباری کے زیر اثر کانگرس میں شریک ہو گئے تھے۔ کلکتہ جاتے ہوئے جب مولانا محمد علی نے پٹنہ کے ایک خلافتی اجتماع میں تقریر کی تو پروفیسر باری اور عبدالباری ساقی نے علی برادران کی سیاست اور خلافت کی روش پر کچھ لایعنی اعتراضات کیے جس پر مولانا محمد علی نے کہا "ہماں یہ تماشہ دیکھنے میں آ رہا ہے کہ" باری باری سے جھوٹ بولا جاتا ہے۔" یہ فقرہ بڑا ہی مقبول ہوا اور کئی روز تک اخبارات کا عنوان بن گئی۔ بہرحال عبدالباری ساقی کو بمبئی میں خلافت ہاؤس کے سوا کہیں پناہ نہ ملی۔ میں نے ان سے سیاسی مضامین لکھوائے اور معاوضہ دیا۔ یہ سب باتیں مولانا شوکت علی کے علم میں تھیں لیکن انہوں نے ایک آشفتہ روزگار باغی اور خود غرض قومی کارکن کی مدد کیے جانے پر بعض لوگوں کے اعتراض کے باوجود کوئی دخل نہیں دیا۔ نہ مجھے روکا۔ بعد میں ساقی صاحب پھر بھٹک گئے جس پر مجھے ایک مفصل مقالہ لکھنا پڑا جس کا عنوان تھا "ساقی نامہ"۔

شوکت صاحب نماز پابندی سے پڑھتے تھے۔ خلافت ہاؤس میں مغرب کی نماز باجماعت کا خاص اہتمام کرتے تھے۔ جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ غیر معمولی موٹاپے کی وجہ سے رکوع و سجود ممکن نہ تھا۔ بیٹھ کر پڑھتے تھے۔ رکوع و سجود گردن کی حرکت سے کرتے تھے۔ جمعہ کی نماز بالالتزام بائیکلہ کی مسجد میں پڑھتے تھے۔ ایک مرتبہ شدید بارش ہو رہی تھی۔ کار موجود نہ تھی، یا کار میں کوئی خرابی تھی۔ موسلا دھار بارش میں بھیگتے ہوئے خلافت ہاؤس سے بائیکلہ مسجد تک پا پیادہ تشریف لے گئے۔

نماز کے لیے وہ مصلے کے بھی قائل نہ تھے۔ کرسی پر بیٹھے بیٹھے پڑھ لیتے تھے۔ کار میں کہیں جا رہے ہوتے اور دیکھتے کہ نماز قضا ہوئی جا رہی ہے۔ وہیں ڈرائیور کے پاس ——— وہ ہمیشہ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے ——— بیٹھے بیٹھے نیت باندھی اور نماز شروع کر دی۔ جب ذہنی طور پر بہت پریشان ہوتے تو کبھی کبھی نماز دو ایک دن تک بالکل نہ پڑھتے اور صاف کہہ دیتے آج کل میرا نماز میں بھی جی نہیں لگتا ہے۔

دو دلوں کے جوڑنے میں شوکت صاحب بڑے شوق سے حصہ لیتے تھے۔ شہزادی در شہوار اور نیلوفر کی شادی انہی نے اعظم جاہ اور معظم جاہ سے کرائی تھی۔ ایک دوسری ترک شہزادی سمی کی شادی بھی انہوں نے راجہ ساجد حسین تعلقہ دار

کوشش کر رہی تھی۔ نواب پٹوڈی جب نواب صاحب بھوپال کی صاحبزادی پر ——— جو اب اپنے باپ کی جانشین ہیں ——— فریفتہ ہوئے تو انہوں نے کوشش کی نواب صاحب بھوپال انہیں داماد بنالیں۔ مگر نواب صاحب کسی طرح اس پر تیار نہیں تھے۔ نواب بھوپال کا جتنا انکار بڑھ رہا تھا اتنا ہی نواب صاحب پٹوڈی کے عشق میں اضافہ ہو رہا تھا۔ گتھی کسی طرح سلجھتی نظر نہیں آتی تھی۔ آخر ان کی نظر شوکت صاحب پر گئی کہ اسی در سے گوہر مقصود حاصل ہو سکتا ہے۔ وہ بمبئی آئے اور تاج محل ہوٹل میں ٹھہرے۔ حالت یہ تھی کہ رات کو چلے آرہے ہیں منہ اندھیرے۔

علی الصباح چو مردم بکاروبار روند
بلاکشان محبت بہ کوئے یار روند

فجر کے وقت خلافت ہاؤس میں موجود۔ شوکت صاحب کو ترس آگیا۔ وہ بیچ میں پڑے۔ نواب صاحب بھوپال ان کا اپنے بزرگوں کی طرح ادب کرتے تھے۔ آخر انہیں شوکت صاحب کی سفارش ماننی پڑی۔ شادی ہو گئی ——— حوریاں رقص کناں ساغر مستانہ زدند۔

مولانا شوکت علی بوڑھے تھے۔ ذیابیطس کے مریض تھے۔ ضرورت سے زیادہ موٹے تھے۔ لیکن تھکنا نہیں جانتے تھے۔ دن ہو یا رات۔ دوپہر ہو یا شام۔ ریل ہو یا لاری۔ یکہ ہو یا تانگہ۔ سہری ہو یا چٹائی، قورما اور شیرمال ہو یا باسی دال اور سوکھی روٹی، جیب نوٹوں سے بھری ہو یا ایک جھنجھی کوڑی بھی نہ ہو۔ وہ ہر حال میں مگن رہتے تھے۔ ہمہ وقت مصروف عمل، سراپا جدوجہد، تمام تر جوش کردار۔ اپنے بزرگوں سے بھی یہی توقع رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ دورے پر گئے۔ وہاں سے ایک خط ایڈیٹر خلافت کو لکھا۔ صرف ایک سطر تھی اور تین لفظ

"کام، کام، کام۔"

ایک مرتبہ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے علی برادران کو دریاباد آکر آم کھانے کی دعوت دی۔ دعوت قبول کر لی گئی۔ عین وقت پر کسی وجہ سے مولانا محمد علی نہ جا سکے۔ لیکن شوکت صاحب پہنچے اور آم بھی کھائے۔ دریاباد اور اودھ کے دوسرے شہروں سے چندہ بھی وصول کیا۔ اور تنظیم خلافت پر بھی توجہ کی۔ واپسی پر ایک دلچسپ مضمون خلافت میں لکھا جس کا عنوان تھا

"آم، کام، دام۔"

مسلمانوں کی غلامی اور بے بسی شوکت صاحب کے دل پر داغ تھی۔ اور یہ داغ کرمک شب تاب کی طرح چمکتا رہتا تھا۔ ایک آزاد ملک ——— افغانستان ——— کا فرماں روا امان اللہ خاں ہندوستان کے دورے پر آیا۔ بمبئی بھی پہنچا۔ مسلمانان بمبئی نے عظیم الشان استقبال کیا۔ شوکت صاحب نے مسلمانان شہر کی طرف سے سپاس نامہ پیش کیا جب وہ اس جملے پر پہنچے:

"ما مسلمانان ہند غلام ہستیم، بجز تو اے امان اللہ ہیچ وسیلہ نداریم۔"

تو ان کی آواز بھرا گئی۔ امان اللہ خاں اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً اٹھ کر شوکت صاحب کے رخسار پر بوسہ دیا اور کہا

"لا تقنطوا من رحمۃ اللہ۔"

دونوں نے ایک دوسرے کو سمجھ لیا تھا۔

پھر بچہ سقہ کی بغاوت کے بعد جب امان اللہ خاں تخت خلافت سے دست بردار ہو کر وطن سے رخصت ہوئے، اور جنرل نادر خاں —— موجودہ شاہ افغانستان کے والد —— بچہ سقہ کو شکست دینے کے لیے جرمنی سے جہاں وہ سفیر تھے، ہندوستان آئے تو مولانا شوکت علی نے ان کی ہر طرح سے مدد کی۔ انہیں خلافت ہاؤس میں ٹھہرایا اور ان کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کر دیے جس کی یاد بادشاہ ہونے کے بعد بھی ممنونیت کے ساتھ نادر شاہ کے دل میں قائم رہی۔

شوکت صاحب کی ایک عجیب اور بہت بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ بڑے سے بڑے دشمن کو بھی اگر ندامت جھکا کر سامنے آئے تو معاف کر دیتے تھے۔

روزنامہ ہلال کے ایڈیٹر حافظ علی بہادر خاں بڑی خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ بے انتہا قابل، اردو اور انگریزی لکھنے اور بولنے پر یکساں قدرت۔ کئی مرتبہ خلافت اور کانگریس کی تحریک میں جیل بھی گئے۔ شوکت صاحب نے انہیں کلیجہ سے لگا کر رکھا۔ لیکن بعد کو بعض سنگین الزامات کے ماتحت انہیں الگ کرنا پڑا۔ انہوں نے اپنا اخبار نکال لیا اور زور شور سے شوکت صاحب کی اور مجلس خلافت کی مخالفت شروع کر دی۔ یہ مخالفت گھٹیا قسم کی تھی۔ اصولی بالکل نہیں تھی۔ سراسر ذاتی تھی۔ رکیک اور فحش حملے ہر روز کیا کرتے تھے۔ میں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے خلافت میں دیتا تھا۔ لیکن شوکت صاحب نے کبھی جواب نہیں دیا۔ وہ اس جنگ میں حصہ لینا اپنی شان سے فروتر سمجھتے تھے۔

حافظ صاحب نے اخبار کو جس ڈھنگ سے چلایا، وہ خود ان کی علمیت اور قابلیت کے شایان شان نہ تھا۔ ایسی سنسنی خیز خبریں شائع کرتے تھے جن کی سرخی پڑھ کر لوگ اخبار پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ لیکن وہ خبریں صرف ذہن و دماغ کی اختراع ہوتی تھیں حقیقت اور واقعہ سے انہیں دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا تھا۔

حافظ صاحب کی آمدنی اخبار سے بہت کافی تھی۔ لیکن خرچ اس سے کہیں زیادہ تھا۔ یہ خرچ پورا کرنے کے لیے وہ طرح طرح کی حرکتیں کیا کرتے تھے۔ چندولال شاہ نے ایک فلم بنائی "ستمگر"۔ ہیرو کا نام تھا "جبار"۔ حافظ صاحب نے مورچہ قائم کر دیا کہ مسلمانو دوڑو۔ چندولال نے خدا کی توہین کی ہے۔ جبار خدا کا نام ہے، اور اس فلم میں اسے "ستمگر" دکھایا ہے۔ ایک ہنگامۂ رستخیز برپا ہو گیا۔ یہ طوفان اس وقت تھا جب چندولال کی جیب ہلکی اور حافظ صاحب کی جیب بھاری ہو گئی۔

جدن بائی نے اپنی پہلی فلم "تلاش حق" بنائی۔ "ہلال" کو اشتہار نہیں دیا۔ حالانکہ حافظ صاحب کو ہر روز ایک صفحے کے اشتہار کی توقع تھی۔ مایوسی کے عالم میں انہوں نے فلم پر ریویو کرتے ہوئے لکھا۔ جدن بائی جب گاتی ہیں تو ان کے حلق کا کوا لٹکتا ہوا نظر آتا ہے جس سے طبیعت میں تنغص پیدا ہوتا ہے۔ خیر کچھ مذہبی —— بے بنیاد —— اعتراض سے کیے۔ بے چاری کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔ یہ محاذ اس وقت سر ہوا جب "ہلال" کے لیے ضمنی "بجٹ" انہوں نے منظور کر لیا۔

عبدالرحمٰن کابلی نے ایک فلم "امیرزادی" بنائی۔ حافظ نے پہلے صفحے پر جلی سرخیوں کے ساتھ بھرپور حملہ کیا کہ مسلمان "امیر" حضرت علی کو کہتے ہیں۔ امیرزادی کا مطلب ہوا حضرت علیؓ کی صاحبزادی۔ مسلمانوں جہاد کے لیے تیار ہو جاؤ۔ کابلی صاحب کابلی ہونے کے باوجود ایسے سہمے کہ حواس باختہ ہو گئے۔ جان اسی وقت چھٹی جب نذرانہ پیش کر دیا۔

ایسٹ انڈیا فلم کمپنی نے ایک فلم "درۂ خیبر" بنائی۔ اس کے ڈائریکٹر مسٹر ر... اور مرحوم کیریکٹر ایکٹر گل حمید تھے۔ حافظ صاحب نے پٹھانوں کو ——— جن کی تعداد بمبئی میں بہت زیادہ تھی ——— اکسایا کہ لو درۂ خیبر بھی ہاتھ سے گیا۔ یہ فلم گلوب سینما میں چل رہی تھی۔ بارہ بجے رات کو خلافت ہاؤس میں فون آیا کئی ہزار پٹھانوں نے سینما کو گھیر لیا ہے اور آگ لگانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ پولیس بھی بھاری تعداد میں آگئی ہے۔ گولی چل جانے کا اندیشہ ہے۔ میں نے فوراً ڈرائیور کو جگایا اور کار سے کر موقعۂ واردات پر پہنچا۔ اس سے قبل یہ فلم میں دیکھ چکا تھا۔ اس میں قطعاً کوئی قابلِ اعتراض بات نہ تھی۔ میں نے ہجوم کے سامنے ایک تقریر کی اور کہا اس فلم میں کوئی ایسی بات نہیں جو قابلِ اعتراض ہو۔ چند آدمی جن پر آپ حضرات کو اعتماد ہو میرے ساتھ فلم دیکھ لیں۔ انہوں نے اگر کوئی بات قابلِ اعتراض بتائی تو فوراً کاٹ دی جائے گی۔"

بپھرے ہوئے مجمع کی سمجھ میں بات آگئی۔ مجمع کے چند لیڈر فلم دیکھنے پر آمادہ ہوگئے۔ فلم دیکھ کر خوش خوش واپس آئے۔ اور سب کو مطمئن کر دیا۔ پٹھان اتنے مشتعل تھے کہ جب تک یہ لوگ فلم دیکھ کر واپس نہیں آگئے۔ وہ اپنی جگہ چٹان کی طرح کھڑے رہے۔

بمبئی کے ایک بگڑے ہوئے رئیس کریمی پریس کے مالک تھے۔ یہ پریس کسی زمانے میں بمبئی کا نولکشور پریس تھا۔ بہت اچھی اور بہت زیادہ تعداد میں مذہبی اور اسلامی کتابیں اس نے چھاپی تھیں۔ کئی قسم کے قرآن بھی چھپے تھے۔ نئے وارث نے اس کی ساری آمدنی پریس پر خرچ کرنا شروع کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پریس کی آمدنی گھٹتے گھٹتے بحرے کراں سے جوئے کم آب ہو کر رہ گئی۔

کریمی پریس کا قاعدہ یہ تھا کہ دوران طباعت میں قرآن کریم کے جو فرمے خراب ہو جاتے تھے۔ وہ بھر میں باندھ کر غرق سمندر کر دیے جاتے تھے تاکہ بے حرمتی نہ ہو۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ نہ جانے کس وجہ سے وہ کنارے پر آ لگے۔ نہ جانے کس طرح یہ خبر حافظ صاحب کو پہنچی انہوں نے پہلے صفحے پر جلی قلم سے "قرآن کی توہین"، "مسلمانوں کی غیرت دینی اور حمیت مذہبی کا امتحان" کے عنوان سے ایک خبر چھاپی اور تفصیل کل کے لیے کریمی پریس کا نام لیے بغیر اٹھا رکھی۔

کریمی پریس کے مالک کو بھی یہ واقعہ معلوم ہوا۔ دوسرے دن ہلال میں یہ چمکتی ہوئی تلوار دیکھی تو حواس باختہ ہو گئے۔ ابھی حواس درست نہیں ہوئے تھے کہ ان سے دو ہزار کا مطالبہ ہوا ورنہ "تفصیل" شایع کرنے کی دھمکی۔ بچارے روتے ہوئے خلافت ہاؤس آئے۔ خلافت والوں سے کریمی پریس والوں کے دیرینہ تعلقات رہ چکے تھے۔ مولانا عرفان نے اطمینان دلایا اور تجویز پیش کی کہ انڈیا کافی ہاؤس میں حافظ صاحب کو بلاؤ اور نشان زدہ نوٹ دے دو۔ سادہ لباس میں پولیس موجود ہوگی فوراً دھر لیے جائیں گے۔ بات ان کی سمجھ میں آگئی۔ کہیں سے دو ہزار قرض لیے۔ اور اطلاع دے دی کہ کل انڈیا کافی ہاؤس میں تشریف لایئے اور روپے لے لیجیے۔ مگر خدا کے لیے تفصیل نہ شایع کیجیے۔ دوسرے روز کا اخبار اس ذکر سے خالی تھا۔ وقت مقررہ پر حافظ صاحب انڈیا کافی ہاؤس پہنچ گئے۔ ادھر انہوں نے نوٹ جیب میں رکھے، ادھر دھر لیے گئے۔ اب تو سٹی گم ہوگئی۔ لینے کے دینے پڑ گئے۔ ان کی سزا یابی استحصال بالجبر کے سلسلے میں یقینی تھی۔ نہ جانے کس کس کی سفارش سے رہا ہوئے، لیکن مقدمہ تیار تھا۔ آخر ایک روز رات کو دس بجے حافظ صاحب خلافت ہاؤس

آئے اور شوکت صاحب کے قدموں پر گر پڑے۔ شوکت صاحب ان کی تمام گستاخیاں اور بدزبانیاں بھول گئے۔ انہوں نے مولانا ظفر علی خاں کو فوراً طلب کیا اور ان سے کہہ کر کرچی پریس والوں کو آمادہ کر دیا کہ مقدمہ نہ کریں۔ لیکن ظفر علی خاں صاحب نے شرط یہ رکھی کہ تین روز تک مسلسل پہلے صفحے پر جلی قلم سے حافظ صاحب اپنی غلط بیانی کا اعتراف کرتے ہوئے معافی مانگیں۔ حافظ صاحب کو یہ شرط ماننی پڑی۔ معاملہ ختم ہو گیا۔

دل فتح کرنے میں شوکت صاحب کو کمال حاصل تھا۔

مولانا عبدالرزاق خاں ملیح آبادی ندوی، خدا ان کی مغفرت فرمائے۔ شوکت صاحب اور خلافت کمیٹی کے شدید مخالف تھے۔ ہر روز اخبار میں نہایت درشت اور غیر مہذب انداز میں کچھ نہ کچھ لکھا کرتے تھے۔ میں بھی خلافت میں ترکی بہ ترکی جواب دیا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ شوکت صاحب کلکتہ گئے۔ اور سیدھے ہند کے دفتر میں پہنچے۔ انہیں دیکھ کر مولانا ملیح آبادی ہکا بکا رہ گئے۔ شوکت صاحب نے ان سے معانقہ کیا۔ گلے سے لگایا اور ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔ فرمایا

"مجھے تم پر ترس آتا ہے۔ تم اپنا کاغذ ضائع کرتے ہو، قلم گھستے ہو۔ وقت صرف کرتے ہو، انرجی برباد کرتے ہو۔ کیوں؟ صرف مجھے برا بھلا کہنے کے لیے۔ ان تحریروں کی وجہ سے بہت سی کام کی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ لو میں تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ ایک گھنٹہ بیٹھوں گا۔ جتنی گالیاں چاہو دے لو۔ جب کلکتہ آؤں گا، تم گالیاں کھانے گھنٹہ دو گھنٹے کے لیے ضرور تمہارے پاس آجایا کروں گا۔"

مولانا ملیح آبادی بڑے جذباتی اور خالص پٹھان آدمی تھے۔ مولانا شوکت علی کو اتنی سخت مخالفت کے باوجود اپنے گھر آتا دیکھ وہ ویسے ہی ساری مخالفت بھول گئے تھے۔ ... شرم سے عرق انفعال میں غرق ہو گئے۔

پیچھے دو ٹوٹے ہوئے دل جڑ گئے۔ دوسرے دن ملیح آبادی صاحب نے کئی کالم کا مضمون مولانا شوکت علی کی مدح و توصیف میں پورے خلوص اور جوش محبت کے ساتھ لکھا۔ ساری لڑائی ختم ہو گئی۔

ایک طرف تو شوکت صاحب کی یہ حالت تھی۔ دوسری طرف اگر کوئی اپنی دولت و ثروت یا شخصیت کی وجہ سے تن جاتا تھا تو شوکت صاحب قضائے مبرم بن جایا کرتے تھے۔

بمبئی میں وقف ایکٹ نافذ ہوا۔ جس کی رو سے متولیان اوقاف کے لیے واجب تھا کہ ہر سال آڈٹ شدہ حساب حکومت کے سامنے پیش کریں۔ ملا طاہر سیف الدین بوہرہ فرقہ کے پیشوا نے اپنے آپ کو اس ذیل سے مستثنیٰ کرانے کی کوشش کی امام غیر مسئول ہوتا ہے، اور میرے فرقے کے لوگ سب مجھے امام مانتے ہیں۔ جب میں اپنے فرقہ کے سامنے جواب دہ نہیں ہوں تو حکومت کے سامنے کیونکر جواب دہ ہو سکتا ہوں؟

مولانا شوکت علی کے اگرچہ ملا صاحب سے کوئی خاص تعلقات نہیں تھے۔ نہ انہوں نے کبھی شوکت صاحب کی یا خلافت کی کوئی خاص مدد کی تھی۔ لیکن ملا صاحب کے اس اعتراض میں شوکت صاحب کو وزن نظر آیا۔ انہوں نے خلافت میں ایک نوٹ لکھا کہ جب حکومت عدم مداخلت فی الدین کی پالیسی پر عامل ہے اور بوہرے اپنے امام کو غیر مسئول سمجھتے ہیں تو

مخدومِ اسلام مولانا شوکت علی

بات شوکت صاحب سے نہ منوا سکا۔ اس کا کئی دن تک مجھ پر اثر رہا۔ دن کی بھوک اور رات کی نیند اڑ گئی۔ حالانکہ حماقت میری ہی تھی۔

ندوہ کے درجۂ اوّل میں میرے میزان منشعب کے ساتھی بھوپال کے عبدالقدوس بھی تھے —— جو اب قدوس صہبائی کے نام سے معروف ہیں اور پشاور میں مقیم ہیں —— کچھ دن ندوے میں تعلیم حاصل کر کے یہ واپس چلے گئے۔ پھر واپس نہیں آئے۔ انگریزی تعلیم میں لگ گئے۔ اب یہ گریجویٹ ہو چکے تھے۔ اور بمبئی میں بہ تلاش روزگار آئے ہوئے تھے۔ کہیں جگہ ڈھونڈنے کی فکر نا کام ہوئے اور مایوس ہو کر بھوپال واپس چلے گئے۔ وہاں سے مجھے خط لکھا۔ میں نے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے ان کا تقرر کر لیا۔ یہ بمبئی آ گئے اور کام کرنے لگے۔

شوکت صاحب بمبئی سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ کئی روز کے بعد واپس آئے۔ ایک روز وہ صحن میں بیٹھے تھے۔ میں بھی حاضر تھا کہ قدوس صہبائی آئے اور انہیں سلام کر کے دفتر میں چلے گئے۔ شوکت صاحب نے پوچھا۔

"یہ کون صاحب ہیں؟"

میں نے کہا قدوس صہبائی ہیں۔ میں نے انہیں سب ایڈیٹر مقرر کیا ہے؟"

شوکت صاحب نے پوچھا

"بھوپال والے تو نہیں؟"

میں نے عرض کیا "جی ہاں وہی —— !"

شوکت صاحب کہنے لگے "نہیں بھئی۔ انہیں ابھی رخصت کر دو۔ یہ شخص کمیونسٹ ہے" —— شوکت صاحب کمیونسٹوں کے سخت مخالف تھے۔

میں نے کہا "لیکن ——"

شوکت صاحب نے میری بات نہیں سنی۔ فرمایا

"یہ نواب بھوپال کا بھی سخت مخالف ہے۔ نواب صاحب سے ہمارے عمر بھر کے تعلقات ہیں۔ یہ شعیب کا بھی ...ن ہے اور وہ میرا دست و بازو ہے۔ یہ خلافت کا بھی مخالف ہے، ہمیشہ خلافت کی مخالفت کرتا رہا ہے" ——

بڑی لمبی چوڑی تقریر کر کے شوکت صاحب نے حکم دیا "ابھی حساب صاف کر دو۔"

یہ فرد جرم سن کر میں لاجواب ہو گیا۔ واقعی ان صفات کے شخص کا برداشت کرنا شوکت صاحب کے لیے ناممکن تھا۔ غلطی میری تھی کہ یہ سب باتیں میں نے کیوں نہ سوچ لیں؟

میں دفتر پہنچا۔ اور الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا کہ حساب کرتے وقت میری اور ان کی دونوں کی کیا کیفیت ہوئی۔ اب بھی سوچتا ہوں تو شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔

ایک روز میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ چپراسی نے ایک وزٹنگ کارڈ میرے سامنے لا کر رکھا۔

"امین حزیں"

یہ مانے کہا " فوراً بلا لاؤ ۔"

اور مشہور شاعر امین حزیں سے استقبال کے لیے تیار ہو گیا۔ لیتے میں "امین حزیں" صاحب تشریف لے آئے۔ لیکن یہ شاعر امین حزیں نہ تھے۔ یہ ماوا پور کے رہنے والے تھے۔ تلاش میں انہوں نے بھی امین حزیں رکھ لیا تھا۔ ملازمت کی تلاش میں آئے تھے۔ آتے ہی درخواست پیش کر دی۔

میں یقیناً انہیں رکھ لیتا لیکن شوکت صاحب کو یہ حرکت ناپسند ہوئی۔ میں نے معذرت کر دی۔ پھر وہ کہیں اور ملازم ہو گئے۔
لیکن بعد میں مجھے افسوس ہوا ... کہ میں نے ان کو مایوس کیا تھا۔ ملازمت دینے سے انکار نہیں ... تھا ... کوئی نہ کوئی صورت پیدا کر ہی لیتا تھا لیکن وقتی برہمی کے سبب ... ہو گئی۔ کافی عرصے تک مجھ پر ... سب ... بعد ... جب شوکت صاحب کا انتقال ... کے بعد میں نے اپنا ذاتی اخبار روزنامہ ہندوستان نکالا تو تلافی بھی کر دی یعنی امین حزیں کو سب ایڈیٹر کی حیثیت سے رکھ لیا۔

اب امین حزیں صاحب کراچی میں ہیں اور ایک کامیاب تاجر ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا میں ان سے ملا تھا۔ ان کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ وہ میری باتیں ... بھی فراموش کر چکے ہیں۔ مجھے ان سے پہلے بھی ہمدردی تھی اور اب پہلے سے بھی زیادہ ہے۔
شوکت صاحب ... ہونے کے باوجود بڑے جامہ زیب، خوب صورت، شاندار اور وجیہ و شکیل آدمی تھے۔
جب وہ چلتے تو یہ معلوم ہوتا ... محترم ہستی ... جب بات کرتے تو ایسا لگتا تھا، سچ کو زبان مل گئی ہے۔ جب تقریر کرتے تھے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے خلوص کو خدا نے قوت گفتار عطا کر دی ہے۔ جب وہ گورنر یا وائسرائے سے ملتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے فرعون کے دربار میں ... ——— موسیٰ کے قدم پہنچ گئے ——— حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔
شوکت صاحب جامہ زیب تو حد سے زیادہ تھے۔ انگریزی لباس میں وہ پورے صاحب بہادر معلوم ہوتے تھے۔ شیروانی، پاجامے ... دیکھنے ... کھدر کے سفید کرتے اور عبا قبا پہنتے تو یہ معلوم ہوتا تھا فرشتہ آسمان سے اتر آیا۔ وہ ہر رنگ ... میں ... لگتے تھے۔

مولانا عبد الباری مغفور کے وہ مرید تھے۔ اور بعض ... امور میں اختلاف کے باوجود ... ان کے عقیدت مند تھے۔
مولانا کے جانشین قطب میاں جب کبھی بمبئی تشریف لاتے اور خلافت ہاؤس آتے تو ... انداز میں ... ان کے ... تھے وہ منظر اب تک نظر کے سامنے پھر رہا ہے۔

مولانا کے فرزند ارجمند جمال میاں سے تو شوکت صاحب کو عشق تھا۔ ... ان کی تمام صفات ... رہنے تھے جمال میاں بمبئی آتے تو اکثر خلافت ہاؤس میں ٹھہرتے۔ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ اور مجھے فخر ہے یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔
گو شوکت صاحب کا عام قاعدہ سیاسیات میں آنے کے بعد یہ تھا کہ ——— ہو سکے سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو ——— پھر بھی کبھی کبھی سینما اور تھیئٹر دیکھ لیا کرتے تھے۔

ایک عظیم بین الاقوامی شہرت رکھنے والے مشہور رقاص اودے شنکر کا طائفہ بمبئی آیا۔ ... کے ... تھیئٹر میں ہر روز اس کے پروگرام ہونے لگے۔ شوکت صاحب کے پاس بھی دعوت نامہ پہنچا۔ تیار ہو گئے۔ یہ نادر موقعہ میں کہاں چھوڑتا۔ میں بھی ساتھ ہو لیا۔

منتظمین نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور پہلی رو میں صوفے پر ہم دونوں کو بٹھا دیا۔ کیا کہنا اس کا رقص تھا۔ اس طائفہ کی ایک رقاصہ مس عذرا بھی تھیں۔ یہ مراد آباد کی رہنے والی تھیں اور ان کے خاندان سے شوکت صاحب واقف بھی تھے۔ مس عذرا کو اودے شنکر کے ساتھ رقص کرتے دیکھ کر شوکت صاحب بے مزہ ہوئے۔ ایک شریف خاندان کی مسلمان لڑکی کو یوں برسر عام ناچتے اور تھرکتے دیکھ کر وہ برداشت نہ کر سکے۔ شو ختم ہونے سے پہلے واپس آگئے۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے ماتحت جب صوبائی خود مختاری کا نفاذ ہوا تو مسلم لیگ نے بھی اپنے امیدوار ہر صوبے میں کھڑے کیے شوکت صاحب نے سارے ملک کا دورہ اس سلسلے میں کیا۔ گرمی کا موسم، ذیابیطس کے مریض لیکن ریل، موٹر، تانگہ، یکہ حتیٰ کہ بیل گاڑی تک پر ہر صبح سفر، ہر شام سفر پر عامل رہتے۔ بندیل کھنڈ میں جب لیگ کے الیکشن کو جواہر لال نہرو نے "ٹسٹ" بنا لیا تھا۔ کانگریس کا سارا زور، سارا روپیہ اور سارا اثر یہاں صرف ہو رہا تھا۔ مولانا شوکت علی نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ یہ کڑی مہم بے سروسامانی اور بے زری کے باوجود شاندار طور پر سر کی۔

مولانا مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔ لیکن مولانا عرفان آزاد ٹکٹ پر شوکت صاحب کے علم و استصواب کے بغیر بمبئی اسمبلی کے لیے سردار پٹیل کی شہ سے کھڑے ہو گئے۔ چونکہ خلافت کی تائید انہیں حاصل نہ تھی ہار گئے۔ یہ سارا واقعہ شوکت صاحب کے دورے کے زمانے کا ہے۔ شوکت صاحب بمبئی واپس آئے تو مولانا عرفان پر بہت بگڑے۔ اور کہا تم میرے رفیق کار ہو اور دشمنوں کے آلۂ کار بھی۔ میں یہ نہیں برداشت کر سکتا۔ تمہیں خلافت یا کانگریس میں سے کسی ایک کا انتخاب کر لینا چاہیے۔ اور خلافت مسلم لیگ کے ساتھ ہے۔"

مولانا عرفان صاحب دنیا کو چھوڑ سکتے تھے لیکن شوکت صاحب کو نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ انہوں نے پھر مسلم لیگ میں شرکت کر لی۔ اور ہر مرحلے پر نمایاں کارنامے انجام دیے۔

انتخاب کے کچھ عرصے کی کشمکش کے بعد صوبوں میں کانگریسی وزارتیں بنیں۔ یاسین نوری صاحب خلافتی یعنی مسلم لیگی تھے۔ اپنے انتخابی منشور میں انہوں نے ووٹروں سے وعدہ کیا تھا کہ مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام پر عمل کریں گے۔ نمایاں اکثریت سے اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ لیکن سردار پٹیل نے انہیں وزارت کی پیش کش کر کے توڑ لیا۔ اور ۲۴ گھنٹے کی مختصر مدت میں نیا لباس سلوا کر کھدر پوش اور کانگریسی بن گئے اور پی ڈبلیو ڈی کے وزیر بنا دیے گئے۔

شوکت صاحب کو اس واقعہ کا بہت صدمہ ہوا۔ اسی زمانے میں ناسک میں تقریر کرتے ہوئے نوری صاحب نے مسلم لیگ کا ذکر کرتے ہوئے کہا

"کہا جاتا ہے کہ کانگریس [illegible] کے وقت مسلم لیگ [illegible] آزادی کی جدوجہد کانگریس نے کی اور مسلم لیگ اس جدوجہد میں شریک ہوئے بغیر اپنا حصہ مانگ رہی ہے"

یہ بیان پڑھ کر شوکت صاحب آگ بگولہ ہو گئے۔ شامت کے مارے نوری صاحب دو تین روز کے بعد دورے سے واپس بمبئی آئے اور شوکت صاحب سے ملنے خلافت ہاؤس تشریف لائے۔ شوکت صاحب نے ان کی بری طرح خبر لی۔ فرمایا

"تم نے ناسک میں کہا تھا۔ کہا تھا کانگریس نے کیا ہے؟ آزادی کی جدوجہد کانگریس نے کی ہے؟ وہ ہم تھے جنہوں نے ہندوؤں میں سیاسی شعور بیدار کیا۔ گاندھی کو گاندھی بنایا۔ کانگریس کو ہم ہی نے جھنڈے سے کھینچ کر آزادی کے راستے پر چلایا۔ مسلمانو

[illegible]

نوری صاحب کا ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا لیکن اپنے لیڈر کے سامنے کچھ کہنا نہیں چاہتے تھے۔ بنگال کا نوجوان بھی علی گڑھ کے ارباب کی طرح سے شوکت صاحب کو سنگین سمجھتا۔ سیاسی اختلاف تھا لیکن علی گڑھ سے عشق تھا۔ علی گڑھ کے ذرے ذرے سے عشق تھا۔ کوئی علیگ ہو۔ شوکت صاحب کا دروازہ اس کے لیے کھلا ہوا تھا۔ شوکت صاحب میں ان ہر مدرسہ کیفیت تھی سیاسی تحریکوں اور معرکہ آرائیوں میں بھی وہ علیگیت کے رشتے کو قائم رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ علی گڑھ کی ایک کرکٹ ٹیم بمبئی آئی۔ یہ لوگ کسی ہوٹل میں ٹھہرے۔ بھلا کیونکر ممکن تھا کہ علی گڑھ کے طلبہ بمبئی آئیں اور اس شخص سے جو اپنے وقت میں ہندوستان کا بہترین اور علی گڑھ کا نامور کرکٹیر رہ چکا تھا ملنے نہ آئیں۔ پوری ٹیم آئی۔ شوکت صاحب ہر ایک سے بغلگیر ہوئے۔ پوچھا کہاں ٹھہرے ہو؟" ہوٹل کا نام سن کر خفا ہو گئے۔ اسی وقت سب کو رخصت کیا اور کہا جاؤ سامان لے کر ابھی آؤ۔ پیچھے صاحب خلافت ہاؤس کا سارا زیریں حصہ علی گڑھ ٹیم کے لیے وقف، ناشتہ، کھانا چائے، ہر قسم کی تواضع ہو رہی ہے۔ بہت سی ذاتی اور سیاسی سرگرمیاں معطل۔ وقت کا بڑا حصہ اسی ٹیم کے ممبروں میں گزارا جا رہا ہے۔ خود قبلۂ حاجات اور پیر مغاں بنے بیٹھے ہیں۔ ارد گرد علی گڑھ کے کھلنڈرے جمع ہیں۔ خود داستان ماضی مزے لے لے کر سنا رہے ہیں۔ اور ان نو واردوں سے ان کی کہانیاں سن رہے ہیں۔ یہ چند روز ایسی سرخوشی میں گزر رہے جیسے پچھلا زمانہ لوٹ آیا ہے۔ اور شوکت صاحب علی گڑھ میں براجمان ہیں۔

سرحد میں ڈاکٹر خاں صاحب کی وزارت قائم تھی۔ مولانا مسلم لیگ کا پروپیگنڈا کرنے کے لیے سرحد پہنچے۔ سارے صوبہ کا دورہ کیا۔ چارسدہ بھی جو خان عبدالغفار خاں کا گڑھ تھا پہنچے۔ اور عبدالغفار خاں کی کانگرس نوازی کے لتے لے ڈالے۔ دوران تقریر میں کہا

"عبدالغفار خاں میرا رضاکار تھا۔ اسے اس پر فخر تھا کہ وہ میرا رضاکار ہے۔ اب وہ گاندھی کا رضاکار ہے۔ اور اسے فخر ہے کہ گاندھی کا رضاکار ہے۔ گاندھی بہت عرصے تک میری جیب میں رہا۔ پھر وہ میری جیب سے نکل بھاگا۔ اب گاندھی کی جیب میں عبدالغفار پہنچ گیا ہے۔ گاندھی کو گاندھی ہم نے بنایا۔ کانگرس، کانگرس ہمارے دم سے بنی۔ لیکن جب ہم نے دیکھا کہ گاندھی اور کانگرس مسلمانوں کو ان کے جائز حقوق دینے میں بھی پس و پیش کرتے ہیں تو میں نے گاندھی اور کانگرس دونوں سے کنارہ کشی کر لی۔ عبدالغفار نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ سرحدی گاندھی بن گیا۔ تم اسلام کے مجاہد ہو۔ یہ تمہیں بزدل بنا دینا چاہتا ہے۔"

دوستوں نے شوکت صاحب کو چارسدہ جانے سے منع کیا تھا۔ لیکن شوکت صاحب گئے۔ جلسۂ عام میں تقریر کی اور واپس آ گئے۔ بجا طور پر وہ کہہ سکتے تھے "میں آیا، میں نے دیکھا، میں نے فتح کر لیا۔"

پشاور میں ڈاکٹر خاں صاحب نے دوپہر کے کھانے پر شوکت صاحب کو مدعو کیا۔ شوکت صاحب نے دعوت قبول کر لی، اور تشریف لے گئے۔ کھانے کے دوران میں اور اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ وہ کانگرس کے نقیب تھے یہ مسلم لیگ کے داعی۔ جب رخصت ہونے لگے تو ڈاکٹر خاں صاحب موٹر تک پہنچانے آئے۔ گرمی کا زمانہ تھا۔ دوپہر

کا وقت۔ تیز دھوپ، لو کے جھکڑ، خاں صاحب نے کہا۔ اس تیز دھوپ اور لو میں نہ جائیے۔ دوپہر کو یہاں آرام کیجیے۔ شام کو چلے جائیے گا۔

شوکت صاحب نے کہا "مجھے دھوپ اور لو سے ڈراتے ہو، خود جہنم کی آگ سے نہیں ڈرتے؟"

بے چارے خاں صاحب کا چہرہ تمتما اٹھا لیکن خاموش رہے۔ شوکت صاحب بے پروائی سے موٹر میں بیٹھے اور رخصت ہو گئے۔

زاہد صاحب سے شوکت صاحب کو عشق تھا۔ کسی باپ کو اپنے بیٹے سے اتنی والہانہ محبت کرتے میں نے نہیں دیکھا۔ جتنی شوکت صاحب، زاہد صاحب سے کرتے تھے۔ زندگی کے اس دور میں کئی مرتبہ زاہد صاحب کی بعض باتوں سے وہ خفا ہوئے۔ انہیں رنج پہنچا۔ بگڑے۔ لیکن زاہد صاحب کا سامنا ہوا اور سب کچھ بھول گئے۔ اس دبدبے اور جاہ و جلال کا آدمی مہر پدر کے سامنے اتنا بے بس تھا۔

صوبوں میں کانگرسی وزارتیں بننے کے بعد کانگرس کا زور بہت بڑھ گیا تھا۔ بہت سے مسلمان جاہ و منصب کی تلاش میں اس ایوانِ زرنگار کا رخ کر رہے تھے۔ شوکت صاحب پر ہر چہار طرف سے یورش ہو رہی تھی۔ اور وہ چومکھی جنگ لڑ رہے تھے۔

انہی زمانے میں ڈاکٹر عبدالحمید بھی دفعتہً بڑے کٹر کانگرسی بن گئے۔ یہ مشہور جرمن دوا "اوکاسا" کے ہندوستان میں سول ایجنٹ تھے۔ جب یہ صرف ایک اٹیچی کیس لے کر تلاش روزگار میں بمبئی میں مارے مارے پھر رہے تھے اور کہیں سے کامیابی کی صورت نہیں پیدا ہو رہی تھی۔ اس زمانے میں شوکت صاحب نے ان کی کافی مدد کی تھی۔ لیکن اب کانگرسی بن کر یہ شوکت صاحب کے خلاف بیان بازی کرنے لگے۔ میں نے ایک مقالہ افتتاحیہ لکھا "اوکاسا کا زور" اور ان کی ہم نگرسیت کا پردہ فاش کر دیا۔ بہت تلملائے۔ اوکاسا کا اشتہار فوراً بند ہو گیا۔ مگر شوکت صاحب نے پروا بھی نہ کی۔

الہ آباد میں جواہر لال نے "مسلم رابطۂ عوام" Muslim mass Contact کی تحریک آنندبھون سے شروع کر رکھی تھی۔ ڈاکٹر اشرف اس شعبہ کے انچارج تھے۔ یہ بھی شوکت صاحب کے خلاف نکتہ آفرینیاں کرتے رہتے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ جل کر بہت مفصل اداریہ "بخدمت اشرف" کے عنوان سے لکھا۔ اس زمانے میں شاہد مظہر علی بیرسٹر ایٹ لا جو مولانا محمد علی کے برادر نسبتی تھے خلافت ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ انہیں یہ مضمون بہت پسند آیا۔ شوکت صاحب سے انہوں نے میری بڑی تعریف کی۔ شوکت صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا یہ ہمارا انتخاب ہے۔ چند روز بعد ڈاکٹر اشرف کسی کام سے بمبئی آئے۔ خلافت ہاؤس مجھ سے ملنے آئے۔ اور دل کھول کر میرے طرز انشا کی داد دی۔ اور ازراہ مزاح فرمایا

"آپ آنندبھون آجائیے!"

مفتی امین الحسینی سے شوکت صاحب کے عزیزانہ تعلقات تھے۔ وہ مفتی صاحب ہی تھے جنہوں نے مسجد عمر (بیت المقدس) میں اصرار کر کے محمد علی کی تدفین کی تھی۔ وہ اس غرض سے ہندوستان آئے کہ یہودی تیزی سے فلسطین

کی زمینیں غریب عربوں سے خرید رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ فلسطین وطن الیہود بن جائے گا۔ لہذا ہندوستان کے ارباب ثروت وہاں زمینیں خرید لیں اور فائدہ اٹھائیں۔ شوکت صاحب دل وجان سے ان کے ساتھ ہوگئے۔ اور اس مقصد کے لیے ایک ایک در پر دستک دی۔ لیکن جونئر والسرائے اور گورنر مخالف تھے لہذا شوکت صاحب کی شبانہ روز کی سرگرمیوں کا کوئی خاص نتیجہ نہ نکلا۔

مفتی صاحب کے قیام بمبئی کا زمانہ بڑا دلچسپ گزرا۔ وہ بیشتر زیادہ وقت شوکت صاحب کے ساتھ صرف کرتے تھے۔ خطوط، اعلانات، بیانات عربی میں لکھ لکھ کر شوکت صاحب کو دیتے تھے۔ وہ مجھے فوراً اردو ترجمے کا حکم دیتے تھے۔ اردو ترجمے کے بعد فوراً چھاپنے کا حکم دیتے تھے۔ شوکت صاحب عربی نہیں جانتے تھے۔ لیکن انگریزی، اردو اور عربی کے الفاظ بیک وقت استعمال کرکے، اور زیادہ تر اشاروں سے، کام لے کر مفتی صاحب کو اپنا مطلب بآسانی سمجھا دیتے تھے۔

طبعاً شوکت صاحب بہت نفاست پسند تھے۔ ان کی مالی حالت نہایت سقیم تھی۔ باسی روٹی اور باسی دال تک پر گزارہ کر لیتے تھے۔ لیکن کپڑے دن میں دو مرتبہ بدلتے تھے۔ صبح اٹھ کر غسل کرتے اور دھلے ہوئے کپڑے پہن کر برآمد ہوتے۔ دوپہر کے قیلولہ کے بعد غسل کرتے اور پھر تازہ دھلا ہوا لباس زیب تن کرکے باہر جاتے تھے۔ کپڑے پرانے تھے۔ بعض میں پیوند بھی ہوتا تھا۔ لیکن وہ کہا کرتے تھے غربت انسان کو میلا اور گندا رہنے پر مجبور نہیں کرتی۔ آدمی اگر چاہے تو ہر روز خود اپنے کپڑے دھو کر اجلا رہ سکتا ہے۔

قائداعظم شوکت صاحب پر حد درجہ اعتماد کرتے تھے۔ ذاتی امور میں بھی ان سے صلاح مشورہ کرتے تھے۔ ایک روز فون آیا۔ یہ قائداعظم کا فون تھا۔ اور انہوں نے فوراً شوکت صاحب کو ملاقات کی زحمت دی تھی۔ وہ اس وقت کسی اور کام سے میرے ساتھ باہر جا رہے تھے۔ چنانچہ پہلے ہم دونوں مالابار ہل قائداعظم کے بنگلے پر پہنچے۔ قائداعظم کے چہرے پر تشویش، اضطراب، اور افسردگی کے گہرے نقوش نظر آ رہے تھے۔

قائداعظم نے ایک کروڑپتی پارسی کی اکلوتی لڑکی رتن بائی کو مسلمان کرکے اس سے باقاعدہ نکاح کیا تھا۔ بڑا ہنگامہ ہوا۔ لیکن وفادار بیوی نے ہر مرحلے پر شوہر کا ساتھ دیا۔ رتن کا انتقال عین عالم شباب میں ہوا۔ دونوں کی محبت کی یادگار صرف ایک بچی تھی۔ قائداعظم اسے بہت چاہتے تھے۔ لیکن سیاسی مصروفیتوں کے باعث اس کی تعلیم و تربیت پر زیادہ توجہ نہیں کر سکتے تھے۔ وہ زیادہ تر نانی کے ہاں رہتی تھی۔ وہاں رہ کر وہ اسلام سے دور ہوتی چلی گئی۔ اور اب معلوم ہوا اسی پارسی خاندان کے ایک کروڑپتی مل اونر نوجوان سے وہ شادی کر رہی ہے۔ انہوں نے شوکت صاحب کو اس لیے بلایا تھا اور باچشم پرنم ان سے استدعا کی تھی کہ وہ اس لڑکی کو اسلام سے آشنا کرنے کے لیے کسی ایسے تعلیم یافتہ مسلمان کا بندوبست کر دیں جو اس کی غلط فہمیاں دور کر دے اور سچا مسلمان بنا دے۔

لیکن اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ چند ہی روز بعد لڑکی نے باپ کی مرضی کے خلاف شادی کر لی۔ باپ نے اسے عاق کر دیا۔ اور پھر مرتے دم تک نہ اسے اپنے گھر میں آنے دیا نہ اس کی صورت دیکھی۔
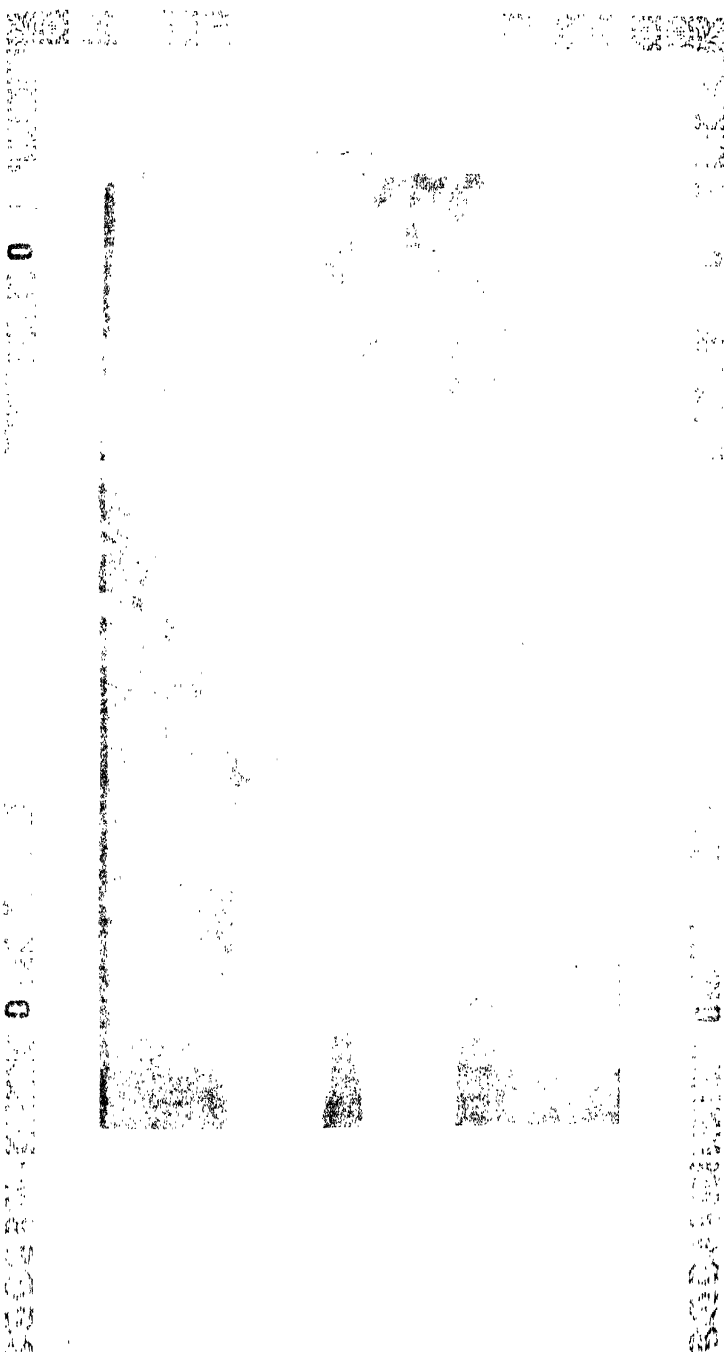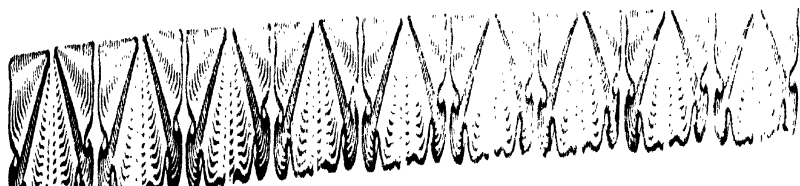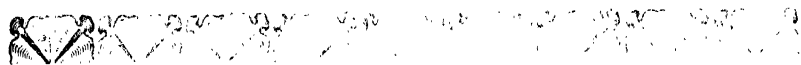
وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن مولانا شوکت علی کا بہت پاس و لحاظ کرتا تھا۔ ایک مرتبہ مرکزی اسمبلی میں حکومت کے خلاف کسی تجویز پر کانگرس اور مسلم لیگ میں باہمی اختلاف کے باوجود اتفاق ہوگیا۔ اس زمانے میں نظام دکن بھی دہلی آئے ہوئے تھے، اور شاہانہ جاہ و جلال کے ساتھ نظام پیلس میں جو وائسرائے کے لاج سے کسی طرح کم شاندار نہیں تھا ٹھہرے ہوئے تھے۔

حکومت نے کئی ممبروں کو توڑنے کی کوشش کی۔ لارڈ ولنگڈن نے اپنے اصول اور مرتبے کے خلاف خود "کونسلنگ" کی۔ مولانا کو چائے پر مدعو کیا۔ اور باتوں باتوں میں کہا۔

"مولانا آپ کو تو کانگرس کا ساتھ نہ دینا چاہیے۔ جب کہ آپ کو اس سے اتنی سنگین شکایتیں ہیں!"

مولانا نے برجستہ جواب دیا۔ مجھے انگریزوں سے بھی بڑی سنگین شکایتیں ہیں انہوں نے کبھی اور کسی موقع پر مسلمانوں کی مدد نہیں کی۔ اب بھی اگر آپ فلسطین پر عربوں کی غیر مشروط حاکمیت تسلیم کرلیں تو میں اپنی جماعت سے غداری کرنے کو تیار ہوں۔ وہ مسکرا کر خاموش ہورہا۔ پھر کچھ نہیں بولا۔ لیکن نظام کو اشارہ کردیا۔ نظام نے دوسرے دن شوکت صاحب کو لنچ پر مدعو کیا۔ اس نے بھی شوکت صاحب کو ہموار کرنے کی کوشش کی۔ شوکت صاحب نے کہا۔ اعلیٰ حضرت اگر لارڈ ولنگڈن برار آپ کو واپس کردیں تو میں تعمیل ارشاد کو ہر طرح کی بدنامی مول لے کر تیار ہوں، ورنہ میرا ووٹ تو حکومت کے خلاف جائے گا۔"

نظام نے بھی پھر کچھ نہیں کہا۔ مولانا اسمبلی گئے اور اپنا ووٹ حکومت کے خلاف دے آئے۔

بات میں بات نکلتی ہے۔ ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ میں ندوۃ العلماء میں پڑھتا تھا۔ لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال میں ایک جلسہ اس وقت کے صدر خلافت سر عبداللہ ہارون کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خلافت اور کانگرس میں ٹھن چکی تھی۔ ظاہر ہے تقریر صدارت کانگرس کے خلاف ہوئی۔ لکھنؤ یونیورسٹی کے چند طلبا، مصطفیٰ کامل قدوائی کی رہنمائی میں ہلڑ بازی کرنے لگے۔ بیچارے عبداللہ ہارون اس یورش کی کیا تاب لاتے۔ کرسی صدارت حاضر تھی بیٹھ گئے۔ اب مولوی شفیع داؤدی کی شامت آئی۔ یہ بڑے مخلص، ایماندار اور باوضع خلافتی زعیم تھے۔ لیکن ہلڑ بازی کا مقابلہ کرنے کی سکت ان میں بھی نہ تھی۔ چند جملے بہ مشکل کہہ سکے۔ پھر ہار مان لی اور بیٹھ گئے۔ اب لکھنؤ یونیورسٹی کے یہ مسلم نیشنلسٹ طلبا ہال پر چھا چکے تھے۔ یہ مصطفیٰ کامل قدوائی، علی برادران کے بھتیجے دوست ولایت علی بمبوق مرحوم کے صاحبزادے تھے۔ اب شوکت صاحب کھڑے ہوئے۔ ذرا دیر کے لیے ہلڑ بازی رکی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے " اک شیر گونجتا ہوا نکلا کچھار سے!"

شوکت صاحب نے تقریر شروع کی تھی کہ مصطفیٰ کامل پھر کھڑے ہوئے اور کہنے لگے

"ہندو آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ قربانیاں دے رہے ہیں۔ اور مسلمان انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں ——"

شوکت صاحب گرجے۔ انہوں نے کہا

"کیا کہا ہندو آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ قربانیاں لے رہے ہیں اور ہم انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کر رہے

نہیں؟ وہ خلافت کمیٹی تھی جس کے سرمایہ سے گاندھی نے سارے ہندوستان کا دورہ کیا۔ وہ ہم ہی تھے جنہوں نے کانگریس کو لیڈروں سے سینچا اور آزادی کے راستے پر سب سے پہلے قربانیاں ہم نے کیں۔ ہم نے اپنی جائدادیں نیلام کرائیں گھر کے برتن قرق کرائے۔ نوکری چھوڑی۔ پریس ضبط کرایا۔ اخبارات کو بند کرایا۔ جیل گئے۔ خطاب واپس کئے۔ پھانسی کا پھندا ہماری گردنوں کے لئے تیار رہتا۔ موتی لال آج بھی چیمبر میں پریکٹس کرکے ہزاروں روپیہ کما رہے ہیں۔ جواہر لال کے نہ جانے کتنے بنگلوں۔ فرموں، کمپنیوں اور کارخانوں میں ہیں جن کا نفع بیٹھے بٹھائے ان کی جیب میں پہنچتا رہتا ہے۔ گاندھی جی کو ان کی قوم لاکھوں روپے دے رہی ہے۔ اور یہ بھی نہیں سوچتی کہ تم کیا کر رہے ہو۔ لیکن ہمارا کسی کمپنی میں حصہ نہیں ہے۔ ہمارے یہاں کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ ہم میں تم جیسے لوگوں کے ہاتھی نہیں جو ہمارا راستہ روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمیں انگریز نہیں خرید سکا، ہم ہندو کے ہاتھ بھی نہیں بک سکے ——

شوکت صاحب بہت مختصر تقریر کیا کرتے تھے لیکن یہ تقریر ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ اور اب حالت یہ تھی کہ مولانا شوکت علی زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔ اور مصطفیٰ کامل قدوائی کا کہیں دور و نزدیک نام و نشان نہ تھا۔

طنز و مزاح کا مادہ بھی شوکت صاحب میں کافی تھا۔

ایک مرتبہ ہم لوگ خلافت ہاؤس کے صحن میں بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ شوکت صاحب کے قدیم اور مخلص دوست غلام حسین بٹ کے بھانجے یا بھتیجے ڈاکٹر اطہر رشید برلن سے ڈاکٹریٹ کرکے تازہ تازہ بمبئی وارد ہوئے تھے۔ اور خلافت ہاؤس میں مقیم تھے۔ بڑے کٹر نیشنلسٹ تھے۔ کھدر کے لباس میں ملبوس۔ گاندھی کیپ زیب سر۔ یہ بھی شریک بزم تھے۔ طبعاً بڑے نیک اور شریف۔ عقیدۃً قوم پرور اور کانگریسی۔ اتنے میں شوکت صاحب کہیں باہر سے تشریف لائے وہ بھی شریک مجلس ہو گئے۔ ہم سب ان کے استقبال کو کھڑے ہو گئے۔ یکایک ان کی نظر ڈاکٹر اطہر رشید پر جا کر رک گئی۔ دونوں ہاتھ جوڑ کر اور ماتھے تک لے جا کر شوکت صاحب نے "بندے ماترم" کچھ ایسے انداز سے کہا کہ ہم سب ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے۔ ڈاکٹر اطہر رشید پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔

کہاں تک لکھوں بہت کچھ لکھا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کچھ نہیں لکھا۔ زندگی نے اگر مہلت دی تو انشاء اللہ ایک پوری کتاب شوکت صاحب کی سیرت اور کردار پر لکھوں گا۔ ایسی دل ربا، ایسی سحر طراز، ایسی شفاف شخصیت میری نظر سے آج تک نہیں گزری۔ شوکت صاحب کی وفات کے وقت بھی بہت سے لیڈر موجود تھے۔ اب بھی ہیں اور آئندہ بھی ان کی تخلیق کا سلسلہ جاری رہے گا۔ لیکن

ہم جس پہ مرتے ہیں وہ کوئی بات ہی ہے اور
عالم میں تم سے لاکھ سہی تم مگر کہاں؟

الا مولانا شوکت علی

از یحییٰ اعظمی

اُف غم روزگار کی باتیں — دہر ناپائدار کی باتیں۔
جو رہے ایک دم قرار نہیں — آہ لیل و نہار کی باتیں۔
اس خزاں آشنا زمانہ میں — کیا سنائیں بہار کی باتیں۔
دل جو پہلو میں ہو تو اب سنئے — دیدۂ اشکبار کی باتیں۔
ہوگیا آہ آج وہ رخصت — یاد ہیں جس کی پیار کی باتیں۔
کس کو اب بیقرار کردیں گی۔ — مدحت دل و نگار کی باتیں
کون سمجھے گا اب یارب — اُمتِ سوگوار کی باتیں
قوم کو کون اب سنائے گا — ہمت استوار کی باتیں
برق سے بڑھ کے کام کرتی تھیں — شوکت نامدار کی باتیں
وہ زباں کیا تھی تیغ جوہر دار — جس میں تھیں ذوالفقار کی باتیں
تیغ ابرو کے ہر اشارے پر — خنجر آبدار کی باتیں۔
تھیں سراپا پیام جوش جہاد — اس مجاہد شعار کی باتیں
تا ابد اشک خوں رلائیں گی — آہ شوکت کی پیار کی باتیں
کانپ اٹھتا تھا لشکر باطل — آہ کر و فار کی باتیں

اب کہاں آہ شوکت ملت
آئینہ دار عظمت ملت

اب کہاں وہ وفا شعار افسوس — خادم کعبہ صد ہزار افسوس
ہند سے لیکے تا بہ خاک حجاز — غم میں کس کے ہے سوگوار افسوس
اٹھ گیا وہ مجاہد اعظم — تھا جو اسلام پر نثار افسوس

اس جہاں سے ہو گئی خالی
صف میدان کارزار افسوس

چل دیا چھوڑ کر غلاموں کو
مالک ہمت کا تاجدار افسوس

آج خود شیر بیشۂ اسلام
ہو گیا موت کا شکار افسوس

وہ زعیم فہیم اب نہ رہا
جس سے تھا قوم کا وقار افسوس

دشمنوں سے مقابلہ کے لئے
تھا وہ اک سد استوار افسوس

سرفروشان راہ ملت کا
مایہ ناز و افتخار افسوس

مٹ گئی ہائے بزم دنیا سے
آج جوہر کی یادگار افسوس

گلشن آرزوئے ملت کی
خاک میں مل گئی بہار افسوس

شدت غم سے کیوں نہ ہو جائے
دامن صبر تار تار افسوس

صدمۂ انتقال پیہم سے
دل ملت ہے داغدار افسوس

ہیں بہت آج زخم ہائے جگر
آہ تازہ ہوا غم جوہر

اٹھ گیا وہ مجاہد اسلام
حق ہے گر وقف غم ہیں مصر و شام

وہ مجاہد کہ زندگی جس کی
تھی سراپا جہاد کا پیغام

وہ اولوالعزم قائد ملت
جس سے تھی تازہ شوکت اسلام

وہ بہادر کہ ہر ادا جس کی
جرأت آموز صد دل ناکام

وہ وطن دوست جس نے پہنچایا
گوشہ گوشہ میں حریت کا پیام

تھا وہی زیب مسند اسلاف
تھا وہی آج جانشین عظام

اجمل و جوہر و تصدق کا
اس کی ہستی پہ ہو گیا اتمام

آہ ہوتے ہیں اب کہاں پیدا
ایسے عالی ہمم زعیم ہمام

عہد حاضر کے سرفروشوں میں
اس مجاہد کا تھا بلند مقام

تھا وہ ملت کا قائد محبوب
تھے فدا اس پہ سب خواص و عام

روز و شب جد و جہد بے پایاں
تھا یہی اس کی زندگی کا نظام

مرتے دم تک شکست دے نہ سکی
اس کی ہمت کو گردش ایام

رشک ہے اس کی موت پر سب کو
مر کے پائی ہے وہ حیات دوام

روئے جی بھر کے آج اے ملت
کہ ہے یہ آپ وداع کا ہنگام

اب وہ پیکر نظر نہ آئے گا۔
یونہی ہوتی رہیں گی صبح و شام

تھکنے والے تجھے مبارک ہو ابدی خواب گاہ کا آرام

تیری روح عظیم پر صدقے نعمت باغ خلد کا انعام

ہو قبول اسے مسافر جنت ہم غلاموں کا بھی درود و سلام

آج مختار و جوہر و اقبال

سبھی حاضر ہیں بہر استقبال

معارف : جنوری ۱۹۳۹ء

سیاست و صحافت، تاریخ و تحقیق ادب و افسانہ اور شعر و سخن کی انجمن

ہمدرد صرف ایک روزنامہ نہ تھا، وہ ایک تحریک تھا، ایک پیام تھا، ایک مقصد تھا، ایک انقلاب تھا، ہمہ گیر اور ہمہ پہلو انقلاب!

آج سے پچاس سال پہلے اردو زبان میں ہمدرد نے جس طرزِ صحافت کا آغاز کیا تھا ہی پر ختم ہو گیا۔ قیس سا پھر کوئی اٹھا نہ بنی عامر میں!

ہمدرد کے مقالات: وقائع، اداریے، مراسلات، عالمِ اسلام سے متعلق تحقیقی اور تاریخی مضامین اور سب سے بڑھ کر اس کا وہ اندازِ بیان جس کی "سنجیدہ شوخی"، اور "شوخ سنجیدگی" اپنا ایک ایسا نقش قائم کر گئی ہے جو مرورِ ایام کے باوجود آج بھی تازہ ہے۔

آئندہ صفحات میں "ہمدرد"، (۱۹۱۳ء) کے فائل سے، جو اب نایاب ہیں وہ تحریریں ترتیب و تہذیب کے بعد درج کی جا رہی ہیں جن سے حیاتِ اسلامیہ کی پوری تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔

بسم اللہ

ہمدرد کی اشاعت کا پہلا دور

یکم جون ۱۹۱۳ء

"ہمدرد" آج اخباری دنیا میں قدم رکھتا ہے مگر ڈر ہے ایسا ہوا کہیں ننگ وجود ثابت نہ ہو۔ اپریل ۱۹۱۲ء کی آخری تاریخوں میں ہمدرد نے عالم فکر سے عالم ذکر میں قدم رکھا تھا۔ اگر ہم شاعر ہوتے یا شعرا کی طرح کسی بھی ہمارے لئے ایک جائز طرز بیان ہوتا اور "ہمدرد" کے خیال وزن اور قافیہ کے قالب میں ڈھل کر سخن سنجوں کی کسی بزم کی زینت ہوا ہوتا تو قدر رسا کی داد خود چاہتے۔ خود ستائی کے عیب کی "تلمیذ رحمان" ہونے کے دعوے سے پردہ پوشی کرتے اور کہہ اٹھتے کہ ہم نے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

مگر یوں تو یہ خلاف تہذیب تلمیذ رحمن بننے اور یہ چیز ہمیں ہمارا دست کی شان ہے اس لئے برخلاف شعرا کے اخبار نویسوں کی خود ستائی تو اپنی بے چادری سے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ دوسرے یورپ میں آج ایک سے ایک بڑھ کر اخبار موجود ہے اس وقت جن چیزوں کو ذاتی سرزنش کہہ سکتے وہ لنڈن کے "ٹائمس" اور پیرس کی "تان" کی درجے کا اخبار تھا۔ الغرض بخشش گر خوشی ہے ہمارے نتیجہ کار کا خیر مقدم ہوا اس سے ہمارے دل پر وہ اثر نہ ہو سکا جو مشاعرہ میں "واہ واہ" اور "کیا خوب فرمایا" سے کسی صاحب قدر رسا کے دل پر ہوتا۔ اردو داں حضرات بھی تراجم کے ذریعے سے جانتے تھے کہ یورپ کے اخباروں اور ہندوستان کے اردو جرائد میں ایک بحر اعظم حائل ہے اور کسی کا یہ کہہ دینا کہ وہ یورپ کے اخباروں کی نقل کرے گا اسے کسی طرح ایک نئی ایجاد کے ہند کا مستحق نہیں کر سکتا۔ لائق تحسین وہ اس وقت ہوگا جب اس دریائے ناپیدا کنار کی وسعت بڑوسے جو یورپ اور اس ملک کی دراندیں بہ اعتبار ان کی خوبیوں کے حائل ہے، کچھ تھوڑی سی زمین نکال کر اپنے ملک میں ملا دے۔ کوئی من چلا سوار ماترہ بکنا ہی کر دل میں شریک ہونا چاہتا ہو تو اس کی پذیرائی نہیں کی جاتی بلکہ تحسین و آفرین کا اسی وقت مستحق ہوتا ہے جب تمام کو ان سے کوئی کارنمایاں کر کے پیچھے اور لکھ دے۔ اس لئے ہمارے بے شمار کرم فرماؤں نے جس خیر مقدم سے جو "ہمدرد" کی تحریک سے شروع ہو گیا تھا۔ ہماری ذمہ داریوں کو اور بڑھا دیا۔

ہم پھر عرض کریں گے کہ "ہمدرد" کو آج اخباری دنیا میں قدم رکھتا ہے۔ مگر ڈر ہے ایسا ہوا کہ کہیں ننگ وجود ثابت نہ ہو عالم فکر سے عالم ذکر میں آتے آتے کم و بیش دو سال لگے تھے۔ تو عالم ذکر سے عالم عمل میں آتے آتے ایک سال سے کچھ زیادہ ہی لگ گیا

ہمارے اہل وطن میں چند اقوام اپنے تئیں "دو جنم" کہتی ہیں اس لئے کہ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ ایک بار سے زیادہ جنم لیتی ہیں "ہمدرد" کو اس سے فخر و مباہات کی اجازت نہیں ملتی۔ لیکن ایک طرح وہ بھی دو جنم ہے اور آج دوسرا جنم لیتا ہے ۲۳ر فروری کو ایک ورقہ نکلا تھا جس نے اپنے تئیں نقیب "ہمدرد" کہا تھا۔ اور اپنی معذرت خود اس طرح کی تھی۔

ہماری شرمساری اور محجوبی کا یہ عالم ہے کہ چلمن سے پردے کی نوبت پہنچ جاتی ہے۔ تاہم خیریت یہ ہے کہ ہم سرد مہری چشم احباب کے شکووں میں ایک طرح کی تلخ شیرینی ہوتی ہے۔ یہ اگر جاری رہیں تو مزا آتا ہے اور اگر بند ہو جائیں تو یاد آتے ہیں۔ مگر قوم کے بزرگ اور مخدوم کی شکایت سننے کا زہرہ نہیں۔ ہم اپنے احباب کو طوعاً نہیں تو کرہاً راضی کر بھی لیتے لیکن جناب قبلہ و کعبہ نواب وقار الملک بہادر مدظلہ کا والا نامہ جو ابھی موصول ہوا ہے ایک ایسی زبردست تحریک ہے جس نے صبر و شکیبائی کے آخری بند توڑ ڈالے اور "ہمدرد" کو گوشہ وار اور نہاں خانۂ خلوت کدہ سے نکل کر برہنہ پا دوڑنا پڑا۔ لیکن وائے خدا اس ایک ورقہ کو "ہمدرد" نہ سمجھے "ہمدرد" تو وہی ہوگا جس کا تعارف اس مضمون کے شروع میں مجملاً اور ۲۵ اپریل کے "کامریڈ" میں مفصلاً کیا جا چکا ہے۔ البتہ "ہمدرد" کا نقیب ہے یا اس کا حاجب در۔

جو حضرات "ہمدرد" کے جلوس کا تماشا دیکھنے لب بام آگئے تھے انہوں نے نقیب "ہمدرد" کی آواز بھی سنی ہوگی۔ اور انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ "ہمدرد" کی سواری اس قدر دیر میں کیوں آئی؟ "آہستہ خرام" کے حکم پر عمل کرتے کرتے اس نے اپنے تماشائیوں کو جلا کر "فخرام" کہنے پر مجبور کر دیا۔

اس داستان کو تو دوسری اور تیسری شب کی کہانی میں ساری آپ بیتی سرگذشت سنا دی ہے اس لئے از سر نو معذرت غیر ضروری ہو گئی ہے۔ اگر ہماری مجبوریوں کا یقین نہ آتا ہو تو ایک بار خود سوچ لیجئے کہ اس نووارد کو اس قدر انتظار دکھانے میں صرف شماتت ہمسایہ ہی نہیں تھا بلکہ نقصان مایہ کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔

مگر کارفرمائے حقیقی کی اس میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ سلطنت عثمانیہ ترکیہ پر جو طوفان نازل ہوا اس نے اخباری دنیا میں بالعموم ابر نیساں کا کام دیا۔ اور بہت سی کھیتیاں آج اس کے طفیل لہلہا رہی ہیں۔ ممکن ہے کہ ہماری خشک سالی ہی ہمارے لئے باعث رحمت ہو اور شاعر کا وعدہ پورا ہو کہ:-

آنکھوں میں ہی وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

اخباروں کی گرم بازاری عاشق کے گھر کی رونق سے کسی طرح کم نہیں۔ دونوں ایک ہنگامہ پر موقوف ہیں اور دونوں کے لئے "نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی"۔ اس سے ہمارا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ خدانخواستہ ہمارے معاصرین ترکوں کی بربادی سے خود پریشان حال نہ تھے۔ در اصل انہوں نے ایک سخت آزمائش کے زمانہ میں اپنے درد دل کا ثبوت دے کر ہزاروں لاکھوں دردمندوں کے پاس سے ترکوں کے درد کا درمان تلاش کر نکالا۔ لیکن "ہمدرد" اگر ایسی ہمدردی کے لئے وقت پر حاضر نہ ہو سکا۔ تو یقین جانئے کہ اپنے درد کا ارمان بھی حاصل نہ کر سکا۔ اور آج نوحۂ غم سے بھی گھر کی رونق نہیں بڑھا سکتا۔

ہم کیا ہیں۔ اور کیا ہوں گے۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا جواب بہتر ہے کہ کچھ عرصہ تک ہمیں دیکھ بھال کر ہمارے ناظرین خود ہی دیدیں۔ لیکن اس قدر بتا دینا ضروری ہے کہ ہمارا خیال ایک اخبار کے فرائض کے متعلق کیا ہے؟ منزل مقصود کی تشریح کے بعد ہمارے ناظرین خود اس مشعل سے ہماری رہنمائی کر سکیں گے۔ اور ہم غلط چلیں گے تو یہ کہکر ہمیں روک دیں گے کہ:-

عزم سفر مغرب و رو در مشرق؟
اے راہرو منزل پشت بمنزل ہشدار!

جس وقت "ہمدرد" کا خیال پہلے پہل ظاہر کیا گیا۔ ہمارے معاصرین نے اسی وقت سے ہمارا نہایت گرم جوشی سے خیر مقدم کرنا شروع کر دیا۔ اس لئے اگر انصاف کو بھی ہاتھ سے دے دیا جائے۔ تب بھی ہماری ممنونیت ہر قدم پر ہمارا دامن پکڑے گی۔ کہ ہم اپنی احسان مندی کا اعتراف کریں۔ ہم کو ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہم ایک نیا آسمان اور ایک نئی زمین تیار کرنے آئے ہیں۔

دراصل منزل مقصود ہم سب کی ایک ہے گو شاید راستے کہیں کہیں مختلف ہوں۔ بقول ایک شاعر کے۔ ہمارے کارنامہ زندگی کی سچی داد مرنے کے بعد ملتی ہے۔ کیونکہ اس وقت وہ خوشامد اور رقابت کی قیود سے آزاد ہوتی ہے۔ مرنے والے کی خوشی یا رنج کی کوئی کیوں پرواہ کرے۔ وہ اگر ناراض ہوا تو کیا لے گا۔ اور خوش ہوا تو کیا دے گا؟ اس لئے جہاں کہیں میرے کلام پر تنقید شائع ہوتی۔ میں اس کا بہت ٹھنڈے دل سے مطالعہ کرتا۔ مگر ایسے نقاد کی تمنا ہی رہ گئی جو شاعر کے لئے نور ہدایت کہا جا سکے۔

... شاید بعض حضرات ہم سے یہ امید کریں کہ "ہمدرد" چونکھی لڑے گا، مگر ہمدرد کو درس و تدریس سے تعلق ہے نہ کہ دنگل سے ہمارا اصول تو ہوگا۔

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنئے
جو ناسزا کہے اس کو نہ ناسزا کہئے
رہے نہ جان تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان تو خنجر کو مرحبا کہئے

ہمدرد کا فرض ہوگا کہ روز سچی خبریں سنائے۔ ان خبروں کو پوری طرح سمجھنے کے لئے جن معلومات کا مہیا کرنا ضروری ہے وہ مہیا کرے ناظرین کے معلومات میں ہر روز اضافہ کرے تاکہ وہ خود رائے قائم کر سکیں۔ نہ اس کے رائے کے ہمیشہ محتاج رہیں۔

مگر یہ خیال نہ کیجیے کہ ہمدرد مسجد کا ملا ہوگا۔ تعلیم کا اصول یہی ہے کہ ایک چیز کا اسقدر کبھی مطالعہ نہ کیا جائے کہ طبیعت اکتا جائے۔ ہمدرد ملک و قوم کی ملاگیری کے اپنی رنگینی طبع سے احباب کی رونق محفل بھی ہوگا۔ سیاسیات کی توتو میں میں سب کے ساتھ نقد سخن کی جھنکار بھی سنائی دے گی۔ اختصار کے ساتھ مزے مزے کے افسانے بھی ہوں گے اور فلسفے کی پھیکی سیٹھی پھڑی کے لئے لطیفوں کی چٹنی چٹنی بھی دستر خوان پر موجود ہوگی۔ ہمدرد آپ سے سیکھے گا۔ اور آپ کو سکھائے گا۔ خود روئے گا۔ اور آپ کو رلائے گا۔ اور جس طرح ساون میں کبھی کبھی بدلی کے ساتھ ساتھ دھوپ بھی ہوتی ہے اور دھنک بھی اپنی نیرنگ سحر آرائی کی جھلک دکھا جاتی ہے۔ ہمدرد بھی ہنستوں کو رلائے گا۔ کبھی روتوں کو ہنسائے گا۔ !

اداریے

سر ایڈورڈ گرے اور برطانیہ کی مسلمان رعایا

شنبہ - ۱۶ر اگست ۱۹۱۳ء

برطانیہ کے وزیر خارجہ سر ایڈورڈ گرے نے اسلامی سلطنتوں کے ساتھ برطانیہ کے طرزِ عمل پر بحث کرتے ہوئے دارالعوام میں کہا کہ "ہمارا طرزِ عمل رواداری کے خلاف نہ ہونا چاہیئے۔ اور نہ ہم کو کسی اسلامی طاقت کے خلاف خواہ مخواہ اور بغیر کسی اشتعال کے دباؤ ڈالنا چاہیئے۔ لیکن سلطنت برطانیہ کے باہر کسی مسلمان طاقت کو ان نتائج سے بچانے کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔ جو اس کے اپنے فعل سے پیدا ہوں۔"

گزشتہ دو سال سے جو چیخ و پکار ہندوستان کے مسلمانوں میں ٹرکی اور ایران کے مصائب سے پیدا ہو گئی ہے اس کا اتنا تو اثر ضرور ہوا کہ انگلستان کے وزراء جب کبھی غیر ممالک کے ساتھ اپنے طرزِ عمل سے بحث کرتے ہیں تو ملک معظم کی اس سات کروڑ رعایا کا بھی خیال کر لیتے ہیں۔ جو ہندوستان میں ہے۔ اور اپنے کو مسلمان کہتی ہے مگر ہم نے سوائے زبانی تشفی اور لفظی تسکین کے کبھی ان کے طریقہ عمل میں کوئی بات ایسی نہیں دیکھی جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ فی الواقع مسلمانوں کے جذبات اور ان کی خواہشات کا کچھ خیال کیا جاتا ہے۔

بلکہ برخلاف اس کے بسا اوقات ان ذمہ دار عہدہ داران برطانیہ نے اپنے خیالات کا اظہار ایسے الفاظ میں کیا ہے جس سے صریح اس قلبی عداوت اور دلی بغض کا ثبوت ملتا ہے جو ان لوگوں کے دلوں میں اسلامی سلطنتوں کی طرف سے بھرا ہوا ہے۔ اور اس طرح گویا یہ اپنے ذاتی جذبہ کے سامنے مسلمانوں کے احساسات کی وہ پرواہ نہیں کر سکتے۔ جنگ بلقان کے متعلق حکومت برطانیہ کی روش کو جو ہم غور کرتے ہیں تو اس کے طرزِ عمل میں نہایت عجیب حیرتناک اضداد اور اختلافات قول و فعل پائے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے ٹرکی کو اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ نتیجہ جنگ خواہ کچھ ہی ہو ملکی حدود میں کوئی تغیر نہ ہوگا۔ مگر جس وقت مسٹر ایسکوتھ نے سالونیکا میں یورپ کی عیسائیت کے آغاز کا خواب دیکھا اس وقت سے ان کے قومی تعصب نے برطانیہ کی پالیسی خواہ مخواہ اس طور پر بدل دیا کہ "فاتح کو نتیجہ کے ثمرات سے محروم نہیں رکھنا چاہیئے" اور پھر جب ترکوں نے دوبارہ ایڈریانوپل پر قبضہ کر لیا تو ریاست ہائے بلقان کے لئے صرف ٹرکی ہی ایک ایسی چیز تھی جس کے لئے معاہدہ لنڈن کی پابندی ضروری تھی۔ باقی اور ریاستوں کو ایک جدید ہونے کی حیثیت سے یہ اختیار تھا کہ اپنے بزرگوں کی میراث کو جس طرح چاہیں آپس میں تقسیم کریں۔ اور معاہدہ کے ہوا خواہ صرف اس بات کی نگرانی کریں کہ ٹرکی اپنی حد سے آگے بڑھنے نہ پائے۔

ان تمام باتوں کے باوجود جب کبھی ان مدعیانِ عدل و انصاف کی زبان پر مسلمانوں کا ذکر آجاتا ہے تو بڑی شد و مد کے ساتھ بمصداق "مفت رم داشتن" ہم کو یقین دلایا جاتا ہے کہ کوئی وزیر ان معاملات پر گفتگو نہیں کر سکتا۔ بغیر اس بات کو مدنظر رکھے ہوئے کہ ملک معظم کی رعایا کروڑوں کی تعداد میں مسلمان ہے" مگر اس کے ساتھ ہی انتہائی رعایت جس کی امید دلائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ برطانیہ کا "طرزِ عمل رواداری کے خلاف نہ ہونا چاہیئے"۔ اور "نہ اسے کسی مسلمان طاقت کے خلاف خواہ مخواہ دباؤ ڈالنا چاہیئے"۔ گویا سر ایڈورڈ گرے اور اس وزارت کے نزدیک جس کے وہ نمائندے ہیں "کروڑوں مسلمان رعایا" کا حق سب سے بڑی اسلامی سلطنت پر"۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ وہ عدم رواداری (جسے غالباً سر ایڈورڈ گرے اور اقوام کے ساتھ جائز سمجھتے ہیں) کی دست درازیوں سے محفوظ رہیں گے۔

ہم نہیں سمجھتے کہ سر ایڈورڈ گرے کس بنیاد پر رعایا کی اتنی بڑی تعداد کو اپنی غیر ملکی پالیسی سے خارج کر دیتے ہیں؟ کیا مسلمانوں کی ذمہ داری برطانیہ کے اوپر اتنی ہی ہے کہ صرف اس کے "مقبوضات کے اندر مسلمانوں کے قومی جذبات اور احساسات کا لحاظ کیا جائے۔" حالانکہ جب کبھی ضرورت پڑی تو ہندوستان کی سرحد اور افریقہ میں ہم نے صرف گورنمنٹ کی خارجہ پالیسی کی حد اور اس کے اقتدار کے قائم رکھنے کے لئے اپنی اور اپنے عزیز بھائیوں کی جانوں تک کی پروا نہیں کی! کیا اس کے سبب سے ہیں مسلمان برطانیہ سے اسبات کا مطالبہ نہیں کر سکتے کہ جن سلطنتوں کے ساتھ ہم کو تاریخی اور مذہبی حیثیت سے ہمدردی ہے برطانیہ ان کے قیام و بقا میں مدد دے یا کم سے کم ان کے دشمنوں کے ساتھ ایسے معاہدوں میں نہ شریک ہو جو ان کی تباہی کا باعث ہوں؟

سر ایڈورڈ گرے نے غیر ملکی معاملات میں مسلمانوں کو مایوس کن جواب دینے کے بعد اس طرح پر اشک شوئی فرمائی ہے کہ سلطنت کے اندر ان کے تمام حقوق ملحوظ رکھے جائیں گے اور ان کے تمام مذہبی جذبات کا پورا پورا خیال رکھا جائے گا۔ اول تو ہم نہیں سمجھتے کہ وزیر خارجیہ کو اندرونی انتظامات کے متعلق کہاں تک اپنے اوپر ذمہ داری لینے کا حق حاصل ہے۔ اور دوسرے خود ہندوستان کے اندر جس طرح ان کی عرضداشتیں مسترد کی جا رہی ہیں وہ اسبات کا کافی ثبوت ہے کہ یا تو گورنمنٹ ہند پر وزارت کا کا کوئی اثر نہیں ہے یا مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ کرنے کا جو وعدہ کیا گیا تھا اس کا مقصود صرف موقع کو ٹال دینا تھا۔ یا گورنمنٹ ان جذبات کو مسلمانوں کے سچے جذبات تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے پہلی صورت یعنی گورنمنٹ ہند پر وزارت کا کسی قسم کا اثر نہ رکھنا کوئی شخص بھی تسلیم نہیں کرے گا۔ البتہ دوسری اور تیسری صورتیں بحث طلب ہیں جن میں سے ایک کو گورنمنٹ اور دوسری کو مسلمان تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ موجودہ واقعات جس بات کو ظاہر کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ گورنمنٹ یا کم سے کم ان حکام کے نقطۂ خیال سے جو گورنمنٹ کی نمائندگی کے مدعی ہیں، مسلمانوں کا تمام جوش و خروش صرف چند امور پر مبنی ہے جن کو اگرچہ انہوں نے بالتشریح کسی موقع پر نہیں بیان کیا ہے۔ مگر مختلف وقتوں میں مختلف طریقوں پر ان کا اظہار ہوتا رہا ہے۔

۱۔ مسلمانوں کے جذبات پر زیادہ تر گذشتہ دو برس کے اندر پے درپے ان واقعات کا اثر پڑتا رہا ہے جو ٹرکی ایران اور طرابلس میں ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں۔

۲۔ مسلمانوں کی ناراضگی میں کسی قدر تقسیم بنگالہ کی تنسیخ نے بھی اضافہ کیا۔

۳۔ ہندوستان کے اندرونی معاملات بالخصوص واقعہ کانپور کے متعلق چند شورش انگیز دل اور بعض فتنہ پرداز اخباروں نے بات کو بلا وجہ طول دے کر کچھ سے کچھ کر دیا۔

ان تینوں دلائل کے متعلق جو بعض حکام اور برطانوی سیاست دانوں نے وقتاً فوقتاً پیش کیے ہیں ہم حسب ذیل کہنا چاہتے ہیں۔

تقسیم بنگالہ سے اگرچہ مسلمانوں کی ایک کثیر آبادی کو فائدہ تھا لیکن چونکہ اس کے متعلق خود رعایا کا ایک بڑا طبقہ ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔ اور اس کی تنسیخ کا اعلان ملکتا ایک ایسی زبان سے کرایا گیا جس کا احترام ہندوستان کی قدیم روایات ملکی رسم و رواج اور مشرقی انداز طبیعت سے اس درجہ ثابت ہے کہ اس کی مخالفت بعض اوقات مذہبی گناہ کی حد تک پہنچ جاتی ہے اس لئے مسلمانوں نے آج تک اس کے خلاف آواز تک نہیں نکالی بلکہ مسلمانوں کو اس بات سے ایک گونہ خوشی ہوئی کہ وہ عظیم فصل جو ان کے اور ان کے ملکی بھائیوں کے درمیان بدقسمتی سے پیدا ہو گیا تھا، اب وصل ہوتا ہوا نظر آنے لگا۔ اگرچہ اس سودے میں مسلمان کسی قدر خسارے ہی میں رہے۔ البتہ حضور وائسرائے نے جو مراسلہ صاحب وزیر ہند کو بھیجا تھا۔ اس نے مسلمانوں کو یہ ضرور جرأت دلائی کہ وہ بھی اپنے مطالبات کو گورنمنٹ میں پیش کرنے میں پس و پیش نہ کریں۔ اور وہ مسلمان جو وفاداری کے یہ غلط اور بوسیدہ معنی

سمجھے ہوئے تھے کہ :-

گر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پروین

اس بات سے آگاہ ہو گئے کہ قوم کے صحیح اور سچے جذبات کو چھپانے کی کوشش کرنا ایک اخلاقی جرم ہے - اور لارڈ ماڈل، لارڈ ہارڈنگ اور لارڈ کریو کے اقوال سے ان کی ہمت بندھی کہ قوم کے صحیح اور سچے جذبات کو بجنسہ گورنمنٹ تک پہنچا دیں اور اپنے حقوق کے طالب ہوں

ٹرکی اور ایران کے واقعات نے جو کچھ ان کے دلوں پر اثر کیا وہ اظہر من الشمس ہے اور ان کی وجہ سے جو صدمے ان کے دلوں کو پہنچے ہیں اسے خود گورنمنٹ نے بھی اتنا ہی تسلیم کر لیا ہے - چنانچہ ہم محسوس کرتے ہیں - فرق صرف اتنا ہے کہ جہاں ہم ان کی بنیاد پر گورنمنٹ سے ہمدردی اور انتقامات ملکی میں ان احساسات کو ملحوظ رکھنے کی امید کرتے ہیں ، وزرا ایسی مصلحتوں کی بنیاد پڑتی ہیں وہ بزعم خود زیادہ اہم سمجھتے ہیں ان کو نا قابل لحاظ سمجھتے ہیں - اور یہی بنیادی اختلاف ہے - جو آج کل اس درجہ نمایاں ہے - اور جس قدر زیادہ ہماری طرف سے مسلمانوں کے احساسات کی اہمیت کو سمجھانے کی کوشش کی گئی - اسی قدر دوسری طرف سے ضد بڑھتی گئی - شاید اس وجہ سے کہ تنسیخ تقسیم بنگالہ کے اندرونی اثرات سے متاثر ہو کر یکایک گورنمنٹ نے ایشیائی مفہوم اقتدار کو اپنے زمین نشین کر لیا - اور مسلمانوں نے مغربی حقوق رعایا کو صحیح معنوں میں سمجھنا شروع کر دیا - علاوہ اس کے کہ مسلمان آزادی اور عصبیت کی حقیقت کو روز بروز زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھنے لگے انہیں یورپ کے موجودہ طرز عمل سے یہ یقین بھی پیدا ہو گیا کہ ان کا وجود خطرے میں ہے اور دنیا کے وسیع جغرافیہ میں کہیں ان کی تھوڑی یا بہت آزادی باقی ہے - یورپ اس کے مٹانے پر تلا ہوا ہے - یہ خطرہ حالات موجودہ کو دیکھتے ہوئے بالکل حقیقت معلوم ہوتا ہے - اور مسلمان کسی طرح اس کی طرف سے مطمئن نہیں ہو سکتے تا وقتیکہ وہ حکومت جس پر ان کی حفاظت کا دار ہے ان کی تسکین اور تشفی کے لئے عملی ذرائع نہ اختیار کرے - ہندوستان کی اندرونی بے چینی کے واقعات بالکل حال ہی میں ظہور پذیر ہوئے اور ہم کہہ سکتے ہیں ان میں سب سے زیادہ ہم اور بادی النظر میں سب سے زیادہ نمایاں کانپور کا حادثہ ہے - ہمارے خیال میں یہی ایک واقعہ ہے جس پر عالم و جاہل اخبار بین و نا اخبار بین ، شہری و دیہاتی ، کانگریسی اور کانفرنس پرست و ار جان تک متفکر ہیں اور ڈر کر اٹھے ہوئے ہیں اور یہی ایک واقعہ ہے جس کی افسوسناک صورت کے بعد ذمہ دار حکام کو برملا اور بہ تکرار یہ کہنے کی جرأت ہوئی ہے کہ بیرونی مفسدہ پردازوں اور شورش پسند اخباروں نے ہی مسجد کی شہادت کو مقامی سے ہندوستانی اور میونسپلٹی سے مذہبی رنگ دے دیا ہے - ممکن ہے کہ ان ملزمان معہود ذہنی میں ہمیں بھی شرف قبولیت حاصل ہو - لیکن ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ باوجود اخباری ذمہ داری و پبلک جرأت کے ہم نے اس معاملہ کو جس خاموشی کے ساتھ سمجھنے کی کوشش کی جو شاید کسی اور نے نہ کی ہو - ہز آنر جیمس مسٹن کی سرکار میں بذریعہ تار اور خطوط کے جس قدر روشنی اس معاملہ پر ہم لے ڈال سکتے وہ ناظرین کرام کی نظر میں ہو گی - لیکن جس وقت کہ ذمہ دار حکام کی اپنی غلطیوں سے یہ معاملہ طشت از بام ہو گیا - تو بجائے اقدام مفسدہ پردازی کے ہمیں اپنے بھائیوں سے اس سکوت کی معذرت کرنی پڑی جو ہم نے ہز آنر کے ساتھ رسل و رسائل کے دوران میں حاکم و محکوم کے تعلقات کو خوشگوار رکھنے کی توقع سے اختیار کیا تھا - ان سب امور پر نظر ڈال لینے کے بعد بھی اگر بقول بعض اینگلو انڈین اخبارات کے مسلمان گورنمنٹ کی توقعات سے بڑھ کر ترقی کر گئے ہیں - تو آئین سیاست و فرمانروائی اس امر کی متقضی نہیں ہے کہ مسلمانوں کو ان کی ذہانت و قابلیت پر الزام دیا جائے - بلکہ خود گورنمنٹ کا فرض ہے کہ جس انصاف شفقت اور رعایا پروری سے مسلمانوں کے سیاسی ، تعلیمی ، اخلاقی ، معاشرتی نشو و نما میں خود باغبانی کرتی رہی ہے اب اس انصاف ، شفقت اور رعایا پروری کو ملحوظ رکھ کر مسلمانوں کی موجودہ حسیات و ضرورت کا

مطالبہ کرے گی۔ اور جس طرح سے لارڈ منٹو نے ہندوستان کے نئے حالات و ضروریات کے مطابق ریفارم اسکیم کے نافذ کرنے میں ایشیائی مفہوم اقتدار کی آئین جہانبانی نہیں سمجھا اور نہ اس کے اجرا کرنے میں اپنی سابقہ پالیسی کی ہتک خیال کیا۔ اسی طرح ہم لارڈ کریو اور لارڈ ہارڈنگ سے ملتجی ہیں کہ وہ مسلمانان ہند کی حقیقی محسوسات کی تخفیقات کریں۔ اور جو کچھ مسلمانان خود گورنمنٹ ہی سے سائل وار مانگتے ہیں ان کو عنایت کریں۔

حی سنز
بلب اور پائپ
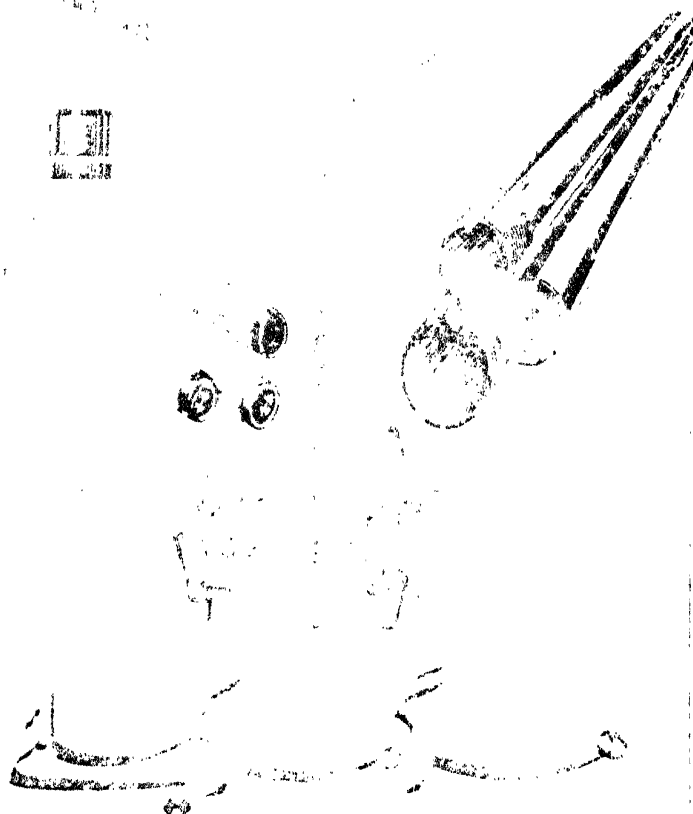
جنوبی افریقہ کے ہندوستانی

(چہارشنبہ ۱۹- نومبر ۱۹۱۳ء)

جن لوگوں نے کل کی اشاعت میں جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے حالات پڑھے ہوں گے ان کے دل یقینی اپنے ہم وطنوں کے مصائب سے پاش پاش ہوں گے اور ساتھ وہ اس کا بھی اندازہ کر سکتے ہوں گے کہ جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ کس قسم کی سفاکانہ اور ظالمانہ کارروائیاں روا رکھی جاتی ہیں۔ مسٹر گاندھی جیسا خیر خواہ ملک اور ہمدرد وطن اس وقت جیل میں ہے اور مسٹر پولاک دی پریذیڈنٹ نٹال انڈین ایسوسی ایشن لکھتے ہیں کہ جو ہندوستانی کام پر جانے سے انکار کرتے ہیں وہ تازیانوں اور ڈنڈوں کے زور سے بھیجے جاتے ہیں۔ گورنمنٹ نے اکثر کانوں کے احاطہ کو جیل خانہ قرار دے دیا ہے۔ اور وہاں سے بھاگنے والے کو گولی مار دینے کی اجازت دے دی ہے سینکڑوں ہندوستانی کوڑے مار مار کر کام پر بھیجے گئے ہیں اور کئی پر گولیاں چلائی گئیں جن میں سے دو زخمی بھی ہوئے۔

یہ حالات ایسے ہیں کہ جن کو سن کر ہر ایسے شخص کا دل جس میں انسانیت ہوگی ضرور ان بے کسوں کی ہمدردی کے لیے دکھے گا خصوصاً ہندوستانیوں کا جن کو ان کے ساتھ دعویٰ ہم وطنی بھی ہے۔ ہمارے لیے یہ وقت سخت امتحان کا ہے اور اگر اس وقت ہندوستانی اپنی عزت آپ نہ قائم کر سکے تو آئندہ ان کے لیے دنیا کے ہر حصہ میں ذلت و خواری مقدر ہے۔

یونین گورنمنٹ اس وقت اپنے طرز عمل سے ثابت کر رہی ہے کہ اس کو نہ تو ہندوستانیوں کے ساتھ ہمدردی ہے اور نہ اسے امپیریل گورنمنٹ کی مصالح ملکی کی پرواہ ہے۔ جو سختیاں ہندوستانیوں پر اس وقت جنوبی افریقہ میں ہو رہی ہیں اگر شاید اس کا دسواں حصہ بھی کسی ملک میں غیر ملکی رعایا کے ساتھ روا رکھی جائیں تو یہ بات یقیناً ان کے سیاسی تعلقات کو منقطع کر دینے کے لیے کافی ہوگی۔

لیکن اگر یونین گورنمنٹ اس وقت ہماری تذلیل اور ہماری حق تلفی کے درپے ہے تو ہمارا بھی فرض ہے کہ مردانہ وار ان سختیوں کا مقابلہ کریں اور جہاں تک ہمارے دست و بازو میں قوت ہے خدا پر بھروسہ کر کے اپنے مساعی ان مصیبتوں کے خلاف عمل میں لائیں۔ ہمارے لیے یہ بات بہت امید افزا ہے کہ خود ہماری گورنمنٹ ہمارے ساتھ ہے۔ اور امپیریل گورنمنٹ اور انگلستان کے با اثر اصحاب کی ہمدردی بھی مظلوم ہندوستانیوں کے ساتھ ہے۔ لیکن یہ امر قابل افسوس ضرور ہے کہ امپیریل گورنمنٹ باوجود ہندوستان اور جنوبی افریقہ کے مشترکہ حکمران ہونے کے اس بارے میں اپنا اثر جنوبی افریقہ پر ڈالنے سے ابھی تک قاصر رہی ہے جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کی اعانت یا بالفاظ دیگر اپنی عزت کی حفاظت کے لیے ہم کو اس وقت سب ذیل

ذرائع اختیار کرنے ضروری ہیں۔

(۱) جنوبی افریقہ کے مصیبت زدوں کے لیے کافی چندہ فراہم کرنا تاکہ وہ استقلال کے ساتھ خاموش مقابلہ میں قائم رہ سکیں۔

(۲) گورنمنٹ ہند کے ذریعہ سے امپیریل گورنمنٹ کو متوجہ کرنا کہ وہ بہ حیثیت مرکزی حکومت ہونے کے اپنے دو اعضاء کو باہمی تصادم سے باز رکھ سکے۔

(۳) اگر یونین گورنمنٹ اہل ہند کی مخالفت پر قائم رہے تو ہندوستان میں ایسے قوانین کا اجراء جن کے ذریعہ سے ہم اس بدسلوکی کا انتقام لے سکیں جو ہمارے ساتھ جنوبی افریقہ میں روا رکھی جاتی ہے۔

سلطنتِ برطانیہ اور اسکی مسلمان رعایا

(پنجشنبہ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۳ء)

جنگِ طرابلس کے زمانہ سے اب تک مسلمانوں نے طرح طرح سے حکومت برطانیہ کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ اپنی مسلمان رعایا کے جذبات کا لحاظ کر کے ٹرکی اغراض و مقاصد کی حمایت کرے اور اسے ہر قسم کی بے پروائی و ناانصافی سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرے برطانیہ کی وزارتِ خارجیہ کی طرف سے اسی قسم کی درخواستوں کا جواب مختلف طور پر دیا گیا لیکن تمام جوابوں کا خلاصہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ مسلمانوں کو برطانیہ کی خارجی پالیسی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ انہیں اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ بیرونی معاملات میں برطانیہ سے توقع رکھیں کہ ان کی درخواستوں پر عمل کیا جائے گا۔ اگرچہ مسٹر اسکوئتھ سر ایڈورڈ گرے اور دوسرے وزراء نے اس قسم کا جواب دیتے وقت یہ خیال رکھا ہے کہ نفسِ مطلب کو بیان کرنے سے پہلے مسلمانوں کے مذہبی حسیات کے احترام کا ذکر کر دیتے ہیں اور یہ کہہ دیتے ہیں کہ ان کے "جذبات کا لحاظ رکھا جائے گا"۔ لیکن جب ہم ان وزراء کے ان دلی خیالات اور ارادوں کو دیکھتے ہیں جو اکثر اوقات ان کی زبانوں سے ظاہر ہوتے رہے ہیں تو ہم کو یقین ہو جاتا ہے کہ ان کا رویہ ٹرکی کے ساتھ دوستانہ نہیں ہے اور گورنمنٹ کی طرف سے بھی جو جنگ طرابلس اور بلقان کے زمانے میں "غیر جانب داری کا اعلان" کیا گیا تھا اس پر جس طریقے سے عمل درآمد کیا گیا ہے اس سے ایک طرف تو ٹرکی کے ساتھ سرد مہری اور دوسری طرف اتحادیوں کی ہمدردی کا لوگوں کو شبہ ہوتا رہا ہے۔ پھر بھی گورنمنٹ نے جس طریقے پر ان اتحادیوں کی بے جا طرف داری سے احتراز کیا ہے اسے ہم ضرور مسلمانوں کے اس اثر پر محمول کرتے ہیں جو برطانوی حکومت کی کثیر التعداد رعایا ہونے کی وجہ سے انہیں حاصل ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا برطانیہ کی خارجی پالیسی پر مسلمانوں کا کوئی اثر پڑنا چاہیئے یا نہیں اور ایسا ہونا ممکن ہے یا نہیں۔ ٹائمس آف انڈیا لکھتا ہے کہ "مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ سلطنت کی مجموعی پالیسی میں ان کی کیا حیثیت ہے؟ ان کو حق حاصل ہے کہ بالخصوص مقدس مقامات کے متعلق وہ برٹش گورنمنٹ کو اس حد تک ذمہ دار سمجھے جیسا کہ مسٹر ایڈورڈ گرے نے بیان کیا ہے لیکن نہ تو وہ اور نہ حکومت کی رعایا کے کسی اور طبقہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ یہ خیال کرے کہ ایک وسیع سلطنت کی پالیسی ان کے ہم مذہبوں کی اغراض کے ماتحت ہوگی۔ ہم کو اس بات کے تسلیم کر لینے میں کوئی اعتراض نہیں کہ کسی سلطنت کی پالیسی بھی اتنی ہی وسیع ہونی چاہیے جتنی کہ ان کی وسعت ہے۔ لیکن مسلمان جو درخواست کرتے ہیں وہ اس وسعت سے باہر ہے یا ان کی درخواست کسی اور فرقہ یا ... کی اغراض کے مخالف ہے؟ اور ... کے مان لینے میں تو کسی کو بھی عذر نہ ہوگا کہ حکومتوں کا طرزِ عمل زیادہ تر رعایا کی خواہشات اور جذبات کے ماتحت ہوتا ہے، اور برطانوی حکومت

میں بہ لحاظ مذہب صرف تین طبقے ہیں، یعنی ہندو، مسلمان اور عیسائی۔ جن میں بہ لحاظ تعداد ہندو سب سے زیادہ ہیں۔ لیکن ان کے اغراض و مقاصد زیادہ تر ہندوستان سے وابستہ ہیں۔ رہ گئے عیسائی اور مسلمان ان میں سے عیسائی یا تو صرف برطانیہ کے باشندے ہیں یا ان نوآبادیوں میں رہتے ہیں جنہوں نے اپنی اغراض کو بہت حد تک مقامی بنا لیا ہے اور اپنے تعلقات کو مرکزی اثر سے آزاد کرنے کی کوشش میں ہیں۔ اگر ان ممالک پر نظر ڈالیے جن کے اندرونی اور بیرونی انتظامات کا تعلق زیادہ تر مرکزی حکومت سے ہے، تو ان میں زیادہ تر وہ ممالک شامل ہیں جن میں بکثرت مسلمان آباد ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ مصر و سوڈان جس پر ٹرکی ملکیت کا دعویٰ کرنے کو تیار ہے، کا یہ مسلمانوں سے آباد ہے، اور ایران و مسقط، عمان جہاں قانونی برطانوی حلقہ جات اثر قائم کئے گئے ہیں۔ خالص اسلامی ممالک ہیں۔ ایسی حالت میں اگر مسلمان جو بہ لحاظ آبادی دس کروڑ سے زیادہ ہیں کے اور بہ لحاظ وسعت دو براعظموں کے وسیع حصوں میں پھیلے ہوئے ہیں، اس بات کے خواہش مند ہوں کہ اپنی خارجیہ پالیسی میں برطانیہ ان تعلقات کو ملحوظ رکھے جو بلحاظ ہم مذہبی کی حیثیت سے اس کثیر آبادی کو دوسرے اسلامی ممالک مثلاً مصر، ٹرکی، طرابلس و ایران سے حاصل ہے تو ہم نہیں سمجھتے کہ ان کے دعوے کو کون معقول پسند سیاستدان بے جا تصور کرے گا۔ کیا برطانیہ اس بات سے بے خبر ہے کہ ٹرکی کی کمزوری اسے اتنا فائدہ نہیں پہنچا سکتی جتنا کہ اپنے رقیبوں کے مقابلہ میں اس کے لئے اندرونی استحکام ضروری ہے؟ مسلمانوں سے جو امداد بیرونی متنازعات کے موقعہ پر اسے مل چکی ہے، وہ محتاج بیان نہیں لیکن آئندہ کے لئے بھی اسے مطمئن نہ ہونا چاہیے اس لیے کہ اب اسے اپنے استحکام اور بقا کے لیے ایشیا میں مقابلے کرنے پڑیں گے۔ جن کے لیے اس نے گذشتہ چند سالوں کے اندر اپنی غلط پالیسی سے سامان پیدا کر لیا ہے۔ اور ان مقابلوں میں سلطنت کی حدود کا لحاظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کے سوا کوئی دوسری قوم برطانیہ کے لیے کارآمد نہیں ہو سکتی۔ اگر ایسے بدیہی دلائل کے باوجود بھی برطانیہ مسلمانوں کو اپنی غیر ملکی پالیسی سے خارج کرنے پر مصر ہے تو آئندہ کسی غیر متوقع نتیجہ کے پیدا ہونے کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔

مڈغاسکر میں اسلام

یکشنبہ ۱۰ر اگست سنہ ۱۹۱۳ء

سولھویں صدی عیسوی تک اہل یورپ کو اس جزیرہ کی عدم وجود کا بھی پتہ نہ تھا۔ سب سے پہلی دفعہ سنہ ۱۵۰۰ء میں پرتگالی کے ملاح اس جزیرہ پر اترے۔ لیکن اس زمانے سے کئی صدی پیشتر اہل عرب نے اس کو دریافت ہی نہیں کر لیا تھا۔ بلکہ شرقی اور شمالی مغربی سواحل پر بستیاں بھی بنا لی تھیں۔

صحیح طور پر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ عرب کس سن میں مڈغاسکر پہنچے۔ اس مسئلہ کے متعلق طویل بحثیں ہو چکی ہیں۔ مگر کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا اور اس معاملہ میں سوائے قیاس کے یا غالب قیاس کے یقینی بات نہیں کہہ سکتے۔ غالباً ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اہل عرب ہجرت سے پیشتر یہاں پر آئے۔ مشہور سیاح فلیکورٹ جو فورٹ ڈوفن کے فرانسیسی گورنر تھے اپنی ایک کتاب میں "ذنی ابراہیم" (ابراہیم کے چھوٹے بچے) کی قوم کا حال لکھتے ہیں جس نے اس وقت سینٹ میری کے جزیرہ میں اقامت اختیار کی لیکن انھوں نے اس وقت تک مذہب اسلام اختیار نہیں کیا تھا۔ موسیو اے گوڈیر کا یہ خیال ہے اور جس کے لئے وہ بہت سے دلائل بھی اپنے پاس رکھتے ہیں کہ "ذنی ابراہیم" کا قبیلہ عرب سے ضروری طور پر اس وقت رخصت ہوا ہوگا جب کہ (حضرت) محمد (صلعم) کی مذہبی اصلاحات کی وجہ سے ملک میں بہت گڑبڑ پڑ گئی تھی لیکن ذنی ابراہیم نے ترک وطن کے بعد اور بہت سے تارکان وطن ان کے پیچھے پیچھے گئے جنھیں یا تو سیر و سیاحت کا شوق کشاں کشاں لے گیا اور یا مخالف ہوا کی وجہ سے موزمبیق کے آبنائے میں داخل ہو گئے۔ ان کے بیچ میں اکثر رسول مکہ (صلعم) کے پیرو تھے۔ اس طرح سے عیسائیت سے عرصہ دراز پہلے اسلام مڈغاسکر میں رونما ہوا۔ جہاں ہر ایک مسلمان گویا اسلام کا واعظ تھا۔

مڈغاسکر میں اسلام کی تاریخ دو حصوں میں منقسم ہو سکتی ہے۔ پہلا حصہ تو وہ ہے کہ جس میں اہل عرب زمانہ ہجرت میں آئے اور تیرھویں صدی عیسوی تک برابر آباد رہے۔ دوسرے یعنی موجودہ حصہ کا آغاز اٹھارھویں صدی سے ہوتا ہے اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ عربوں کی سلطنت جو مڈغاسکر کے ساحل کے برابر پھیلی ہوئی تھی۔ یک قلم غارت کر دی گئی۔ پہلا حصہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے مادی یا سیاسی کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس اثنا میں مڈغاسکر کی شرقی اور شمال مشرقی آبادی وہاں کے اصلی باشندوں ملنے جلنے لگی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے اسلام قبول کر لیا۔ دوسرا حصہ اس نمایاں خصوصیت کی وجہ سے مشہور ہے کہ اس میں فاتحوں کے اسلامی خیالات مفتوحوں میں رائج ہونے شروع ہو گئے۔ یہ عمل ہمیشہ سے جاری ہے۔ اور اس میں اس وقت سے ایک قسم کی سرگرمی پیدا ہو گئی ہے جب سے کہ آخری پچاس سالوں میں ہندوستانی تجار کا عنصر آکر مل گیا ہے۔

ذنی ابراہیم اور ذنی امینیا کے فرقے جن کی سلطنت مشرقی مڈغاسکر کے ساحل پر پھیلی ہوئی تھی ان کے حالات اس قدر زیادہ ہیں کہ وہ اس مختصر کتابچہ میں نہیں سما سکتے۔ اور علاوہ ازیں عموم کو غالباً اس سے کچھ دلچسپی بھی نہ ہوگی۔ ان فرقوں کی سلطنت کے نشانات وہاں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ یہ سلطنت آخر میں بیرونی مخالفت اور اندرونی لڑائی جھگڑوں سے بالکل تباہ و برباد ہو گئی۔

یہ امر خاص طور پر قابل لحاظ ہے کہ باوجود اس کے کہ اسلام آٹھویں صدی سے مڈغاسکر میں رائج ہے لیکن جزیرہ کے اندرونی

حصہ میں اس کا مطلق اثر نہیں۔ ان تمام صدیوں میں عربوں کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں صرف ساحل ہی تک محدود رہیں۔ اور انہوں نے جزیرہ کی قدیم آبادی پر کسی قسم کا اثر نہیں ڈالا۔ حالانکہ اس نے عربوں سے حساب کتاب کے پیمانے، جنتری اور بعض بعض علم ہیئت کی باتیں سیکھیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جب عربوں کی سیاسی طاقت مغربی مڈغاسکر میں جا رہی تھی تو اس عرصہ میں جزیرہ کی قدیم آبادی نے اجنبی چیزوں کے قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ ان سے وہ دلی نفرت رکھتے تھے۔ یہ دلی نفرت اس وقت اور زیادہ نمایاں ہوئی جبکہ یوشینا کی مقامی حکومت نے عربوں کی حکومت کو مغلوب کر لیا۔ اس کے بعد عربوں نے فقط دینی اور تجارتی ترقی کرنے پر اکتفا کیا جو تمام کی تمام انہیں کے ہاتھ میں تھی۔ بہت عرصہ تک قدیم آبادی کی مخالفت شدید مدت جاری رہی۔ اور اس زمانہ میں اسلام کو بہت ہی کم ترقی نصیب ہوئی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ تمام تعصب اور مخالفت کا جوش جاتا رہا۔ انیسویں صدی سے اسلام بڑی تیزی اور وسعت سے ترقی کر رہا ہے اور وہاں کے لوگ اسلامی مراسم اور شعائر اختیار کرتے جاتے ہیں۔ عربوں نے وہاں عورتوں سے شادیاں کیں جنہوں نے رفتہ رفتہ اسلام کو قبول کر لیا۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ "سکالاوا" قوم کی ملکہ نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے۔ اور باوجود تبدیلی مذہب تخت سلطنت پر متمکن ہے۔

جزیرہ کی مسلمان آبادی آج کل اسلام کے پھیلانے کی سخت کوشش کر رہی ہے۔ یہ تحریک ان ہندوستانی تجار کی پیدا کردہ نہیں ہے جو بحر ہند میں تجارت کرتے ہیں۔ بلکہ یہ ذاتی طور پر پچاس برس سے رو پذیر ہو رہی ہے۔ ہر ایک مسلمان اس جزیرہ میں واعظ کا کام دیتا ہے ہندوستانی اس تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔ اور نہ وہاں کے مسلمانوں کے مشن میں مداخلت ہی کرنی چاہتے ہیں۔

اس تحریک کا اصلی سبب وہ بیداری ہے جو آج کل اسلامی ریاستوں میں پائی جاتی ہے۔ حال ہی میں عرب اور زنجبار کے مسلمانوں نے گاؤں گاؤں اور جماعت بندرگاہوں پر جا کر اپنے مقدس مشن کی براہ راست تبلیغ کی ہے وہاں کی اصلی آبادی پہلے موتیوں اور ہڈیوں کو تعویذ کے طور پر استعمال کیا کرتی تھی۔ مگر اب قرآن شریف کی آیتوں کو لکھ کر تعویذ بنا لیا جاتا ہے۔ مردوں کی نسبت عورتوں میں اسلام زیادہ رائج ہے۔

اگرچہ شمال مغربی حصہ ملک کی آبادی اسلام کی تعلیم کو پورے طور پر نہیں سمجھ سکتی تاہم اسلامی جماعت میں اپنے آپ کو شمار کرتی ہے اور اسلام کی روح سے سرشار نظر آتی ہے۔ چنانچہ محاربہ ٹرکی و بلقان کے آغاز پر یہ روح اور بھی پورے طور پر ظاہر ہو گئی۔ کیونکہ یہ ایک ایسا معاملہ تھا جب کہ دنیا کے تمام مسلمانوں نے خواہ شیعہ ہوں یا سنی۔ عرب ہوں یا ہندی۔ خلیفۃ المسلمین کی امداد کے لئے چندے بھیجے۔ جن پر "کمبخت عیسائیوں" نے حملہ کر دیا تھا۔ یہاں مسلمانوں نے یہ بات ظاہر کی تھی کہ ترک کبھی مفتوح نہیں ہوں گے۔ اور نہ خطرات کے وقت خدائے تعالیٰ اپنی نادیدہ طاقت سے دشمنوں کو غارت کر دے گا۔ اس جنگ کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ نام نہاد مسلمان بھی اسلام سے پورے طور پر وابستہ ہو گئے۔ اور خلیفۃ المسلمین کی الفت و محبت ان کے دلوں میں جاگزین ہو گئی۔

یہاں کے مسلمان بالعموم جاہل ہیں۔ حال ہی میں حدیدہ سے چند پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ عرب پہنچے ہیں۔ جو قرآن شریف کی تعلیم سے کما حقہٗ واقف ہیں۔

مڈغاسکر کے مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۷۵ ہزار ہے۔

(مسلم ورلڈ)

(عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے قلم سے)

سرویا میں اسلام

چارشنبہ ۱۱ جون ۱۹۱۳ء

میں نے کامریڈ میں مسلمانان چین اور روس کے متعلق مختلف مضامین کو گہری دلچسپی سے پڑھا ہے۔ اور اس مطالعہ کا اثر ہے کہ میرے دل میں قدرتی طور پر یہ خیال پیدا ہوا کہ قسطنطنیہ جاتے ہوئے میں سرویا اور بلغاریہ کے مسلمانوں سے واقفیت حاصل کروں۔ مجھے ان ریاستوں میں تقریباً دو ہفتے تک ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ اور میں خوش ہوں کہ اس قلیل عرصہ میں مجھے کافی مواقع مل گئے جن کی وجہ سے میں سچے اور قابل اعتبار حالات معلوم کر سکا۔

سرویا میں نِش اور دارالسلطنت میں مقیم رہا۔ بلگریڈ میں مجھے حضرت شیخ المفتیا کے مہمان ہونے کی عزت نصیب ہوئی۔ اور زیادہ تر یہی بزرگ میری معلومات کا ذریعہ ہیں۔ محترم تقریباً تیس سال کے ایک نوجوان عالم ہیں۔ لیکن کوئی شخص جس نے ہمارے ہندوستان کے علماء دیکھے ہیں۔ ان کے عالم ہونے کی نسبت رائے نہیں قائم کر سکتا۔ اگر ان کی وضع قطع دیکھنی ہو تو علی گڑھ کے کسی اولڈ بوائے کو دیکھ لیجئے۔ جہاں تک ان کی محدود آزادی ان کو اجازت دیتی ہے وہ سرویا میں اپنے ہم مذہبوں کے حالات کو بہتر بنانے میں مصروف رہتے ہیں۔ ہم نے آپس میں دنیائے اسلام کی موجودہ حالت کی نسبت اکثر مفصل گفتگو کی ہے۔ لیکن موقع اور محل کے خیال سے میں یہاں سروے مسلمانوں کے حالات لکھنے پر کفایت کروں گا۔

سرویا میں ان مسلمانوں کا شمار جو سروے حکومت کی رعایا ہیں بیس ہزار ہے۔ یہ تعداد گورنمنٹ کے اندراجات کے مطابق ہے۔ اور خود مفتی صاحب بھی اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ خاص بلگریڈ میں ایک اور دو ہزار کے درمیان غیر سروے مسلمان آباد ہیں۔ جو معمولی قسم کی تجارت کی غرض سے آتے ہیں۔ غیر ملکی بالعموم البانیا اور بوسینا کے باشندے ہیں۔ اور جب کبھی وہ سرویا آتے ہیں تو اہل وعیال کو تقریباً ہمیشہ اپنے پیچھے اپنے گھروں میں چھوڑ آتے ہیں۔ کیونکہ یہاں پر مسلمانوں کی ذاتی حفاظت کی بہت کم کفالت کی جاتی ہے۔

اگرچہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ سرویا سلطنت عثمانی کے زیر نگین تھا۔ مگر ان کی حکومت اور ان کے قبضہ کا کوئی نشان نہیں پایا جاتا۔ بلگریڈ میں ان کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے اگر اب بھی کچھ باقی ہے تو وہ چند ترکی توپوں کے علاوہ ترکی قلعہ کے کھنڈرات ہیں یا ایک حمام اور مشہور و معروف مجاہد مصطفیٰ پاشا کا مقبرہ۔ باقی تمام یادگاریں گورنمنٹ اور دیگر عیسائیوں کے ہاتھوں تمام و کمال برباد ہو چکی ہیں۔ مصطفیٰ پاشا کی قبر کی لوح مقبرے کے احاطہ سے باہر ٹوٹی پھوٹی پڑی ہوئی ہے۔ دروازہ کی محراب کا کتبہ سب کا سب مٹا دیا ہے۔ صرف ایک لفظ مصطفیٰ باقی رہ گیا ہے۔ یہ حرکت اس وقت کی گئی تھی جب کہ چند سال پیشتر عیسائی تعصب جو ہمیشہ کچھ عرصہ کے بعد عود کرتا ہے۔ بڑے زور و شور کے ساتھ پھوٹ نکلا تھا۔ سرویا میں اب کوئی ترک نہیں پایا جاتا۔ سوائے ان چھ خاندانوں کے جو نِش اور بلگریڈ میں آباد ہیں۔ بلگریڈ میں مجھے ایک ستر برس کے بوڑھے آدمی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جو ترکی دور حکومت کی یادگار ہے۔ جب میں نے اس

دریافت کیا کہ اس زمانے سے لے کر اب تک ملک میں کیا کیا انقلابات واقع ہوئے ہیں تو اس نے جواب دیا کہ "آفندم" صرف اتنا کہ یہاں جہاں اب مکان ہیں وہاں پہلے سڑکیں تھیں۔ اور جہاں جہاں اب سڑکیں ہیں وہاں پہلے مکانات تھے۔ جہاں پہلے مساجد تھیں وہاں اب قہوہ خانے نظر آتے ہیں۔ الغرض ہر جگہ اور خصوصاً بلغاریہ میں عیسائیوں نے کچھ نہیں چھوڑا۔ سرویہ میں مجھے پہلی دفعہ یہ بات معلوم ہوئی کہ عیسائی یورپ بلقان کے مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ کر چکا ہے۔ اور ابھی تک کر رہا ہے۔ میرا تن کانپنے لگتا ہے جب میں یہ خیال کرتا ہوں کہ اگر یورپ کے ظالم ہاتھ کو نہ روکا گیا۔ جیسا کہ یقین ہے کہ ترکی روک سکے گی۔ تو خدا جانے آگے چل کر مسلمانان بلقان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ اگر میں اس مضمون کو ذرا زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کروں تو مجھے ڈر ہے کہ میں اس مضمون کے موضوع سے باہر نکل جاؤنگا۔ اگرچہ میں نے جو کچھ خود اپنی آنکھوں دیکھا اور کانوں سنا ہے اس نے مجھے بالکل دیوانہ کر دیا ہے۔

مسلمانوں کی مادی حالت بہت خراب ہے۔ اور جو کچھ سیاسی و اقتصادی اور تمدنی دباؤ ان پر ہمیشہ ڈالا جاتا ہے اسے دیکھ کر کہا جا سکتا ہے کہ ان کی حالت کیوں خراب نہ ہو۔ اس کے خلاف ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ ملک بھر میں ایک مسلمان بھی دولت مند نہیں ہے سوائے چند لوگوں کے جو معمولی حیثیت سے گزر کرنے کے قابل ہو سکے ہیں۔ [illegible] تمام [illegible] میں باقی سب کے سب کاشتکاری یا مزدوری کر کے پیٹ پالتے ہیں۔ سرویہ سیاست کا سارا [illegible] یہ ہے کہ مسلمانوں کو [illegible] چھین لیا جائے تاکہ ضروریات سے بے بس ہو کر وہ یا تو مر کھپ جائیں یا مذہب عیسوی قبول کر کے عیسائیوں میں [illegible] ہو جائیں۔ لیکن مسلمان اگرچہ متاع دنیوی کے اعتبار سے مفلس ہیں تاہم وہ ان علمی اخلاقی اور تمدنی نیکیوں اور برکتوں سے مالا مال ہیں جو اسلام کے [illegible] ہیں۔ وہ ملک بھر میں ہر جگہ سادہ تر اور پاکیزہ تر زندگی بسر کرنے والے مشہور ہیں۔ شراب خوری، قمار بازی اور بدکاری کے اخلاقی نتیجے ان میں نسبتاً مفقود ہیں۔ عیسائیوں کی بہ نسبت ان کی خاندانی زندگی بزرگ قبیلہ کے زیادہ تحت حکم ہے۔

عورتیں آزادی کے ساتھ باہر آتی جاتی ہیں۔ لیکن پردہ کا رواج ہے۔ اور ان کا تمام جسم اور چہرے کا زیادہ حصہ ڈھکا رہتا ہے۔ تعدد ازدواج شاذ و نادر بلکہ معدوم ہے۔ غرباء کے طبقہ میں مرد و عورت کا لباس عیسائیوں کے لباس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اور میرا یقین ہے کہ اس اختلاف کی وجہ ضروریات زندگی کی خصوصیات، رسم پردہ اور عیسائیوں سے ممتاز رہنے کی خواہشیں ہیں۔

لیکن ان کی پہچان کی سب سے زیادہ آسان علامت ترکی ٹوپی ہے۔ کیونکہ یہ رفتہ رفتہ یقینی طور سے دنیا بھر کے مسلمانوں کا قومی لباس بن رہی ہے۔ [illegible] کے مسلمان اگرچہ نسلاً سرویہ ہیں تاہم وہ اپنے غیر مسلم ہم وطنوں سے خد و خال میں بھی مختلف ہیں۔ میرے خیال میں اس کا سبب یہ ہے کہ [illegible] کے حالات شکل و شباہت پر اپنا اثر ڈالتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ مسلمان سرویہ عام شباہت میں ملتے جلتے ہیں تو نمایاں غلط نہ ہوگا۔ جو لوگ خوش حال ہیں یا ترک ہیں وہ یورپین یا ترکی لباس پہنتے ہیں۔ اور با اعتبار طرز ماند و بود ترکوں سے زیادہ مختلف نہیں ہیں۔

[illegible] کی موقوفات مسلمانوں کے سربراہ ہیں۔ ان کے لئے زردار [illegible]۔ انہیں ہر وقت [illegible] عیسائیوں کے حملہ اور بیگار دباؤ کا [illegible]۔ کاشتکاروں کی حالت بعینہ غلاموں کی سی ہے۔ تمام خدمت جو [illegible] ان کے ساتھ کیا جاتا ہے وہ وحشیانہ اور بے رحمانہ ہوتا ہے۔ ان کی بیخ کنی یا جبری تبدیلی مذہب کے تمام خلاف قانون اور مجرمانہ کوششوں میں گورنمنٹ ہمیشہ معاون رہتی ہے۔ ترکی گورنمنٹ کی مداخلت کی وجہ سے انہیں صرف چند ہی سال سے اس امر کی اجازت ملی ہے کہ وہ مساجد میں جا کر علانیہ نماز پڑھ سکیں۔ اور

تمام مقامات کی سماعت شیخ المفتیان خود کرتے ہیں۔ لیکن ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ شریعت کے قانون کو چھوڑ کر قانون دیوانی کے تحت حمایت آجائے۔ ان اسلامی عدالتوں میں قانون شہادت اور ضابطہ فوجداری و دیوانی بھی اسلامی ہے۔

اسلامی دنیا کے اتحاد کا خیال سب مسلمانوں کے دلوں میں بھی موجود ہے۔ خطبہ خلیفہ کے نام کا پڑھا جاتا ہے۔ جو یہاں محمد خلیفہ محمد رسول اللہ کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔

اس وقت ترکی کی لڑائی نے گہرے تعلقات کے احساس کو بیدار کر دیا ہے۔ اور میں نے یہ واقعہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ مسلمانوں کے گروہ ہر شام شیخ المفتیان کے پاس آیا کرتے تھے۔ اور طرابلس کے مجاہدین کے متعلق تازہ خبریں سنا کرتے تھے۔ ترکوں کی فتح کے لئے ہر روز دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ اور تقریباً ہر مہینہ ایک معتدبہ رقم انجمن ہلال احمر کے نام روانہ کی جاتی ہے۔

جو مآل و مستقبل دنیا کے دوسرے حصوں کے مسلمانوں کا ہونے والا ہے میں نہیں کہہ سکتا کہ وہی مآل و مستقبل ان بیس ہزار مسلمانوں کا ہوگا۔ اسلام میں ایک قسم کی حرکت پیدا ہو گئی ہے اور جو قدم بڑھا ہے آگے ہے۔ گو ایک منتظم ترقی کی جانب بڑھ رہا ہے لیکن ابھی تک یہ ایک ایک متلاشی حیات اندھا جذبہ ہے۔ جو ایک زبردست اور باخبر قوت ارادی کا منتظر ہے۔ اور جس کا آنا اپنے وقت پر یقینی ہے اس کے لئے سب کو سعی کرنا چاہئے۔

لے حبیب الرحمٰن سیوہاروی - عبدالرحمان بجنوری مرحوم شارح کلام غالب - ش حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

بلغاریہ میں اسلام

یک شنبہ ۲۲ ؍ جون ۱۹۱۳ء

سرویا کے دارالخلافہ سے رخصت ہو کر میں بلغاریہ کے دارالسلطنت میں آیا۔ جب میں صوفیہ پہنچا تو میری نظر دور سے ایک گرجا پر پڑی جو روسی اور بازنطینی طرز کا تھا۔ جس کے گنبد کا سنہری کلس بڑی تیزی سے چمک رہا تھا میرے زیادہ قریب آنے پر اس کی قد و قامت میں اضافہ ہوتا جاتا تھا حتیٰ کہ جب میں اس کے نیچے آیا ہوں۔ تو سامنے بس اسی کی تصویر دکھائی دیتی تھی اور اپنی لطافت کا اظہار کر رہی تھی۔ بلقان کے دوسرے دارالخلافوں کی طرح صوفیہ بھی ایک نیا تعمیر شدہ شہر ہے۔ شہر کی عمارتیں علی العموم بیش قیمت بنانے کے علاوہ اعلیٰ اصول انجینیری کے مطابق بنائی گئی ہیں۔ اور عمارتوں کی یکسانیت کے اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ دراصل صوفیہ کسی دوسرے شہر کی نقل ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا سینٹ پیٹرزبرگ ہے۔ جو اہل مشرق کے حلقۂ اثر سے نکلنے کے لیے اہل مغرب کی ایک ناکامیاب بغاوت کا اظہار کرتا ہے۔ آبادی مختلف عنصروں سے مرکب ہے۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ ایسی ریاست کے دارالخلافہ میں جو ابھی سلطنتِ عثمانیہ کی شہنشاہانہ سیادت سے علیحدہ کی گئی ہے۔ کوئی مسلمان نہیں ہے۔ یہاں پچاس سے زیادہ ترک آباد نہیں ہیں۔ مگر باوجود اس کے میں نے یہ معلومات حاصل کر لیں کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ اور یہی امر میرے لیے باعثِ تسکین تھا۔

دوسرے روز میں تفریح کے طور پر لنگانزو سڑک پر اچھی پوشاک پہنے ہوئے آدمیوں کے انبوہ کثیر میں سے گزر رہا تھا جن میں بہت سے فوجی افسر بھی اپنی وردیاں ڈاٹے جا رہے تھے۔ جن کی تلواریں سڑک پر گھسٹتے وقت کھڑکھڑاتی تھیں۔ یورپین لباس کی رونق کو ماند کر دینے والی یکسانیت سے میں بہت پریشان ہو رہا تھا۔ اتنے میں میری آنکھیں ایک عورت کی بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں میں پڑیں جو میرے پاس ہی کھڑی تھی۔ اس کے بال اس کی آنکھوں کی پتلیوں کی طرح سیاہ تھے اور اس کی ناک پتلی اور اونچی تھی۔ اس کا رنگ میری طرح سیاہی مائل ہو رہا تھا اور مسکراتے وقت اس کے دانت نہایت تیزی سے چمکتے تھے۔ سر پر ایک سفید دوپٹہ پڑا تھا جس نے اس کے سیاہ بالوں کو ڈھانک رکھا تھا۔ وہ بہت چپ چاپ اور غریب نظر آتی تھی۔ مگر ایسی کونسی بات تھی جس کی وجہ سے اس نے خاص مجھے ہی اپنی خوبصورت اور مؤثر آنکھوں سے ایک جگہ قائم کر دیا؟ میں نے اس کو ہر ایسے ممکن طریقہ سے مخاطب کیا جس میں کہ میں اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا۔ لیکن نہ تو اس نے میری بات سمجھی [illegible]

انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں جامع مسجد دکھانے لے جاؤں گا۔ اور اپنے قلم کو رکھ کر جو ابھی ان کے ہاتھ ہی میں تھا انھوں نے اپنا ہاتھ دراز میں ڈالا۔ اور ایک ریوالور نکال کر پہلو کی جیب میں ڈال لیا۔ مجھے بعد میں دوسرے اشخاص سے معلوم ہوا کہ یہ کارروائی محض احتیاط کے طور پر ہی نہیں ہے۔ بلکہ جہاں تک ان کا تعلق ہے۔ نہایت ضروری ہے۔ مسجد اسلامی اور بازنطینی طرز کی عمارت ہے۔ اور اندر سے نہایت خوبصورتی کے ساتھ آراستہ کی گئی ہے۔ ایک قاری نہایت خوش الحانی سے قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا۔ اور بہت سے اشخاص بہت توجہ کے ساتھ بیٹھے سن رہے تھے۔ مسجد کے متصل ایک کلب ہے جہاں ہر شام کو پندرہ اور پچیس کے درمیان نوجوان مسلمان جمع ہوتے ہیں۔ اور ترکی اخبارات پڑھنے کے علاوہ قہوہ پیتے اور اپنے مواشل اور سیاسی معاملات پر رائے زنی کرتے ہیں۔ یہاں سے ہم مفتی صاحب سے ملنے کے لیے اسلامی مذہبی عدالت میں گئے اور ہمیں پہلے ہی وقفہ پر اندر بلا لیا گیا مفتی صاحب جو ایک بزرگ صورت شخص ہیں سبز لباس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ سر پر ترکی ٹوپی اور پر عمامہ بندھا ہوا تھا۔ ان کے اسسٹنٹ (نائب) پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ دو سرشتہ دار بھی دائیں بائیں تھے۔ گفتگو قدرتی طور پر اسلامی دنیا کی موجودہ پست حالی پر ہوئی۔ میں نے آخر میں پوچھا کہ جناب اب کیا کرنا چاہیے۔ بلغاریہ کے مفتی اور دوسرے بزرگ نے جو جواب دیا۔ وہ حسب ذیل ہے۔

سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ بوسیدہ اسلامی طریقۂ تعلیم میں جو تمام دنیا میں رائج ہے۔ آزادانہ طور پر نمایاں اصلاح کی جائے۔ ایشیا، یورپ اور افریقہ کی پرانی مذہبی درس گاہیں جو طالب علم کو ملا گری کے علاوہ اور کسی کام کا نہیں رکھتیں (اور یہ امر اسلام میں ہرگز جائز نہیں ہے) دنیا میں ہمارے ادبار اور پستی کا سب سے بڑا سبب ہے۔ مولوی جیسکر اسلام کا ایک با کار ممبر ہونا چاہیے نہ کہ خوشامد سے اپنے حلوے مانڈے کا خیال رکھنے والا ہو۔ اس گفتگو کے بعد قہوہ پیش کیا گیا۔ اور ہم رخصت ہوئے۔ دوسرے دن ایڈیٹر صاحب نے بلغاریہ کے اسلامی مدارس کے ڈائرکٹر نعیم آرکی سے تعارف کرایا۔ وہ پکے یعنی بلغاری مسلمان ہیں۔ وہ مذکورہ بالا ارکان ثلاثہ کے دوسرے ممبر ہیں۔ انھوں نے جو کوشش مسلمانوں میں موجودہ علوم پھیلانے کے متعلق کی ہے۔ اس کا مقابلہ کسی دوسرے شخص کی کوششوں سے نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے حال ہی میں صوفیہ میں ایک نارمل اسکول قائم کیا ہے۔ اور وہ اپنی دیگر تجاویز کو بھی جو فی الحال ان کے دماغ میں ہیں۔ بہت جلد ہی عملی صورت میں لانے کی کوشش کریں گے۔ وہ مجھے اپنا اسکول دکھانے کے لیے لے گئے۔ عمارت کی مرمت ہو رہی تھی۔ عمارت اگرچہ بہت وسیع ہے مگر معمولی۔ لیکن جیسا کہ سب کو معلوم ہے علی گڑھ کالج میں درس گاہ کی ابتدا بھی ایک معمولی سے بنگلے سے شروع ہوئی تھی۔ اس نارمل اسکول کے قیام کی سب سے زیادہ ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ اس کے اجرا سے ان بلغاری قوانین کے برے اثر کی روک تھام کرنی مقصود تھی۔ جو کسی ایسے شخص کو اسلامی مدرسہ میں ٹیچر بننے کی اجازت نہیں دیتے جو بلغاری نہ ہو۔ مذکورہ بالا اسکول کا اسٹاف بہت قابل ہے۔ اس کی لائبریری عمدہ ہے۔ اور اسکول میں سے

اب تک اچھے اچھے قابل ماسٹر پیدا ہو چکے ہیں۔ ڈائرکٹر صاحب موصوف اس مقصد کو ترقی دینے کے لیے ترکی زبان میں تعلیم کے متعلق ایک رسالہ بھی نکالتے ہیں۔

آج سہ پہر کو میرا تعارف ایک ایسے معمر عیسائی شریف آدمی کے ساتھ کرایا گیا جنہوں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ ایک طویل گفتگو میں بلغاریہ کی مکمل تاریخ بیان کرنے کے بعد انہوں نے ظاہر کیا کہ یہ ہماری سب سے بڑی بدقسمتی ہے کہ عثمانیوں کو ہم پر حکومت کرنے سے آہستہ آہستہ ہٹا دیا گیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں یہاں کچھ آزادی نہیں ہے۔ ترکی کے عہد حکومت میں دراصل ہم ملک پر حکمران تھے۔ لیکن اب باوجودیکہ گورنمنٹ ہماری ہے۔ غیر ہم پر حکومت کر رہے ہیں۔ ہم بذات خود نہ لڑائی کر سکتے ہیں —— اور نہ صلح کر سکتے ہیں۔ ہمیں روس کے ہاتھ فروخت کر دیا گیا ہے۔ جب کبھی ہمیں حکم دیا جاتا ہے۔ ہم کو مجبوراً ٹرکی کے ساتھ لڑنا پڑتا ہے۔ جس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ ٹرکی کی قوت کمزور کر دیں اور اپنے آپ کو تباہ کر لیں۔ ترک اگرچہ عدل کرنے میں سخت تھے ان کا انصاف مساوی ہوتا تھا۔ لیکن اب ہمارے جج صاحبان غیر مطبوع جماعتوں اور مردوں کے حقوق کو غارت کرنے کے لیے اعلیٰ یورپین ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں۔ ترک تمام مذاہب کے یکساں محافظ تھے۔ مگر اب کسی مختلف فرقوں کے عیسائیوں کو بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ یہ تمام خوب صورت عمارتیں جو آپ برابر دیکھ رہے ہیں ان میں سے ایک ہی نہیں —— بلکہ ان سب کو ہمارے گھروں کے کھنڈرات پر غیر ملکی سرمایہ داروں نے تعمیر کرایا ہے۔ آہ جہاں جہاں آپ کو یہ مکانات نظر آتے ہیں وہاں کسی زمانہ میں ہمارے پسندیدہ گھر واقع تھے۔ ہمارے ہی گھر آباد تھے۔

شام کو میں بند کا باغ دیکھنے کے لیے گیا۔ اور اس اثنا میں خلیل زکی نے مجھ سے کہا کہ "احمد فائق بے آپ کی شام کی دعوت کرتے ہیں —— جو آپ کو خوشی سے مطلوبہ واقفیت بہم پہنچائیں گے"۔ یہ باغ ایک پارک معلوم ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے ساکن پانی کا ایک تالاب تھا شفق پھولی ہوئی تھی۔ سڑک پر سلافی اور یونانی خط و خال کی عیسائی عورتیں اور مغربی جرمنی کے لباس میں جا رہی تھیں۔ فوجی افسر بھی سفید کوٹ اور نیلی برجس پہنے ہوئے چل رہے تھے۔ اور عورتیں عموماً پیرس کے جدید ترین لباس میں تھیں۔ اعلیٰ یہ نظارہ شمالی یورپ کے منظر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ صرف کبھی کبھی جب کہ کوئی البانی یا کرد کسی عمدہ لباس میں گذر جاتا تھا۔ یا دور سے کالی اور سرخ ترکی ٹوپی دکھائی دے جاتی تھی۔ یا برقع پوش مستورات کا سریلا قہقہہ سننے میں آجاتا تھا۔ اس وقت میں اپنے آپ کو مشرق کی سرحد پر محسوس کرتا تھا۔

واپسی پر میں نے تمام مسجدوں میں چراغاں دیکھا کیوں کہ نئے چاند نے ماہ رمضان کی آمد کو مشتہر کر دیا تھا مسجدوں میں چراغاں ایک تو ماہ رمضان میں کیا جاتا ہے اور دیا خلیفۃ المسلمین سلطان المعظم کی سالگرہ کے دن۔ مجھے آج شام نو اشخاص سے [illegible] ۱۹۱۰ء سے مل کر نہایت مسرت حاصل ہوئی۔ تقریباً سب کے سب ہونہار نوجوان ہیں۔ جنہوں نے قسطنطنیہ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ [illegible]

کے تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ بھی عوام و قوم اپنے ملک میں اسلام کے دورِ جدید کا آغاز اور منبع امید سمجھے جاتے ہیں۔ احمد فائق بے جوار کان ثلاثہ کے تیسرے ممبر ہیں۔ بلغاریہ کے سب سے بڑے سوداگر ہیں۔ ان کی مقامی تجارت بہت وسیع پیمانہ پر جاری ہے۔ اور ملک میں سب سے بڑے دوکان کے مینیجنگ پروپرائٹر ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ نہایت خوشی سے بمبئی، کلکتہ اور رنگون کے تاجروں سے اسلامی تجارت کو وسیع کرنے کے متعلق نامہ و پیام کریں گے۔ یہ جلسہ آدھی رات تک ہوتا رہا۔ خلیل ترکی میرے ترجمان تھے۔ اور ترکی سے جرمنی زبان میں اور جرمنی سے ترکی میں ترجمہ کرتے جاتے تھے۔ نسل، ملک، رنگ اور زبان کے فرق کے باوجود ہم ایک دوسرے سے اتنے قریب اور متحد معلوم ہوتے تھے کہ گویا میں بلغاریہ میں پلا بڑھا ہوں۔ فی الحقیقت اسلامی اخوت کے یہی معنی ہیں ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستان ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

اس آرٹیکل کے دوسرے حصہ میں میں نے اپنی گفتگو اور بحث کا نتیجہ اختصار کے ساتھ درج کر دیا ہے رمضان کی پہلی تاریخ کو میں نے صبح کے وقت سرحد پر چند بے کس بلغاری مسلمانوں کے قتل کی خبر سنی۔ جن کو عیسائیوں نے قتل کیا تھا اور اس قتل میں جندرمہ اور پولیس نے خاص طور پر نمایاں حصہ لیا تھا۔ بلغاری جنہیں ان کی دغاباز گورنمنٹ ابھارتی رہتی ہے۔ مسلمانوں کے دیہات جلانے اور لوٹنے کے عادی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ دل ہلا دینے والے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ ننھے بچوں کو تلوار کے سپرد کرتے ہیں۔ اور غیر محفوظ بیلا! عورتوں کی عصمت دری کرتے ہیں۔ یہ تمام کارروائی افسروں کے بھڑکانے اور تقویت دینے سے اس لیے کی جاتی ہے کہ مسلمان یا تو ملک بدر ہو جائیں اور یا عیسائیت قبول کر لیں۔

سہ پہر کو میں مسلمانوں کا ایک گاؤں دیکھنے کے لیے گیا۔ وہاں بہت سے بوڑھے آدمی موجود تھے جن کی کمریں بڑھاپے کی وجہ سے خمیدہ ہو گئی تھیں۔ مگر باوجود اس کے وہ نہایت فخر کے ساتھ اپنا سر بلند رکھتے تھے۔ بوڑھی عورتیں بھی اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو کھیت میں کام کرتے ہوئے دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھیں۔ اور ان کے کاموں میں مدد دیتی تھیں۔ یہاں کی عورتیں برقعہ نہیں اوڑھتیں۔ چند لڑکیاں نزدیک ہی آہستہ آہستہ دبے لہجہ میں اپنے ہاتھ دونوں رانوں پر رکھ کر باتیں کر رہی تھیں۔ دو جپسیوں کی گاڑیاں ذرا فاصلہ سے کھڑی تھیں۔ کچھ عورتیں اپنے بچوں کو بغل میں دبائے ہوئے جلدی جلدی اس طرف جا رہی تھیں۔ بعض عورتیں شام کا کھانا پکانے کیلئے آگ جلا رہی تھیں۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں نے خیال کیا کہ "پریاں" مجھے ارضِ مقدس میں ملنے آئی ہیں۔ اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ہے۔ واللہ ان لوگوں کی زندگی کیسی پاکیزہ اور سادہ ہے۔ اور اس پر طرہ یہ ہے کہ یہی لوگ ان لوگوں کے وحشیانہ مظالم کا شکار رہتے ہیں جو اپنے آپ کو شہزادۂ امن یعنی مسیح علیہ السلام کی امت میں شمار کرتے ہیں۔ چند سال پیشتر ہزاروں تلواریں اس ذلت کا انتقام لینے کے لیے یہاں سے باہر نکل

سکتی تھیں جو ان بے گناہ کنواریوں کے ساتھ روا رکھا جاتا تھا۔ مگر اب خلیفہ کی حکومت باقی رہی۔ جب کہ میں اُن میں سے ایک بوڑھے آدمی کے سامنے کھڑا ہو کر اس کی زبان سے ترکوں کی گذشتہ عظمت و شان و شوکت کے افسانے سن رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ اس کی چمک دار آنکھیں آسمان کی طرف دیکھ رہی ہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ مستقبل کو دیکھ رہا ہے۔ اس نے مجھ سے اور میرے ہمراہی سے کہا کہ ترکیہ نے کچھ انتشار [illegible] نے اپنے دین سے علیحدگی اختیار نہیں کی ہے۔ وہ پھر اسلام کی عظمت اور شان کو دوبارہ ظاہر کر دے گا انشاء اللہ تعالیٰ۔

آدھی رات کو میں نلیبہ سے قسطنطنیہ روانہ ہوا۔ میں یہاں اگرچہ ایک اجنبی کی طرح آیا تھا تاہم رخصت ہونے پر مجھے وعدہ کرنا پڑا کہ یہ آخری ملاقات نہیں ہے۔ بلکہ میں انشاء اللہ پھر آؤں گا۔

ترکوں کے عہد سلطنت میں بلغاریہ میں ۲۰ لاکھ مسلمان آباد تھے۔ لیکن روس و ترکی کی جنگ کے بعد جب کہ ملک پر بلغاریوں کی [illegible] قائم کر دی گئی تھی تو ہزاروں آدمی خود اپنی مرضی سے ترکی میں ہجرت کر گئے تھے۔ [illegible] اور خود مختار ہو چکے تھے نئے دور حکومت میں [illegible] اخراج کا [illegible] عیسائی حکومت نے ان کے ساتھ روا رکھا [illegible] جائداد اور قتل عام تک کے تمام ذرائع ان کے خلاف استعمال کیے گئے [illegible] ملک سے رخصت ہو جائیں۔ ان ذرائع [illegible] روس سے جاری [illegible] عیسائی تعصب [illegible] گھٹ [illegible] ہے۔

[illegible] مسلمانوں کی تعداد صرف ساڑھے نو لاکھ ہے [illegible] ہیں خاص طور پر [illegible] بلغاریہ میں جو اسلامی آبادی [illegible] چھبیسویں [illegible] مسلمان بالعموم سرحدی شہروں کے قریب دیہات میں آباد ہیں۔ جن میں سے بعض میں خاص اسلامی آبادی ہے۔ بعض بڑے بڑے اسلامی مقامات کے نام [illegible] پلیوتا ایڈس اور دیدان میں مسلمان آبادی ترکی [illegible] بلغاری میں جو خاص طور پر رہنے والے ہیں اور جنہوں نے مذہب اسلام قبول کر لیا ہے۔ برخلاف اس کے جپسی ایک ایسی خانہ بدوش قوم ہے۔ جو کسی مقام کو اپنا وطن نہیں بناتے۔ علاوہ ازیں ان کی نسل بھی نامعلوم ہے۔ ترک آبادی کا زیادہ حصہ [illegible] پوچک دس فیصدی سے زیادہ نہیں ہیں باقی سب جپسی ہیں۔ ترکوں اور جپسیوں کی زبان ترکی ہے۔ پوچک عام طور پر بلغاری زبان بولتے ہیں۔ لیکن ان میں سے بہت سے ترکی زبان بھی سمجھتے ہیں۔

دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے مسلمان تین جماعتوں میں منقسم ہو سکتے ہیں۔ پہلی جماعت سوداگروں کی قلیل تعداد پر مشتمل ہے۔ جو ملک کی تجارت میں بلغاری عیسائیوں کے ساتھ مساوی حقوق کے حصہ دار ہیں۔ لیکن چونکہ بڑے پیمانہ کا

تمام کاروبار غیر ملکی سرمایہ داروں کے قبضہ میں ہے۔ اس لیے ان کی تجارت زیادہ نہیں۔ احمد فائق بے صرف ایک ایسے مسلمان اور بلغاری سوداگر ہیں جو نو آبادیوں اور بر اعظم کی تجارت کے نگران ہیں۔ متوسط جماعت تمام زراعت پیشہ ہے۔ ترکی عہد حکومت میں وہ بہت خوش حال تھے مگر اب ان کی زندگی غلاموں کی سی ہے۔ بھاری ٹیکسوں اور تکلیف دہ کرایوں کے اقتصادی بوجھ، جائداد کی ضبطی برائے نام قیمتوں پر زمینوں کی جبریہ فروخت، گھروں کی تباہی اور عورتوں کی عصمت دری کے سیاسی تعصب نے مخالف پروس کے سوشل دباؤ نے الغرض ان تمام باتوں نے انہیں محتاج مصیبت زدہ اور بے کس بنا دیا ہے۔ ان کی زندگی ایک مسلسل آوارہ گردی کی زندگی ہے۔ وہ دن کے وقت دھوپ میں بیٹھ کر سوچ و بچار کرتے اور رات کو لیٹے لیٹے ستاروں پر غور کرتے ہیں۔ وہ بھی اسلام کے ان دشمنوں کی بے پروا بے رحمی اور مظالم سے سخت تکلیف اٹھاتے ہیں۔ مگر وہ اپنی تکلیفات کو بعینہٖ اسی طرح برداشت کرتے ہیں۔ جس طرح سے کہ ہرنوں کی ڈار شکاری جانوروں کی لوٹ کھسوٹ کو برداشت کرتی ہے۔

تمام مسلمان سنی المذہب حنفی ہیں۔ ان کی زندگی میں مذہب کا ایک نمایاں حصہ پایا جاتا ہے۔ بلغاریہ میں تقریباً ۱۲۰۰ مسجدیں ہیں جن میں سے چار سو اور پانچ سو کے درمیان بڑے شہروں میں واقع ہیں۔ خاص فلیبہ میں ۸ مساجد ہیں مسجدوں کی نگرانی اوقاف سے کی جاتی ہے۔ لیکن متولیوں کی جہالت کی وجہ سے ان کا انتظام اچھا نہیں ہے۔ گورنمنٹ ان کے انتظام میں ہمیشہ دخل انداز رہتی ہے۔ جس کا نتیجہ عموماً ضبطی ہوا کرتا ہے۔ یہاں کے مسلمانوں کی زندگی خالص طور پر مذہبی ہے۔ وہ سادے، راست باز، ایمان دار اور دلیر ہیں۔ اور یہ صفات زیادہ تر اس لیے نمایاں معلوم ہوتی ہیں کہ وہ ایک ایسی قوم کے دوش بدوش رہتے ہیں۔ جو سچائی، ایمانداری اور دلیری جیسی پاکیزہ صفات سے بالکل معرا ہے۔ مستورات کی منزلت ایسی ہی ہے کہ جیسی کہ خود ٹرکی میں۔ اور وہ اپنی ہندوستانی بہنوں کی نسبت زیادہ آزادانہ زندگی بسر کرتی ہیں۔ پردہ بس یہیں تک محدود ہے کہ باہر جاتے وقت "لیشمک" اوڑھ لیا جاتا ہے۔ اور عورتوں کی مجلس میں مردوں کو نہیں بلایا جاتا۔ جیسا کہ مجھ سے مسلمانوں اور عیسائیوں نے کہا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی گھریلو زندگی عیسائیوں کی نسبت زیادہ خوش اور پاکیزہ ہے۔ کثیر الازدواجی شاذ و نادر ہے۔ اور اکثر جگہ بالکل ہی نہیں پائی جاتی۔ اور دیہاتیوں اور خانہ بدوش جپسیوں تک میں عورتوں کا بے حد ادب روا رکھا جاتا ہے۔ عقد، جہیز، طلاق اور وراثت کے متعلق تمام تنازعات کے فیصلہ جات میں مسلمانوں کے قانون کے استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ صدر مفتی کی عدالت صوفیہ میں ہے۔ فلیبہ میں بھی ایک مفتی عدالت کیا کرتے ہیں۔

ٹرکی کی طرح بلغاریہ کی اقتصادی حالت بھی تمام مشرقی ممالک سے مختلف نہیں ہے۔ غیر ملکی سرمایہ دار جیسے فائدہ اٹھانے کے کافی ذرائع مہیا ہیں۔ مغربی تہذیب و تمدن کے فوائد سے متاثر کر کے ملک کو غریب اور کھوکھلا کرنے کی عظیم الشان مہم میں برابر مصروفیت کے ساتھ کام کر رہا ہے۔ مالکان صنعت و حرفت تمام کے تمام یا تو روسی ہیں یا غیر ملکی یہودی اور یا اہل آرمینیا، بلغاری عیسائی اور مسلمان چند ایسی صنعتوں کے مالک ہیں۔ جن کا دار و مدار صرف زراعت پر ہے۔ ان میں مسلمان عیسائیوں کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ غیر ملکیوں کے طرز عمل

اور حکومت کی مدد اور حفاظت کے سبب عیسائیوں کی اقتصادی حالت کی ترقی یقینی ہے۔ اعلیٰ سلوک جو ان کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے۔ غالباً ان کو اس بڑی مصیبت سے بچائے گا جس کا انہیں خطرہ ہے۔ لیکن اسلامی سرمایہ اور محنت کی راہیں دن بدن کم ہو رہی ہیں۔ اور گورنمنٹ کا یہ مقصد ہے کہ تجارتی حلقوں میں سے مسلمانوں کو کلی طور پر نکال دے۔ مسلمانوں کی زیادہ تر تعداد زراعت پیشہ ہے۔ بلغاریہ میں زمین کا نرخ دن بدن بڑھ رہا ہے۔ آخری دس سالوں میں زمین کی قیمت دس گنی ہو گئی ہے۔ مسلمانوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی زمینوں اور جائدادوں کو برائے نام داموں پر فروخت کر دیں۔ اور پھر بالیحتاج زندگی سے مجبور ہو کر ہجرت کر جائیں۔ اگر وہ عدل چاہنے کی جرأت کر بیٹھتے ہیں تو مال و اسباب کے ساتھ انہیں اپنی جان بھی ضایع کرنی پڑتی ہے۔ سال بھر میں کوئی دن ایسا نہیں گذرتا جس روز کہ چند مسلمان بلغاری عیسائیوں کے سلوک سے تنگ آکر ترکی سرحد میں نہ داخل ہوتے ہوں۔

عہد نامہ برلن کے مرتب ہونے کے بعد بہت سے مسلمان ترک ملک کے انتظام میں شریک تھے۔ بلغاری مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد فوج میں ذمہ داری کے عہدے رکھتی تھی۔ لیکن یہ عمل عرصہ تک جاری نہیں رہا۔ اور رفتہ رفتہ تمام مسلمانوں کو ملکی اور فوجی عہدوں سے یک لخت محروم کر دیا گیا۔ چنانچہ اب سارے ملک میں ملکی یا فوجی عہدے پر کوئی بھی مسلمان مامور نہیں۔ خلیل زکی بے جو ایک نوجوان (بلغاری مسلمان) ہیں آخری مسلمان تھے جو فوجی کالج میں پروفیسری کر رہے تھے۔ علاوہ ازیں ملک کے اخراجات کے لیے ان سے بڑا بھاری ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے مسلمان محکمہ پولیس کی ملازمت سے بھی مستثنے کر دیئے گئے ہیں۔ چنانچہ دونوں طرف سے بے بس ہو کر وہ اپنے ہی حال میں رہنے کے لیے مجبور ہیں۔ ان سے کہہ دیا گیا ہے کہ بلغاریہ عیسائیوں کے لیے ہے۔ مسلمانوں کو عہد نامہ کی رو سے جو حقوق حاصل ہیں اور جن کی کفالت بین الاقوامی قوانین سے کی گئی ہے۔ دن دہاڑے پاؤں تلے روند دیئے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے لیے عدل و انصاف کے دروازے بالکل بند ہیں۔ ان کی حالت روس کے یہودیوں سے بھی خراب خستہ اور ردی گذر رہی ہے۔ ان کی زندگی ایک قسم کی ایسی غلامی ہے جس میں ان کی بے قدری کے سبب انہیں پناہ اور خاطر جمعی بھی حاصل نہیں ہے۔

لیکن مسلمان متحد ہو گئے ہیں اور ان تمام مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرتے ہیں جو نئی زندگی اور عام بیداری آج اسلام میں ظاہر ہو رہی ہے۔ اس نے ان کو متاثر کر دیا ہے۔ یہ جوش حیات جو قدرت کی دوسری طاقتوں کی طرح ختم نہیں ہو سکتا ان کے لیے بھی وہی نتائج پیدا کرے گا۔ جو وہ باقی اسلامی دنیا کے لیے پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور اس امر سے وہ بخوبی واقف ہیں۔

علاوہ ازیں وہ سچے مومنوں کی طرح یہ اطمینان دہ یقین رکھتے ہیں کہ اگر بالفرض ہم اس کشمکش میں جان بحق تسلیم ہو گئے تو کم سے کم ہمیں یہ تو خوشی ہے کہ ہم نے اسلام کی آخری کامیابی کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کیا ہے۔ بلغاریہ کی تمام مساجد میں خطبہ ہز میجسٹی سلطان محمد خامس کے نام کا پڑھا جاتا ہے۔ گورنمنٹ نے مسلمانوں کو خلافت عظمیٰ سے علیحدہ کرنے کے لیے ہزار طرح کی کوششیں کی ہیں۔ مگر یہ امر ناممکن ہے۔ ایک نوجوان آدمی نے جو حال ہی میں

یورپ سے فارغ التحصیل ہوکر آئے ہیں۔ میرے سوال کے جواب میں نہایت غصے کے لہجے میں کہا کہ "اگر وہ ہماری مساجد کو مسمار کر ڈالیں گے تو بھی ہم اپنے مکانوں کی بلندیوں سے خطبہ پڑھیں گے اور وہ سن لیں گے کہ ہم خلیفۃ المسلمین کا مقدس نام پڑھ رہے ہیں۔

اٹلی و ٹرکی کی جنگ کو یہاں کے لوگ ہمارے لڑائیوں کی ابتدا خیال کرتے ہیں۔ انہوں نے پیشین گوئی کردی تھی کہ دوسری لڑائی بلقانیوں سے ہوگی۔ اور اب انہوں نے تیسری جنگ کے متعلق بھی پہلے سے مطلع کر دیا ہے۔ اگر ان خیالات کو مبالغہ آمیز بھی خیال کر لیا جائے تو ہمیں ایک گھڑی کے لیے اس امر کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ بلغاریہ کے مسلمان نہایت ظالمانہ اور غیر منصف حکومت میں رہتے ہیں۔ بلغاریہ کے مسلمانوں نے نہایت فراخ دلی اور فیاضی سے طرابلس کے مصیبت زدوں کو مالی امداد پہنچائی ہے۔ اور طرابلس میں اسلامی حکومت قائم رکھنے کیلئے بہت سے بلغاری مسلمان والینٹیر کی حیثیت میں اب تک جنگ کر رہے ہیں۔ بلغاری مسلمانوں کی کوئی ایسی انجمن نہیں ہے۔ لیکن بشرط امکان وہ ایک کانگریس کی بنا ڈالنا چاہتے ہیں۔ ان کے پاس صرف ایک ہی روزنامہ اخبار بلقان ہے جسے ادہم روحی بے ترکی زبان میں شائع کرتے ہیں۔ یہ اخبار ۸ سال ہوئے جاری کیا گیا تھا۔ اور بلغاریہ اور ٹرکی میں اس کی بہت زبردست اشاعت ہے۔ اخبار کی گورنمنٹ کے ساتھ ہمیشہ جھڑپ رہتی ہے۔ یہاں تک کہ پارسال اس کے ایڈیٹر کو چھ ماہ کی سزا دی گئی تھی۔ غیر ممالک کے لیے اس کا سالانہ چندہ ۲۳ روپے سے ہے۔

لیکن کسی قوم کی باقاعدہ ترقی میں سب سے بڑا حصہ صحیح طریقۂ تعلیم کا ہے۔ اور اس کو بلغاریہ کے مسلمانوں نے پورے طور پر سمجھ لیا ہے۔ لیکن بلغاریہ میں مسلمانوں کو تعلیم کے معاملہ میں بے انتہا مختلف مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تمام اسلامی تعلیمی درسگاہوں کی نگرانی اوقاف سے کی جاتی ہے۔ جنگ کے بعد گورنمنٹ نے تمام مدارس اور مکاتب کی عمارتوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ چنانچہ وہ اب سرکاری دفاتر اور سرکاری مدارس کے استعمال میں آرہے ہیں۔

جنگ کے آغاز سے لے کر اب تک نصف سے زائد اوقاف کو کسی نہ کسی بہانے سے ضبط کر لیا گیا ہے اور اس طرح سے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے سامان آمدنی کو جبراً چھین لیا گیا ہے۔ تعلیم کے لیے جو ٹیکس مسلمانوں سمیت تمام آبادی سے وصول کیا جاتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی تعلیم پر کبھی خرچ نہیں کیا جاتا۔ گورنمنٹ کا مقصد یہ ہے کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں کو سرکاری مدارس میں تعلیم پانے پر مجبور کیا جائے۔ تاکہ وہ وہاں بلغاری زبان میں تعلیم پائیں۔ اور اپنی مادری زبان سے جو کہ ترکی ہے۔ بالکل بے بہرہ رہیں اور اپنے مذہب اور قرآن شریف سے ناآشنا ہو جائیں۔ لیکن مسلمانوں نے نہایت دلیرانہ طور پر اس کو منظور کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ بلغاریہ کے مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ نوجوان جماعت میں سے جو ہونہار آدمی قسطنطنیہ یا یورپ سے فارغ التحصیل ہو کر آتے ہیں۔ وہ سلطنت عثمانیہ میں جا کر ملازمتیں کرنے اور بالآخر وہیں کی رعایا ہو کر آباد ہو جاتے

ہیں۔ اس سے بہت بڑی دماغی اور سوشل کمی واقع ہوگئی ہے۔ ان حالات پر نظر ڈالنے کے بعد کوئی شخص یہ سن کر تعجب نہیں کرے گا کہ جہاں بلغاریہ میں تعلیم یافتہ عیسائیوں کی تعداد فی صدی ساٹھ ہے۔ وہاں مسلمانوں کی صرف فی صدی دس ہے۔ مسلمان نوجوان صرف مکاتب میں تعلیم پاتے ہیں۔ جہاں انہیں ابتدائی قسم کی مذہبی تعلیم دی جاتی ہے۔ وہاں کے مکاتب ہندوستان کی طرح سے نہیں ہیں۔ خلیل زکی بے نے ان میں ایک نمایاں اصلاح کر دی ہے۔ اور جدید طرز کے بہت سے مدارس 'فلیبہ' وارنہ' درسچک' وڈِن اور دیگر مقامات میں جاری کر دیئے گئے ہیں۔ اس سال فلیبہ میں یک نارمل اسکول قائم کیا گیا ہے۔ جس کا مقصد ان قوانین کے برے اثرات کو روکنا ہے۔ جن کی رو سے کوئی شخص جو بلغاری رعایا نہیں ہے۔ کسی اسلامی مدرسہ میں ٹیچر (مدرس) نہیں بن سکتا۔ مسلمان ہر سال ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس کرتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے بہت مفید نتائج مرتب ہوں گے۔ کل مدارس کی تعداد تقریباً چودہ سو ہے۔ جن میں عورتوں اور مردوں کو ملا کر ۰۷ امدرس ہوتے ہیں۔ مدارس جانے والے لڑکوں کا شمار فی الحال ۴۲ ہزار اور لڑکیوں کا دس ہزار ہے۔ ان دونوں گوشواروں سے صاف واضح ہوتا ہے کہ ہندوستان کے مسلمان، بلغاریہ کے مسلمانوں سے کیا کچھ سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

بلغاریہ کے مسلمانوں کے مستقبل پر کچھ رائے زنی کرنا بہت مشکل ہے۔ مجھے اس نوجوان آدمی کی رائے پر پورا یقین ہے۔ جنہوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ "اس کا دارومدار ٹرکی کے مستقبل پر ہے۔ اور اس قول کی تائید ایک اور نوجوان مسلمان نے بدیں الفاظ کی تھی کہ تمام اسلامی دنیا کا مستقبل ٹرکی کے مستقبل کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور دراصل یہ درست بھی ہے۔

عبدالرحمٰن سیوہاروی (انجمن)

چین میں اسلام اور عیسائیت کا مقابلہ

(۱)

عیسائی پادریوں کی سرگرمی

جمعہ ۱۴ رجون ۱۹۱۱ء

آج کل یورپ، افریقہ اور مغربی ایشیا میں جو بربادی اور تباہی پیروان حضرت مسیح کے ہاتھوں اہل اسلام پر نازل ہو رہی ہے اس سے ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے۔ اٹلی کی قزاقی طریپولی پر فرانس کی تسخیر مراکش: روس کا حضرت امام زین العابدین کے روضہ مقدس کا منہدم کرنا۔ اور اہل ایران کی نوزائیدہ آزادی کا خون کرنا، بلقانی، ریاستوں کا مقدونیہ اور البانیہ کے مسلمان آبادی کو بلا تخصیص مرد و عورت یا بچہ کے تہ تیغ کرنا، یہ سب کچھ اس عظیم الشان اور عالم گیر جدوجہد کا معمولی شائبہ ہے جو ملت بیضا کو سرنگوں یا یوں کہو کہ نیست و نابود کرنے کے لئے عیسائی دنیا میں ہو رہی ہے۔ لیکن جو عمل مغرب اقصیٰ اور مغرب قریب میں دول یورپ کی حکمت عملی اور عیسائی سلطنتوں کو آتش فشاں توپوں، آہن پوش جہازوں اور دیگر آلات شیطانی کے ذریعے سے ہو رہا ہے، اس نے مشرق اقصیٰ میں دوسری صورت اختیار کی ہے ہمارے خیال میں مقدونیہ اور افریقہ کے مسلمانوں کا کلمہ لاالٰہ الا اللہ کہتے ہوئے عیسائی سنگینوں سے شہید ہونا بدرجہا بہتر ہے۔ اس عمل سے جو چین کے مسلمانوں کو دین اسلام سے برگشتہ کرکے صلیب پرستی پر راغب کرنے کی غرض سے عیسائی مشنری کر رہے ہیں۔

۱۹۱۰ء میں اسکاٹ لینڈ کے سب سے بڑے شہر اڈنبرا میں، تمام دنیا کی مشنری انجمنوں کی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ سب سے اہم مسئلہ اس کانگرس میں زیر بحث یہ تھا کہ عیسائیت کی اشاعت میں جو رکاوٹ اسلام نے پیدا کر دی ہے اس کا سد باب کس طرح ہو۔ افریقہ اور ایشیا کے مشنریوں نے بیان کیا کہ باوجود لکھوکھا روپیہ خرچ کرنے کے اسلامی جماعتوں میں عیسائیت کو کوئی کامیابی نہیں ہوتی۔ اور افریقہ کے جس حصہ میں کوئی مسلمان مشنری پہنچ جاتا ہے تو وہ عیسائی پادریوں کی سالہا سال کی محنت کو برباد کر دیتا ہے۔ اس کانفرنس کا ایک جلسہ دروازہ بند کرکے بھی کیا گیا۔ اور اس میں کیا کچھ سرگوشیاں ہوئیں وہ کسی غیر شخص کو معلوم نہیں لیکن کانفرنس کے بعد مشنری تحریک نے جو رخ اختیار کیا ہے اس سے ——— اس کانفرنس کا سراغ چلتا ہے۔ منجملہ ان کے ایک فیصلہ یہ بھی کیا گیا کہ پادریوں کی ایک جماعت ایسی تیار کی جائے جو اپنے آپ کو اسلامی روایات، اسلامی تاریخ اور عربی زبان کی تحصیل کے لئے وقف کر دے۔ اور جو ان ممالک میں کام کرتے ہیں۔ جہاں اسلامی آبادیاں ہیں۔ چنانچہ ایک بڑی فوج پرجوش پادریوں کی اس کام کی جانب متوجہ ہوئی ہے ڈاکٹر زویمر جو امریکہ کا ٹاٹ پادری اور عیسائی دنیا میں عربی دانی کے لحاظ سے ممتاز و مشہور ہے، اڈنبرا کانفرنس کا پریذیڈنٹ تھا۔ اس نے اپنی ایڈیٹری میں ایک رسالہ مسلم ورلڈ اسلامی دنیا کے نام سے نکالنا شروع کیا ہے جس میں علاوہ تاریخی اور مذہبی مضامین کے ان پادریوں کی رپورٹیں بھی شائع ہوتی ہیں جنہوں نے اسلامی دنیا میں عیسائیت پھیلانے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔

افریقہ اور ایشیا میں باوجود صدہا سال کی کوشش کے عیسائیت کو اسلام کے خلاف کوئی کامیابی نہیں ہوتی ہے۔ ابھی کل کی بات

ہے کہ شمال کے ذیر ِ عظیم نے جنوبی افریقہ میں اسلامی خطرہ کی عظمت اور سنجیدگی کو علی الاعلان بیان کیا تھا۔ لیکن تازہ ترین حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ چین میں عیسائیوں کو معتدبہ کامیابی کی امید ہے۔

چین میں مسلمانوں کی آبادی مصر، عرب یا ایران سے کہیں زیادہ ہے لیکن صدیوں سے ایک زبردست اور جابر حکومت کے زیر دست رہنے کی وجہ سے وہ مصیبت نہیں ہے جو دیگر اسلامی ممالک میں ہے۔ علوم دینی کی بھی یہی کیفیت ہے۔ عربی زبان کے جاننے والے بہت کم نظر آتے ہیں لیکن عام مسلمان اب بھی عربی زبان کی حد درجہ عظمت کرتے ہیں۔ ایک عیسائی پادری نے بیان کیا ہے کہ ایک عرصہ سے چینی مسلمانوں کو عیسائی دعظوں کے گرد جمع کرنے کی تمام کوشش بے کار رہی تو یہ ترکیب کی گئی کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی سوانح عمری اور عیسائیت کے متعلق دیگر معلومات عربی زبان میں چھپوا کر لوگوں میں تقسیم کی گئیں۔ وہ مسلمان جو کسی عیسائی واعظ سے بات کرنے کے بھی روادار نہ تھے ان عربی رسالوں کو کلام پاک سمجھ کر ہاتھوں ہاتھ لیتے اور سروں پر رکھتے تھے۔ صدہا مسلمانوں نے جو مضمون سے واقف نہ تھے محض اس خیال سے کہ عربی زبان میں سوائے متبرک باتوں کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ ان رسالوں کو مساجد میں جا کر رکھ دیئے۔

صرف ایک مثال سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک مسلمانانِ چین کو اپنے مذہب مقدس سے کس قدر الفت ہے لیکن ان کی تعلیم دینی اور دنیوی کا کوئی بندوبست نہیں ہے۔ اور عیسائی مشنری اسلامی آبادیوں میں جابجا مدارس اور شفاخانے کھول رہے ہیں اور ان ذرائع سے ایک تعداد مسلمانوں کی عیسائیت کے دائرہ میں شامل ہو گئی ہے۔ اور اگر عیسائی مشنریوں کا یہی زور رہا تو کیا عجب ہے کہ چین کے لاکھوں مسلمان اسلام سے منحرف ہو جائیں۔

جب سے ترکوں نے چینی مسلمانوں کی طرف اپنی توجہ مائل کی اس وقت سے عیسائیوں کی جدوجہد میں اور بھی ترقی ہوئی ہے۔ مسلمانوں کی مشہور رواداری کی مثالیں چین میں بھی بکثرت پائی جاتی ہیں۔ لیکن عیسائی پادریوں نے مسلمانوں کی مہمان نوازی اور رواداری سے ناجائز فائدہ اٹھانا شروع کر دیا ہے۔ پادری پیٹیس تحریر کرتا ہے "میں مسلمانوں کی مساجد میں ہمیشہ بے تکلف چلا جاتا ہوں۔ اور جب چاہتا ہوں وہاں عیسائیت پر وعظ دیتا ہوں۔ اکثر مسلمان میرے مکان واقع نان کنگ میں آکر مذہبی گفتگو کرتے ہیں۔ مشن اسکولوں میں مسلمان لڑکے بکثرت پڑھتے ہیں۔ اور بعض طلبا عیسائی مذہب قبول کر لیتے ہیں۔ دوسرے ممالک کے مسلمانوں کے جو حالات میرے پڑھنے میں آئے ہیں۔ ان کے لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ چین کے مسلمان دنیا بھر کے مسلمانوں کی نسبت زیادہ زود حامل لوگ ہیں۔"

مسٹر روڈس صوبہ یونان سے لکھتے ہیں: "یہاں کے مسلمان اس وقت سے زیادہ کبھی بھی ہماری طرف مائل نہ ہوئے ہوں گے پیروانِ اسلام میں مشنری کام کرنے کا دروازہ بالکل کھلا ہوا ہے نہیں مسلمان اپنی مساجد میں اس کثرت سے مدعو کرتے ہیں۔ کہ بعض اوقات دعوت رد کرنی پڑتی تھی۔ بار بار مجھ سے مسلمانوں نے درخواست کی ہے۔ کہ کسی عربی دان مشنری کو بلایا جائے تاکہ مذہبی مباحثہ اس مقدس زبان میں ہو سکے۔ شمال و مغربی حصہ ملک میں سویڈن کے مشن نے اپنا وسیع کام اعلیٰ پیمانہ پر پھیلا رکھا ہے۔ کاشغر اور یارقند میں ترکی النسل مسلمانوں کے یقین کے لئے جابجا مدارس اور شفاخانے کھول رکھے ہیں۔ ڈاکٹر ہنٹر نے ترکی ملاؤں کی امداد سے عیسائیت پر متعدد رسالے عربی زبان میں چھاپ کر مسلمانوں میں تقسیم کئے ہیں۔ صوبہ کانسو میں جہاں عربی زبان کے پڑھنے اور سمجھنے والے کسی قدر زیادہ تعداد میں ہیں۔ مصر اور شام سے عیسائی رسالے اور اخبارات منگا کر مسلمانوں میں مفت تقسیم کئے جاتے ہیں۔

پادری ٹیس نے عربی زبان کی انجیل مقدس چینی ترجمے اور حاشیوں کے ساتھ چھاپ کر تقسیم کی ہے۔ جو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے ہیں برٹش، امریکن اور دیگر ممالک کی بائبل سوسائٹیاں ہزارہا جلدیں عربی بائبل کی ہر سال تقسیم کرتی ہیں۔

مسٹر رودس جس نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ مسلمانان چین کو راہ راست سے منحرف کرنے میں صرف کیا ہے تحریر کرتا ہے۔ اور چھوٹی چھوٹی کتابیں جن میں قرآن کے پاروں کا خلاصہ ہے۔ اور اس کے ساتھ عیسائی نقطہ نظر سے اسلامی مسائل پر نقطہ چینیاں درج ہیں۔ نہایت مفید ثابت ہوئے ہیں۔ اس سلسلہ کی کتابیں مدارس میں طبع کرائی گئی ہیں۔ اور چونکہ ان میں مکہ (معظمہ) کی تصاویر اور آیات قرآنی موقع بموقع چھاپی گئی ہیں اس لئے اسلامی مساجد میں بہت مقبول ہوئی ہیں۔ جہاں ہمارے دوستوں کی تعداد روز افزوں ترقی ہے۔ مکہ (معظمہ) کی جو زبردست عظمت مسلمانوں کے دلوں میں باقی ہے۔ اس کی وجہ سے ایسی کتابیں جن میں کعبہ اور دیگر اسلامی مقامات مقدسہ کی تصاویر درج ہوں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اور ان کے ذریعے سے ہمیں راستی کی تبلیغ کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ البتہ بعض مسلمان مسئلہ تثلیث پڑھ کر بہت الجھتے ہیں اور بارہا کہہ اٹھتے ہیں "ہم مریم والدہ مسیح کی پرستش تمہاری طرح ہرگز نہیں کر سکتے۔"

ڈاکٹر رودس بڑی مسرت کے ساتھ عیسائی دنیا کو اطلاع دیتے ہیں کہ متذکرہ بالا طریقوں سے اسلامی جماعتوں میں کوشش کا یہ نتیجہ ہوا ہے کہ ہزارہا درخواستیں عربی کتابوں کے لئے وصول ہوئی ہیں۔ اور جو مسلمان پہلے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے تھے کہ اسلام اور عیسائیت میں بہت فرق نہیں ہے اب یہ کہنے لگے ہیں واقعی عیسائیت اور چیز ہے۔ اور اسلام شئے دیگر۔"

مارشل بروم ہال جس نے تمام ملک چین کا دورہ مشنری خدمت کے سلسلے میں کیا ہے تحریر کرتا ہے:۔

"چین کے مسلمانوں کو عیسائی مذہب میں لانے کے لئے تو کچھ نہ کچھ کیا بھی جا رہا ہے۔ لیکن مسلمان چینی باشندوں کو اپنے مذہب میں لانے کے لئے کچھ کوشش نہیں کرتے۔ عیسائی مشنریوں کو ہر جگہ وعظ کہنے کی اجازت ہے۔ لیکن مسلمانوں کو شارع عام پر مذہب اسلام کی تلقین کرنے کی حکومت کی جانب سے ممانعت ہے۔ مسلمان "انگور کھٹے ہیں" کی مثل پر عمل کر کے یہ کہتے ہیں کہ ان کا مذہب اس قدر پاک اور ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کی اشاعت کے لئے عیسائی مشنریوں کی طرح شارع عام پر مارے مارے پھرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مسلمان اپنے مذہب کے متعلق کسی قسم کی کتابیں شائع نہیں کرتا۔ اور بمشکل تمام کسی اسلامی کتاب کا پتہ چلتا ہے۔"

ان واقعات سے مسلمانان ہند کو معلوم ہو سکتا ہے کہ چین میں اسلامی آبادی کو عیسائی بنانے میں کیسی جد و جہد دنیا بھر کے مشنری کر رہے ہیں۔ گذشتہ بغاوت میں چینی حکومت نے لکھوکھا مسلمانوں کو قتل کر دیا اور تمام ملک سے ... ہیں کہ اشاعت اسلام کی آزادی جو انہیں پہلے حاصل تھی اب بالکل مفقود ہے۔ لیکن برخلاف اس کے عیسائی مشنری اپنی سلطنتوں کی حمایت میں ہر جگہ عیسائی مذہب کی اشاعت کے لئے کھلے بندوں اور بے روک ٹوک کوشش کر رہے ہیں۔

سال گذشتہ میں چین میں جمہوری سلطنت قائم ہوئی۔ لیکن اس کا پریذیڈنٹ عیسائی مذہب ہے۔ ... اپریل گذشتہ کو تمام عیسائی گرجاؤں میں نہ صرف چین بلکہ یورپ میں بھی بڑے بڑے پادریوں نے جمہوریت کا باضابطہ خیر مقدم کیا۔ اور اس کی بقا کے لئے اس امید پر دعائیں مانگیں کہ اس کی وجہ سے عیسائیت پھیلانے کا دروازہ مشرق اقصیٰ میں پوری طرح کھل گیا۔

اس وقت میں نئی قوتوں اور نئے جذبات و خیالات کا دور دورہ ہے۔ اور مسلمانان چین کی تاریخ ان کی روایات اور موجودہ کشاکش

حیات ہیں ان کی جد و جہد کے حالات مسلمانانِ ہند کے لئے دلچسپی سے خالی نہ ہوں گے۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہمدرد میں وقتاً فوقتاً چینی مسلمانوں کے حالات شائع کر کے اپنے ہم وطنوں کی معلومات میں اضافہ کریں۔

ایک وہ زمانہ تھا کہ باوجود بادبانی کشتیوں کے تکلیف دہ اور پُر خطر سفر کے صدہا مسلمان ممالک اسلامیہ سے چین میں ہر سال جاتے تھے۔ اور ملت بیضاء کی اشاعت کرتے تھے۔ طنجہ کے دُور دراز مقام کو جو مراکش کے دوسرے کنارہ پر ہے اور چین کی مسافت کو خیال کرو مگر ابن بطوطہ جیسے باہمت مسلمان بکثرت چین میں سیر و سیاحت کو جاتے تھے۔ اور مسلمانانِ چین کو نہ صرف اخلاقی و روحانی تقویت دیتے بلکہ ان کی ہمتوں کو دوبالا کرتے تھے۔ اور دیگر ممالک اسلامیہ کے مسلمانوں کو وہاں کے دلچسپ حالات سنا کر ترکِ وطن اور اشاعت اسلام کی جانب مائل کرتے تھے۔ یا اب وہ زمانہ ہے انہیں مسلمانوں کی اولاد نہ کبھی "سیروا فی الارض" کی مقدس ہدایت پر عمل کرتی ہے۔ اس لئے اسلامی ذرائع سے وہاں کے حالات معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ لیکن یورپی ذرائع سے جو بدقسمتی سے اسلام کے متعلق ہمیشہ ہمدردانہ نہیں ہوا کرتے جو کچھ معلوم ہو سکے گا ہم اپنے ناظرین کی خدمت میں پیش کریں گے۔
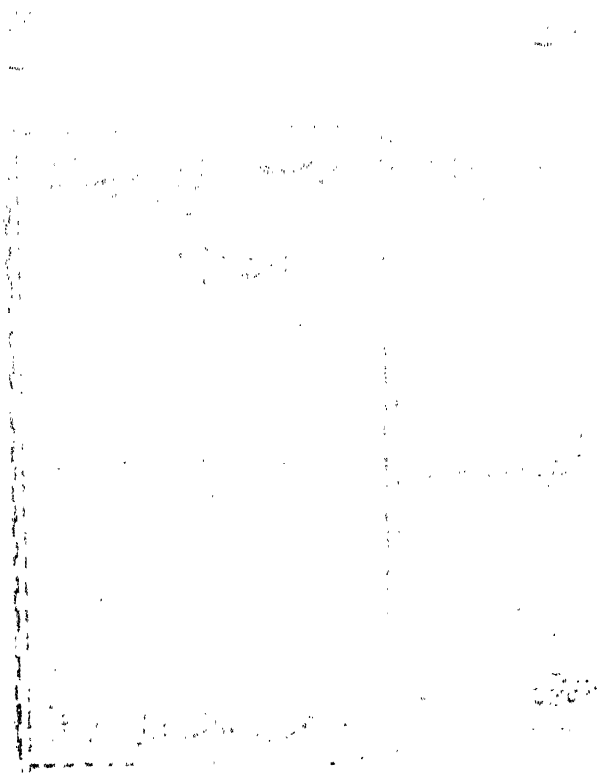
لارڈ کچنر کی رپورٹ مصر پر

چہار شنبہ ۲ر جولائی سنہ ۱۹۱۳ء

لارڈ کچنر کی دوسری رپورٹ بحیثیت ایجنٹ اینڈ قونصل جنرل حضور ملک معظم ۲۴ مئی کو شائع ہوگئی ہے۔ اس میں مصر و سوڈان کے مالیہ، انتظام اور عام حالت پر بحث ہے۔ رپورٹ ہذا وہائٹ پیپر نمبر سی ڈی 6682 کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ رپورٹ کی تمہید میں لارڈ کچنر اس امر پر اطمینان ظاہر فرماتے ہیں کہ پارٹیوں کے باہمی نزاع و اشتعال میں نمایاں کمی ہوگئی ہے۔ بہ نسبت سابق رعایا کا خصوصاً اور عموماً جمہور کا گورنمنٹ پر اعتماد بڑھ گیا ہے۔ ان امور سے وہ یہ استنباط کرتے ہیں کہ عنقریب رعایا باہم متحد ہو جائے گی۔ اور رفاہ عام کے لیے باہم وفاداری کے ساتھ کوشش کرے گی۔ مگر انہیں امید واثق ہے کہ خود گورنمنٹ اس اثناء میں لوگوں کی حالت درست کرنے اور صحیح راستوں پر قدم بڑھانے کے لیے ان کی امداد کرتی رہے گی۔ مشرق قریب میں جنگ (ٹرکی و بلقان) کا ذکر کرتے ہوئے جو بہت زیادہ پریشانی کے باعث تھے وہ فرماتے ہیں:۔

جنگ کا اثر یہاں بہت گہرا ہوا ہے اور اس کے نتائج کا ملک پر بہت اثر ہوا۔ متعدد ذی فہم اور دوربین اصحاب کو اس انحطاط کا کچھ احساس ہے جو حکومت سیّدہ (عثمانیہ) کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے۔ ترکی اطالوی جنگ کی قائم کردہ نظیر پر مصر اس جنگ میں غیر جانبدار رہا۔ لیکن لوگوں نے ایک انجمن ہلال احمر مرتب کی اس میں دل کھول کر چندے دیئے اور اسلامی مجاہدین ترکیہ کی ہوا خواہی میں پرجوش ہمدردی کا اظہار کیا۔ خاندان خدیویہ اور خصوصاً دو شہزادوں نے اس تحریک میں سرگرم حصہ لیا۔ مگر باشندگان مصر دوران جنگ میں بالکل ضبط نفس سے کام لیا ہے اور باوجودیکہ اپنے بھائیوں کے جنگی مصائب و نوائب کی وجہ سے ان کے دلوں میں فطرتی احساسات پیدا ہوئے مگر انہوں نے اسی روش کو برابر قائم رکھا۔

مصر کی موجودہ اقتصادی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لارڈ کچنر نے یہ دکھلا دیا ہے کہ ملک کی دولتمندی ایک گونہ روئی کی قیمت پر منحصر ہے۔ اس کے بعد وہ ایزاد کرتے ہیں کہ:۔

"دراصل جیسا کہ اس کی تجارت برآمد سے ظاہر ہے مصر کی قوت خرید ایک حد تک اس ایک جنس کی قیمت کی کمی بیشی پر ایک حد تک منحصر ہے اور اسی وجہ سے ملک تیزی اور مندے کا شکار رہتا ہے

اس لئے ہمیں یاد رکھنا چاہئیے کہ جس سطح دولت مندی پر ہم پہنچ گئے ہیں بیشتر اس امر پر مبنی ہے کہ روئی
کی جو قیمت گذشتہ چند سالوں میں اٹھتی رہی ہے اسے بحال رکھا جائے۔ خوش قسمتی سے اس اندیشہ کی کوئی
وجہ نہیں ہے کہ مستقبل قریب میں روئی کی قیمت گھٹ کر اتنی ہو جائے جتنی کہ ۱۵ سال قبل تھی لیکن اگر کبھی
بہت ہی مندا ہو گیا تو نتیجہ یہ ہو گا کہ موجودہ دولتمندی کے بل بوتہ پر جو زاید ذمہ داریاں لاحق ہو گئی
ہوں گی۔ ان کے دباؤ میں آ کر قیمتوں کا یہ انقلاب نہایت سخت ہو گا۔،

مصر کی اقتصادی زندگی

ان ظاہر اور دیگر پوشیدہ خطرات کی موجودگی میں دو چند بدیہی و فرزانہ مشورے دیتے ہیں جو
گورنمنٹ (مصر) کی تدبیر عملی پر خود بخود نمایاں بھی ہو جاتے ہیں۔

یہ ضروری ہے کہ معمولی اخراجات میں کفایت شعاری کو خود رکھتے ہوئے غیر معمولی اخراجات کو اس
طرح سے قاعدہ میں رکھا جائے۔ کہ ریزرو فنڈ (خزانۂ توفیر) میں اتفاقی ضروریات کے لئے کافی سرمایہ موجود ہے
اس میں تو شک نہیں کہ گذشتہ دو سال سے غیر معمولی خراج مالیہ توفیرات زیادہ نہیں بڑھا ہے۔ اور اس
خزانہ کی زر توفیر میں کچھ کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اگر گورنمنٹ پر اس لئے ملامت کی جائے کہ گذشتہ
تیس سال میں اس نے قرضہ ملکی میں سے کچھ بھی ادا نہیں کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس اثنا میں
گورنمنٹ نے قومی ضروریات پر رقوم کثیر صرف کر کے ملک کو دوبارہ اقتصادی زندگی عطا کر دی ہے۔ اور
اگرچہ اس کا نتیجہ حسب مراد تو نہیں ہوا تاہم اگر ان قومی مصارف سے قرضہ ملکی میں اضافہ بھی ہو جاتا
تو، گورنمنٹ حق بجانب تھی۔ مالیہ ملکی میں سے کوئی تین [illegible] عمارتوں اور ریلوں کی تعمیر پر صرف ہوا
ہے اور ان ضرورتوں کے لئے باہر سے کوئی قرضہ نہیں لیا گیا۔،

پھر لکھتے ہیں کہ گورنمنٹ ملک کے ذرائع آمدنی کو فروغ دینے کی ضرورت پر توجہ [illegible] ہے اور
علاوہ کاشت پنبہ کے دیگر شعبوں پر بھی متوجہ ہے چنانچہ زراعت، پیمائش اور صنعتی تعلیم کے محکمے اس لحاظ
سے مفید کام کر رہے ہیں۔

ملک کے پرائیویٹ قرضوں کی بابت لارڈ کچنر فرماتے ہیں کہ اس وقت بجز بار آور ضرورتوں کے
کسی اور مطلب کے لئے نیا قرضہ لینے کی بہت کم ترغیب ہے ساتھ ہی دیہاتی سیونگز بنکوں کے قیام اور
فائیو فیڈن لاء کے نفاذ سے ایسی صورتیں اختیار کی گئی ہیں جن سے دہقانی آبادی میں، جو زورسی پیدا ہو
جائے گی۔ اور نا عاقبت اندیشی کے ساتھ قرضہ لینے کی عادت چھوٹ ہو جائے گی۔ (فائیو فیڈن لاء) ہر اس ادنے
بسوہ دار کی حفاظت کی حفاظت کرتا ہے جس کے پاس پانچ فیڈن یا اس سے کم زمین ہو۔ قرضہ کی ادائیگی
میں اس کی زمین مکان یا برتن بھانڈے قرق نہیں ہو سکتے۔ اور اس قانون کا نفاذ غیر ملکی سود خواروں

کی وجہ سے ضروری ہوا جو ملک میں ہر طرف پھیلے ہوئے تھے اور جن کے پاس غریب دہقان بہت جلدی پھنس جاتے ہیں ۔ لارڈ کچنر کو تو یقین ہے کہ جدید قانون مقبول ہوا ہے اور خود فلاحین بھی اسے پسند کرتے ہیں ۔

ایک اور اصلاح یہ ہوئی ہے کہ "کینٹونل جسٹس لاز" کا اجراء ہو گیا ہے اس قانون کے رو سے امراء چھوٹے چھوٹے علاقوں میں مقدمات خفیہ کے انفصال کے لیئے بطور آنریری مجسٹریٹوں کے کام کریں گے ۔

آبپاشی

پشتۂ اسوان کے متعلق جو دسمبر گذشتہ میں کھولا گیا تھا ذکر کرتے ہوئے لارڈ کچنر آبپاشی کی عام حالت پر ایک تبصرہ کرتے ہیں ۔ اگر دریا معمولی حالت میں رواں ہو تو اس نئے حوض سے جو وافر پانی دستیاب ہو سکے گا اس سے مزروعہ رقبہ میں سے اور ۴۰ فیصدی کی اراضی کی آبپاشی ہو سکے گی ۔

اس سے بڑے رقبہ کی آبپاشی کی تجاویز بھی بیان کی گئی ہیں ان میں سے دو تو مثلث نیل میں زیر عمل ہیں اور باقی بالائے مصر میں زیر غور ہیں ۔ نیز یہ تجویز ہے کہ سفید نیل پر ایک اور بند لگایا جائے گا جو خرطوم سے ۳۰ میل اوپر کو ہو گا ۔

مسئلہ آبپاشی پر عبور کرنے کے بعد لارڈ کچنر مندرجۂ ذیل بڑے بڑے نتائج پر پہنچے ہیں ۔

(۱) موجودہ وسیع و عظیم رقبہ مزروعہ کی آبپاشی کے لئے پانی کا کافی ذخیرہ ہے ۔

(۲) کہ مثلث نیل میں آئندہ ۱۵ سال میں رقبہ مزروعہ کی جو توسیع بوجوہ اغلب ہو سکتی ہے اس کی آبپاشی کے لئے بھی پانی کا ذخیرہ کافی ہے ۔ بشرطیکہ ذخیرہ آب دریا بہت نہ اتر جائے

(۳) کہ چونکہ بالائے مصر میں مزید زراعت کی توسیع اور دریا کے اتار کے دنوں میں مثلث نیل کی توسیع یافتہ زراعت کی ضروریات آبپاشی کا لحاظ رکھنا بھی قرین مصلحت ہے اس لئے ضرورت ہو گی کہ پانی کی مقدار مطلوبہ کو تقسیم کرنے کے لئے نئے کام جاری کئے جائیں ۔ توقع کی جاتی ہے کہ سفید نیل میں مجوزہ بند اس غرض کے واسطے کافی ہو گا ۔

لارڈ کچنر عدالت ہائے مخلوط کے عدالتی نظام میں فوری اصلاحوں کی ضرورت کو بیان کر کے تمہید کو ختم کرتے ہیں اس مضمون پر وہ سال گذشتہ کی رپورٹ میں بھی بحث کر چکے ہیں سب سے زیادہ ضروری اصلاح تو یہ ہے کہ محکمہ عدالت کے اخراجات میں کفایت کی جائے ۔ اور وہ اس طرح سے ہو سکتی ہے کہ اس وقت جو اجلاس کامل کے لئے جو تعداد ججوں کی مطلوب ہے ان میں کمی کی جائے ۔ اس غرض کے لئے مصری گورنمنٹ نے پچھلے سال تجاویز کی تھیں اور ان مسائل و وسائل کا حوالہ دیتے ہوئے جو سال گذشتہ میں اس مسئلہ کے متعلق ہوئے اور ان کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا لارڈ

کمشنر فرماتے ہیں :-

"میں اس امر کو بہت مذموم خیال کرتا ہوں کہ پولٹیکل مخالفت ان عدالتوں میں اصلاح کے لئے مانع ہے جس کو گورنمنٹ مستقل ترقی و حسن انتظام کے لئے لازمی خیال کرتی ہے۔ مجوزہ اصلاحیں کسی نہج بھی موجودہ عدالتی نظام کے بنیادی اصولوں میں تبدیلی نہیں لاتیں۔ یعنی یہ کہ جن مقدمات میں غیر ملکیوں کا تعلق ہو ان میں بہ نظر ثانی مختلف القوم غیر ملکی جج شریک ہوا کریں۔ میں خود اس اصول کو برقرار رکھنا بہیں خیال ضروری سمجھتا ہوں کہ اس سے ان غیر ملکی باشندوں کی بہت بڑی مالی اغراض کی حفاظت ہو سکتی ہے جن کا روپیہ مصر میں لگا ہوا ہے۔ لیکن میری رائے ہے کہ بحالات موجودہ مذکور الصدر عدالتیں بوجہ ناقص نظام اور قدیم طرز عمل کے ان اغراض کی حفاظت کا کافی ذریعہ نہیں ہیں"۔

گورنمنٹ کی مالی حالت کو اطمینان بخش بتلایا گیا ہے۔ معمولی بجٹ میں ۰۰۰۵۴،۲ پونڈ انگریزی کی توفیر ہے۔ سنہ ۱۹۱۱ء کے حسابات مارچ میں شائع کئے گئے تھے۔ اور ٹائمس اخبار کی ۱۱ مارچ کی اشاعت میں ان کا خلاصہ بھی کیا گیا ہے۔ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالیہ ۰۰۵۱۵۷۱ پونڈ (انگریزی) ہے اور معمولی اور خاص اخراجات کا اندازہ ۰۰۰۰۴۵۱ پونڈ ہے۔ سنہ ۱۹۱۱ء کی نسبت سال میں ۲۷۰۰۰ کے پونڈ کا اضافہ ہوا۔ اس سے پیشتر کبھی اس قدر اضافہ نہیں ہوا۔

انجمن خدام کعبہ

رقمزدۂ عالی جناب مولانا مولوی عبدالباری صاحب

۱۰ جون ۱۹۱۳ء

جمعیت خدام کعبہ کی ضرورت کو تو مسلمان عام طور پر محسوس کرتے ہیں۔ اس کی غرض اور مقاصد و قواعد کی شہرت بھی ہو گئی ہے۔ اور ہر طرف سے شرکت کی خواہشیں آ رہی ہیں۔ ہمارا اس مجلس کے قائم کرنے سے کوئی سیاسی مقصد ہے۔ نہ امن عامہ میں خلل ڈالنا ہے۔ نہ یہ کوئی سازشی پارٹی ہے۔ یہ انجمن امور مذہبی ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ اس سے ہماری بڑی غرض یہ ہے۔ کہ باوجود مختلف خیالات و عقائد کے مسلمانوں کو ملکر کام کرنے کا موقع ہو۔ ان کو ایک جانب توجہ دلانے سے ان کے باہمی مناظرانہ و مباحثات میں کمی ہو۔ تمام مسلمانوں کے دلوں میں مذہبی جوش قائم رہے۔ اور جو غفلت میں پڑے ہیں۔ ان کا [illegible] چونکہ تجاویز کی ابتدائی حالت ہے۔ جو دستور العمل شائع ہوا ہے۔ وہ عارضی ہے۔ اور بعض بزرگان قوم نے مشورہ کی ضرورت [illegible] ہے۔ ہم اس مجلس کو کسی خاص جماعت کی ملکیت نہیں سمجھتے ہیں۔ بلکہ مسلمانوں کی ایک ایسی انجمن ہے جس میں ہر قسم کی مساوات مدنظر رکھی گئی ہے۔ مگر فضلائے ملت اور علمائے امت کے ارشاد [illegible] انجمن کے قواعد و ضوابط [illegible] اور ان کی رائے سے ہر قسم کا رد و بدل ہو سکتا ہے۔ چونکہ ہم خود اس امر کو جانتے ہیں کہ بالفعل کام جاری کرنے کے لئے جو قواعد ہم نے بنائے ہیں ان پر غور و نظر کی بہت ضرورت ہے اس واسطے ہم نے یہ سفر اس غرض سے نہیں کیا ہے۔ کہ اکابر علماء کو اس انجمن کی شرکت کی دعوت دیں اور عوام کو خواہ مخواہ انجمن کا ممبر بنائیں۔ بلکہ ہماری غرض اس سے علماء کی خدمت میں حاضر ہونا اور ان سے اپنے مقاصد کو زبانی عرض کرنا اور ان سے مشورہ دینے کی خواہش کرنا ہے۔ چنانچہ اس امر میں بہت کامیابی ہوئی۔ ہم بہت مشکور ہیں کہ جن علمائے کرام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے بڑے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ اور ہمارے معروضات سنے۔ اور اپنی مفید تجاویز بتلائیں۔ ہماری معلومات کو وسیع کیا۔ اور آئندہ مفید مشورہ دینے کا وعدہ کیا۔ ہم کو جو مشکلات اس انجمن کے قائم کرنے میں پیش آئیں اور ان کے متعلق جو حضرات بزرگ کے مشورہ سے جو باتیں قابل لحاظ معلوم ہوئیں۔ ان کو ہم مختصراً قلمبند کرتے ہیں۔ تاکہ ان مشکلات کے آسان کرنے کی صورت نکالی جائے۔

انجمن کے قائم [illegible] دشواریوں کے ملحوظ رکھنے کے ابھی بھی یہ نہیں ہوتی ہے۔ کہ ہم اس انجمن کی کارروائی کو موقوف رکھیں بلکہ ان دشواریوں کو رفع کرنے کی کوشش کی جاوے گی۔ اور جو امور اس دستور العمل کے قواعد کی وجہ سے ایسے ہیں جن سے عام مسلمانوں کو شرکت میں سہولت نہیں ہوتی ہے۔ ان پر ممبران الفیہ پوری توجہ کر رہے ہیں۔ اور عنقریب جو دستور العمل شائع ہوگا۔ اس میں ان باتوں کا لحاظ رکھا جائے گا۔

ہر انجمن کو لائق کارکن مل جانا اس انجمن کے قیام و ترقی کا قوی سبب ہوتا ہے۔ یہ دشواری ہم کو پیش آ رہی ہے۔ کہ جیسے کارکن اس انجمن کے ہونا چاہئیں ابھی ہم کو دستیاب نہیں ہوئے۔ مگر امید قوی ہے کہ اس انجمن سے جو دلچسپی مسلمانوں نے ظاہر کی ہے اس کو دیکھتے ہوئے ایسے لوگوں کا مل جانا بالکل آسان ہے جو اخلاص سے انجمن کا کام کریں جن میں ایثار نفسی ہو۔ جو تجربہ کار ہوں۔ دیانت دار ہوں۔ اور ان پر ملک اعتماد کر سکتا ہو۔ اگرچہ اس وقت بھی انجمن کے کارکن بحمداللہ ان اوصاف سے خالی نہیں۔ مگر جو اہم ذمہ داریاں آئندہ انجمن کے کارکنوں پر عائد ہونے والی ہیں ان کے اعتبار سے ہم ان کارکنوں سے اعلیٰ تر کارکن چاہتے ہیں۔ اور خدا سے چاہتے ہیں کہ جو یہ کارکن اپنے اوصاف کو موجودہ حالات سے زائد ترقی دیں گے۔ اور دینی ان امور کے انجام دینے کے بھی سزاوار ہوں گے جب کہ ان سے توقع

یہ خدا کی توفیق پر موقوف ہے۔ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیز۔ تاہم مسلمانوں کو چاہیئے کہ ان امداد دینے والے حضرات کی نقصان دہی سے انجمن کے کام کو برقرار فرمائیں۔ دوسری بات یہ قابل لحاظ ہے۔ کہ یہ انجمن ملک میں اتحاد پیدا کرنا چاہتی ہے۔ اس کے لئے عہدیداران کا بے جوڑ نہ ہونا ضروری امر ہے۔ اس کی طرف خاص توجہ کرنی چاہیئے۔ تاکہ کارکنوں پر ملک اعتماد کرے اور خود وہ حضرات بھی کسی داخلی یا خارجی مفسدہ پردازی کے اثر کو قبول نہ کریں۔ یہ صورت مشکل ہے تاوقتیکہ ان کے ذریعہ کی جس قدر ممکن نہ ہو۔ ہمارا فرض ہے۔ کہ ہم کو ان سے آگاہ کریں۔ اور اس مشکل کے دور کرنے کی ہر وقت کوششیں ہونی چاہئیں۔ ہم خود ان امور سے انجمن کو بالکل علیحدہ رکھیں گے جو فرقہ بندی کا باعث ہیں۔ بلکہ اس پر خاص توجہ کی جائے کہ کسی بات سے اسلام کو ہی نقصان ہوتا ہو۔ وہ کیسی ہی مفید کیوں نہ ہو۔ ہم اس کو بغیر اس کے نقصانات کے دفع کئے ہوئے نہ اختیار کریں گے۔ مثلاً اشاعت اسلام جتنا اہم اور ضروری ہے۔ اتنا ہی دشوار اور موجب افتراق ہے۔ یہ زیر بحث ہے کہ اور غالباً اس سے انجمن کو تعلق نہ رہے گا۔ اور یہ فرقہ کے عقائد کی اشاعت اس فرقہ پر چھوڑ دی جائے گی۔ ابتدائی مدارس وہیں کھولے جائیں گے جہاں ضرورت ہو۔ ورنہ موجودہ مدارس کی مدد کی جائے گی لہذا ہم کوئی امر ایسا نہیں کرنا چاہتے ہیں جس میں ہم کو اس بدظنی کا اندیشہ ہو۔ جو بات ایسی ہو اس سے اطلاع کرنا ہمارے مسلمان بھائیوں کا فرض ہے۔ تاکہ اس پر ہم غور کریں۔ اور اس کو دفع کر دیں۔ ہم کوئی راز نہیں رکھنا چاہتے ہیں۔ بلکہ ہر امر آشکارا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہمارے فرائض مذہبی ہیں۔ اس میں ہم کو یقین ہے۔ کہ متمدن اقوام بالخصوص حکام ہند یا برطانیہ کے لوگ کبھی دست اندازی کو روا نہیں رکھیں گے اور ہم کو اس کا یقین ہے۔ کہ یہ لوگ ہرگز مقامات متبرکہ کی بے حرمتی کا گمان بھی نہیں رکھتے ہیں۔ اسی وجہ سے بلا خطرہ ہم اس انجمن کو قائم کر رہے ہیں۔ تاہم اس کا تحفظ امن کے لحاظ سے یہ ہے۔ کہ وہ کسی ایسی تحریک کو جو امن عامہ میں خلل انداز ہو یا قانون کے خلاف ہو۔ شائع نہ ہونے دیں۔ اسی واسطے ہم کو بھی اس کا تحفظ از بس ضروری ہے۔

چونکہ امر متعلق مال کے ہے۔ کوئی کام بغیر روپیہ کے نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ضروری ہے کہ اس انجمن کا چندہ وصول کیا جائے۔ مگر وہ چندہ ایسا ہونا چاہیئے کہ جو کسی دیگر مفید انجمن کے چندہ کا سد راہ ہو۔ کیونکہ یہ انجمنیں ایسی ہیں کہ جن کی وجہ سے ہم اس وقت ترکی سلطنت کی تائید کر سکتے اور ملک کے فوائد ان سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس خیال سے چندہ قلیل مقدار کا رکھا گیا ہے۔ جو صورت مفید ہو اس سے ہم کو اطلاع ہونا چاہیئے۔ اس کا خیال رکھا جائے۔ اس طرح روپیہ جمع کرنے کا طریقہ ایسا ہونا چاہیئے۔ جس میں غبن نہ ہو سکے۔ تیسرے مصارف کے اوپر خاص توجہ کرنا چاہیئے۔ اور وہ روپیہ جو سلطنت ترکی کو دیا جائے۔ اس میں تصفیہ کر لینا چاہیئے۔ کہ یہ روپیہ چونکہ خدمت مذہبی کے لئے دیا جائے گا۔ اس واسطے اس روپیہ سے سوائے مقامات متبرکہ کی عزت و حرمت برقرار رکھنے کے اور کچھ نہ کیا جائے۔ ہر حالت میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ کہ کسی قسم کی ہمدردی اہل عرب کے ساتھ ایسی نہ کی جائے جو باعث ان کی اور ترکوں کی رقابت کا ہو اور مسلمانوں میں عداوت پیدا ہو۔ اگر خدانخواستہ ایسی کسی صورت میں ہم نے مدد کی تو بلاشبہ یہ مضر ترین فعل ہوگا۔

کسی طرز عمل سے اس کا شائبہ اگر ہوتا ہو تو ہر محب قوم و اسلام کا فرض ہے۔ کہ ہم کو آگاہ کر دے۔ ہم ہر طرح کی اصلاح کیلئے تیار ہیں

محاربۂ بلقان

سجاد حیدر یلدرم کے قلم سے

پنجشنبہ ۵ جون ۱۹۱۳ء۔

اسلام کے لئے میں اس لڑائی کو پچھلے سو برس بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ زمانہ کی سب سے بڑی فلاکت سمجھتا ہوں۔ ۱۸۷۸ء کی جنگ روم و روس میں بھی اسلام کو سخت ضرب پہنچا تھا۔ لیکن وہ اس قدم اکھاڑ دینے والے دھکے کے مقابلے میں بہت کم تھا۔

اس معرکہ میں پیکر اسلام بے جان تو نہیں ہوا۔ مگر اس سے بڑھ کر ایک مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ مسلمان اپنی عزت نفس کھو بیٹھے۔ اور کتنے دل ہیں جو اس فلاکت کی وسعت اس زخم کی گہرائی کا اندازہ کر سکتے ہیں؟ یورپ سے مسلمانوں کا اخراج ہماری آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔ مصیبت زدہ۔ خانماں برباد قافلے۔ اپنے وطنوں کو اپنے گھروں کو، اپنی زمینوں کو، اپنے باپ دادا کے کھیتوں کو چھوڑ کر اور اس طرح چھوڑ کر کہ اپنی باقی تلخ محروم نشیمن زندگی میں اس کا خواب ہی دیکھیں تو دیکھیں۔ اور خواب میں کون سی رات ہوگی کہ وہ نہ دیکھیں گے؟ وہ معلوم اقالیم کی طرف جا رہے ہیں۔ وطن نکالا اور وہ بھی آگ کے شعلوں اور تلواروں سے۔ جبرکوں کی مشایعت کے ساتھ مل رہا ہے۔ اور اتنی فرصت بھی نہیں دی جاتی۔ کہ وہ اپنے گاؤں کے قبرستان میں جا کر اپنے باپ، ماں یا بھائی بہن کی قبر پہ ایک آخری فاتحہ پڑھ لیں۔ یہ تو وہ ہیں جو آشیاں ویران ہیں۔ بھٹک رہے ہیں مگر اسیر نہیں ہوئے۔ اور جو جنگل میں آ گئے، وہ اپنے وطن سے نکالے نہیں گئے۔ ان کے ساتھ یہ احسان کیا گیا کہ وہ اپنے وطن کی زمینوں میں جلا دیئے گئے۔

اس بے پایاں سیلاب بلا کی مسلمانوں کی تاریخ میں کونسی نظیر ہے؟ اخراج مسلمانان از اسپین۔ تباہی بغداد۔ کشت اسلام جب پامال ہو کے روندے گئے۔ اس وقت یہ دردناک عبرت ناک نظارے چند عبرت اندوز آنکھوں اور چند ملہم دلوں نے دیکھے ان میں سے

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر　　داغ رویا خون کے آنسو جہان آباد پر

آسماں نے دولت غرناطہ جب برباد کی　　ابن بدروں کے دل ناشاد نے فریاد کی　　(اقبال)

مگر مجھے خوف ہے۔ کہ اس بلائے ناگہانی کی جو اپنے سیاہ دامن میں ہماری آنکھوں کے سامنے مسلمانوں کو لپیٹ رہی ہے۔ کیفیت کیست کے سمجھنے والے سمجھانے والے ہم میں کم یاب ہیں۔ اور یہ مصیبت بالائے مصیبت ہے۔ ہندوستان میں اس کی چوٹ سب کے دلوں پر لگی ہے۔ مگر بہتیرے کتنے شبلی، محمد علی۔ ڈاکٹر انصاری اور چند اور لوگ ان کے مقابلے میں یہ منظر بھی ہماری آنکھوں نے دیکھا کہ اس مصیبت سے ناجائز فائدہ اٹھانے والے لوگ ہم میں پیدا ہوئے۔ یہ مسلک پنجاب کے ایک اخبار نویس نے عجب طمطراق کے ساتھ اختیار کیا۔ ایک طرف تو یہ لوگ ہیں۔ دوسری طرف وہ جو اپنے گھروں میں آرام سے بیٹھ کر، ان قربان ہونے والوں پر طعنہ زن ہیں کہ کچھ نہیں کیا فقط طلبہ کے سادہ دل۔ زود اعتقاد۔ خیر پیشہ ہیں وفاداروں کے متعلق اپنے ترکش دشنام میں سے جتنے تیر چاہیے استعمال کیجئے۔ مگر اے قارئین کرام جو لوگ اسلام کے لئے اور اسلام کے نام کے لئے سینہ سپر ہوئے۔ گو سینہ عریاں رکھتے تھے۔ شمشیر بکف حریف سے لڑے۔ گو خود بھوکے تھے، ان کا استہزاء تو نہ کیجئے۔

میں نے کہا کہ میں اس ضرب کو ۱۸۷۸ء کے ضرب سے بہت شدید سمجھتا ہوں، اور اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ اس وقت اسلام نرغہ میں نہ تھا بلکہ دولت

پروفیسر مرزا محمد سعید دہلوی[1]

ہندو مسلمان کے اتحاد پر ایک نظر

(شنبہ ۸ نومبر ۱۹۱۳ء)

میں قوم کے کسی فرد کی نسبت مجہول الاسم یا غیر معروف وغیرہ وغیرہ ہونے کا حملہ کرنا نہیں چاہتا۔ جیسا کہ بعض خود سر تحریروں کا رویہ ہے۔ کیونکہ یوں تو ہمیشہ شریف اور لائق اصحاب کی پگڑی اچھالے اور قوم کی مصیبت اور اس کی مشکلات کے وقت کبھی کروٹ بھی نہ لے۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جو اصحاب باوجود مشکلات زندگی کے ہندو مسلمان کے اتحاد کے محرک ہوئے ہیں ان کے دلی جذبات اور خلوص کا اندازہ اپنے حلقہ اور مکان کی چار دیواری میں بیٹھنے والوں کو خودساختہ بھاٹوں کی زبانی سنی سنائی باتوں سے نہیں ہو سکتا، جب تک کہ ان کے دل میں بھی جذبہ موجود نہ ہو۔

میرے خیال میں کاپی نویس پڑیہ بندی نہیں بلکہ اگر قوم کے ایک لکڑہارے اور گھسیارے اور پریس کے کلبہ کے دل میں اسلام اور قوم کی سچی عزت اور ترقی ملک کے جائز جذبات موجزن ہیں تو ان کی ہستی ان ننگ قوم افراد کی زندگی سے بدرجہا زیادہ مبارک ہے، جو دین کے خلاف اپنی رائے رکھ کر عزت چاہتے اور اپنے خطابوں اور جاہ طلبی کی امیدوں سے دھوکہ میں آکر قومی جذبات کو پامال کرتے ہیں۔ خدا کے فضل سے امید ہے اور زمانہ بالکل قریب ہے جب کہ کاپی نویس، پڑیہ بند اور کلبہ اپنے سچے جذبات کے ساتھ چمکدار ستارے اور آفتاب کی روشن کرنیں بن کر چمکیں گے اور ملت فروش و خود پسند درہم و دینار کے بندے تعجب و حیرت کے ساتھ اپنی چار دیواری میں گھن کھائے پیڑوں کی طرح پڑے سڑا کریں گے۔ ان مجہول الاسم اصحاب کی اتحادی تحریک بالکل نیک نیتی پر مبنی تھی مجھ کو ان میں خاص اصحاب کے جذبہ اور خلوص کا پورا پورا علم اور اندازہ ہے۔ لیکن انسان میں غفلت بھی ہو جاتی ہے ممکن ہے کہ کسی وقت کے سبب وہ اس معاملہ پر کافی غور نہ کر سکے ہوں۔ لہذا اگر ایک کام کرنے والی ہستی کی کسی غلطی کی وجہ سے تحقیر کی جائے یا اس کو قوم کی نظروں سے گرانے والے الفاظ لکھے جائیں۔ تو اس بے سرے الاپ کو خود پسندی اور اور شوریدہ سری کی دھن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ چونکہ آج کل اخبارات میں ہندو مسلمانوں کے اتحاد کے متعلق مختلف تجویزیں پیش ہو رہی ہیں اس لیے مجھ کو بھی اپنے خیالات حوالہ قلم کرنے کی جرأت ہوئی جن کو ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔

سنہ ۱۹۰۶ء سے پہلے جب دہلی میں بیرون شہر طاعون کے مریضوں کے لیے جھونپڑیاں ڈالی گئی ہیں اور اس وقت

مسلمانوں نے محض پردہ کے خیال سے انکار کیا تو ہمارے وطنی بھائیوں نے اتحاد کی اس طرح تحریک اٹھائی تھی جیسی۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء کو مسلمانوں کی طرف سے بلا کوئی مابہ النزاع معاملہ ہونے کے ہو چکی ہے۔ اور اس اتحاد سے ہمارے بھائیوں نے وہی فائدہ اٹھایا جو مسلمانوں نے اپنے شرعی پردہ سے اٹھایا تھا۔ اور اس طرح دونوں قومیں ان تعویذیوں کی تکالیف سے محفوظ رہیں۔ فریقین کی طرف سے اتحاد کی تحریک ہو چکی ہے۔ صرف فرق اتنا تھا کہ مسلمانوں نے اپنے بھائیوں کی اس نمائشی تحریک سے چشم پوشی کی اور دو ہندو والے روزانہ فراخ دلی اور خلوص کے ثبوت میں پان سپاری، شربت وغیرہ وغیرہ سے مدارات کی۔ لالہ صاحبان کے اس نمائشی اتحاد کا اس سے پتہ مل جائیگا کہ جب عید الاضحیٰ کا موقع آیا اور غریب دستکار پیشہ ور مسلمانوں نے اپنے تہوار کے وقت مزدوری طلب کی جس کا وہ بقدر عید سے پہلے انتظام کر لیا کرتے تھے، اور اس وقت اس نمائشی اتحاد پر بھروسہ کر کے کوئی انتظام نہیں کیا تھا تو ان غریب مسلمانوں کو کورا جواب ملا کہ تم جیو ہتیا کرو گے، ہم تو ان تاریخوں کے بعد خرچ دیں گے۔ اسلامی بھائی اپنا سا منہ لے کر چلے آئے اور اتحاد کی قلعی کھل گئی۔ اب جو مسلمانوں نے تحریک اٹھائی تو وہ ہمارے بھائیوں نے نمائش پر محمول کی۔ یہاں تک مسلمانوں کو اس وقت نہ طاعون کی جھونپڑیاں نظر آ رہی تھیں اور نہ کوئی ملکی خوف ہراساں کر رہا تھا جس کے واسطے لالہ صاحبان سے امداد کی امید پر اتحاد کی تحریک اٹھائی جاتی۔

پھر اس کے بعد آج سے کچھ عرصہ پہلے بنگال ایجیٹیشن کے وقت ہندو اصحاب نے مسلمانوں کو اپنا ہم آواز بنانے کے لیے اتحاد کی تحریک اٹھائی۔ لیکن چونکہ وہ آواز ایک حد تک گورنمنٹ کی منشاء کے خلاف تھی اور اسلامی تعلیم سے جدا تھی اور اس اتحاد کے قیام اور کسی قسم کی مادی وغیر مادی فائدہ کی امید نہ تھی اس لیے مسلمانوں کا علیحدہ ہی رہنا مناسب تھا جس کی نسبت یہ خبر اڑائی گئی کہ مسلمان ڈرپوک ہیں اور اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد جدا چننی چاہتے ہیں۔

ان واقعات کے بعد پھر نہ معلوم کہ ہندو مسلمان کس وقت دست و گریباں ہو چکے ہیں جس کی صفائی کے لیے مسلمانوں کو یکایک اتحاد کی امنگ پیدا ہوئی اور خواہ مخواہ مجہول الاسم ترے دفتر میں لکھی گئی۔

پھر اس پر بھی بس نہیں بلکہ بعض سادہ لوح مسلمان خود پیش ہیں اگر مسلمانوں کو یہ مشورہ دینے کے لیے تیار ہو گئے کہ عید الاضحیٰ کی تاریخوں میں مسلمان گائے کا ذبیحہ چھوڑ دیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ اس وقت جب کہ ملکی ترقی کے خیال سے مسلمان اتحاد کے محرک ہوتے ہیں تو ان کو قبل از وقت اس قسم کی تجویز پیش کرنے کی ضرورت کیا ہے جس کو قوم کا بہت بڑا حصہ اس وقت تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ بجز اس کے کہ یا تو ایسے خیال والے اصحاب کو ان کی نسبت میں لانا چاہتے ہیں اور واقعات سے چشم پوشی کرتے ہیں، یا وہ زمانہ کے واقعات سے اصلاً بے خبر ہیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ بنگال ایجیٹیشن کے وقت ہندو اصحاب نے باوجود مابہ النزاع کوئی واقعہ نہ ہونے کے جو اتحاد کی تحریک اٹھائی تھی اس وقت سے اب تک برادران وطن کی طرف سے کون سا اینٹ مبارک ہو کر ہوا ہے، جو

مسلمانوں کو جو اب اتحاد کی طرف جذب نہ کر سکتا ہو۔ مجھ کو معاف فرمایا جائے اگر میں یہ عرض کروں کہ طبیعتوں میں جو تنفر اور کشیدگیاں و قومیت کا خیال اس وقت تھا وہ اب بھی موجود ہے مسلمانوں کی ملازمت کی چھوٹی چھوٹی اسامیوں کے لیے جو دشواریاں اس وقت تھیں وہ اب زیادہ موجود ہیں۔ چھوت چھات کی رسم دن بدن زیادہ سخت ہوتی جاتی ہے۔ مذہبی مباحثت کا لب و لہجہ روز بروز کڑا اور دل آزار ہوتا جاتا ہے۔ اب اگر ہمارے سادہ لوح مسلمان ان تمام باتوں کی وجہ سے گائے کی قربانی قرار دیتے ہیں تو، پانچ سوال پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) مسلمانوں کے تہوار پر کیوں اظہار رنج کیا جاتا ہے، جب کہ روزانہ ایک عمل جاری ہے۔ بجز اس کے کہ ہمارے بھائیوں کو مسلمانوں کی خوشی ناگوار ہے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

(۲) جب کہ ہندوستان کی تمام قومیں اس گائے کشی سے فائدہ اٹھانے میں برابر ہیں خواہ فائدہ خوراک کے درجہ میں ہو یا آرائش و استعمال کی چیزوں سے حاصل ہوتا ہو۔ بستر بند، ہینڈ بیگ، گھوڑے گاڑی کا سامان سواری کا زین، بوٹ، شوز وغیرہ وغیرہ مسلمانوں کی کھال کی نہیں ہوتی بجز جانوروں کے چمڑہ کے تو محض اہل اسلام سے کیوں یہ تحریک کی جاتی ہے، اور عیسائیوں اور دیگر قوموں سے یہ سوال کیوں نہیں کیا جاتا؟ اور مسلمان دوسری قوموں سے پہلے کس احسان کے دباؤ میں ایسی تجویز پیش کرنے اور صلح کرانے کے لیے تیار ہیں جس کو ضمیر ماننے کے لیے حاضر نہیں ہے۔

باوجودے کہ مسلمان نسبتاً اپنی مذہبی پابندی میں کمزور نظر آ رہے ہیں تاہم اس تجویز کے تسلیم کرنے سے پہلے ان کو یہ خطرہ ہو سکتا ہے کہ آج ایک فروعی مسئلہ مابہ النزاع قرار دیا جا رہا ہے تو ممکن ہے کہ کل کوئی اصولی بات ہمارے بھائیوں کے لیے موجب رنج ہو۔ اور اس کے بعد وہ تحریک کریں کہ پکار کر اذان نہ دی جائے۔ پھر اس کے بعد مسلمان مسجدوں میں نماز ادا کرنے نہ جائیں کیونکہ مسلمانوں کا ایک جگہ بیٹھنا بھی غیر مسلم اقوام کے دلوں کو ہمیشہ کھٹکتا رہا ہے۔ پھر اور آگے چل کر یہ تحریک ہو کہ مسلمان گھروں میں قرآن پاک کی تلاوت نہ کریں، کیونکہ ہندو اصحاب کو اس تعلیم سے اتفاق نہیں ہے۔ تو ذرا سادہ لوح حضرات غور فرمائیں کہ آئندہ مسلمان کن کن باتوں کو ترک کرنے کے لیے آمادہ نظر آتے ہیں۔

(۴) اس وقت جب کہ مسلمان بوجہ اپنی غربت کے بکری کا گوشت نہیں خرید سکتے جو گائے وغیرہ سے نسبتاً گراں ہے تو اس وقت جب کہ گائے کا گوشت دوا کے لیے بھی میسر نہ ہوگا اور مسلمان اگر اس گرانی کے متحمل نہ ہوں گے تب ان غریب مسلمانوں کی خوراک کا کیا انتظام ہو سکے گا۔ اور معتاد غذا نہ ملنے کے سبب وہ کیونکر اپنی صحت قائم رکھ سکیں گے۔

(۵) اگر تھوڑی دیر کے لیے مابہ النزاع گائے کشی کو تسلیم کر لیا جائے اور مسلمان اس کے ترک پر آمادہ بھی ہو جائیں تو اس کے عوض مسلمانوں کو اپنے بھائیوں سے کس قسم کی مادی یا غیر مادی فائدہ کی امید رکھنی چاہیے۔

دونوں قومیں مجھ کو معاف فرمائیں، مجھ کو اپنی مذہبی معلومات کے علاوہ دیگر مذاہب کی جو کتابیں دیکھنے کا اتفاق

ہوا ہے اور زمانہ کے واقعات بتا رہے ہیں ۔ وہ یہ ہے کہ مابہ النزاع کوئی مذہبی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ جو کچھ ہے ناشدنی واقعات پیش آ رہے ہیں ۔ یہ سب اسی بات کا خمیازہ ہے کہ اپنے مذہب کے سچے پابند نہیں ہیں ۔ نہ ہندو، ہندو ہیں اور نہ مسلمان مسلمان ۔ کیونکہ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں ہے جس میں کچھ نہ کچھ اخلاقی تعلیم کا حصہ نہ ہو ۔ اور اس کے تحت میں دل آزاری سے روکا نہ گیا ہو ۔ یہ ایک بہت بڑی کمی واقع ہو گئی ہے جس کا ہندو مسلمان کسی وقت بھی لحاظ نہیں کرتے ۔ اور فریقین کو وہ ناگوار شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ، اور اس کا تمام بار مذہب پر ڈالا جاتا ہے ، اور معاملات زندگی میں نئی نئی الجھنیں اور رکاوٹیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ہندو اصحاب میں سے جو صاحب اپنے مذہب کے پابند ہیں ان کی ذات سے کسی مسلمان کو شاکی نہ پایا اور اسی طرح کسی ہندو کو مسلمان کا ۔

میرے خیال میں اگر آج ہندوستانی اقوام میں اگلی سی صداقت اور اخلاق پیدا ہو جائیں جس کو اس جدید تعلیم نے مسخ کر دیا ہے ، اور ہر ایک کو کبر و نخوت کا پتلا بنا دیا ہے ، تو کبھی ایک دوسرے سے شکایت نہیں ہو سکتی ! اس لیے میں مؤدبانہ عرض کرتا ہوں کہ بات بات پر مذہب کو آڑ بنانا اور اس کے اوچھل دلی بخارات کا اظہار کر کے مذہب کو بدنام کرنا عقلمندی اور دور اندیشی سے بعید ہے ۔ بجائے اس کے کہ ہم اپنے ملک کی ترقی کے لیے فنا ہونے والی کوشش میں وقت صرف کریں ۔ بہتر اور مناسب یہ ہے کہ ہر ایک کو اپنی حالت پر چھوڑا جائے ۔ پرماتما کی بھگتی کرنے والے سے محمد صلعم کا نام لینے والوں کے اعمال کی بازپرس نہ ہو گی اور مسلمان سمجھتے ہیں کہ قیامت کے روز ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا ۔ تو ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اپنے حقوق کی حفاظت اور اپنے ناموس کو آئندہ خطرات سے بچانے والے اسباب کی تلاش کریں ۔ اور دنیاوی حقوق کی حفاظت کے ساتھ رام کی بھگتی اور خدا کی عبادت کریں اور سوچیں کہ اس پرماتما نے دنیا میں گوناگوں اور متضاد عناصر سے مختلف الخیال اقوام پیدا کی ہیں اور حقیقت میں دنیا کس رستہ کا نام ہے ۔

سعید دہلوی

شخصیات

رؤف کمانڈر جہاز حمیدیہ سے گفتگو

یکم جنوری ۱۹۱۳ء

ہمعصر اخبار "ترقی" کے نامہ نگار نے رؤف بے حمیدیہ کے مشہور کمانڈر سے جو گفت و گو حمیدیہ کے حیفا پہنچنے پر کی تھی اس کا ذکر اپنے حال کی اشاعت میں کرتے ہیں۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ جمعہ کے روز گذشتہ سہ پہر کو عصر کے وقت "حمیدیہ" جہاز حیفا کی بندرگاہ پر پہنچا۔ میری طبیعت نے گوارا نہیں کیا کہ پہلے کی طرح اب بھی اس جہاز کے مشہور افسر کی زیارت سے محروم رہوں۔ چنانچہ میں معہ اپنے ایک خاص دوست اور چند دیگر ہمراہیوں کے سمندر کے کنارے پہنچ کر ایک کشتی میں سوار ہوا۔ جو ہمیں بٹھا کر فوراً ہی حمیدیہ کی جانب روانہ ہوگئی۔ اس وقت کی کیفیت نہ پوچھئے دل کا یہ حال تھا کہ مارے خوشی کے پھولا نہ سماتا تھا۔ اور طرح طرح کے خیالات کے ہجوم نے جو لحظہ بلحظہ بڑھتے رہتے تھے مجھے بالکل محو کر دیا تھا۔ اسی عالم بیخودی میں ہماری کشتی "حمیدیہ" کے پاس پہنچ گئی۔ اور میں یکایک چونک پڑا۔ ایک افسر سے ملنے کے لئے اجازت کا لینا ضروری تھا۔ اس لئے ہم نے اپنے آنے اور شیر دل رؤف بے سے ملاقات حاصل کرنے کی باقاعدہ اطلاع کرائی جس کے جواب میں انہوں نے اپنی معزز جماعت میں سے ایک شخص کو ہمارے لئے بھیجا۔ جس نے ہمیں بہادر جہاز ران تک پہنچنے میں مدد دی۔ یہ گداز جسم، پست قامت، بلند پیشانی، مدور چہرہ، اور سیاہ چشم نوجوان تھا۔ خرمی و نشاط کے آثار چہرے سے نمایاں تھے۔ اس نے ہمارا استقبال اس طرح کیا جس طرح ایک بلند حوصلہ اور عالی ہمت شخص کو زیبا ہے۔ جس وقت ہم نے اپنے شیر دل جہاز ران کی زیارت کی تو یکایک ان کے کارناموں نے یاد آ کر میرے دل پر رعب طاری کر دیا۔ اور میرے حواس ایسے مختل ہوئے کہ میں اپنے متعلق چند منٹ تک اسے کچھ نہ کہہ سکا۔ تاہم میری خوشی اس رعب پر غالب آئی۔ اور میں نے اپنی کپکپاتی زبان اور ٹوٹے پھوٹے بے ربط الفاظ سے جس قدر گویائی نے یاوری کی جہاز ران موصوف سے اپنے خوش قسمت ہونے کا اظہار کیا۔ ایسا شخص جس کی آنکھیں اور پلکیں چشم بینا اور گوش شنوا پر اپنے استقلال و بسالت کا بزبان حال ثبوت دے رہے ہوں اسباب کی کامل دلیل ہیں کہ جس پر آشوب زمانہ کا احساس آج کل عثمانی کر رہے ہیں۔ اس پر ان کے رؤف بے جیسے وطن پرست اور بہادر ضرور فتح حاصل کریں گے۔

تیسرے روز جب ہم ہوا اور ہم کرسیوں پر بیٹھے تو مجھے خیال آیا کہ بہادر رؤف بے نے وطن کی خدمت کرتے ہوئے جو کچھ کارنمایاں کئے ہیں ان کی داستان سننی چاہئے۔ لہٰذا میں نے کہا کہ میں نے آپ کے متعلق اخبار "ڈیلی ٹیلیگراف" میں ایک مضمون "بحری سبق" کے عنوان سے دیکھا ہے اور انگریزی میں کہا کہ دردانیال سے نکل کر بحری محاربات میں آپ نے اپنی کامل بہادری کا ثبوت دیا ہے اور بحری رستوں کو دشمنوں کے لئے خطرناک بنا دیا ہے۔ یہاں تک کہ سرویہ نے جب اپنی سپاہ اور توپیں بھیج کر سقوطری کا محاصرہ کرنا چاہا تو محض "حمیدیہ" کی مدد سے بری سپاہ ارسال کی مگر توپیں پھر بھی نہ بھیجیں کیونکہ ان کے لے جانے کے لئے بری رستہ نہ تھا۔ آپ نے اس کا جواب انگریزی میں دیا۔ اور اس طرح گفت و گو کی جیسے کوئی قادر الکلام شخص کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ "ڈیلی ٹیلیگراف" ایک نہایت وقیع پرچہ ہے لڑائی چھڑنے سے پہلے میں اسے اکثر دیکھتا تھا لیکن جب سے میں نے سنا ہے کہ وہ اتحادیوں کی طرفداری کے باعث عثمانی حکومت سے منحرف ہو گیا ہے۔ مجھے بہت برا معلوم ہوتا ہے پھر بھی اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ یہ اخبار پھر وہی اعتدال پسندی کی روش اختیار کرے اور اپنی اصلیت پر آ جائے۔

اس جواب سے مجھے معلوم ہوا کہ آپ اخبارات کو نہایت غور و خوض سے دیکھتے ہیں اور ان کے متعلق آپ پوری معلومات رکھتے ہیں۔ میں نے کہا کہ کیا یہ درست ہے کہ عثمانی گورنمنٹ دیگر کمپنیوں کو آپ کے کارناموں کے متعلق اطلاع دیتی ہیں جو خبریں ان کے ذریعے سے پہنچتی ہیں۔ ان میں باہم سخت اختلاف ہے اور رائٹر نے آخر میں اپنے تار میں کہا تھا۔ یہ خیال بھی ہے کہ وہ کہتا ہے کہ ... کے واقعات یہ ہیں کہ اس نے ... سامان خورد و نوش اور ذخائر جنگ کے (۱۰) آدمیوں کو تلف کیا ہے جو اس واقعہ کے آپ کی زبان سے بالتفصیل سننے کے از حد مشتاق ہیں۔ آپ نے کہا کہ میں سین جیوانی ڈی میڈوا پر جو واقعات گزرے ہیں ان کے متعلق کیا بیان کیا گیا ہے۔ میں نے کہا وہ کہتے ہیں کہ آپ نے سین جیوانی ڈی میڈوا پر دو جہازوں میں آگ لگا دی تین غرق کر دیے اور پچاس ساٹھ آدمی ہلاک کئے لیکن عجیب ہے کہ آپ مع سپاہ کی چھاؤنیوں کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے۔

اس پر رؤف بے نے فرمایا "میں نے سین جیوانی ڈی میڈوا میں ایک بادبانی کشتی اور چھ تجارتی باربردار جہاز جو سامان خورد و نوش و ذخائر جنگ سے پر تھے۔ اور بعض میں تھوڑی سی سپاہ بھی بھیجی تھی جلائے اور غرق کئے۔ اس کے بعد شمالی طرف میں اس موقع پر پہنچا۔ اور بعض باربرداری کے غرق ہونے والے جہازوں کا فوٹو لیا میں نے انہیں بنظر غائر دیکھا اور وہاں سے چلا آیا۔ اس کے بعد ... میں نے تین سرویوں کی بارکیں دیکھیں۔ انہیں کے پاس سمندر میں تین جہاز بھی لنگر انداز تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے ان پر آتش باری کرنے کی تیزی کی تاکہ انہیں بھی ہمیشہ کے لئے فارغ البال کر دوں۔ اور توپوں کو داغنا شروع کیا۔ اور ان میں بھی آگ لگا دی سروے توپیں بھی ہم پر آگ اگل رہی تھیں لیکن ان کے گولے ہم سے بہت دور پانی میں گرتے تھے ہم تک نہ آتے تھے۔

جب میں نے دریافت کیا کہ باربرداری کے جہازوں میں کیا تھا تو انہوں نے فرمایا کہ "یقینی طور پر یہ تو معلوم نہیں ان میں کیا تھا۔ کیونکہ وہ ہم سے بہت دور اور ساحل کے قریب تھے لیکن میرا خیال ہے کہ غالباً وہ بھی سامان خورد و نوش اور ذخائر جنگ سے پر تھے۔ دوسرے چار باربرداری جہاز جو رہ گئے تھے ان سے جب میں نے اطاعت قبول کرنے کو کہا تو انہوں نے اطاعت قبول کر لی۔ لیکن جب میں وہاں سے چلا اور حمیدیہ کی زد سے وہ دور ہوئے تو انہوں نے مکر کر کے بھاگنا چاہا۔ یہ دیکھ کر میں نے توپ داغی جس سے ان چاروں میں سے ایک جہاز "الیس" نامی کے انجن کے اس حصہ میں جس میں تیل رہتا ہے (اور جس کو عربی میں "مرجل" کہتے ہیں) آگ لگ گئی۔ اس جہاز میں سپاہ بھری تھی۔ ہم نے اس وقت دیکھا جب کہ شعلے اچھی طرح بلند ہو چکے تھے۔ اور سپاہی آگ سے پناہ لینے کے لئے پانی کے دامن میں پانی پینے کی غرض سے سمندر میں کود رہے تھے۔ اس طرح میں نے باقی — کو بھی جلا دیا۔ تیسری بادبانی کشتی تھی۔ جس میں ذخائر جنگ اور سامان خورد و نوش بھرا تھا۔

اس کے بعد میں وہاں سے واپس آ رہا تھا کہ ایک باربرداری کا جہاز اور ملا۔ اس میں بھی ذخیرۂ جنگ اور سامان جنگ تھا۔ اسے بھی میں نے جلا کر غرق کر دیا۔ مگر اس کے ساتھ جو اسٹیمر تھے انہیں میں نے نہیں روکا۔ جب میں نے عرض کیا کہ بہت سے آدمی آپ کے خطرناک اعمال کو مافوق العادت خیال کرتے ہیں اور رائٹر ویٹنا کی خبر شائع کر کے کہتا ہے کہ آپ کے ساتھ ایک انگریزی افسر ہے۔ جو آپ کو اس شاہراہ کامیابی پر چلا رہا ہے۔ اور وہ یہ بھی کہتا ہے کہ آپ اسی افسر کے ساختہ پرداختہ ہیں تو رؤف بے نے ارشاد فرمایا۔ کہ کثرت حرارت سے اس کے دماغ میں خون چڑھ گیا ہے۔ میں انگریزوں کی نہایت قدر کرتا ہوں۔ اور مجھے اعتراف ہے کہ بحری فنون میں انگریز بہت سی قوموں کے استاد ہیں اور ہمارے یہاں ایک انگریز امیر البحر بھی تھا۔ مگر اب وہ جب سے جنگ چھڑی ہے قانون حفاظت خود اختیاری کے اصول کے بموجب عثمانی بیڑہ کی خدمت سے معزول کر دیا گیا ہے۔ میں تین سال سے متواتر اس — جہاز کی جہاز رانی

کر رہا ہوں ۔ ——— پر قائم ہیں ۔ جب سے کوئی ایسا موقع پیش نہیں آیا کہ ہمارے ساتھ کوئی انگریز یا کوئی غیر ملکی اس خدمت پر مامور ہوا ہو ۔ نہ ہم سے پہلے ایسا ہوا اور نہ آئندہ اس کی امید ہے ۔ میرے یہ دریافت کرنے پر کہ کیا آپ نے کسی انگریز سے بھی یہ تعلیم حاصل کی ہے ۔ انہوں نے فرمایا کہ ہرگز نہیں ۔ مگر میرے والد نے البتہ ان سے تعلیم پائی تھی ۔ اس عرصہ میں جہاز کے چاروں طرف زیارت کرنے والوں کا ہجوم ہو گیا تھا ۔ نیز شہر دل بہلانے کا اور بہت سے کام کرنے تھے اس لئے ہم نے رخصت کی اجازت چاہی ۔

مسٹر موہن داس گاندھی

شنبہ ۱۳ دسمبر ۱۹۱۶ء

سرزمین ہند میں آج کون فرد ہے جو مسٹر گاندھی سپہ سالار حق و صداقت کے نام نامی سے واقف نہیں۔ یہ وہ فخر ہند نوجوان ہے جو مادر ہند کی عزت و احترام برقرار رکھنے کی خاطر آج تمام تر بار جنوبی افریقہ سے۔ بر خاطر میں دنیا کی گوری آبادی کے ہاتھوں مظلومیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ مہذب دنیا کو فخر ہے کہ اس نے بردہ فروشی کو نابود کر دیا۔ مگر جو سلوک جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ جائز قرار دیا جا رہا ہے وہ کیا ہے؟ جس زندگی پر انہیں مجبور کیا جا رہا ہے اگر یہ تعبد و غلامی نہیں تو پھر غلامی کیا ہے؟ جبر و ظلم، بے دردی و بے رحمی کی ظلمت آفتاب صداقت کے چمکتے ہی کافور ہوتی ہے۔ آج جنوبی افریقہ میں حق و مکاری، حریت و استبداد، نور و ظلمت کی کشمکش ہے۔ کل نتائج سامنے ہوں گے۔ دنیا کی تاریخ کے حصہ تاریک کا ایک صفحہ منور کر دیا جائے گا۔ مظلومیت کی فوج جبر و ظلم کو پسپا کر دے گی۔ اس درمیان میں سپہ سالار حق و صداقت کے حالات خالی از دلچسپی نہ ہوں گے۔

مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی کاٹھیاواڑ کے ایک قدیم خاندان کے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ ۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو کاٹھیاواڑ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد نہایت ہی عزت دار بزرگ تھے۔ اور مدت تک ریاست ہائے پوربندر و راج کوٹ میں بعہدۂ وزارت سرفراز رہے۔ گویا سیاسیات مسٹر گاندھی کی میراث پدری ہے۔ آپ کی والدہ نہایت نیک طینت پرانے خیال کی خاتون تھیں۔ اور چونکہ مسٹر موصوف اپنے والدین کے سب سے آخری فرزند تھے اس لیے آپ کی اور آپ کی والدہ کے درمیان محبت مادری بھی خاص طور کی تھی۔ جو لوگ اس راز سے واقف ہیں کہ بچہ کی ابتدائی تعلیم پر حالات گرد و پیش کا اثر نہایت گہرا پڑتا ہے۔ وہ مسٹر گاندھی کی دینداری و پرہیزگاری سے مسٹر موصوف کی والدہ کی سلامت روی کو دریافت کر سکتے ہیں۔ ہندی تعلیم کے بعد جب آپ ولایت جانے لگے تو آپ کی والدہ اپنے بیٹے کو سمندر کا سفر کرنے کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ آخر بڑی ردوکد کے بعد اس وعدہ پر کہ گاندھی ولایت جا کر گوشت، شراب اور یورپ کی عورتوں سے پرہیز کریں گے۔ رضامند ہوئیں۔ اور فرمانبردار بیٹے نے اپنے وعدہ کو صداقت سے پورا کیا۔ ولایت سے بی۔اے اور بیرسٹری پاس کر کے واپس آئے اور بمبئی میں وکالت شروع کر دی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کی آمدنی تقریباً پانچ ہزار روپے ماہوار تک پہنچ گئی۔ اور کامیاب بیرسٹروں میں شمار ہونے لگے۔ ایک ہندی مقدمہ کے متعلق آپ کو ۱۸۹۳ء میں جنوبی افریقہ جانا پڑا۔ قدرت کو یہی میدان آپ کی ہمت مردانہ کا جولان گاہ بنانا مقصود تھا۔

یہاں جب آپ نے دیکھا کہ آپ کے ہم وطنوں کے ساتھ افریقہ کی گوری آبادی وہ سلوک روا رکھتی ہے جو ہندوستانی ضمیر بہائم کے ساتھ بھی جائز نہ رکھنے لرزتا ہے۔ تو دل بے تاب ہو گیا۔ چنانچہ مسٹر گاندھی نے جس وقت عدالت میں اپنا وکالت نامہ داخل کیا ہے تو عدالت اوّل نے اس عذر پر مقدمہ میں پیروی کرنے کی اجازت نہیں دی کہ کالے رنگ والے آبادی دنیا میں سفید رنگ کی ہمسری کے لیے پیدا نہیں کیے گئے ہیں بلکہ غلامی کے لیے۔ اس لیے اس کو کوئی موقع نہیں دیا جاسکتا کہ اپنے فطری فرض سے نکل کر اپنے آقاؤں کے مقابلہ پر آئے۔ مگر عدالت بالادست سے بعد از دشواری بسیار وکالت کی اجازت مل گئی سنہ ۱۸۹۱ء میں گاندھی کی عاقبت بین نگاہ نے ان تمام خطرات کو دیکھ لیا جن کا بادل ہندی آبادی کی تباہی کے لیے فضا میں جمع ہو رہا تھا۔ نیٹال ہندی انجمن کی درخواست پر وہیں رہنا منظور کر لیا۔ کہ شاید ضرورت کے وقت اپنے مظلوم برادران وطن کے کام آئیں۔ اس سال آپ نے چند دیگر مقتدر آدمیوں کی یگانگت میں نیٹال ہندی کانگرس قائم کی۔ جس میں کچھ عرصہ تک بحیثیت آنریری سیکرٹری کام کرتے رہے۔

اس زمانہ میں ممانعت داخلہ اقوام ایشیا کے خلاف آپ نے جد و جہد کی اور کامیاب ہو گئے۔ دوسری کوشش آپ نے ہندی آبادی کے حقوق غصب کرنے کے خلاف کی۔ مگر اس میں ناکامیاب ہوئے۔ تاہم امپیریل گورنمنٹ کے ایما پر سنہ ۱۸۹۵ء میں آپ ہندیان مقیم نیٹال و ٹرانسوال کے قائم مقام بن کر ہندوستان تشریف لائے۔ تاکہ یہاں کی آبادی کو اپنے آوارہ وطن بھائیوں کی ناگفتہ بہ سرگذشت سے آشنا کریں۔ اور اس فرض کو آپ نے شہر در شہر دورہ کر کے اور رسالہ جات شائع کر کے انجام دیا۔ یہ خبریں جب اخبارات کے ذریعہ سے افریقہ میں پہنچیں تو آپ کے برخلاف گوری آبادی میں سخت اضطراب و بے چینی پیدا ہو گئی کیونکہ یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ اس کے مظالم کی داستان کو شائع کیا جائے کیونکہ اس کے نزدیک سیاہ رنگ کو پیسنا اور برباد کرنا بھی فرض انسانیت تھا۔

اس عرصہ میں آپ معہ اپنے خاندان کے ڈربن واپس گئے۔ اور جس جہاز میں یہ دل پرست سفر کر رہا تھا۔ اس میں چند دیگر ہمدرد ان ہند بھی تھے۔ مگر ان کے وہاں پہنچنے سے پیشتر نو آبادی کے شریروں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ مسٹر گاندھی اپنے ہمراہ ہندوستان سے ایسے کاریگر لے کر آرہا ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں یہاں کے اُجڈ گوروں سے ساری محنت چھین لیں گے۔ ایک تو پہلے ہی خبروں کی آگ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی اس مزید روغن اندازی نے اور بھی شعلے بھڑکا دیئے۔ اور اب مسٹر موصوف کے خلاف ایک خدائی ہنگامہ جس کی برافروختگی کو کوئی چیز فرو نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ جب جہاز لنگر انداز ہوا ہے تو گوروں کے وحشیوں کی ایسی بھیڑ تھی کہ پولیس افسر نے خوف زدہ ہو کر جہاز پر آکر مسٹر گاندھی کو یہ مشورہ دیا کہ آپ رات کی تاریکی میں جہاز سے اتریں کہ مبادا کوئی ہنگامہ مذموم ظہور پذیر ہو جائے مگر مسٹر گاندھی نے اپنے ایک دوست کی معیت میں جو انہیں لینے کے لیے جہاز پر آگئے تھے دن کی روشنی میں خشکی پر جانا پسند کیا۔ صاحب موصوف نے جونہی خشکی پر قدم اتارا ہے۔ درندگان افریقہ نے حملہ کر دیا اور اگر سپرنٹنڈنٹ پولیس کی بیوی کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو ممکن تھا کہ گوروں کی گردن اپنے گناہوں کے عذاب سے نجات پا جاتی۔ گاندھی بدقت تمام اپنے دوست کے مکان پر پہنچا دیئے گئے۔ مگر وہاں بھی آخر کار بدکرداروں نے چین نہیں لینے دیا۔ اور یہ رئیس الاحرار شب کی تاریکی

میں پولیس کی وردی پہن کر بہ مشکل اپنی جان لے کر بھاگا۔

جنوبی افریقہ میں گوری آبادی کا اثر جوں جوں بڑھتا گیا۔ وہ لگاتار اس کوشش میں مصروف رہے کہ ہندی جو وہاں جا کر آباد ہو گئے تھے ان کے حقوق کو پامال کرے اور ان آوارہ وطن مزدوروں کو باربرداری کے جانوروں سے بہتر کبھی نہ بننے دیا جائے۔ چونکہ سخت محنت کرنے والوں کے بغیر ایک وحشت زار ویرانہ متمدن آبادی میں تبدیل نہیں ہو سکتا تھا اس لیے ان کا وجود تو ناگزیر تھا مگر یہ ہرگز منظور نہ تھا کہ یہ پیروں کے نیچے کچلی جانے والی مخلوق کبھی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔ لہٰذا آئے دن کے جھگڑے کھڑے رہتے تھے۔ اور ہندوستانی گوروں کی مشق ستم بنے رہتے تھے آخر جام لبریز ہو گیا اور گورنمنٹ برطانیہ نے عاجز آکر منجملہ دیگر شکایات کے ہندیوں کے ساتھ بدسلوکی کے عذر پر اعلانِ جنگ کر دیا۔ اور ۱۸۹۹ء کا پُر آشوب زمانہ شروع ہو گیا۔

مسٹر گاندھی نے جو مدنیت کی ذمہ داریوں کو بھی حقوق سے کم اہم خیال نہیں کرتے تھے۔ آغازِ جنگ ہی میں ہندوستانیوں کی جانب سے ایک طبی مشن پیش کیا جو منظور کر لیا گیا۔ ہندوستان کے آدمی جو جنگ بلقان کے بعد سے یہ سمجھنے لگے ہیں کہ طبی مشن کیا بلا ہے اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسٹر موصوف کو ایک ہزار آدمیوں کی جماعت جمع کرنے میں کس قدر مصارف وغیرہ کا بار اٹھانا پڑا ہو گا۔ اس جماعت نے دورانِ جنگ نہایت قیمتی خدمات انجام دیں۔ اور صلہ میں اختتامِ جنگ پر مسٹر گاندھی کو ایک تمغہ جنگ عنایت ہوا۔

۱۹۰۶ء میں افریقہ میں اصل آبادی افریقہ کے خلاف فوج کشی کرنی پڑی۔ اس موقع پر بھی مسٹر گاندھی نے ہندی آبادی کی جانب سے ایک طبی مشن پیش کیا جس نے نہایت کارنمایاں کیے۔ اور آخر میں اس کے ہر ممبر نے ایک ایک تمغہ پایا۔

جنگ کے کچھ ہی دنوں بعد گورنمنٹ برطانیہ نے جنوبی افریقہ کی حکومت خود اختیاری عطا کر دی۔ چنانچہ کیپ نیٹال اور ٹرانسول کے چار صوبے جو باہم مل کر ایک متحد حکومت بنائے گئے تھے۔ خود مختار ہو گئے۔ اور اس دن سے ہندیوں پر آسمان ستم ٹوٹ پڑا۔ اس سے پیشتر جنوبی افریقہ کی حکومت کو گورنمنٹ ہند کا بھی کچھ تھوڑا بہت خوف تھا وہ بھی اب جاتا رہا۔ بعد میں گوروں نے ہندوستانیوں پر کھلے بندوں مظالم کرنے شروع کر دیئے۔ اس آخری مشن سے واپس آکر مسٹر گاندھی ابھی اپنے گھر پر راحت بھی نہیں لینے پائے تھے کہ حکومت ٹرانسوال نے "قانون آبادی اہلِ ہند" پیش کیا۔ مسٹر موصوف اس کی عجبیت کو فوراً پا گئے اور آپ نے اس کے خلاف خاموش مقابلہ کا علاج پیش کیا۔ اس کی ابتدا سے آج تک مسٹر گاندھی کی زندگی جبر و ظلم کے خلاف صرف ہوئی ہے بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آپ کی زندگی جنوبی افریقہ کے جبر و تعدی کی ایک مفصل تاریخ ہے۔ ۱۹۰۶ء میں گورنمنٹ نے قانون رجسٹریشن نافذ کیا جس کا منشا یہ تھا کہ ہر ہندی اپنے آپ کو درج رجسٹر کرائے۔ اور بجائے اپنا نام لکھنے کے خواہ خواندہ ہو یا ناخواندہ انگوٹھے کا نشان تحریر کرے کہ تحریر کا حق صرف اس ہستی کو حاصل ہے۔ جو کہ انسان ہے نہ کہ ہندی کو جو افریقہ تو افریقہ ہندوستان ہی میں غلامانہ زندگی بسر کرنے پر خوش ہے۔ ہندوستانیوں نے

اس قانون کو اپنے وطن عزیز کی توہین خیال کیا اور اسی ہی سال مسٹر گاندھی ولایت گئے کہ وہاں کے وزراء کو اس وحشیانہ سلوک سے آگاہ کریں۔ مگر اس غرض میں کامیابی نہ ہوئی اور آخرکار مسٹر گاندھی نے واپس آکر خاموش مقابلہ سے جبر و تشدد کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا جو آج تک برابر جاری ہے۔ اس خاموش مقابلہ کے سلسلہ میں صاحب موصوف کو معہ اپنے دیگر رفقاء کے ۱۹۰۸ء میں جیل جانا پڑا۔ اور اب اس کے بعد تیسری بار ہے کہ یہ سالار حریت اپنے بیوی بچوں، دوست و احباب کو خیرباد کہتے ہوئے جیل خانے کی تاریک زندگی بسر کر رہا ہے۔ اور یہ صرف اس لیے کہ اس کا دل دنیا میں جہاں ہر آدمی برابر کا بنایا گیا ہے۔ کسی آدمی کو غلام دیکھنا پسند نہیں کرتا۔

آپ کے بڑے صاحب زادے اس سے پیشتر وطن عزیز کی خدمت کی خاطر قید محن برداشت کر چکے ہیں۔ اور اس مرتبہ آپ اپنے چھوٹے صاحب زادہ کو بھی جن کی عمر صرف ۱۳ سال کی ہے لے گئے ہیں۔ تاکہ وطن پرستی کی شراب سے یہ معصومانہ کام و دہن بھی لذت یاب ہو جائے۔ حقیقت میں حریت پسندی کی آگ وہ ہے جو ایک مرتبہ سلگنے کے بعد کبھی بجھ نہیں سکتی۔ بلکہ باد صرصر کے جھونکے جتنی تیزی کے ساتھ چلتے ہیں اور بھڑکتے ہیں۔ کسی پست قوم میں اگر آزادی کی خواہش پائی جاتی ہے تو اسے مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ خواہش تو فلک عظمت پر پہنچا دے گی۔

اس وقت جنوبی افریقہ کے ہندوستانی جن قوانین کی مخالفت کا مقابلہ مقاومت مجہول سے کر رہے ہیں۔ ان کی سختی ناگفتہ بہ ہے۔ اور انہیں دنیا میں شاید جنوبی افریقہ کے سفید درندوں کے علاوہ وحشی سے وحشی قوم بھی کبھی ان لوگوں پر جاری کرنا جائز قرار نہ دیں گے۔ جنہوں نے پچاس برس کی جانکاہی کے بعد صحرا کو متعدد شہروں میں تبدیل کر دیا ہے۔ قوانین حسب ذیل ہیں۔

(۱) ہندوستانی کسی شہر کی آبادی کے اندر نہیں رہ سکتے۔

(۲) ان کی دوکانیں ۲ میل کے فاصلہ پر ہونی چاہئیں۔

(۳) یہ لوگ شہر کی کسی سڑک پر نہیں چل سکتے۔

(۴) سوائے تھرڈ کلاس کے یہ لوگ کسی درجہ میں سفر نہیں کر سکتے۔

(۵) کسی ہوٹل میں قیام نہیں کر سکتے۔

(۶) ہر ہندی مرد و عورت جس کی عمر ۱۳ برس سے تجاوز کر چکی ہے۔ ۳ پاؤنڈ یعنی ۴۵ روپیہ جزیہ دے

(۷) جتنے ہندوستانی افریقہ میں موجود ہیں خواہ مسلمان ہوں یا ہندو اگر ان کی شادیاں ہندوستان میں ہوئی ہیں تو چونکہ یہاں کا قانون تعدد ازدواج کو جائز قرار دیتا ہے۔ اس بنا پر وہ سب ناجائز ہیں۔ وہ تمام عورتیں حقوق زوجیت سے محروم اور ساری اولادیں ناجائز۔

موجودہ وقت میں جو جور و ظلم خاموش مقابلہ کو ختم کرنے میں جائز رکھا جا رہا ہے۔ وہ ہندوستان کا ہر باشندہ جانتا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔ یعنی تمام مقابلہ کرنے والوں کو مجرم قرار دیا گیا ہے۔ کانوں اور کارخانوں کو

جیلوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ اور اب وہ لوگ از روئے قانون مجبور ہیں کہ مشقت کریں اور اگر اب بھی انکار کریں تو تازیانہ کی سزا دی جائے۔ افریقہ میں ایک ہلچل پڑی ہے۔ اور وہاں کا ہر باشندہ ہندوستان سے جس کی عزت برقرار رکھنے کی خاطر وہ لڑ رہا ہے۔ مدد چاہتا ہے۔ دیکھنا ہے کہ ہندوستان کیا کرتا ہے۔

گذشتہ سال میں مسٹر گوکھلے جب افریقہ گئے ہیں۔ تو گورنمنٹ افریقہ کے اعلیٰ افسروں نے وعدے کیے تھے کہ مو پونڈ جزیہ معاف کر دیا جائے گا۔ اور قوانین کی دیگر سختیاں بھی دور کر دی جائیں گی۔ اسی بنا پر انگلستان کے وزیر ار نے مسٹر گوکھلے کی زیادہ آؤ بھگت کی کہ ان کی کوشش سے افریقہ کی رنگ دار و گوری آبادی میں سمجھوتہ ہو جائے۔ مگر آج دریدہ دہنی دیکھئے کہ یہی بے شرم لوگ صاف کہہ رہے ہیں۔ کہ ہم نے کوئی اس قسم کا وعدہ نہیں کیا۔
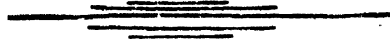
سن لیجئے خلوتوں میں انا الحق کا ادعا
سولی پہ چڑھ کے سنائے وہ اب نعرہ زن کہاں
فرصت کسے خوشامد شمر و یزید سے
اب ادعائے پیروی پنج تن کہاں
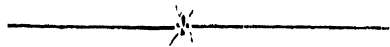
کابل کے سیاسی قیدی

نہ دلیل نہ اپیل نہ وکیل

سہ شنبہ ۱۰ جون ۱۹۱۳ء

"دربارِ امیر" کے حالات میں جو کتاب مسٹر فرینک مارٹن نے چند سال ہوئے چھپوائی تھی۔ اس میں انہوں نے سخت اور تکلیف دہ سزاؤں کا حال بیان کیا ہے۔ جو کابل کے قید خانوں میں ان لوگوں پر روا رکھے جاتے ہیں جن پر سیاسی وجوہات کی بنا پر شہنشاہ کا عتاب نازل ہوتا ہے۔ یا جن سے پبلک کاموں میں کسی بے ایمانی کا اظہار ہوتا ہے۔ افغانستان کے قوانین میں اس قسم کی کوئی رعایت مدنظر نہیں رکھی گئی ہے۔ کہ جب کبھی کسی شخص کو قید کر لیا جائے تو دریافت کرنے پر قانونی کارروائی کی وجوہات بھی بتا دی جائیں۔ چنانچہ جن قیدیوں کو زندان میں بھیج دیا گیا ہے۔ انہیں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ بلکہ وہ اس وقت تک قید میں پڑا سڑا کرتے ہیں جب تک کہ وہ اپنے مفروضہ جرائم کی قرار واقعی سزا بھگت نہیں لیتے۔ یا سخت جرائم کی حالت میں جلاد ان کی گردن نہیں اڑا دیتا۔ یہ امر شاذ و نادر ہی وقوع میں آتا ہے کہ سلطنت انگریزی ہی کی ہندوستانی رعایا کو کسی واقعی یا مفروضہ جرم میں نظر بند کیا جاتا ہے۔ کیونکہ خوف ہے کہ کہیں گورنمنٹ آف انڈیا اپنی رعایا کی حفاظت کے لئے جسے ہر طرح سے حق دخل اندازی کرنے کا حاصل ہے۔ سوال نہ کر بیٹھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابھی تک پنجابی ڈاکٹر کا واقعہ جس کے حالات لاہور کے اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ نے شائع کئے ہیں۔ گورنمنٹ کی توجہ سے محروم ہے۔ جیسا کہ ہم کو ان کے روزنامچہ سے معلوم ہوا ہے۔ مرحوم امیر کے صیغہ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ اگرچہ افغانیوں نے ان کے رائج کردہ طریقہ تعلیم سے موافقت نہ کی تھی اور اخلاقی و مذہبی وجوہات کی بنا پر تمام ملاں غیر زبانوں کے پڑھانے کے مخالف تھے ان کے جانشین نے جو انگریزی زبان کا کچھ علم رکھتے ہیں ایک تعلیمی سکیم مرتب کی جس میں کابل میں ایک مرکزی کالج قائم کرنے کا ذکر تھا۔ اور چھ سال قبل جب وہ ہندوستان میں آئے تھے تو علی گڑھ کالج اور مسلمان طلباء کے ہجوم نے ان پر خاص اثر ڈالا۔ اور انہوں نے ان کی عمدہ الفاظ میں تعریف کی۔ علی گڑھ کالج میں اس خود مختار بادشاہ نے کہا تھا کہ "مجھ سے کہا گیا ہے کہ بہت سے ہندوستانی مسلمانوں میں یورپین تعلیم کے خلاف سخت تعصب پایا جاتا ہے۔ جو صریح حماقت ہے۔ اور میں یہاں مغربی علوم کی تائید میں کھڑا ہوا ہوں بجائے اس کے کہ میں اسے ایک بدعت خیال کرتا ہوں میں نے کابل میں "حبیبیہ کالج" قائم کیا ہے۔ جہاں حتی الامکان یورپین اصول پر تعلیم دی جاتی ہے۔ ہز میجسٹی ممدوح کے ان اعلیٰ اور پاکیزہ خیالات کا اعادہ صرف اس لئے کرتے ہیں۔ کہ ان کا تعلق محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر کی قید سے ہے۔ جنہوں نے تعلیمی کام کی خاطر ڈاکٹری کو خدا حافظ کہا۔ اور اب غالباً اپنی تبدیلی پیشہ پر افسوس کرتے ہوں گے۔ ڈاکٹر عبد الغنی ہز میجسٹی امیر صاحب کے معالج بن گئے تھے۔ مگر افغانستان میں مغربی تعلیم و تمدن کے حامی اول ہونے کی حیثیت سے انہوں نے محسوس کیا کہ وہ اپنی ذاتی وجاہت کو معراج ترقی پر پہنچا سکتے ہیں حتی کہ وہ تعلیمی محکمہ کے افسر اعلیٰ بن گئے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ افغانیوں کو تعلیم کے فوائد سے پورے طور پر بہرہ ور کرنے کے لئے انہوں نے بہت سے مدارس قائم کئے۔ کیونکہ لازمی تعلیم کی ابتدا ابھی ہے۔ لیکن بجائے اس کے کہ ڈاکٹر صاحب بانی تعلیم کے معزز لقب سے ممتاز

ہونے کے علاوہ امیر صاحب کے تحفہ جات سے محروم ہونے ۔ ۔ گزشتہ چند سال سے ایسے الزاموں کی بنا پر کابل کی جیل میں پڑے سڑ رہے ہیں جن کی قانونی طور پر ابھی تحقیق ہونی بھی شروع نہیں ہوئی ۔

اگرچہ امیر عبدالرحمن نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کو تخت کا جانشین مقرر کیا تھا ۔ اور گورنمنٹ آف انڈیا کو بھی اپنے فیصلہ سے مطلع کر دیا تھا ۔ تاہم یقینی امر تھا کہ نئے بادشاہ کی تخت نشینی پر ملک میں خانہ جنگی ہو گی ۔ افغانیوں کی روایت کے مطابق ہر نئے بادشاہ کے لئے ضروری ہے کہ اگر وہ ان طاقت ور جرگوں کی اطاعت چاہتا ہے ۔ جو در اصل قومی قسمت کے فیصلے کرتے رہے ہیں ۔ تو اس کو چاہیئے کہ جنگ کر کے تخت حاصل کرے ۔ جب مرحوم امیر حالت نزع میں تھے تو اس وقت اگر فوج دوسرے بیٹے کی تائید کرتی جو بڑے کی نسبت زیادہ ہر دلعزیز ہونے کی وجہ سے حکومت کرنے کے زیادہ اہل سمجھے جاتے تھے ۔ تو یقینا خانہ جنگی شروع ہو جاتی ۔ مگر ایزادی تنخواہ کا لالچ دے کر فوج کو اپنی طرف ملا لیا گیا ۔ اور پہلا ہی موقع تھا ۔ کہ افغانستان میں تخت نشینی کے مراسم بغیر خونریزی اور غارت گری کے عمل میں آئے ۔ مرحوم امیر کی ایک اور نوجوان بیٹی بھی تخت کی دعوے دار تھی ۔ جو اپنی والدہ بی بی حلیمہ کے واسطہ سے شاہی خاندان کی اولاد ہونے کا دعوی کرتی تھی ۔ مگر وہ سازشیں کرتے ہوئے حال میں انتقال کر گئی ۔ عبد اللہ خان اور ان کے با اثر رشتہ دار سرکاری قیدی بنا لئے گئے ۔ لیکن اس خاتون نے حبیب کے ولی العہد بن میں بہت سے ہمدرد حامی موجود تھے ۔ ہی سلطنت کے خلاف بہت سی سازشیں کیں جو خوش قسمتی سے خوفناک صورت اختیار کرنے سے بہت عرصہ پیشتر ہی دبا دی گئیں ۔ اس کی آخری اور سب سے زبردست سازش دو سال ہوئے ظاہر ہو گئی تھی ۔ جس کی پوری تفصیلات ابھی تک پبلک کے روبرو نہیں آئی ہیں ۔ اگر پرائیویٹ نامہ و پیام کو ذریعے گورنمنٹ آف انڈیا کو ان کا علم ہے ۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سازش میں امیر صاحب قتل ہونے سے بال بال بچ گئے ۔ اور یہ کہ کچھ سازشی کرنے والے قتل کر دئے گئے ۔ اور باقیوں کو کابل کے قید خانہ میں ڈال دیا گیا ۔ موخر الذکر بدقسمتوں میں پنجاب کا ڈاکٹر اور خانہ تعلیم کے سابق ڈائرکٹر تھے ۔ جو اب ہمارے لاہوری ہمعصر کے ذریعے اپنے ہم ملکیوں سے اپیل کر رہے ہیں ۔ ڈاکٹر غنی اپنی بے گناہی ثابت کرتے ہیں ۔ اور کہتے ہیں کہ میں چند درباری افسروں کی ناراضگی کا شکار ہوا ہوں ۔ جو میری تعلیمی تجاویز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے ۔ اور میرے مقاصد کو شکستہ کرنے کے لئے انہوں نے سب سے زیادہ آسان ذریعہ یہ سمجھا کہ مجھے متذکرہ بالا سازش کے الزام میں متہم کر دیا جائے ۔ چنانچہ انہوں نے اس سازش کے ساتھ مجھے بھی ملا دیا ۔ اگر ان کے بیانات درست ہوں ۔ اور چونکہ ان کی کوئی تردید نہیں ہوئی ہے اس لئے ان کو درست تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی ۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے ۔ اور اگر امیر صاحب ہندوستان سے ان کا جانشین چاہتے ہیں تو ہمیں خوف ہے کہ بہت کم لوگ اس عہدہ پر وہاں جانے کی خواہش کریں گے ۔

(ماخوذ از ایڈووکیٹ آف انڈیا)

تین سال کابل میں

(ایک یورپین کے قلم سے)

پنجشنبہ ۵ جون ۱۹۱۳ء

ہمعصر سٹیٹسمین میں ایک یورپین نے کابل میں اپنے سہ سالہ قیام کے حالات قلمبند کئے ہیں۔ جن کا اقتباس درج ذیل ہے:۔

کچھ عرصہ ہوا کابل میں یورپینوں کی تعداد بارہ تھی۔ لیکن اب امیر کابل کے ٹرامویز اور کارخانوں کے نگران صرف چھ رہ گئی ہے۔

انگریزوں کے مکانات پر رات کو پہرہ رہتا ہے۔ یہ بغیر محافظ دستے کے باہر نہیں نکل سکتے۔

موجودہ امیر سے ہر روز مجھے ملنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ میں کہہ سکتا ہوں ملک میں ان سے بغیر کوئی شخص موجود نہیں ہے۔ لیکن یہ کوئی کام کرنے سے متنفر معلوم ہوتے ہیں۔ وہ ہفتوں سلطنت کے کاموں کی طرف توجہ نہیں کرتے۔ اور خود موٹر کی سواری۔ فوٹو گرافی اور کھانا پکانے میں مصروف رہتے ہیں۔ کھانا پکانے کے اس قدر دلدادہ ہیں جس طرح شہنشاہ لوئی شانز دہم اپنی زلفیں درست کرنے کا تھا۔

امیر حبیب اللہ خاں بہت امور میں مطلق العنان اور خود پسند واقع ہوئے ہیں۔ بعض اوقات وہ صبح کے ۶ بجے اپنی موٹر کار تیار کروا لیتے ہیں۔ اور تقریباً چھ سات میل جا کر چائے کا ایک پیالہ پی کر واپس آ جاتے ہیں۔ جب کبھی ان کی طبیعت چاہتی ہے وہ موقع بے موقع فوج کو قواعد کرا لیتے ہیں۔ اس کی فوجیں ادنیٰ درجہ کی ہیں۔

اس تمام بے پرواہی اور مطلق العنانی کا نتیجہ یہ ہے کہ تمام ملک سرکش ہوتا جاتا ہے مختلف صوبوں کے گورنر بلا روک ٹوک مطلق العنان ہوتے جاتے ہیں۔ اور یہی سبب ہے جس نے گذشتہ سال منگل قوم کو فساد پر آمادہ کیا تھا۔ وہ فساد ابھی تک پورے طور پر فرو نہیں ہوا ہے۔ اور عام بے اطمینانی اور بے چینی کی وجہ سے سلطنت کے دوسرے حصوں میں بھی پریشانی کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔

ہز میجسٹی کے لئے یہ امر خوش قسمتی کا باعث ہے کہ ان کا کوئی بھائی بھی اس حالت میں نہیں ہے کہ ان کے خلاف کوئی بغاوت کر سکے۔ امیر صاحب کے مصاحبوں میں سے بھی کوئی شخص ایسا طاقتور نہیں ہے جو بغاوت کا سرغنہ بن سکتا ہو۔ اور اگر حبیب اللہ زیادہ قوت اور عقلمندی کو کام میں لانا شروع کر دیں۔ جیسا کہ وہ ایسا کرنے کی پوری قابلیت رکھتے ہیں۔ تو بغیر کسی دقت کے تخت پر ہمیشہ قابض رہ سکتے ہیں۔ کیونکہ افغانی ایک طاقتور حاکم کو محبوب

رکھتے ہیں۔ اور ان کے والد مرحوم کی قسم کھا کر یاد کرتے ہیں۔ لیکن اگر ان کا رویہ ایسا ہی رہا جیسا کہ اب ہے تو مجھے
اپنے سامنے ایک زبردست انقلاب نظر آتا ہے۔

ہمارا بنگلہ دریائے کابل کے ایک کنارے تقریباً ۷۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع تھا۔ موسم گرما میں درت
سہ پہر دن گرمی پڑتی ہے۔ لیکن جاڑے میں نہایت سخت سردی پڑتی ہے۔ لیڈی نے جو حرم کا حال بیان کیا ہے
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی خواتین ابھی زمانہ موجودہ کی عورت کی ابتدائی منازل طے کر رہی ہیں لیکن وہ
یورپین لباس کی بے حد مشتاق نظر آتی ہیں۔ کابل کے کنارے کنارے درخت ہیں۔ اور وہاں موٹر چلانے کے
لئے بہت عمدہ سڑکیں بھی ہیں۔ مگر شہر خود جھونپڑیوں کا ایک مجموعہ نظر آتا ہے۔ اردگرد کی پہاڑیاں خشک اور
بنجر ہیں۔

اگر کابل خوبصورت نظاروں سے خالی ہے تو اپنی تاریخی روایات کے لحاظ سے وہ بالکل پر نظر آتا
ہے "کوپ ہین" کی طرح اس نے بھی دو ہزار برس پیشتر فاتح سکندر اعظم کا استقبال کیا اور ہمیں معلوم ہوا
ہے کہ اس کے قرب و جوار میں اب تک یونانی سکے نکلتے رہتے ہیں۔ کاستان میں سکندر اور اس کے مقدونی
ہمراہیوں کی یادگاریں اچھی طرح سے بنائی گئی ہیں۔ کیونکہ تمام کا تمام علاقہ یونانی فن تعمیرات کا نمونہ ہے۔ غالباً یہ واقع
ہوگا کہ سکندر اپنے چند یونانی ہمراہیوں کو ہر مفتوح ملک میں آباد رکھتا تھا۔ اور پھر وہیں کی مقامی آبادی میں
اپنی فوج کے لئے رنگروٹ بھرتی کرتا تھا۔ چنانچہ جب وہ پنجاب پہنچا ہے تو اس کی تمام کی تمام فوج ایشیائی تھی۔

دوسری تاریخی چیز شہنشاہ بابر کا مقبرہ ہے جو دراصل مغل سلطنت کے بانی تھے۔ اور جس کا فوٹو
اب پہلی دفعہ چھپ گیا ہے۔ یہ مقبرہ کابل کے پہاڑوں میں واقع ہے اور ہمایوں کے مقبرہ واقع دہلی سے
ہر امر میں مختلف ہے۔

ہمدرد اور کامریڈ کے خاکے اور کارٹون

حاجی بغلول

کبیرالدین احمد

بنگال کے ذہین و ظریف ممبر مرکزی اسمبلی

حاجی وجیہ الدین

ہمارے مولانا محمد علی نے لکھی تھی۔
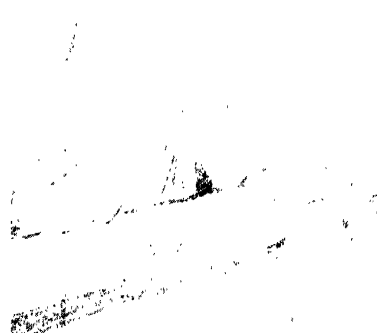
حاجی صاحب ھجے کر کے اپنی تقریر پڑھ رہے تھے

پڑھ نہ سکے، مولانا محمد علی نے اپنی لکھی ہوئی

آرٹسٹ کا تعارف

عبدالسمیع خاں " سمیع آرٹسٹ " کے نام سے مشہور ہیں، اصلی وطن امروہہ، پیدائش ہوشنگ آباد ، سی پی کی ہے - جے جے اسکول آف آرٹ میں مصوری کا سات سالہ کورس پورا کر کے ڈپلوما لیا ۔ متعدد میڈل اور انعامات حاصل کئے ۔ مسٹر محمد مارماڈیوک پکتھال ایڈیٹر بمبئی کرانیکل کی سفارش پر ہمدرد اور کامریڈ کے کارٹونسٹ مقرر ہوئے ۔ ہندوستان ٹائمز ، نیشنل کال ، ہندو ، ریاست ، تیج ، ڈان ، وغیرہ میں بھی ان کے کارٹون اور اسکیچ شایع ہوتے رہے ۔ مولانا محمد علی نے ایک مرتبہ پنڈت مالوی سے سمیع صاحب کا تعارف کراتے ہوئے کہا تھا ۔

" یہ سی پی کا موتی ہے "

سمیع صاحب دھلی میں ۲۴ سال رہے ۔ گزشتہ ۱۵ سال سے کراچی میں قیام ہے ۔

یہ پانچوں کارٹون سمیع صاحب نے اپنے البم سے عنایت فرمائے ہیں جس کا شکریہ واجب ہے ۔

یونان و سرویا

ڈاکٹر پیٹیسن نے انگلستان کے کسی اخبار کو ایک طویل مراسلہ بھیجا ہے جس کا اقتباس حسب ذیل ہے۔

مبادیٔ صلح پر دستخط ہو جانے سے یہ امر ظاہر ہو گیا ہے۔ کہ اتحادیوں کے تنازعات اور زیادہ نمایاں ہو گئے ہیں۔ باہمی سمجھوتہ کرنے اور آنے والی ہولناک مصیبت کو رفع کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ متنازعہ فیہ کے دعووں کا اچھی طرح مطالعہ کیا جائے۔

یورپین ٹرکی کا بہترین علاقہ اتحادیوں نے فتح کیا ہے۔ اس کا پورا رقبہ ۱۳۰۰۰۰ مربع کیلومیٹر ہے جس میں تقریباً ۴۰ لاکھ نفوس کی آبادی ہے جو حسب ذیل طریق سے منقسم ہے :-

مسلمان = ۱۷۷۵۰۰۰ لاکھ - یونانی = ۱۱۰۰۰۰۰ لاکھ - بلغاری = ۸۰۰۰۰۰ لاکھ - سروے = ۲۲۵۰۰۰ یہودی = ۱۰۰۰۰۰ لاکھ - آرمنی اور ولاشی - ۲۰۰۰۰۰ ہزار - ان میں سے بلغاریہ = ۹۰۰۰۰ ۲ نفوس۔ اور ۲۵۰۰۰ مربع کیلومیٹر کا مطالبہ کرتا ہے جس میں کمانووا اور اوپر دلوک کے علاقے بھی شامل ہیں۔ اور سرویا اور بلغاریہ کے مابین ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے۔ اور ان دونوں کی آبادی ۲۳۰۰۰۰ لاکھ اور رقبہ ۵۰۰۰ ہزار مربع کیلومیٹر ہے۔ بلغاریہ نے جتنی آبادی کا مطالبہ کیا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

مسلمان = ۱۰۲۰۰۰۰ لاکھ = بلغاری = ۶۳۵۰۰۰ لاکھ - یونانی = ۵۸۰۰۰۰ لاکھ - یہودی = ۹۴۰۰۰ ہزار۔ آرمینی اور ولاشی ۱۴۰۰۰ ہزار سروے ۱۲۰۰۰ ہزار۔ جن علاقوں کو یونان نے فتح کیا ہے۔ لیکن آسٹریا اور اٹلی ان کا الحاق البانیہ کے ساتھ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تفصیل بہ لحاظ آبادی و رقبہ حسب ذیل ہے :-

رقبہ = ۱۱۸۰۰ مربع کیلومیٹر - آبادی = ۳۹۰۰۰۰ لاکھ اس میں سے ۲۵۰۰۰۰ لاکھ یونانی اور ۱۴۰۰۰۰ مسلمان اور البانی ہیں۔

جس آبادی کا بلغاریہ نے مطالبہ کیا ہے۔ اس میں بلغاری عنصر ۲۰ فیصدی سے زیادہ نہیں ہے۔ حالانکہ یونانی عنصر فقط ۲۵ فیصدی ہے۔ ان شمار و اعداد سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تنازعہ کس خاص امر کے متعلق ہے۔

یونانی تھریس اور مقدونیہ کے ان حصص میں اپنے ہزارہا بچوں کا نقصان اٹھایا ہے جن پر فی الحال بلغاریہ کا قبضہ ہے

مزید برآں قسطنطنیہ اور یورپین ترکی میں ۵۰ لاکھ یونانی ہیں جن کا تعلق ہمیشہ کے لئے قطع ہو چکا ہے۔ یہ امر بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ کہ مشرقی رومیلیا میں ڈیڑھ لاکھ یونانی ہیں۔

یقیناً بلغاریہ باہمی صلح کی ضرورت کا بخوبی اندازہ کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ فعل نہ صرف اتحادیوں میں دل جمعی پیدا کرے گا۔ بلکہ بلقان میں ہمیشہ کی یگانگت۔ اتفاق اور صلح کو قائم کر دے گا۔

سروبا کی موجودہ پالیسی

سروبا کے سابق وزیر مسٹر چیڈ ومیا ٹووچ لندن سے لکھتے ہیں :۔

میں انگلستان کے اخبار میں پبلک کے روبرو چند باتیں لکھنی ضروری سمجھتا ہوں۔ کیونکہ ان سے سروبا کی موجودہ پالیسی کا پورے طور پر اظہار کرنا مقصود ہے۔

بلغاریہ کے ساتھ پوری ایمانداری برتتے ہوئے میں فی الفور مان لیتا ہوں۔ کہ سرسری نظر میں ان کی دلیل بہت قوی معلوم ہوتی ہے۔ وہ ہم سے کہتے ہیں کہ" ہم نے سروبا کی تقسیم کے وقت ویلس، پربایپ، مناستر اور وچر بڑا بلغاریوں کے حصہ میں آئے گا۔ اس لئے ہم اس دفعہ کو عملی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں"۔ بلغاریوں کے بیان کی سچائی اور راستی کو صحیح تسلیم کرنے میں مجھے کچھ شک نہیں ہے۔ اور میں بلا چون وچرا مان لوں گا۔ کہ شرائط نامہ میں یہ شرط موجود ہے۔ کہ مقدونیہ کا حصہ بخرہ کرتے وقت چاروں شہر اور ان کا علاقہ بلغاریہ کو ملنا چاہیئے۔ بد قسمتی سے یہ خفیہ عہد نامہ شائع نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے متعلق صرف چند مشہور باتیں پبلک میں آئی ہیں۔ جن میں سے ایک یہ ہے۔ کہ عہد نامہ کی پہلی شرط یہ ہے۔ کہ سروے اور بلغاری متحدہ طور پر مقدونیہ کو آزادی دلوائیں اور سروبا کے ملک کو وسعت دے کر ایڈریا ٹوپل تک پہنچا دیں۔ اس وقت تھریس اور ایڈریا نوپل فتح کرنے کی تجویز نہیں کی گئی تھی لیکن چونکہ مقدونیہ اور البانیہ ہی ایسے علاقے تھے جو اتحادیوں یعنی سرویوں اور بلغاریوں میں منقسم ہونے والے تھے۔ (کیونکہ یونانی ابھی اتحاد میں شریک نہیں ہوا تھا) اور چونکہ سروبا کو شمالی البانیہ اور بحیرہ ایڈریاٹک کا کچھ حصہ ملنا قرار پایا تھا۔ اس لئے سروبا نے بلغاریہ کو مغربی مقدونیہ اور متذکرہ بالا مشہور و معروف شہر دینے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

لیکن مابعد کے واقعات نے اصلی عہد نامہ کی شرائط کو بالکل تبدیل کر دیا۔ دو اتحادیوں کی بجائے چار اتحادی ہو گئے۔ مقدونیہ اور تھریس ہی تک جنگ محدود نہ رہی بلکہ ان کے علاوہ اور علاقے بھی شامل کر لئے گئے۔ سروبا کو شمالی البانیہ اور بحیرہ ایڈریاٹک کا کچھ حصہ ملنے کی بجائے اس نے دول عظمٰی کے کہنے سننے سے ایڈریاٹک اور البانیہ میں اپنے تمام حقوق چھوڑنے منظور کر لیے۔ مقدونیہ کی بجائے ایڈریا نوپل اور تھریس کا علاقہ بھی اتحادیوں میں تقسیم ہونے کے لئے فتح کیا گیا۔ اور ایک لاکھ بلغاریوں کی شراکت میں مقدونیہ کو فتح کرنے کے علاوہ سروے فوج نے تن تنہا مغربی مقدونیہ کو ترکوں سے آزاد کرا یا۔

مذہب عیسوی اور خزانہ ہند

یکشنبہ ۱۰ اگست سنہ ۱۹۱۳ء

رپورٹ مردم شماری بابت ۱۹۱۱ء پایا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ابن مسیح کے پیرووں کی تعداد 3877000 ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

رومن کیتھولک	1904,00
چرچ آف انگلینڈ	492300
پریسبٹیرین	181000
پراٹسٹنٹ	961400
غیر کیتھولک (متفرق)	338300
کل تعداد	3877000

سنہ 1909-10ء میں جو گراں مایہ رقم سرکاری خزانہ سے ان مختلف فرقہ ہائے کلیسائی عہدہ داروں کو بعد مشاعرہ دئے گئے۔ 1837720 روپیہ تک پہنچ گئی ہے۔ جس میں سے چرچ آف انگلینڈ کو مبلغ 1073569 اور رومن کیتھولک کو چرچ کو مبلغ 137431 روپیہ ملے، بقول "کیتھلک ہیرلڈ آف انڈیا" جس سے یہ امور اخذ کئے گئے ہیں، یہ رقوم فقط اخراجات کلیسائے ملکی کے ہیں، اور اخراجات کلیسائے فوجی ان میں شامل نہیں صرف لارڈ بشپ آف کلکتہ اور ان کے عملہ کے مصارف اس قدر ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے اس بارہ میں ذیل کا پیراگراف جو جریدہ مذکور سے اقتباس کیا جاتا ہے۔ غور سے پڑھے جانے کے قابل ہے:۔

پریذیڈنسی۔ لاڈ بشپ آف کلکتہ۔

مبلغ 45980 روپیہ (مشاہرہ)، مبلغ 4500 روپیہ (سفر خرچ)، مبلغ 450 روپیہ (مصارف ڈاک و تار)، مبلغ ۱۰۰ روپیہ (متفرق)، میزان کل مبلغ 51030 روپیہ عملہ (۱) مہتمم کلیسائے خانگی لارڈ بشپ موصوف مبلغ 6000 روپیہ (۲) نائب عہدہ دار کلیسائے خانگی۔ مبلغ 2000 روپیہ
(۳) سیکرٹری و رجسٹرار۔ مبلغ 3500 روپیہ۔

(۴) کرایہ مکان و الونس دفتر سیکرٹری مذکور مبلغ 1630 روپیہ

(۵) کلارک مبلغ 3360 روپیہ

(۶) ملازمین ۔ مبلغ 2640 روپیہ

(۷) الونس معاوضہ تبادلہ ۔ مبلغ 380 روپیہ

میزان	مبلغ	21590 روپیہ
کل میزان	مبلغ	72620 روپیہ ہیں ۔

سال زیر بحث میں الونس کرائی خانہ شمار میں نہیں لایا گیا ۔ اوپر کے نقشہ سے واضح ہوتا ہے سالانہ اخراجات جن کا بوجھ خزانۂ ہند پر پڑتا ہے ، مبلغ 73620 روپیہ ہیں ، دوسرے معنوں میں لارڈ بشپ موصوف کی تثلیث پرست ذاتِ واحد پر خزانۂ ہند کو اس سے دو چند روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے جتنا کہ وہ رومن کیتھولک چرچ کے کل ادنیٰ و اعلیٰ عہدہ داروں کے اخراجات پر خرچ کرتا ہے ۔ اس موقعہ پر یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان تمام رقوم میں فوجی کلیسا کے عہدہ داروں کی رقوم مشاہرہ وغیرہ شامل نہیں ۔

اب قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قدر رقوم خطیرہ مذہب عیسوی کی حمایت اور اشاعت میں کیوں صرف کی جاتی ہیں ؟ بالخصوص درآں حالیکہ اعلانِ ملکہ معظمہ آنجہانی نے ۱۸۵۸ء میں صریح الفاظ میں اس بات کا رعایا کو یقین اور اطمینان دلایا جا چکا ہے کہ کسی خاص مذہب کی رعایت و حمایت نہیں کی جائے گی ۔ کیا اوپر کے حالات سے ہم یہ نتیجہ مستنبط کرنے کے مجاز نہیں کہ دن دہاڑے عملی طور پر اعلانِ مذکور کی خلاف ورزی کی جا رہی ہے ؟ اشاعتِ تعلیم اور حفظانِ صحت کی روز افزوں ضروریات کے باعث جن کا احساس اب حاکم و محکوم دونوں کو ہو رہا ہے ، خزانہ کو نئی مشکلات کا مقابلہ درپیش ہے ، نئے نئے ٹیکس لگائے جا رہے ہیں ہر بندوبست پر اراضی کے لگان میں معتدبہ بیشی کی جا رہی ہے ۔ ۱۹۰۷ء میں پنجاب میں چناب پر اور ضلع راولپنڈی میں ٹیکس اراضی کی بیشی پر جو ادھم مچا اور جو جو فسادات معرض ظہور میں آئے ، ناظرین سے پوشیدہ نہیں ، اب پھر نہر چناب پر نئی تشخیص کی تجویز ہے ، ہر جگہ میونسپل اور پراونشل ٹیکس بڑھائے جا رہے ہیں ، مگر ضروریات ملکی پوری نہیں ہوتیں حتیٰ کہ ہز ایکسیلنسی وائسرائے ہند کو حال میں ہی ایک نہایت گراں قدر رقم بذریعہ قرضہ حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے ،

ایک طرف تو یہ کیفیت ہے ، دوسری طرف جب ہم دیکھتے ہیں تو ایک سال میں گورنمنٹ مبلغ ۱۸۲۷۷۲۰ روپیہ مختلف فرقہ ہائے کلیسا کو بطور مشاہرہ عنایت کرتی ہے ۔ خزانہ کا روپیہ ملک کی جملہ اقوام کی جیب سے ، خواہ وہ کسی مذہب و ملت پر ہوں ، نکلتا ہے ۔ گورنمنٹ تو محض اس روپیہ کی امین ہوتی

ہے، اس کا فرض ہے کہ اس روپیہ کو بوجہ احسن رعایا کی تعلیمی اور تمدنی ضروریات پر صرف کرے، اگر وہ اس امر کی ضرورت سمجھتی ہے کہ آمدنی ملک کا کوئی جزو مذہبی ضروریات پر بھی صرف کیا جائے۔، تو تقاضائے انصاف تو یہ ہے کہ اسے ہر مذہب وملت کی حمایت میں خرچ کرے، نہ یہ کہ منجملہ دیگر مذاہب کے ملک کے دو بڑے بڑے مذہب ہندو دھرم اور اسلام تو اس سرکاری فیضان سے محروم رہیں اور اس کا سارا فائدہ عیسائی مذہب کو پہنچے، ٹیکس ادا کرنے والے اصل ملک ایسی یک طرفہ کارروائی کو کس طرح نظر استحسان سے دیکھ سکتے ہیں؟ ہماری رائے میں یہ معاملہ ایسا نہیں کہ اس کے انکشاف پر مذہبی سبھائیں اور انجمنیں خاموش بیٹھی رہیں اور اُف تک نہ کریں مگر سب سے موزوں طریق عمل تو یہ ہوگا کہ کوئی من چلا محب وطن امپیریل کونسل میں اس معاملہ کی سلسلہ جنبانی کرے، اس پر باقاعدہ سوال اٹھائے اور تاوقتیکہ معاملہ خاطرخواہ طریق سے طے نہ ہو جائے۔ اپنی مساعی کو دھیما نہ پڑنے دے ؂

افسانہ

داروئے تلخ

(منشی پریم چند کے قلم سے)

(پنجشنبہ ۱۷۔ جولائی ۱۹۱۳ء)

یونیورسٹی کے امتحانات ختم ہو گئے تھے۔ اور کوئینس کالج کا بورڈنگ ہاؤس بالکل سنسان نظر آتا تھا۔ صرف دو متفکر صورتیں ایک کمرہ میں بیٹھی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ ان میں بہت گاڑھی دوستی تھی۔ چار سال کی رفاقت نے دوستی کی جڑ مضبوط کر دی تھی۔ آج امتحانات کو ختم ہوئے پورا ایک ہفتہ گذر گیا ہے۔ مگر جدائی کا خوف انہیں جدا نہیں ہونے دیتا۔ کئی بار ان کے اسباب باندھے گئے۔ ریل کا وقت دیکھا گیا۔ کئی بار پھاٹک تک کرایہ کی گاڑی بھی بلائی گئی۔ مگر چلنے کا وقت آیا تو دونوں دوست باہم گلے لپٹ گئے۔ اور روانگی کا ارادہ فسخ ہو گیا۔ رات کو یہ صلاح کر کے سوتے کہ اب صبح کو ضرور چلیں گے۔ یہ جدائی کی مصیبت تو ایک دن جھیلنی ہی ہے آخر کب تک ٹالیں گے۔ مگر کل آتے ہی ان کے دلوں کی وہی کیفیت ہو جاتی تھی۔ جو موت کو بلانے والے لکڑہارے کی ہوئی تھی۔ آخر جب خوش نصیب لکشمی دت کے والد ڈاکٹر ہری دت نے جھلا کر لکھا تمہاری اس تاخیر سے مجھے اندیشہ ہوتا ہے۔ کہ تم نے وہاں اپنے پیروں میں کوئی نئی زنجیر ڈال لی ہے۔ تو گوبند رام کو اپنا دل منضبط کرنا پڑا۔ گوبند رام کے گھر سے بھی اس مضمون کا خط آیا۔ باپ تو کب کے رخصت ہو چکے تھے۔ بیوی نے لکھا۔ پیارے! چاہے آؤ مت، مگر مجھے یہ اطمینان دلا دو کہ سوکن کا جلاپا تو نہ سہنا پڑے گا۔" اب بنارس میں رکنا غیر ممکن تھا۔ ۳۰ اپریل کو امتحان ختم ہوا تھا۔ ۱۵ مئی کو ان کی روانگی کی ساعت آئی دونوں کے چہرے افسردہ تھے۔ اور گو آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ مگر کنارہ دریائے خشک بالو کی طرح انہیں صرف چھیڑنے کی دیر تھی۔ سطح کے نیچے پانی کا دریا چھپا ہوا تھا۔

لکشمی دت تو اپنے مکان پر پہنچ کر اپنے والد کے ساتھ نینی تال گیا۔ ڈاکٹر ہری دت بہت بارسوخ آدمی تھے۔ بیٹے کو سیٹلمنٹ کے محکمہ میں ایک اچھی جگہ دلا دی اور اساڑھ کے مہینے میں جب کہ آسمان بادلوں سے سیاہ اور زمین پانی سے سفید ہو رہی تھی۔ اسے ترائی میں جانا پڑا۔ آبادی سے سینکڑوں میل دور۔ جہاں مشکل سے چار مرتبہ ڈاک پہنچ سکتی تھی تنخواہ معقول اور اختیارات وسیع تھے۔ کچھ دنوں تک تو وہ بہت گھبرایا رہا۔ گوبند رام کی صحبتوں کو یاد کر کے کئی بار رویا۔ نہ کوئی سوسائٹی، نہ کوئی تفریح۔ تمام دن ایک جنگلی مقام میں مقید رہنا پڑتا۔ مگر بالآخر کارگذار بننے کی خواہش اور ترقی کی امید، اور دنیا کی ترغیبات دوستی اور موانست کی دلفگار جذبات پر غالب آ گئی۔ دوستوں کی یاد اور رفیقوں کی دل جوئیاں فراموش ہو گئیں۔ دل میں لذت درد کا ذوق باقی نہ رہا۔ دنیا نے اپنے عام خراج کی قسط وصول کر لی۔

گوبند رام کی زندگی کا راستہ ایسا ہموار نہ تھا۔ ایسا کوئی صیغہ نہ تھا جہاں اس نے ملازمت کے لئے دست سوال نہ پھیلایا ہو۔ مہینوں کا یہی کام تھا کہ صبح کو حکام کے بنگلوں پر حاضری دیتا۔ دن بھر مختلف دفتروں کے چکر لگاتا اور شام کو مایوس و مغموم منہ لپیٹ کر پڑ رہتا۔ نہ کوئی وسیلہ تھا، نہ کوئی سفارش۔ کالج کی اعلیٰ تعلیم نے مزاج میں خودداری کا احساس پیدا کر دیا تھا جو اس کی موجودہ حیثیت سے بھی اونچا تھا۔ اس لئے جب سے رد کیے اور دلشکن الفاظ میں انکاری جواب ملتے یا اپنے ضمیر کا خون کر کے دوسروں کی تعریف میں رطب اللسان ہونا پڑتا، تو اس کی روح کو بہت صدمہ ہوتا۔ کبھی کبھی اسے لکشمی دت پر رشک آتا۔ میں اس سے کسی بات میں کم نہ تھا۔ میری مدد سے اس نے ڈگری پائی۔ مگر وہ تین سو روپیہ ماہوار کا افسر ہے اور میں تیس روپیہ کی غلامی کے لئے ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہوں۔ رسوخ اور حکام کے مقابلہ میں لیاقت کی یہ قدر ہے۔ ایک بار سخت مایوسی کے عالم میں اس نے للتا سے انہیں الفاظ میں اپنی تقدیر کا شکوہ کیا۔ مگر للتا نے اس کی طرف کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھا۔ کہ گوبند رام پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ مارے ندامت کے سر نہ اٹھا سکا۔

آخر تین مہینہ کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک مدرسے میں اسے پچاس روپیہ کی جگہ مل گئی۔

(۲)

گوبند رام نے یہ خدمت خوشی سے منظور کی۔ پھولا نہ سمایا۔ گویا کوئی دفینہ ہاتھ آ گیا۔ تقدیر کی ستم ظریفیوں سے نجات ہوئی مگر بہت تھوڑے دنوں کے لئے۔ کھڑے ہونے کی جگہ پاتے ہی بیٹھنے کی فکر ہوئی۔ تمناؤں نے پاؤں پھیلائے۔ نوجوان آدمی تھا۔ دل میں امنگ موجود تھی۔ قانون کا امتحان دینے کا ارادہ مصمم ہو گیا۔ مگر قلیل تنخواہ! اس میں قانونی فیس اور کتابوں کا خرچ اٹھانا گرانی کا مصارف کے لئے اتنی بچت نہ ہوتی کہ اسے دال کی الجھنوں سے گلا چھوٹے۔ یہ قانون کا جوش یہاں تک بڑھا۔ کہ کبھی کبھی اس سے فرائض منصبی میں ہرج واقع ہوتا۔ ایک بار ہیڈ ماسٹر صاحب برہم بھی ہوئے مگر گوبند رام وکالت کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اس نے ماسٹر کی کچھ پرواہ نہ کی۔ بلکہ ان کے کمرے سے مونچھیں گھماتا ہوا نکلا۔ اور باہر آ کر دوسرے ماسٹروں سے ڈینگ مارنے لگا۔ "جی ان سے وہ دبے جنہیں ہمیشہ غلامی کرنی ہو، یہاں تو چند دنوں کے اور مہمان ہیں۔ پھر تو اسی مدرسے میں آپ لوگوں کو چار گھنٹے کا نوکر ہوں۔ کچھ کام کا ٹھیکہ نہیں لیا ہے۔ ترجمہ کی کاپیاں گھر پر نہیں لے جا سکتا۔ مدرسہ کا کام مدرسہ میں ہوگا۔ خواہ وہ کسی کو برا لگے۔ یا بھلا جو خوشی میں نو کاپیاں دیکھتے ہی دم کا ہوا۔" ماسٹروں نے بڑھاوا دیا۔ "شیر ہے۔ شیر۔ اسی کا نام جوان مردی ہے۔" مگر کھڑکیوں سے دیکھا۔ کہ ہیڈ ماسٹر صاحب آ رہے ہیں۔ تو میدان صاف ہو گیا۔

تین سال گوبند رام نے یوں ہی کاٹے۔ مگر ان تین دنوں میں اسے سب سے بڑا جو تجربہ ہوا۔ وہ یہ تھا۔ کہ دلدستیں نہ مایا ملتی ہے۔ نہ رام۔ وہ یکسوئی، وہ انہماک، وہ لاگ جو کامیابی کا لازمہ فقرہ ہے۔ کسی نہ کسی وجہ سے مجھ میں اب لقا نہ درت موجود تھیں آئے دن ایسی فکریں پیدا ہوتی رہتی تھیں جو اطمینان قلب کے منافی ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ایسی کتنی ہی زندہ مثالیں موجود تھیں۔ جنہوں نے سلسلہ تدریس کو وکالت کا زینہ بنایا تھا۔ یہ کوئی انہونی بات نہ تھی۔ جوش میں آ کر وہ دو چار دن غیر معمولی محنت سے کام کرتا۔ مگر یہ جوش کمزور ہو جاتا۔ حوصلہ بلند، مضبوط ارادے کے بغیر بڑھاپے کا عشق ہے۔ وہ جب کتاب کھول کر بیٹھتا۔ تو اس کا دماغ مطالعہ کے مقابلہ میں وکالت کی برکتوں کے خیال سے زیادہ خوش ہوتا۔ یہ مکان مسمار کروں گا۔ اس جگہ ایک عالیشان

مکان بناؤں گا۔ اس کا نقشہ اس کی نگاہوں میں کھنچا ہوا تھا۔ کئی بار وہ سچ مچ پنسل اور کاغذ لے کر اس مجوزہ مکان کا نقشہ بنانے لگا۔ ایسا مکان ہو۔ کہ ہر موسم میں آرام ملے۔ مہمان آئیں تو انہیں آسائش کے ساتھ ٹھہرایا جا سکے۔ اس طرح خیالی قلعے بنانے میں اس کا وقت صرف ہو جاتا۔ اور مدرسہ کا وقت آ پہنچتا۔

یہ تینوں سال تپسیہ کے دن تھے۔ للتا کو گھر کا سب کام کاج اپنے ہی ہاتھوں سے کرنا پڑتا۔ مگر چوڑیاں بہت ٹوٹتیں اور اس کی چوڑیوں کا ہفتہ وار خرچ منشی کی تنخواہ سے کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتا تھا۔ گوبند رام منہ اندھیرے اٹھتے اور پانی کی کلسی کھینچ لاتے۔ موٹے کھانے کھاتے اور موٹے کپڑے پہنتے۔ مگر موٹے پن کا جسم پر الٹا اثر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی خاص کر تہواروں کے دن للتا جھنجھلا اٹھتی اور اپنا غصہ اپنی قسمت پر اتارتی۔ کیونکہ اس سے زیادہ کمزور اسے اور کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ یوں چاہے للتا فاقے کرتی، گاڑھا پہنتی اور ذرا بھی من نہ میلا ہوتا۔ مگر اپنی سبکی اس سے نہیں برداشت ہو سکتی تھی۔ ایک بار اس نے اپنی پڑوسن سے کچھ روپے قرض دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر گوبند رام نے ضد کی کہ مجھے قانون کی چند کتابیں منگانی ضروری ہیں۔ مباحثہ شروع ہوا۔ اور حسب معمول قانون نے حق پر فتح پائی۔ للتا کا وعدہ جھوٹا پڑ گیا۔ یہ کہا سنی۔ لڑائی شروع ہو گئی۔ مگر کھلے میدان میں نہیں۔ للتا نے مقابلۂ مجہول کو زیادہ کارگر سمجھا۔ جو دور جدید کی بہترین حربی ایجاد ہے۔ تین دن گھر میں آگ نہیں جلی۔ اور پڑوسیوں نے یہ فیصلہ کر لیا۔ کہ آج کل نوبت فاقوں پر بسر ہو رہی ہے۔ ایسے بھی لوگوں کے نصیب ہیں۔ مگر فراغت کا بھیس بدل کر وہ بڑا ظالم اور بے رحم ہوتا ہے۔

گوبند رام کا ارادہ کتنا ہی کمزور ہو۔ اس میں تکلیف اور ظاہر داری کی کمی نہ تھی۔ اس کے خطوط ایسے دل خوش کن ہوتے۔ کہ لکشمی دت کو بھی اس پر رشک آتا۔ آخر ملازمت سے اس کا جی ایسا اچاٹ ہوا۔ کہ اس نے رخصت کی درخواست دے دی اور اپنے دوست کو لکھا کہ تم سے ملاقات کرنے آتا ہوں۔

لیکن گوبند رام کو اس خبر سے بہت خوشی نہیں ہوئی۔ وہ سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ لکشمی دت یہاں بڑی بڑی امیدیں لے کر آئے گا۔ وہ مسلسل دعوتوں کے خواب دیکھ رہا ہو گا۔ اور یہاں رام نام کے سوا کچھ نہیں۔ کیوں نہ ایک خط ڈال دوں کہ ایک ضروری کام کے لئے بمبئی جا رہا ہوں یا کوئی اور بہانہ کر دوں۔ للتا سخت بیمار ہے۔ سخت پریشان ہوں۔ مگر ان خیالوں پر وہ خود ہنس پڑا۔ یہ انسانیت نہیں۔ یہ دوستی نہیں۔ میری محبت اسے یہاں لائی ہے۔ اور میں اس سے منہ چھپاؤں اس سے تو بہتر ہے۔ کہ صاف صاف اپنی رام کہانی سنا دوں۔ وہ میرا سچا دوست ہے۔ اسے میرے ساتھ ہمدردی ہو گی۔ اس میں میری کیا خطا ہے۔ کہ میں زیادہ امیر نہیں ہوں۔ میں نے وہ تعلیم حاصل کی۔ جو ثروت اور دولت کا خزینہ تھی۔ اگر یہ جنس خریدار مجھے نہیں ملا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔

گوبند رام نے مہمان داری کی تیاریاں شروع کیں۔ فرش فروش، میز اور کرسیاں سب ادھر ادھر سے مستعار لے کر جمع کیں۔ ایک خوبصورت جھالروں والا پنکھا بھی لگا دیا۔ ان تیاریوں سے فرصت پا کر للتا کے پاس گئے۔ اور

بولے کل میرے دوست لکشمی آئے ہیں۔ للتا نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ "وہ بہت اچھی بات ہے۔"

آئے دن کے قانونی مصارف نے للتا کو بہت بیزار کر دیا تھا۔ اس لئے جب نیا خرچ سامنے آجاتا۔ تو وہ جھنجھلا اٹھتی تھی دوستوں کی دعوتیں اور نت نئے تحفے فراغت اور تمول کی جلوہ آرائیاں ہیں ایسے موقعوں پر للتا قانون ہی پر اپنا غصہ نکالتی۔

لیکن گوبند رام اس طنز کو پی گئے۔ اور بہت رقیق لہجہ میں کہا۔ "خوشی تو مجھے بھی ہے۔ پرانا دوست ہے۔ مگر اس کی دعوت ضیافت کی کیا فکر ہوگی۔ روپیہ کہاں سے آئے گا۔"

للتا نے تیوری بدل کر کہا "کیا مجھ سے یہی سوال پوچھ رہے ہو؟"

گوبند رام اور بھی ملائم ہو گئے۔ "نہیں تم سے بھلا کیا منہ لے کر پوچھوں گا، مگر تمہاری صلاح لینی تو ضروری ہے۔ میرے منہ دیکھے اب چند آنے پیسوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور میں ٹھہرا مدرس۔ یہ جانتا ہوں۔ کہ ایک نمونہ ہزاروں روایتوں سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ میرے جتنے دوست، ملنے والے اور صورت آشنا ہیں۔ ان کو میں خود نمونہ بن کر سکھا چکا ہوں۔ کہ دنیا اعتبار کی جگہ نہیں ہے۔ اس فرض کو میں نے خوب دل توڑ کر پورا کیا ہے۔ انہیں یہ بھی تجربہ ہو گیا ہے۔ کہ مقروض کے وعدے معشوق کے وعدوں سے کم بے سر انجام نہیں ہوتے۔ اس لئے میں تو اس وقت بالکل معذور ہوں۔ تمہیں کوئی تدبیر سوجھی ہوگی" للتا پر اس ظریفانہ گفتگو کا کچھ اثر نہ ہوا۔ بولی "مجھے اس وقت سر مغز ذکر کرنے کی مطلق فرصت نہیں ہے۔"

گوبند رام زچ ہو کر بولے۔ "پیاری للتا دیکھو مجھے اس وقت دق نہ کرو۔ میں تین دن سے سخت پریشان ہوں۔ اب میرے ہوش و حواس بالکل ٹھیک نہیں۔ تمہیں کوئی نہ کوئی راستہ نکالو۔"

للتا کا غصہ کچھ فرو ہوا۔ سوچ کر بولی "ایک تدبیر سوجھتی ہے۔ تمہیں برا نہ لگے۔ تو کہوں" گوبند رام کی جان میں جان آئی جواب دیا۔ "برا لگنے کی کوئی بات نہ ہوگی۔ تو کیوں برا لگنے لگی۔" للتا "میں تو صاف دل سے کہتی ہوں۔ شبہ کرتے ہو۔ تو نہ کہوں گی۔"

گوبند رام "نہیں نہیں شبہ کی کوئی بات نہیں۔ بتاؤ تو سہی۔" للتا "اپنے قانون کی چند کتابیں گرو رکھ دو۔ جب تنخواہ ملے۔ چھڑا لینا۔"

للتا نے یہ باتیں نہایت متبسم انداز میں کہیں۔ مگر گوبند رام اس خیال کو دور نہ کر سکے۔ کہ یہ پرانا بخار نکالا گیا ہے۔ وہ دل میں سمجھے تھے۔ کہ شاید للتا کوئی زیور گرو رکھنے کو دے گی۔ مگر للتا یہ بازی پہلے ہی ہار چکی تھی۔ اس کے کئی زیور ایک مہاجن کے صندوقچہ کا سنگار بنے ہوئے تھے۔ گوبند رام نہایت خفیف ہوئے۔ اور باہر آکر اسی فکر میں غوطے کھانے لگے۔ یہاں تک کہ فکر نے چاروں طرف کا دروازہ بند پا کر قانون کا سہارا لیا۔ دل نے فیصلہ کیا۔ للتا کی تجویز باوجود خفت آمیز ہونے کے آزمائش کے قابل ہے۔ فوراً گھر میں گئے۔ اور نئی نئی کتابیں چن کر جمع کیں۔ ان کتابوں پر اپنی ولدیت اور قومیت اور سکونت لکھنے کا خبط تھا۔ بچپن میں نظم سے زیادہ رغبت تھی۔ ہر ایک کتاب پر کسی استاد کے یہ بے نظیر اشعار لکھا کرتے تھے۔

ہر کہ دعویٰ بریں کتاب کند — دین و ایمان خود خراب کند
ہر کہ دعویٰ کند شود باطل — پیش قاضی و کوتوال عادل!!

اب وہ شاعرانہ رجحان تو نہ تھا۔ مگر اس کی یادگار باقی تھی۔ اسے ربڑ سے مٹا دیا۔ اور جب خوب اندھیرا ہو گیا

سلطان حیدر جوش کے قلم سے

افسانۂ دل

چہار شنبہ ۲۳ جون ۱۹۱۳ء

منظر ... یعنی ان کے والدین کو صرف ... کہ ... جناب ... کی طرف ... اسی طرح جس بات ... کا ... تھا جس طرح سجدہ کرنے کی اجازت دی ... حاصل تھی۔ ... کو گھی ... تھی جو منظر ... تمام آرزوؤں کا ... زندگی کا مرجع ... سمجھتی تھی۔ اس کو ٹھی کے مالک ایک ... بنگالی تھے۔ ... سے ایک عہدہ جلیل پر ریاست ... نہایت فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ سوائے اولاد کے اور کسی بات میں کمی نہ تھی۔ روپیہ پیسہ ... حکومت ... فارغ البالی ... سب کچھ ... سے زیادہ میسر تھا۔ البتہ اولاد کے نام ... ایک لڑکی ہے اور کچھ نہ تھا۔ مگر وہ ایک لڑکی جس نے حسن ... کو گرم و سرد ... نے ابھی سترہ برس سے زیادہ نہیں گذرے تھے ایک ... موتی ... یتیم تھی۔

یہ لڑکی کلکتہ کے ایک بنگالی گرلز اسکول میں تعلیم پاتی تھی۔ اور اسی سال انٹرنس میں کامیاب ہوئی تھی۔ منظر کے والدین میں اور اس بنگالی فیملی میں نہایت ... ربط ضبط تھا۔ منظر کے والد تعصب سے قطعی پاک تھے۔ اور یہ بنگالی آزادی کے لحاظ سے بھی ... دنیا کافی ہوگا کہ برہمو سماج تھے۔

... آخر ... کی ... ایسی چیز نہیں جو ایک مقید ... اثر نہ کرے پھر اس پر دونوں طرف اس قدر ... مخالفت و تعصب کی کدورت سے پاک دل ... جس قدر ... بے تکلفی اور یگانگت پیدا ہو جاتی تھوڑی تھی۔ آج سے چھ سات برس پیشتر جب کہ یہ لڑکی ... کیملا دنیا کو کسی اور بھولے اور نادانی آمیز نظر سے دیکھتی تھی۔ منظر اور یہ ... ہم نشیں، ہم جلیس اور شریک شرارت رہتے تھے۔ پھر زمانہ نے ان کو علیحدہ کر دیا منظر علی گڑھ کالج میں بھیجے گئے۔ اور کیملا گرلز اسکول کلکتہ - بنگالی گرلز اسکول! خط و کتابت جاری رہنا کچھ تعجب آمیز نہ تھا اور ہر تعطیل کے موقعہ پر ایک دوسرے سے شوق کے ساتھ بنارس میں آکر ملنا قطعی نیچرل! مگر اس مرتبہ کچھ ایسا اتفاق ہوا تھا کہ پورے تین سال سے ملاقات نصیب نہیں ہو سکی۔ اس عرصہ میں منظر بھی کئی مرتبہ بنارس آئے۔ اور کیملا بھی۔ مگر۔ اسے اتفاق کہئے یا فلک کج رفتار کی شعبدہ بازی۔ جس دفعہ منظر آئے کیملا نہ آ سکی۔ اور جس دفعہ وہ آئی منظر کالج نہ چھوڑ سکے۔ بچپن کی ہم نشینی نے ایک انس پیدا کر دیا۔ اور زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ خود رو چیز دونوں جانب جڑ پکڑتی رہی۔ خط و کتابت سے ہمیشہ اس خود رو چیز کو غذا پہنچتی رہی۔ اور۔ ! اور جب شباب کا نظر خیرہ کرنے والا آفتاب طلوع ہوا اس کی صبر سوز شعاعوں کا انعکاس دونوں الھڑ دلوں پر شروع ہوا تو یہ خود رو چیز ایک ساتھ پھوٹ پڑی، پھیل گئی، ایک ایک رگ میں سرایت کر گئی۔ اب وہی الفاظ جو نہایت بے پروائی کے ساتھ قلم و زبان سے نکل جایا کرتے تھے۔ رکنے لگے۔ نہیں کوئی خاص چیز۔ کوئی خاص خیال۔ ایسے موقع پر زبان اور قلم کو یکایک دونوں طرف روک لیتا تھا! اور اس خیال کا احساس تکلیف دہ۔ مگر دل چسپ مضطرب کن مگر لذت آمیز۔ اجتماع الضدین احساس۔ دونوں دلوں میں جاگزین تھا۔

ہاں تو۔۔۔ پورے تین سال شوق و انتظار کے بعد آج منظر عجیب بے چینی کے ساتھ کیملا سے ملنے تشریف لے جا رہے تھے۔ یہ اس کو معلوم ہو چکا تھا کہ کچھ عرصہ سے ایک بنگالی سن رسیدہ عورت کیملا کی نگران یا اتالیق کی صورت میں اس کے پاس رہتی تھی۔ اور اسے ڈر تھا کہ کہیں

سب حال اس سے پوچھا تھا۔ ہم تم کو خوش نصیب سمجھتا تھا

اے میرے خلیلین ہونٹ شاید آپ شک کرنے لگا؟

او بس! تم اچھے ہو گئے؟"

"کچھ نہیں۔ نہ مظہر اپنا مطلب بے باک ہو کر کہہ گیا۔ اس کی سانس کچھ معمول سے زیادہ سرعت کے ساتھ آرہی تھی۔

"اللہ اکبر (خوب دست) تم نے کیا کیا؟ اس پر ۔۔ یاد رہے ضرور [illegible] ہو گیا!"

"یہ کچھ نہیں تھا محض ایک بوسہ تھا [illegible] نہایت [illegible] مسکراتا ہوا پوری متانت کے ساتھ مظہر نے جواب دیا!

"کیا۔ کیا۔ کیا تم ۔۔ بیچاری نیپالی عورت اس فتنہ خیز و ظرافت آمیز لفظ کا مطلب مطلق نہیں سمجھی!

اس کا جواب دینے کی بجائے مظہر کرسی کی طرف جھکا اور اس سے پیشتر کہ وہ سنبھل سکے۔ آگاہ ہو زور کا بوسہ مظہر نے گرگ باراں دیدہ کی پیشانی پہ لے لیا۔

"یہ کیا! یہ کیا! غصہ کے ساتھ بڑھیا کے منہ سے نکلا۔

مظہر (انگریزی میں) "بڑی بی تم اس قدر کیوں ناراض ہوتی ہو۔ ہمارے کالج کا یہ طریقہ ہے کہ ہم جب کبھی کسی برابر والے سے ملتے ہیں تو رخسارے پر بوسہ دینا ہمارا فرض ہے۔ اور کسی بزرگ سے ملیں تو پیشانی پر! اور اگر ایسا نہ کریں خصوصا اس وقت جب کہ محبت درمیان میں ہو تو سخت بدتہذیبی اور بدتمیزی سمجھی جائے گی۔"

"اچھا۔ دل (معاف) یہ بات! یہ بات! تم ہم کو مانٹ (معاف) کرے گا۔ ہم افسوس ہے!"

اب بڑھیا کا غصہ رفو چکر ہو گیا تھا۔ بالکل اس طرح اڑ گیا تھا۔ جس طرح گدھے کے سر سے سینگ۔ وہ بہت کچھ منظا کی نسبت خصوصا اس محبت کی نسبت جو مظہر اور کمیلا کے مابین تھی۔ خود کمیلا کی والدہ سے سن چکی تھی۔ اس لئے اب زیادہ مخل ہونا اسے خود برا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اٹھی اور چلی گئی۔! مظہر بھی کمیلا کا ہاتھ ہاتھ میں لئے ہوئے باغیچہ میں ٹہلنے لگا۔ شکوہ شکایت، اظہار صداقت و استقلال، دل کی لگی، خدا جانے کیا کیا معاملات تھے جن پر عجیب لطافت کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی۔ مگر اثنائے گفتگو میں عین اس وقت جبکہ دو مجروح دل ایک بوسہ مشترک کے ساتھ ایک دوسرے کو پابند رہنے کا عہد کر رہے تھے۔ سامنے والی سڑک پر سے ایک شخص دردھری آواز میں گاتا ہوا نکلا۔

از نہادِ سن نہ دوم پائے بدام است اینجا

ہر برہمن بچہ پچھمن نہ رام است اینجا

ہم کو اور کسی جھگڑے سے مطلب نہیں اس سے بھی کچھ غرض نہیں کہ بڑھیا نے اس واقعہ کا ذکر بڑے بابو سے کیا یا نہیں۔ یا "دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ" کے مصداق ایک نوجوان کے بوسہ نے اسے خاموش کر دیا۔ البتہ ہم کو صرف یہ الجھن ہے کہ "بوسہ ذو معنی" کا اطلاق پہلے بوسہ پر ہو سکتا ہے یا دوسرے پر۔"؟

الا دردمند

حضرت آرزو لکھنوی[1]

چہار شنبہ ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء

گزرا نہ تھا جو اس تک وہم و گماں ہمارا
یوں آج مٹ رہا ہے نام و نشاں ہمارا

ملتان ہو کہ ایران طرپولی یا مراکو
اک وقت میں تھا ہے ہر کارواں ہمارا

توپیں تو مورچوں کی خاموش ہو چلی ہیں
نامہ ہو کوئی شاید آتش فشاں ہمارا

یا گھر میں بیٹھنا تک دشوار ہو گیا ہے
یا ایک وقت میں تھا سارا جہاں ہمارا

وہ دن کہاں ترقی تشکل ہلال جب تھی
ہے اب تو بے نشانی نام و نشاں ہمارا

کرتے ہیں اب بسیرا آ آ کے بوم ان پر
جن ڈالیوں پہ کل تک تھا آشیاں ہمارا

اک رگ ہزار نشتر اک دل ہزار پیکاں
ہے آج تشنۂ خوں سارا جہاں ہمارا

جو سیل آ رہی ہے سیل فنا ہے گویا
مشکل ہے اب بچے گا نام و نشاں ہمارا

کیا کام اس شجر سے سرسبز ہو کہ سوکھے
جس پر نہیں ہے باقی اب آشیاں ہمارا

ہم ساتھ زندگی کے خانہ خراب اب ہیں
تربت کے واسطے ہے یہ خاکداں ہمارا

مٹتے جسے بھی دیکھو جانو کہ ہے مسلمان
یہ اک رہ گیا ہے قومی نشاں ہمارا

یہ قصہ مصیبت نشتر سے کم نہیں ہے
روئے گا خون کے آنسو ہر قصہ خواں ہمارا

اب انتظار کیا ہے اب آنے والے جلد آ
گمراہ بے خضر ہے یہ کارواں ہمارا

تو لاج رکھ لے آ کر دین محمدی کی
جز تیرے کون اب ہے عزت نشاں ہمارا

سینے میں جن کے دل ہے تڑپیں گے آرزودہ
اک داستان غم ہے گویا بیاں ہمارا

---

[1] جلال لکھنوی کے جانشین۔ نظموں میں اُردو غزلوں کا رواج انہی نے دیا، پاکستان میں ۸۰ سال کی عمر میں وفات پائی۔

ایک خط میں بچپن کی یاد
لڑکیوں کے نیچرل جذبات کا اظہار

از محمد حامد اللہ صاحب افسرؔ میرٹھی

(اشفیہ ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۱۳ء)

خط کو تمہارے دیکھ کر پیش نگاہ ہے اب
باتیں جو بچپنے کی تھیں آ گئیں یاد سب کی سب

زمانے کو دن ہوا ہو گئے باتیں ہیں سب کہانیاں
باتوں کو کون بیٹھ کر کہتا ہے اب کہانیاں

نیم کے نیچے بیٹھ کر کھیل وہ مجھ کو یاد ہے
تم بھی خوش اور میں بھی خوش کھیل وہ مجھ کو یاد ہے

ہو گئی کچھ جو چھیڑ چھاڑ تن گئے اک ذرا میں پھر
ہنس دئے اک ذرا میں دل مل گئے اک ذرا میں پھر

کیسے تھے کس خوشی کے ساتھ بیٹھ کے دونوں پاس پاس
رنج نہ آتے اردگرد فکر نہ آتے پاس پاس

گڑیوں کو رات دن نئے کپڑے سینے بنائے جاتے تھے
ہوتی تھیں روز نسبتیں بیاہ رچائے جاتے تھے

طرفہ عجیب سمجھتے تھے موسم برشکال میں ہم
عیش نصیب رہتی تھی موسم برشکال میں ہم

لیتے تھے جھولنے میں ہم پینگ بہت بڑھا کے
پینگ لیا تو گر پڑے گر کے اٹھے تو ہنس پڑے

روز پڑھایا کرتے تھے راتوں کو بیٹھ کر جسے
مٹھو وہ لے کے مر گیا کوئی پڑھائے اب کسے

اب میں ہزاروں کاوشیں جان ہے اک وبال میں
بچپنے کے لطف بھول کر آتے نہیں خیال میں

جلد جواب خط کا دو اب یہ تمہارا فرض ہے
افسرؔ خوش خیال کو میرا سلام عرض ہے

دُعَا

مجاہدین ریف کی فتح و نصرت کے لیے جو غازی عبدالکریم کی قیادت میں فرانس اور اسپین کے خلاف معرکہ آراء تھے، جامع مسجد دہلی کے منبر سے جمعہ کی نماز کے بعد مولانا نے یہ دعا مانگی تھی اس وقت مولانا کے تاثر کی یہ کیفیت تھی کہ روتے روتے گھگھی بندھ گئی تھی۔ دوسری طرف ہزارہا کا مجمع تھا جو زار و قطار رو رہا تھا۔ اور جامع مسجد کا وسیع صحن ایک ماتم کدہ بن گیا تھا۔ (از مرتب)

اے بحر و بر اور خشک و تر کے مالک، اے ارض و سما، کون و مکان کے خالق و فاطر، اے کہ وہ تیرا آستانہ ہر عاجز و درماندہ کا ملجا و ماویٰ اور تیری چوکھٹ بے نواؤں اور بے کسوں کے لیے آخری جائے پناہ ہے، اے وہ کہ مسکینوں کی فریاد کو لبیک کہتا اور عجز و درماندگی کو عزیز رکھتا ہے، آج تیرا ایک گنہگار و عصیاں شعار بندہ تیرے حضور میں حاضر ہوا ہے۔ کہ اس کی پیشانی پر تیری اطاعت و فرمانبرداری کا کوئی نشان نہیں مگر غرقِ خجالت و انفعال سے تر نظر رہے۔ گو اس کا سر تیرے احکام کے سامنے کم جھکا ہے مگر خاک شرمساری اور گرد خجالت سے وہ اٹ رہا ہے۔ اور اس کے چہرے پر رعونت و سرکشی کی تمکنت و نخوت کی بجائے مذلت و خاکساری اور عجز و فروتنی موجود ہے اس کی جیب و دامن متاعِ طاعت سے خالی ہے۔ مگر اس کے دل کی جھولی عجز و شکستگی اور فروتنی و درماندگی کی دولت سے معمور ہے۔ وہ چشم خوں بار اور قلب پرسوز کے ساتھ تیری بارگاہ عاجز نواز اور آستانہ ناز پر حاضر ہوا ہے کہ تیرے حضور میں اپنی خجل و شرمسار پیشانی کو رگڑ رگڑ کر تجھ سے کچھ مانگے اور سرِ نیاز کو جھکا کر کچھ طلب کرے۔ اے دردمند دلوں کی فریاد کو سننے والے اور ایسے عاجزانہ اور منکسرانہ دعاؤں کو آغوش استجابت میں جگہ دینے والے خدائے حی و قیوم، تیرے سوا کون ہے جو دلوں کی شکستگی کو دولت و حشمت کی اکڑ پر ترجیح دیتا ہو اور روحوں کی دردمندی کو طاعت و عبادت کے نخوت پر مقدم رکھتا ہو۔ یقیناً تیرے سوا کوئی نہیں پھر ایک تہی دامن اور بے بضاعت بندہ تیرے آستانہ قدس کو چھوڑ کر اپنے دل کی تڑپ سنانے کے لئے کہاں جاتا اور کس کی چوکھٹ پر جا کر سرِ نیاز کو رگڑتا اے بے کسوں کے کس اور بے سہاروں کو سہارا دینے والے رب موسیٰ و ہارون! میں اس لیے حاضر نہیں ہوا کہ تجھ سے اپنے رہنے کے لیے عالیشان محل مانگوں کیونکہ قلب مطمئن کے ساتھ میں خس پوش جھونپڑے کو شان دار محل پر ترجیح دیتا ہوں۔ میں اپنے لیے شاہانہ جاہ و جلال اور عظمت و جبروت کا بھی طالب نہیں کہ عجز و گدایانہ کے

ساتھ زندگی بسر کرنے کو پسند کرتا ہوں۔ مجھے دولت کی فراوانی بھی درکار نہیں نہ عیش و راحت کے لئے امیرانہ کروفر کی مجھے چاہ ہے۔ بلکہ میں تو اس لیے تیرے حضور میں آیا ہوں کہ اگر تیری توفیق کرم فرمائے تو تجھ سے تیرے مجاہد و سرفروش بندوں کے لیے جو صحرائے اعظم افریقہ کے ایک گوشہ ریف میں مصروف جہاد ہیں، دعا مانگوں کہ اے حق و صداقت کو دوست رکھنے والے خدا تو اپنے ان بندوں کی اپنی نصرت بخشیوں سے مدد فرما اور ان کو ظلم و طغیان کے مقابلہ کرنے کی طاقت عطا کر تاکہ حق سربلند و سرفراز ہو اور باطل خاسر و ناکام رہے۔

خداوندا! یہ مٹھی بھر آدمی جو بے سروسامانی مگر تیری نصرت فرمائیوں کے سازوسامان کے ساتھ اسپین اور فرانس جیسی طاقت ور حکومتوں سے نبرد آزما ہیں تاکہ اسلام کا علم مغرب اقصیٰ کی سرزمین پر سرنگوں نہ ہونے پائے۔ اپنے خزانۂ غیب سے ان کی مدد فرما۔ کیوں کہ بغیر تیری نصرت بخشی و نصرت فرمائی کے یہ بے سروسامان مجاہد ایسی عظیم الشان سلطنتوں کا کامیاب مقابلہ کس طرح کر سکتے ہیں جو اپنی شیطانی طاقت کے نشے میں سرشار ہیں اور جن کو اپنے جہنمی آلاتِ حرب پر اس قدر گھمنڈ ہے کہ جہاں کہیں بھی حق و صداقت کی روشنی نظر آتی ہے۔ چڑھ دوڑتے ہیں۔ تاکہ اس کو گُل کر دیں۔ اور اپنی سطوت و جبروت کا سکہ بٹھائیں اور جو اپنی ابلیسی قوت پر اس قدر مغرور ہیں کہ جس جگہ بھی کوئی کمزور اور ناتواں قوم بستی ہے یہ اس پر دھاوا بول دیتے ہیں تاکہ جن گردنوں کو تو نے آزاد پیدا کیا ہے۔ ان میں اپنی غلامی کا طوقِ لعنت ڈال دیں۔ اور جن سروں اور پیشانیوں کو تو نے صرف اپنی بارگاہ کبریائی میں رگڑنے کے لیے بنایا ہے۔ ان کو اپنی ناپاک چوکھٹوں پر رگڑوائیں۔

اے خدائے بے نیاز یا اسے وہ کہ تو نے اپنی قدرتِ کاملہ سے کمزوروں اور ناتوانوں کو طاقت و توانائی عطا فرمائی کہ سرکش اور متمردانسانوں کو شکست و ہزیمت کی ذلت و رسوائی دلوائی ہے۔ تیرے یہ ریفی بندے جو بے سروسامانی کے سوا کوئی سازوسامان نہیں رکھتے۔ بغیر تیری مدد کے فرعنہ اسپین و فرانس سے کس طرح سر بر ہو سکتے ہیں اور جب تک تیری غیبی نصرت بخشیاں بے سروسامان مجاہدین ریف کے ہم رکاب نہ ہوں، وہ ایسی قاہر حکومتوں کا کیوں کر مقابلہ کر سکتے ہیں۔ بھلا ایک مفلوک الحال اور دنیاوی سازوسامان سے محروم قوم کب کسی ایک طاقت ور حکومت کے غرور و گھمنڈ سے کس طرح حق و صداقت کی پامالی کی حفاظت کر سکتی ہے۔ البتہ تو نے فرعون کے گھمنڈ کو موسیٰ کی بے کسی سے شکست دلوائی۔ اور بدر کے چند نفوس سے کفار قریش کے غرور کو پامال کرایا ہے۔ تیری ہی قدرت میں ہے کہ آج بھی تو پرستارانِ توحید کو غالب و سرفراز فرما۔ بارالہا! میں تو اس قابل بھی نہیں ہوں کہ تیرے پاک بندوں کے لیے جو اعلائے کلمۃ الحق کی جدوجہد میں مشغول ہیں۔ دعا بھی کر سکوں ایک غلام و محکوم قوم کا فرد ایسے قدسی نفوس کے لیے دستِ دعا دراز کرنے کا کیا حق رکھتا ہے جو اپنی آزادی کی حفاظت میں جانیں قربان کر رہے ہیں اور پانی کی طرح اپنا لہو بہا رہے ہیں لیکن اے خدائے رحیم و غفور! ہم اپنی بدبختی پر نادم ہیں اور جہاں اپنی ناپاک زبان سے فتح و نصرت کی تجھ سے دعا مانگتے ہیں یہ بھی عاجزانہ اور درد مندانہ التجا کرتے ہیں کہ مجاہدین حق کے صدقے میں ہم کو بھی توفیق عطا فرما کہ غلامی کے بندھن اور محکومی کی زنجیروں سے نجات حاصل کرنے کے لیے سرفروشانہ جدوجہد میں مشغول ہوں۔

الٰہی! اگر تو نے بے کس اور بے سروسامان غازیانِ اسلام کی مدد نہ کی تو کفر کی تاریکی سارے اقصائے مغرب کو گھیر لیگی۔ اسلئے شہدائے بدر و احد کے صدقے میں اپنے جان فروش ریفی بندوں کو فتح و نصرت عطا فرما اور انکے دشمنوں کو جو فی الحقیقت حق و صداقت کے دشمن ہیں مغلوب و مفتوح بنا دے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

الوداع اوّل

(مئی ۱۹۲۸ء میں علاج کی غرض سے یورپ جاتے ہوئے یہ مقالہ لکھا گیا تھا)

حقیقتاً ایک اخبار اسی وقت چل سکتا ہے، جب کہ عوام کو اس کی ضرورت محسوس ہو اور وہ کافی تعداد میں اسے خریدیں آج عوام کو "ہمدرد" کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، اس لیے میں اسے بند کرتا ہوں اور ایک بار پھر غالب کے اس شعر کو دہراتا ہوں

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں؟

عوام کی یقیناً آج پھر وہی حالت ہے کہ ؎

جاتا ہوں تھوڑی دور ہر ایک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس لیے بہتر ہے کہ انہیں ایک دو سال کے لیے ان کے حال پر چھوڑا جائے اور خداوند کریم سے دعا کی جائے کہ وہ انہیں راہبر کی پہچان عطا فرمائے۔ اور پیشتر اس کے کہ ہر ایک تیز رو کے ساتھ تھوڑی دور تک بھاگتے بھاگتے وہ بالکل خستہ اور چور ہو جائیں۔ انہیں منزل مقصود کا پتہ لگ جائے۔ اور اس کی طرف بڑھنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ میں پہلے بھی "درمے" ان کی مدد کیا کر سکتا تھا۔ اپنی استطاعت کے مطابق کچھ چندہ کسی فنڈ میں دے دیا اور بس "قلمے" اور "قدمے" البتہ میں نے مجنونوں کی طرح ان کی امداد کی اور قرض میں بری طرح گرفتار ہو گیا۔ اور صحت کو بھی خیرباد کہہ چکا۔ ذیابطیس کے مرض کے باعث پہلے شکر ہی آیا کرتی تھی مگر امسال بیربل (ALBUSNI) بھی آ رہی ہے۔ اور ایسی ٹون (ACITONE) زہر بھی آ رہا ہے اور اعصابی سوزش (NEURITIS) نے رات کی نیند اور دن کا آرام حرام کر دیا ہے۔ اب "ہمدرد" کو بند کرتا ہوں اور راہبر کی طلب پر کہیں جا بھی نہ سکوں گا۔ "قلمے" اور "قدمے" جو ملک و ملت کی خدمت کرتا تھا مجبور ہوں کہ اسے بند کر دوں۔ البتہ "سخنے" جو کچھ ہو سکے گا۔ کروں گا۔ اپنی اور اپنے متعلقین کی معاش کے لیے ہر روز دو تین گھنٹے یا ہر ہفتے دو تین روز کسی کی خدمت کر کے جو کچھ بطور اکل حلال کے مل سکے گا اس کے کمانے کی کوشش کروں گا اور باقی وقت میں خود پڑھوں گا اور اپنی بچیوں کو بھی کچھ پڑھاؤں گا۔ اور مسیح۔

ہمدرد — ۲۰ مئی ۱۹۲۸ء

جامع میں یا کسی تفریح کی جگہ ہر اس بھائی کی خدمت کے لئے حاضر ہوں گا جو مفادِ عام کے کسی کام کے متعلق میری رائے دریافت کرنا پسند فرمائیں گے۔ کانگریس میں۔ خلافت میں۔ جمعیت العلماء وغیرہ میں اس طرح برابر شریک ہونے کی کوشش کروں گا۔ جس طرح ایک مفلس، نادار ہندوستانی اور مسلمان شریک ہو سکتا ہے۔ حقیقتاً جس طرح سال گذشتہ عرض کر چکا ہوں اب بھی عرض کرتا ہوں کہ یہ گوشہ نشینی نہیں ہے بلکہ "مکہ" سے ہجرت ہے۔ خدا کرے کہ جلد فتح مکہ نصیب ہو۔ جو بھائی مجھے اور میرے اہل و عیال کو اکل حلال کی کوئی صورت بتا سکیں، بتائیں۔ ان کا نہایت ممنون ہوں گا، لیکن اپنی ذاتی ضروریات کے لیے کسی سے کوئی مدد قبول نہیں کر سکتا، سال گزشتہ بھی جب اس قسم کی رو کے لیے چند بھائیوں نے امداد کی نظاہر فرمائی تھی۔ میں نے دل سے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس سے مستفید ہونے سے بہ مجبوری انکار کر دیا تھا۔ اور اسی پر میں آج بھی قائم ہوں۔

حال ہی میں ایک سفر سے واپس آکر جب میں نے اپنی ڈاک کھولی تو پہلا محبت نامہ جو میری نظر سے گزرا، میرے قدیم اور عزیز کرم فرما مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا تھا۔ اس میں انہوں نے "ہمدرد" کے لیے اپنے اور چند اور عزیزترین احباب کی کوششوں کا ذکر فرمایا تھا اور وہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح "ہمدرد" جاری رہے اور اس کے متعلق ان سب احباب نے ایک اسکیم تیار کی ہے جسے وہ قارئین کرام کے سامنے پیش فرمائیں گے۔ خیر یہاں انہوں نے قرآن کریم کی ان بہت اچھی آیات بینات کو بھی دہرایا تھا کہ ومن یتق اللّٰہ یجعل لہ مخرجاً ویرزقہ من حیث لا یحتسب ومن یتق اللّٰہ ومن یتوکل علی اللّٰہ فھو حسبہ ان اللّٰہ بالغ امرہ قد جعل اللّٰہ لکل شیٔ قدرا۔ (اور جو کوئی اللہ سے ڈرتا ہے وہ اس کا گزارہ کر دیتا ہے اور اس کو وہاں سے روزی دیتا ہے، جہاں سے اسے گمان بھی نہ ہو اور جو کوئی اللہ پر بھروسہ رکھتا ہے سو وہ اس کے لیے کافی ہے۔ اللہ تو کسی نہ کسی طرح اپنا کام پورا ہی کیا کرتا ہے۔ اس نے ہر چیز کے لئے ایک اندازہ رکھا ہے)

جس سفر سے واپس آتے ہی میں نے مولانا عبدالماجد دریابادی صاحب کا یہ محبت نامہ پڑھا اس کے آخری دن خداوند کریم نے اپنے گنہگار اور ناچیز بندے کے لیے غیب سے علاج اور اس کے لیے سفر کا سامان یکایک اور بالکل محیر العقول طریقے پر بہم پہنچا دیا۔ میں لکھ چکا ہوں کہ میں نے ہندو بھائیوں سے قرض تک لینے میں احتیاط برتی ہے اور قارئین کرام جانتے ہیں کہ میں خلافتِ راشدہ جیسی جمہوریت کا کس قدر شیدا ہوں اور ملکیت سے کس قدر بیزار ہوں۔ مجھے اس کا کبھی گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک ہندو فرماں روا جس سے ماہ اپریل سے پیشتر میں تعارف تک نہ تھا۔ اور ہی ملا تھا۔ اور وہ بھی گھنٹے دو گھنٹے سے زیادہ نہیں ان پر میری خرابی صحت کا یہ اثر پڑے گا کہ پہلے وہ خود میرا چند ماہ سے ایک قول پر علاج کرنے پر اصرار کریں گے اور بالآخر خود ہی بلا طلب بلکہ خود میری کسی چیز سے یکایک متاثر ہو کر مجھے آمادہ فرمائیں گے۔ لندن یا یورپ چلا جاؤں اور کسی ڈاکٹر سے جو وہاں نے علاج کا یہ طریقہ سیکھا ہے اس سے اپنا علاج کراؤں اور چند ماہ یورپ میں کسی صحت بخش مقام پر آرام کر کے اچھا ہو کر تو میں ہندوستان واپس چلا آؤں۔ میں نے بار بار اس کا اظہار کیا کہ میں اس امداد کا مستحق نہیں ہوں، مگر جس طریقے پر بار بار اصرار کیا گیا اس نے مجھے اور میرے ان اعزہ و احباب کو جن سے میں نے مشورہ لیا مجبور کر دیا کہ اس نعمت غیر مترقبہ کو اور اس خدا کی دین کو جو واقعی اس نے چھپّر پھاڑ کر دی ہے، قبول کر لوں۔ اور ۱۲ جون کے جہاز میں عازم یورپ ہو جاؤں۔ میرے یہ محسن کرم فرما نہیں چاہتے کہ میں شکریہ کے الفاظ بھی زبان پر لاؤں۔ چہ جائے کہ ان کی نیاضی کی تعریف کروں۔ اس لیے میں خاموش ہوں۔ لیکن خدا خوب جانتا ہے کہ

میرے دل میں کیا کچھ مستور ہے۔ میں خود ۱۵ مئی کے بعد سے "ہمدرد" سے علیحدہ ہو چکا ہوں۔ اور آج سے ۲۰ مئی کے پرچے کے بعد میرا نام بھی بہ حیثیت ایڈیٹر "ہمدرد" شائع نہ ہوا کرے گا۔ اب میں اس کے قارئین کرام اور ملک و ملت سے رخصت ہوتا ہوں۔ آئندہ کیا ہوگا؟ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اس وقت میری زبان پر الوداع ہے اور میرے دل میں ایک درد ہے اور میری آنکھوں میں چند آنسو ہیں۔ میں اپنے بھائیوں اور بہنوں سے درخواست کرتا ہوں کہ میری صحت روحانی و صحت جسمانی دونوں کے لیے دست بدعا ہوں۔ لیکن میرے اس جدید کرم فرما کو بھی نہ بھولیں۔ جسے خدائے مسبّب الاسباب نے میری کھوئی ہوئی صحت مجھے پھر دلانے سکے لیے اپنا آلہ بنایا ہے۔ انہوں نے اپنا ذاتی یا اپنی ریاست کا یا عام طور پر ریاستوں کا کوئی کام بھی میرے سپرد نہیں فرمایا ہے۔ بلکہ محض ذیابیطس کا فاقوں کے ذریعے علاج کرانے کے لیے مجھے لندن کے ایک ڈاکٹر کے پاس بھیجا ہے اس کے خلاف جو کچھ اخبارات میں شائع ہوا وہ حسبِ دستور سراسر غلط ہے۔ میں نے جب آج سے ساڑھے تین سال پیشتر "ہمدرد" کی دوسری بسم اللہ کی تھی تو اپنے ربِ ذوالجلال کے آگے ہاتھ پھیلا کر عرض کیا تھا۔

"افسوس کہ میں اپنی کوشش میں اب تک ناکام و نامراد رہا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں آج بھی مایوس نہیں ہوں۔ آج بھی میری یہی دعا ہے اور آج بھی مجھے خدائے قدیر پر بھروسہ ہے کہ جلد وہ میری دعا قبول فرمائے گا۔ میں چند ماہ کے لیے دہلی سے اور ہندوستان سے رخصت ہوتا ہوں۔ اور دست بدعا ہوں کہ

الٰہی پھر انہیں آباد و شاد دیکھیں ہم
الٰہی پھر انہیں حسبِ مراد دیکھیں ہم

الوداع اخیر

اپریل ۱۹۲۹ء کو "ہمدرد"[1] کو ہمیشہ کے لئے بند کرنے کے موقع پر لکھا گیا۔

میں نے "ہمدرد" میں بہت سے اور بے حد طول طویل مضامین شائع کر کے قارئین "ہمدرد" کی سمع خراشی کی ہے خود بھی بہت کچھ رو دیا ہوں۔ اور بعض اوقات انہیں بھی کسی قدر رلایا ہے۔ مگر آج آخری بار ایک مضمون لکھ رہا ہوں اور ان کو الوداع کہہ رہا ہوں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ آج "ہمدرد" کے جو معدودے چند قارئین کرام رہ گئے ہیں۔ اب تو ان کی آنکھوں کے آنسو بھی سوکھ چکے ہوں گے اور میں بھی اب نوحہ گری اور سوز خوانی سے تھک گیا ہوں۔ اس لیے اس آخری تحریر سے انہیں ایک بار اور رلانا ٹھیک نہیں یہ اور بات ہے کہ جس رفیقِ سفر کے ساتھ ایک مدت مدید سے اتنی منزلیں طے کی ہوں کہ اسے رخشِ عمر کہا جائے تو نا مناسب نہ ہوگا۔ اس سے رخصت ہوتے وقت میں خود بچشمِ پُرنم اسے الوداع کہوں۔ میں نے جب ۱۹۱۰ء میں ریاست بڑودہ کی ملازمت سے اس نیت سے علیحدگی اختیار کی تھی کہ اس سے زیادہ وسیع دائرے میں قدم رکھ کر ملک و ملت کی خدمت کیا کروں تو "کامریڈ" نکالنے کے لئے کلکتہ گیا تھا۔ اس وقت سے یہ خیال میرے دل میں تھا۔ کہ انگریزی ہفتہ وار تو حکومت کی خدمت میں عرضِ حال کرنے کے لئے ہو اور ہندوستان کی دوسری ملتوں کو بھی ملت اسلامیہ کے افکار و مطامح سے اس کے ذریعے سے باخبر رکھا جائے۔ اور ایک حد تک ہندوستان کی باہر کی اسلامی اور غیر اسلامی دنیا کو بھی افکار و مطامح سے آگاہ کیا جاتا رہے۔ لیکن سوائے ان مسلمانانِ ہند کے جو اردو سے ناواقف اور نا آشنا ہیں۔ باقی مسلمانانِ ہند کی خدمت کے لئے جو اس ملت مرحومہ کے سوادِ اعظم ہیں۔ ایک روزنامہ اردو میں بھی شائع کیا جائے۔ جب "کامریڈ" کی اشاعت شروع ہونے کے ایک ہی سال بعد حکومت نے کلکتے کو چھوڑ کر دہلی میں پھر دارالحکومت بنانے کی ٹھانی اور "کامریڈ" کے سبب اس اہتمام سے دیار میں اس وقت قارئین کرام کو اس پر آمادہ کیا کہ "ہمدرد" کو بھی جاری کرنے میں میری امداد فرمائیں تاکہ "کامریڈ" کے ساتھ ساتھ اس مطبع سے ٹائپ کے حروف میں روزانہ "ہمدرد" بھی شائع ہو سکے۔ اور انہوں نے مجھے پچیس ہزار روپے کے ڈبنچر میری استدعا پر پندرہ سال کے لیے خرید فرمائے اور میں کامریڈ ہمدرد پریس ۱۹۱۲ء میں قائم کر سکا اور ۱۹ ستمبر ۱۹۱۲ء کو دہلی پہنچ گیا۔ یہاں آتے ہی ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑا۔

---

[1] "ہمدرد" ۱۲-۱۳ اپریل ۱۹۲۹ء

یعنی جس وقت دہلی سے "کامریڈ" کا پہلا پرچہ نکلا۔ ترک جو ابھی جنگِ طرابلس کی مصیبت سے نکلنے نہ پائے تھے۔ جنگِ بلقان کی تازہ مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ بیروت سے جو نسخ کا ٹائپ منگایا گیا تھا وہ دیر میں آیا اور اس پر بھی ضرورت سے کم آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عرصے تک "ہمدرد" نہ نکل سکا اور اس کا ایڈیٹوریل عملہ اس تمام عرصے میں بے کار رہا اور مصارف برابر جاری رہے لوگوں کے اصرار پیہم سے مجبور ہو کر جو کچھ ٹائپ موجود تھا اسی سے کام لیا گیا۔ اور ۲۳ فروری ۱۹۱۳ء سے ایک ایک ورقہ نقیب "ہمدرد" بن کر آنے والے "ہمدرد" کی منادی کرنے لگا۔ اس وقت اس ایک ورقہ نے اپنا تعارف قارئین کرام سے ان الفاظ میں کرایا تھا۔

> ہماری شرم ساری اور محجوبی کا یہ عالم ہے کہ چلمن سے پردے کی نوبت پہنچتی جاتی ہے تاہم خوش ہے کہ ہم سرا در ہم چشم احباب کے شکووں میں ایک طرح کی تلخ شیرینی ہوتی ہے۔ یہ اگر ہی رہیں تو مزا آتا ہے۔ اگر بند ہو جائیں تو یاد آتی ہیں مگر قوم کے بزرگ مخدوم کی شکایت سننے کا زہرہ نہیں۔ ہم اپنے احباب کو طوعاً نہیں تو کرہاً راضی بھی کر لیتے۔ لیکن جناب قبلہ و کعبہ وقار الملک بہادر مدظلہ کا والا نامہ جو ابھی موصول ہوا ہے ایک ایسی زبردست تحریک ہے جس نے صبر و شکیبائی کے آخری بند توڑ ڈالے اور ہمدرد کو بنیان اور شلوار ہی پہنے خلوت کدے سے دیسے ہی نکل کر برہنہ پا دوڑنا پڑا۔"

جب بیروت سے کافی ٹائپ آ گیا تو "ہمدرد" کی بسم اللہ ہوئی۔ اس وقت "ہمدرد" نے جن الفاظ میں اپنا تعارف کرایا تھا انہیں بھی اختصار کے ساتھ آج پھر دہرائے دیتا ہوں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ "ہمدرد" آج اخباری دنیا میں قدم رکھتا ہے مگر سہما ہوا کہ ننگِ وجود نہ ثابت ہو۔ عالمِ فکر سے عالمِ ذکر میں آتے آتے کم و بیش دو سال لگے تھے تو عالمِ ذکر سے عالمِ عمل میں آتے آتے ایک سال سے کچھ زیادہ ہی لگ گیا۔ جو حضرات "ہمدرد" کے جلوس کا تماشہ دیکھنے لبِ بام آ گئے تھے۔ انہوں نے نقیبِ ہمدرد کی آواز بھی سنی ہو گی۔ اور انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ "ہمدرد" کی سواری اس قدر دیر میں کیوں آئی۔ کہ آہستہ خرام کے حکم پر عمل کرتے کرتے اس نے اپنے تماشائیوں کو بھلا کر خرام کہنے پر مجبور کر دیا۔ اسی داستان گو نے دوسری اور تیسری شب کی کہانی میں ساری آپ بیتی سرگزشت سنا دی ہے اس لیے از سرِ نو معذرت غیر ضروری ہو گئی ہے۔ اگر ہماری مجبوریوں کا یقین نہ آتا ہو تو ایک بار خود سوچ لیجئے کہ اس نو وارد کے اس قدر انتظار دکھانے میں صرف شماتتِ ہمسایہ ہی نہ تھی بلکہ نقصانِ سرمایہ کو بھی بہت کچھ دخل تھا۔ مگر کارفرمائے حقیقی کی اس میں بھی کوئی مصلحت ہو گی۔ سلطنت عثمانیہ پر جو طوفان نازل ہوا ہے۔ اس نے اخباری دنیا میں بالعموم ابر نیساں کا کام دیا۔ اور بہت سی کھیتیاں آج اسی کے طفیل لہلہا رہی ہیں۔

ممکن ہے کہ ہماری خشک سالی ہی ہمارے لیے باعثِ رحمت ہو اور شاعر کا وعدہ پورا ہو کہ ؎

آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

اخباروں کی گرم بازاری عاشق کے گھر کی رونق سے کسی طرح کم نہیں، دونوں ایک ہنگامے پر موقوف ہوں اور دونوں کے لئے ع

نوحۂ غم ہی سہی، نغمۂ شادی نہ سہی

چونکہ "ہمدرد" کے نکلنے تک جنگِ بلقان کا خاتمہ ہو چکا تھا اور چونکہ کم از کم مسلم اخبارات کے خریدار زیادہ تر جنگ و جدال اور حرب و قتال کی ہی خبروں سے محظوظ ہوا کرتے ہیں۔ ان کا فروخت کرنے والا صحیح طور پر شاعر کی طرح کہہ سکتا ہے کہ؏

من قماش فروشم دلِ صد پارۂ خویشم!

اس لیے اس وقت "ہمدرد" کا جاری ہونا ایک منڈی کے بازار میں سودا کرنے کا مترادف تھا۔ اس لیے میں نے لکھا تھا۔ کہ "ہمدرد" نوحۂ غم سے بھی گھر کی رونق نہیں بڑھا سکتا۔ اس سے جہاں ہر شخص کو ایک بدیہی نقصان نظر آتا ہے ہمیں ایک بیش بہا فائدے کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یعنی قومی ماتم پر تہذیب کی تحسین و آفرین کا شبہ اور سینہ کوبی پر تالیوں کا دھوکہ نہیں ہو سکتا۔ جو حضرات قومی اقبال کے جنازے کو کاندھا دینے آئے تھے انہیں ہم اپنا تختِ رواں بردار نہیں بنا سکتے۔ اس لیے تشنہ لب جب کبھی مست ہو سکیں گے تو کہہ سکیں گے کہ:

مست ہیں، جس مے سے ہم اس مے کا پیمانہ نہیں
منتِ ساقی نہیں غوغائے مے خانہ نہیں

یہ آج سے سولہ برس پہلے کی عبارت ہے۔ قارئین کرام غور فرمائیں اور کہیں کہ کیا یہ "ہمدرد" کے لئے ایک صحیح پیشین گوئی نہ تھی۔ بیروت کا نسخ کا ٹائپ مسلمانانِ ہند میں مقبول نہ ہو سکا تو سال بھر نقصان اٹھا کر میں نے لیتھو کی روشنائی اور پتھر کی طرف رجعتِ قہقری کر کے دورِ جدید سے دورِ حجر کی طرف عود کیا۔ لیتھو کا خطِ نستعلیق بے شک مقبول ہوا۔ اور روزانہ اشاعت بڑھنے لگی۔ اس کے مہینے دو مہینے کے بعد جنگِ عمومی کا افتتاح ہوا اور اب تو "ہمدرد" کی اشاعت ایک سال کے اندر دس ہزار تک پہنچ گئی مگر ۱۵ مئی ۱۹۱۵ء میں اس کا مالک اور اڈیٹر معہ اپنے بڑے بھائی مولانا شوکت علی کے نظر بند ہو گیا۔ اور اس کے ایک ماہ بعد "ہمدرد" پر ایک ایسا سنسر بٹھا دیا گیا۔ جس کا فرضِ منصبی بظاہر یہ قرار دیا گیا تھا۔ کہ وہ جلد سے جلد "ہمدرد" کو بند کر دے "کامریڈ" ترکوں سے جنگ شروع ہوتے ہی پریس کی ضمانت ضبط کئے جانے پر نومبر ۱۹۱۴ء سے بند ہو چکا تھا۔ اور از سرِ نو ضمانت دی گئی تھی بند ہو گیا، ایک عرصے تک اس امید پر کہ نظر بندی سے رہائی مل جائے گی، میں کوچہ چیلان کے اس مکان کا جس میں پریس بھی تھا، اخباروں کا دفتر بھی تھا اور میں خود بھی رہتا تھا کرایہ برداشت کرتا رہا۔ حالانکہ کرایہ اس وقت ایک سو پینتیس روپے ماہوار تھا۔ اور مجھے حکومت کی طرف سے اپنے اور اپنے بال بچوں اور دیگر متعلقین کے ماہواری مصارف کے لیے دو سو پچاس روپے کی گراں قدر رقم ملا کرتی تھی۔ مئی ۱۹۱۵ء سے نظر بندی، قید، رہائی، تحفظ خلافت کے لیے سفرِ یورپ، ترکِ تعاون اور سارے ہندوستان کا گشت اور پھر ستمبر ۱۹۲۱ء میں گرفتاری، کراچی کا مقدمہ اور دوبارہ قید اور بالآخر اگست ۱۹۲۳ء کے اواخر میں رہائی کی داستان دہرانا فضول ہے۔ ہندوستان میں لوگوں کا حافظہ بظاہر زیادہ قوی نہیں۔ لیکن اتنا تو آج بھی شاید ملک و ملت کو یاد ہو کہ جب قید و بند سے دوبارہ رہائی ملی تو چند ماہ تک پھر سارے ملک میں گشت لگائے۔ مگر اب ملک و ملت کی حالت بدل چکی تھی۔ آج "ہمدرد" کے بعض ہم عصر جو ان حضرات کی ملک پروری اور مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی اور رفاقت کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ اس وقت یہی ہم عصر اُن کی سنگھٹنی ذہنیت اور شدھی میں ان کی سرگرمی سے نالاں تھے

اور اس کے جواب میں لفظی تنظیم اور زبانی تبلیغ کے شور مچا رہے تھے۔ اس افراط و تفریط سے پریشان ہو کر سوچا کہ پھر "کمرید" اور "ہمدرد" کو زندہ کیا جائے۔ اور اس "دوج" کی جوڑی نے ایک بار اور اکتوبر، نومبر ۱۹۲۴ء میں جنم لیا۔ ہمدرد کی دوسری بسم اللہ کرتے وقت میں نے عرض کیا تھا کہ میں تو ایک گدائے بے نوا ہوں، بے سروسامانی میرا سامان ہے۔ میرے پاس اگر کوئی پونجی ہے تو صرف اس قدر کہ دل میں چند ارادے اور دماغ میں چند افکار ہیں جن کی تکمیل کا بھروسہ خداوند کریم کی توفیق فرمائی پر ہے۔ اس کے سوا نہ کوئی ساز رکھتا ہوں نہ کوئی سامان۔ اس پونجی کو لے کر بازارِ جہاں میں نکلا ہوں۔ ان چند ارادوں اور چند افکار کے سوا میرے ہاتھ خالی ہیں۔ نہ تو میری جیب میں دولت ہے۔ جس کا مجھے غرور ہو اور نہ میرے پاس طاقت ہے۔ جس کا مجھے گھمنڈ ہو۔ نہ اعوان و انصار کی کوئی فوج ہے جس پر بھروسہ ہو۔ اس لیے میں نے اپنے کارساز سے التجا کی تھی کہ میں پرانی آرزوؤں اور تمناؤں کو لے کر صرف تیری نصرت فرمائی پر بھروسہ کر کے پھر اٹھتا ہوں میری مدد فرما کہ ان کی تکمیل کر سکوں اور جو ارادے اور خواہشیں میرے دل میں مدت سے پرورش پا رہی ہیں، ان کی تکمیل کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ عطا فرما کہ آگے قدم بڑھا سکوں۔

میں ایک بار پہلے بھی عرض کر چکا ہوں اور آج "ہمدرد" کو بند کرتے ہوئے پھر عرض کرتا ہوں۔ کہ میں اپنے کارساز سے شکوہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ اور شکر ہی میرا شعار ہونا چاہیئے۔ بلاشبہ میری نیت ہی میں کچھ نہ کچھ کھوٹ ہوگی کہ اس وقت تک میری دعا قبول نہ ہوئی۔ اور جن چیزوں کو مجھے اپنی پرانی آرزوؤں اور تمناؤں کی تکمیل کے لئے ضرورت تھی وہ عطا نہ ہوئی۔ "ہمدرد" کی مالی حالت کا رونا بار بار رویا جا چکا ہے۔ ۳۔ جون ۱۹۲۵ء کو میں نے "ہمدرد" کے ہمدردوں سے خطاب کے عنوان سے اس کی ساری سرگزشت "ہمدرد" میں شائع کر دی تھی۔ اس خطاب کا جو جواب ملا تھا۔ اس کا پتہ قارئین کرام کو اس مضمون سے چل گیا ہوگا۔ جو حج و زیارت و شرکت مؤتمر عالم اسلام کے لیے جاتے وقت میں نے "کشکول گدائی" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اور جو سالِ گزشتہ سے "ہمدرد" کی اڈیٹری اور پروپرائٹری سے الگ ہوتے وقت میں نے دوبارہ ۱۱ مئی کے پرچے میں شائع کرا دیا تھا جو "ہمدرد" کی عیدی کے عنوان سے ۳۱ مارچ ۱۹۲۷ء کو شائع کیا گیا تھا۔ اس عنوان سے ایک دوسرا مضمون ۱۰۔ اپریل ۱۹۲۷ء کو شائع کیا گیا تھا جس سے قارئین کرام کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ جس نتیجے پر بالآخر ۱۹۲۸ء میں پہنچا۔ اس پر دراصل ایک سال پہلے ہی پہنچ چکا تھا یعنی صحافت اور گشتی سیاست دونوں سے کنارہ کشی۔ یہ دراصل گوشہ نشینی نہ تھی۔ نہ ترکِ تبلیغ بلکہ مکہ سے ایک ایسے مدینہ کی طرف ہجرت کا مقصد، جہاں مجھے امید تھی کہ کم از کم کچھ لوگ میری بات سننے کے لئے زیادہ آمادگی کا اظہار کریں گے۔ اسی لیے اس عنوان سے ایک تیسرا مضمون ۲۷۔ اپریل ۱۹۲۷ء کو شائع کیا تھا۔ اور ظاہر کر دیا تھا کہ "ہمدرد" کو بند کرنے کے بعد میں کیا کروں گا۔ یہ سب مضمون سالِ گزشتہ یورپ جاتے وقت میں نے شائع کر دیئے تھے۔ ۲۹ فروری ۱۹۲۸ء کو "فسانہ غم دل" کے عنوان سے میں نے گزشتہ دو سال کے خسارے کا مکمل حساب شائع کر دیا تھا۔ اور اس کے بعد جو کچھ اعانت جمہورِ ملت نے کی وہ بھی برابر شائع ہوتی رہی۔ بالآخر ۲۔ مئی ۱۹۲۸ء کو میں نے قارئین کرام کو آج سے ایک بار پہلے بھی الوداع کہی اور ۲۵۔ مئی کو دہلی چھوڑ کر عازم یورپ ہوا۔

اس دن کے بعد آج تک میرا نام "ہمدرد" کے اڈیٹر کی حیثیت سے شائع نہیں کیا گیا اور میرا خیال تھا کہ اب جب کہ

بڑی مشکل سے اس کی پیدا پڑنٹری سے پیچھا چھڑایا تھا جو ایڈیٹری کی شماتت ہمسایہ کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے کہیں زیادہ نقصان مایہ میں بھی مجھے مبتلا کرتی چلی آتی تھی۔ میرا پنڈ ان دونوں پاپوں سے چھوٹ گیا۔ اب مولانا ظفر الملک صاحب نے انتظامی امور اپنے ہاتھ میں لیے۔ تحتے اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی اڈیٹری کے نگران تھے۔ میرے یورپ کے قیام میں اطلاعیں ملتی رہیں کہ مولانا ظفر الملک جس جبر رسی سے کام کر رہے ہیں اور روز بروز اخراجات کم کر رہے ہیں۔ مگر افسوس اس بات کی ایک اطلاع نہ آئی کہ کچھ آمدنی بھی بڑھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب میں ستمبر کو ہندوستان پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ پیہم نقصانات کے باعث "ہمدرد" کو بند کئے دیتے تھے مگر چونکہ میں ۲۲ اکتوبر کو عازم ہندوستان ہو چکا تھا۔ شوکت صاحب اور میرے ایک اور عزیز نے میرے واپس آنے تک نقصان کی ذمہ داری لی اور "ہمدرد" کو جاری رکھا۔ افسوس کہ اس عرصے میں ملک و ملت میں اور بھی انتشار پیدا ہو گیا تھا اور ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

مجھے آتے ہی پٹنہ اور پھر کلکتہ جانا پڑا اور بہار کی مسلم آل پارٹیز اور آل انڈیا خلافت کانفرنسوں کی صدارت کرنا پڑی اور دہلی واپس آ کر بھی آل انڈیا مسلم کانفرنس میں حصہ لینا پڑا۔ اور مسلم لیگ میں مصالحت کرانے کی امید نے تو برما تک سے گھسیٹ بلایا۔ ابتدائے جنوری میں بھی "ہمدرد" کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کیونکہ بعض احباب کا خیال تھا کہ "ہمدرد" بند کرنا کیسا "کامریڈ" کو بھی دوبارہ جاری کرنا چاہیے۔ اور اس بار اسے بھی ایک روزنامے کی حیثیت سے نکلنا چاہیے۔ مجھے آج تک پریس اور اخباروں کے لیے اچھے منیجر نہیں ملے اور غلام حسین مرحوم کے بعد سے تو "کامریڈ" کے لئے کوئی سب اڈیٹر بھی نہ مل سکا، حالانکہ میرے اعزہ اور احباب اچھی طرح جانتے ہیں کہ غلام حسین مرحوم کے نعم البدل نہ سہی معمولی سے معمولی جانشین کے لیے میں کہاں کہاں گھوم آیا ہوں۔ اس لیے میں نے اس تلخ تجربے کے بعد قطعی فیصلہ کر لیا کہ اگر مجھے کوئی آزاد چھوڑے گا تو اس کے اخبار کی اڈیٹری تو قبول کر لوں گا مگر خود کوئی اخبار اب نہ نکالوں گا۔ اور نہ نفع کا طالب ہوں گا اور نہ خسارے کے لیے ذمہ دار۔ جو حالت انتشار آج بھی باقی ہے اس کو دیکھ کر میں مسلمانوں سے بالکل مایوس ہوں کہ یہ کوئی اچھا اخبار نکال سکیں گے اور رفع انتشار کی امید میں مزید انتظار عین حماقت ہے۔

ابتدائے جنوری میں مولانا ظفر الملک صاحب مجھے حسابات سمجھانے دہلی تشریف لائے۔ میں نے خود ہی حسابات تیار کرا رکھے تھے۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ میرے ولایت جاتے ہی باوجود اخراجات میں بے حد کتر بیونت کے آمدنی کے بے حد گر جانے سے خسارہ بڑھنے لگا۔ جون میں اگر دو سو روپے سے اوپر تھا تو جولائی میں چار سو کے قریب پہنچ گیا۔ اگست میں نقصان میں پچاس روپے کی کمی واقع ہوئی۔ تو ستمبر میں پچیس روپے اور بھی بڑھ گئے۔ اور اب سوا چار سو ماہوار کا نقصان ہونے لگا تقریباً یہی حالت میرے زمانے میں تھی۔ کہ اگر میں "ہمدرد" سے اپنے مصارف کے لیے ایک حبہ بھی نہ لیتا۔ تب بھی باقی عملہ کے اور دیگر مصارف کے لیے پانچ سو روپے گھر سے دینے پڑتے۔ اکتوبر، نومبر اور دسمبر کے خسارے کے اعداد میرے پاس نہیں ہیں۔ بلکہ مولانا ظفر الملک ہی کے پاس بتائے جاتے ہیں۔ مگر میرا قیاس ہے کہ یہی تخمینہ ان مہینوں کے متعلق بھی صحیح ہوگا۔ بہر کیف اتنا تو معلوم ہے کہ میری غیر حاضری کے زمانے کے متعلق تین ہزار سے اوپر کی رقم واجب الادا ہے۔ ایسے حساب کا سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا۔ میں

اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا مگر جب دریافت کیا گیا کہ یہ دا جب الادا رقم کس طرح ادا ہوگی تو مجھ سے کہا گیا کہ ہاں اب یہ سوال ہے کہ اسے کون ادا کرے بجز سوائے اس کے کیا عرض کر سکتا تھا کہ یہ سوال کسی سے بھی کیا جائے یقیناً مجھ سے تو نہیں کیا جا سکتا۔ جسے قبول کیا گیا مگر آج تک اس کا ایک حبہ بھی ادا نہیں کیا جا سکا۔ آئندہ کیا ہوگا۔ خدا کو معلوم ہے۔

میرے آنے کے بعد آمدنی کسی قدر بڑھی مگر پھر بھی دو سو روپے سے زیادہ کا خسارہ جنوری میں ہوا۔ فروری اور مارچ کے خسارے تقریباً ڈیڑھ سو روپے ماہوار کے حساب سے ہوئے۔ مگر چونکہ میں اس تمام عرصے میں "ہمدرد" کی خدمت سے بمبئی اور رنگون جانے کے باعث اور یہاں بھی مسلم لیگ کے جھگڑوں میں گھر جانے کے سبب سے محروم رہا۔ اس لیے اپریل کے ان چند دنوں کی صورت صاف بتا رہی ہے کہ خسارہ اور بھی زیادہ ہوگا۔ یاد رہے کہ یہاں سے واپس آنے پر بھی "ہمدرد" سے ایک حبہ اپنے اور اپنے اہل و عیال کے مصارف کے لئے نہیں لیتا۔

اب سوائے اس کے کیا چارہ ہے کہ میں "ہمدرد" کو بند کر دوں۔ اور اس پیہم خسارے کے بارے میں سبکدوشی اختیار کروں۔ میرا ارادہ تھا کہ میں دہلی میں ایک چھوٹے سے مکان میں قیام کرتا اور ہر روز تین گھنٹے یا ہفتے میں دو تین دن کسی کا کام کر کے اتنا پیدا کر لیا کرتا کہ میں اور میرے بال بچے قوت لایموت سے محروم نہ رہیں۔ باقی وقت خود کچھ سیکھتا۔ کچھ اپنی لڑکیوں اور بیوی کو سکھاتا جن کی تعلیم سے میں طوعاً نہیں بلکہ کرہاً اب تک غافل رہا ہوں۔ اور جو وقت بچتا اس میں ایک مفلس نادار شخص کی حیثیت کے مطابق ملک و ملت کا کام کرتا۔ مگر میری غیر حاضری میں میرا بہ حیثیت صدر جمعیت خلافت انتخاب کیا جا چکا ہے اور میں مجبور ہوں کہ امسال اور ملک میں گشت لگاؤں۔ اور جمعیت خلافت کے مقاصد سے مسلمانوں کو آگاہ کروں۔ اور انہیں ہر گاؤں اور ہر شہر کے ہر محلے میں خلافت کمیٹیاں اور بچوں کے لیے ابتدائی اور عمر رسیدہ لوگوں کے لیے شبینہ مدرسے قائم کرنے پر آمادہ کروں۔ اور اس سلسلے میں کل انشاء اللہ پھر برما جاؤں گا۔ اور وسط مئی میں وہاں سے واپسی پر انشاء اللہ مسلمانان جنوبی افریقہ کی دعوت پر وہاں جاؤں گا۔ اور ہندوستان کے مختلف صوبجات میں اور بالخصوص سندھ اور پنجاب میں دورہ کروں گا۔

لیکن جو کام اب میں نے ساری عمر کے لیے اپنے لیے تجویز کر لیا ہے خواہ وہ دہلی میں بیٹھ کر کیا جائے یا کہیں اور جا کر۔ وہ پہلے مسلمانوں میں اور پھر ساری دنیا میں تحریک اسلامی پیدا کرنے اور کفر و الحاد کے اس سیلاب کے مقابلہ کرنے کا ہے جو یورپ سے وطن پرستی اور جنسیت و قومیت کی شکل میں امڈا آ رہا ہے اور جو ترکی اور ایران شام اور عراق ہی نہیں بلکہ افغانستان اور ہندوستان میں بھی نوجوان مسلمانوں کو خدا اور آخرت دونوں سے انکار کی طرف مائل کر رہا ہے۔ اسلام ہرگز حب وطن اور غیر مسلموں کے ساتھ آزادی اور حریت اور بنی نوع انسان کی خدمت میں تعاون کرنے کے برخلاف نہیں اور اس معنی میں ہر مسلم کو ملک پرور اور محب وطن بننا لازمی ہے۔ اور خدا نہ کرے کہ وہ دن آئے کہ مسلمانان ہند اپنی موجودہ غلامی پر راضی ہو جائیں۔ یا پھر اپنے غیر مسلم بھائیوں سے نفرت کو اپنے دلوں میں جاگزین ہونے دیں۔ اور ان کے ساتھ ذرا سی بھی ناانصافی کو روا رکھنے لگیں لیکن کوئی مسلم اس حب وطن اور جنسیت و قومیت کا ہرگز قائل نہیں ہو سکتا جو عرب کو عجم سے، ترک کو تاجک سے یا ہندی کو افغانی سے جدا کرے۔ کان الناس امۃ واحدۃ فبعث اللہ النبیین

مبشرین و منذرین وانزل معھم الکتاب لیحکم بین الناس فی ما اختلفوا فیہ (خداوند کریم نے تمام انسانوں کو ایک ہی قوم بنایا تھا۔ پھر ان میں اپنے انبیاء اس غرض سے مبعوث فرماتے تھے کہ وہ نیکو کاروں کو فلاح دارین کی خوشخبری سنائیں اور بدکاروں کو دنیوی تباہی اور اخروی رسوائی سے ڈرائیں اور اسی لیے ان کے ساتھ صحف سماوی نازل فرماتے تاکہ جن امور میں لوگوں میں اختلاف پیدا ہو گیا تھا ان میں سب کو راہِ راست دکھا کر اس اختلاف کو مٹائیں اور دنیا میں امن و آشتی قائم ہو)

یورپ کے جو نام نہاد سیاست دان اور مدبر اور مغرب کی نام نہاد تہذیب و تمدن کے نام لیوا بنی نوع انسان کو ملکوں، قوموں اور رنگوں میں تقسیم کر کے ایک کو دوسرے کے خلاف ابھار رہے ہیں وہ حقیقتاً ایک شیطانی کام کر رہے ہیں۔ اور اگر وہ کامیاب ہو گئے تو اسلام جو ساری مخلوق کو بلا جبر و اکراہ آپس میں ملا کر دنیا میں امن و سلامتی کا دور دورہ قائم کرنے آیا ہے، سمجھ لو کہ وہ خدانخواستہ ناکام و نامراد رہا۔ اس لیے میں بار بار کہتا ہوں کہ خدا نے انسان کو بنایا اور شیطان نے قوم کو بنایا۔ یہی وہ نظریہ اسلامی ہے۔ جس کی نشر و تبلیغ ہر مسلمان کا فرض ہے تاکہ دنیا میں جنگ و جدال کا خاتمہ ہو۔ اور ساری خلقت بلاکسی تفریق حسب و نسب، مرز و بوم اور زبان و رنگ کے دینِ فطرت پر چلنے لگے۔ اور سارے عالم میں نورِ اسلام پھیل جائے۔ وہ نور جس کی تعریف میں سورۃ النور میں اسلام کے درخت کو اس زیتون کے نام سے پکارا گیا ہے۔ جو لا شرقیۃ ولا غربیۃ (نہ صرف مشرقی نہ صرف مغربی) ہے۔ جس نبی کو رب المشرقین و رب المغربین نے رحمت اللعالمین بنا کر کافۃ الناس کے لیے بھیجا تھا۔ اس کا دین انسانی سرشت ہے۔ فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللّٰہ۔ وہی حضرت آدم کا دین تھا۔ وہی ان کے بعد سب انبیائے کرام کا دین تھا۔ وہی رسول اکرم صلعم کا دین تھا اور تمام آج ہر مرد و زن کا دین ہے خواہ وہ کسی مسلم کے گھر پیدا ہوا ہو یا کافر کے گھر۔ لوگوں نے دینِ فطرت کو چھوڑ کر قوموں اور ملکوں کے جدا گانہ دین بنائے ہیں اور جدا گانہ نام نہاد تہذیبیں گھڑلی ہیں۔ اور کل حزب بما لدیھم فرحون۔ ہر ایک اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہوئے اپنی ڈفلی پر اپنا ہی راگ بجا رہا ہے۔ ہمیں عمر بھر کی اس فکرِ جنسیت کو دنیا سے مٹانا اور تمام دنیا کو ایک کر کے جنگ و جدل کی جگہ اسلام اور سلامتی کو پھیلانا ہے۔ افسوس ہے کہ میں اب تک اس کام میں بھی ناکام رہا اور ع

یک الفتِ بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

لیکن اب تو اسے گریباں سمجھ چکا ہوں۔ پھر دستِ وحشت کو کس طرح روک سکتا ہوں۔ کہ اسے چاک نہ کرے۔ صیقلِ آئینہ کی کمی اور بیشی خدا کے اختیار میں ہے۔ قارئین ہمدرد سے اب رخصت ہوتا ہوں اور ان سے التجا ہے کہ میرے آئینہ قلب کی صیقل اور دستِ وحشت کی کامیابی کے لیے دعا فرمائیں کہ یہ گریباں ایک نہ ایک دن چاک ہی ہو کر رہے۔ برما اور جنوبی افریقہ کی دونوں پر وہاں جا رہا ہوں۔ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اس دعوت و تبلیغ میں میری کس حد تک امداد فرمائیں گے واپسی پر معلوم ہو گا۔ کہ مزید صحرا نوردی اختیار کرنا چاہیے یا غارِ حرا میں خلوت، جمہور کی اصلاح کی کوشش سے بھلا کوئی کس طرح مستغنی ہو سکتا ہے مگر باوجود اس کے آج بھی اس فقیر بے نوا کا وہی قول ہے کہ ؎

مست ہیں جس مے سے ہم اس مے کا پیمانہ نہیں
منتِ ساقی نہیں، غوغائے مے خانہ نہیں

میرے لیے ساقی کوثر کافی ہے۔ اسی سے التجا ہے کہ ؎

جو دو سخائے ساقی کوثر کی دھوم ہے
اک جام ہم کو بھی جو عطا ہو تو جانیے (جوہر)

اب میں قارئین "ہمدرد" کو الوداع کہتا ہوں۔ میں نے جس کسی کا قصور کیا ہے اس سے استدعا ہے کہ وہ مجھے معاف کرے نہیں تو اسے اختیار ہے کہ جو جی چاہے مجھے کہہ لے۔ مگر میرے لیے دعا ضرور کرے کہ خدا مجھے حق گوئی، حق نگاری اور حق پرستی کی توفیق عطا فرمائے اور میرے بے شمار گناہوں کو معاف کرے۔

افوض امری الی اللّٰہ علیہ توکلت والیہ اُنیب

ٹرکش میڈیکل مشن

پہلی جنگ عظیم سے پہلے جب دولِ مغرب نے ترکوں کو یورپ سے جلا وطن کر دینے کا منصوبہ بنایا تھا اور ان کی ماتحت بلقانی ریاستیں ان کے خلاف اعلانِ جنگ کر رہی تھیں، یونان نے انگریزوں کی شہ پاکر سرزمینِ ترکیہ کو مسلمانوں کے خون سے لالہ زار بنا دیا تھا ترک مٹ رہے تھے، کٹ رہے تھے، مر رہے تھے — لیکن لڑ رہے تھے۔

اس وقت محمد علی نے "کامریڈ" میں ایک سلسلۂ مقالات شروع کیا، ترکی میں میڈیکل مشن بھیجنے کے لیے سرمایہ کی اپیل کی، اور جب سرمایہ فراہم ہو گیا تو ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں ایک وفد روانہ ہو گیا جس کے ارکان میں خلیق الزمان، شعیب قریشی، عبدالرحمٰن صدیقی، عبدالعزیز انصاری — اور عبدالرحمٰن پشاوری وغیرہ تھے۔

اگلے صفحات ٹرکش میڈیکل مشن کی گم شدہ تاریخ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

★

ڈاکٹر انصاری کا خط

قسطنطنیہ ۳۰ مئی

چہار شنبہ ۱۸ جون۔ سنہ ۱۹۱۳ء۔

علامت ہے اور ڈاکٹر اسد و پاشا کی کوششوں کا مشکور ہونا چاہیئے۔ لہذا ان کی بدولت گورنمنٹ نے سرکاری طور پر اس سوسائٹی نوآبادیان مہاجرین مقدونیہ کو منظور کر لیا۔ چار شخصوں کی کمیٹی بن گئی ہے جس میں میں اور مسٹر ظفر علی خاں بھی شامل ہیں ہم سب آئندہ جمعہ کو اناطولیہ جاتے ہیں جہاں ہم نوآبادیوں کے لئے ایک ایسی مناسب جگہ تجویز کریں گے جہاں زراعت حفظان صحت اور افادیت تجارتی کا بھی لحاظ رہ سکے۔ مدینہ یونیورسٹی کا نصاب تیار کرنے کے لئے ہم انگلستان، مصر اور ہندوستان سے مجوزہ نصاب کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس عرصہ میں کانسٹی ٹیوشن کمیٹی بھی بہت کچھ ضروری کام کرنے میں مشغول ہے۔ ابتدائی نصاب سائنس اور دینیات کے صیغوں کے متعلق ہم نے تیار بھی کیا ہے۔ سب سے زیادہ دشوار کام ایسے پروفیسروں اور اسسٹنٹ پروفیسروں کا مہیا کرنا ہوگا جو عربی میں سائنس پڑھا سکیں۔ ایک دفعہ یونیورسٹی جاری ہو جائے خواہ کچھ زیادہ مزین انتظامی پر نہ ہو پھر تو وہ کامیاب ہو ہی رہے گی۔ مجھے یقین ہے۔ کہ ہر مسلمان اس یونیورسٹی کا خیر مقدم کرے گا۔ کیونکہ اسلامی دنیا میں یہ ایک عظیم الشان اتحاد ہوگا۔ بعض لوگوں کے خطوط میرے پاس آرہے ہیں۔ کہ ہمارے لئے کچھ ترکی یتیموں کو ہندوستان لیتے آنا۔ مجھے کچھ شک نہیں ہے۔ کہ لوگوں کی یہ خواہش ان شریفانہ خیال پر مبنی ہے۔ کہ ان غریب خانماں برباد یتیموں کی پرورش کریں۔ لیکن ان کی خواہش کا پورا کرنا ناممکن ہے۔ کہ یہ تمام یتیم سرکاری یتیم خانوں میں بھیج دیئے جاتے ہیں۔ اور اس لئے نہیں مل سکتے۔ میں نے یہ طے کر لیا ہے کہ دونوں شفاخانے مئی کے آخر میں بند کر دیئے جائیں۔ اور سب عملہ سوائے ان لوگوں کو جو نوآبادیوں کے کام کے لئے یہاں رہنا چاہیں۔ وسط جون میں یہاں سے روانہ ہو جائیں۔

ڈاکٹر انصاری کا خط ترکی سے

جمعہ ۶ جون ۱۹۱۳ء

اس ہفتہ ڈاکٹر انصاری کا اور بھی دلچسپ خط موصول ہوا ہے جس کے ساتھ چند بہت ضروری کاغذات بھی ہیں۔ جو آئندہ شائع کئے جائیں گے۔

ٹرکی میں کبھی کبھی غیر متوقع واقعات بھی پیش آجاتے ہیں، مسلم بنک اور کواپریٹو سوسائٹی کی تجویز عملی صورت پکڑتی جاتی ہے۔ اور کمیٹی کی اسکیم کو قابل عمل بناتی جاتی ہے۔ انجمن مدافعہ ملیہ جو ترکی افواج کی رسد رسانی کا بہت زیادہ کام کر رہی ہے۔ اور دوسرے معاملات میں بھی بہت کچھ کر رہی ہے۔ وہ عنقریب ۲۵ ہزار پونڈ مسلم بنک میں حصص خریدنے کے لئے جمع کروانے والی ہے۔ اس فیاضانہ عطیہ کی بدولت کواپریٹو سوسائٹی عملی صورت میں آگئی۔ اب صرف ۲۵۰۰۰ پونڈ اور جمع ہو جائیں تو سوسائٹی جاری ہو سکتی ہے۔ سوسائٹی کے قواعد تیار ہو جانے کے بعد فوراً "سلطانی ارادہ" شائع ہو جائے گا۔ اس کے بعد پراسپکٹس تیار کر کے مختلف اسلامی ملکوں کو بھیجے جائیں گے۔ تاکہ وہاں حصص فروخت ہوں تو خیال کر سکتے ہو کہ کواپریٹو سوسائٹی اور بنک کے اثرات کس قدر وسیع ہوں گے۔ اور اس کی وجہ سے ٹرکی اور دیگر اسلامی ممالک کی مردہ صنعت و حرفت کس قدر ترقی کرے گی۔ دوسرا ضروری سوال مدینہ یونیورسٹی کا ہے۔ مرکزی کمیٹی کا ایک جلسہ اس ہفتہ ہوا تھا جس میں اکثر وزراء ٹرکی کے بہت سے اصحاب اس میں شریک تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ترکوں کو کس قدر دلچسپی ہے۔ وزیر اوقات نے کسی قدر دلچسپی ظاہر کی اور ان کی تو یہ خواہش تھی کہ جس قدر جلد ہو سکے یونیورسٹی قائم ہو جائے۔ نظام نامہ پر (جس کی نقل تمہیں بھیجتا ہوں) بحث ہوئی اور منظور کر لیا گیا۔ کنسٹی ٹیوشن کمیٹی کے ممبر مقرر کئے گئے۔ جس میں میں اور مسٹر ظفر علی خاں بھی شامل ہیں۔ شیخ عبدالعزیز شاویش جو اس تحریک کے روح رواں ہیں۔ غالباً یونیورسٹی کے پرنسپل مقرر ہوں گے۔ ہم تمہیں تار دے چکے ہیں۔ اور ہمیں امید ہے کہ تم نصاب و نظام یونیورسٹی کی ترتیب میں پوری محنت کرو گے۔ اور کوئی بات اٹھا نہ رکھو گے۔ جو علی گڑھ یونیورسٹی کی طرز پر ہونا چاہئے۔ مقامی ضروریات کا خاص خیال رکھا جائے۔ اور یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ عربی زبان میں تعلیم دی جائے گی۔ مہربانی کر کے مولانا شبلی نعمانی، ڈاکٹر اقبال، میجر بلگرامی، مولوی حمید الدین صاحب اور جن اصحاب کو تم مناسب سمجھو سب سے مشورہ کر لو۔ شیخ شاویش صاحب نے لنڈن اور مصر کے بعض اصحاب سے بھی درخواست کی ہے کہ وہ مسودہ نصاب تیار کریں۔ ان تینوں مسودوں کے آجانے پر کمیٹی جو نصاب سے زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کو منتخب کر کے اس کی بنا پر خود ایک نصاب بنائے گی۔ ہندی عثمانی انجمن نو آبادیات کے دو جلسے اور ہو چکے ہیں۔ اور قواعد کا ایک مسودہ تیار کر لیا گیا ہے۔ جو وزیر داخلہ کی منظوری کے لئے پیش کیا جائے گا۔

حاجی عادل نے ہمیں اناطولیہ میں زمینوں کی ایک فہرست دی ہے جو فی الحال حکومت کے پاس ہیں اور جنہیں وہ نو آبادیوں کے لئے دے گی۔ انگورا میں ریلوے کے قریب ۲۵ ہزار ایکڑ زمین مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ اورنہ میں ایک بہت ہی سیراب قطعہ

میں ۴۵ ہزار ایکڑ زمین دستیاب ہوسکتی ہے۔ لیکن یہاں کی آب و ہوا زیادہ گرم ہے اور مقدونیہ سے آئے ہوئے مہاجرین کو موافق نہیں آئے گی۔ بروسہ اور قونیہ کے قریب بھی بیس اور پچیس ہزار ایکڑ کے درمیان زمین مل سکتی ہے۔ اناطولیہ میں دورہ کرنے سے پیشتر ہم صرف سوسائٹی کے قواعد کی وزیر داخلہ سے باقاعدہ منظوری ملنے کے منتظر ہیں۔ امید ہے کہ ہمیں ایک ہفتہ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں تم کو اپنے مشن کے ان ممبروں کے نام بتا چکا ہوں۔ جو کام کی نگہداشت کرنے کی غرض سے وسط ستمبر تک قیام کرنے کے لئے تیار ہیں۔ لیکن تمہیں اب قابل آدمیوں کی تلاش میں رہنا چاہئے۔ جو یہاں اگست کے آغاز میں پہنچ سکیں تاکہ جب پرانے ممبر سبکدوش ہوں تو نئے آدمیوں کو کام میں کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہو۔ بسیم عمر پاشا کو دیہات اور جھونپڑیوں کا عام نقشہ تیار کرنے کے واسطے ایک ماہر فن دستیاب ہو گیا ہے۔ ہر ایک گاؤں سو مکانات۔ ایک مسجد، ایک مدرسہ، ایک ہسپتال، ایک دھوبی خانہ اور ایک ایسے مدرسہ پر مشتمل ہوگا۔ جہاں فن زراعت کی عملی تعلیم دی جایا کرے گی۔ ہر مکان دو منزلہ ہوگا۔ پہلی منزل میں باورچی خانہ کھانے کا کمرہ، گودام غسل خانہ، اور پاخانہ ہوگا۔ احاطہ میں مویشیوں کے لئے اور فصل کے غلہ کے لئے ایک چھپر علیحدہ ڈالا جائے گا۔ جس وقت کہ گورنمنٹ مختلف ٹھیکہ داروں کے تخمینوں کا ملاحظہ کرنے کی منظوری دے دے گی تو میں ان نقشوں کو تمہارے پاس بھیجدوں گا۔ چونکہ ہسپتال میں صرف ۳۰ مریض رہ گئے ہیں اور صلح کے آثار اب کی مرتبہ امید افزا ہیں۔ اس لئے میں نے ہسپتال کو بند کردینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پچاس بستروں کا سامان تو میں ہندوستان ارسال کردوں گا اور باقی کو عثمانی ہلال احمر کے گودام میں داخل کردوں گا۔ ممبروں کو اب چناق قلعہ بھیج دیا جائے گا۔ کیونکہ وہاں ابھی ریضوں کی کافی تعداد موجود ہے۔ اس کے علاوہ باہر کے مریض بہت آتے ہیں۔ جن کی تعداد میں اضافہ ہوجاتا ہے تو آبادیوں، ہاسکیم، مدینہ یونیورسٹی اور مسلم بنک اور کواپریٹو سوسائٹی کی وجہ سے کام کی اس قدر کثرت ہے کہ میں مسٹر کاظم حسین کی چٹھی کا جواب نہیں دے سکا۔ جو گذشتہ ہفتہ کے کامریڈ میں چھپا ہے۔

مگر مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوا ہے کہ میرے بیانات کو غلط پیرایہ میں سمجھا گیا ہے۔ اور ان کے متعلق ایسی ایسی باتیں تصور کرلی گئی ہیں جو کسی ایسے آدمی کے دماغ میں بھی نہیں آسکتیں۔ جو دل میں خواہشمند ہے کہ اس کا پیشہ بدنامی سے محفوظ رہے مشن کے حسابات بیباق کرنے کے لئے میں ۱۵ ہزار روپیہ کے واسطے ایک تار بھیج رہا ہوں۔ ہلال احمر نے مریضوں کے سامان خوراک پہنچانے اور ہمارے ہسپتال کے لئے ضروری اشیاء خرید کرنے کے عوض میں ۵۰۰، ترکی پونڈ کا حساب بھیجا ہے۔ ہمارے ذمہ ہلال احمر کی کل رقم بھی اتنی ہی ہے جس کے ادا کرنے کے بعد ہم سوسائٹی کے مالی قرضہ سے بالکل سبکدوش ہوجائیں گے۔

قسطنطنیہ سے ایک خط

یک شنبہ ۱۰ر جون ۱۹۱۳ء

ہم ذیل میں حافظ محمد یوسف صاحب انصاری ممبر آل انڈیا میڈیکل مشن کا ایک خط درج کرتے ہیں۔ جو انہوں نے اپنے ایک عزیز کی وساطت سے ہمیں بھیجا ہے۔

ہعدیہ (عمرلی) خطوط مدافعہ چنانچہ ۱۳ر مئی ۱۹۱۳ء

دو تین ہفتہ سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی کہ جس سے کے لئے بڑا خط لکھا جا سکے۔ نیز مشن کا کام عموماً اور عمرلی کا ہسپتال خصوصاً عنقریب بند کر دیا جائے گا۔ اکثر وقت اس کی ادھیڑ بن میں لگ جاتا ہے اس لئے فرصت بھی نہیں ہوتی۔ لیکن یہاں کے متعلق چند غلط افواہیں مشہور کی جا رہی ہیں جن سے مسلمانان ہند کو صدمہ پہنچا ہے۔ اس کو دیکھ کر جی چاہا کہ مختصر صحیح حالات سے اس کی تردید کروں۔ قدیم جواہرات و تاج وغیرہ کی فروخت کی افواہ ہے وہ محض غلط ہے۔ کہ میں پچھلے ہفتہ خود اس مکان میں جہاں جواہرات و قدیم اشیاء رکھی ہیں شیخ عبد العزیز کے ہمراہ گیا۔ ان سے دریافت کیا اور ان کی معرفت تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ صرف وہ اشیاء فروخت کی گئی تھیں جو سابق سلطان عبد الحمید خاں نے پبلک کے روپیہ سے خرید کی تھیں۔ اور وہ بھی اب نہیں، عرصہ ہوا۔ اس کے سوا تمام اشیاء بدستور ہیں۔ یہ افواہیں یورپ کا معمولی کرشمہ ہیں۔ اس لغو بیانی کا ماحصل یہ ہے کہ مسلمانانِ عالم میں ترکوں کی طرف سے سوءِ ظنی اور بددلی پھیل جائے۔ اور برائے نام مسلمانوں میں جو ارتباط ہے یہ بھی نہ رہے، رہا سہا شیرازہ بھی بکھر جائے۔ چنانچہ وہ اپنے اس مدعا میں برابر کامیاب ہو رہے ہیں۔ اور مسلمان مسلسل قعر مذلت میں چلے جا رہے ہیں۔ اور ہوش نہیں آتا۔ یہ بالکل غلط ہے کہ انور بے اور احمد عزت پاشا میں مخالفت ہے۔ غلط ہی نہیں بلکہ ناممکن۔ کیونکہ میں دونوں سے متواتر ملا ہوں۔ اور دونوں کی حالت سے بخوبی واقف ہوں۔ ایسے لوگ اگر مسلمانوں میں زیادہ ہوں تو نکبت ہی کیوں رہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ جب انور بے گیلی پولی میں تھے تو میجر فتحی بے (جو پہلے طرابلس میں کمانڈر تھے) یہاں بھی انور بے کے افسر تھے۔ انہوں نے ایک دن غصہ میں یہ فرمایا تھا کہ باب عالی کے سامنے تو بہت کچھ کر دکھاتے ہو بلغاریوں کے مقابلہ میں کچھ کر کے دکھاؤ انور بے خاموش ہو گئے یہ خاموشی بجز اس کے نہ تھی کہ وہ عادتاً خاموش ہیں۔ پس ایسی ذرا سی بات کو پھول پھل لگا دیا گیا۔ اغیار کو آستانہ میں اراضی دی جانے کی خبر بھی قطعاً غلط ہے۔ البتہ ایک پرانی فوجی بارک تھی جس کا معاملہ کامل پاشا اپنی وزارت کے زمانہ میں طے کر چکا تھا۔ وہ کریسٹون کمپنی کے تصرف میں ہے۔ آگے اس کے سوا سب غلط ہے۔

درّۂ دانیال سے ایک خط

۱۴؍ جون ۱۹۱۳ء

قاضی بشیر الدین صاحب ممبر آل انڈیا میڈیکل مشن ۱۳؍ مئی کو درۂ دانیال سے ہم کو لکھتے ہیں :۔

ہم بدستور کام کر رہے ہیں۔ لیکن روزانہ مسلسل کام کرنے نے ہم سب کی تندرستیوں پر بہت اثر کیا ہے۔ چنانچہ سب کے سب یکے بعد دیگرے بیمار پڑ چکے ہیں۔ مگر تین چار دن میں جب ذرا اچھے ہو جاتے ہیں تو پھر کام کرنے لگتے ہیں۔ میں نے سنا ہے مشن اوائل جون میں روانہ ہو جائے گا۔ ۲۶؍ جون کو غالباً سویز سے سب لوگ اسٹیمر پر سوار ہوں گے۔ اس وقت تک غالباً ہمارے مریضوں کی تعداد دو ہزار ہو جائے گی جس میں ہسپتال میں رہنے والے مریض اور باہر کے مریض دونوں شامل ہوں گے۔ ارمینیا کا معاملہ اب معرض بحث میں آ رہا ہے۔ اگر یورپ نے اس کی معاونت کی تو یقیناً ارمینیا ترکوں کو دشواریوں کا باعث ہو گی۔ با اثر زمینداروں کا ایک گروہ محمد شوکت پاشا کے پاس اصلاحات کا دعویٰ کرنے کے لئے گیا تھا۔ اب تک معلوم نہیں کہ کیا جواب دیا گیا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی عزت اور عافیت کی حفاظت چاہتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ فوجیں جو جنگ سے لوٹیں گی ان تمام مصائب کا جو اتحادیوں کی بدولت ان کو اٹھانے پڑے ہیں ہم سے انتقام لیں گے۔ ترکی کی موجودہ حالت کے متعلق میرا خیال تو یہ ہے کہ ترکوں نے بلا شک شکست فاش کھائی۔ اتحادی ان پر ہر طرح سے سبقت لے گئے۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں مثلاً عبد اللہ پاشا جنہوں نے جنگ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ترکی یونانیوں سے بھی لڑنے کے قابل نہیں ہے۔ میدان جنگ میں بھی ان کے پاس بہت کم افسر ایسے تھے جن کی جنگی قابلیت اچھی کہی جا سکے۔ سپاہی ادھر ادھر جمع کر دئے گئے تھے۔ اور ان کو وردیاں پہنا دی گئی تھیں۔ لیکن اس زمانہ کی جنگ میں محض جسمانی طاقت سے کام نہیں چلتا۔ قطعاً یقین ہے کہ ترک نہایت شجاع اور محب وطن ہیں۔ لیکن کیا ان کی بہادری ان کے دماغ کی کھوٹ کے بدلہ میں کام آ سکتی ہے؟ مجھے امید ہے کہ ترک اس صاف گوئی کو معاف کریں گے۔ جو ایک ایسے شخص کی زبان سے ادا ہو رہی ہے جو ان سے محبت کرتا ہے۔ اور ان کا ثنا خواں ہے۔ اتحادیوں کے لئے تو ابتدا سے آخر تک تمام فتوحات نہایت آسان ثابت ہوئیں۔ ان شکستوں کا اثر ہے کہ ترک سست پڑ گئے۔ معمولی آدمی یہ نہیں جانتا کہ اس کے ملک کو کیوں شکست ہوئی۔ یہاں تک کہ لفٹیننٹ اور سب لفٹیننٹ جس نے سال بھر برابر دن میں دو دفعہ اپنے سپاہیوں کو ڈرل کرائی اور جو کچھ بوسیدہ فوجی معلومات اسے حاصل تھے وہ سب ان کو بتائے۔ پھر بھی اس کے ملک کو شکست ہوئی۔ اس لئے اب اس کو کوئی چارہ باقی نہیں رہتا۔ سوائے اس کے کہ تقدیر الٰہی پر صبر و شکر کرے۔ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ سپاہیوں پر اس شکست کا بہت برا اثر پڑا ہے۔ اگر ہم اس واقعہ کو قبول نہ کریں تب بھی سوائے اپنے کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ ایک کمیشن مقرر کیا گیا ہے۔ تاکہ وہ اناطولیہ جائے اور رپورٹ کرے کہ وہاں کس طرح اصلاحات کی جا سکتی ہیں۔ میرے خیال میں اس تجویز کو کامیاب ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اب ترکوں کو اور کرنا ہی کیا ہے۔ اور اب سوائے اس حصہ کے اور ملک ہی کونسا رہ گیا ہے جس کا انتظام کیا جائے یا جس سے آمدنی ہو۔ معمولی ترک افسروں اور "دیتلاری" کو برا بھلا کہتا ہے' افسر پاشا کو برا بھلا کہتے ہیں' اور پاشا گورنمنٹ پر الزام رکھتے ہیں گورنمنٹ جیسا کہ چاہئے' عبد الحمید خاں اور ان کی ریہا برس کی بدانتظامی کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

تعلیم کی حالت یہ ہے کہ یہاں عورتوں میں ہندوستان کے مقابلہ میں تعلیم کا زیادہ چرچا ہے۔ بہت سی لڑکیاں فرنچ، جرمن اور انگریزی زبانیں بول سکتی ہیں اور حفظانِ صحت اور خانہ داری کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات رکھتی ہیں۔ لیکن مردوں کی تعلیم میں ہندوستان ترکی سے کم نہیں ہے۔ پھر بھی اصل یہ ہے کہ دونوں کا مقابلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ اس لئے کہ ہندوستان میں ہم طفیلیان کی زندگی بسر کرتے ہیں اور ہماری کمزوریاں پوشیدہ ہیں اور اس وقت تک ظاہر نہیں ہو سکتیں جب تک کہ ہمیں خود اپنے پاؤں پر کھڑا نہ کر دیا جائے۔

قاضی بشیر الدین صاحب نے یہ بھی لکھا کہ حسن رضا پاشا کی طرح نیازی بے سن پاشا کی خونخواری کا شکار ہو گئے۔ یہ تحریر نہایت صاف ہے اور ترکی کی اصل صورت حال پر بہت روشنی ڈالتی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ جب ایک مہینہ کے بعد ڈاکٹر انصاری صاحب ہندوستان واپس تشریف لائیں گے تو ان کے لکچروں سے ہمیں وہ پوری معلومات حاصل ہوں گی جو ان ہفتہ وار خطوں سے جو اس قدر جلدی میں اور اختصار کو مدنظر رکھ کر لکھے جاتے ہیں حاصل نہیں ہو سکتے۔ تفصیل حالات کے معلوم ہونے کے بعد شاید ہم کو ترکی سیاسی حالت کے متعلق اپنے خیال میں بہت کچھ تغیر و تبدل کرنا پڑے گا۔ اس لئے جو آگ موقعہ پر حالات کو بچشم خود دیکھ کر آئیں وہ ان سے جو معلومات ہم خود حاصل کریں گے۔ وہ بہت قیمتی اور نتیجہ خیز ہوگی۔ ہمارا یہ ارادہ ہے کہ طبی مشن کے تمام تجربات اور مشاہدات کو آئندہ ایک کتاب کی صورت میں شائع کریں۔

ڈاکٹر انصاری کی چٹھی

چہار شنبہ ۲۵ جون سنہ ۱۹۱۳ء

کامریڈ کا وہ نمبر جس میں "برٹش ریڈ کریسنٹ سوسائٹی" کے سیکرٹری مرزا کاظم حسین صاحب کی چٹھی شایع ہوئی ہے۔ مجھے گذشتہ سے پیوستہ ہفتہ کی ڈاک میں موصول ہوا تھا۔ اس مسئلہ پر میں آج سے ایک ہفتہ پہلے قلم اٹھاتا۔ لیکن طبی فرائض کی انجام دہی کے علاوہ مسئلہ قیام نوآبادی برائے مہاجرین کے متعلقہ مشاغل نے فرصت نہ دی۔ مزید برآں سرکاری اعداد و شمار کا دستیاب ہونا بھی بہت کچھ انتظار و صبر کا محتاج تھا۔ شکر ہے کہ میرے صبر و انتظار کا صلہ مجھے اعداد و شمار کی ایسی جامع فہرست کی بہم رسی کی شکل میں مل گیا۔ جس [illegible] کامل و مکمل فہرست بحالت موجودہ دستیاب ہونی محال تھی۔ صرف ایک سرکاری فہرست مجھے بہم نہیں پہنچ سکی۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ بہت کچھ تلاش و جستجو کے بعد بھی یہ فہرست برآمد نہ ہوئی۔ یہ فہرست یا تو حکام کو وصول ہی نہیں ہوئی اور یا عجب نہیں کہ گم ہو گئی ہو۔ لیکن اس فہرست کی عدم دستیابی کی تلافی میں نے ان اعداد و شمار کے اندراج سے کر دی ہے جو مدرسہ طبیہ قسطنطنیہ کے ایک طالب علم درجۂ اعلیٰ نے قلم بند کر کے میرے حوالہ کیے ہیں۔ طالب علم موصوف کی خدمت بحیثیت رجسٹرار شفاخانہ متعلقہ کو تفویض کی گئی تھی۔

مرزا کاظم حسین صاحب نے میری تجویز کے متعلق سخت مغالطہ دہی سے کام لیا ہے۔ اور اس سے ایسے ایسے نتائج پیدا کیے ہیں۔ جن کا انہیں ہرگز کوئی استحقاق نہ تھا۔ انہوں نے میری تحریر کو خود غرضی و انسانیت پر محمول کرتے ہوئے دنیا پر یہ ظاہر کرنا چاہا ہے کہ میرا مقصد بدنیتی کی راہ سے برطانوی ہلال احمر کے اراکین کو بدنام اور مطعون کرنا تھا۔ لیکن میری تحریر کو اگر بغور مطالعہ کیا جائے گا تو معلوم ہوگا کہ میرا مقصد اس تحریر کے حوالہ قلم کرنے سے صرف یہ تھا کہ ان معائدہ تہمتوں کی قلعی کھول جائے جو یورپین اخبارات کے ایک طبقہ نے ترکی شفاخانوں کے انتظام کے خلاف تراش رکھی تھیں۔ اور یورپین طبی وفود کی کارگزاریوں کا ذکر اگر بیچ میں آ گیا تھا تو محض ذیلی و ضمنی تھا۔ میری تحریر کے جس فقرہ نے نکتہ چینوں کو اس قدر نعل در آتش کیا ہے ان کے اعادہ کے لیے باوجود خوف طوالت بھی مجھے کسی عذر خواہی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے پڑھنے سے ارباب انصاف کو ایک نظر میں معلوم ہو جائے گا کہ آیا میں نے نہایت نیک نیتی سے محض واقعات کے

بیان کرنے پر اکتفا کیا ہے یا از راہ خبث باطنی ان لوگوں کی شہرت یا نام نیک پر خواہ مخواہ کا حملہ کیا ہے۔ جو ہمدردی بنی نوع کے ملکوتی فرض کی انجام دہی میں مصروف تھے۔

فقرہ زیر بحث کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔ یہ داستان کہ ہزار ہا ترکی مجروحین میدان جنگ میں سسک سسک کر مر جانے کے لیے چھوڑ دیئے گئے۔ کذب و افترا کا ایک غبیث آمیز مجموعہ ہے۔ جس کی حقیقت ہر اس شخص پر کھلے بغیر نہیں رہ سکتی جو ترکی شفاخانوں میں داخل ہو کر ایک سرسری نظر سے یہی دیکھے کہ کس قدر بڑے بڑے اعمال جراحی کتنے مریضوں پر کیے گئے ہیں۔ اور ان سے کیونکر وہ نہایت ہی قابل اطمینان نتائج مترتب ہوئے ہیں۔ جن پر یورپ کے بہترین ماہرین فن جراحی کو بھی ناز ہو سکتا ہے۔ مقابلہ کے طور پر اس امر کا بیان کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ جرمن صلیب احمر۔ مسٹر امیر علی والی برطانوی ہلال احمر اور فرانسیسی صلیب احمر کے شفاخانہ جات کے نتائج ناقابل اطمینان ثابت ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ ممکن ہے کہ ان شفاخانہ جات کے ڈاکٹروں کی ناقابلیت یا بے توجہی ہو۔ انہیں برے نتائج کی وجہ سے یہاں عام طور پر خیال پھیلا ہوا ہے۔ کہ یورپین وفود کے ڈاکٹروں نے جان بوجھ کر اپنے مریضوں کے اعضا قطع کیے ہیں جنہیں استحفاظی طریقہ علاج کے اختیار کرنے سے محفوظ رکھا جا سکتا تھا۔ لیکن بلاشبہ یہ غلط ہے۔

اس فقرہ میں حسب ذیل تین صریح و بین دعاوی کی ذمہ داری مجھ پر عائد ہوتی ہے۔

(۱) ترکی شفاخانہ جات کی کارگزاری پسندیدہ و قابل اطمینان نہ تھی۔

(۲) ترکی شفاخانہ جات کے مقابلہ میں بعض یورپین طبی وفود کے نتائج قابل اطمینان نہ تھے۔

(۳) یورپین ڈاکٹروں کی کارگزاری کے برے نتائج کے باعث یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا تھا کہ یہ لوگ اعضا کو محفوظ رکھنے کی بجائے عمداً اور دیدہ دانستہ اپنے مریضوں کے اعضا بریدگی کو جائز رکھتے تھے۔

شق اول کے متعلق جو امر زیر بحث لی جاتی ہیں میں فقط اتنا عرض کروں گا کہ اگر مرزا کاظم حسین صاحب اس امر کے بدل و جان متمنی ہیں کہ یورپین اخبارات کا گندہ دہان طبقہ ترکی ڈاکٹروں کو منہ بھر بھر کر گالیاں دے۔ اور ان پر مفتریانہ اکاذیب کا جھاڑ باندھے تو میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ اس مسرت بار اطمینان سے جناب مرزا صاحب ممدوح محروم کیے جائیں۔ لیکن ان کا یہ اطمینان اس بحث میں میرے پائے استدلال کو جو بیں نہیں بنا سکتا۔ البتہ شق دوم کے متعلق مرزا صاحب کو بگڑنے اور چیں بہ جبیں ہونے کا پورا حق حاصل ہے۔ بشرطیکہ اس کی تائید کے لیے ناممکن التردید شہادتوں کا انبار جمع نہ ہو۔ لیکن اگر مرزا صاحب کا دماغ واقعات اور شمار و اعداد کے اہل منطق سے متاثر ہونے کی کچھ بھی قابلیت رکھتا ہے تو ایسی حالت میں جب کہ عثمانی مصری ہندوستانی اور دیگر شفاخانہ جات کے مریضوں کی شرح اموات صرف ۲ یا ۳ یا زیادہ سے زیادہ ۸ فی صدی ہو۔ یورپین وفود کی ۱۸ اور ۱۹ فی صدی شرح مرزا صاحب کے دربار میں مجھے یقیناً اس دعوے کے استحقاق سے محروم نہیں کر سکتی کہ مؤخر الذکر نتائج

ناقابل اطمینان تھے۔ لیکن غالباً میرا سب سے بڑا قصور جناب ممدوح کی نظروں میں یہ ہے کہ کیوں میں نے اس عام افواہ کا ذکر اپنے مضمون میں کر دیا۔ کہ بعض یورپین طبی وفود کے ڈاکٹروں نے اس استحفاظی طریقہ علاج کو گلدستۂ طاق جرّاحی بنا کر جسے دنیا کے بڑے بڑے ماہرینِ فن جراحی نے اپنا معمول بہا بنایا ہے کثرت کے ساتھ مریضوں کے اعضا بریدگی کو اپنا شعار قرار دے لیا۔ اس افواہ کے متعلق میری ذاتی رائے ان الفاظ سے ظاہر ہوتی ہے۔ کہ" بلاشبہ یہ افواہ غلط ہے"۔ اور جناب مرزا کاظم حسین تک کی نظروں میں میرے یہ الفاظ میرے جرم کا کفارہ ہو سکتے تھے۔ یہ الفاظ صاف بتا رہے ہیں کہ یورپین وفود کے ڈاکٹروں کی نسبت جو عام خیال پھیلا ہوا تھا۔ اسے صحیح تسلیم کرتے ہوئے وہ قدرتی تامل میرے یقین کا سنگ راہ ثابت ہوا ہے۔ جو اپنے یورپین طبی ہم چشموں کے نام نیک کے برقرار رکھنے کی خواہش کا لازمہ تھا۔ بحث فقط اتنی ہے کہ یہ خیال قسطنطنیہ کے عام حلقوں میں فی الحقیقت پھیلا ہوا تھا یا نہیں۔ سو اس کے موجود ہونے کی سب سے بڑی تصدیق اس رپورٹ سے ہوتی ہے جو ایک برطانوی وفد کے ڈائرکٹر نے ترکی حکام کی خدمت میں بھیجی ہے۔ اس رپورٹ کا پہلا فقرہ یہ ہے:-

چونکہ یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے کہ مجروحین کے اعضا کثرت سے قطع کیے گئے ہیں۔ لہذا میں یہ رپورٹ پیش کرتا ہوں۔

خیال زیر بحث کے موجود ہونے کی تصدیق تو خود برطانوی طبی وفد کے ڈائرکٹر کی زبانی ہو گئی۔ رہا یہ امر کہ اس خیال کی واجبی اور حق بجانب ہونے کے لیے بھی کوئی بنیاد تھی یا نہیں۔ سو مزید تحقیقات سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیاد تھی اور ضرور تھی۔ چنانچہ ذیل کے شمار و اعداد اس بارہ میں اپنی شرح آپ کر رہے ہیں۔

نام شفاخانہ	تعداد مریضان مرجوعہ	تعداد اموات	فیصدی اموات	کیفیت
ہلال احمر عثمانی	۱۳۴۴۵	۳۲۳	۲٫۳	
عثمانی فوجی شفاخانے	۲۲۵۲۴	۷۵۳	۳٫۳	از ابتدائے جنگ تا اعلان متارکۂ ثانی
مصری ہلال احمر	۱۵۹۱	۱۴۲	۸٫۹	
ولندیزی ہلال احمر	۱۸۵	۴	۲٫۱	
برطانوی ہلال احمر				
(۱) شفاخانہ واقع مدرسہ فنون لطیفہ	۳۱۳	۶۱	۱۸٫۳	دس مجروحین کے اعضا قطع کیے گئے۔ جن میں سے آٹھ جان بحق ہوئے۔
(۲) علی بے چیفلک	۴۹	۱	۲٫۰۴	

نام شفاخانہ	تعداد مریضان مرجوعہ	تعداد اموات	فی صدی اموات	کیفیت
(۳) کالی کرایہ	۵۰	نامعلوم	نامعلوم	نوٹ:- ڈائرکٹر نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ کل ۱۱۲۵ مریض ان کے شفاخانوں میں داخل ہوئے۔ لیکن خود شرح اموات درج نہیں کی۔
(۴) بکیوس برطانوی	۹۸	۵۳	۵۴٫۰۸	
ہلال احمر				
(۱) ایاسٹیفانو	۳۰۵	۵۸	۱۹٫۰۱	
(۲) شفاخانہ واقع مدرسہ ثانیہ السقودر	۸۷ - ۹۳	نامعلوم	نامعلوم	نوٹ:- ۲۰ مریضوں کے اعضاء قطع کیے گئے۔ یہ کیفیت رجسٹرار سے معلوم ہوئی۔
الوفد الطبی من بلاد الہند	اندرونی ۲۰۸	۱	۴۸	نوٹ:- ایک مریض جس کے دست و پا دونوں سے کٹ گئے تھے۔ شفایاب ہوا۔
(۱) ہندیہ (عمرلی)	بیرونی ۳۹۰			اندرونی اور بیرونی اموات کی مجموعی فیصدی ۱۶ر
(۲) درہ دانیال	اندرونی ۳۵۵	۱۱	۳٫۰۹	مجموعی فی صدی ۸۶ر
	بیرونی ۱۱۵۲	۲	۱۷ر	نوٹ:- تعداد ۵ ارمئی ۱۹۱۳ء تک کی ہے۔
غریب مسلمانان بمبئی کا طبی وفد				نوٹ:- اگرچہ اس مشن کے شمار و اعداد کے وصول نہ ہونے کے باعث میں ان اعداد کو شائع نہ کرسکا۔ لیکن مجھے اس بات کا علم ہے۔ کہ اس کی شرح اموات بھی بہت کم ہے اور کسی طرح ۲ فی صدی سے زیادہ نہیں ہے

اس نقشہ کے اعداد و شمار پر رائے زنی کرنے سے پہلے اس واقعہ کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ کہ مختلف شفاخانہ جات میں جو مریض پہنچ گئے تھے ان سب کی حالت سردی کھا جانے ضعیف و نقیہ ہونے یا زخموں میں مواد فاسد کے جمع ہونے کے لحاظ سے عموماً یکساں تھے۔ ذرایع نقل و حمل بھلے یا برے جو کچھ بھی تھے۔ سب شفاخانہ جات کے لیے ایک سے تھے۔ البتہ بعض برطانوی شفاخانہ جات کو خوبی تقدیر سے ریل یا سمندر کے بہت قریب موقع مل گیا تھا۔ بخلاف اس کے ان شفاخانہ جات میں جو شتالجہ کے خطوط دفاعی سے قریب تر تھے۔ زیادہ تر

نازک حالت کے مریض بھیجے جاتے رہے اس لیے کہ ان کا ضعف ونقاہت اس امر کا متحمل نہ ہو سکتا تھا کہ وہ زیادہ فاصلہ طے کر سکیں۔ پس مختلف شفاخانہ جات کے نتائج کا محاکمہ کرتے وقت ان واقعات کا پیش نظر رکھنا نہایت ہی ضروری ہے۔ اسی ضمن میں یہ واقعہ بھی قابل لحاظ ہے کہ بعض شفاخانہ جات میدانی تھے جو خیموں میں تھے۔ اور بعض پختہ بارکوں اور عمارتوں میں تھے۔ ظاہر ہے کہ اوّل الذکر شفاخانجات کے مریض بوجہ خیموں میں رکھے جانے کے موسم کے استبداد کی زیادہ زد میں تھے۔ اور اس لیے ان کے معالجہ اور خبر گیری میں زیادہ تر احتیاط اور توجہ کی ضرورت تھی۔ برطانوی شفاخانہ جات اکثر صورتوں میں بجائے خیموں کی بارکوں یا دوسری پختہ عمارتوں میں تھے۔ اور ان کے نتائج پر نظر ڈالتے وقت اس واقعہ کا مدنظر رکھنا ضروری ہے۔ یورپین ڈاکٹروں نے جو خدمات ٹرکی میں آکر انجام دی ہیں۔ ان کے لحاظ سے اگرچہ مجھ پر بحیثیت مسلمان ہونے کے ان سب کا شکریہ اور باعتبار ایک طبیب ہونے کے ان کی مساعی کا اعتراف واجب ہے۔ لیکن جب ان کے نتائج پر نظر پڑتی ہے تو یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ دوسرے شفاخانہ جات کی فی صدی اموات بہت بڑھی ہوئی ہے۔

یہ تو عام نتائج کا تبصرہ ہؤا۔ جب ان مریضوں کی تعداد پر نظر ڈالی جاتی ہے۔ جن کے اعضا برطانوی شفاخانہ جات میں قطع کیے گئے (دس مریضوں کے اعضا برطانوی صلیب احمر اور بیس کے برطانوی ہلال احمر میں قطع کیے گئے آخر الذکر عدد محتاج تصدیق مزید ہے) تو خواہی نخواہی اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بڑے بڑے جلیل القدر برطانوی اور یورپین ڈاکٹروں نے دوران جنگ میں فن جراحی کے استحفاظی پہلو کے متعلق جن روایات کو ہم تک پہنچایا ہے انہیں ہر حالت میں برقرار نہیں رکھا گیا۔ کسی عضو کا کاٹ ڈالنا آسان ہے۔ لیکن کٹا ہوا عضو پھر اپنی اصلی حالت پر نہیں آسکتا ؎

که لعل است لعل بدخشاں شکست
شکسته نیاید دگر باره بست

اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ قطع اعضا کے متعلق تمام اعمال جراحی کامیاب ثابت ہوئے۔ (جو بد قسمتی سے کم از کم برطانوی صلیب احمر کے دس اعمال کے متعلق جو خود ڈائرکٹر کی رپورٹ کے مطابق آٹھ مریضوں کے ہلاک ہونے کا باعث ہوئے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ تو پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ آیا ان مریضوں میں سے چند کے اعضا بھی محفوظ رکھے جا سکتے تھے۔

پروفیسر دیباچ جو بلجیم کے صلیب احمر کے وفد کے ہمراہ قسطنطنیہ آئے ہیں۔ ایک بہت بڑے پیمانہ کے سرجن ہیں۔ انہیں فن جراحی کے متعلق موجودہ جنگ کے تمام پہلوؤں پر نظر غائر ڈالنے کے خاص خاص مواقع حاصل ہوئے ہیں۔ وہ اصول استحفاظ کی بڑی شد و مد سے حمایت کرتے ہیں۔ اور اپنے زمانہ قیام کی ترکی میں مریضوں کے اعضا قطع کرنے میں انہوں نے بہت ہی احتیاط اور تامل سے کام لیا ہے۔ ان کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

میں نے بہت کم مریضوں کے اعضا قطع کیے ہیں اور میں خوش ہوں کہ میں نے یہ اعمال جراحی اس قدر کم کیے مجھے یہ کامیابی اس لیے ہوئی کہ میں اصول استحفاظ پر تنقید کے ساتھ عامل رہا۔

ایک بلند پایہ یہودی ڈاکٹر جو قسطنطنیہ کے ایک شفاخانہ میں ملازم ہے۔ موجودہ جنگ کے دوران میں جراحی کے قاطعانہ کارناموں کی شدید ترین مضرتوں کا مشاہدہ کرنے کے بعد یورپین طبی وفود میں سے ایک کی نسبت حسب ذیل رائے ظاہر کرتا ہے۔

ظاہر ہے کہ سب کے سب شفاخانوں کی نگرانی ایسے ڈاکٹروں کے حصہ میں نہیں آسکی جو اپنے فن کی ماہر ہو اور جن کا علاج بے خطا ہو۔

یہ انہیں سرگرم اور سراپا استعداد جراحوں کی جاں فشانی کا نتیجہ تھا کہ اعضا کی ہیبت انگیز بریدگی زخموں کے مواد فاسدہ کی غیر منتہی تراوش اور حرارت غریزی کی غیر معمولی کمی ہمارے دیکھنے میں آئی۔ اکثر کم عمر اور ناتجربہ کار ڈاکٹروں نے جو میدان جنگ کی جراحی کی ابجد خواں تک نہ تھے۔ مجروحین کو اپنا تختۂ مشق بنا رکھا تھا۔ اور ان مصیبت کے ماروں کی یہ حالت تھی کہ شفاخانہ میں پہنچتے ہی انہیں اپنے زخم اور جراحان نو خاستہ کی سلائیوں اور اوزاروں اور دشمنوں اور اوزاروں کے حوالہ کر دینے پڑتے تھے۔ شاید ان نوجوان سرجنوں کو اس حقیقت کا علم نہ تھا کہ جنگ کی جراحی میں استحفاظ بہترین طریقۂ علاج ہے۔ ایسے زخمی بھی ہمارے دیکھنے میں آئے۔ جن کے جسم میں گولی داخل ہو کر گم ہوگئی اور گم شدہ کی تلاش میں ڈاکٹر صاحب نے بیچارے مجروح کے جسم میں اتنے بڑے اور لمبے شگاف دیئے کہ قیاس میں نہیں آسکتے۔ یورپین وفود میں سے ایک کی قسطنطنیوی کارگذاری کا ذکر کرتے ہوئے بھی ڈاکٹر حسب ذیل معنی خیز الفاظ قلم بند کرتا ہے۔

ان سپاہیوں کے زخموں میں زہریلا مادہ سرایت کر چکا تھا۔ زخم رس رہے تھے۔ گھاؤ نے تالو پڑے ہوئے تھے۔ کٹے ہوئے ہاتھوں اور پاؤں کے بھیانک ٹھنٹ رہ گئے تھے۔ بغرض جنگ کی ناقص العمل! جراحی کے وہ تمام ناگفتہ بہ نتائج ہمارے پیش نظر تھے جو موجودہ صدی کے لیے مایہ ننگ و عار ہیں۔ سپاہیوں کی جسمانی صفائی بالکل نظر انداز کر دی گئی تھی۔ ان کے جسموں اور کپڑوں میں جوئیں پڑی تھیں۔ اور وہ سر سے لے کر پاؤں تک میل میں اٹے ہوئے تھے۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ سپاہی تھے۔ جو ابھی ابھی میدان جنگ سے واپس آئے تھے۔ اور انہیں راحت و آسایش میسر نہ آئی تھی۔ اور نہا دھو کر صاف ہونے کا موقع نہ ملا تھا بلکہ یہ بیچارے مریض تھے۔ جن پر اعمال جراحی کیے گئے تھے۔ اور دو مہینے تک ایک شفاخانہ میں ان کی دیکھ بھال ہوتی رہی تھی۔ بڑے بڑے شگاف جو طول میں ۳۰ سے لے کر ۴۰ سنٹی میٹر تک تھے۔ ٹانگوں اور رانوں میں بلائے گئے۔ اس لیے کہ جراح کو ایک گم شدہ گولی کی تلاش میں یہی مناسب معلوم ہوا کہ پورے عضو کی چیر پھاڑ کی جائے ملاحظہ ہو فوٹو گراف"۔

ہلال احمر عثمانی کے اعلیٰ عہدہ داروں میں سے ایک نے پروفیسر ڈی باچ کی معیت میں جب ان مریضوں کا

معاینہ کیا تو ایسے پریشان و متحیر ہوئے کہ انہوں نے اس ڈاکٹر سے (یہودی ڈاکٹر سے مراد ہے) فرمائش کی کہ ان مریضوں کی عکسی تصاویر بغرض اشاعت لے لی جائیں۔ اس بارہ میں ڈاکٹر موصوف کا بیان حسب ذیل ہے۔

ہم ان تصاویر کو اس غرض سے شایع کرتے ہیں کہ دنیا کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ یورپ کی مجالس صلیب احمر اپنی ذمہ داریاں لائق اور تجربہ کار ڈاکٹروں کے تفویض کیا کریں۔ اور ایسے ناتجربہ کار اور نالائق ڈاکٹروں کو مجروحوں کی چارہ گری کے لیے نہ بھیجا کریں۔ جو جرّاحی کا فن سیکھنے کے لیے غریب سپاہیوں ہی کو تختۂ مشق بنانے کے خواہشمند ہوں"۔

اس کے بعد اسرائیل ڈاکٹر بہت سے مریضوں کے حالات نہایت شرح و بسط کے ساتھ بیان کرکے دکھاتا ہے کہ ناقص جرّاحی اور غیر محتاط تیمار داری نے کیسے ناقابل اطمینان نتائج پیدا کیے اور خاتمہ پر اپنے غصہ کا اظہار حسب ذیل الفاظ میں کرتا ہے۔

"کیسے افسوس کا مقام ہے کہ اس انیسویں صدی میں .... کی طرح کی سلطنتیں ہمارے زخمیوں کی چارہ گری کے لیے ایسے ڈاکٹروں کے بھیجنے کی جرأت کرتی ہیں جو شاید ہمارے حجاموں جتنی لیاقت بھی نہیں رکھتے وائے بر حال ٹرکی! کیسی خلاف قانون مضرتیں ہیں۔ جو ان مصیبت کے ایام میں ہم کو پہنچائی جا رہی ہیں: کیا اسی کا نام ترقی تہذیب ہے۔

اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کہ جو کچھ میں نے لکھا ہے۔ وہ بے وجہ و بے بنیاد نہ تھا۔ باوجود خوف و طوالت میں ٹرکی ڈاکٹروں کے چند اور بیانات حوالۂ قلم کرتا ہوں۔ ایک ڈاکٹر اپنی سرکاری رپورٹ میں برطانوی شفاخانہ جات میں سے ایک کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہے:۔

ایک مریض مرض کزاز میں مبتلا تھا۔ اس پر عمل جرّاحی کرنے کے لیے جن مقراض اور دیگر آلات کا استعمال کیا گیا۔ انہیں آنچ دیئے یا عرق دافع مواد سمیہ میں دھوئے بغیر دوسرے مریضوں کے زخموں کے لیے بلا تامل استعمال کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس شفاخانہ میں چھ مریض کزاز میں مبتلا ہو کر جان بحق ہوئے۔ حالانکہ خود شفاخانہ کے منتظمین کو اقرار ہے کہ ابتدا میں صرف دو مریض اس متعدی مرض میں میدان جنگ سے مبتلا ہو کر داخل شفاخانہ ہوئے تھے۔ شفاخانہ کے منتظمین کی بے پروائی کا یہ عالم تھا کہ کزاز کے مریضوں کے بستر مواد متعدیہ سے پاک و صاف کیے بغیر دوسرے مریضوں کے کام میں لائے جاتے تھے۔

بہت ہی احتیاط کی گئی تو صرف اتنا کیا گیا کہ بستروں کو تھوڑی دیر کے لیے باہر ہوا میں پھیلا دیا گیا۔ جو ہرگز کافی نہ تھا...

ہیضہ کے بارہ مریض جنہیں معالجہ کی بہت بڑی ضرورت تھی بلا علاج چھوڑ دیئے گئے۔ یہاں تک کہ یہ بیچارے ایک ایک کرکے درد و کرب اور ضعف و نقاہت کے عالم میں جان بحق ہو گئے۔

(۱) ایڈیٹر صاحب "کامریڈ" کو میں نے لکھ دیا ہے کہ ان عکسی تصاویر کی ایک ایک نقل آپ کی خدمت میں بھی

بغرض اشاعت بھیج دی جائے۔

ہیضہ کے مریضوں کے لیے علیحدہ رکھے جانے کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ بلکہ انہیں دوسرے مریضوں کے ساتھ رکھا گیا۔ ایک مریض نے جو نہایت ضعیف و لقیہ تھا اور جس کا دوسرے دن انتقال ہو گیا۔ پینے کے لیے پانی مانگا۔ یورپین ڈریسر نے جس کے سپرد اس کی تیمارداری تھی بجائے پانی کے آبخورے کے اپنے بوٹ کی ایک ٹھوکر اس کی چھاتی پر رسید کی۔

مدرسہ طبیہ واقع حیدر پاشا کا ایک پروفیسر انگریزی شفاخانہ جات میں سے ایک کی نسبت لکھتا ہے۔

یہ افواہ بارہ کر میرے کانوں تک پہنچتی ہے کہ بہت سے اعمال جراحی (جو مستلزم قطع اعضاء تھے) ایسے کیے گئے۔ جن کی بالکل ضرورت نہ تھی۔ اور جنہیں فن طب ہرگز جائز نہ سمجھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مریض جانبر نہ ہو سکے۔

ایک بہت بڑا ترکی ڈاکٹر جس کی شہرت یورپ تک میں پھیلی ہوئی تھی۔ اور جو یہاں کے مدرسہ طبیہ کا پروفیسر بھی ہے۔ بیان کرتا ہے۔

یہاں تو برقی افواہیں اس مضمون کی پھیلی ہوئی ہیں کہ انگریزی ہلال احمر اور بعض دوسرے یورپین طبی وفد نے جو قسطنطنیہ اور دیگر مقامات میں مقیم ہیں اپنی خدمات مفوضہ کی انجام دہی کے وقت زخمیوں اور مریضوں کا علاج ویسا نہیں کیا۔ جیسا انہیں چاہیئے تھا۔ اور بعض اعمال جراحی انہوں نے ایسے کیے جو بالکل غیر ضروری تھے۔

علاقہ شناطبہ کے جملہ شفاخانہ جات فوجی کا ایک افسر جس سے ان کا شفاخانہ جات کی صفائی کے متعلق لکھتا ہے۔

وہ (یورپین) اخبارات جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ترکی ڈاکٹروں نے اپنے مریضوں کا علاج بہترین طبی اور جراحی اصولوں کے مطابق نہیں کیا اس الم افزا حقیقت کو بخوبی ذہن نشین کرلیں کہ بجائے ترکی ڈاکٹروں کے یہ الزام ان یورپین صلیب احمر وفود پر بدرجہ اولیٰ عاید ہوتا ہے۔ جو قسطنطنیہ یا میدان کارزار میں موجود ہیں۔

اخبار "کامریڈ" مورخہ ۸ فروری ۱۹۱۳ء میں جو آپ کا مضمون شایع ہوا ہے۔ میری نظر سے گذرا۔ جو کچھ آپ نے اس مضمون میں لکھا ہے وہ حرف بحرف سچ ہے۔ جیسا کہ آپ کا بیان ہے کہ یورپین طبی وفود میں سے بعض کے شفاخانہ جات میں زخمیوں کا علاج اچھی طرح نہیں کیا گیا۔ جو کچھ آپ نے اپنے مضمون میں تحریر کیا ہے۔ میں اس کی پوری طرح سے تصدیق کرتا ہوں۔

ناانصافی ہوگی اگر میں انگریزی ڈاکٹروں کا ذکر کرتے ہوئے اس قابل تعریف خدمت کا اعتراف نہ کروں جو ہیضہ کے مریضوں کے معالجہ کے متعلق ڈاکٹر بینیس نے انجام دی۔ ڈاکٹر نیل تھروپ کی جراحانہ قابلیت کا اعتراف بھی مجھ پر واجب ہے۔ جنہوں نے بارہ مریضوں کے اعضاء قطع کیے۔ اور یہ سب کے سب شفایاب ہوئے۔ جن لوگوں نے ہندوستان میں ترکی مجروحین جنگ اور پسماندگان شہداء کی امداد کے لیے

وقتاً فوقتاً خاص خاص اشیاء اور انجمنوں کے ذریعہ سے رقوم روانہ کی ہیں۔ ان کے استفسارات کہ یہ رقمیں وصول ہوئیں یا نہیں۔ مجھے بذریعہ ڈاک آئے دن وصول ہوتی رہتی تھی۔ ان استفسارات کے جوابات میں جو چند فقرے میں نے "کامریڈ" میں لکھے۔ انہیں جناب مرزا کاظم حسین صاحب نے خواہ مخواہ اپنی سوسائٹی کے سر چپک لیا۔ ظاہر ہے کہ ان فقرات کا مشار الیہ برٹش ریڈ کریسنٹ سوسائٹی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے کہ اس سوسائٹی کے حسابات تو خود مرزا کاظم حسین صاحب ہی کی تصریح کے بموجب باقاعدہ طور پر اخبارات میں شایع ہوتے رہتے ہیں۔ میں جناب مرزا صاحب کو یقین دلاتا ہوں کہ رائٹ آنریبل مسٹر سید امیر علی بالقابہم نے مسلمانانِ ہند کے لیے جو خدمات انجام دی ہیں ان کا اوصاف مجھ سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

جناب مرزا صاحب نے اپنی سوسائٹی کے مداخل کی کمی کی مرثیہ خوانی فرماتے ہوئے اس کمی کا مورد الزام جن اشخاص کو قرار دیا ہے وہ اس الزام سے بری ہیں۔ اگر جناب ممدوح قطع نظر ہندوستان کے متعدد اسلامی اخبارات کے لندن کے بعض سرکردہ مسلمانوں ہی سے دریافت حالات کی زحمت گوارا فرماتے تو آپ کو معلوم ہو جاتا کہ حقیقی الزام "برٹش ریڈ کریسنٹ سوسائٹی" کے خزینۂ خاصہ میں رقوم کے بافراط نہ داخل ہونے کا کس کے سر ہے۔ کیا جناب مرزا صاحب براہ نوازش اس احقر کے اس سوال کا کوئی شافی جواب ارشاد فرما سکتے ہیں کہ کیوں جناب ممدوح کی سوسائٹی نے ان طبی وفود کی رکنیت کے شرف سے ہر ہندوستانی کو محروم رکھنے کی از حد کوشش کی ہے۔ جو قسطنطنیہ کی جانب بھیجی گئی؟

خود مجھے چند ایسے مسلمان نوجوانوں کے نام معلوم ہیں جنہوں نے برٹش ایڈ کریسنٹ مشن کے لیے اپنی خدمات رضاکارانہ حیثیت سے بلا شرط مزد وبلا امید انعام پیش کی تھیں۔ مگر ان کی درخواست یا تو رد کر دی گئی یا استغنا کی اس ٹوکری میں جھونک دی گئی جو خاص اسی مطلب کے لیے "برٹش ریڈ کریسنٹ سوسائٹی" کی میز کے تلے رکھی رہتی ہے۔ ان نوجوانوں کا قصور اگر کوئی تھا تو یہ تھا کہ وہ بدقسمتی سے ہندوستانی واقع ہوئے تھے۔ اور بہترین برطانوی یونیورسٹیوں میں سے بعض گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ تھے۔ اور اپنی خدمات انہوں نے بلا کسی مشاہرہ کے مطالبہ کے پیش کی تھیں۔ اور بعض نے تو ترکی جانے اور آنے کے اخراجات تک اپنی گرہ سے ادا کرنے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔

مجھ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ میں نے انگریزی ڈاکٹروں کی حسن کارگذاری کا موزوں الفاظ میں اعتراف کرنے کی بجائے انہیں بدنام کیا ہے۔ نیتوں کا حال تو خدا جانتا ہے۔ لیکن جو شخص بہترین برطانوی روایات کی گود میں تربیت پا چکا ہو۔ اور جس نے فن طب وجراحی کو انگلستان میں اس کی کامل ترین شکل میں دیکھا ہو۔ اس کا ہمیشہ یہ نصب العین ہونا چاہیے کہ ان روایات کے برقرار رکھے جانے میں ہر طرح ساعی ہو۔ فن طب کی قندیل سقفِ علم کے بعد تابانی و درخشانی آویزاں ہے۔ ہر وہ ہاتھ جو اس جگمگاتی ہوئی قندیل کو اس بلندی سے اتارنا چاہتا ہے اس قابل ہے کہ بلا خوف لَوْمَۃَ لَائِمٍ اسے قطع کر دیا جائے۔

یہی وجہ تھی کہ میں نے اپنے طبی ہم چشموں کے کام کی تنقیح میں اس قدر جارحانہ تنقید سے کام لیا۔ ورنہ ان کی کارگذاری اور قابلیت مجھ سے خراج تحسین و آفرین وصول کیے بغیر نہ رہ سکتی۔

رقم ۱۷

خاکسار - مختار احمد بی - اے (اوکسن) ایم - ڈی - ایم - ایس (اینڈبرا) ایم - آر - سی - ایس (انگلینڈ) ایل - آر - سی - پی (لندن)
ناظم الوفد الطبی من بلاد الہند قسطنطنیہ ۲۷ مئی ۱۹۱۳ء

کیا ڈھونڈتے ہو قصص زماں میں بہار کو
اب وہ چمن کہاں ہیں وہ رنگ چمن کہاں
کشتوں کو تیرے کس نے کیا ہے سپرد خاک
ان بیکسوں کے واسطے گور و کفن کہاں
سنتے ہیں یہ بھی ایک بزرگوں کی رسم تھی
اس دور اعتدال میں دار و رسن کہاں

ٹرکی سے آل انڈیا میڈیکل مشن کا الوداعی منظر

(یکشنبہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۳ء)

جناب ایڈیٹر صاحب زاد عنایتکم! السلام علیکم۔ مندرجہ ذیل مضمون اپنے اخبار کے گوشہ میں شائع فرما کر ممنون فرمایئے۔

۱۹ مئی کو ڈاکٹر انصاری صاحب نے ہر دو شفاخانہ جات متعلقہ عمر لی و چناق قلعہ کا شفاخانہ بالترتیب افتتاح بند کر دیئے جائیں۔ یہ امر پہلے ہی سے طے ہو چکا تھا۔ کہ ہر دو شفاخانہ جات میں سے پچاس بیماروں کا مکمل سامان ہندوستان سے لے جانے کے لئے علیحدہ کر کے باقی کل اسباب ہلال احمر عثمانی کے حوالہ کر دیا جائے۔

اس وقت عمر لی کے شفاخانہ میں بہت تھوڑے مریض باقی رہ گئے تھے جن میں چند تو ایسے تھے۔ کہ ان کی علالت خفیف باقی رہ گئی تھی۔ صرف چند روز راحت کی ضرورت تھی۔ لیکن ۳ بیمار ایسے تھے جن پر سوال ہنوز عمل جراحی ہو چکا تھا۔ اور ان قابل نہ تھے۔ کہ عمل جراحی مکمل ہو۔ تاہم یہ رائے قرار پائی کہ یہ سب مریض ۲۲ تاریخ کو استنبول کے کسی عثمانی شفاخانہ میں ضروری ہدایات کے ساتھ بھیج دیئے جائیں۔ لیکن شفاخانہ بند ہونے کی خبر بیماروں تک پہنچانے سے ہم نے عمداً احتراز کیا۔ کیونکہ بیمار کو اس کی مرضی کے خلاف بغرض علاج کے ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا نہایت شاق ہوتا ہے بلکہ ہندوستان لے جانے والے سامان کو علیحدہ کرنا ہر شے کی مفصل فہرست تیار کرنی اور بستر وغیرہ المباڑ کر بندے بنانا غرض یہ سب کچھ بحیثیت مجموعی ایسا کام نہ تھا جو چھپا رہتا۔ دل کی آنکھ سے بیمار رہتا تھا چنانچہ اس تاریخ کو ان کا شبہ درجہ یقین کو پہنچ گیا۔ کہ رخصت کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اور نہایت حسرت سے بار بار سوال کیا جانے لگا۔ کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا اب ہم کو ادھیڑ میں چھوڑے جاتے ہیں۔ اور پھر یہ سوالات کچھ ایسے مایوسانہ لہجے میں کئے جاتے تھے۔ کہ خواہ مخواہ طبیعت پر قلق انگیز اثر ہوتا تھا۔ رات کو جب انہیں معلوم ہو گیا کہ ۲۲ کو شفاخانہ بالکل بند ہو جائے گا۔ تو بعض تو آبدیدہ ہو کر رہ گئے۔ اور بعض غصہ کا سامنہ بنا کر بیٹھ گئے۔ اور جب ان سے ناخوشی کی وجہ دریافت کی گئی تو نہایت آبدیدہ ہو کر کہا کہ اب تم نا محرم ہم محبت کرد اور نہ تم ہم سے کیونکہ جدائی کی قیامت ہوتی ہے۔ ایک مریض جس کا دست راس ٹوٹا ہوا تھا۔ اس نے نہایت غمگین لہجہ میں ایک ترکی شعر پڑھا۔

"بنی بزن برگوں الرالبر.................."

جس کا ماحصل یہ ہے۔ کہ تجھے ہماری قدر نہیں۔ لیکن یقیناً ایک روز آنے والا ہے۔ جب تو میری جستجو کرے گا۔ اور میں نہیں ملوں گا۔ یہ شعر پڑھ کر آنسو بھر لایا۔ اور دوسرے بھی چشم نم ہو گئے۔ ۲۱ رہی کو یہ صلاح قرار پائی کہ اپنے مریضوں کو رخصتی دعوت

دی جائے جس میں طبیب تیماردار اور مریض شامل ہوں۔ بیماروں کو خیموں میں باقاعدہ چیزیں وغیرہ آراستہ کی گئیں۔ اور جنگل میں جس قدر بھی بہتر دعوت کا سامان ہو سکتا تھا۔ وہ کیا گیا۔ اور سب نے ساتھ مل کر کھانا کھایا۔ اس موقع کا فوٹو بھی لیا گیا تھا۔ مگر غالباً اور بہت سی دیگر بلیٹوں کے ہمراہ یہ بھی ضائع ہو گیا۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کا حکم تھا۔ کہ ۲۲ تک تمام سامان کی مفصل فہرست ہو جائے۔ اور ہندوستان جانے والا سامان بمبئی بھیجے جانے کے لئے ٹھیک ہو کر نشان اور پتہ سے درست رہے چنانچہ ۲۶ تاریخ کو ہلال احمر عثمانی کی طرف سے اسمٰعیل حقی بے اور چند دیگر اصحاب سامان لینے کے لئے آ گئے۔ اور ہم نے بلا تردد اپنی فہرست سے مقابلہ کرا کر سامان ان کے حوالہ کر دیا۔ ایک واقعہ میں درج کرنا بھول گیا کہ موضع ہنہ یاسمر لی بلندی پر واقع ہے۔ اور ہمارا شفاخانہ نشیب میں چنانچہ ہمارے اکھڑتے ہوئے خیمے موقع کے مہاجرین نے بھی دیکھے۔ اس موضع میں ساٹھ کے قریب مہاجرین آباد تھے۔ جن کو دونوں وقت ہمارے ہاں سے کھانا پہنچتا تھا۔ چونکہ ان مہاجروں میں پردہ نشین مستورات زیادہ ہیں۔ اور مرد کم اس لئے کھانا ہر گھر پہنچایا جاتا تھا۔ اور دونوں وقت ایک دو ممبر تقسیم کرنے کے لئے ہمراہ جاتے تھے۔ اس لئے تمام مہاجرین ہر شخص سے جداگانہ واقف ہو گئے تھے اور محبت کے بدلے محبت کرنے لگے تھے۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر رضا صاحب گھر گھر جا کر علاج کرتے تھے۔ اور ہر روز دو دفعہ موضع میں اپنے بیماروں کو ضرور دیکھنے جاتے تھے۔ اس برتاؤ نے خصوصیت سے سب کو گرویدہ بنا لیا تھا۔ مرمت مسجد اور مکتب قائم کئے جانے کی اطلاع تو پہلے ہی آپ کو مل چکی ہے۔ بہرحال انہیں چند خفیف باتوں کی وجہ سے مہاجرین کا تعلق ہم سے اس قدر گہرا ہو گیا۔ کہ ہمارے خیمے اکھڑتے وقت ان کو دلی صدمہ پہنچا۔ ۲۲ تاریخ کو تمام موضع کے عورت مرد بچے بوڑھے گھروں سے باہر نکل آئے کیونکہ کسی نے غلط اطلاع دی تھی۔ کہ ۲۲ تاریخ کو روانگی ہے۔ تاہم ۵-۶ گھنٹے بلندی پر بیٹھے ہوئے ہمارے کیمپ کی طرف دیکھتے رہے جب ہم میں سے کوئی ادھر پہنچا تو ایک ساتھ مع اسلامۃ کے صدا بلند ہو گئی۔ اور ہزاروں دعائیہ فقروں کی بوچھاڑ جن کو ہم سمجھ بھی نہ سکتے تھے۔ ہونے لگے۔ آخر جب ان کو یقین ہو گیا کہ آج ہم نہیں جائیں گے تب کہیں اپنے گھروں کو گئے۔ ۲۳ مئی کی صبح کو جنرل احمد عزت پاشا کمانڈر انچیف افواج عثمانی کے اور جنرل عبد السلام پاشا انسپکٹر جنرل شفاخانہ جات عثمانی کی خدمات میں جدا جدا تار دیئے۔ کہ ہم نے اپنا شفاخانہ بند کر دیا ہے۔ اور ہماری آرزو ہے۔ کہ رخصت سے پہلے ایک دفعہ اور شرف قدم بوسی حاصل کریں۔ اور چونکہ آپ کا وقت قیمتی ہے۔ اس لئے استدعا ہے۔ کہ مناسب اوقات سے اطلاع دی جائے۔ کہ صرف ملازمت کو حاضر ہوں۔ دونوں جگہ سے فوراً تار کا جواب آیا۔ عبد السلام پاشا نے بلا تعین وقت تحریر فرمایا کہ جس وقت بھی آئیں حاضر ہوں۔ اور جنرل احمد عزت پاشا نے ۲ بجے بعد دوپہر وقت ملاقات معین فرمایا۔ چنانچہ تھوڑی دیر بعد کمانڈر انچیف کے اردلی کا سوار باشق کمانڈان کی تحریر لایا جس کا منشا یہ تھا۔ کہ آنے والوں کی صحیح تعداد سے اطلاع دی جائے۔ تاکہ گھوڑے سواری کے لئے اس قدر بھیج دیئے جائیں۔ بعض اصحاب جو گھوڑے کی سواری کو کسی وجہ سے پسند نہ فرماتے تھے۔ اس سے گھبرا گئے۔ اور پریشانی چھپانے لگے۔ لیکن طوعاً و کرہاً جانے والوں کی تعداد لکھنی پڑی۔ ۱۲ بجے اسٹنبول گاڑی جاتی تھی۔ اس میں بیماروں کو رخصت کرنا تھا جو پیدل چل سکتے تھے وہ پیدل اور معذورین کو اسٹریچر پر ڈال کر اسٹیشن پر لے گئے۔ یہ منظر قابل دید تھا۔ ان کا رخصت کے وقت مل مل کر ہاتھ اور منہ چومنا۔ بھرائی ہوئی آواز میں دعائیہ کلمات کہنا ایسا دن تھا جو ہمارے دلوں کو موہ نہ لیتا۔ چنانچہ جس وقت ٹرین چھوٹی اس وقت ہم میں سے ہر شخص کے رومال کا کچھ حصہ ضرور تر تھا۔ بیماروں کو رخصت کرنے کے بعد اپنے ذاتی

اسباب کو ایک جا کرنے میں مشغول ہوئے۔ لیکن ساتھ ہی یہ انتظار بھی لگا ہوا تھا۔ کہ کب باسق کماندان کی طرف سے گھوڑے آئیں اور اس سراپا عزت کی الوداعی قدمبوسی حاصل ہو۔ تقریباً ایک بجے دور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی اور ان کے ہنہنانے کی آواز نے سب کو متنبہ کر دیا۔ کہ گھوڑے آگئے۔ لیکن باہر نکل کر دیکھنے پر یہ خیال ہوا۔ کہ یہ ہمارے گھوڑے نہیں ہیں بلکہ کوئی باعزت پاشا اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ کس طرف جا رہا ہے۔ اول تو گھوڑوں کی تعداد ہمارے اندازے سے کہیں زیادہ تھی۔ دوسرے جو افسر کہ رسالہ کے آگے آگے رہے تھے۔ ان کی شان اور زرق برق وردیوں سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی تھی۔ بہر حال یہ آنے والا رسالہ ہمارے کیمپ سے کوئی سو قدم کے فاصلے پر پہنچ کر ٹھہر گیا۔ اور افسروں میں سے ایک شخص جو بہ ظاہر رتبہ میں سب سے بڑا معلوم ہوتا تھا۔ گھوڑے کو بڑھا کر ہمارے خیمہ کے سامنے جس میں ہم سب جمع تھے۔ آیا اور السلام علیک کہہ کر آگے بڑھے۔ اور اندر آکر بیٹھنا چاہا۔ لیکن انہوں نے معمولی ادائے مراسم کے بعد کہا کہ وقت تھوڑا ہے۔ اگر آپ لوگ تیار ہیں۔ تو بسم اللہ چل کر سوار ہو جیئے۔ باسق کماندان آپ کے منتظر ہیں۔ ہم سب پہلے ہی سے تیار تھے۔ فوراً ساتھ ہو لئے۔ یہاں عبدالسلام پاشا اور احمد شوقی پہلے سے موجود تھے۔ ان سے ملاقات کی۔ ہز ایکسلنسی نے فرمایا۔ کہ غالباً ان حضرات کے رسمی تعارف کی تو ضرورت نہیں۔ کیونکہ کئی دفعہ ملاقات ہو چکی ہے۔ عبدالسلام پاشا جو عرب ہیں آگے بڑھے اور نہایت ہی متین لہجہ میں فرمایا۔ کہ افسوس میں لوگوں کی مدارات اگر اپنے مکان پر کرتا۔ تو زیادہ مسرت ہوتی۔ لیکن پاشا حضرت لری نے ایسی نوج کے پاشاؤں کو آپ سے ملنے کے لئے یہیں طلب فرما لیا۔ اس لئے یہ مسرت نہ حاصل کر سکا۔ تاہم ایک ہی بات ہے۔ یہاں یا وہاں۔ ہم ابھی بیٹھنے نہیں پائے تھے۔ کہ محمود پاشا ناظر بحریہ، حضرت فواد پاشا کماندار سواری، ضیا پاشا کماندار خط موافعہ دول تشریف لے آئے۔ یہ سب حضور کماندار انجیف کے طلبیدہ ہم سے رخصتی ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے۔ جب سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے تو ڈاکٹر صاحب نے بذریعہ ترجمان اول گھوڑوں کے بھیجنے اور وداعی ملاقات کی اجازت بخشنے کا شکریہ ادا کیا۔ پاشا حضرت لری نے ارشاد فرمایا۔ کہ یہ ایک معمولی بات ہے۔ آپ اس کو اس قدر وقعت کیوں دیتے ہیں۔ اور فرمایا۔ کہ مجھے افسوس ہے۔ کہ آپ لوگ جا رہے ہیں۔ چھوڑنے کو طبیعت نہیں چاہتی اور جدائی کا تصور کر کے طبیعت کو کوفت ہوتی ہے۔ اس پر مسٹر شعیب قریشی نے عرض کیا۔ ہز ایکسلنسی کی۔ آئی۔ ڈی۔ سی رشید بے اور محمد انور بے بادر بحری انگریزی خوب جانتے تھے۔ کہ ہم لوگ آج آپ کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوئے ہیں۔ وہ اپنے اور نیز تمام مسلمانان ہند کی طرف سے آپ کا شکریہ ادا کریں۔ کہ جناب والا نے مختلف طریقہ سے سہولت، ہم پہنچا کر روز اپنے عساکر کو ہماری امداد کے لئے متعین فرما کر ہم کو اس قابل بنا دیا کہ اپنے شجیع بہادر مظلوم مگر زخمی بھائیوں کی خدمت کر سکیں۔ یہ وہ خدمت ہے۔ جس کے ادا کرنے کے لئے آج تمام دنیا کے مسلمان تڑپ رہے ہیں۔ ہم کو فخر ہے۔ کہ خدا کی عنایت سے ہم اپنے جانباز فدائیان اسلام کی خدمت کر سکے۔ ہز ایکسلنسی اس تقریر سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا کہ افسوس آپ نے ترکی کو اس حالت میں دیکھا جبکہ اعدا سے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے اور تمام دنیا اس کے درپے آزار ہو رہی ہے۔ کاش تم اس کو فتح اور عروج کے زمانہ میں دیکھتے۔ شکست و فتح خدا کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کیا نتیجہ ہوگا۔ کوئی اکیلی طاقت تمام دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

ہم نے اپنی طرف سے کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا۔ قدرت خداوندی میں کوئی چارہ نہیں جو منظور تھا وہ ہوا ہماری سلطنت سے بہت سا قیمتی علاقہ نکل گیا۔ ہمارے بھائیوں کے ساتھ ناگفتہ بہ مظالم ہو رہا ہے جن کا طبیعت پر داغ ہے۔ اور جس کی یاد نہ صرف ہمارے لئے سوہان روح بنی ہوئی ہے۔ بلکہ آئندہ نسلوں کے لئے بھی فلسفۂ زندگی صرف خیال انتقام ہوگا اس قدر فرما کر ہز ایکسلنسی انتہائے جوش میں کھڑے ہو گئے، تاہم سب کچھ کھو کر ہم کو وہ ایک بیش بہا چیز حاصل ہوئی جس نے اس نقصان کے خیال سے نباہ تلافی کر دی۔ اور ان مصائب کی تاریکی میں وہی ایک روشنی ہے جس سے آئندہ کی امیدیں وابستہ ہیں۔ اور جس نے تمام قوم میں امید کی نئی روح پھونک دی ہے۔ اور یہ یقین ہے۔ کہ یہ ہم کو اس لڑائی کی وجہ سے حاصل ہوا ہے۔ کہ ہزاروں میل فاصلہ پر ہمارے درد میں برابر کا حصہ لینے والے موجود ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اخوت اسلامی اور ہمدردی کی مثال ہمارے سامنے پیش کرکے ہم کو اس قدر اخلاقی نفع پہنچایا ہے۔ کہ جس کو ہم عثمانی کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ بلکہ فی الحقیقت یہ ایک ایسا گراں بار احسان ہے۔ جس سے ترک کسی وقت بھی سبکدوش نہیں ہو سکتے میں آپ کا اور ہندوستان کے تمام مسلمان کا اپنی طرف سے بحیثیت کمانڈر انچیف تمام عساکر عثمانیہ کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ میرا پیام ہندوستان ضرور پہنچا دیں۔ افسوس میں وقت معین نہیں کر سکتا۔ لیکن تاہم خلوص سے عرض کرتا ہوں کہ میرا دل احسان مندانہ خیالات سے اس قدر لبریز ہے۔ کہ ضرور ایک دن خود ہندوستان آپ کی مساعی جمیلہ کا شکریہ ادا کرنے حاضر ہوں گا۔ مسٹر شعیب قریشی نے اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ہز ایکسلنسی کی تقریر نے سب کے قلوب میں کچھ ایسے مخصوص جذبات پیدا کر دیئے تھے۔ کہ اظہار خیالات کی قدرت باقی نہ رہی۔ قہوہ اور سگریٹ کی تواضع کے بعد ہز ایکسلنسی کھڑے ہو گئے۔ اور فرمایا کہ وقت خوشگوار ہے۔ باہر نکل کر مناظر قدرت کی سیر کیجئے۔ اول ہم کو چند خیمہ دکھلائے جو شاہ ناصر الدین قاچار کی آمد کے وقت ترکی میں تیار کرائے گئے تھے۔ قدیم صنعت کا عجیب نمونہ تھا۔ فارسی کے اشعار ریشم سے پردوں میں کڑھے ہوئے تھے۔ تمام کام نہایت قیمتی اور قدیم زمانہ عروج کی یاد کو تازہ کرنے والا تھا۔ یہاں سے پھر ہز ایکسلنسی ہم کو سمر پاؤس میں لے گئے قدرت نے اس جگہ کو خود ہی حسین بنایا ہے۔ پھر اس پر حضرت انسان کا دماغ اور ترکوں کا مذاق۔ ان تمام باتوں نے مل جل کر اس جگہ کو خاص دلفریبی بخش دی ہے۔ پاشا حضرت لمری نے چند دوربینیں منگائیں۔

اور دیر تک سب کو تمام خطوط مدافعت دکھلائے اور ان کے متعلق خاص جدید اور قدیم تاریخی واقعات۔ ہر ایک کی وجہ تسمیہ بیان فرمائی اور اس جگہ سب کو جمع کرکے سب کے درمیان کھڑے ہوئے دوسرے پاشا اور ہم چاروں طرف سے گھیر کر لئے گئے۔ ہز ایکسلنسی نے الوننگ۔ پارٹی کا پہلے سے انتظام کر رکھا تھا۔ جس کا ہم کو اب تک علم نہ تھا۔ چنانچہ فوٹو کھنچ گئے۔ پھر خیمہ میں لے گئے۔ جس میں ہز ایکسلنسی کی شایان شان سامان دعوت آراستہ تھا۔

سب سے زیادہ دلآویز چیز پاشا حضرت لمری کی عادات اور اطوار ہیں۔ ہر ملاقات پر جس بے تکلفی اور سادگی سے ہم لوگوں کے ساتھ برتاؤ کیا ہے۔ اس کا لطف کبھی نہ بھولیں گے۔ کئی مرتبہ یہ فرمایا۔ کہ تم میرے بچے ہو۔ اور واقعی ان الفاظ کی حقیقت اپنے افعال سے ہمارے دلوں پر نقش کر دی۔ فوٹو کے وقت بے تکلفانہ طرز سے کسی کو بغل میں لے لینا۔ بیٹھتے وقت نہایت معمولی اور محبت سے زبردستی اپنے پاس برابر بٹھانا۔ کوئی چیز میز پر سے خود اٹھا کر پیش کرنا۔ یہ سب کچھ ایسی قدرتی معلوم

سے کرتے تھے۔ کہ تصنع کی بو بھی نہ پائی جاتی تھی۔ ہنس کر فرمانے لگے۔ اگرچہ میں روزانہ ۸، ۹ میل پیدل چلتا ہوں اور دو گھنٹہ سواری پر تاہم میں موٹا ہو گیا ہوں۔ اس وقت بہت سے ڈاکٹر موجود ہیں۔ کوئی دوا بتلائیے کہ جسم ہلکا ہو جائے۔ پھر فرمایا۔ کہ کیا ہندوستان میں بھی آدمی موٹے ہوتے ہیں جس پر ہم میں سے ایک صاحب نے سید اسماعیل حسین شیرازی کو پیش کیا۔ کہ مختصر نمونہ تو یہ ہیں۔ لیکن ہندوستان میں تو ایسے موٹے ہیں۔ کہ وہ کوئی حرکت بھی نہیں دے سکتے۔ حضرت فواد پاشا بہت ہنسے اور فرمایا۔ کہ خدا کا شکر ہے۔ کہ میرے ساتھی اور بھی ہیں۔ اتفاق سے عبدالرحمٰن پشاوری علالت طبع کی وجہ سے رخصت ہونے نہ آ سکے۔ فوراً سوال کیا "برادر افغان کجا است؟" مجھ سے فرمایا تم سے تو میں گفتگو سہولت سے کر سکتا ہوں۔ کیونکہ میں فارسی سمجھتا ہوں عربی بولتا ہوں۔ فارسی بولتے ہو۔ غالباً پہلی ملاقات میں ہم نے اس طرح باتیں کی تھیں۔ غرض یہ وقت اس قسم کی پر لطف باتوں میں گذرا۔ چلتے وقت بعض ممبروں نے سب پاشاؤں سے درخواست کی۔ ہماری نوٹ بک میں دستخط کر دیجئے۔ غلام احمد خاں کی نوٹ بک کسی قدر بڑی تھی۔ حضرت فواد پاشا جو بڑے مشہور نشانہ باز اور نہایت ہی با مذاق آدمی ہیں۔ نوٹ بک دیکھ کر فرمانے لگے۔ کہ یہ تو اچھا خاصا رجسٹر ہے اور قلم سے کمال اپنی تصویر بنائی جس کے نیچے دستخط کئے۔ تصویر اس قدر صحیح ہے۔ کہ سرمو فرق نہیں۔ پہلی نظر میں آدمی پہچان سکتا ہے۔ کہ یہ کسی کی تصویر ہے۔ ٹوپی کے نشان تک دکھلا دیئے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے واپسی کی رخصت چاہی۔ مصافحہ کے ساتھ ہم نے چاہا۔ کہ دست بوسی کریں۔ مشکل سے ہاتھ چومنے دیا۔ لیکن خود سب کے منہ چوم لئے۔ گھوڑے کسی قدر فاصلہ پر تھے۔ فرمایا میں گھوڑوں تک پہنچانے چلوں گا۔ بڑی منت سماجت سے روکا۔ اس جگہ ہوا کی وجہ سے سردی بہت زیادہ تھی۔ بعض ممبر باوجود ضبط کے آثار سردی کو چھپا نہ سکے۔ پاشا نے ہم کو رخصت کرنے کے بعد ایک افسر کو کچھ اشارہ کیا۔ وہ جھپٹ کر ہم سے آملا۔ ایک جگہ کودنے کا اکھاڑہ بنا ہوا تھا۔ ہم کو وہاں لے گیا۔ تمام نوجوان افسروں کو وہیں جمع کر لیا۔ پہلے خود کودے پھر ہم سے مصر ہوئے کہ تم بھی کودو۔ مجبوراً سب کودے۔ پاشا کھڑے دیکھتے رہے اور نہایت ہی بزرگانہ انداز سے اظہار مسرت فرمایا کئے۔ غلام احمد خاں سب سے زیادہ کودے۔ اس پر بہت خوش ہوئے۔ اس سے یہ فائدہ ہوا۔ کہ سردی جاتی رہی۔ اور غالباً پاشا حضرت کری کا بھی یہ منشاء تھا۔ اس کے بعد گھوڑے آ گئے۔ اور ہم سوار ہو کر مغرب کے قریب ہندیہ کوٹی اپنے کیمپ میں پہنچ گئے۔ اب تک ہم مہاجرین کو برابر کھانا پہنچاتے رہے تھے۔ لیکن ۲۴ کو چونکہ روانگی یقینی تھی۔ اس لئے یہ تجویز قرار پائی کہ ایک ہفتہ کی پوری رسد انہیں بھیج دی جائے۔ اس کے بعد خدا مالک ہے۔ چنانچہ ۲۴ کی صبح کو ہر مہاجر کے مکان پر ایک ہفتہ کی پوری رسد پہنچا دی گئی۔ تقریباً ۱۱ بجے جنرل عبدالسلام پاشا مع اپنے اسٹاف کے ہمارے کیمپ میں تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ میرا خود بھی جی چاہتا تھا۔ کہ تم کو ریل میں سوار کرانے آؤں۔ لیکن حضرت کری نے آج علی الصباح مجھے طلب فرما کر ارشاد فرمایا کہ آپ میری طرف سے عموم ہندوستان ہلال احمر کے ممبران کو رخصت کرنے جائیں۔ اور میری طرف سے اظہار معذرت کریں۔ کہ میں خود آپ لوگوں کو رخصت کرنے آتا۔ لیکن بوجہ عدیم الفرصتی میں اپنی اس خواہش میں ناکامیاب رہا۔ چنانچہ میں اس وقت حضرت پاشا کمانڈان کا قائم مقام بن کر نیز اپنی طرف سے تم لوگوں کو رخصت کرنے آیا ہوں۔ ہمارے ممبروں کے لئے یہ وقت نہایت دشواری کا تھا۔ تمام اسباب مکین میں بار کرانا اور نواح کی فوجوں کے افسر و ڈاکٹر رخصت کرنے کے لئے جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ ان کو ملانا۔ بات چیت کرنا۔ سب سے زیادہ قیامت خیز سماں مہاجرین ہندیہ کوٹی کا جمع ہو جانا تھا۔ عورت، مرد، بوڑھے بچے موضع میں کوئی بھی نہ رہا۔ سب ہمارے

دعا اور پھر ایک ایک کے لئے ۳-۳ دفعہ نعرہ ہائے مسرت بلند کئے۔ تقریر ختم کی۔ ساتھ ہی گاڑی ہم کو لے کر استنبول روانہ ہوگئی۔ شعیب چشموں پر الواح نصب کرائے جو مشن کی یادگار کے لئے کندہ کرائی گئی تھیں۔ اور مکتب و مسجد بلندیہ کوئی کی تکمیل کے لئے وہیں رہ گئے۔ ہم استنبول تقریباً پانچ بجے شام کو پہنچے تو دو شفا خانہ میں حسب سابق ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ سب وہاں جا کر ٹھہرے۔ ڈاکٹر انصاری چونکہ مہاجرین کے آباد کرنے کی غرض سے زمین دیکھنے اناطولیہ جانے والے تھے۔ اور اتنا عرصہ ہمارا استنبول رہنا فضول تھا۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب نے یہ تجویز کیا کہ ہم سب لوگ بھی چناق قلعہ چلے جائیں۔ وہاں دوسرے حصہ مشن کو اسباب وغیرہ پیک کرنے میں مدد دیں۔ اور پھر سب ایک ساتھ شروع ماہ جون میں استنبول چلے آئیں۔ ہلال احمر کا جہاز "کیمرج" جو یونانیوں سے اسی لڑائی میں ترکوں نے لیا ہے۔ اکثر بیماروں کو گیلی پولی اور چناق قلعہ سے لانے کے لئے آتا جاتا ہے۔ اس میں یہ سفر مفت طے ہو جائے گا۔ ۲۸ مئی کو عبدالرحمٰن صاحب نے منیجر ہلال احمر کے دفتر سے جہاز کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ آج شام کو جائے گا۔

آج شعیب بھی بلندیہ کوئی سے آگئے۔ لیکن چونکہ ان کو اپنے حصہ مشن کا حساب کتاب منیجر صاحب کو دینا تھا۔ اس لئے وہ ہمارے ساتھ چناق قلعہ نہ جا سکے۔ ڈاکٹر محمود اللہ اپنے ضروری کام کی وجہ سے استنبول رہ گئے۔ باقی سب نے رات کو دس بجے "کیمرج" میں سوار ہو گئے۔ ۲۹ کو ہم ایک بجے چناق قلعہ پہنچے یہاں سب کو یہ تو معلوم تھا کہ بلندیہ کوئی والے اپنا شفاخانہ بند کر کے چناق قلعہ آئیں گے لیکن تاریخ آمد معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا اس وقت پہنچنا بالکل اچانک ہوا۔

میں ایک دفعہ پہلے مشن کے کچھ کاغذات لینے یہاں آچکا تھا۔ اس لئے راستہ سے واقف تھا۔ سب سے پہلے ہم شفاخانہ پہنچے شفاخانہ میں عجیب افراتفری پڑی ہوئی تھی ہر شخص کسی نہ کسی کام میں مصروف تھا۔ کوئی فہرست بنا رہا تھا۔ کوئی اشیاء کے شمار میں مصروف کوئی پیک کرنے میں مشغول۔ بہرحال ہم اس گڑبڑ سے مستفید ہو کر بلا اطلاع ان کے قریب پہنچ گئے اور چناق قلعہ والوں کو اطلاع نہ ہوا۔ ہم سب نے اپنے اپنے لئے ایک ایک آدمی آنکھیں بند کرنے کے لئے منتخب کر لیا اور قریب تھا کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو کر چناق قلعہ والوں کو کچھ دیر ستاتے۔ لیکن کالا کوا جیسا مشہور ہے۔ مسٹر نور الحسن کی نظر اتفاقیہ ہم پر پڑی تعجب سے انہوں نے ایک ایک کو غور سے دیکھ لیا تو پھر ان کی ہنسی اور ان کا چلبلا دل پوچھیں کہ کھلا بیٹھا تھا۔ فوراً کہتے ان کے منہ سے نعرہ مسرت بلند کر کے ہماری طرف جھپٹے۔ جیسے کسی کی کھوئی ہوئی چیز مدتوں کی معمولی کوئی اتفاقیہ پا جائے ویسا کیا تھا۔ آن واحد میں وہ دو مل کر ایک ہو گئے۔ وہ لوگ کہ اس قدر منتظر تھے چناق قلعہ جیسی جگہ میں اپنے ہمراہیوں کے بہت سے موقعوں پر ترکوں جیسی قوم سے بھی نادوست کر چکے تھے۔ اس وقت ان میں ہر فرد اسکول کے لڑکوں سے شوخیوں میں کوئی سبقت لے جاتا تھا۔ ہر شخص پر مقتضائے وقت فقرے کسے جا رہے تھے۔ پہلا خطاب جو غریب بلندیہ کوئی والوں کو شہر چناق قلعہ کے رہنے والوں سے عطا ہوا وہ "دیہاتی" تھا۔ ایک صاحب نے نہایت کرم گستری فرما کر تعلیم کی خدمت اپنے ذمہ لی۔ اور ہم کو شہر کے آداب و قواعد سکھانا شروع کئے۔ "بھئی تم گو دیہاتی ہو۔ لیکن ہمارے بھائی ہو اگر یہاں کے لوگوں نے تمہاری گنواری عادات دیکھیں تو ہم کو بھی شرمندہ ہونا پڑے گا۔ اس لئے مناسب ہے کہ تم ہر چیز غور سے دیکھ لو اور پوچھ

ہم بتلائیں۔ اس پر عمل کردہ سب سے زیادہ خطابات اس ناچیز کے لئے جلد جلد تجویز ہوگئے۔ پیارے لوری نے میاں نور الحسن اگر
محمد بخش ہوا ہے کو سنجیدہ نام سے یاد فرمایا کہ خلیفہ صاحب نے منشی دلاور علی چھٹی رساں کے ہر دلعزیز لقب سے ملقب فرمایا۔ بہر حال
وہ ایسا مخصوص مسرت آمیز منظر تھا جو کبھی فراموش نہیں ہو سکتا۔ کیمرج جہاز میں ہمارے ساتھ جودت بیے اور دیگر اصحاب
ہلال احمر کی طرف سے مامور ہو کر اس شفاخانہ کا سامان لینے آئے تھے۔ ان سے قدرتاً شفاخانہ کی بے تکلفانہ واقفیت تھی۔
وہ قریب کچھ عرصہ تک تو حیران دیکھتے رہے۔ کیونکہ منظر ان کے لئے بالکل نیا تھا۔ لیکن بعد میں وہ بھی ہماری خوشیوں میں شریک
ہوگئے۔ جب خوب دل کے ارمان نکل چکے تو سب مل کر پھر کام میں مشغول ہوئے۔ شاید میں شروع عریضہ میں لکھ چکا ہوں۔ کہ ڈاکٹر
انصاری صاحب نے ہندیہ اور چناق قلعہ ہر دو شفاخانہ جات کو کچھ تھوڑے سے تقدم تاخر کے ساتھ بند کرنے کی ہدایات
ایک ساتھ روانہ فرما دی تھیں۔ یہاں کے لئے۔ یہاں کے لئے یہ ارشاد تھا۔ کہ ۲۲ کو وہ مریض جن کا علاج شفاخانہ میں رکھ کر کیا
جاتا ہے۔ رخصت کر دیئے جائیں۔ اور ۲۴ کو دوا لے جانے والے مریضوں کو بھی نہ لیا جائے۔ یہ اطلاع یہاں ۱۹ کو پہنچی۔ چونکہ
شفاخانہ کے بعض ملازم خاص چناق قلعہ کے رہنے والے تھے۔ اس لئے فوراً یہ خبر شہر میں گشت کر گئی۔

شفاخانہ کے مریضوں پر تو رخصت کی خبر کا اثر وہی پڑا۔ جو ہندیہ کوئی کی بابت میں لکھ چکا ہوں۔ لیکن باہر سے دوا لے جانے والے
بیماروں نے جن میں بعض عیسائی بھی تھے۔ اپنی احسان مندی کا اظہار اور مصالحین و تیمار داروں کے اچھے برتاؤ کا اعتراف بالکل نئی
طرز میں کیا۔ عورتوں میں جن میں طبقہ طربا دادریا شاؤں کی بہو بیٹیاں تک شامل تھیں اپنے ہاتھ کے کڑھے ہوئے ریشمی رومال،
سلیپر و دیگر مختلف ہدایا نام بنام ہر ممبر کے لئے بھیجے۔ بچوں نے روزانہ گلدستے بنا کر پیش کرنے شروع کر دیئے۔ غرباء حسب
مقدرت مٹھائی، اور دعا کے ہدیہ روزانہ پہنچاتے تھے۔ حسب ہدایات ڈاکٹر انصاری کے ۲۲ کو علی الصباح شفاخانہ کے تمام
مریض فوجی شفاخانہ میں بھیج دیئے گئے۔ رخصت ہوتے وقت بیماروں نے جس خلوص اور حقیقی محبت کا اظہار ہر ایک ممبر کے
ساتھ کیا۔ اس کی مثال ہندوستان میں مفقود ہے۔ یہاں کی کیفیت میں نے سنی ہے۔ اور ہندیہ کا واقعہ چشم دید ہے۔ اس
کی اجمالی کیفیت کے لئے میں صرف اتنا عرض کرتا ہوں کہ ہر دو جگہ کے بیمار ہم سے اسی طرح رخصت ہوتے جیسے بھائی
بھائی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوتا ہے۔

۲۵ مئی سے ہندوستان جانے والے اسباب کو پیک کرنا شروع کر دیا اور باہر کے آنے والے مریضوں کو بھی بادل نخواستہ جواب
دینا پڑا۔ ان مریضوں میں اکثر مہاجرین ہوتے تھے۔ ان کو جواب دیتے ہوئے صدمہ ہوتا تھا۔ مگر کیا کیا جاتا مجبوری۔ گو چناق قلعہ
والے ممبر ایک دفعہ عثمانی بیڑہ کی سیر کر چکے تھے۔ لیکن تاہم امیر البحر طاہر بے کا یہ وعدہ تھا۔ کہ جب کل ممبر یہاں جمع ہوں گے۔ اس وقت
بھی آپ کو سیر کرائی جائے گی۔ ڈاکٹر رضا خاں صاحب نے ۲۷ کو اطلاع کرا دی کہ ہمارے سب ممبر آگئے ہیں جسب وعدہ سیر کرائی
وہاں سے ایک اسٹیمر لینے کے لئے آیا۔ اور ہم سوار ہو کر سب سے پہلے خیر الدین بار بروسہ پر پہنچے۔ یہ سب سے بڑا جہاز ہے۔ اور
امیر البحر اسی میں رہتے ہیں۔ اس جہاز کے نائب کپتان انگریزی خوب بولتے ہیں۔ انہوں نے ہر چیز تفصیل کے ساتھ دکھلائی۔ سیلون میں قہوہ،
سگریٹ کی تواضع کے بعد ہر ممبر کو ملباری اور یونانی گولوں کے ٹکڑے جو اس جہاز پر چھٹے تھے بخشش کئے۔ چناق قلعہ کے شفاخانہ کے
ممبر اس جہاز کے سپاہیوں سے فٹ بال میچ بھی کھیل چکے تھے۔ کپتان نے یہ درخواست کی۔ کہ کھیلنے والے فریقین کا ایک گروپ بطور

یادگار میں لینا چاہتا ہوں۔ اگر آپ لوگ بھی اس خیال کو پسند کریں۔ سب بخوشی آمادہ ہوگئے۔ اور جہاز کے سامنے کے حصہ پر توپوں کے سایہ میں یہ گروپ لیا گیا۔ اس کے بعد کل مشن اور جہاز کے افسر بیٹھے۔ عثمانی جھنڈا لگوایا گیا۔ توپیں کسی قدر نیچی کر کے ایک گروپ لیا گیا۔ یہ گروپ نہایت شاندار اور خوبصورت ہے۔ اس کے بعد مجیدیہ کروز دیکھنے گئے۔ حمیدیہ اور مجیدیہ بالکل ایک ہی قسم کے جہاز ہیں۔ بحری افسر عام طور پر انگریزی جانتے ہیں۔ اس لئے ہم کو نہایت سہولت ہوگئی۔ جہازوں کی صفائی، سپاہیوں کی مستعدی اور تنومندی قابل حیرت تھی۔ صوم و صلوٰۃ اور پابندی احکام خدا اور رسول جس قدر جہازوں میں دیکھے۔ اتنے دوسری جگہ کم ہوں گے۔ نماز کا وقت ہوتے ہی امیر البحر کے جہاز پر نماز کا جھنڈا اڑا دیا جاتا تھا۔ اس کو دیکھ کر تمام جہاز والے تقلید کرتے ہیں اور پھر جہاز کا موذن بلندی پر چڑھ کر اذان دیتا ہے۔ اور پھر جماعت کے ساتھ نماز ہوتی ہے۔ چلتے وقت اس جہاز پر بھی ہمارے مشن کا ایک گروپ لیا گیا۔

اس کے بعد تر غوت رئیس وغیرہ دیکھے۔ ایک جہاز دیکھنے کے بعد دوسرے جہاز میں ہلال احمر عثمانی کی طرف سے شام کو عمائدین شہر، کلکٹر ضلع، پولیس کمشنر، تورغوت پاشا و دیگر افسروں کی طرف سے سرکاری باغ میں الوداعی پارٹی کا انتظام تھا۔ دعوتی کارڈ پہلے آ چکے تھے۔ اس لئے وقت معین پر وہاں پہنچے۔ دعوت کا انتظام، زیبائش اور آرائش میزبانوں کی شایان شان تھی۔ قابل ذکر وہ لکچر تھے جو جلسہ و دیگر اراکین کی طرف سے دیئے گئے۔ ان کا مضمون نقل کرنا دشوار ہے۔ صرف مختصر اتنا کہہ دینا کافی ہے۔ کہ اختتام جلسہ پر ہم سب کے دلوں میں ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا۔ اور وہ یہ کہ الحمد للہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سعی رائیگاں نہیں گئی۔ دنیا میں مقبولیت تو آنکھوں سے دیکھ لی۔ کچھ بعید نہیں کہ درگاہ عالی میں بھی مقبول ہو جائے۔

کوئی نئی چیز دیکھنے کی باقی نہیں رہی۔ بجز اس کے کہ نئے آدمیوں سے ملاقات ہو جائے۔ یہاں سے اسٹیمر میں بیٹھ کر چناق قلعہ واپس آئے چناق قلعہ میں علاوہ شفاخانوں کے ہلال احمر عثمانی کی طرف سے بھی ایک بہت بڑا شفاخانہ قائم ہے۔ اس کے طبیب اعلیٰ ڈاکٹر احسن بے ہیں۔ ڈاکٹر رحمٰن و دیگر ممبران سے ان کے اخلاق اور صفات حمیدہ کی اکثر تعریف سنا کرتا تھا۔ لیکن اب تک ذاتی تعارف کا موقع نہ ملا تھا۔ ۲ کی صبح کو ان کا پیام آیا کہ سواریوں کا انتظام ہو گیا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے۔ کہ آپ ایک دو شب میرے شفاخانہ میں گذاریں۔ وہاں کی سیر کے ساتھ میری آرزو بھی پوری ہو جائے گی۔ ہمارا تمام اسباب پیک ہو چکا تھا۔ صرف تھوڑا سا سامان ہلال احمر کو سونپنا باقی تھا۔ اس کیلئے نور الحسن عبد العزیز انصاری، خلیق الزماں، منظور علی خاں صاحبان نے ذمہ لے لیا کہ یہ کام یہاں رہ کر ہم انجام دے دیں گے۔ اور ڈاکٹر غیضی صاحب بھی اس تجویز سے متفق ہوگئے اور ڈاکٹر احسن بے کو جواب لکھ دیا گیا ہم تیار ہیں۔ آپ تشریف لے آئیں اصل میں اس سفر کا محرک ڈاکٹر احسن کا شفاخانہ نہ تھا بلکہ اشتیاق مجھے پہلا یہ کہ چناق قلعہ سے تقریباً ۲۵ میل میلنس ٹرائی ہے جو پرانا تاریخی مقام ہے۔ دوسرے یہ بھی چاہتا تھا۔ کہ ترکوں کی اصل زندگی کا مطالعہ کیا جائے۔ شہروں میں عام طور پر یورپین تہذیب کا پردہ پڑا ہے۔ دیہات میں یقیناً ترکی زندگی کا صحیح نقشہ ملے گا۔ تقریباً ۸ بجے صبح کے ۳ شکرم اور ۱۰ گھوڑے آ گئے۔ چند آدمی دھوپ کے خیال سے شکرموں میں بیٹھ گئے۔ باقی گھوڑوں میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ ہندوستان میں بیٹھے یہ سنا کرتے تھے۔ کہ ٹرکی میں پختہ سڑکیں نہیں۔ لیکن جس سڑک پر ہم کو اس وقت اتفاق ہوا۔ وہ بہت سی وجوہ سے اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ یورپ کے تعلیم یافتہ ڈاکٹروں نے اسکاٹ لینڈ یا آئرلینڈ میں ایسی سڑک کا ہونا بیان کیا۔ لیکن ہندوستان میں تو یقیناً ایسی شاہراہ دیکھنے میں نہیں آئی۔ سب سے بڑی دل فریبی اس میں یہ ہے۔

کہ ۴۰-۵۰ میل تک بحر مارمورا کے برابر چلی گئی ہے۔ ایک طرف سمندر اور دوسری طرف پہاڑ سبزہ زار کہیں دو طرفہ درختوں کی قطار چلی گئی ہے۔ اور بعض حصوں میں صرف ایک طرف پہاڑ کی چڑھائی اترائی کو اس خوبصورتی اور خوش اسلوبی سے کاٹا ہے۔ کہ قطعاً گاڑی کے گھوڑے کو تھکان نہ معلوم ہو۔

ایک پہاڑی سے اترتے وقت میں نے شمار کیا تو دس دفعہ گاڑی نے ایک جگہ گشت لگایا۔ گیارھویں دفعہ سیدھی سڑک پہ آ [illegible] پڑے۔ سڑک وسیع، پتھر نہایت ہموار کٹا ہوا۔ قدرتی مناظر اور دنیاوی دلفریبیوں کی یہ زمین مظہر ہے۔ جابجا پانی کے چشمے اور نالے دونوں طرف پھولوں کے قطعات۔ زیتون اور چیڑ بے حساب۔ انگور کی کشت زاریں تو یہاں اس طرح ہیں۔ جیسے ہندوستان میں مولیوں کے لئے کیارے بے اندازہ کاشت کر دیتے ہیں۔ راستہ میں سر بہ سڑک قصبہ ازنیک کوئی آیا۔ اس میں مسلمان بھی ہیں۔ لیکن زیادہ تر یونانی عیسائیوں کی آبادی ہے۔ ڈاکٹر حسن بے ہم کو اس قصبہ کے اندر لے گئے۔ کیونکہ کرنل راجب بے جو اس نواح کی تمام افواج کے کمانڈر ہیں۔ اس قصبہ میں ان کا صدر مقام ہے۔ کرنل صاحب کے مکان پر گئے۔ وہ ہم سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ اپنے صاحب زادہ سے ملایا۔ جو استنبول کے طبیہ دارالعلوم میں پڑھتے ہیں۔ قہوہ سگریٹ پیش کیا۔ کھانے کے لئے بہت مصر ہوئے۔ لیکن ڈاکٹر حسن بے نے شکریہ کے ساتھ یہ کہہ کر انکار کر دیا۔ کہ ہمارے ساتھ موجود ہے۔ وہ ضائع ہو گا۔ کرنل صاحب سے رخصت چاہی۔ تو باوجود بہت سی التجاؤں کے شہر سے باہر تک دھوپ میں پہنچانے آئے۔ راستہ میں جابجا سڑک سے متصل فوجی چھاؤنیاں تھیں۔ ہماری وردیوں سے پہچان کر ہر جگہ سے افسر دوڑتے تھے اور جب تک ہم بیٹھ کر قہوہ سگریٹ نہ قبول کر لیں۔ تب تک نہ چھوڑتے تھے نصف راستہ طے کرنے کے بعد ہلال احمر کا ایک شفاخانہ ملا۔ جس میں ٹھہر کر ہم نے کھانا کھایا۔ شفاخانہ میں گرم نیم جوش بیضہ مرغ۔ دہی، چاول قہوہ ملا۔ غرض ان عجائبات قدرت [illegible] کی سحر آفرینیوں سے حظ اٹھاتے شام کے قریب ہم یلوا یہ پہنچے۔ یہ ترکی کا چھوٹا اور ادنیٰ چھوٹے وضع کو کہتے ہیں۔ یہاں چیڑ کے درخت بھی بکثرت ہیں۔ اور شفاخانہ کے قریب ایک چھوٹا سا موضع ہے۔ جس کو درختوں کی مناسبت سے چم ادیہ کہتے ہیں۔ شفاخانہ ایک سرسبز پہاڑی پر قائم ہے۔ جابجا درختوں کا سایہ ہے۔ بجانب مشرق ایک پہاڑی کی اوٹ میں تقریباً ۳ میل پر بحر مارمورا اور قلعہ جات سدالبحر اور کم ہی اس قدر قریب ہیں۔ کہ شب کے وقت ان کی قندیلوں کی روشنی نظر آتی ہے۔ اس شفاخانہ کا کل سامان برٹش ہلال احمر کا ہے۔ جو وہ چلتے وقت فروخت کر گئے تھے۔ ہر شے اس قدر سبک مضبوط کار آمد اور نفیس تھی۔ کہ بار بار دیکھ کر رشک آتا تھا۔ کہ کاش ایسا ہی سامان ہمارے پاس بھی ہوتا۔ شفاخانہ کی صفائی اور حسن انتظام اس قدر اعلیٰ تھا۔ کہ اس سے پیشتر اس خوبی کا ایک ہسپتال نظر سے نہ گزرا تھا۔ شفاخانہ کے موجودہ خیمے، بیماروں سے معمور تھے۔ اس لئے ہمارے لئے جدید خیمے اسی وقت نصب کئے گئے۔ ڈاکٹر حسن بے کی غیر متناہی عنایات اور بے حد مہربانیوں کا اظہار کسی طرح نہیں ہو سکتا۔ باوجودیکہ وہ بھی ہماری طرح تھکے ہوئے تھے۔ اور ۴۶ میل [illegible] میں سواری کر کے یہاں پہنچے تھے۔ لیکن ایسی خود فراموشی کی مثال مشکل سے ملے گی۔ جو انہوں نے ہم کو دکھلائی۔ ہمارے [illegible] خدام اور ماتحت عملہ کے موجود ہوتے ہوئے خود نصب کرائے۔ بستر سب کے اپنے ہاتھ سے لگائے۔ چارپائیاں اٹھا اٹھا کر لائے۔ غرض باوجود سب کے منع کرنے کے سب کام خود کرتے تھے۔ اور ہم لوگوں کو اصرار پر ایک مختصر جواب یہ تھا۔ آپ لوگوں کی خدمت کا پھر کب موقع ملے گا۔ رات کو کھانا کھا کر تھکان کی وجہ سے سب گہری نیند سوئے۔

۱۹ کی صبح کو خیال تھا کہ نواح کی سیر کو جائیں گے۔ لیکن سید تو نگر حسین کو تھکان کی وجہ سے بخار آ گیا۔ اور حامد رسول صاحب بھی آج زین سواری کے لئے تیار نہ تھے۔ چونکہ باوجود بہت سے حفظ ماتقدم کے زین کی سختی کی وجہ سے کرسی پر بیٹھنے میں تکلیف معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے ڈاکٹر حسن بے نے آج کا دن آرام کے لئے رکھا۔ شام کے وقت دھوپ کسی قدر نرم ہوئی۔ تو ڈاکٹر رفیعی ڈاکٹر ظہور سید اسمٰعیل حسین شیرازی، میں اور چند دیگر اصحاب گھوڑے لے کر نکلے۔ دس میل پر ایک موضع تھا۔ لوگ پہلے تو دیکھ کر حیران ہوئے۔ لیکن جب ہلال احمر کے ڈاکٹر کاظم بے نے جو ہمارے ساتھ تھے۔ ان کو بتلایا کہ یہ ہندوستانی ہلال احمر کے ڈاکٹر ہیں اور کام ختم کر کے اپنے بھائیوں کو یہاں دیکھنے آئے ہیں۔ تو فوراً ہمارے گھوڑے پکڑ کر ہم کو اتارا۔ ایک قہوہ خانہ میں لے گئے گھاس کی بنی ہوئی بہت سی چھوٹی چھوٹی کرسیاں لا کر ڈال دیں دو تخت وہاں پہلے سے پڑے ہوئے تھے۔ کرسیوں پر ہم کو بٹھایا موضع کے عمر اور با اثر آدمی تختوں پر بیٹھے۔ باقی آدھے قطار لگا کر سامنے زمین پر بیٹھ گئے۔ ایک آدمی اسی وقت موضع کے مولوی صاحب کو بلانے کے لئے بھیجا گیا۔ میں یہ لکھنا بھول گیا تھا۔ کہ چناق قلعہ سے انسپکٹر مدارس ضلع بھی ہمارے ساتھ آئے تھے۔ اور اس جگہ وہ ہمراہ تھے۔ انسپکٹر صاحب نے مولوی صاحب سے اسکول کے متعلق کچھ سوالات کئے۔ ان سے معلوم ہوا۔ کہ مختصر پیمانہ پر زنانہ مردانہ دونوں اسکول ہیں۔ لڑکیوں کو قرآن شریف پڑھا کر امور خانہ داری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ کشیدہ کاڑھنا، کھانا پکانا وغیرہ اس کے لئے ایک عورت مامور ہے۔ بچوں کو ابتدائی تعلیم دی جاتی ہے۔ جس میں بعد مذہبی تعلیم کے تھوڑا حساب جغرافیہ بھی شامل ہے۔ ایک بات ہم نے خاص طور پر دیکھی ہے۔ کہ حاضرین میں جوان کوئی اتفاقیہ ہی تھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ صرف اس موضع سے ۔ آدمی لڑائی پر گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں قہوہ آیا اور سگریٹ کی جگہ اناطولین تمباکو اور کاغذ پیش کیا گیا۔ دیا سلائی کی جگہ ٹی پیٹین کے سکلے پیالے اس میں رکھے۔ اور چند آگ کی چنگاریاں پڑی ہوئی۔ اس سے سگریٹ بنا کر سلگائے گئے۔ جب ہم نے رخصت چاہی، تو نہایت خلوص اور سادگی سے مصر ہوئے۔ کہ آج رات یہیں گذاریئے۔ ہمارا جی بھی چاہا کہ مگر ڈاکٹر حسین بے متفکر ہوئے۔ اس لئے واپسی ہی مناسب معلوم ہوئی۔ یہ جگہ اور بعد میں دوسرے دیہات دیکھ کر یہ قیاس بے جا نہ ہوگا۔ کہ تمدن، تہذیب مذہبی احساسات اور عام طرز معاشرت میں استنبول سے قطع نظر کر کے دیہات اور قصبات ہم ہندوستانی مسلمانوں سے بہمہ وجوہ فائق ہیں۔ مکانوں کا طرز تعمیر، ان کی صفائی ستھرائی۔ عورتوں کی تعلیم پردہ اور حیا۔ مردوں کا ستر پوش لباس۔ نماز، روزہ و دیگر اسلامی احکام کی تکمیل۔ یہ سب باتیں ایسی ہیں کہ جن پر وہ مسلمان جن کو خدا نے ان تمام نعمتوں سے مستفیض فرمایا ہے۔ بجا طور پر ناز کر سکتے ہیں۔ مستورات بے تکلف باہر نکل کر کام کرتی ہیں۔ لیکن ایسے گہرے پردے میں کہ مجال نہیں غیر مرد ان کی ایڑی بھی دیکھ پائے۔ ہم نے کھیتوں میں کام کرتے ہوئے بعض مستورات کو دیکھا۔ سر سے پاؤں تک برقعہ میں ڈھکی ہوئی اور اس پر بھی جب ان کی نظر ہم پر پڑی تو فوراً کھیت میں بیٹھ گئیں۔ دیہات میں دھوبی کا نام نہیں۔ امیر گھروں میں خادم اور متوسط و غربا میں اپنے کپڑے خود دھو لیتے ہیں ہر گھر میں چھوٹا سا باغیچہ ضرور ہوتا ہے۔ کبھی کسی بچہ کو برہنہ یا میلا کچیلا نہیں دیکھا۔ مردوں کا لباس ہمارے افغانی بھائی ہینگ والوں سے بہت ملتا جلتا ہے۔ شلوار، پگڑی۔ بعض جگہ خط و خال بھی بہت ملتے جلتے ہیں۔ صرف امتیازی نشان ہر مرد میں یہ ہے۔ کہ افغان تند خوئی میں ضرب المثل ترک نرم خوئی میں عدیم المثال۔ بہر حال یہاں سے رخصت ہو کر دن چھپے ہم واپس شفاخانہ میں پہنچے۔ راستہ میں قابل ذکر واقعہ درپیش آیا۔ کہ تمام گھوڑے شیرازی صاحب کی شہسوارانہ رانوں سے آشنا ہو گئے۔ بار بار گھوڑے بدلے

لیکن غریب سے غریب گھوڑا بھی ان کی ران کے نیچے آکر بدلگامی کرتا تھا جس کی وجہ سے مجبور ہو کر کئی ایک دفعہ گویا دل نخواستہ زمین پر آنا پڑا۔ بارے خدا خدا کر کے راستہ طے ہوا۔ ڈاکٹر حسن بے نے شفا قارہ پہنچ کر چناق قلعہ ٹیلیفون کر دیا تھا۔ کہ ایک اچھا فوٹوگرافر یہاں بھیج دیا جائے۔ چنانچہ ۲۹ کی شام کو وہ آگیا۔

۳۰ کی صبح کو ڈاکٹر حسن بے نے اول مختلف گروپ اپنے شفاخانہ کے لئے۔ اس کے بعد ایک بیٹھ کر دوسرا جب گھوڑوں پر سوار ہو کر چلنے کے لئے تیار ہوئے اس وقت ہمارا اور اپنے اسٹاف کا شامل گروپ لیا۔ گھوڑوں والا گروپ خصوصاً شاندار ہے۔ ناشتہ ہم صبح کر چکے تھے۔ دوپہر کے لئے دو ٹٹوؤں پر ساتھ لے لیا گیا۔ اور تقریباً ۸ گھوڑے سواروں کا دستہ جم ادیہ سے روانہ ہو گیا۔ راستہ میں قاضی بشیر الدین صاحب نپولین بنے۔ عبدالرحمٰن صاحب پشاوری کو مارشل نے کا خطاب ملا۔ غلام احمد خاں اور میرے لئے بھی اسٹاف کی مناسبت سے نام عطا ہوئے۔ اور سب سے کارآمد اور موزوں نام سید اسماعیل حسین صاحب شیرازی کے لئے توپ خانہ کا تجویز ہوا راستہ بہت خراب تھا۔ اور بعض دفعہ تو حقیقت میں نپولین اور اس کے اسٹاف کو توپ خانہ کھینچ کر لانے میں بہت ہی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ مبادا دشمن کے قبضہ میں نہ چلا جائے۔ کیونکہ اکثر توپ خانہ بہت ہی پیچھے رہ جاتا ہے۔ مارشل نے اور نپولین کے (FLANKING) (MOVEMENT) سے سب کا قافیہ تنگ تھا۔ کبھی کبھی اسٹاف کو بھی زبردستی شامل ہونا پڑتا تھا۔ منشی تفضل حسین صاحب نے اپنی قدامت کا لحاظ کئے بغیر ایک نہایت ہی جسیم گھوڑا اپنے لئے پسند فرمایا۔ اور اس پر دونوں ہاتھوں سے زین پکڑ کر اس شان سے بیٹھے کہ ان کی ہیئت کذائی نے نپولین اور مارشل نے کو مجبور کیا۔ کہ اپنی فوجی نقل و حرکت کے دائرہ میں ان کو بھی شامل کر لیں لیکن دو ہی دفعہ گھوڑے کے دولتی پھینکنے پر بوڑھے صاحب نے مناسب سمجھا۔ کہ اپنی ہمراہیوں سے علیحدہ ہو کر ڈاکٹر حسن بے سے بھی دو قدم آگے چلیں تاکہ گھوڑا سکون سے چلے اور ان کا سفر بھی خیریت سے کٹ جائے۔ دس گیارہ میل چلنے کے بعد قصبہ دازنیرہ میں پہنچے۔ یہ قصبہ ضلع چناق قلعہ کی ایک تحصیل ہے۔ یہاں حکومت کی طرف سے ایک تحصیلدار رہتے ہیں۔ شہر کے درمیان ہو کر ایک ندی جاتی ہے۔ اور ندی کے دونوں طرف شہر آباد ہے۔ دونوں آبادیوں کو ایک پل ملاتا ہے۔ ہم پل سے گذر کر شہر کے ٹاؤن ہال تک پہنچے۔ یہاں چند [illegible] کے سپاہی کھڑے تھے۔ انہوں نے ہمارے گھوڑے بندھوانے کا انتظام کیا۔ ٹاؤن ہال کے چند کلارک ہم کو بالاخانہ پر لے گئے جو نہایت ہی خوشنما اور سلیقہ سے آراستہ تھا۔ اطلاع ہونے پر تحصیلدار صاحب مع عمائدین شہر ہم سے ملنے کے لئے تشریف لائے۔ تحصیلدار صاحب کی آمد پر مولوی محمد شریف و ڈاکٹر فیضی صاحبان تو حیران رہ گئے۔ اور قریب تھا کہ کوئی استعجابیہ کلمہ بھی منہ سے نکل جائے۔ کیوں کہ تحصیلدار صاحب قاضی رفیع الدین بیرسٹر ایٹ لا بمبئی سے اس قدر مشابہ ہیں کہ معاً ہر دو صاحبان کو یہ خیال ہوا۔ کہ شاید کسی اتفاق سے اچانک قاضی صاحب یہاں تشریف لائے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر حسن بے کی قریب ملاقات نے وہ طلسم توڑا۔

تحصیلدار صاحب سراپا متانت اور نہایت خلیق تھے۔ باتیں کرتے وقت زود فہمی اور ذکاوت برستی تھی۔ بہت دیر تک ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات دریافت کرتے رہے۔ بار بار یہ لکھنا تو فضول ہے۔ کہ مسلمانان ہند کا شکریہ ادا کیا۔ کیوں کہ یہ تو ہر ملاقات کا تمہیدی باب ہے خواہ وہ سلطان معظم سے ہو یا کسان سے ہر شخص کا دل احسان مندانہ اور تشکرانہ جذبات سے اس قدر لبریز ہے کہ گفتگو کی ابتداء اسی طرح ہوتی ہے۔ کہ قوت بلاغیہ کی پوری طاقت اظہار تشکر میں صرف کر دی جاتی ہے۔ قہوہ سگریٹ کے بعد شہر کی سیر کو نکلے۔ اس قصبہ میں عیسائی کم اور مسلمان زیادہ ہیں۔ بازاروں میں پتھر کی بڑی بڑی سلوں کا فرش لیکن پتھر کٹا ہوا تھا۔ چمڑے کا کام بنانے والوں

کی دوکانیں - یہاں زیادہ نظر آئیں جوتا، گھوڑے کا زین وغیرہ ہیٹیں، بڑہ۔ جوتا یہاں بوٹ بھی بنتے ہیں۔ اور پرانی وضع کے بھی پرانی وضع کا جوتا ہمارے ہندوستانی پاپوش ہوتے سے بالکل اشبہ ہے۔ کچھ عجیب نہیں جو ایجاد ایک جگہ کی ہو۔ شہر میں گھومنے کے بعد دو تین دیہات میں گئے۔ ہر جگہ نہایت فراخ دلی کے ساتھ ہمارا خیر مقدم ہوا۔ اور بالکل یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ ہندوستان کی پرانی طرز کے دیہات سے ہم مل رہے ہیں۔ وہی خلق، وہی تواضع اور وہی متانت۔ ودقار ہر گاؤں میں پختہ مسجد، قہوہ خانہ اور مکتب موجود متمول لوگوں کی نشست گاہیں جس میں فرصت کے وقت شرفاء جمع ہوتے ہیں۔ گاؤں کے چاروں طرف انگور اور زیتون کے باغات بکثرت ہیں جو دور سے بالکل ہندوستان کے آم کے باغات معلوم ہوتے ہیں۔ اب پھرتے پھرتے تقریباً ایک بج گیا تھا۔ اور بھوک نے ستانا شروع کر دیا دو بجے کے قریب ہم قوجہ علی موضع میں پہنچے۔ یہ نہایت ہی چھوٹا سا موضع تھا۔ اور چاروں طرف خشک پتھر کی چٹانوں سے گھرا ہوا تھا۔ بڑی بڑی چٹانیں ایک دوسرے پر اس طرح علیحدہ علیحدہ بنی ہوئی تھیں۔ جیسے کسی مشین سے رکھ دی گئی ہوں۔ موضع کے آدمی مصر ہوئے۔ کہ آپ موضع میں ٹھہریں۔ لیکن ڈاکٹر حسن بے نے موضع کے باہر زیتون کے درختوں کے سایہ میں ٹھہرانے کی جگہ پسند کی۔ موضع کے آدمی دسترخوان قالین اور گدے لے آئے ہم نے کچھ دیر آرام کیا۔ اور ہم منہ ہاتھ دھو کر کھانے کے لئے بیٹھے۔ ڈاکٹر حسن بے کھانا نہایت تکلف کا اپنے ساتھ لائے تھے کچھ اضافہ موضع والوں نے کیا تازہ پنیر، دہی، دودھ، پیاز اور چند سبزیاں انہوں نے بہت سی لا رکھیں۔ بھوک سخت لگی ہوئی تھی خوب لطف سے کھانا کھایا۔ بلکہ بھوک میں بے اندازہ کھا گئے۔ پیٹ ہلکا کرنے کے لئے کچھ دیر پہاڑوں پر چڑھے اترے اور پھر سوار ہو کر آگے بڑھے۔

ابھی ہم چولداریوں تک نہیں پہنچنے پائے تھے۔ کہ تمام آدمی ایس ہو کر ایک قطار میں ہمارے راستہ میں کھڑے ہو گئے۔ فوجی ہلالی کے بعد کپتان ان سے کہتا تھا۔ کہ دیکھو یہ تمہارے بھائی ہندوستان سے تمہاری تکلیف اور درد میں حصہ لینے کے لئے آئے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سرکی اور چتاق کی مہموں میں ہزاروں مجروحوں کا علاج کیا۔ اب یہ رخصت ہونے والے ہیں۔ اور اس نواح میں اپنے بھائیوں کو دیکھتے اور رخصت ہوتے پھر رہے ہیں۔ کچھ بیان نہیں ہو سکتا ہے۔ کہ یہ الفاظ ان سچے مسلمان غازیوں میں کیا جذبات پیدا کرتے تھے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کے چہرے اس مختصر اسپیچ کے وقت کس طرح چمک اٹھتے تھے۔ دفور جذبات سے بعض کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں۔ اور بعض ایک لمبے سانس لیتے تھے۔ یوں ہی کپتان نے تقریر ختم کی۔ اور ایک ساتھ سپاہیوں نے "لیتا شوں" "لیتا شوں" کے نعرے لگانے شروع کئے۔ اور دور تک ہم ان کے دعائیہ فقرات سنتے چلے جاتے تھے۔ جب تک روشنی رہی تب تک تو ہر جگہ قہوہ اور سگریٹ کی رسم جاری رہی۔ لیکن اندھیرا ہو جانے کے بعد گھوڑوں کی رفتار بھی تیز کرنی پڑی۔ اور ملاقات بھی مختصر سے مختصر۔ گھوڑوں کی رفتار تیز ہو جانے کی وجہ سے زمین بوسی کا سلسلہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ جوش و خروش سے شروع ہو گیا۔ بسم اللہ نے عثمانی ہلال احمر کے ہر دلعزیز ادارہ معمورلے کی۔ گھوڑا پوری دلکی چلا جا رہا تھا۔ اور اس کی نگاہیں زمین پر لگی ہوئی تھیں۔ کہ اوپر سے ایک درخت کی شاخ میں الجھ کر چاروں شانے چت گرے۔ بدقسمتی سے بجائے اس کے کہ ان کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ سب بے اختیار قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ ادمان کو تو اس گرنے میں نیا لطف آیا۔ کہ برابر یہ حرکت جاری رکھی چم اد یہ تک تین مرتبہ گھوڑے کے قدموں میں گر کر اسے روکنے کی کوشش کی۔ ادارہ معمور کے بعد نمبر سید اسمٰعیل حسین صاحب شیرازی کا تھا۔ سچ یہ ہے۔ کہ ان کے گرنے میں بھی ایک شان ہے اگر کوئی شہسواری پر ناز کرے تو ہمارے شیرازی صاحب بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ گرنے کے لئے بھی کمال کی ضرورت ہے۔ شیرازی

صاحب کبھی کبھی اس زور سے نہیں گرتے۔ کہ چوٹ آئے۔ اگر گھوڑا اونچا ہوتا تو تیند زیچ گرتے ہیں۔ اور اگر گھوڑا ان کے قد کے مناسب ہو تو آٹے کی گون کی طرح سہولت سے پھسل جاتے ہیں۔ میرا جہاں تک خیال ہے۔ شیرازی صاحب نے اس سفر میں اپنے کمال کی نمائش دو دفعہ کی۔ لیکن خود شیرازی صاحب کو صرف ایک مرتبہ یاد ہے۔ اس لئے یقیناً ان کی یادداشت زیادہ قابل اعتبار ہے۔ افسوس تفضل حسین سید تونگر حسین۔ اور مارشل بے عبدالرحمٰن پشاوری صاحب بھی اس لالچ سے اپنا دامن ملوث کئے بغیر نہ رہ سکے۔ اور انہوں نے بھی اپنے لیڈر شیرازی صاحب کی تقلید کی۔،،

اب رات بہت تاریک ہوگئی تھی۔ اور راستہ خراب بعض ہمراہی بہت پیچھے رہ جاتے تھے۔ اس لئے تھوڑے فاصلے پر مذکورہ صدر ادارہ مامور صاحب "تمام،، کی صدا زور سے لگاتے تھے۔ اگر سب ساتھ ہوتے تو سب نے "تمام،، کہہ دیا۔ اگر کوئی غائب ہوا۔ تو جواب میں "نقصان،، کی صدا آتی تھی۔ غرض خدا خدا کر کے نقصان نہیں اا بجے کے قریب واپس پہنچے۔ یہاں آکر معلوم ہوا کہ ابن پاشا معہ پاشاؤں کا اسٹاف اور کرنل راہی بے ہم سے ملنے آئے ہیں۔ ابن پاشا تو سو گئے تھے۔ مگر حلمی پاشا جو نہایت ہی معمر اور فرشتہ خصلت آدمی ہیں۔ ہمارے منتظر تھے۔ فرینچ خوب بولتے ہیں۔ قاضی بشیر الدین صاحب کی معرفت بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد سو گئے۔

۲۱ کی صبح کو چناق قلعہ کی واپسی کی تجویز تھی۔ آج تو گھوڑ دن کا تصور کرنے پر بعض صاحبوں کو ہول آنے لگا۔ لیکن گاڑیاں واپس جا چکی تھیں۔ اس لئے زین سواری کے سوا چارہ نہ تھا۔ پاشاؤں اور شفاخانہ والوں سے رخصت ہو کر مع کرنل راہی بے یہاں سے روانہ ہوئے۔ ابھی تک ہنیس لڑائی ہم نے نہیں دیکھ لیا تھا۔ اب واپسی میں وہ راستہ اختیار کیا۔ جس میں ہم اس تاریخی مقام کو دیکھ سکیں۔ راستہ بعض جگہ سے تو اس قدر دشوار گذار تھا۔ کہ گھوڑے چھوڑ دینے پڑے۔ ایک طرف پہاڑ دوسری طرف ایک چوڑی ندی خالی گھوڑا بھی مشکل سے گزرا۔ اس گھاٹی کو طے کر کے گھوڑوں پر سوار ہوئے تھے۔ کہ ہمارے ڈاکٹر فیضی صاحب کے پیٹ میں کچھ بے چینی پیدا ہوئی۔ اور وہ ہم سے علیحدہ ہو کر جھاڑیوں میں غائب ہو گئے۔ ہم نے ان کے انتظار میں گھوڑوں کی رفتار دھیمی کر دی۔ جب بہت دیر ہو گئی۔ اور ڈاکٹر صاحب نہ آئے۔ تو مجبوراً کھڑے ہو کر انتظار کرنا پڑا۔ تقریباً آدھ گھنٹہ ٹھہرے رہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب نہ آئے۔

کرنل راہی بے مجبور ہو کر پھر روانہ ہو گئے۔ اور ان کے ساتھ ہمارے ممبر بھی۔ لیکن ڈاکٹر رضا صاحب کو چونکہ ڈاکٹر فیضی سے بوجہ قیام عمر کی نسبتاً زیادہ انس تھا۔ اس لئے انہوں نے پیٹ کی چقلش کا عذر کیا اور مجھے اکیلا چھوڑ کر ایک کھیت میں غائب ہو گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد ڈاکٹر صاحب کھیت سے جو واپس تشریف لائے تو بے حد نڈھال تھے۔ چہرہ پر ہوائیاں چال ڈگمگاتی ہوئی۔ غالباً ڈاکٹر فیضی صاحب کے نہ آنے کی وجہ سے یہ پریشانی ہوئی۔ ساتھی بہت دور چلے گئے۔ اس لئے سوار ہونے میں جلدی کی۔ لیکن تقدیر میں جلدی نہ لکھی تھی۔ ابھی ڈاکٹر صاحب آدھے ہی سوار ہوئے تھے کہ دھم سے زمین پر اور زین بھی بجائے کمر کے پیٹ پر آگیا۔ دیکھنے سے معلوم ہوا۔ کہ زین کے نیچے سے ایک کمبل کی تہہ ڈاکٹر صاحب کہیں گرا آئے ہیں۔ خدا خدا کر کے اس کو درست کیا اور پیش رفتگاں کے قدم دیکھتے ہوئے چلے۔ گھوڑے بعض جگہ سرپٹ کرنے پڑے۔ اور تقریباً تین میل پر ہم نے ساتھیوں کو جا پکڑا۔ اب ڈاکٹر فیضی صاحب بھی کسی طرف سے آملے۔ تینوں ڈاکٹروں میں سے دونوں اپنا فرض ادا کر چکے تھے۔ صرف ڈاکٹر رضا صاحب باقی تھے۔ انہوں نے بھی اپنے مہاجرین سے پیچھے رہنا پسند نہ کیا اور وہ بھی درد شکم کی شکایت کر کے ہم سے

جدا ہوئے۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ کل کے سفر میں مختلف پانی پینے سے ہمارے تین ڈاکٹروں کو پیچش ہوگئی۔ ڈاکٹر رحمن صاحب کے آجانے کے بعد ہم ایک موضع میں پہنچے۔ یہاں آبادی بہت کم تھی۔ اور ایک کرد رسالہ ٹھہرا ہوا تھا۔ اس رسالہ کا ہر ایک جوان نام دنہریاں معلوم ہوتا تھا۔ ہر سپاہی پر ایسے پن کی شان برستی تھی۔ زیادہ تعریف فضول ہے۔ صرف اتنا لکھنا بس ہے۔ کہ یہ وہی کرد تھے جن کا ظلم شہرہ آفاق ہے۔ یہاں ہم نے کھانا کھایا۔ جو ڈاکٹر حسن بے نے ساتھ کر دیا تھا۔ اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد بینس لڑائی کے کھنڈر دیکھنے چلے۔ جو یہاں سے صرف میل بھر تھی۔

رسالہ کا ایک نوجوان لفٹنٹ ایک نہایت نفیس گھوڑے پر بلازین ولگام سوار ہو کر ہمارے ساتھ چلا۔ یہ اس کی شہ سواری تھی۔ کہ گھوڑے نے اس کی ران کے نیچے ذرا ہیں نہیں کی۔ لڑائی کے کھنڈروں میں کردوں اور عربوں کی مخلوط رجمنٹ پڑی ہوئی تھی۔ انہوں نے ہم کو ٹھہرنے کے لئے کہا۔ گدی اور قالین زمین پر ڈال دئے اور سب ایک جگہ نہایت بے تکلفی سے بیٹھ گئے۔ اول سگریٹ پیش کئے گئے۔ اس کے بعد قہوہ کی باری آئی۔ قہوہ کی پیالیاں تو معمولی تھیں۔ لیکن قہوہ ان میں چند قطرے ہی تھا۔ کرنل راہی بے نے بتلایا کہ تھوڑا قہوہ دینا علامت محبت ہے۔ پیالی بھر کر دینا اس کے برعکس۔ مہمان جتنا زیادہ دفعہ طلب کرے اس کی طرف سے اظہار محبت ہے۔ اگر انکار کیا جائے تو عداوت سمجھی جاتی ہے۔ قہوہ اس قدر تلخ تھا۔ کہ پینا دشوار ہو گیا۔ مگر مجبوری خوف کے مارے پینا پڑا۔ اور خدا کا شکر کیا کہ محبت کی علامت میں تھوڑا دیا۔ ورنہ مشکل پڑ جاتی۔ یہاں سے اٹھ کر پیدل کھنڈر دیکھنے گئے۔ یہ نام ہی پرانے آثار ہیں۔ اور مرور زمانہ نے ان کو بالکل زیر زمین دفن کر دیا ہے۔ سلطان عبدالحمید خاں کے زمانہ میں کسی امریکن کمیٹی کو کھودنے کا ٹھیکہ دیا گیا تھا۔ اس کمیٹی نے تھوڑی سی جگہ صاف کی۔ اور جو کچھ ملا لے گئی۔ اب صرف غار ہیں اور بے پتھر۔ لیکن ان پتھروں میں بھی قدیم صنعت کے لاجواب نمونہ پائے جاتے ہیں۔ ساحل سے یہ جگہ بہت ہی قریب ہے۔ سد البحر یہاں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر گھوم گھام کر ہم پھر سوار ہو گئے۔ ارن کوئی تک کرنل راہی بے ساتھ آئے۔ یہاں سے وہ رخصت ہوئے۔ اور ہم دن چھپے کے قریب چناق قلعہ بخیریت پہنچ گئے۔ یہاں آکر معلوم ہوا۔ کہ ڈاکٹر محمود اللہ عبدالرحمن بیجر اور شعیب قریشی بھی کل سے آئے ہوئے ہیں۔

یہ بھی بڑے بنیں گے
بچوں کا بھولپن دیکھئے، سمجھتے ہیں کہ صرف کپڑے پہن کر بڑے بن سکتے ہیں! لیکن سمجھدار والدین جانتے ہیں کہ ان کا صحیح نشوونما تو خوب غذائیت اور اچھے ہاضمے پر منحصر ہے، اور یہ دونوں چیزیں سنکارا بخوبی مہیا کرتا ہے۔
سنکارا جڑی بوٹیوں، معدنی اجزا اور کثیر حیاتین کا ایک متوازن مرکب ہے، جو عام کمزوری کو دور کرتا ہے مرض سے چھٹکارا پانے کے لئے قوت مدافعت پیدا کرتا ہے اور پٹھوں، ہڈیوں اور دانتوں کو مضبوط بناتا ہے۔ نزلہ زکام نہیں ہونے دیتا۔ سنکارا کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ ہر موسم میں استعمال ہوتا ہے۔
Cinkara
سنکارا
بچوں کے لئے بے مثل ٹانک — اور آپ کے لئے بھی
ہمدرد
ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان کراچی ڈھاکہ لاہور

OUR FIRST
CUSTOMERS
ARE STILL
WITH US.
After more than a decade, Golden Block Works can say with pride that our first customers are still among our satisfied clients In view of competition and rapidly advancing printing trends, no higher compliment could be paid to our efficiency
Using the most up to-date process, Golden demands the ultimate in precision and speed — the standards which make clients, (present and future,) our life-long friends
Line and halftone blocks
in colour or monochrome
Matrices and sterio blocks
Colour plates from transparencies
Photoprints and photostats
Printing and Designing
Golden Block Works
South Napier Road Karachi
Phones 31415 - 38013
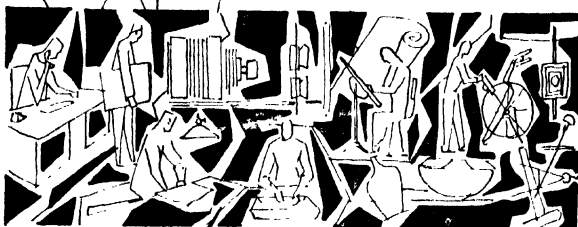
۳۰۵

قسطنطنیہ کی چٹھی

(جمعہ ۱۲ ستمبر ۱۹۱۳ء)

مسٹر عبدالرحمٰن نے ذیل کی یہ دل چسپ اور پر از معلومات چٹھی تازہ ولایتی میل سے ہمارے نام ارسال کی ہے۔ جسے ہم بہ خوشی درج اخبار کرتے ہیں۔

جو خط میں نے آپ کو جلدی میں ایڈریانوپل سے لکھا تھا۔ اس میں میں نے بعد میں تفصیل کے ساتھ حالات لکھنے کا وعدہ کیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اپنی روانگی کے باعث اس سے پیشتر خط نہ بھیج سکا۔ اگرچہ مجھے دیر ہو گئی ہے تاہم نہ بھیجنے سے بہتر ہے۔

ایڈریانوپل کے متعلق جو میرے مشاہدات ہیں وہ اور ان کے علاوہ چند ضروری واقعات ذیل میں تحریر کیے جاتے ہیں۔

اس سے پیشتر کہ دوسرے اشخاص کو اس کا وہم و گمان بھی ہو ہمیں اپنے خاص ذرایع سے معلوم ہو گیا تھا کہ پیش قدمی کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ جب ہم نے خبر سنی ہم نے انور ڈاکٹر بسیم عمر پاشا کے پاس گئے اور کہا کہ پیش قدمی کی صورت میں ہم ایک چھوٹی سی جماعت مرتب کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ فوج کے ساتھ رہ کر سب سے پہلے مدد دے سکیں۔ ہم قدرتی طور پر ایک بڑے فوجی اسپتال کا انتظام نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے کہ اول تو اس میں بہت وقت صرف ہوتا ہے اور دوسرے ہم صرف چند آدمی ہی تھے۔ فوج میں اس قسم کے انتظامات ہوتے ہیں کہ خود سپاہی میدان جنگ سے زخمیوں کو ایک چھوٹے سے خیمے میں لے آتے ہیں۔ جہاں ایک ڈاکٹر اور دو تین جراح فوری تیمارداری کرنے کے بعد انہیں فوجی اسپتال میں بھیج دیتے ہیں۔ جو ہمیشہ گولہ باری کی زد کے باہر مقامات میں واقع ہوتا ہے۔ ڈاکٹر بسیم عمر پاشا نے وعدہ کر لیا کہ فوری مدد کرنے کے لیے تمہیں بھیج دیں گے۔ اور ہم اس نئی اور دل چسپ خدمت کو پورا کرنے کے خیال میں مست تھے لیکن افسوس ہے کہ ہمارے خیالات پورے نہیں ہوتے۔ فوج اس قدر تیزی کے ساتھ بڑھی کہ اس سے پیشتر ڈاکٹر بسیم عمر پاشا ہمارے لیے اجازت حاصل کر سکیں۔ اس نے لوسی برغاس پر قبضہ کر لیا تھا۔ ایڈریانوپل کی دوبارہ تسخیر کا ہر لحظہ انتظار

---

[1] سابق گورنر مشرقی پاکستان۔

گیا جا رہا تھا۔ علاوہ ازیں ان مقامات پر قبضہ کرنے میں کوئی جنگ بھی نہیں ہوئی۔ سوائے اس کے کہ ایڈریانوپل۔ ترقی۔ کلسیا اور ریزا کے قریب آخری دن ایک جنگ ہوئی تھی۔ مگر یہ سب صرف چھوٹے چھوٹے معرکے تھے۔ اور حقیقتاً کوئی بڑی جنگ نہیں تھی۔ آخر کار "عید حریت" کی سال گرہ کی شام کو "طنین" نے ۴ بجے ایک غیر معمولی ایڈیشن نکالا جس کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہو گیا کہ انور بے نے آبائی وطن کی بار دگر خدمت کی ہے۔ فوج کا مع اپنے جنگی سامان کے ایک دن میں ۸۰ کیلومیٹر چلنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ایڈریانوپل میں چشم دید شہادتوں سے جو اطلاعیں ہم پہنچی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً صبح کے سات بجے ۵ فدائی سوار شہر میں ڈرانہ اور بے خوف گھس آئے۔ آدمیوں کے واپس آنے پر انور بے کی ہمراہی میں ابراہیم کا رسالہ تقریباً ساڑھے نو بجے آپہنچا۔ اس واقعہ کے ایک دو گھنٹے بعد آدمی کورس کی دسویں پلٹن جو خورشید پاشا کے زیر کمان تھی آپہنچی۔ اور شہر میں داخل ہو کر تمام استحکامات اور سرکاری عمارات پر قبضہ کر لیا۔ ایک جنرل اور تقریباً دو ہزار بلغاری قید کیے گئے۔ بلغاری ۲۶۰ توپیں بھی چھوڑ گئے تھے۔ پانچ فدائیوں کے پہنچنے کے ساتھ ہی لوگ جمع ہو گئے۔ اور "لیشاسوں عثمان بے" (خدا عثمانیوں کو عرصہ دراز تک سلامت رکھے) اور پاشا "ہم چوق جیشا" کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ یہودیوں کے ربی (مذہبی اقتدار) اور قدیم عثق بینڈ بجاتے ہوئے گاڑیوں میں بیٹھ کر نکلے۔ تاکہ ترکوں کا خیر مقدم کریں۔ لوگوں کی بشاش نگاہوں اور چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ اس سے پیشتر ان پر کس قدر ظلم ہو رہا تھا۔ ترک فی الحقیقت بطور منجی کے تھے اس لیے کہ انھوں نے لوگوں کو شیطان کے اعلیٰ افسروں کے پنجوں سے رہائی دی۔ ترکوں کا استقبال کرنے کے لیے آبادی کے ساتھ یونانی بھی شامل تھے۔ ان حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ ترک ان کے پرانے دوست ... ری سے بدرجہا افضل ہیں۔ اس کے ثابت کرنے کے لیے میرے پاس مضبوط دلائل بھی ہیں۔ ان لوگوں نے بلغاریوں کو مسلمانوں کے قتل کرنے میں بے حد مدد دی تھی۔ لیکن نئے دور کے بعد جو صورت معاملات نے اختیار کی۔ اس میں بلغاریوں نے یونانیوں کو اپنے سلوک کا کرشمہ دکھلا دیا۔

میں اپنے اصلی پوائنٹ سے ذرا دور جا رہا ہوں۔ اس خبر کو پر امن اور پر از شکوہ استنبول نے بھی نہایت مسرت کے ساتھ سنا۔ مختلف مقامات پر جلوس نکالے اور بینڈ بجائے گئے۔ اسی رات کو حاجی عادل بے اور ان کی ولایت کے مختلف افسر چھ سو جندرمہ کے سپاہیوں کی ہمراہی میں تشریف لے گئے۔ خوش قسمتی سے مال عمر بے نے ہمیں وقت پر خبر دی۔ اور اس لیے ہم بھی شان دار اور پر جوش مجمع کے ساتھ انہیں الوداع کرنے گئے۔ ہز ایکسلنسی طلعت بے اور دیگر دیوانی اور فوجی اعلیٰ افسر بھی موجود تھے۔ اعزازی گارڈ جو فوجی اور پولیس کے سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ موجود تھا۔ ہمارا تعارف نئے والی کے ساتھ کیا گیا۔ جس نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ اور رجب کمال بے نے ان سے کہا کہ ہم ہلال احمر کے اسپتال میں کام کرنا چاہتے ہیں تو انھوں نے ایڈریانوپل میں آنے کی دعوت دی اور کہا کہ میں حتے الامکان تمہاری مدد کروں گا۔

ہراول کے ساتھ نہ جانے میں جو ہمیں مایوسی اٹھانی پڑی تھی۔ وہ پورے طور پر زائل ہو گئی۔ جب کہ بسیم عمر پاشا نے ہمیں اپنے ساتھ لے جانے اور ایڈریانوپل میں ہلال احمر کے ہسپتال میں کام کرنے کے لیے کہا۔ اس وقت یہ خیال تھا

کہ بلغاری بہت سے ترکی قیدیوں کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ اور بالفرض اگر جنگ ہوئی تو اس صورت میں ہم بہت مفید ثابت ہوں گے۔

انتظامات کرنے کے بعد ہم آج کی صبح کو عازم ایڈریانوپل ہو گئے۔ سرکجی کے اسٹیشن ماسٹر نے ہم سے کہا کہ "میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا ٹرین سیدھی ایڈریانوپل تک جائے گی یا نہیں۔ اس لیے کہ والی جو آپ سے ایک شب پہلے روانہ ہوئے تھے۔ شارلو یا لولی برغاس سے گھوڑے پر سوار ہو کر جائیں گے۔" بہرحال محض اپنے اتفاق کے سہارے ہم روانہ ہو گئے ہم سب گنتی میں چھ تھے۔ بن خالق، غلام احمد، منظور، شعیب اور میں ڈاکٹر نواد کی ماتحتی میں جا رہے تھے۔ ہم سینٹ اسٹیفانو، کوچک حکمہ اور پیارے عمرلی کے مانوس مناظر طے کرتے ہوئے اپنے عملیات خانہ اور آبدست خانہ سمیت دن کے بارہ بجے خادم کوئی پہنچ گئے۔

یہاں سے سفر کا نہایت تکلیف دہ اور خوفناک حصہ شروع ہوتا ہے۔ بلغاریوں کی سفاکیوں اور خون ریزیوں پر بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ اور چنانچہ اب شاہ فلسطین والی یونان نے بھی موقع پا کر ان غریب مظلوموں کی تائید میں اپنی آواز بلند کی ہے جنہوں نے ان وحشیوں کے ہاتھوں تکلیف اٹھائی ہے۔ کاش وہ اپنی عیسائی سپرٹ کا اظہار اس وقت کرتے۔ جب کہ غریب مسلمانوں کے گلوں پر چھری چل رہی تھی۔ خود ان کے سپاہی اور دوا نسروں نے ظلم کرنے میں کچھ کمی نہیں کی۔ ممکن ہے کہ وہ بلغاریوں کی نسبت کچھ کم خون خوار ہوں۔ مگر مسلمانوں کی مخالفت میں تو سب کے سب یکساں تھے۔ اگر اس کمیشن نے جس کا مطالبہ اس وقت یونان کر رہا ہے۔ باضابطہ تحقیقات شروع کر دی۔ تو مجھے یقین ہے کہ یونان کو سرخ روئی کی بجائے تھوڑی بہت شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ لیکن مجھے تو یورپ کے انصاف اور رحم پسندی پر بالکل اعتبار نہیں رہا۔ اگر اس کمیشن نے تحقیقات کی بھی تو وہ انسانیت اور رحم کے تقاضے سے نہیں بلکہ سیاسی وجوہ سے ضرور متاثر ہوگی اور مظلوموں کے ساتھ کبھی انصاف نہیں ہوگا۔ اور اس طرح اصل مجرم جائز سزا سے بالکل بچے رہیں گے۔ سانجلق تپہ اور قلعۂ احمد پاشا کا چکر کھاتی ہوئی ریل گاڑی قاراسو کی وادی میں داخل ہوئی۔ اور یہ وہی مقام ہے جو اس جنگ میں بڑی بڑی خون ریزیوں کا منظر رہا ہے۔ ترکی تاروں کے جال یہاں ابھی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ مگر ان کی حالت بہت خراب ہے۔ قریب ہی بخشایش کے کھنڈر پڑے ہوئے ہیں۔ شہر کی مسجد کی چار دیواری ہی باقی رہ گئی ہے۔ اور اس پر چھت بھی ندارد ہے۔ علاوہ ازیں جس مینارے پر سے اذان دی جاتی ہے۔ وہ بھی نصف کے قریب ٹوٹا ہوا ہے۔ بالآخر ہم شتلجہ پہنچے۔ جب بلغاری اس مقام پر آئے ہیں تو اس وقت انہوں نے تمام مسلمانوں کو قتل کر ڈالا۔ اور مکانات اور مساجد کو گولہ اور بارود سے اڑا دیا تھا۔ اور جب وہ گئے ہیں تو انہوں نے تمام یونانیوں کو قتل کر دیا تھا۔ ان کی اس سفاکی کا نتیجہ یہ ہے کہ شتلجہ سے لے کر لولی برغاس تک کسی انسان کا پتہ نہیں۔ اور ایسا کوئی مکان نہیں جو قابل رہائش کہلایا جا سکے۔ یہاں بربادی اور تباہی پورے طور پر پائی جاتی ہے۔ ان پہاڑیوں میں مویشی تک نظر نہیں آتے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرندے بھی ان حیوانوں کے خوف سے بھاگ گئے ہیں۔ ریلوے اسٹیشن، سڑکوں، گاڑیوں، انجنوں کو اور پانی دینے کے حوضوں میں آگ لگا دی گئی تھی۔ اسٹیشنوں کے ترکی ناموں کو کھرچ کر اس پر بلغاری نام

لکھ دیئے گئے ہیں۔ یہ امر کہ ترکی فوج نے کس قدر جلد پلوں اور ریلوے پٹڑی کی مرمت کر ڈالی۔ ان کے جوش اور صناعی کی صاف دلیل ہے یشتلجہ سے ہو کر پھر ٹرین قباقچہ پہنچی۔ اور پھر وہاں سے سنکلی اور چرکس کوئی تک جاتی ہے۔ مؤخر الذکر مقام بلغاری جنرل سیودف کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اور وہاں خاص اس کی آنکھوں کے سامنے تمام اسلامی آبادی کو قتل کر دیا گیا تھا۔ مسجدوں کو جلا کر ڈھیر بنا دیا تھا۔ چنانچہ ریلوے اسٹیشن میں ایک درجن کے قریب تنور پائے جاتے ہیں۔ مانچیسٹر گارڈین کا نامہ نگار ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے ان مظالم کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اپنے آپ کو عیسائی کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔ گاڑی یہاں سے سیدھی شتالجہ ہو جاتی ہے۔ یہاں کی تمام قدیم ترکی فوجی بارکیں اور ہسپتال بالکل محفوظ ہیں۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ بلغاریوں نے انہیں فی الواقع چھوڑ دیا ہے۔ بلکہ یہ ہے کہ انہیں ان کو تباہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔ اس لیے کہ وہ بہت جلد ان مقامات کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ چرکس کوئی اور شادلوکی اردگرد کی پہاڑیوں کی سڑکوں پر ہمیں بہت سی گاڑیاں ملیں۔ جن میں مرد عورتیں اور بچے بیٹھے ہوئے جا رہے تھے یہ وہ مہاجرین ہیں جنہیں اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ مگر افسوس کہ ان کا کوئی بھی گھر نہ تھا۔ چند مقامات پر ہمیں خاندان کے خاندان ملے۔ جو ایک دیوار کے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس اجڑے ہوئے مکان میں وہ کبھی رہا کرتے تھے۔ جس تکلیف اور مصیبت میں یہ لوگ ہیں۔ وہ ناقابل بیان ہے اگر اتفاقیہ تمہیں کوئی ایسا مکان مل جائے جو بالکل صحیح سالم ہو۔ تو پہلا خیال جو تمہارے دل میں آئے گا۔ وہ یہ نہیں ہوگا کہ بلغاریوں نے نہایت فیاضی کے ساتھ اسے بچا لیا ہے) بلکہ یہ ہوگا کہ وہ کس طرح بلغاریوں کی زد سے محروم رہا؛ اس تباہی کا خیال کرو اور پھر اس غیر مضافی آبادی کا خیال کرو جسے بلغاریوں نے تلوار کے گھاٹ اتارا ہے قدرتی طور پر سب نہیں بھاگ سکتے تھے۔ اکثر حصہ پیچھے رہ گیا تھا۔ ہائے افسوس! وہ اب کہاں ہیں؟ غالباً جنرل سیودف اور اس کے سپاہی اس راز کو بہتر حل کر سکیں گے۔ شادلو سے ہو کر ہم لولی برغاس پہنچے۔ مرادلی اور رسیڈلی بھی ہمارے راستہ میں پڑے۔ مرادلی کے نزدیک ہماری ریل گاڑی نے خطا ہنوس میڈیا کو عبور کر لیا۔ اور اس طرح سے ہم گویا متنازعہ فیہ قطعۂ ملک میں داخل ہو گئے۔ سنجاق تپہ کے بعد میڈیا ہمارا قرار گاہ عمومی قرار پایا۔ اور جب فوج ایڈریانوپل میں داخل ہو گئی ہے۔ تو ہیڈ کوارٹروں کو بابا عسکی میں تبدیل کر دیا گیا۔ ہماری گاڑی عین مغرب کے بعد لولی برغاس پہنچی۔ اسٹیشن کے قریب ہمیں چند مکانات کے نشانات نظر پڑے۔ مگر ہوا ان غیر مدفون سپاہیوں کی وجہ سے کثیف ہو گئی تھی۔ جو اس عظیم الشان جنگ میں مقتول ہوئے تھے۔ یہاں سے ہم آلپولو جنکشن گئے۔ جہاں سے ریل گاڑی بابا عسکی اور قرق کلیسہ جاتی ہے۔ ہمیں یہاں تین گھنٹے ٹھیرنا پڑا۔ اس کے بعد ہماری گاڑی ایک جنگی گاڑی کے ساتھ ملا دی گئی۔ علی الصباح ہم ایڈریانوپل پہنچ گئے۔ گاڑی شہر میں جنوب مشرقی غیر مستحکم حصہ سے داخل ہوئی۔ مگر مسجد جامع سلیم کے مینارے ہمیں دور ہی سے نظر آ رہے تھے۔

ریلوے اسٹیشن کے احاطہ میں داخل ہوتے ہی مغربی جانب چند فوجی بارکیں دکھائی دیتی ہیں۔ جنہوں کو بلغاریوں نے اڑا دیا تھا۔ وہاں صدیوں کی ۲۵ توپیں بھی پڑی ہوئی ہیں۔ جن کو بلغاری جلدی میں اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔ قریب ہی

ادنٰی درجے کے فوجی افسروں کی درس گاہ موسومہ کوچک ضابطان ——— واقع ہے۔ یہی عمارات اب عثمانی ہلال احمر کے ہسپتال کا کام دے رہی تھی۔ اس عمارت میں برطانوی ہلال احمر کے ہسپتال نے بھی تسخیر شہر کے بعد کام کیا تھا۔ ڈاکٹر بہاؤ الدین شاکر بے جو شہزادہ ولی عہد یوسف عزیز الدین آفندی کے پرائیویٹ ڈاکٹر ہیں اور علم طب کے پروفیسر بھی ہیں۔ محاصرہ کے دنوں میں ہسپتال کے ڈائرکٹر تھے۔ بعد میں وہ قید کر لیے گئے تھے۔ بلغاری انہیں قتل کرنا چاہتے تھے۔ نگران کے دوستوں نے جو صوفیہ اور قسطنطنیہ میں رہتے تھے۔ اس کے خلاف شور مچایا۔ چنانچہ وہ رہا کر دیئے گئے۔ یہ وحشی (میرے پاس ان حیوانوں کے لیے اور کوئی زیادہ سخت لفظ نہیں ملتا) ڈاکٹروں کے اور نیز ہلال احمر کا بھی کچھ لحاظ رکھنا نہیں چاہتے۔ تسخیر شہر کے بعد بلغاری ڈاکٹر آڈگرڈف ہسپتال کے مہتمم تھے۔ اور یہیں اس عمارت میں انگریزی قونصل اور اس کے دوستوں نے ترکی زخمی اور بیمار سپاہیوں میں انجیل اور " دی خورشید " نسخے تقسیم کیے تھے۔ اور خوراک اناج کی بہت بڑی مقدار بلغاری قطعہ میں چھوڑ گئے ہیں۔ انہوں نے ایک بہت بڑی تعداد جلا بھی دی تھی۔ مگر جو مقدار باقی رہ گئی ہے۔ وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہے۔ سامانِ حرب کی بھی بہت سی مقدار ترکوں کے ہاتھ آئی ہے۔ علاوہ ازیں ۴۰ ہزار سے ۷۰ ہزار تک رائفلیں بھی دستیاب ہوئی ہیں۔ اسٹیشن پر اناج کے بہت سے ڈھیر جل رہے تھے۔ اور تمام سامان خوراک میں آگ لگی ہوئی تھی۔ اسٹیشن سے ہو کر ہم ہسپتال گئے جہاں ڈاکٹر صاحب نے بھی نہایت تپاک کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ اور ہم سے کہا کہ " آپ یہاں صرف بہ حیثیت وزیر آن کے ٹھیر سکتے ہیں میں ہسپتال کو بند کرنا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ لڑائی نہ ہونے کی وجہ سے کوئی مریض نہیں ہے۔ اور فوج کی حالت نہایت عمدہ ہے۔ اس بات نے ہمارے آتش جوش کو کم کر دیا۔ مگر ہمارے دلوں میں یہ خوشی سمائی ہوئی تھی کہ ہم ایڈریانوپل میں ہیں۔ اور یہ وہی مقام ہے۔ جہاں ترکوں نے اپنی کھوئی ہوئی فوجی عظمت دوبارہ حاصل کر لی ہے۔ بعض یورپین نامہ نگاروں نے ترکی فوجوں کی شجاعت و جسارت کو گھٹانے کی کوشش کی ہے۔ اور قلعوں کو " رنگی ہوئی لکڑی کی تختی " سے تعبیر کیا ہے۔ میری بحث اس امر پر ہے کہ پتھر اور اینٹوں کی بجائے " منقش لکڑی کی تختی " پر بھروسہ کرنا بہت زیادہ مشکل ہے۔ اور اس لحاظ سے ترکی بہادری کا نقش دلوں پر اور زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ شکری پاشا نے مدافعت کے تمام انتظامات کی جانب اپنی توجہ نہیں کی۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کی غلطی تھی کہ انہوں نے آخری حملہ کے موقع پر مشرقی قلعوں کو زیادہ مضبوط نہیں کیا۔ حالانکہ وہ مزید سپاہیوں کے ذریعہ سے ایسا کر سکتے تھے۔ بہر حال خواہ کچھ ہی ہوا ہو فوجی ماہرین اور مؤرخین دنیا کے سامنے تسخیر ایڈریانوپل کے دوسرے ہی اسباب بیان کریں گے۔ لیکن مجھ جیسے آدمی کو جو جنگی باتوں سے زیادہ مہارت نہیں رکھتا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شتالجہ اور بولیر کی ترکی فوجیں ایڈریانوپل والوں کی مدد نہیں کر سکتی تھیں۔ شہر بالضرور فتح ہونا تھا۔ خواہ ایک مہینے ہی بعد ہوتا۔ لیکن ترکی افسروں کی بہادری اور پابندی فرائض پر سوائے تعریف اور حیرت کے اور کچھ ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔

ہم ایڈریانوپل میں صرف چار روز تک ٹھیرے۔ لیکن اس قلیل عرصہ میں میں نے اس قدر چیزیں دیکھی ہیں

کہ میں نہیں جانتا کہ ان سب کو آپ کے روبرو کس طرح بیان کروں۔ کم سے کم دو باتیں صاف اور صریح ہیں۔ اوّل یہ کہ تمام آبادی اپنے بلغاری حاکموں سے سخت عاجز اور نالاں تھی۔ اور کہ انہوں نے نہایت صدق دلی اور ایمان داری کے ساتھ اپنے رہائی دینے والوں کا استقبال کیا۔ جنہوں نے ان کو خوف اور دیگر تکلیفات سے آزادی دلائی۔ یورپ اور اس کے ماہرین سیاست جس طرح چاہیں فیصلہ کریں۔ لیکن اگر ایڈریانوپل کے باشندوں کی خواہشات کا لحاظ کیا گیا تو وہ یک زبان ہو کر نہایت شکریہ کے ساتھ رحم دل ترکوں کی تائید میں رائے دیں گے جنہیں اس قدر نشانہ الزامات بنایا جا رہا ہے۔

سب سے پہلی چیز جو ہم نے دیکھی وہ ہسپتال کی عمارت تھی۔ یہ ایک بہت بڑی صاف ستھری عمارت ہے یہاں چند سروے مریض بھی تھے۔ بلغارین اپنے مریضوں کو لے گئے تھے۔ اور ان قدیم ساتھیوں کو چھوڑ کر چلے گئے تھے جو ان کے دوش بدوش ہو کر لڑے تھے۔ یہ ہے بلغاری صداقت کا ثبوت۔ ہسپتال کے متعلق ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جسے میں یہاں لکھتا ہوں۔ چند آسٹریا کی ڈاکٹر عورتیں محاصرہ کے دنوں میں ڈاکٹر بہابے کے ماتحت تیمارداری کا کام کر رہی تھیں۔ جب بلغاری آئے تھے اور ڈاکٹر بہابے کو گرفتار کیا گیا تو یہ ڈاکٹر عورتیں چلی گئیں۔ ان سے بڑے افسروں نے درخواست کی کہ وہ ہسپتال میں آ کر کام کریں۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ بخلاف اس کے ترکی فوج شہر میں داخل ہوئی تو وہ بھاگ آئیں۔ اور پورے جوش کے ساتھ دوبارہ اپنا کام شروع کر دیا۔ یہ ڈاکٹر عورتیں عیسائی ہونے کے علاوہ آسٹریا کی رعایا تھیں جو بلغاریا کا دوست ہے۔ اور بلغاری قبضہ کے دنوں میں مریضوں کی تعداد زیادہ تر عیسائی ہی تھی۔ مگر انہوں نے سرویوں اور بلغاریوں کی تیمارداری سے انکار کر دیا لیکن غیر مصافی مسلمان آبادی کے زخمیوں کی تیمارداری کرنے کے لیے وہ فی الفور تیار ہو گئیں۔

سب سے پیشتر ہم مصری ہلال احمر کا ہسپتال دیکھنے کے لیے گئے۔ جس کے مہتمم ڈاکٹر مصطفےٰ تھے۔ یہ ہسپتال خاص شہر میں واقع ہے۔ جو ریلوے اسٹیشن سے قریباً دو میل کے فاصلے پر آباد ہے۔ برابر ایک نہایت خوبصورت سڑک گئی ہے۔ شہر کے راستے میں دو دریا یعنی دریائے آردا اور دریائے مرتضیٰ پڑتے ہیں۔ سب سے پہلا دلچسپ نظارہ جو دکھائی دیتا ہے وہ "ہلال عثمان" کی نمائش ہے۔ جو تقریباً ہر مکان کی کھڑکیوں سے ہویدا ہے۔ قہوہ خانوں اور ہوٹلوں نے طرح طرح سے اس خوب صورت جھنڈے کو سجا رکھا تھا۔ جو دنیا کے تمام قومی جھنڈوں سے زیادہ شان دار ہے۔ شہر میں ترکی سکوں کی کمی ہے۔ اس لیے اگر کوئی چیز خریدی جائے تو اس کے عوض میں عام طور پر بلغاری سکہ ملے گا۔ سگریٹ بلغاری کارخانوں کے ہیں۔ اس لیے کہ "ریجی ڈس ٹوبیکس" کی گماشتی شہر میں سگریٹ پہنچانے سے قاصر رہی تھی۔ مصری ہسپتال میں ہمیں چند بلغاری مریض ملے۔ جن میں سے دو افسر بھی تھے۔ ہسپتال کی کتاب معائنہ اس لحاظ سے ذرا دلچسپ تھی کہ اس میں شہر کے بلغاری شریف اور دیگر بلغاری افسروں کی آرا اور دستخط ثبت تھے۔

نہایت جوش کے عالم میں ہم جامع سلیم میں داخل ہوئے۔ صرف تین دن پیشتر اس خوب صورت مسجد پر بلغاری

پرچم لہرا رہا تھا۔ مسجد ایک خوب صورت پہاڑی پر واقع ہے۔ اور بغیر اس کے ایڈریانوپل کا نظارہ نامکمل رہتا۔ دیگر ترکی مساجد کی طرح یہ مسجد اندر سے بھی بہت خوب صورت اور منقش ہے۔ بلغاری بوٹ پہنے اس میں داخل ہوتے تھے۔ اور بعض نے اسے نجس کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ خود اس نے ترکوں کو دوبارہ اسے پاک کرنے کے لیے بھیج دیا۔ سپاہیوں اور افسروں کو نماز اور قرآن شریف پڑھتے ہوئے دیکھ کر تسکین محسوس ہوئی۔ ایک چھوٹے گنبد میں کسی گولہ سے قدرے نقصان پہنچا ہے۔ مگر محکمۂ اوقاف نے اس کی مرمت شروع کر دی ہے۔ میں یقین نہیں کر سکتا کہ یورپ کس طرح ترکوں سے ایڈریانوپل اور قسطنطنیہ کو واپس لینا چاہتا ہے۔ ان دونوں شہروں کی ظاہری صورت ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خالصتہً اسلامی شہر ہیں۔ اور اس لیے ان پر حکومت کرنے کے لیے کسی عیسائی حاکم کو مقرر کرنا بالکل بے معنی اور مضحکہ انگیز ہوگا۔

چونکہ استحکامات دیکھنے کا وقت باقی نہیں رہا تھا۔ اس لیے ہم نے والی کی خدمت میں حاضر ہونے کے بعد رخصت ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ گورنمنٹ چند مقامات پر سے اٹھا دیا گیا ہے۔ اور سیڑھیوں کے راستہ میں شکستہ عمارت کے پتھر پڑے ہوئے ہیں۔ حاجی عادل بے نے نہایت تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ اور ہماری پیش کردہ مبارک باد کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے ہم سے چند بلغاری مظالم کا ذکر کیا۔ اور آخر میں کہا کہ ایڈریانوپل کے والی اور کمانڈر نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اگر گورنمنٹ نے بھی شہر کو خالی کرنے کا حکم دے دیا تو وہ ہرگز خالی نہیں کریں گے۔ انہوں نے کہا کہ وہ آبادی کو زیادہ پریشان کرنا اور ان خون ریزیوں سے کٹوانا نہیں چاہتے۔ والی سے رخصت ہونے کے بعد ہم محمد علی پاشا کمانڈر کے دفتر میں گئے۔ یہ حضرت پہلے میڈوس کمانڈر رہ چکے ہیں۔ انہوں نے ایک دفعہ ہمارے ہسپتال واقع چناق قلعہ کا بھی معاینہ کیا تھا۔ وہ اگرچہ دفتر میں موجود نہ تھے۔ تاہم جنرل سٹاف کے سب سے بڑے رکن سے مل لیے یعنی انور بے سے جو دسویں آرمی کور سے متعلق ہیں۔ جب عمارت میں داخل ہوئے۔ تو اس وقت پانچ چھ افسر ایک بلغاری سپاہی سے سوالات کر رہے تھے جو قریب کے گاؤں کے ایک مکان میں آگ لگاتا ہوا پکڑا گیا تھا۔ ڈاکٹر علی غالب بے باہر آئے اور ہمیں ایک کمرے میں بٹھا دیا جو خوش قسمتی سے انور بے کا کمرہ تھا۔ اور ہم سے کہا گیا کہ ان کا انتظار کیجیے۔ چند منٹ کے بعد انور بے مسکراتے ہوئے آئے اور نہایت انکساری کے ساتھ ہماری مبارک باد کو قبول کیا پھر ہم نے ان سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی اور درخواست کی کہ ہم استحکامات کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ جسے انہوں نے فوراً قبول کر لیا۔ تھوڑی سی گفتگو کرنے کے بعد ہم رخصت ہو گئے اور کرا آغاچ پہنچ گئے جہاں کہ ہسپتال واقع ہے۔

دوسرے دن علی الصباح ہم جنوبی قلعوں کو دیکھنے کے لیے گئے۔ اسٹیشن اور قلعوں کی درمیانی جگہ ٹوٹی پھوٹی پڑی ہے۔ قریباً ایک سو مربع گز سے جگہ ہموار نظر آتی ہے۔ گولہ باری کی وسعت اور قوت کا اس واقعہ سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک عمارت کو قریباً ۲۰۰ نشان لگے مگر اس میں سے صرف دو موثر ثابت ہوئے۔ یہ عثمانی ہلال احمر کی عمارت تھی۔ بارود خانے اور دیگر تمام استحکامات نہایت اچھی حالت میں ہیں۔ تمام توپیں اس قدیم جگہ پر رکھی ہوئی ہیں۔

جہاں شکری پاشا انہیں چھوڑ گئے تھے۔ بعض بعض مقامات پر کچھ نقصان پہنچایا گیا ہے۔ لیکن اب ان کی بہت جلد مرمت ہو جائے گی۔ سروی فوجیں زیادہ تر اسی حصہ پر حملہ کر رہی تھیں۔ لیکن ان سے کچھ نہ ہو سکا۔ سہ پہر کو ہم پھر ایوان بلبا اور حال تپہ دیکھنے کے لیے گئے۔ یہ شہر کے مشرق کی طرف واقع ہیں۔ اور گاڑیاں خاص توپوں تک جا سکتی ہیں۔ قلعہ کے جدید مہتمم سرگیشیا کے ایک شریف آدمی ہیں اور ان کا نام محمد علی آفندی ہے۔ اور ہیں نے ان سے بہتر "ضابطی" افسر نہیں دیکھا۔ انہوں نے ہم سے آخری جنگ کی کیفیت بالتفصیل بیان کی۔ اور تسخیر شہر کی وجوہات بھی بتائیں۔ ایوانہ بابا شہر کے نزدیک ہی واقع ہے۔ اور اگر اسے فتح کر لیا جائے تو شہر کسی حالت میں محفوظ نہیں رہ سکتا۔ جب جرمنی والے شہر کا استحکام کر رہے تھے تو اس وقت جنرل اسٹاف کے ایک ممبر نے یہ کہا تھا کہ مغربی و جنوبی استحکامات اور شہر کے درمیان ایک بہت بڑی کشادہ جگہ ہے۔ اور اگر دشمن کی فوجیں اس کھلی جگہ پر بھی قابض ہو جائیں۔ تو اس حالت میں مشرقی اور شمالی قلعوں کی توپیں دشمن کی پیش قدمی کو بہت آسانی کے ساتھ روک سکتی ہیں۔ لیکن چونکہ اس کے اور شہر کے درمیان بہت ہی مختصر کھلی جگہ ہے۔ اس لیے بہتر یہی تھا کہ ایوانہ بابا کے بالمقابل مال تپہ اور پہاڑیوں کے سلسلے کو اور زیادہ مستحکم کیا جاتا۔ اور پہلے مورچوں کی قطار کی تسخیر کے بعد ایوانہ بابا کو دوسرے مورچوں کی قطار بنا دیا جاتا۔ مگر اس کی تجویز کو بالکل غلط سمجھا گیا اور ترکی کو تسخیر کی سزا بھگتنی پڑی۔ بلغاری التوائے جنگ کے زمانہ میں نہایت خفیہ طور سے اپنی توپیں اور سپاہی ان پہاڑیوں کے پیچھے سے لاتے تھے۔ اور ایوانہ بابا کی کچھ پروا نہیں کرتے تھے۔ ایوانہ بابا کی توپوں سے تھوڑے فاصلہ پر "دوار ناڈہ کوئی" کا گاؤں واقع ہے۔ اور جس میں خالصتہً یونانیوں اور آرمینیا والوں کی آبادی ہے۔ ایسا خیال کرنا ممکن نہیں ہے کیونکہ شکری پاشا نے گاؤں کو برباد نہیں کر ڈالا۔ یہ لوگ ترکی توپوں اور سپاہیوں کے متعلق بلغاریوں کو تقریباً روزانہ خبریں پہنچاتے تھے۔ اوّل تو موقع ہی کمزور تھا اور دوسرے "آرنٹ کوئی" کے لوگوں کی دغا بازی کی وجہ سے ایوانہ بابا فتح کر لیا گیا۔ اردگرد کی زمین پر پھٹنے والے گولے اور گولیاں پڑی ہوئی ہیں۔ ہم سے کہا گیا کہ فریقین کی طرف سے گولہ باری اس قدر خوفناک ہو رہی تھی کہ تمام رات صرف توپوں ہی کے شعلوں سے شہر میں روشنی رہا کرتی تھی۔ اس مقام پر بدبو بہت کثرت سے پھیلی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ بلغاریوں نے ترکی مقتولین کو ۲۱ دن تک دفن نہیں کیا۔ اور آخرکار انہوں نے ہیضہ کے خوف سے ترکی قیدیوں کو دفن کرنے کے کام پر مامور کر دیا۔ واپس ہونے پر راستہ میں ایک ایسا جزیرہ پڑا۔ جہاں قیدی ۲۴ ہزار سے ۲۵ ہزار تک خوراک اور سردی اور برسات سے کسی پناہ کے بغیر چار دن تک رکھے گئے تھے۔ آپ نے فیراسٹ میں سے ایک چٹھی کا مرثیہ میں درج کی تھی۔ یہ بالکل سچ ہے کہ چار سو سے زیادہ آدمی روزانہ انتقال کر جاتے تھے۔ اور ان میں سے بعض زخمی بھی ہوا کرتے تھے۔ ہمارے ایجا "اجو اس جزیرہ کا نام ہے) کے مظالم سے خون خشک ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں یقین نہیں ہے کہ آیا ان بلغاریوں کو انسان کا لقب بھی دے سکتے ہیں یا نہیں۔ وہ وحشی ہیں۔ بلکہ وحشیوں سے بھی کہیں بڑھ کر ہیں۔

دوسرے دن علی الصبح توپوں کے شور کی وجہ سے ہماری آنکھیں کھل گئیں۔ توپوں کی آواز فی الواقع ہمارے دروازے سے ٹکرا رہی تھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ شہزادہ ولی عہد یوسف عزیز الدین اور پرنس ضیاء الدین شہر کی

سیاحت کرنے آئے ہیں۔ ان کا نہایت شان دار استقبال کیا گیا۔ اور چونکہ ان کی قیام گاہ کے لیے کوئی بہتر انتظام نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے انہیں بلدیہ (میونسپل کمیٹی کی عمارت) میں ٹھہرایا گیا۔ سہ پہر کے وقت ایک بڑی فوجی نمایش کی گئی۔ جس کے بعد شہزادہ ولی عہد نے عزت پاشا اور دیگر افسروں کا شکریہ ادا کیا۔ کہ انہوں نے شہر کو بلغاریوں کے پنجہ سے نجات دلوائی۔ شاہزادگان ممدوح کے استحکامات دیکھنے کے بعد مصطفےٰ پاشا تشریف لے گئے اور دہاں قرق کلیسہ اور پھر وہاں سے سیدھے استنبول پہنچے۔

جس وقت شاہزادہ ولی عہد فوج کا معائنہ کر رہے تھے۔ اس وقت ایڈریانوپل کے باشندوں نے شہر کے ایک بہت بڑے احاطہ میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ حاضرین کی تعداد بے شمار تھی۔ اور اس میں ہر قوم کے نمائندے شامل تھے۔ یونانی، آرمینیا کے اسقف۔ اور یہودیوں کے ربی (مذہبی پیشوا) اعظم بھی موجود تھے۔

بہت سے اصحاب نے تقریریں کیں اور ان میں بلغاریوں کی سفاکیوں کو تفصیل سے ساتھ بیان کیا۔ چند ریزو یوشن بھی پاس کیے گئے۔ اور آخر میں حضرت اقدس سلطان المعظم اور عثمانیوں کے لیے دعائیں مانگی گئیں۔ ان ریزولیوشنوں کو مختلف کونسلوں کی خدمت میں بھیج دیا گیا۔ جنہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں کے پاس روانہ کر دیں گے قسطنطنیہ جانے کے بعد مجھے اخبارات کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ایڈریانوپل کے باشندے یورپ کے تمام بڑے بڑے دارالخلافوں میں وفود بھجوا رہے ہیں۔ تاکہ ایڈریانوپل کو دوبارہ بلغاریوں کے حوالے نہ کیا جائے۔

غلام احمد کے پاس عزت پاشا کی ایک بہت بڑی تصویر تھی اور وہ اب بابا عسکی اسی غرض سے جا رہے تھے۔ تاکہ اس پر ان کے دستخط کرائیں۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ عزت پاشا شہزادہ ولی عہد کے ہمراہ ہیں۔ انہوں نے ایڈریانوپل ہی میں سپہ سالار اعظم کی موجودگی سے فائدہ اٹھانا چاہا۔ اس غرض سے وہ خالق اور منظور کو لے کر اپنی قسمت آزمانے کے لیے چلے۔ عزت پاشا، ضیا پاشا، محمد علی پاشا اور دیگر افسروں کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ان تمام افسروں نے ان لوگوں کو پہچان لیا۔ اور نہایت تپاک سے ان کا خیر مقدم کیا۔ عزت پاشا نے تصویر پر اپنے دستخط کر دیئے۔ لیکن جو محبت ان کو ہندوستان کے ساتھ ہے۔ اس کا اندازہ ان الفاظ سے ہو سکتا ہے جو انہوں نے تصویر پر لکھے۔ الفاظ یہ ہیں "اوغلوم غلام احمد خاں" جس کے معنی "میرے بیٹے غلام احمد خاں" کے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا مہربانی ہو سکتی ہے۔ محمد علی پاشا نے منظور کو گاتے اور قرآن شریف قرأت سے پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ انہوں نے منظور کی اس قدر تعریف کی تھی کہ عزت پاشا اسے سنے بغیر نہ رہ سکے۔ چنانچہ انہوں نے دوسرے دن علی الصبح منظور کو اپنے پاس بلایا۔ عزت پاشا نے ان سے سورۃ انا فتحنا قرأت سے پڑھنے کی درخواست کی۔ منظور نے سورۃ کو اپنی خوش آہنگی میں پڑھا۔ جس سے حاضرین پر بے حد اثر پڑا۔ منظور کا شکریہ ادا کیا گیا۔ اور حاضرین نے قرآن شریف سننے کے بعد مرحبا کی آوازیں بلند کیں۔ اس کے بعد ہم نے ان متبرک اور قابل ادب اشخاص سے رخصت چاہی۔ اور سیدھے گاڑی میں بیٹھ کر "حفریق" پہنچے۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں شکری پاشا محاصرہ کے دنوں میں اپنے اسٹاف کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جس کے اردگرد چاروں طرف بارود خانے واقع ہیں۔ وہاں ایک دوسرے کے برابر برابر بہت سے کمرے واقع ہیں۔

یہاں شکری پاشا اور ان کے اسٹاف کے افسر رہتے تھے۔ اور یہیں بالآخر وہ قید ہو گئے۔ سرویوں کے شمالی دروازہ کا بگر کرنے کے بعد "خضرلق" پہنچے۔ عبدالرحمٰن (علیہ) کے قریب ان کا خفیف سا مقابلہ کیا گیا۔ مگر وہ بڑھتے چلے گئے۔ اور سیدھے قلعہ "خضرلق" میں داخل ہو گئے۔

بلغاری افواج شہر کو بہت ہی کم نقصان پہنچا سکیں۔ اسلامی محلہ کے چند مکانوں کو بالکل اڑا دیا گیا۔ بہت سی چھوٹی مساجد کو انہوں نے اصطبلوں اور آبدست خانوں میں تبدیل کر دیا تھا۔ انہوں نے یہ خیال کیا تھا کہ چونکہ وہ اس مقام پر ہمیشہ حکمرانی کریں گے۔ اس لیے انہوں نے شہر کو بیگانہ نے یا برباد کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جامع سلیم کے علاوہ وہاں اور بھی عالیشان جامع مسجدیں ہیں۔ جن میں سے بایزید عسکی اور مرج شر نیے زیادہ تر ذکر کے قابل ہیں۔ اگرچہ سب مساجد کو تھوڑا بہت نقصان پہنچا ہے۔ تاہم اچ شر نیے کو بے حد صدمات پہنچے ہیں۔ اس خوب صورت مسجد کو انہوں نے گودام بنایا تھا۔ اور چلتے وقت انہوں نے اس میں آگ لگا دی تھی۔ یہ تمام و کمال ایک پتھر کی عمارت ہے۔ اور اس لیے آگ نے اسے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا۔ انہوں نے ایک مینارہ کا سب سے اونچا درجہ بھی گرا دیا تھا۔ تاکہ ان کی سفاکی اور مظالم کی داستان ہمیشہ ہمیشہ تازہ رہے۔

عبدالرحمٰن صدیقی کا تعارف

مسٹر عبدالرحمٰن صاحب صدیقی کے نام سے لوگ واقف نہ ہوں گے۔ آپ آل انڈیا میڈیکل مشن کے منیجر تھے۔ اور "کامریڈ" اور "ہمدرد" کے سابق منیجر رہ چکے ہیں۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کے قسطنطنیہ سے رخصت ہونے کے بعد آپ وہاں اس غرض سے ٹھہر گئے تھے کہ مہاجرین کی نوآبادیوں کے متعلق کچھ کام کریں۔ صاحب موصوف ان خوش قسمت اشخاص میں سے ہیں جو ایڈریانوپل میں فاتحانہ فوج کے ساتھ داخل ہوئے۔ آپ کے دلچسپ و پر از معلومات مضامین کامریڈ اور ہمدرد میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہیں۔ مذکورہ چٹھی آپ نے روانہ ہونے سے پیشتر لکھی تھی۔ جس کی اشاعت میں ہمیں افسوس ہے کہ تاخیر ہو گئی ہے۔ آتے ہوئے آپ نے سفر میں تھوڑے دن قیام کیا تھا۔ اب دہلی والوں کی خوش قسمتی ہے کہ وہ اپنے گھر سے یہاں تشریف لا رہے ہیں۔

منظور محمود[1]

ترکوں کے سچّے حالات مشاہدہ کی بنا پر

(پنجشنبہ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۳ء)

خدا ہمارے خلیفۃ الاسلام ارشاد محمد خامس کو ہمیشہ زندہ رکھے اور اُن کے زیرِ سایہ اسلام کو ترقی بخشے، مجھ سے اس کی خواہش کی گئی ہے کہ ترکوں کے سچّے حالات ذاتی مشاہدہ کی بنا پر "ہمدرد" اخبار میں بغرضِ اشاعت ارسال کروں، اوّل تو مجھ میں اتنی قابلیت ہی نہیں ہے کہ جو کچھ آنکھوں سے دیکھوں اُس کو زبان پر لا سکوں، یا قلم سے ادا کر سکوں کیونکہ اس کام کے واسطے خداداد مادہ اور قابلیت کی ضرورت ہے، دوم میں نے دیکھا ہی کیا ہے جو لکھوں۔ مجھے اتنا موقع ہی نہیں ملا کہ تفصیل کے ساتھ دیکھ بھال سکوں۔ تو دس ماہ کے قریب قسطنطنیہ اور اس کے اطراف و جوانب میں رہا اور اس قلیل عرصہ میں انقلاباتِ ملکی سے ترکوں کو فرصت کہاں تھی اور نہ مجھ کو شفاخانہ کے کام سے فرصتِ مشاہدہ ملی۔ میں اپنے آپ کو کسی طرح اس قابل نہیں سمجھتا کہ ایسے اعلیٰ اخبار کے کالموں کو اپنی ناچیز تحریر سے ناپاک اور سیاہ کراؤں۔ مگر مجھی سے کام کرنے کی جرأت ہوتی ہے تو فقط اس خیال سے کہ یورپ اور امریکہ کے مضمون نگار اور مصنف میری ہی طرح دو آنکھیں لیکن متعصب دل اور دیدۂ نابینا لے کر ترکی جاتے ہیں اور ہفتہ عشرہ قسطنطنیہ میں قیام پذیر ہونے کے بعد واپس چلے آتے ہیں، اور ترکوں اور ترکی پر کتابیں لکھ مارتے ہیں۔ اِن کتابوں کو لکھنے میں وہ اپنے پیش رو متعصبین سے اور اُن کی تصانیف سے بھی مدد لیتے ہیں، ظاہر ہے کہ صرف قسطنطنیہ میں پانچ چھ دن رہ کر خود پایہ تخت ہی کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتے ہیں، چہ جائیکہ سارے ترکی پر کتاب لکھنا۔ میں کم سے کم اِن لوگوں سے زیادہ حق دار ہوں کہ ترکی کے حالات لکھوں، میں کوئی کتاب تو لکھوں گا نہیں، صرف مختصر پیرایہ میں چھوٹے چھوٹے مضامین کے ذریعہ سے ترکی کی حالت نذرِ ناظرین کر دوں گا اور اس کی اُجرت یا داد صرف اس قدر چاہتا ہوں کہ ناظرینِ "ہمدرد" ان کو پڑھ کر ہمیشہ سے زیادہ ترکوں کے نہیں بلکہ اسلام کی مدد کرنے پر کمرِ ہمت باندھ لیں۔ کیونکہ میرے خیال میں بقائے حکومت اسلام ترکی پر منحصر ہے، ترکی سلطنت گو برائے نام سہی مگر اُس کا بالکل مٹ جانا گویا اسلام کا مٹ جانا ہے۔ گو مذہب اسلام تو بقول ڈاکٹر اقبال کے :-

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

کوئی دنیوی طاقت مٹا ہی نہیں سکتی لیکن رہی سہی جو حکومت ہے وہ مٹ کر ذلتیں اور مصیبتیں بڑھ جائیں گی۔

---

[1] مشہور موسیقار و فلم کار طلعت محمود کے والد

ترکی ہی ایک ایسی اسلامی قوم باقی ہے جو حکومت اور آزادی کے سبب ہمارے مقصدِ آفرینش کی تکمیل یعنی حفاظت حرمین شریفین کر سکتے ہیں۔ عرب یا افغان مقابلۃً ترکوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے، افغانوں سے تو ہم کو رات دن سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے، ان کی حالت جیسی خراب ہے اس کا اندازہ ہم کو اچھی طرح ہے۔ عربوں کی حالت میں آئندہ کسی خاص مضمون میں لکھتے وقت اپنی وہ وجوہ بھی بیان کروں گا جن کی بنا پر میں عربوں پر ترکوں کو ترجیح دیتا ہوں۔ ایک قصہ مجھے یاد آیا، اس سے کم سے کم، ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت کا اندازہ ہو جائے گا، اس کے شاہد شاید میرے ہمراہی بھی ہیں جو ادرنہ کی تسخیر کے بعد میرے ہمراہ شہر مذکور میں گئے تھے، ایسے شاندار معرکہ میں جس سے کفرستان اور عالمِ اسلام دونوں کو حیرت ہو گئی، ہمارے چند پنجابی مسلمان بھائی بھی شریک تھے، چنانچہ یہ لوگ ہندوستان چھوڑ کر جہاد کرنے کے لیے ٹرکی پہنچے تھے۔ سات کروڑ مسلمانوں میں سے یوں چند اشخاص کا عملاً جہاد میں شریک ہو جانا ہی ان کی بہادری کا کتنا بڑا ثبوت ہے۔ یہ لوگ انور بک کے ہمراہ ادرنہ کو بلغاریوں سے واپس لینے کی غرض سے گئے تھے، اور خدا کے فضل سے نہایت تزک اور احتشام کے ساتھ چھوٹی موٹی معرکہ آرائیاں کرتے ہوئے اپنے شجاع ترک بھائیوں کے ساتھ ادرنہ میں داخل ہوئے۔ میں بھی اپنے چند ہمراہیوں کے ہمرکاب ہوا کے گھوڑے پر چڑھ کر دوسرے تیسرے ہی دن ادرنہ پہنچ گیا تھا۔ ادرنہ ٹرکی میں ایڈریانوپل کو کہتے ہیں۔ یہاں پہنچکر خوش قسمتی سے انور بک و عادل بک وغیرہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس کی مفصل کیفیت، ہمدرد ہی کے ذریعہ سے اپنے ایک خط میں جو میں نے قسطنطنیہ سے بھیجا تھا لکھ چکا ہوں۔ اسی اثنا میں مجھے اپنی جماعت سے بھی زیادہ خوش قسمت جماعت یعنی انہیں چند پنجابی بھائیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ لوگ مجھے "بلدیہ" یعنی عمارت میونسپلٹی کے سامنے جب کہ ولی عہدِ خلافت اور نہ سے فرق کلیسا جانے والے تھے، تماشائیوں اور سپاہیوں کے مجمع میں نظر پڑے، میں نے اُن سے مختصراً دریافت کیا کہ مارچ کرتے وقت اُنھوں نے کیا کیا؟ اس سوال کے ساتھ ہی میرا رشک ظاہر ہونے لگا۔ گو میں نے کتنا ہی چھپایا۔ مگر میری باتوں سے صاف ظاہر ہو گیا۔ اور وہ لوگ ہنسنے لگے۔ جواب دیتے ہوئے مجھ سے من وعن کیفیت بیان کی۔ میرے اس سوال پر کہ کبھو خود بھی کسی کو مارا؟ نہایت شرم سے جواب دیا کہ "ہم ہندوستانی ہیں اکثر چھوٹے پیمانہ پر لڑائیاں ہوئیں۔ ترکوں نے بڑھ بڑھ کر دشمنوں کی گردنیں اُڑائیں لیکن ہم پیچھے ہی رہتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ افسران ہم کو روکتے تھے، بلکہ اس لیے کہ ہم نے کبھی تلوار و بندوق نہیں اُٹھائی تھی۔ ہم کو خود بخود ایک رکاوٹ سی ہوتی تھی۔ اور جیسے ایک قاتل قتل کرتے وقت مرعوب ہو جاتا ہے، اسی طرح ہم پر بھی رُعب طاری ہو جاتا تھا۔ اب اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہم کیسے ہیں۔ افسوس کہ ہم لوگوں کو اتنا بھی نہیں آتا کہ اگر موقع پڑے تو جان بھی بچا سکیں۔ چہ جائیکہ جنگ میں مرنا اور مارنا۔" میں نے یہ قصہ اس لیے پیش کیا ہے کہ ہم کو اس کا اندازہ ہو جائے کہ ترکوں میں اور ہم میں کتنا فرق ہے۔ مسلمانوں میں حاکم، آزاد، بہادر اگر کوئی قوم صفحۂ ہستی پر ہے تو وہ ترک ہے۔ میرا مستقل ارادہ ہے کہ صحیح حالات لکھوں، لیکن اپنی رائے کو شامل کرتا رہوں گا۔ کیونکہ وجوہ کا بتلانا نہایت ضروری ہے۔ میں اس کے لیے بھی تیار ہوں، کہ کوئی صاحب اگر میری طرح ذاتی مشاہدہ کی بنا پر میرے بیانات کی تکذیب کریں۔ تو میں

ان کو جواب دے کر مطمئن کر دوں۔ میرا اصل مقصد اس مضمون نویسی سے یہ ہے۔ کہ اب تک مسلمانانِ ہند کا متعصب تاریخ نویسوں اور مضمون نگاروں کے بیانات پر انحصار رہا ہے۔ یہ مضامین چونکہ بے غرضانہ نہیں ہوتے، اس لیے ان میں جا و بے جا ترکوں کی برائیاں ایک عالم کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔ میں نے اتنا عرصہ انتظار کیا کہ میرے ہم سفر بھائیوں میں سے مجھ سے کوئی قابل شخص اس فرض اہم سے ممبرانِ مشن کی گلو خلاصی کرے اور اپنی قابلیت سے دیگر مسلمانانِ ہند کو مستفیض بنائے۔ لیکن جب خاموشی میں اس قدر بڑا حصہ عمر کا گذر گیا، اور ترکوں کی طرف سے میں نے مسلمانوں کے جوش کو کم ہوتے دیکھا تو جبراً و قہراً اپنے ہی سر لے لیا۔ خدا میری مدد کرے کہ میں بلا کم و کاست سچ سچ حالات عوام الناس کے سامنے پیش کر سکوں۔ اور اس طرح پر ترکوں کی یاد تازہ کر کے اسلام کی مدد کی اپیل کروں۔ نیز یہ کہ اپنے ترکی جانے سے کوئی فائدہ اُن لوگوں کو بھی پہنچاؤں جو بے چارے دل پہ پتھر رکھنے یعنی پڑے رہنے پر مجبور تھے۔ ترک عام طور پر ہم ہی لوگوں کی طرح ہیں، سوائے اس کے کہ شجاع زیادہ ہیں اور کوئی بات نہیں۔ ان میں برائیوں کے ہونے سے پریشانی کی ضرورت نہیں۔ ہر زوال پذیر قوم کی یہی حالت ہوتی چلی آئی ہے۔ یہ تو ہر انحطاط پذیر قوم کا نغمہ ہوتا ہے۔ اگر یہ دن نہ ہوتا تو آج ویانا اور پیرس، میڈرڈ اور لسبن قاہرہ اور ایتھنز، مسونیا اور بلگریڈ، سباستوپول اور طہران، مراکو اور طرابلس، سسلی اور مالٹا، قبرص اور قریدہ، طیونس اور الجزائر، کابل اور کوئٹہ، چی کنگ اور ماسکو، دہلی اور رنگون، کولمبو اور جاوا وغیرہ وغیرہ:۔

خلیفۃ المسلمین امیر المومنین خادم حرمین شریفین سلطان البرین والبحرین کا سکہ رواں ہوتا لیکن "ہر کمالے را زوالے" کا ثبوت تاریخوں سے ملتا آیا ہے، اسی طرح اس کا بھی ثبوت ملتا رہا ہے اور اسی لڑائی میں ملا کہ "ہر زوالے را کمالے"۔ یونان اور بلغاریہ کو دیکھیے کیا تھے اور کیا ہو گئے؟

مثلِ بو قید ہے غنچہ میں پریشاں ہو جا
رخت بر دوش ہوائے چمنستاں ہو جا
شوق وسعت ہے تو، ذرہ سے بیاباں ہو جا
نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا
بول اسلام کا ہر قوم میں بالا کر دے
اے دنیا کے اندھیرے میں اُجالا کر دے

از نواب وقار الملک

ڈاکٹر مختار احمد صاحب انصاری کی مراجعت ہندوستان

یکشنبہ ۲۹ رجون ۱۹۱۳ء

یقین ہے کہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے ڈاکٹر انصاری صاحب کی مع الخیر والعافیت مراجعت زمانے کو بہت خوشی سے سُنا ہوگا جو چھ سات روز ہیں، انشاء اللہ بمبئی پہنچنے والے ہیں۔ وہاں سے تمام بڑے بڑے مقامات پر بذات خود تشریف لے جا کر مسلمانوں کو ترقی تمسکات قرضہ کی خریداری کی ترغیب دیں گے۔ درحقیقت ابھی تک بہت سے ایسے مسلمان ہیں جو یہ سن کر کہ جنگ ختم ہو چکی ہے یہ سمجھ رہے ہیں کہ اب ترکوں کو مالی امداد بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ ان کا یہ خیال صرف واقعات کی لاعلمی کی وجہ سے ہے اور واقعات کی لاعلمی زیادہ تر اس پر مبنی ہے کہ عام اشخاص کو ابھی تک اخبار بینی کا مذاق پیدا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ دورہ تمام مصائب و تکالیف و ضروریات پر سے پردہ اٹھا دے گا جو گزشتہ پر افسوس جنگ اور ہولناک بربادی کی وجہ سے ترکوں اور مقدونیہ وغیرہ کے مسلمانوں کو اس وقت لاحق ہو رہی ہیں۔ نیز جس قدر تدبیریں اور کوششیں کہ ان مصیبت زدوں کو مدد پہنچانے کی غرض سے ہندوستان میں کی جا رہی ہیں اور جن کی بابت واقعات کی ناواقفیت کی وجہ سے بعض صاحبان کو کچھ غلط فہمیاں ہو رہی ہیں۔ ان کی غلط فہمیوں کی اصلاح بھی اسی موقع پر ڈاکٹر صاحب موصوف کے ذریعہ سے پوری طرح ہو جائے گی۔ انہیں مسائل میں اناطولیہ میں مہاجرین اہل اسلام کے واسطے نوآبادیاں قائم کرنے کا مسئلہ بھی ہے۔ اس کے متعلق بھی جو شبہات بعض صاحبوں کو پیدا ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان سننے کے بعد، غالباً وہ بھی رفع ہو جائیں گے۔ حالانکہ بعض شبہات تو اس قسم کے ہیں جو ذرا بھی غور و تامل کے بعد یوں بھی قائم نہیں رہ سکتے مثلاً جب ترکی حکام نے اس کمیٹی کو منظور کر لیا ہے جو نوآبادیوں کے واسطے قائم کی گئی ہے۔ اور جس میں خود ترکی تجربہ کار افسر شریک ہیں تو اب ہم کو اس بحث میں پڑنا کہ پہلے سے جو ایک کمیٹی مہاجرین اس قسم کی امداد کے واسطے ترکی میں قائم تھی۔ اسی کے سپرد یہ کام بھی کیوں نہ کیا گیا ہمارے منصب سے بالکل خارج ہے۔ اور جب تمام واقعات کمیٹی کے سامنے ہیں اور کمیٹی کے موقع پر ان کی نسبت غور کر رہی ہے تو وہ ہماری بہ نسبت بہت اچھی طرح اس بات کا تصفیہ کرے گی کہ کن کاموں کی ضرورت ہے اور ان میں کس قدر خرچ ہونا چاہیے یا مثلاً اس قسم کی نکتہ چینیاں کہ چندہ کا روپیہ کس کے پاس گیا اور خزانچی کون ہونا چاہیئے وغیرہ وغیرہ چلتی گاڑی میں روڑا اٹکانا ہے۔ ایک بزرگ

ابھی تک یہ خیال نہیں ہوا کہ بجائے طبی وفد بھیجے جانے کے نقد روپیہ کا ترکوں کے پاس بھیجا جانا زیادہ مفید تھا۔ آفتاب نصف النہار پر پہنچ چکا ہے۔ دوست اور دشمن نے اقرار کر لیا ہے کہ ڈاکٹر انصاری صاحب کے طبی وفد نے جو کامیابی حاصل کی ہے اس سے بہتر مفید نتائج اور طرح حاصل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد بھی وفد بھیجنے یا نقد روپیہ بھیجنے کے سوالات کو جاری رکھنا یہ اسلام کی سچی خدمت نہیں ہے جس وقت یہ وفد روانہ ہو رہا تھا۔ میرا خیال بالکل اس طرف منتقل نہیں ہوتا تھا۔ کہ مجروحوں کے علاج معالجہ کے سوا جس میں بے شبہہ ایک خاص جزو بہت زیادہ ہمدردی کا شامل ہوگا۔ اور کوئی ایسا اہم پولیٹیکل نتیجہ بھی پیدا ہوگا۔ جس کا سلسلہ اب شروع ہوا ہے، یعنی ہندوستان کے مسلمانوں اور ترکوں کے درمیان ایک مضبوط رشتہ اتحاد کا قائم ہونا اور یہ وہ نتائج ہیں کہ جس قدر خرچ کی کارروائی میں ہوا اگر اس سے دس گنا روپیہ بھی خرچ ہو جاتا تو بھی یہی نتائج جو حاصل ہوئے بہت ارزاں سمجھے جانے کے قابل تھے آج جو بیج کہ قسطنطنیہ میں ڈاکٹر انصاری صاحب اور مولوی ظفر علی خاں صاحب اور ان صاحبوں کے دوسرے اعوان و انصار کی کوشش سے بویا گیا ہے اگر مسلمانان ہندوستان اپنی مالی امداد سے اس کی آبیاری کرتے رہے تو وہ عنقریب ایک تناور درخت ہوگا۔ اور ایسا شیریں پھل لائے گا کہ جو بزرگوار اس وقت وفد کی کارروائی کو فضول خرچی سے تعبیر کرتے ہیں وہ غالباً اپنی رائے کو بدلنے پر مجبور ہوں گے۔

علیٰ ہذا القیاس قسطنطنیہ میں ایک اسلامی بنک قائم کرنے کی تجویز کی نسبت پر اعتراضات کا پیدا کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ معترضین کا یہ خیال کہ ایک وقت میں چند قسم کی کوششوں کو جاری کر دینا ہر ایک کوشش کے ضعف کا موجب ہوگا۔ اصولاً صحیح ہے لیکن ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب کہ منشیات سے ہی کام لینا پڑتا ہے اور آج جو مصیبت ترکوں پر عاید ہو رہی ہے اسی قسم کی مصیبت ہی جس کے لیے جائز ہے بلکہ لازمی ہے کہ ساتھ ہی ساتھ چند کام شروع کئے جائیں، ایک شخص بھوکا بھی ہے پیاسا بھی ہے اس کے بدن پر کپڑے بھی نہیں ہیں وہ بیمار بھی ہے تو اب جو شخص بھی ایسے ایک مصیبت زدہ بندہ خدا کے ساتھ ہمدردی کرنا چاہے وہ قابل معافی ہوگا، اگر اس کی سب ضرورتوں کو ایک ساتھ بہم پہنچانے کی کوشش کرے اور جو صاحب اس پر معترض ہیں ان کو چاہیئے کہ بجائے اس کے کہ مختلف کاموں کو بند کرنے کی رائے دیں جس کام میں ان کو زیادہ دلچسپی ہو وہ اپنی کوشش خاص اسی کام میں مصروف رکھیں۔ پھر اس کی شکایت کی جاتی ہے کہ چندہ مانگنے میں سخت زبانی سے کام لیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ دینے والا بھی عاجز آکر نا دہندہ بن جائے اور بلاشبہ اس قسم کی معذرت ان صاحبوں کی طرف سے ہو سکتی ہے جو چندہ میں تو ایک پیسہ نہ دیں اور دنیا جہان کے اعتراضات پیدا کر کے لوگوں کو ترکوں کی مدد سے باز رکھیں۔ اور دوسرا کوئی عذر اس قسم کی کارروائی

کے واسطے وہ پیش ہی کیا کر سکتے ہیں لیکن پوری قلعی کھل جاتی ہے جب ان اعتراضات کا پڑھنے والا معترضین کے اس مشورہ پر پہنچتا ہے۔ کہ بجائے اس کے کہ ٹرکی سلطنت کی حفاظت میں مہاجرین کے واسطے نو آبادیاں قائم کی جائیں بہتر یہ ہے دول یورپ کے توسط سے پھر مہاجرین کو ان کے پہلے وطنوں کو لوٹانے کا انتظام کیا جائے۔ اور پھر ان کو انہیں سفاک، بے رحم، نا خدا ترس ظالموں کے پنجہ میں دے دیا جائے جنہوں نے ان میں سے بہتوں کو بے گناہ قتل کیا ہے۔ ان کو لوٹا ہے۔ ان کی عصمت دری کی ہے اور کوئی دقیقہ ان کو نقصان، تکلیف اور ذلت پہنچانے کا باقی نہیں چھوڑا۔ مشفق ناصح اس موقع پر یہ لکھنا بھول گئے ہیں کہ اگر دول یورپ ان کو اپنی طرف سے بلقان و یونان میں ایجنٹ مقرر کر کے بھیج دیں۔ تو وہ ذمہ دار ہوں گے کہ بلقانی و یونانی ریاستوں کو ایک سرمو بھی مسلمانوں پر دوبارہ دست تعدی دراز نہ کرنے دیں گے۔ یہ ہیں ہمارے مسلمان ناصح خدا کے واسطے کوئی بتا دے کہ آیا ان نصیحتوں پر عمل کرنا۔ مسلمانوں کی عقلمندی اور عزت غیرت اور حمیت کے شایان ہو گا۔ ایک وقت میں یہی دلسوز ناصح ہندوستان کے مسلمانوں کو حجاز ریلوے میں چندہ دینے سے روکتے تھے۔ آیا ان نصیحتوں پر عمل کرنے سے مسلمان دنیا میں اپنی عزت وقار قائم رکھ سکتے ہیں۔

گر مسلمانی ہمیں است کہ واعظ دارد   وائے گر در پس امروز بود فردائے

اس سے زیادہ اور اس باب میں لکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ سوائے اس کے کہ خدا نے ڈاکٹر انصاری صاحب کو اس وقت بہت ہی برمحل اور برموقع ہندوستان کو واپس بھیج دیا ہے۔ پس ہر ہر جگہ جہاں جہاں سے وہ گذریں اور جہاں تشریف لے جائیں ان پر یہ ثابت کردیا جائے کہ مسلمانوں نے ان کی خدمات کو بہت ہی احسان مندی و شکر گزاری و اعتماد کے ساتھ دیکھا ہے۔ اور پورے جوش کے ساتھ دیکھا ہے اور پورے جوش کے ساتھ ان کا استقبال کریں اور عام جلسہ کر کے ان کے بیانات سے مستفید ہوں، لیکن اس کا یہی خیال رکھیں کہ وہ بہت سخت محنت برداشت کر کے اور ایک بڑے سفر سے واپس آرہے ہیں لہٰذا ان کا وقت بہت قیمتی ہے۔ اور جو وقت بھی ان سے کسی کام میں صرف کرانا چاہیں وہ کام بھی قیمتی ہونا چاہیئے۔ "کامریڈ" اور "ہمدرد" ان کے پروگرام کو وقتاً فوقتاً چھاپتے رہیں گے اور بالفعل جہاز سے اترنے کے بعد پہلا قیام ان کا بمبئی میں ہو گا۔ جن ہمدردانِ قوم کو ان کاموں سے دلچسپی ہے چاہیئے کہ وہ بمبئی ہی سے ان کو اپنی طرف کھینچنے کی اس طرح کوشش شروع کردیں کہ ان کا وقت زیادہ صرف نہ ہو، نہ زیادہ تکلیف ہو، اور بہت سے مسلمانوں کو وہ نہایت مفید اور ضروری اطلاعوں سے مستفیض فرما سکیں۔

خاکسار:۔ مشتاق حسین امروہوی (نواب وقار الملک)

مقام دہلی۔ ۲۵۔ جون ۱۹۱۳ء

خیر مقدم ڈاکٹر انصاری

شبلی

ادا کرتے ہیں ہم شکر جناب حضرت باری
کہ آئے خیریت سے ممبران وفد انصاری

ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا دردِ اسلامی تھا، یہی تھی رسم غمخواری

فراق ملک و ترک خانماں و دوری منزل!
خدا کے فضل سے کڑیاں یہ تم نے جھیل لیں ساری

جو سچ پوچھو تو زیبا ہے تمہیں دعوے آقائی
کہ تم نے کی ہے ترکان مجاہد کی پرستاری،

تمہارا ناز اٹھائیں اہل ملت جس قدر کم ہے
کہ تم نے غازیان دیں کی، کی ہے ناز برداری

تمہارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں
کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی یتیموں کی گہر باری!

تمہی کچھ جاں نوازی ہائے اسلامی کو سمجھو گے
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کا طرز خوں خواری

تمہیں ہے سوز اسلامی کا گو نام و نشاں باقی
تمہارے دل میں ہیں کچھ درد کی چنگاریاں باقی

•

پھیری والے سوداگر کی صدا

(از غلام امیر صاحب رئیس بدایوں)

ترکی کے تمسکات یہ لو لے لو — جنت کے قبالۂ نجات لے لو لے لو

ترکی کی مدد ہے فرض ہر مسلم پر — اسی گرتے ہوئے کا ہات لے لو لے لو

یوں دب کے کبھی نہیں کیا تھا سودا — کچھ آن پڑی ہے بات لے لو لے لو

تحریر میں گاہکوں کی دستخط کر دو — جلدی سے قلم دوات لے لو لے لو

کل حشر کے روز بھی وعدہ نہ سہی — تم آج ہی نجات لے لو لے لو

جب وقت نکل گیا تو پچھتاؤ گے — ملتے ہی رہو گے ہات لے لو لے لو

یورپ کی بساط جنگ اور زر سے دریغ
تو اپنی خوشی سے مات لے لو لے لو

مضبوط۔ بہترین۔ ارزاں
بازار سے انسان جو چیز خریدتا ہے کوشش کرتا ہے کہ ایسی چیز خریدے جو مضبوط
ہو، بہتر ہو، سستی ہو اور یہ خواہش سائیکل کے بارے میں اور زیادہ قوی ہوتی ہے
اس لیے کہ اس زمانے میں سائیکل کا شمار ضروریات زندگی میں ہوتا ہے۔ غریب اور
متوسط طبقے کے لوگ سائیکل کے بغیر نہ دفتر وقت پر پہنچ سکتے ہیں نہ گھر یہی ایک
ایسی غریب نواز سواری ہے جو غریب اور متوسط طبقے کے لیے رگِ زندگی کی
حیثیت رکھتی ہے۔ ہماری دکان میں
پاکستان کی ہر سائیکل ساز کمپنی کی سائیکلیں
مناسب داموں پر آپ بہ آسانی حاصل کر سکتے ہیں
علاوہ ازیں
ٹائر۔ ٹیوب۔ پرزے اور دوسرا متعلقہ سامان
بھی آسانی اور رعایت کے ساتھ ہمارے ہاں سے آپ کو مل سکتا ہے
بشیر اینڈ کمپنی ۔۔۔ سائیکل ڈیلر
صرافہ بازار • کوئٹہ

ہنگامہ زارِ کانپور

آج سے پچاس برس پہلے!

پچاس سال پہلے جب انگریز پورے استبداد اور قہرمانیت کی شان سے ہندوستان کا آقا تھا اور ہندو مسلم اس کے غلام تھے، کلکٹر کانپور نے یوپی کے لیفٹنٹ گورنر کی شہ پاکر مسجد کا ایک حصہ سڑک کی توسیع کے سلسلے میں منہدم کرا دیا۔

مسجد کی شہادت!

اس سلسلے میں غلام مسلمانوں نے کیا کیا، غلام مسلمانوں کے زعماء نے کیا کیا اور ان دونوں کے ایثار و قربانی نے کس طرح بالآخر وائسرائے کو جھکنے اور گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ یہ تاریخ کا ایک نہایت دلچسپ باب ہے۔

ایک وہ زمانہ تھا اور ایک یہ زمانہ ہے کہ ہندوستان کی قومی اور سیکولر حکومت اُن صدہا مسجدوں کو نہ اب تک دوبارہ بنا سکی جو شہید کر دی گئی تھیں، نہ واگزار کرا سکی جو آج تک غیر مسلموں کے قبضے میں ہیں!

★

سخن ہائے گفتنی

شبلی

کچھ طفل خورد سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں ،
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آ گئی ہے منتظر نفخ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشّۂ شباب
ظاہر ہیں گرچہ صاحب عقل وشعور ہیں،
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے ، مگر ہم ضرور ہیں ،
سینہ پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار
ازبسکہ مست بادۂ ناز وغرور ہیں،
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناس ذوق دل ناصبور ہیں،
پوچھا جو میں نے کون ہو تم ؟ آئی یہ صدا
"ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں ،، !

کانپور میں مسجد کی شہادت

سہ شنبہ ۸ جولائی ۱۹۱۳ء

کانپور کی مسجد واقع مچھلی بازار کے ایک حصہ کے انہدام کا ناخوشگوار معاملہ کچھ عرصہ سے درپیش تھا جس کے متعلق اکثر اسلامی اخبارات نے معاملہ کے ہر گوشہ گوشہ پر طویل بحث کر کے اور اچھی طرح ظاہر کر دیا تھا کہ صورت حالات و حقیقت واقعات کیا ہے۔ اور مسلمانوں کی تشویش و پریشانی کس حد تک جائز ہے۔

ہمارے ناظرین کو سخت تعجب ہوگا کہ اس بارہ میں ہمدرد نے اپنی زبان سے اب تک کیوں ایک حرف بھی نہ نکالا۔ اور اس اہم معاملہ کو کس وجہ سے قابل التفات نہ سمجھا۔ لیکن جیسا کہ مسلمانان کانپور کو اچھی طرح علم و اطلاع ہے مسٹر محمد علی نے صوبہ جات متحدہ آگرہ اودھ کے حاکم اعلیٰ کی معاملہ فہمی اور مصلحت شناسی بلکہ انصاف پسندی اور عدالت شعاری پر بھروسہ کر کے مناسب سمجھا کہ اس بارہ میں ہز آنر سر جیمس مسٹن صاحب بہادر کی خدمت میں اصلی حالات اور صحیح واقعات پیش کر کے وہ تمام امور مراسلت کے ذریعہ سے گوش گزار کر دیں جو اخبارات کے ذریعے سے پیش کئے جاتے اور اس طرح اگر یہ معاملہ خطوط و عرائض کے صفحات میں لانے سے رو براہ ہو جائے تو بدرجہا اولیٰ و بمراتب اس سے بہتر ہوگا کہ اخبارات کے کالموں میں لا کر ایک طرف تو اسلامی پبلک کے جوش کو بڑھایا جائے۔ اور دوسری طرف گورنمنٹ کی مشکلات میں اضافہ کیا جائے۔

مسلمانان کانپور نے بطور خود بھی آخری کوشش کی یعنی ہز آنر کی خدمت عالی میں آخری میموریل پیش کیا جس میں شرح و بسط کے ساتھ واقعات بیان کر کے درخواست کی کہ مسجد کا کوئی حصہ منہدم نہ کیا جائے۔ ہز آنر خود بھی بغرض معائنہ مسجد و دریافت حالات کانپور میں تشریف لائے اور ہمیں قوی امید تھی کہ وہ ہر پہلو کو اچھی طرح سوچ سمجھ لیں گے اور حکم اخیر نافذ فرمانے سے پہلے اس امر کو ملحوظ رکھیں گے کہ ان کے صوبہ کی رعایا کی کثیر تعداد اور معتدبہ حصہ کی دل آزاری اور خاطر شکنی نہ ہونے پائے گی۔ افسوس کہ جس زخم کی قسمت میں ہمیشہ پیپ ہو کر بہہ جانا لکھا ہوتا ہے۔ اس پر کافوری مرہم کے ہزار پھاہے رکھے جائیں تب بھی کچھ نہیں ہوتا اور وہ بغیر پھٹے اور تراوش کئے نہیں مانتا۔

جیسا کہ ہمارے ناظرین کو اس وقت تک تفصیل و صراحت معلوم ہو چکا ہوگا۔ کانپور کی مسجد کا وہ شرقی حصہ جسے چاہے دالان کہو یا غسل خانہ یا وضو خانہ اور جسے کانپور میونسپلٹی کے چیئرمین صاحب تاک چکے تھے۔ آج ایک ہفتہ ہو چکا کہ پیوند خاک اور سطح زمین سے ہموار کر دیا گیا۔ مسجد شکنی بھی ہوئی اور خاطر شکنی بھی ہوئی نہ صرف مسلمانان کانپور کی بلکہ مسلمانان ہند کی خاطر شکنی! اور آج ہمیں اقرار کرنا پڑتا ہے کہ معاملہ کو چپ چپاتے اور مراسلت و مصالحت طے کرانے کے متعلق مسٹر محمد علی کی تمام کوششیں بالکل رائیگاں اور محض بے سود ثابت ہوئیں۔

ہم ہز آنر سر جیمس مسٹن اور مسٹر محمد علی کی خط و کتابت کو بجنسہ شائع کرتے ہیں جس سے ناظرین واقعات کو دیکھ کر اور بجائے خود سمجھ کر رائے قائم کر سکتے ہیں۔ اس سے یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ ہم ادائے فرض سے غافل نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم ابھی عرض کر چکے ہیں ہم نے چاہا تھا کہ اگر اس سہل طریقہ سے حصول مقصد ہو جائے تو اخباری دار و گیر سے یہ بہتر و اولیٰ ہے۔ لیکن ہم افسوس کر رہے ہیں کہ جمہوریت میں جمہوری طریقوں

کے بغیر کاربراری نہیں ہوتی۔ کانپور کی مسجد کا انہدام ایک ایسا واقعہ ہے جو بہ آسانی مسلمانوں کے دلوں سے محو نہیں ہو سکتا۔ اور اس واقعہ نے ہمیں صاف بتا دیا ہے کہ لوکل سیلف گورنمنٹ جس چیز کا نام ہے وہ محض ایک دھوکے کی ٹٹی ہے جس کی آڑ میں جمہوریت نما مگر شخصیت پسند خود مختار عمال نہایت اطمینان کے ساتھ رعایا کے دلوں کو تیرہ مشق نشانہ بازی بنا سکتے ہیں اور کمال بے پرواہی کے ساتھ ایسے حالات پیدا کر سکتے ہیں جن سے رعایا و گورنمنٹ کے تعلقات میں کشیدگی واقع ہو جائے۔ ذیل میں ہم ان واقعات کو درج کرتے ہیں جو بالتصریح بتائیں گے کہ کانپور کی نا درشاہی لوکل سیلف گورنمنٹ نا واقف اور کمزور رعایا کے حقوق کی کیسی اچھی حفاظت کر سکتی ہے۔ اور یہ کہ ہز آنر کے صریح وعدوں (کہ مسجد میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جاوے گی) حسب مطلب تاویلیں کر کے کس قدر قابل احترام ہستی کا ثبوت دیا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ سے دوسرے بڑے شہروں کی طرح کانپور کو "اصلاحات" کا متعدی مرض لاحق ہوا ہے۔ اس مرض کے علاج و معالجہ کے لئے صوبہ کی گورنمنٹ نے ۱۹۰۸ء میں ڈھائی لاکھ روپیہ اس غرض سے دینا منظور کیا کہ "سڑکیں چوڑی کی جائیں اور رفاہ عام کے اسی قسم کے اور کاموں کی تکمیل کی جائے" "جس سے کانپور کی گنجان آبادی کی مصیبتیں کم ہو جائیں اور" اس مقصد کے حصول کے لئے جو تجاویز طے ہو چکی ہیں یا آئندہ ہوں ان پر عمل کیا جائے"۔ انہیں تجاویز میں اے۔ بی روڈ کی تعمیر کی تجویز تھی جسے ۷ اپریل ۱۹۰۹ء کو گورنمنٹ منظور کر چکی تھی۔ اہل شہر کو جب اس تجویز کی اطلاع ہوئی تو مفصل حالات سے لاعلمی کی وجہ سے انہیں تشویش و پریشانی لاحق ہوئی۔ اگر سڑک مجوزہ سیدھی بنائی جاتی تو مچھلی بازار میں مسجد کے مقابل جو مندر واقع ہے وہ یقیناً میونسپلٹی کے انجنیر کے پھاوڑوں کی نذر ہو جاتا۔ اہل ہنود جب اس خطرہ سے مطلع ہوئے تو لازمی بات تھی ان میں بیچینی پیدا ہوتی۔ چنانچہ ہوئی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا اور ہونا چاہیئے تھا کہ یہ امر طے پایا کہ مندر کو بچا دیا جائے۔ جب یہ تجویز رد کی رو سے مندر منہدم ہوتا تھا مسترد کی گئی اور سڑک کو کسی قدر موڑنا پڑا تو چونکہ مندر اور مسجد کے درمیان اتنا کافی فاصلہ نہ تھا کہ سڑک نکل سکے۔ اس لئے مسلمانوں کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سڑک کی غرض کو یکساں رکھنے کے لئے مسجد کا مشرقی حصہ لینے کی کوشش کی جائے چنانچہ نومبر ۱۹۱۲ء میں جب حضور لفٹیننٹ گورنر بہادر صوبجات متحدہ کانپور تشریف لائے تو مسلمانان کانپور نے مسجد کے حصہ مذکور کے متعلق ہز آنر سے استدعا کی کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کا خیال کر کے اسے محفوظ رکھا جائے۔ اس پر ہز آنر نے اپنی اسپیچ میں کہا کہ مسجد اور مندر دونوں پر دست اندازی نہ کی جائے گی۔ ہز آنر کی یہ تقریر کانپور کے مقامی اخبار ہیرلڈ آف انڈیا مورخہ ۲۴ نومبر ۱۹۱۲ء میں شائع ہو چکی ہے۔

اس صاف و صریح وعدہ کے الفاظ معمولی عقل کے آدمی کے نزدیک جو معنی رکھتے تھے وہی مسلمانان کانپور نے سمجھے۔ اور شکر گزاری کے ساتھ ہز آنر کے اس وعدہ سے مطمئن ہو گئے اور مسجد کی طرف سے بے فکر ہو بیٹھے۔ ان بیچاروں کو کیا معلوم تھا کہ ان الفاظ کے مفید مطلب معنی نکال لینا جدت پسند چیرمین صاحب میونسپل بورڈ کی نکتہ آفرین طبیعت سے کچھ بعید نہ تھا۔ چنانچہ چیرمین صاحب نے ہز آنر کے الفاظ کا جو مطلب وہ سمجھ سکتے تھے وہی سمجھ لیا۔ اور امپرومنٹ ٹرسٹ کمیٹی میں جس کے متعلق بہ حیثیت سب کمیٹی میونسپل بورڈ کل انتظامات متعلقہ اے۔ بی روڈ کئے گئے تھے اس مضمون کا ریزولیوشن پاس کرا لیا کہ مسجد مذکور کے مشرقی حصہ (دالان) کو منہدم کر دیا جائے اور اس کے عوض مسجد کو جانب شمال جگہ دی جائے۔

جب کمیٹی کا یہ ریزولیوشن آخری منظوری کے لئے بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو ایک ممبر نے یہ مسئلہ پیش کیا کہ آیا اس امر کی ضرورت بھی ہے کہ مسجد کا کوئی حصہ لیا جائے۔ مگر اس مسئلہ پر بحث کرنا ضروری نہ سمجھا گیا۔ اور ممبر صاحب کو اس بنا پر گفت و گو کرنے سے روک دیا گیا کہ بورڈ کے سامنے جو سوال ہے وہ محض معاوضہ کا سوال ہے۔ عمارت کا لیا جانا تو پہلے ہی طے ہو چکا ہے۔

چیرمین صاحب کے اس بیان کی کوئی تصدیق نہیں ہوتی کہ "عمارت کا لیا جانا پہلے ہی طے ہو چکا ہے"۔ اگر بورڈ کے پاس اس قسم کا کوئی ریزولیوشن

موجود ہونا تو ضرور تھا کہ بجائے زبانی جواب دینے کے چیئرمین صاحب اسے عین موقع پر جیب سے نکال کر معترضین کے منہ پر کھینچ مارتے۔ منجملہ ان رزولیشنز کے جنہیں چیئرمین صاحب نے اپنی پرپیچ و خم منطق کی تائید میں پیش کیا ہے ایک وہ ہے کہ جس میں عام الفاظ میں گورنمنٹ کی طرف سے بورڈ کو ڈھائی لاکھ روپیہ اس غرض سے دئے جانے کا ذکر ہے کہ شہر کانپور کے سڑکوں کو وسیع اور گنجان آبادی کو کشادہ کیا جائے۔ مگر ہم اس عجیب منطق کے سمجھنے سے بالکل قاصر ہیں جس کی رو سے کلیات کی منظوری کے بعد جزئیات کی بحث بالکل ممنوع اور ناممنوع قرار دی جائے جو رزولیشن پاس ہو چکا تھا۔ اس میں جزئیات کا کوئی تذکرہ ہوا نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اب جب کہ وہ وقت آیا کہ بورڈ میں جزئیات پر ہر معاملہ کے متعلق علیحدہ علیحدہ بحث کی جائے تو چیئرمین صاحب کا ان معاملات کو امور طے شدہ قرار دے کر مزید گفتگو کی اجازت نہ دینا اس شخصی حکومت کی مثال ہے جو لوکل سیلف گورنمنٹ کے پردے میں کام کر رہی ہے مبران بورڈ کو صحیح طور پر معلوم نہ تھا کہ سڑک کی تعمیر کے لئے کون کون سی عمارتوں کے حصول و انہدام کی ضرورت ہوگی۔ بلکہ ہم سے تو یہاں تک کہا گیا ہے کہ سڑک مجوزہ کے نقشہ میں مسجد کے حصہ انہدام طلب کو دکھایا ہی نہیں گیا تھا۔ لیکن اگر نقشہ میں اس حصہ کو دکھایا بھی گیا ہو۔ تو وہ ممبر جو انگریزی نہیں جانتے ہیں اسے کیا سمجھ سکتے تھے۔ اس کارروائی میں سب سے زیادہ معما لاینحل یہ ہے کہ امپروومنٹ ٹرسٹ کمیٹی انگریزی

ا   )نے ۲۰ فروری ۱۹۱۳ء کو مسجد کے مشرقی حصہ کے لینے کا فیصلہ کیا۔ لیکن

اس سے پندرہ مہینے قبل افسر حصول اراضی نے یہ رپورٹ کر دی تھی کہ "مسجد کا صرف ایک کونا جو غسل کرنے کی غرض سے حال ہی میں بنایا گیا ہے لے لیا جائے گا۔ اور اس کے معاوضہ میں مکانات گرد و پیش منہدم کر کے ایک قطعہ اراضی دے دیا جائے گا"۔ جب امپروومنٹ ٹرسٹ کمیٹی نے ۲۰ فروری ۱۹۱۳ء تک یہ طے نہ کیا تھا کہ آیا مسجد کا شرقی حصہ ضرور ہی لے لیا جائے گا۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ افسر حصول اراضی کو اپنے فرائض مفوضہ سے زیادہ اور اپنے فرض منصبی کی حدود سے تجاوز کر کے اس مسئلہ کے تصفیہ کرنے کا کیا حق حاصل تھا؟ کیا افسر مذکور کسی بالادست طاقت کے ایما و ہدایت پر عمل پیرا ہو کر اس معاملہ کے لئے راستہ صاف کر رہا تھا؟ کیا افسر مذکور کا حصہ انہدام طلب کو "مسجد کا صرف ایک کونا" مان کر اس پر یہ مستزاد کرنا کہ "جو غسل کرنے کی غرض سے حال ہی میں بنایا گیا ہے" معنی خیز نہیں؟

چیئرمین صاحب نے جو خط صاحب کلکٹر ضلع کو لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں کہ "جب تک قریب کے ہندو مندر کو بچا نہ دیا گیا اس وقت تک حصہ مسجد کے اصول کے خلاف ایک آواز بھی بلند نہ ہوئی"۔ ہم نہیں جانتے کہ اس چھوٹے سے فقرہ میں جو غدر لنگ مستور ہے اس کی توہین و تضحیک کریں یا جو الزام قبیح مضمر ہے اس کی تحمیق و تردید یہ پہلا واقعہ ہے۔ نہ اس سڑک کے نکاس کی صرف دو صورتیں تھیں یعنی یا تو سیدھی بخط راست نکالی جائے جس میں مندر مسمار ہوتا تھا یا خم دے کر نکالی جاتی جس سے مسجد کا ایک حصہ منہدم ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں صورتیں ایک ہی وقت میں اور ایک ساتھ نہیں ہو سکتی تھیں۔ لہذا جب یہ خیال تھا کہ سڑک سیدھی بخط راست نکالی جائے گی۔ تب تک کوئی وجہ نہ تھی کہ مسجد کو معرض خطر میں سمجھ کر مسلمان عرض معروض اور داد فریاد کرتے پھرتے۔ لیکن جب اس امر کا اعلان کر دیا گیا کہ مندر بچا دیا گیا اور مسمار نہ کیا جائے گا۔ تب کہیں جا کر معلوم ہوا کہ مسجد کا حصہ مشرقی ہی ممتنع الوجود قرار دیا گیا ہے۔ اور اس وقت سے انہوں نے اس بارہ میں داد روش شروع کی۔ مگر چیئرمین صاحب مسلمانان کانپور پر یہ الزام قائم فرماتے ہیں کہ انہوں نے دریا نظر آنے سے پہلے موزے کیوں نہ اتار لیے اور موت کی خبر سننے سے پہلے گریہ و بکا کیوں نہ شروع کر دیا۔ چیئرمین صاحب کا معناً یہ الزام لگانا کہ ہندوؤں کے مندر بچ جانے کے بعد مسلمانوں کو بربنائے رقابت مذہبی یہ خیال ہوا کہ حصہ مسجد کے متعلق شور و شغب کرنا چاہیے۔ بہتان صریح اور افترائے قبیح ہے۔ اس تمام ناخوشگوار اور دل آزار واقعہ میں اگر کوئی بات ایسی ہے جسے مسلمان آنکھیں استحسان کے ساتھ دیکھ سکیں اور مسلمان دل شکر گزاری سے یاد رکھ سکیں تو وہ ہمارے ہندو بھائیوں کے حصۂ کثیر کا برادرانہ اور دوستانہ طرز عمل

ہے جسے ہم کبھی نہیں بھول سکتے۔ جیسا ہم پہلے عرض کر چکے ہیں بورڈ کے جلسہ میں ایک ممبر نے مسجد کے شرقی حصہ کے حصول و انہدام پر اعتراض کیا مگر اسے خاموش کر دیا گیا اس پر دس ممبروں نے جن میں چھ ممبر ہندو تھے۔ ایک درخواست لکھ کر چیئرمین صاحب کی خدمت میں بھیجی جس میں استدعا کی گئی تھی کہ ریزولیوشن درج ایجنڈا کیا جائے۔

امپرومنٹ ٹرسٹ کمیٹی کی روئیداد سے جو جلسہ بورڈ منعقدہ ۴ مارچ ۱۹۱۳ء میں پیش ہوئی اور جلسہ بورڈ منعقدہ ۸ مارچ میں منظور ہوئی جس میں بورڈ کے ایک ممبر کا اعتراض مسترد کر دیا گیا تھا بورڈ کو واضح ہوتا ہے کہ مسجد واقع مچھلی بازار کی عمارت کا ایک حصہ سڑک B.A کے لئے حاصل کیا جا رہا ہے۔ لہذا تحریک کی جاتی ہے کہ چونکہ مسجد کی بنا پر قابل اعتراض اور بحوائے ارشاد ہز آنر لفٹیننٹ گورنر بہادر صوبجات متحدہ مصدرہ ۱۳ر نومبر ۱۹۱۲ء کے خلاف ہے لہذا بورڈ کی رائے ہے کہ مسجد کا حصہ مشرقی نہ لیا جائے اور اس پر بورڈ ہذا کا کوئی سابقہ ریزولیوشن جس میں بصراحت یا بہ اشارت اس حصول کو منظور کیا گیا ہو منسوخ کیا جائے۔

یہ ریزولیوشن بورڈ کے جلسہ منعقدہ یکم اپریل ۱۹۱۳ء میں پیش کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ ترمیم پیش ہوئی کہ گورنمنٹ سے درخواست کی جائے کہ مسلمانوں کے جذبات کا خیال کر کے سڑک B.A میں مسجد کا کوئی حصہ شامل نہ کیا جائے۔ اس ترمیم کی تحریک و تائید باقاعدہ ہوئی۔ لیکن چیئرمین صاحب نے ایک دوسری ترمیم پیش کی جس کی مسٹر رائن نے تائید کی۔ اس ترمیم کا مطلب یہ تھا کہ ریزولیوشن پیش کردہ پر کچھ عمل درآمد نہ کیا جائے۔ لیکن اس ترمیم کی تائید صرف چار یورپین ممبروں نے کی چونکہ پہلی ترمیم کی تائید مزید تیرہ ممبروں نے کی تھی۔ لہذا وہ کثرت رائے سے منظور ہوئی اور ابتدائی تحریک واپس لے لی گئی۔ لیکن چیئرمین صاحب نے صاحب کلکٹر ضلع کو اپنی چٹھی میں لکھا کہ ترمیم شدہ صورت میں بھی وہ ریزولیوشن کی سفارش کرنے سے قاصر ہیں۔ کیونکہ اگر مسجد کا یہ حصہ بدستور رکھا گیا۔ تو سڑک نہایت بدنما ہو جائے گی۔ جو کسی طرح جائز نہیں رکھی جا سکتی اس ترمیم شدہ ریزولیوشن بورڈ نے اپنے جلسہ منعقدہ ۱۵ اپریل ۱۹۱۳ء میں منظور کر لیا۔

مگر اس سے کچھ عرصہ پہلے کانپور کے صاحب مجسٹریٹ ضلع بھی مسجد کے حصہ شرقی کے انہدام میں شرکت فرمانے اور اس کار خیر میں حصہ لینے کو تشریف لائے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ صاحب موصوف کا پہلا کام یہ تھا کہ وہ معائنہ مسجد کے لئے گئے اور مشرقی حصہ مسجد میں بوٹ پہنے داخل ہوئے سنا جاتا ہے کہ واپسی پر صاحب موصوف نے اپنی رائے علی الاعلان ظاہر فرما دی کہ حصہ متنازعہ کسی طرح جزو مسجد نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ کسی مسلمان نے انہیں وہاں بوٹ پہن کر جانے سے نہیں روکا۔

اس واقعہ ہائلہ نے خیالات میں جو تلاطم برپا کر رہا ہے اس کی وجہ سے ہم اس قابل نہیں ہیں کہ کوئی چبھتی ہوئی مثال پیش کر کے صاحب بہادر کی منطق کی تائید کریں۔ لیکن اس امر کے دریافت کی اجازت چاہتے ہیں کہ کیا آئندہ سے مسجد کی تعریف یہ قرار پائی ہے کہ وہ جگہ اور صرف اس قدر جگہ جہاں صاحب بہادروں کے غریب پرور بوٹ نہ جا سکیں؟ اگر یہی ہے تو بڑے شہروں کی میونسپلٹیوں کو عموماً اور دہلی میونسپلٹی کو خصوصاً اپنے شہر کی ترقی و تزئین مبارک ہو کہ مسجد وغیرہ کے صحن اور حجرے اور دروازے سڑکوں کی توسیع و ترمیم کے لئے وقف ہو گئے۔ اب نہ امراء اور ریلوں کو مساجد کی وجہ سے غیر ضروری پیچ و خم دینے کی ضرورت رہے گی۔ نہ عمارات و شوارع عامہ کو موقع سے بے موقع ہونا پڑے گا کیونکہ مسجد کے مختصر سے گنبد کو چھوڑ کر باقی وہ کل لق و دق حصہ جس میں دروازہ و عمارات مشرقی و شمالی و جنوبی اور صحن اور حوض اور چھتیں اور کھڑکیاں سب شامل ہیں۔ حسب ضرورت ان کار ہائے خیر کے حوالے کیا جا سکے گا۔ یہ ہم اس لئے کہتے ہیں کہ جب مسجد کی تعریف یہی ٹھہری کہ وہ حصہ جس میں صاحب بہادروں کے بوٹ نہ جا سکیں تو ہندوستان جیسے طویل و عریض ملک کی کسی مسجد کا چاہے وہ شاہ جہاں بادشاہ کی بنائی ہوئی مسجد جہاں نما (جامع مسجد) ہی

کیوں نہ ہو دروازہ و عمارت شمالی و شرقی و جنوبی اور صحن اور حوض ایسے مقامات نہیں جو شامل وہ اعلیٰ [illegible] جائیں۔ کیونکہ یقیناً ۔ وہ مقامات ہیں جہاں صاحب بہادروں کے بوٹ تشریف نہ لے جاتے ہوں۔

ممکن ہے کہ ہمیں صاحب مجسٹریٹ بہادر ضلع کانپور کے الفاظ یا خیالات کی سبکی کرنے کا مرتکب قرار دیا جائے۔ لیکن جو شخص ہمیں مرتکب قرار دے اسے چاہیئے کہ پہلے اپنے کلیجہ پر ہاتھ رکھ کر دیکھ لے اور اپنے دل سے صلاح لے کر سوچ لے کہ مسلمانوں کے مذہب کے ساتھ اس طرح مذاح و ظرافت کرنا زیادہ سنگین جرم ہے یا صاحب بہادر کے الفاظ کی سبکی کرنا زیادہ سخت الزام ہے۔

اگر کسی ضلع کا حاکم اپنے زعم حکومت میں کسی مسجد میں جوتا پہنے چلا جائے جیسا کہ روزہ ہوتا ہے اور اس کی رعایا جو اس کی شان جباری سے واقف ہے اپنی جہالت اور کمزوری بلکہ بزدلی کی وجہ سے اس حاکم کو جوتا پہنے جانے سے نہ روکے۔ کیونکہ وہ واقف ہے کہ صاحب بہادر کو روکنا کتنے بڑے ناقابل معافی جرم کا مرتکب ہوتا ہے جس کی پاداش میں کیا کچھ خمیازے بھگتنے نہ پڑیں گے تو اس حاکم کو کہاں تک لازم ہے کہ وہ اپنی رعایا کی کمزوری کو سی کے منہ پر کھینچ مارے۔ اور اس سے رعایا کے اہم مذہبی معاملہ کے انفصال کے وقت فائدہ اٹھائے۔

سلسلہ خیالات میں الجھ جانے سے سلسلہ واقعات ہاتھ سے چھوٹا جاتا ہے۔ صاحب مجسٹریٹ ضلع کے معائنہ کے بعد مسلمانان کانپور نے مسجد میں ایک جلسہ کیا جس میں پانچ علماء نے جن میں مولانا آزاد سبحانی پرنسپل مدرسۃ الالہیات کانپور بھی شامل تھے باضابطہ فتویٰ بدیں مضمون دیا کہ حصہ زیر بحث یعنی مشرقی حصہ مذہبًا اور شرعًا جزو مسجد اور شامل مسجد ہے تشریع اسلامی کی رو سے مسجد یا اس کے کسی جزو یا حصہ کی بیع یا مبادلہ خوزہ خلاف شریعت ہے اس کے بعد مسلمانان کانپور صاحب کلکٹر بہادر ضلع کانپور کی خدمت میں اس غرض سے حاضر ہوئے کہ اپنی واجبی شکایات ظاہر کریں۔ اور احکام مذہبی کی تشریح کر دیں۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانان کانپور کے پیش کردہ دلائل کلکٹر صاحب بہادر کے لئے باعث تشفی نہ ہوئے۔ اب مسلمانان کانپور کے لئے صرف ایک ہی کھلا دروازہ رہ گیا تھا۔ اور وہ دروازہ ایوان لفٹیننٹ گورنر کا تھا۔ چنانچہ انہوں نے آنریبل مسٹر شاہد حسین صاحب بیرسٹر ایٹ لا کے توسط سے ۱۲ راپریل ۱۹۱۳ء کو ہز آنر لفٹیننٹ گورنر صوبجات متحدہ کی خدمت میں میموریل پیش کیا جس میں انہوں نے واقعات معاملہ ظاہر کر کے عرض کیا کہ صاحب مجسٹریٹ ضلع نے مسجد کے شرقی حصہ کو انہدام سے بچانے کے متعلق اظہار نارضامندی کیا۔ اور چونکہ اس حصہ کے اصول و انہدام سے ان کے مذہب پر دست و درازی ہوتی ہے جو گورنمنٹ کی مصلحت کے منافی ہے لہٰذا ان کی استدعا ہے کہ حضور لفٹیننٹ گورنر بہادر حصہ مسجد کو دست برد انہدام سے محفوظ رکھیں۔ اس میموریل کے جواب میں انڈر سیکرٹری گورنمنٹ صوبجات متحدہ نے ارقام فرمایا:۔

" لفٹیننٹ گورنر بہادر نے میموریل پیش کنندگان کی گذارش پر بخوبی غور فرما لیا ہے۔ اور واقعات کو مقامی افسروں سے دریافت کر لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ سڑک کی لائن جو پہلی ہی تجویز ہو چکی ہے برقرار رکھنی چاہیئے۔ ہز آنر نے اس امر کا ذمہ لیا تھا کہ مسجد میں دست اندازی نہیں کی جائے گی۔ لیکن منہ ہاتھ دھونے کی جگہ عمارت مقدس کا جز نہیں ہے۔ اور جب اس قسم کی بحث لکھنؤ کی درستی شہر کے متعلق پیش آئی تھی تو مسلمان اس پر راضی ہو گئے تھے۔ کہ منہ ہاتھ دھونے کی جگہ جو اغراض عامہ کے لئے مطلوب ہے اس کی بجائے انہیں کوئی دوسری جگہ منہ ہاتھ دھونے کے لئے دے دی جائے۔ لہٰذا مسجد کانپور کے متعلق جو منہ ہاتھ دھونے کی موجودہ جگہ ہے اسے بھی مسمار کر دینا چاہیئے۔ متولیان مسجد سے کہا جائے گا کہ وہ کوئی اور جگہ پسند کر لیں جس پر میونسپل بورڈ ان کے لئے منہ ہاتھ دھونے کی جگہ تعمیر کر دے گا۔ انڈر سیکرٹری صاحب کے جواب سے اس امر کی تصدیق ہو گی کہ ہز آنر نے اس امر کا ذمہ لیا تھا کہ مسجد پر دست درازی نہ کی جائے گی۔ مگر ذمہ دار مقامی عمال بھلا اسے کیوں کر گوارا کر سکتے تھے کہ ان کی شیخی یوں کرکری ہو۔ اس لئے انہوں نے ہز آنر کے الفاظ۔ اپنی باراں دیدہ اور خزاں چشیدہ منطق اور مسلمانوں کے پنبہ دہان سے ایک معجون مرکب تیار کی جس نے

مرض کا "استیصال کلی کر دیا۔ ان عمال نے شروع ہی سے حصہ مسجد کو مختلف ناموں سے یاد کرنا" ایک گوشہ" "ایک تعمیر جدیدہ" ۔ "وضو کی جگہ" ۔ "غسل خانہ" ۔ آخرکار وہ اپنی پندار اور ہز آنر کی نگاہ میں اس امر کے ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ "وہ مسجد کا حصہ شرقی ، حصہ مسجد نہیں ہے ۔ اور اس لئے خارج از مسجد ہے ۔ اس کے بعد منطق کی کڑیاں مضبوط تھیں ۔ ہز آنر نے تو ذمہ لیا تھا کہ مسجد میں دست اندازی نہ کی جائے گی ۔ مگر حصہ انہدام طلب خارج از مسجد ہے ۔ لہذا ہز آنر کی ذمہ داری اس پر عائد نہیں ہوتی ۔

افسوس ہے کہ اس سلسلے میں جو سب سے زیادہ کمزور کڑی تھی اس پر مطلق توجہ نہ کی گئی یعنی آیا حصہ انہدام طلب (جو افسوس ہے کہ اب شہید ، مسمار و منہدم سب کچھ ہی ہو چکا ہے) داخل مسجد ہے یا نہیں ۔ اور اس پر مسجد کا اطلاق ہو سکتا ہے یا نہیں ۔ ہمیں معاف کیا جائے کہ اگر ہم یہ عرض کریں کہ مقامی عمال بلکہ خود ہز آنر کی عاملانہ اور عاقلانہ یا لیفٹیننٹی نظر ، جو ارباب حکومت کے لئے ہی زاد راہ ہے سر بستہ اور عقدہ ہائے لاینحل کے حل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ۔ مگر یہ مسئلہ ایک خاص مذہب اور اس مذہب کی ایک شاخ اور فن سے تعلق رکھتا ہے اور بجز علماء و فقہائے اسلام کے یا ان لوگوں کے جو شرع اسلام کے مسائل پر عبور رکھتے ہیں دوسرے کا کام نہیں کہ اسے طے کرے ۔ علمائے نے یہ طے کر دیا کہ اور فتویٰ دے دیا کہ یہ حصہ مذہبا اور شرعاً داخل و شامل مسجد ہے ۔ مگر صوبہ کی گورنمنٹ کا دعویٰ ہے کہ "خارج از مسجد" ہے بہتر ہوتا کہ پرجلال اور باعظمت گورنمنٹ کل مالی و ملکی و سیاسی و اقتصادی اور اصلاحی و انتظامی امور کی باگ ڈور اپنے ہی بارعب و داب عہدہ داروں کے ہاتھ میں رکھتی مگر اسلامی امور متعلق افتاء اور تشریح مسائل کا کام غریب اور میلے کچیلے کپڑے والے مولویوں کے ہاتھ میں ہی رہنے دیتی ۔

تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی

مسلمانان کانپور پورے وثوق کے ساتھ اور نہایت زور سے دعویٰ کرتے ہیں کہ مرحوم دالان مسجد سے جدا نہ تھا ۔ اور ان کے پاس اس امر کا ثبوت ہے کہ جب کبھی کسی وجہ نمازیوں کا مجمع زیادہ ہوتا تھا تو ہمیشہ اس حصے میں نماز پڑھی جاتی تھی ۔

چیئرمین صاحب کے راج ہٹ کی یہ ادنی مثال ہے کہ ۲۰ مئی کو میموریل کا جواب مل جانے کے بعد جب پھر ایک دفعہ بورڈ میں یہ ریزولیوشن پیش کیا گیا وہ بورڈ گورنمنٹ سے سفارش کرتا ہے کہ آخری حکم پر نظر ثانی کی جائے "۔ تو چیئرمین صاحب نے خود ایک ترمیم پیش کی کہ بورڈ کی طرف سے کسی مزید تحریک کی ضرورت نہیں ہے ۔ اور گورنمنٹ کے حکم کو حکم اخیر سمجھنا چاہئے ۔ یہ ترمیم صاحب چیئرمین کے اپنے ڈبل ووٹ کی وجہ سے پاس ہو گئی ۔ برٹش گورنمنٹ کے دور حکومت میں نام نہاد لوکل سیلف گورنمنٹ کا یہ عجیب و غریب استعمال ہے کہ گورنمنٹ عالیہ ہند نے جو آلہ بصد اظہار شفقت ہمیں اپنی جائز اغراض کی حفاظت کے لئے عطا فرمایا ہے اسی کے ذریعے سے ہمارے حقوق اور ہماری آزادی کا گلا کاٹا جاتا ہے ۔

اپنی جوتی اپنی چاند

اس ریزولیوشن کی شکست کے بعد ایک دوسرا میموریل ہز آنر لفٹیننٹ گورنر بہادر کے حضور میں بھیجا گیا ۔ اور اس میں تفصیل کے ساتھ عرض و معروض اور گذارش و التماس کی گئی ۔ ہمیں معلوم نہیں کہ صوبہ کے حاکم اعلیٰ کی پیشگاہ سے اس میموریل کا اب تک کوئی جواب ملا یا نہیں لیکن یکایک ۳ جولائی کو ہز آنر سر جیمس مسٹن خود کانپور تشریف لائے اور مسجد کا معائنہ فرمایا ۔ کسے معلوم تھا کہ ہز آنر کے یوم تشریف آوری کی شب حصہ مسجد کی شب رحلت ہوگی ۔ ؟

کیوں کہ عام امیدیں تو تسلی دے رہی تھیں کہ صوبہ کے سب سے بڑے حاکم کی تشریف آوری مریض کے لیے مسیحائی کرے گی ۔ لیکن افسوس ۳۰ر کی شام تک جو امیدیں تھیں وہ یکم جولائی کی صبح کو خاک میں مل گئیں ۔

علی الصبح سنگیں چڑھائے ہوئے مسلح پولیس مسجد کے ہر چہار طرف متعین تھی ہمارے خاص کارسپانڈنٹ نے اسی روز جو تار ہمیں دیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی طرف آنے کے تمام راستے روک دیئے گئے تھے ۔ اور لوگ بہت جلد سمجھ گئے کہ یہ سب کچھ تیاری مسجد کے اس حصہ کو منہدم کرنے کے لئے ہے جو سڑک کی داغ بیل میں آتا ہے ۔ پولیس کے سوار ہر طرف سڑکوں پر پھر رہے تھے اور جہاں کہیں لوگوں کا مجمع ہوتا جاتا تھا اسے منتشر کرتے جاتے تھے ۔ انہدام کے بعد ہزاروں مسلمان جن میں بہت سے کارخانوں کے مزدور تھے دن بھر اس موقع کو دیکھنے آتے رہے "۔ ایک دوسرے کارسپانڈنٹ نے بعد کو اطلاع دی کہ اسی دن شام کو مسلمانان کانپور کا ایک عظیم الشان جلسہ عیدگاہ میں ہوا ۔ اور ذیل کا تار ہز ایکسیلنسی حضور والسرائے کی خدمت میں بھیجا گیا ۔

مسلمانان کانپور نے آج ایک عام جلسہ میں یہ ریزولیوشن پاس کیا کہ یور ایکسیلنسی کو اطلاع دی جائے کہ حکام ضلع نے مسلح پولیس کی امداد سے اور بلا انتظار نتیجہ اس میموریل کی جو ہز آنر لفٹیننٹ کو بھیجا گیا ہے ۔ مچھلی بازار کی مسجد کی عدیم المثال بیحرمتی کی ہے ۔ یہ طرز عمل بالکل خلاف قانون ہے اور اس کی نظیر ہندوستان میں انگریزی اور حکومت کی ابتدائے آج تک نہیں مل سکی ۔ سخت بے چینی پیدا ہو گئی ہے ۔ التجا ہے کہ حضور مداخلت فرمائیں ۔ اور اس مقدس عمارت کو اسی جگہ پھر بنا دینے کا حکم فرمائیں ۔

ہمارا خاص نامہ نگار اطلاع دیتا ہے کہ مسلمانوں کا پختہ ارادہ ہے کہ حضور والسرائے کی طرف سے جواب آجانے کے بعد باقاعدہ عملی کارروائی کی جائے گی ۔ وہ یہ بھی لکھتا ہے کہ " ان لوگوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو مسجد میں نیز عیدگاہ میں جاکر روئے ۔ اور جنھوں نے اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالی ۔

ظاہر ہے کہ اہل کانپور سے جو کچھ بن پڑا وہ انہوں نے سب کچھ کر چھوڑا ۔ جب ہر طرف ہاتھ پاؤں مار کر تھک گئے تو آخر میں وہ سب سے بڑے احکم الحاکمین کے دروازے پر جاکر روئے ہم ان کے غم میں شریک ہیں اور سچ پوچھو تو ہمارا دل اندر ہی اندر رو رہا ہے ۔ مگر ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اب وہ وقت نہیں ہے کہ بچوں یا بوڑھی عورتوں کی طرح ہم اپنے حقوق کی پامالی پر سر پکڑ کر آہ و زاری کر لیں اور بس ۔ حکام کی بے پرواہی اور خود رائی کی بدولت جو مسلمانوں کو صدمہ پہنچا یا پہنچ رہا ہے اس کا اثر یہ نہ ہونا چاہئے کہ ہمارے پاؤں میں پہلے سے بھی زیادہ قوت اور طاقت آجائے اور وہ ہمیں ان دروازوں تک لے جائیں جو ابھی دادرسی کے لئے کھلے ہوئے ہیں ۔ ملک کا کوئی قانون نہیں ہے جو ہمیں ان دروازوں کے کوٹنے سے اور جائز وسائل اختیار کرنے سے روک سکے مسلمانوں کی مذہبی آزادی اور ان کی عبادت گاہوں کی حرمت کا مسئلہ نازک ہوتا جاتا ہے ۔ کیونکہ بہت سے پرجوش افسران تعمیرات حفظان صحت ہندوستان کی سرزمین پر چھیٹے پھر رہے ہیں ۔ یہ حضرات پرانے کوٹ کے گرانے اور نئے کوٹ کے بنانے کی دھن میں ہمارے جذبات سے بے پروا اور غیر متاثر ہو کر جو کچھ بھی نہ کریں کم ہے ۔ دہلی کانپور اور لکھنؤ پر کیا موقوف ہے اگر یہی مطلق العنانی رہی تو ہمیں ان نئے شیدائیان تعمیرات و حفظان صحت کی مہربانیوں کا ہر جگہ شکار ہونا پڑے گا ۔ اس لئے مسلمانوں کو اور مسلمانوں کی قائم مقام جماعتوں کو خصوصاً مسلم لیگ کو پوری طرح موقع کی اہمیت کا اندازہ کرکے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لینا چاہئے اور اگر ضرور ہو تو اپنے محضر حقوق کو لے کر پارلیمنٹ کے دروازے تک جانا چاہئے اور مذہبی معاملات عدم دست اندازی و غیر جانبداری کے برطانوی اصول کی کامل تشریح و تفسیر تفصیل پوچھ لینی چاہئے ۔ کہ وقت ضرورت کام آئے ۔

کانپور کے واقعہ نے امید کے بہت سے منقش اور خوش نما پردے جو ہماری مفتون و مسحور نگاہ کے سامنے پڑے ہوئے تھے۔ دفعتاً نوچ کھسوٹ کر پھینک دیئے۔ اور اب ان کی جگہ مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے نے لے لی ہے۔ مسٹر جیمس مسٹن ہنوز صوبجات متحدہ کے لفٹیننٹ گورنر بھی نہ ہوئے تھے کہ ہمیں ان کے ساتھ حسن اعتقاد شروع ہو گیا تھا۔ مگر کانپور کے واقعات نے کم سے کم ہمیں اس قدر کہنے پر مجبور کر دیا ہے کہ صوبجات متحدہ کے بیدار مغز حاکم اعلیٰ مسلمانان کانپور کے صحیح جذبات کا اندازہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اور جس استقلال اور معاملہ فہمی کی ہمیں ان سے امید تھی اس کا کافی اظہار نہ فرما سکے۔ اب ہم مسلمانان کانپور کو سوائے اس کے اور کوئی مشورہ نہیں دے سکتے کہ وہ خدا کے سوا کسی پر بھروسہ نہ کریں۔ اور اپنے حقوق کا دعویٰ تمام جائز طریقوں سے کئے جائیں۔ خوشنما امیدوں کے چمن بندیوں میں ہم سب انٹونی (لارڈ) میکڈانل کے دور حکومت کو بھولتے جاتے تھے۔ لیکن

ہم ہی چوکے جو ترا گوشۂ داماں پکڑا

۸ رجولائی کی اشاعت میں ہم ناظرین کے اس تعجب کو دور کر چکے ہیں جو انہیں مسجد مچھلی بازار کانپور کے جزوی انہدام کے متعلق ہماری عدم رائے زنی کے بارے میں پیدا ہوا تھا۔ جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا ہے۔ ہماری اس ہیبت ناک خاموشی کی وجہ یہ تھی کہ مسٹر محمد علی نے صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے حاکم اعلیٰ سر جیمس میسٹن کی معاملہ فہمی اور انصاف پسندی پر بھروسہ کر کے مناسب خیال کیا تھا کہ اس معاملہ کے جملہ حالات اور واقعات صحیح صحیح پیرایہ میں مراسلت کے ذریعے سے صاحب موصوف کے گوش گذار کر دیں جو دوسری صورت میں اخبار کے ذریعے پیش کئے جاتے۔ اس طرز عمل سے جو محض نیک نیتی اور مصلحت اندیشی پر مبنی تھا۔ ہماری غرض یہ تھی کہ اگر یہ ناگوار معاملہ خطوط و عرائض کے صفحات میں لانے سے طے ہو جائے تو بدرجہا بمراتب اس سے بہتر ہو گا۔ کہ اخبارات کے کالموں میں لا کر ایک طرف تو اسلامی پبلک کے جوش کو بھڑکایا جائے۔ اور دوسری طرف گورنمنٹ کی مشکلات میں اضافہ کیا جائے۔ مگر تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ اور ہمیں بکمال افسوس تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہمیں اس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ بڑے تعجب کی بات ہے کہ ایک طرف تو حکام اس بات کے خواہشمند ہوں کہ ان کے اعمال و افعال پر کسی طرح اخبارات میں غل غپاڑہ نہ کیا جائے اور دوسری طرف رویہ اس قسم کا اختیار کریں کہ جب تک ہندوستانی اخبارات ان کی قلعی نہ کھولی جائے، راہ راست پر نہ آئیں! کیونکہ اعیان حکومت کی جانبدار اخباروں کی پالیسی تو اب ایک راز آشکار ہو چکی ہے۔ پائنیر جو اینگلو انڈین جرائد میں چوٹی کا اخبار خیال کیا جاتا ہے۔ لکھتا ہے کہ مسلمانان کانپور کی فریاد مصنوعی اور بناوٹی ہے۔ اسلامی جرائد کی اضطراب آموزی کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ اگر یہ ہمہ دان ہم عصر حالات سے واقفیت رکھتا یا انصاف سے کام لیتا تو اسے معلوم ہوتا کہ اگر مسلمانان کانپور نے اپنی شکایات کی بابت دس کالم اسلامی جرائد کو لکھ کر چھاپنے کو بھیجے ہیں۔ تو انہوں نے چند ہی سطور پر اکتفا کیا ہے۔

مسلمانان کانپور نے ہمیں ڈاک اور تار کے ذریعے التجا پر التجا کی اور خود ہمارے دفتر میں تشریف لا کر درخواست کی کہ مسجد کے مضمون پر اخبار کے کالموں میں شد و مد سے بحث کی جائے۔ مگر مسٹر محمد علی نے یہی مناسب سمجھا کہ بذریعہ نامہ و پیام ہی حکام سے داد طلبی کی جائے۔ انہیں پورا پورا وثوق تھا کہ ہز آنر جیمس میسٹن جو ان کے عقیدہ کے مطابق ایک متدین اور مصلحت اندیش حاکم ہیں ہمارے طرز عمل کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے اور مسلمانوں کی مذہبی محسوسات کا لحاظ کر کے مسجد کے حصہ شرقی کو منہدم ہونے سے بچا دیں گے۔ مگر صاحب موصوف کی ذات میں انہیں جو اعتماد تھا اس کا حشر جو کچھ ہوا ناظرین سے پوشیدہ نہیں اب حصہ مذکور شہادت پا چکا ہے۔ اور جو کچھ بھی ہوا ان کی منظوری سے ہوا انہیں رنج ہے کہ کیوں ہم نے ابتدا ہی میں اخبار کے کالموں میں گورنمنٹ ممالک متحدہ کے متعدد عہدہ داروں مسٹر سم اور ٹائیلر کے برخلاف صدائے احتجاج بلند نہ

کی تو گورنمنٹ کی ہوا خواہی کے خیال سے اخبار میں علانیہ نکتہ چینی کرنے کی بجائے مراسلت کے ذریعہ معاملہ کو گورنمنٹ کے حضور میں پیش کر کے رعایا اور سرکار کے درمیان ترجمانی کی خدمت انجام دی اور گورنمنٹ نے ہمیں یہ انعام دیا کہ ہمارے جملہ دعاوی اور دلائل جنہیں درحقیقت سات کروڑ مسلمانانِ ہند کے دعاوی اور دلائل کہنا چاہئے ایک رشحۂ قلم سے ملیامیٹ کر دیا۔

یا للعجب! یہ حشر امید وار کا!

ایسے موقعوں پر بے اختیار انسان کو خیال آتا ہے کہ بنگال کے اخبار نویسوں اور جرائد نگاروں کی روش کی پیروی کی جائے۔ جو اپنے غل غپاڑہ سے حکام کا ناک میں دم کر دیتے ہیں اور جب تک اپنے مقصد میں فائز المرام نہیں ہوتے، اپنی چیخ و پکار سے آسمان کے گنبد میں سوراخ کئے دیتے ہیں۔

سر جیمس مسٹن اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری مراسلت کا لہجہ نہایت معتدل اور معقول تھا۔ اور جو درخواست ہم نے ان کے حکم اول کی نظر ثانی کی بابت کی تھی برمحل اور دوستانہ تھی۔ ہم بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ہماری مراسلت اور ہمارے تاروں کا جواب عنایت آمیز تھا۔ مگر ہمیں اس قسم کے لفظوں سے کیا خاک تسکین ہو گی جبکہ ہمارے برادرانِ کانپور، گورنمنٹ متحدہ کے حکام کے ہاتھوں خون جگر پی رہے ہیں؟ اس موقع پر ہمیں یہ بھی ظاہر کرنا ہے کہ اگرچہ ہماری عام مراسلت اور ہمارے تاروں کا جواب عنایت آمیز تھا۔ مگر ہمیں اس حسن خلق کی یقیناً توقع نہیں تھی۔ کہ ہز آنر ہماری ۹ جون کی چٹھی کا جواب جو اسی مسجد کے متعلق تھی اس کے منہدم کئے جانے کے ایک روز بعد دیں گے۔

سر جیمس میسٹن کی فیصلہ سے ایک زبردست نتیجہ جو ہم مستنبط کر سکتے ہیں یہ ہے کہ انڈین سول سروس کے ارکان کی رائے کی اہمیت اپنی نظیر آپ کہلانے کے مستحق ہے ان کے فیصلہ جات اٹل ہوتے ہیں۔ اور خواہ وہ صحیح ہوں خواہ غلط، صوبہ کے حاکم اعلیٰ تک ان کو منسوخ نہیں کرتے۔ اور ان کے مقابلے میں جوئی کے معزز و ممتاز ہندوستانیوں کی رائے کی شنوائی نہیں ہوتی۔ شاید اس قسم کی کارروائی سے ممبرانِ سول سروس کی وقعت و وقار کو برقرار رکھنا مقصود ہے۔ مگر ہمارے خیال میں حکام کا فرض ہے کہ وہ معاملہ کی تہ تک پہنچیں اور ہمیشہ اصلیت اور حقیقت کے متلاشی رہیں، ورنہ نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ حاکم و محکوم کے درمیان تفرقہ کی خلیج جو ایسے ہی حالات سے ملک کے بعض حصوں میں کچھ عرصہ سے پیدا ہو گئی ہے عریض ہوتی جاتی ہے۔ اور اس کا اثر ملک اور سرکار دونوں کے حق میں نہایت ناخوشگوار پڑ رہا ہے۔

ہم نے ہز آنر کی توجہ اس امر کی جانب منعطف کروائی تھی کہ معاملہ کانپور میں امر تنقیح غلط قائم کیا گیا ہے۔ گورنمنٹ کے نزدیک امر تنقیح یہ تھا کہ "آیا مسجد کے مشرقی جزو میں جس کے انہدام کی تجویز زیر بحث تھی نماز ہوتی ہے یا نہیں۔" ہم نے عرض کیا تھا کہ امر تنقیح یہ ہونا چاہئے تھا کہ "آیا مسجد کا کوئی حصہ، جزوی یا کلی طور سے فروخت ہو سکتا ہے یا کسی دوسرے مصرف میں لایا جا سکتا ہے۔ اس امر کے تصفیہ کے لئے ہم نے کہا تھا کہ گورنمنٹ کو علمائے اسلام سے استصواب کرنا چاہئے۔ یہی وہ درخواست ہے جسے ہز آنر نے نہایت اعتدال آمیز اور جائز قرار دیا تھا مگر تعجب کی بات ہے کہ باوجود اس حسن ظن کے اس پر توجہ نہیں کی گئی جہاں تک ہمارا علم ہے کسی مفتی یا عالم سے اس امر میں مشورہ نہیں لیا گیا۔ اور صاحب چیئرمین میونسپل بورڈ کی رائے کو، جو شروع ہی سے مسجد کے حصہ مذکور کے انہدام کا تہیہ خلوت خانہ دل میں کر چکے تھے اول سے لیکر آخر تک برقرار رکھا گیا ہے۔ انہوں نے شروع سے ہی یہی بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کا شور و غل امر فرضی ہے۔ اور اس بات کو ہز آنر کے دل نشین کرنے اور مسلمانوں کے کعبہ دل کو ڈھانے میں وہ کامیاب ہو گئے ہیں، بقول ہز آنر ان کی شہادت "قول فیصل" ہے۔ اور اس کی صحت" بلا کم و کاست قابل منظوری" طرفہ بات یہ ہے کہ ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ جزو مذکور کا انہدام ہز آنر کے دو آخری حکم" کی تعمیل پر مبنی تھا۔ اور تمام معاملہ نہایت احتیاط سے تمام طبقوں کے بہت

سے اصحاب کے مشورہ سے طے ہوا"۔ علانیہ طور پر تو ایسا کوئی مشورہ نہیں دیا گیا۔ اور اگر چپکے چپکے کوئی مشورہ اس امر میں دیا بھی گیا ہے تو یہ سخت قابل اعتراض ہے کون کہہ سکتا ہے کہ مشورہ دینے والے اصحاب کیسے بزرگ تھے۔؟ ممکن ہے کہ بعض بو الہوس جاہ طلب لوگوں نے ہز آنر کی خوشنودی مزاج حاصل کرنے کی حرص میں اندھے ہو کر ایسا مشورہ دیا ہو، مگر اس کی وقعت ؟ ایسے ضمیر فروش، ملت فروش، خود فروش لوگ تو اگر بس چلے تو گورنمنٹ کو بھی بیچ ڈالنے سے باز نہ رہیں۔ تاہم از حد ممنون ہوں گے اگر ہز آنر ان بزرگان ملک و ملت کے اسمائے گرامی سے ہمیں مطلع کر دیں جنہوں نے اپنے قیمتی مشورہ اس آڑے وقت میں حکام گورنمنٹ کی دستگیری کی ہے۔

ایک اور عمل قابل ذکر یہ ہے کہ میونسپل بورڈ کانپور کی مسلسل کارروائی کے ملاحظہ سے پتہ چلتا ہے کہ اب تک لوکل سیلف گورنمنٹ محض برائے نام ہے، ہندو مسلمان ممبران بورڈ نے ہر چند صاحب چیئرمین کی مخالفت کی، مگر ان کی مخالفت کا اثر ؟

مسلمانان کانپور کا مسلک ابتداء سے آخر تک نہایت قابل تعریف رہا ہے انہوں نے صاحب کلکٹر کے پاس وفد بھیجا، ہز آنر کی خدمت میں عرضی بھیجی مگر شنوائی نہ ہوئی۔ آنریبل مسٹر شاہد حسین وبحیثیت ان کے معاہدہ کے ہز آنر سے مراسلت کا کی ناکامی ہوئی۔ آنریبل راجہ صاحب محمود آباد بالآخر خود ہمارے محفوظ ہے کہ ہز آنر کی خدمت میں شملہ میں روانہ کیا۔ خاص طور پر اس کی کوشش کی گئی کہ کسی طرح معاملہ کو اخبارات کے کالموں میں لے جانے کی نوبت پیش نہ آئے، مگر نتیجہ ؟ راجہ صاحب بہادر کو ہز آنر نے یقین دلایا کہ ان کی شفاعت رائیگاں نہ جائے گی۔ مگر چند دن کے بعد ہی اصلیت کھل گئی ہز آنر فرماتے ہیں کہ ان کے احکام پہلے ہی "قطعی اور ناطق تھے"۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا راجہ صاحب بہادر سے بھی یہی کہا گیا تھا کہ زمین آسمان ٹل جائیں مگر ہمارا حکم نہ ٹلے گا۔

ایک اور بات یہ ہے کہ تو فرضاً ہز آنر کے احکام جہاں تک کہ ان کا تعلق ان سے تھا "قطعی اور ناطق" تھے مگر یہ صحیح ہے کہ اب تک ہز ایکسیلنسی حضور والسرائے کشور ہند نے ان درخواستوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جو بذریعہ تار ان کی خدمت میں بھیجی گئیں مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا گورنمنٹ لوکل گورنمنٹ کے فیصلہ جات سے بھی یہی سلوک کیا کرتی ہے۔ اگر یہی وقت ہز آنر کو چاہیئے تھا کہ گورنر جنرل اور مسلمانوں کو بتلا دیتے کہ ان کے احکام قطعی اور ناطق تھے اور مسجد کو منہدم کرنے کی منظوری دینے سے پہلے مسلمانوں کو موقع دیتے تاکہ وہ آپ کے فیصلہ کے برخلاف گورنمنٹ ہند میں اپیل کر لیتے۔

اب پایونیر کی روش کو بھی ملاحظہ کیجئے۔ وہ لکھتا ہے "اس کارروائی کے بعد جو منگل کے دن صاحب مجسٹریٹ کانپور نے مسجد کے بارے میں کی یہ معاملہ جو کچھ عرصے سے زیر بحث ہے خاتمہ پذیر ہو جائے گا۔ لہٰذا اسے یاد رہے کہ مسلمان اس مذہبی دست اندازی کو مطلق بھول نہیں سکتے۔ یہ ایک خار ہے جو کہ ان کے سینہ میں چبھ رہا ہے اور چبھتا رہے گا۔ جب تک منہدم شدہ حصہ پہلی صورت میں بنا نہ دیا جائے گا۔ یوں تو تمام روئے زمین مسلمان کے لئے مسجد ہے اور وہ ہر جگہ نماز پڑھ سکتا ہے اور ہزار ہا مسجدیں ریلوے لائنیں اسے باز نہیں رکھ سکتے۔ مگر ہمیں شکایت ہے تو اس امر کی ہے کہ ایک نہایت وقیع اور مہتم بالشان اسلامی اصول کو توڑا گیا ہے۔ حالانکہ تعلیم اسلام کی رو سے ہم مسجد کی چپہ بھر زمین بھی کسی اور استعمال میں نہیں لا سکتے شریعت بیضا کے مطابق تو مسجد کی اینٹ، پتھر، چونا، گارا، کنکر، ذرہ سب کے سب مقدس ہیں اور سچا مسلمان کسی صورت میں بھی ان کی ذلت اور بے حرمتی ہوتے دیکھنا گوارا نہ کرے گا۔

یک ذرهٔ زمیں نہیں بیکار باغ کا
یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

سر جیمس مسٹن کو حقیقت حال سے حکام مقامی کانپور نے واقف نہیں کیا ۔ ورنہ وہ کبھی نہ کہتے کہ مسٹر کیمبل اور سر جان ہیوٹ کے زمانے میں مسجد کے انہدام کا فیصلہ ہوا تھا ۔ اس کے برخلاف واقعات کی شہادت اس کے برعکس ہے ۔ عجب معاملہ ہے ۔

کماں جانب دیگراں می کشند
وے تیر بر جان ما می زنند
زہے غمزہ و شوخی و چابکی
کجا می نمایند کجا می زنند

اگر حکام کانپور اپنے طرز عمل کی صداقت کے قائل ہیں تو وہ کیوں ان کاغذات کو شائع نہیں کرتے جو اس معاملہ کے متعلق ان کے ہاں موجود ہونے چاہئیں ؟ کیا وجہ ہے کہ وہ مسلمانان کانپور کو اس نقشہ کی نقل دینے سے انکار کرتے ہیں ۔ جس میں اے ۔ بی روڈ کی [illegible] کھینچی ہے ۔ کیا سبب ہے کہ وہ بورڈ کے اس ریزولیوشن کو ظاہر نہیں کرتے جو ۴ / مارچ ۱۹۱۳ء سے پہلے پاس ہوا تھا ؟ اور وہ نوٹس کہاں ہیں جو ایکٹ حصول اراضی کے مطابق متولیان مسجد کو دیا جانا لازمی تھا ۔ اور جو ۲۴ جون کے بے ضابطہ نوٹس سے پہلے دیا جانا چاہئے تھا ؟

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

خاتمہ پر ہم ایک اور بات کہنا چاہتے ہیں سننے میں آیا ہے کہ اب متولیان مسجد پر طرح طرح کا ناجائز دباؤ ڈال کر انہیں ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ گورنمنٹ سے معاملہ فہمی کر لیں اور معقول عوض قبول کر لیں انہیں مختلف طریقوں سے اسباب پر مائل کیا جاتا ہے اس کی نسبت خطوط لکھے جاتے ہیں ۔ کہ گورنمنٹ کی پیش کردہ زمین مشرقی دالان کے عوض میں منظور کر لو ۔ ورنہ وہ ہنود کو دے دی جائے گی ۔ اس قسم کی شاطری درجہ غایت رنجدہ ہے ۔ متولی مسجد کا عوض حاصل کرنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتے مسجد کا معاملہ ہے اور اس کا فیصلہ مسلمانوں کی قوم سے ہوگا ۔ اور وہ اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ مسجد کا حصہ مذکورہ پھر پہلی صورت میں تعمیر کر دیا جائے ۔ بعض ایسے خطوط راجہ صاحب محمود آباد کی خدمت میں بھیجے جا چکے ہیں اور دو عدد ہمارے پاس بھی موجود ہیں ۔ ان سے ایک طرف تو متولیوں پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے ۔ اور دوسری طرف ہندو مسلمانوں کے درمیان منافرت پیدا ہونے کا امتحان ہے ۔ ہم اس قسم کی کارروائی کے برخلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں ۔ اور حکام کانپور (اور گورنمنٹ کی توجہ اس امر کی طرف منعطف کرواتے ہیں ۔

مسجد مچھلی بازار کانپور

مسٹر محمد علی اور ہز آنر لفٹیننٹ گورنر بہادر صوبجات متحدہ کے درمیان مسجد کانپور کے متعلق جو خط و کتابت ہوئی ہے۔ وہ بہ اجازت ہز آنر سر جیمس صاحب بہادر ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

مورخہ ۸ر جولائی ۱۹۱۳ء

(تار)

بخدمت ہز آنر سر جیمس میسٹن صاحب بہادر لفٹیننٹ گورنر بمقام نینی تال۔

کانپور کے بہت سے مسلمان باشندوں نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ میں ان کی اس عرضداشت کی تائید کروں کہ مسجد مچھلی بازار کی مسجد کے ایک حصہ کو میونسپل کمیٹی کے چیئرمین کو سڑک درست کرنے کے لئے درکار ہے۔ منہدم نہ کیا جائے۔
مجھے معلوم ہوا ہے کہ یور آنر کی خدمت میں ایک میموریل بھی بھیجا گیا ہے۔ اگر جواب موافق ہو تو مجھے اس معاملہ میں تحریک کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے۔ کیا یور آنر مجھے فیصلہ سے مطلع کر سکتے ہیں؟

کانپور کے مسلمانوں میں بہت جوش پھیلا ہوا ہے۔ میں اس موقعہ پر خصوصیت کے ساتھ ان کے جوش کو ہلکا کرنے کا خواہشمند ہوں۔

۱۵ر مئی ۱۹۱۳ء محمد علی کامریڈ

جواب

موسومہ مسٹر محمد علی ایڈیٹر کامریڈ۔ دہلی

مجھے کانپور کی مسجد کے متعلق آپ کا تار ملا۔ میموریل میں جو اعتراضات کئے ہیں، ان پر احکامات جاری ہو گئے ہیں۔ میں نے اس معاملہ پر خاص طور سے ذاتی توجہ کی ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ شکایت زیادہ تر ذہنی و خیالی ہے۔ یہ امر کہ مسجد کا حصہ انہدام طلب غسل خانہ ہے، اور دراصل متبرک عمارت کا کوئی جزو نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان جوتا پہن کر اس احاطہ میں داخل ہوتے دیکھے گئے ہیں۔ بہر حال ہر طرح سے کوشش کی جائے گی کہ غسل خانہ ایک مناسب موقع زمین پر بنوا دیا جائے۔ لیکن سڑک کی لائن بدلی نہیں جا سکتی۔ مسجد کا ادب ہر طرح سے ملحوظ رکھا جائے گا۔

۱۵ر مئی ۱۹۱۳ء میسٹن لفٹیننٹ گورنر۔ نینی تال

جواب

بخدمت لفٹیننٹ گورنر بہادر بمقام نینی تال۔

میں جناب کی تار کا مشکور ہوں۔ شرع اسلام کی رو سے زمین کا کوئی حصہ جو مسجد کی غرض کے لئے وقف کر دیا گیا ہو، کسی اور مقصد کے لئے منتقل نہیں ہو سکتا۔ جس مقام پر وضو کیا جاتا ہے۔ وہ حصہ ہمیشہ مسجد کا جزو سمجھا جاتا ہے۔

کانپور کے مسلمانوں کا جواب ہے کہ جس حصہ مسجد کو منہدم کرنے کی غرض سے مانگا جاتا ہے اس مقام پر جوتی نہیں پہنی جاتی۔ بلکہ جب کبھی نمازیوں کا زیادہ مجمع ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہاں نماز ادا کی جاتی ہے۔ میں یور آنر کی اس خواہش کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہوں کہ یور آنر مسجد کا احترام کرنا چاہتے ہیں۔ اور ساتھ ہی وضو وغیرہ کے لئے منہدم شدہ حصہ کے عوض کوئی مناسب جگہ دینی چاہتے ہیں۔ لیکن مجھے شبہ ہے کہ یور آنر کو متنازعہ فیہ کے متعلق کچھ غلط فہمی ہو گئی ہے۔ میرا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ محض خیالی شکایات کی بنا پر گورنمنٹ کو پریشان کروں اور خصوصًا اس نازک موقع پر مگر میں یور آنر سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ سڑک کی لائن ایسا معاملہ نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے ہم ایسی شکایات پر سر برآوردہ اور معقول اشخاص کو پیدا ہو گئی ہیں۔ باقی رہنے دی جائے جس سے ناانصافی کا خیال قائم ہو سکے۔ میں نہایت ادب کے ساتھ یور آنر کو مشورہ دیتا ہوں کہ کسی قسم کی قانونی کارروائی کرنے سے پیشتر آپ اس معاملہ کے متعلق مسلمان علماء اور قانون دان اصحاب سے مشورہ فرمالیں۔

۱۶ رمئی ۱۹۱۳ء محمد علی کامریڈ

جواب

مائی ڈیر محمد علی!

کانپور کے معاملہ کے متعلق آپ نے جو آخری تار مجھے بھیجا تھا۔ اسے میں نے کچھ دن غور کرنے کے لئے بلا ادائے جواب رہنے دیا۔ میں حکام مقامی کو پہلے ہی احکام بھیج چکا تھا۔ مگر میں نے چاہا کہ آپ کی نہایت معتدل و معقول درخواست دوبارہ غور مزید کو نظر انداز نہ کروں میں نہایت صفائی کے ساتھ آپ سے کہتا ہوں کہ میری رائے میں یہ جوش کسی حقیقی مذہبی شکایت پر مبنی نہیں ہے۔ اگر اس معاملہ میں مجھے شبہ کا شائبہ بھی ہوتا تو میں نہایت احتیاط کے ساتھ ایسے امر سے احتراز کرتا۔ جو حقیقی جذبات کو صدمہ پہنچانے والے ہوتے۔ مگر جو شہادت میرے پاس ہے۔ اس سے قطعی اور مختتم طور پر ثابت ہوتا ہے کہ غسل خانہ کے متعلق شور و شغب بعید از وقت ہے۔ اور یہ کہ جو حصہ منہدم کیا جانے والا ہے۔ اس میں مسلمان جوتا پہنے جاتے ہیں۔ امر آخر الذکر کے متعلق کسی شبہ کی گنجائش کا امکان بھی نہیں معلوم ہوتا۔ میں بصداقت امید کرتا ہوں کہ مسلمانوں کی عقل سلیم انہیں اس معاملہ کو طول دینے سے باز رکھے گی۔ ہم سے جس قدر ہو سکے گا معاملات میں آسانی و سہولت پیدا کریں گے۔ مگر آپ اچھی طرح اندازہ کر لیں گے کہ امور عامہ سوائے صحیح اور کافی وجوہ کے رد کی نہیں جا سکتی۔

میں آپ کی حالت کا صحیح اندازہ کر سکتا ہوں۔ اور اس لئے میں نے معاوضۃً اپنی صحیح حالت اپنی عادت کے موافق نہایت صفائی سے آپ کے روبرو بیان کر دی ہے۔

آپ کا مخلص:۔ جیمس میسٹن ۔ گورنمنٹ ہاؤس نینی تال ۲۴ رمئی ۱۹۱۳ء

جواب

مائی ڈیر سر جیمس

میں کانپور کی مسجد کی بابت جناب کو پھر تصدیعہ دینا چاہتا ہوں۔ چند اردو اخباروں میں اس معاملہ پر تھوڑی بہت بحث ہو چکی ہے۔ اور مجھے خطرہ ہے کہ باقی اخبارات بھی فی الفور معاملہ کو ہاتھ میں لے لیں گے۔ میرا خیال ہے کہ اردو کے اخبارات میں جو مضامین سرکاری افسروں کے متعلق شائع ہوتے ہیں عمومًا ان کا اثر ان افسروں پر نہیں ہوتا۔ کیونکہ عام طور پر وہ اردو نہیں جانتے ہیں۔ اور میں نے یہ التزام مد نظر رکھا ہے کہ جس امر کو گورنمنٹ کے مطالبہ میں لانا منظور ہو اسے "کامریڈ" میں شائع کیا جائے۔ اور جو عوام (پبلک) کی واقفیت کے لئے لکھا جائے

"ہمدرد" میں شائع ہوا۔ اس لئے میں نے مذکورۂ بالا مضمون کے متعلق "ہمدرد" میں کچھ بھی لکھنا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ اس قسم کی تحریریں گورنمنٹ پر تو کوئی اثر نہیں کرتیں اور خاص مزاج کے لوگوں کو بھڑکا دیا کرتی ہیں۔ مگر یور آنر کی ذات اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہے اس لئے کہ یور آنر اردو اخبارات کو خود اچھی طرح پڑھ سکتے ہیں۔ کانپور کی مسجد کے متعلق میں ضرور "ہمدرد" میں کچھ لکھتا۔ اگر مجھے یہ امید نہ ہوتی جو اب ہے کہ وہی نتیجہ اور اطمینان بخش نتیجہ یور آنر سے خط و کتابت کرنے سے بھی حاصل ہو سکتا ہے جو اخبار میں اس بحث کو اٹھانے میں ہو سکتا تھا۔ لیکن اس وقت تک تو مجھے مایوسی ہوئی ہے کیونکہ باوجودیکہ یور آنر میری درخواست کو میانہ روی اور راستی پر محمول فرماتے ہیں لیکن اب تک اس کا کوئی نتیجہ مترتب نہیں ہوا۔ لیکن میں اب تک بالکل ناامید نہیں ہوا۔ اور ایک دفعہ پھر یور آنر سے التجا کرتا ہوں کہ اس تجویز کو منظور فرما کر علماء اور قانون دان اصحاب سے مشورہ فرمائیں۔ مجھے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہ سوال زیر غور ہے کہ جس حصہ عمارت کو میونسپلٹی کے چیئرمین منہدم کرنا چاہتے ہیں اس میں آج کل نماز پڑھی جاتی ہے یا نہیں۔ لیکن جس امر پر سب سے پہلے توجہ ہونی چاہئے تھی وہ یہ ہے کہ کیا کوئی ایسی عمارت جو فی سبیل اللہ وقف کر دی گئی ہو اس کا کوئی حصہ بیع یا کسی اور مقصد کے لئے منتقل کیا جا سکتا ہے۔ میں نہ تو اسلامی فقہ سے واقف ہوں اور نہ کچھ ایسا ماہر قانون ہوں۔ لیکن مجھے وثوق ہے کہ اس قسم کی وقف شدہ املاک کو کسی اور غرض کے لئے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر میرا یہ وثوق بجا ہے۔ تو اس عمارت کے کسی حصہ کو بھی منہدم کرنے سے ہم سب کی محسوسات کو صدمہ پہنچے گا اور ایسی حالت میں یور آنر خود فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ کیا سڑک مذکورہ کی داغ بیل اس قدر بیش قیمت ہے کہ وہ ہمارے ہاتھ اس قدر گراں بیچی جا رہی ہے۔ ہم حکام کی مجبوری کی اس وقت کچھ قدر کر سکتے تھے۔ اگر مسلمانوں کی مصیبت کی وجہ سے کوئی عظیم الشان پبلک عمارت بنتے بنتے رک جاتی۔ لیکن صاف عرض کرتا ہوں کہ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ اس وجہ سے کہ میونسپلٹی کے چیئرمین سڑک کو علم ہندسہ کی رو سے درست کرنا چاہتے ہیں مسلمانوں کی محسوسات کو نظر انداز کر دیا جائے حالانکہ وہ سڑک میں خم دے سکتے تھے۔ اور عمارت بالکل محفوظ رہ سکتی تھی۔ مجھے یہ اطلاع ملی ہے کہ اگر سڑک کا خط سیدھا کھینچا جاتا تو مساجد کو چھیڑنے کی بھی ضرورت نہ پڑتی۔ اور ایک مندر بچانے کے لئے مسجد سے قریباً ۱۵۰ فٹ کے فاصلہ پر کوئی ۸ فٹ کا ایک خم کر دیا گیا میں نے کانپور کے مسلمانوں سے جو مجھے ملنے کے لئے یہاں آئے تھے کھود کھود کر دریافت کیا کہ اس وجہ سے مسلمان ہندوؤں سے تو کچھ آزردہ دل نہیں ہو گئے۔ لیکن مجھے یقین دلایا گیا ہے کہ ہندوؤں سے کوئی عناد اس وجہ سے نہیں ہے کہ یور آنر نے مندر کو بچانے کا فیصلہ کیا ہے۔ جو عین وسط میں واقع ہے۔ بلکہ امر واقع یہ ہے کہ وہ اس معاملہ میں برابر اس امر کے متمنی رہے ہیں کہ میونسپل بورڈ کانپور کے ہندو ممبروں کی امداد حاصل کریں۔ اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ جہاں ہندوؤں نے اس معاملہ میں مسلمانوں کی امداد کی ہے وہاں مسلمانوں نے بھی ایک ہندو جنٹلمین کی یہ ترمیم منظور کر لی تھی کہ اس معاملہ کے متعلقہ ریزولیشن کے نفس مضمون کو بہ نسبت اصل کے جو میونسپل بورڈ ایجنڈا میں درج تھا نرم کر دیا جائے۔ بلکہ جب اس مسئلہ پر ۲۸ مئی کو ممبروں سے رائے لی گئی تو اس وقت بھی یہ ظاہر ہوا کہ بجائے مخالفت کے زیادہ تر ہندوؤں نے ہی اس امر پر زور دیا کہ اس کارروائی کو روک دیں۔ تاکہ مسلمانوں کو پھر ایک دفعہ گورنمنٹ سے عرض معروض کرنے کا موقع مل جائے۔ لیکن مجھے معلوم ہوتا ہے کہ چیئرمین صاحب کا اس معاملہ میں خاص حصہ ہے۔ اور وہ اپنی تمام طاقت کام میں لا رہے ہیں۔ انہیں کی رائے نے آخری موقع پر بھی مسلمانوں کے خلاف معاملہ طے کر دیا تھا۔

اگر صاحبان کانپور کا بیان صحیح ہے تو اس سے کلکٹر صاحب ضلع کے اس طریق عمل کی عجیب حقیقت کھلی ہے۔ جو وہ اس امر کا ثبوت بہم پہنچانے

میں استعمال کر رہے ہیں کہ مسجد کے جس حصہ کو میونسپلٹی کے چیئرمین منہدم کرنا چاہتے ہیں وہ مسجد کا جز نہیں ہے۔ ان کا بیان ہے کہ:-

مسٹر ٹائنلر مسجد کے زیر بحث حصہ میں بلا اجازت جوتی سمیت گئے اور وہاں سے واپس ہو کر کہا کہ اگر یہ مسجد کا حصہ ہوتا تو مجھے ضرور روک دیا جاتا۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو مسلمانان کانپور اسی قابل تھے اور ان کا علاج یہی تھا کیونکہ میرا خیال ہے کہ مہذب دنیا میں کہیں بھی کوئی مجسٹریٹ شہادت پیدا کرنے کے لئے یہ طریق اختیار نہیں کرے گا۔ اور بجز مسلمانوں کے جنہیں ہمارا دوست ٹامس طرح طرح کے الزام دیتا ہے کوئی اور قوم اس قسم کے سلوک کو گوارا نہیں کر سکتی۔ مجھے معلوم نہیں ہے کہ یور آنر کے پاس اس مضمون کے متعلق کیا اطلاع پہنچی ہے۔ لیکن اگر مسٹر ٹائیلر نے شہادت پیش کی تو مجھے امید ہے کہ یور آنر نے ان کو ضرور نصیحت کی ہو گی۔ کیونکہ اگر یہ واقعات راست ہیں تو وہ ضرور کسی نہ کسی نصیحت کے محتاج ہیں۔ حق الامر یہ ہے کہ اگر جوتہ گندگی سے پاک ہو تو از روئے شریعت مسلمان جوتی سمیت مسجد کے فرش پر نماز پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہندوستان کی سڑکیں عموماً ایسی صاف نہیں ہوتیں کہ اگر مسلمانوں کی جماعت جوتی سمیت نماز پڑھے تو فرش مسجد نماز کے قابل رہے۔ اس لئے شدہ شدہ اس عام فہم خیال نے ہندوستان میں ایک رسم و رواج کی صورت اختیار کر لی ہے کہ کسی شخص کو جوتی سمیت مسجد میں نہ آنا چاہئے۔ اور ایک عرصہ تک اس دستور سے مسلمانوں کو چنداں وقت بھی محسوس نہ ہوئی۔ اس لئے کہ ان کا جوتا درحقیقت سلیپر ہوتا ہے اور اس کے اتارنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی۔ لیکن یورپین اصحاب بعض بعض مسجدوں میں بوٹ پہنے ہوئے گھس جاتے ہیں۔ جس سے مسلمانوں کو بہت رنج ہوتا ہے۔ اور مجھے یہ بتلایا گیا ہے کہ خود ہز ایکسیلنسی وائسرائے بہادر بنفس نفیس اس رواج کو قولاً نہیں بلکہ عملاً مسدود کرنے والے ہیں۔ اور اس کے بعد ہمیں امید ہے کہ نہ صرف دہلی کی جامع مسجد بلکہ آگرہ کی بعض بعض مقدس عمارات بھی جن میں مسٹر موررڈن نے غیر مسلموں کو مع بوٹ جانے کی اجازت دیدی ہے۔ بوٹوں کی پامالی سے محفوظ ہو جائیں گی اور واجب التعظیم شمار ہوں گی۔ لیکن مسلمانان کانپور زور کے ساتھ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ ہر طرح سے یہ ثابت کرنے کے لئے تیار ہیں کہ جس حصہ کو منہدم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے اس پر کبھی بھی جوتیاں نہیں گئیں۔ اور نہ کبھی زینہ کے قدموں سے آگے جوتیاں رکھی جاتی ہیں۔ بلکہ جب نمازی زیادہ ہو جاتے ہیں تو اس حصہ پر نماز ادا کی جاتی ہے۔

بہر نوع جیسا کہ میں پہلے اپنے ایک تار میں عرض کر چکا ہوں ہر ایک جگہ وضوگاہ مسجد کا لازمی حصہ ہوا کرتی ہے اور جس قدر حرمت مسجد کے کسی اور حصہ کے لئے واجب ہے اسی قدر حرمت وضوگاہ کے لئے بھی واجب آتی ہے۔

مجھے جو کچھ اطلاع ملی ہے اس کی بنا پر میرا خیال ہے کہ پہلے تو یہ تجویز تھی کہ اس مندر کو منہدم کر دیا جائے جو عین سڑک کے وسط میں واقع ہوتا ہے۔ لیکن اہل ہنود کی داد و فریاد پر گورنمنٹ نے بالکل بچا گیا۔ اگر اس کو بچا لیا۔ اس کے بعد یہ تجویز ہوئی کہ مندر کے عوض میں کیوں نہ مسجد کا ایک حصہ منہدم کر دیا جائے۔ بیان کیا گیا ہے کہ جب نومبر گذشتہ میں یور آنر کانپور میں رونق افروز ہوئے تھے تو میونسپل بورڈ کے مسلمان ممبروں نے یور آنر کی خدمت میں التجا کی تھی کہ انہیں اس امر کا یقین دلایا جائے کہ مسجد منہدم نہ کی جائے گی اور میں نے "ہیرلڈ آف انڈیا" میں دیکھا کہ یور آنر نے ممبروں کو یقین دلایا تھا۔ کہ امپرومنٹ ٹرسٹ کمیٹی مسجد اور مندر دونوں کو ہاتھ تک نہ لگائے گی۔ بیان کیا جاتا ہے کہ باوجود آنجناب کے وعدے کے امپرومنٹ ٹرسٹ نے ایک ریزولیشن پاس کیا کہ اس حصہ مسجد کو حاصل کر لیا جائے اور اس کے عوض میں شمال کی جانب ایک قطعہ دے دیا جائے لیکن جس وقت یہ ریزولیشن میونسپل بورڈ کے سامنے منظوری کے لئے پیش ہوا تو مسلمان ممبروں کی مخالفت کی وجہ سے ملتوی کر دیا گیا۔ اس کے بعد مسٹر ٹائلر مسجد کو ملاحظہ کرنے کے لئے گئے۔ اور بوٹ پہنے ہوئے اس

حصہ مسجد پر چڑھ گئے۔ بعد ازاں ایک میٹنگ میں پانچ کانپوری علما نے فتویٰ دیا کہ مسجد کا یہ حصہ مسجد ہی میں شامل ہے اور میٹنگ نے اس مضمون کا ریزولیوشن پاس کر دیا۔ اس کے بعد بورڈ کا ایک اور اجلاس ہوا اور قبل از وقت نوٹس نہ دینے کی وجہ سے ایک مسلمان ممبر کی اس تحریک کو مسترد کر دیا گیا کہ مسجد کا یہ حصہ مسمار نہ کیا جائے۔ چنانچہ شہر کے ممتاز مسلمانوں کے ایک وفد نے کلکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی کہ مسجد کا یہ حصہ بچا لیا جائے اور انہوں نے ہیوسے روڈ کی نظیر بھی پیش کی جس کی داغ بیل پہلے اس اس طرح ڈالی گئی تھی کہ چھوٹی عیدگاہ کی وضوگاہ سڑک میں آ گئی تھی۔ لیکن جب مسٹر ہیوسے کی خدمت میں مسلمانوں کا وفد حاضر ہوا تو ان کی خواہشات کو ملحوظ رکھ کر سڑک کا رخ بدل دیا گیا تھا۔ میرے پاس ہیوسے روڈ کا ایک نقشہ موجود ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ مسجد کا گیارہ فٹ عریض حصہ سڑک میں آنے سے بچا لیا گیا ہے۔ لیکن اگر ان دنوں بھی علم ہندسہ کی رو سے مستقیم سڑک بنائی جاتی تو وہ بھی منہدم ہو جاتی۔ سڑک عموماً ۱۰۲ سے ۱۰۵ فٹ تک چوڑی ہے۔ لیکن یہاں یہ مسجد کے پاس سے گذری ہے وہاں ایک جگہ تو اس کا عرض ۹۴ فٹ رہ گیا ہے اور دوسری جگہ ۹۶ فیٹ۔ اس جگہ میں یہ بھی عرض کر دوں کہ مسجد زیر بحث کا جو نقشہ میرے پاس ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسجد کا جو حصہ سڑک کو بخط مستقیم بنانے کی غرض سے منہدم کیا جانے والا ہے وہ کہیں بھی ناپا جائے ساڑھے تیرہ فٹ سے زیادہ عریض نہیں ہے۔

جس بات کا مجھ پر بہت ہی زیادہ اثر ہوا ہے وہ میونسپل کمیٹی کا وہ ریزولیوشن ہے جو یکم اپریل کی میٹنگ میں پاس کیا گیا ہے۔ اصل ریزولیوشن کے مسودہ پر بورڈ کے چار مسلمان ممبروں کے علاوہ چھ ہندو ممبروں کے دستخط ثبت تھے مگر دو ہندو ممبروں نے ایک ترمیم تجویز کی تھی جس میں اصل ریزولیوشن کی تمہید انہوں نے چھوڑ دی تھی۔ مگر اس نتیجہ سے وہ متفق تھے کہ مسجد کا کوئی بھی حصہ نہیں لینا چاہئے۔ چیئرمین نے ایک اور ترمیم تجویز کی اور ایک یورپین ممبر نے اس کی تائید کی کہ اس تجویز پر کوئی توجہ نہ کی جائے۔ لیکن صرف چار رائوں میں اس ترمیم کی تائید ہوئی۔ برخلاف اس کے تیرہ ممبروں نے ہندو اصحاب کی رائے کی تائید کی اور پھر ترمیم پاس ہو گئی۔ صورت حال کو مد نظر رکھتے ہوئے بھی یور آنر کے سامنے یہ خیال ظاہر کرنا داخل گستاخی ہو گا کہ جب چیئرمین اپنی من مانی بات منوا سکتا ہے تو لوکل سیلف گورنمنٹ محض ایک ڈھکوسلا ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ صورت حالات کے اس پہلو نے جس قدر مجھ پر اثر کیا ہے اسی قدر یور آنر نے لیا ہو گا۔

یور آنر کی گورنمنٹ نے میرے دوست آنریبل مسٹر شاہد حسین کو جواب دیتے ہوئے لکھنؤ کی ایک نظیر بیان کی ہے جس میں تزئین شہر کی غرض سے مسجد کی ایک وضوگاہ حاصل کر لی گئی تھی۔ مسلمانان کانپور کا بیان ہے کہ اگر اس پیش کردہ تجویز میں مولوی گنج کی ان دو مسجدوں کا حوالہ ہے جو امین آباد کے مغرب میں واقع ہیں تو ان کو یقین ہے کہ جو حصہ حاصل کیا گیا تھا وہ ایک علیحدہ عمارت تھی۔ اور وہاں کبھی بھی نماز نہیں پڑھی گئی تھی۔ بہر کیف وہ اس امر پر زور دیتے ہیں کہ ہیوسے روڈ کی نظیر اس سے زیادہ زوردار ہے۔ اور یہ کہ مان بھی لیا جائے کہ کسی جگہ کے مسلمانوں نے مسجد کی وضوگاہ کو دے دینے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ جو یقیناً وقف سبیل اللہ ہے تو اس قسم کی رضامندی دوسری جگہ کے مسلمانوں کو پابند نہیں کر سکتی مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ میونسپل بورڈ کا جو اجلاس ۲۰ مئی کو ہوا تھا۔ اس میں صرف چیئرمین کی آخری رائے ہی کے بل پر یہ ترمیم پاس ہو سکی کہ بورڈ کے مسلمان ممبروں کو گورنمنٹ کی خدمت میں اپنی معروضات پیش کر سکنے کی غرض سے سڑک کی مزید کارروائی ملتوی نہ کی جائے۔ میرا خیال ہے کہ تین ہندوؤں کے جنہوں نے چیئرمین کی تائید کی تھی۔ اور چیئرمین کی رائے کے خلاف اگر مسلمان ممبروں اور ان چار ہندو ممبروں کی اب بھی وہی رائے ہے کہ سڑک کی کارروائی روک دی جائے تو یہ ایک ایسا امر ہے جس میں گورنمنٹ بخوبی سمجھ سکتی ہے کہ زیادہ ہندو اور مسلمان ممبروں کی رائے کے مقابلہ میں چیئرمین کی رائے کی چنداں وقعت نہیں رہتی۔ مجھے امید اور یقین ہے کہ یہ معاملہ چیئرمین کے کسی فعل سے ہندو مسلمانوں کے مسئلے کی شکل اختیار نہیں کریگا

لیکن اگر یہ صورت پیدا ہو چکی ہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کوئی نہ کوئی شخص یہ شبہ کر بیٹھے گا کہ چیئرمین نے اس تنازعہ کے پیدا کرنے میں سرگرمی سے حصہ لیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یور آنر کو اس امر کا کس قدر خیال رہتا ہے کہ کسی افسر پر ذرا سا شبہ بھی نہ ہونا چاہئے کہ وہ "رعایا میں پھوٹ ڈال کر حکومت کرو" کی تدبیر پر کاربند ہے۔ مجھے امید ہے کہ خدا کرے کانپور میونسپلٹی کے چیئرمین بھی اس قسم کے شبہات سے پاک رہنے کے اسی طرح خواہشمند ہوں۔ میں نے مسلمانان کانپور کو مشورہ دیا ہے کہ اگر وہ پہلی التماس کو آخری التماس سمجھ کر خاموش ہونا نہیں چاہتے تو یور آنر کی خدمت میں اپنی معروضات پھر پیش کریں۔ اور میں بھی ایک دفعہ پھر گزارش کرتا ہوں کہ براہ مہربانی میری تجویز کو منظور فرما کر اس معاملہ میں مسلمان علماء اور مسلمان قانون دان اصحاب سے مشورہ فرمالیں۔ اس میں تو شک نہیں کہ اگر اس شکایت کے خلاف فیصلہ صادر ہوا تو مجھے یقین ہے کہ راستی پر مبنی ہے تو اس معاملہ پر رائے ظاہر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ اگرچہ میری تو خواہش یہی ہے کہ اس معاملہ پر مجھے کوئی جرح قدح کرنا ہی نہ پڑے اور خود یور آنر ہی نظر ثانی کے بعد اس معاملہ میں ہمارے محسوسات کا پاس رکھنا ممکن تصور فرمالیں۔

دہلی ۳ر جون ۱۹۱۳ء — آپ کا صادق۔ محمد علی

جواب

جواب ہز آنر سر جیمس میسٹن بالقابہ لفٹیننٹ گورنر صوبجات متحدہ۔

مائی ڈیر محمد علی!

مجھے بہت افسوس ہے کہ دیگر ضروری کاموں کی وجہ سے دیر ہوئی۔ اور میں اب تک آپ کی چٹھی متعلقہ مسجد واقع مچھلی بازار کانپور مورخہ ۹ر جون ۱۹۱۳ء کا جواب نہ دے سکا۔ میں آپ کی اس توضیح کے ساتھ اور تاہم دوستانہ رنگ میں چٹھی لکھنے کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ اور میں بھی حسب دستور اس رنگ میں جواب دینے کی کوشش کرتا رہوں گا۔

۲۔ میں نے بہت احتیاط کے ساتھ اور مختلف حیثیت کے بہت سے اصحاب سے مشورہ کر لینے کے بعد اس فیصلہ پر مکرر غور کر لیا ہے۔ جو مسجد کے دالان کے مسمار کر دئے جانے کی بابت شائع ہو چکا ہے۔ (میں قانون دان اصحاب کی طرح بالکل بے تعصبی کے ساتھ اس حصہ مسجد کو دالان کے نام سے پکارتا ہوں) میں خود اس بارے میں اپنا ذاتی اطمینان کرنے کی فکر میں تھا کہ جو احکام جاری ہو چکے ہیں اور میرے آخری احکام ہیں کہیں بے غوری اور ناانصافی پر مبنی نہ ہوں۔ اور مزید غور و خوض کے بعد میں نہیں دیکھتا کہ از روئے انصاف ان احکام کی بابت یہ رائے قائم کی جا سکتی ہے۔

۳۔ مدت سے سلے۔ بی روڈ کے نقشہ میں بھی دکھلایا گیا ہے کہ اس دالان کے متعلق کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی گئی علاوہ میرا یہ وعدہ کہ مسجد مسمار نہ کی جائے گی اس دالان سے کوئی تعلق نہ رکھتا تھا۔ جو بظاہر مسجد سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ اور جس کی نسبت مجھے ذمہ دار افسروں نے کامل یقین دلایا ہے کہ دالان مقدس عمارت کی تعمیر میں بالکل شامل نہیں ہے۔

۴۔ دالان کو مسمار کرنے کے خلاف معروضات میرے پاس اس وقت پہنچائیں جبکہ ہندوؤں کے مندر کو بچا لینے کا فیصلہ شائع ہوئے کئی ماہ گزر چکے تھے۔ قدرتاً مجھے اس بنا پر یہ تحقیقات کرنے کا خیال پیدا ہوا کہ یہ صدائے احتجاج سچی شکایتوں پر مبنی ہے یا ہندوؤں کو رعایت دئے جانے کے بعد اس کا خیال سوجھا ہے۔ تاکہ مسلمانوں کے لئے ایسی ہی مراعات حاصل کی جائیں۔ اس لئے اس امر کا تحقیق کرنا ضرور تھا کہ خود مسلمان اس دالان کی کیا وقعت کرتے ہیں۔ اس کے متعلق میں نے مسٹر کم سے دریافت کیا اور انہوں نے فوراً مجھے بتلایا کہ جب مسلمان انہیں

دالان دکھانے کے لئے لے گئے نوبت سے مسلمان اس میں جوتی سمیت گھس گئے تھے۔ میں خود اس بارہ میں رسم و رواج اور محسوسات سے ناواقف نہیں ہوں کیونکہ میں بہت سے خوش عقیدہ مسلمانوں کے ساتھ اکثر مسجدوں میں گیا ہوں۔ چنانچہ میں نے مسٹر سیم کے بیان کو (جسے میں بلا شک و شبہ تسلیم کرتا ہوں) اس معاملہ پر قطعی شہادت سمجھ لیا۔ کہ دالان کی اس قدر حرمت نہیں ہے جتنی کہ خاص مسجد کی ہے۔ یہ شہادت آپ کی چٹھی کے اس بیان سے بہت کچھ مختلف ہے کہ مسٹر ٹائیلر یہ ثابت کرنے کے لئے دالان میں بوٹ سمیت داخل ہوئے تھے کہ یہ جگہ واجب التحریم نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ نتیجہ اخذ کیا ہے وہ خود مسلمانوں کے افعال ہی سے کیا ہے۔

جب میں کانپور گیا تو میں نے مسلمانوں کے اسی نقطہ خیال کے اظہار اور ان اعتراضوں کی نوعیت کا جو بعد میں کئے گئے لحاظ کر کے احکام جاری کئے۔ اور انہیں احکام کو آخری قرار دیا۔ (اگر مجھے کسی جماعت کے سچے جذبات کو رنج پہنچانے یا ان کی مذہبی محسوسات کو دکھ دینے کا اندیشہ ہوتا تو میں کبھی ایسا نہ کرتا۔ نہ تو اس وقت مجھے معلوم ہوا اور نہ اب مجھے کوئی اس قسم کا اندیشہ معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کسی جماعت کے مذہبی محسوسات کو صدمہ نہیں پہنچایا ہے۔ ممکن ہے کہ لوگ نئی باتوں کو ناپسند کریں اور پرانی اور مانوس اشیاء سے مداخلت کرنے پر اظہار ناراضگی کریں۔ مگر مسلمانان کانپور کی یہ چیخ پکار کہ ہمارے مذہبی محسوسات کو صدمہ پہنچا ہے' مجھے مبالغہ آمیز معلوم ہوئی۔ اور میں نے خیال کیا کہ اس میں پورا پورا اخلاص اور صدق نہیں ہے۔ میرا یقین تھا کہ دالان (متنازعہ) کے عوض کسی اور جگہ جو پہلی جگہ کی طرح موزوں ہو ایک نیا دالان تعمیر کر دئے جانے اور مسجد یا اس کے متعلقہ ارد گرد کی عمارتوں کو معقول امداد دینے سے ہم کسی تکلیف یا ایسی تبدیلی کا ازالہ کر دیں گے۔ جو عارضی طور پر نمازیوں کو پیش آئے یا ان کے روزمرہ کے معمول میں واقع ہوئی ہو۔ اس طریقہ سے ہم پورا پورا عوض دینے کو تیار ہیں۔ اس تجویز کے مطابق عملدرآمد کرنے سے جو آپ پیش کرتے ہیں یا تو ہمیں رستہ کے لئے نئی سمت ڈھونڈھنی پڑے گی یا دالان مذکور کو اس طرح لب سڑک کھڑا رکھنا ہوگا کہ وہ سڑک کے تھوڑے حصے کو ڈھالے رکھے۔ خود تو یہ خفیف سا معاملہ ہے مگر افراد یا کسی قوم کے ایک حصہ کو چھوٹی چھوٹی رعائتیں دینے کی وجہ سے کس حد تک رفاہ عام کے کاموں میں حرج کیا جا سکتا ہے؟

۶۔ یقین فرمایئے کہ اگر یہ شور و غل ٹل سکتا تو مجھے بہت مسرت ہوتی۔ مگر ہم سب کو اس امر سے اتفاق ہونا چاہئے کہ اگر ہم رفاہ عام کا خیال دل میں رکھتے ہیں تو ہمیں چھوٹی اور بڑی باتوں کے درمیان امتیاز کرنا چاہئے۔ اگر خفیف سے خفیف تکلیف کو قومی شکایت بنا دیا جائے اور اسے قومی شکایت تسلیم کر لیا جائے' تو گورنمنٹ کے قانون اور امور رفاہ عام کی ترقی کا خدا حافظ ہے۔ اگلے مہینے جب میں کانپور آؤں گا تو مسلمانوں سے ملاقات کروں گا۔ اور جہاں تک مجھ سے بن پڑا ان کی ناراضگی خاطر کو جس پر مجھے حقیقی افسوس ہے دور کر دوں گا۔ مگر میں اپنے فیصلہ کو کہ اسے بی روڈ کے لئے دالان کو منہدم کیا جائے تبدیل نہیں کر سکتا۔ میں آپ کا کچھ کم شکر گزار نہیں کہ آپ نے اس معاملہ کو ایسی منصف مزاجی اور آزادی سے میرے سامنے پیش کیا ہے۔

گورنمنٹ ہاؤس نینی تال۔ آپ کا مخلص:۔

مورخہ ۲ر جولائی ۱۹۱۳ء (دستخط) سر جیمس میسٹن

خواجہ حسن نظامی کی تقریر

کہو تکبیر!

اَللّٰہُ اَکْبَر۔ اَللّٰہُ اَکْبَر۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاللّٰہُ اَکْبَر اَللّٰہُ اَکْبَر وَلِلّٰہِ الْحَمْد۔

(یہ تقریر بتاریخ ۴ رمضان المبارک مطابق ۷ اگست ۱۹۱۳ء بعد نماز جمعہ میرٹھ شہر کی جامع مسجد میں دس ہزار مسلمانوں کے سامنے کی گئی اور جس کے ایک ایک لفظ نے جلسہ میں تہلکہ ڈال دیا)

اس بندوق کی قسم جو ظالم و مظلوم کے ہاتھ میں یکساں کام کرتی ہے۔ اس سنگین کی قسم جو دوست و دشمن کے سینہ میں برابر اتر جاتی ہے۔ اس تلوار کی قسم جس پر اگر آج غیر کا قبضہ ہے تو کل ہمارا ہوگا۔ اس پستول کی قسم جو ہر انگلی کے اشارے سے کام کرتا ہے۔ ہم کانپوری شہیدوں کے ماتم میں یہاں جمع ہوئے ہیں ہم ان زخمیوں کی ہمدردی کرنی چاہتے ہیں جو کانپور میں بندوق و کرچ و سنگین کا نشانہ بنائے گئے۔

اس مسجد کی قسم جس کے اندر آج ہم سب کلمہ گو بھائی صف بند نظر آتے ہیں۔ کانپوری مسجد کا غم ہم کو یہاں کھینچ لایا ہے وہ مسجد جو مچھلی بازار میں تھی۔ وہ مسجد جس کا ایک حصہ سڑک سیدھی کرنے کی خاطر زور اور ظلم سے شہید کر دیا گیا۔ وہ مسجد جس کی محبت کرنے والے مسلمانوں کو ۲۹ شعبان کے دن بندوقوں نے دس منٹ لگاتار فائر کر کے خاک و خون میں ملا دیا۔ وہ مسجد جس کے سامنے ہمارے بوڑھے بزرگوں کی لاشیں تڑپ تڑپ کر گریں۔ اور ان کی سفید داڑھیاں خون سے لال ہوگئیں۔

اس مسجد کی قسم جس کے سامنے دم توڑنے والے شہیدوں نے یہ کہا۔ سلام ہمارا مدینے والے سلطان پر جس کے دین کی لاج پر ہم جان دیتے ہیں۔ سلام اس پر جو حجاز کے اونچے پہاڑوں سے آیا ہے۔ اور ہم کو اپنے سینے کے سہارے لئے بیٹھا ہے۔ ہمارے زخموں کو پیار کرتا ہے۔ جس کے گیسو دراز نواسے حسنؓ و حسینؓ اس مقتل میں اپنی سرخ سبز قباؤں کے دامن بچھا رہے ہیں۔ جن کی صاحبزادی فاطمہ زہراؓ اپنے باپ کی ہچکیاں لینے والی امت کو پانی کے گھونٹ پلاتی پھرتی ہیں۔ جس کے طفیل جنت کی حوریں کوثر کے جام لائی ہیں۔

اس مسجد کی قسم جس کے اندر سینکڑوں بے گناہ ستم کی رسیوں سے باندھے گئے۔ اور بھوکے پیاسے جیل خانہ کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بند کئے گئے۔

ہم اسی غرض سے یہاں آئے ہیں کہ اپنے کانپوری شہیدوں کی ارواح کو درود و سلام بھیجیں۔ ہم اس لئے یہاں اکٹھے ہوئے ہیں کہ کانپوری زخمیوں کی تیمارداری کے لئے تدبیریں سوچیں۔ ان کے زخموں کے واسطے مرہم بھجوائیں۔ اور قیدیوں کی رہائی دلوانے کا کچھ سامان کریں۔ اور شہیدوں کے بے کس بال بچوں کو بھوک اور پیاس کی تکلیف سے بچائیں۔

میرٹھ کے مسلمانو! اسلام تم سے اپنا حق مانگتا ہے۔ کانپور کے مسلمانوں نے اپنا حق جان و مال سے ادا کر دیا۔ وہ قربان ہوگئے اور مسجد کی بے آبروئی پر کٹ مرے۔ تم سے فقط مال کی مانگ ہے تاکہ زخمیوں اور شہیدوں کے پس ماندوں اور قیدیوں کے گھر والوں کی مدد کی جائے۔

دوسری مانگ تم سے اور ہے اس کو بھی سنو اور زور سے اک نعرۂ تکبیر بلند کرو۔ اللہ اکبر۔ لا الہ الا اللہ۔ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد۔ اور وہ طلب یہ ہے کہ سب ایک ہو جاؤ اور ہندوستان نے نیک دل وائسرے حضور لارڈ ہارڈنگ بہادر کو فریاد نامے بھیجو۔ کہ کانپوری حکام

نے ہمارے بھائیوں کو ناحق تیغ و تفنگ کا نشانہ بنایا۔ ہماری مسجد کو تلوار کے زور سے ڈھا دیا۔ بے قصور مسلمانوں سے جیل خانے بھر دئے۔ لارڈ ہارڈنگ کو لکھو۔ لنڈن کی پارلیمنٹ کو لکھو اور اس رحم دل آدمی کو لکھو جس کا نام جارج خامس ہے۔ اور جو ان ظالم حکام اور کانپوری مظلوموں کا منصف بادشاہ ہے۔ وہ بادشاہ جو مسلمانوں کے دین سے محبت رکھتا ہے جس نے دہلی دربار میں آنے کے وقت اس جہاز میں سفر کیا جس کا نام مدینہ تھا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نجات مدینہ کے نام میں ہے۔ وہ بادشاہ جس نے جامع مسجد دہلی کا طواف کیا۔ وہ بادشاہ جس کے آگے جلوس دربار کے موقع پر اسلامی جھنڈا تھا جس پر نصر من اللہ و فتح قریب لکھا ہوا تھا۔ ہم کو اپنے اس انصاف پسند بادشاہ سے امید ہے کہ وہ کانپور کے ظالم انگریزوں کی جفا کاریوں کو معاف نہیں کرے گا۔

اللہ کے بندو! بے اساس اور مایوس نہ ہو۔ کمر ہمت مضبوط باندھو۔ آنکھیں دیکھتی ہیں کہ بول بالا ہونے کا وقت قریب آیا ہے۔ کان سنتے ہیں کہ عذاب الٰہی کا بادل گرج رہا ہے۔

کانپور کی مسجد کا واقعہ ایسا نہیں ہے جس سے تم بے خبر ہو یا جس کو سن کر تم سب کے دلوں میں جوش نہ پیدا ہوا ہو مگر اس ملک میں کچھ انگریز ہیں جو سمجھتے ہیں کہ گنتی کے چند مسلمان اور اخبارات غل مچا رہے ہیں۔ باقی مسلمانوں کو تو کانوں کان خبر بھی نہیں کاش وہ بدنصیب جانتے کہ اسلام کے کلمہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ میں ایک ایسی بجلی ہے جو انگریزوں کی سب تار کی تاروں میں بھی نہیں پائی جاتی۔ اس میں ایک ایسی لہر ہے جو دنیا کے تمام سمندروں کی موجوں سے زیادہ پر جوش ہے ان کو یقین کرنا چاہئے کہ سارا ہندوستان کانپوری مسجد کے معاملہ میں ایک دل اور ایک زبان ہے۔ کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ بلقان و طرابلس کے دور دراز ملکوں میں جب ہمارے بھائیوں کے ایک پھانس چبھتی تھی تو یہاں پر دس کروڑ ہندوستانیوں کے دلوں میں خنجر چل جاتے تھے۔ کیا یہ لوگ مسلمانوں کا جوش دیکھنا چاہتے ہیں؟ کیا ان کو آرزو ہے کہ مسلمان اپنا ایجی ٹیشن دکھائیں۔ مگر ان سے کہدو ہمارا جوش ایجی ٹیشن اور نمائش کا جوش نہیں ہے۔ جو میٹنگ ہی تک محدود رہے۔ ہم جب جوش میں آتے ہیں آسمان تھرا جاتا ہے۔ سمندر ڈر کے مارے سمٹ جاتا ہے۔ پہاڑ پست ہو جاتے ہیں۔ دریاؤں کی روانی رک جاتی ہے۔ ہمارا جھنڈا جب بلند ہوتا ہے تو سینٹ پال کے گرجا کے سوا اور کہیں نصب نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم تم سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم کو نہ چھیڑا جائے ہم وفادار لوگ ہیں ہم اپنے بادشاہ کے فرمان پر سر جھکانے اور اس کے پسینہ کی جگہ خون بہانے والے لوگ ہیں۔ کیونکہ خدا اور رسول نے ہم کو یہی حکم دیا ہے۔ تم ہم کو نہ ستاؤ اور چپ چاپ اپنا کام کرتے رہو۔ ملکہ معظمہ وکٹوریہ کے اس وعدہ کا خیال رکھو کہ ہندوستانیوں کے مذہب میں حکومت کبھی کوئی مداخلت نہ کرے گی۔

ہماری کانپور کی مسجد بنا دو۔ ہمارے قیدیوں کو چھوڑ دو۔ ہمارے زخمیوں کو ہمارے حوالہ کر دو۔ اور موقع دو کہ ہم اب اطمینان سے اپنے مالک الملوک پروردگار کے آگے سر جھکائیں اور اس کی عبادت کریں جس کے لئے ہم پیدا ہوئے ہیں۔

اے مسلمانو! خیال تو کرو کہ آج جب کہ تم آرام سے اپنے گھروں میں بیٹھے ہو۔ کانپوری شہیدوں اور زخمیوں کے بال بچوں پر کیا گذر رہی ہوگی۔ لہٰذا جیب میں ہاتھ ڈالو اور ان کی مدد کے لئے حسب توفیق کچھ دو۔

کانپور کے مسلمانوں کی شہادت کا ذمہ وار کون ہے

پنجشنبہ، ۷ اگست ۱۹۱۳ء

آخر وہ دن آگیا جس کا ہم کو خوف تھا۔ اور جس کے متعلق ہم نے بار بار گورنمنٹ کو متوجہ کرنا چاہا تھا۔ مگر ہٹ دھرمی اور تندی حکام کی معنی آفرین اور سخن پرور طبیعتوں کی بدولت اصلی حالات پر روشنی نہ پڑ سکی۔ اور کانپور کی مسجد کے معاملات نے افسوسناک صورت اختیار کی جس کا ذکر ہم گذشتہ اشاعت میں مفصل کر چکے ہیں۔ اور جس کے متعلق مسٹر ٹائیلر مجسٹریٹ کانپور کا بیان ہے کہ بیرونی اشتعالک اور طعنوں سے تنگ آ کر مسلمانانِ کانپور نے بلوا کر دیا۔ مگر مسٹر ٹائیلر اور ان کے ہم خیالوں پر واضح ہونا چاہیے کہ سب سے بڑی اشتعالک مسلمانوں کو اگر کسی بات سے ہو سکتی تھی تو وہ یہ تھی کہ باوجود ان کی فریاد اور واویلا کے سرکاری اعلان میں یہ اشارہ کیا گیا کہ کانپور کے مسلمانوں میں دراصل کوئی سچا جوش مسجد کے متعلق نہیں ہے جس کے معنی دوسرے الفاظ میں اس سے زیادہ کیا ہو سکتے تھے کہ گورنمنٹ ان کی نفسانی ناراضگی کی کچھ پرواہ نہیں کرتی اور مسٹر ٹائیلر اور ان کے ہم نوا اس بات کے آرزومند تھے کہ اس سے کچھ زیادہ ہونے والا ہے تو ہم ان کو مبارکباد دیتے ہیں کہ ان کی آرزو پوری ہوئی۔

اب مسٹر ٹائیلر اپنی سرکاری رپورٹ میں خواہ ان واقعات کو کس رنگ میں رنگیں مگر شہیدانِ کانپور کے لہو کی سرخی ہمیشہ کے لئے ان کے دامن پر جھلکتی رہے گی۔ اور ان بے گناہوں کا خون تا قیامت ان کی گردن پر رہے گا۔

جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

مسلمانوں کی وفاداری اور اطاعت شعاری کے متعلق اب سے پہلے بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ اور ہم اب بھی گورنمنٹ کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ سے کوئی پرخاش نہیں ہو سکتی۔ مگر جس حالت میں کہ ان کی مودبانہ عرضداشت اور ان کی باضابطہ فریاد کو مسٹر ٹائیلر جیسے فہیم حکام یہ ثابت کرنا چاہیں اور یہ طعنہ دے کر کہ ان میں کوئی سچا جوش نہیں ہے ان کی رگِ غیرت و حمیت کو حدِ اعتدال سے زیادہ حرکت میں لانا چاہیں تو اگر ان سے کوئی امر خلافِ قانون سرزد ہو تو محلِ استعجاب نہیں۔

نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود
برآرد بہ چنگال چشم پلنگ

مسلمانوں کی مذہبی تعلیم خود ان کو بتاتی ہے کہ جو لوگ تم سے انصاف کے ساتھ پیش آئیں تم ان کی اطاعت کرو۔ مگر جس وقت ان کے معابد کی بے حرمتی کر کے ان سے یہ چاہا جائے کہ وہ اپنے سچے مذہبی جذبات کا ثبوت دیں تو یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انہیں جانیں اور اپنی گردنیں اپنی عبادت گاہوں سے زیادہ عزیز نہیں۔ اور وہ اپنی چند روزہ زندگی کا اس سے بہتر کوئی خاتمہ نہیں سمجھتے۔ کہ وہ خدا کی راہ میں کام آئے۔

وبالِ دوش ہے یہ سر مگر اسے ہم نے
لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لئے

کانپور کے نہتے مسلمان اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے۔ کہ وہ مسلح فوج اور نیزہ بردار پولیس کے سواروں کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتے۔ اور

صرف مسجد کے منہدم شدہ حصہ کی ازسرِنو تعمیر کا قصد ہی۔ اسباب کو بخوبی ثابت کرتا ہے کہ ان کا ارادہ فاسد نہ تھا۔ بلکہ صرف ایک مذہبی جذبہ تھا جس پر شارع عام پر خلاف قانون مجمع یا زیادہ سے زیادہ گورنمنٹ کے جس حکم کی مطابق وہ حصہ سرکاری غلطی میں آیا تھا۔ اس کی خلاف ورزی کا الزام آسکتا تھا۔ اور یہ ایسی باتیں تھیں جن کے متعلق ایک نیک نیت حاکم بعد مجمع کے خود بخود منتشر ہوجانے کے ذمہ دار لوگوں سے بہ آسانی جواب طلب کرسکتا تھا۔ اور بغیر اس کے کہ مسلح پولیس سے ان کا محاصرہ کرکے ان کو زیادہ اشتعال دلایا جائے۔ تمام معاملات طے ہو سکتے تھے۔ مگر جو حاکم اپنی شان انا ربکم الاعلیٰ اور نعرہ پندار لمن الملک الیوم کا اظہار کرنا چاہتا ہو۔ اور جس نے بغیر اس کے کہ کوئی قطعی فیصلہ ہو مسجد کو ڈھا کر بے بس اور بے کس مسلمانوں کو اپنی سنگینوں کا جوہر دکھانا چاہا ہو اس سے کب یہ توقع ہو سکتی تھی کہ وہ وقت اور موقع کی نزاکت کو ملحوظ رکھے گا۔ مسٹر ٹائلر اپنے اس فعل کو خواہ کوئی جامہ پہنائیں مگر حکومت برطانیہ کا انصاف ان سے بے گناہ مسلمانوں کے خون کا مواخذہ لے کر رہے گا۔ اور ان کا اشتعال انگیز طرز عمل اس پردہ میں نہیں چھپ سکے گا۔ کہ بیرونی طعن و تشنیع اس اندرونی ہنگامہ کے سبب ہوئے۔ اگر مسلمانوں نے دوسروں کے یا خود مسٹر ٹائیلر کی غیرت دلانے کی وجہ سے یا انہدام مسجد کو خلاف قانون سمجھ کر اس کو دوبارہ درست کرنا چاہا تو مسٹر ٹائیلر کو کس بات نے تحریک کی کہ وہ مسلح پولیس لے کر ایک غیر مسلح جماعت پر حملہ کردیں۔

ہاتھ کی سرخی کو مانا کہ حنا کہتے ہیں
یہ جو دامن پہ ہیں چھینٹے اسے کیا کہتے ہیں

ہم کو سر جیمس مسٹن بالقابہ اور گورنمنٹ ہند سے پوری توقع اس بارہ میں ہے کہ وہ حکومت برطانیہ کے ضرب المثل انصاف کو اس موقع پر ہاتھ سے نہ جانے دیں گے اور محض سرکاری رپورٹوں اور حکام ضلع کے بیانات پر اکتفا نہ کریں گے۔ جن کے یک طرفہ اور متعصبانہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ ہم کو بخوبی اسباب کا اندازہ ہے کہ اس سے پہلے کانپور کے مسلمانوں کا ارادہ قانون کی کسی قسم کی خلاف ورزی کا نہ تھا۔ اور ہم بہ وثوق کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کے المناک حادثہ کے وقوع کے ذمہ دار حکام ضلع ہیں جنہوں نے خلاف واقعہ اطلاعیں گورنمنٹ میں پہنچا کر مسلمانوں کو مشتعل کرنا چاہا۔ اور اب ایک غلط بیانی کی پردہ پوشی دوسری افترا پردازی سے کی جاتی ہے۔ آخر میں ہم ان سرفروشان ملت کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں۔ جنہوں نے صرف اپنے مذہبی حقوق زندہ رکھنے اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے جانیں خدا کی راہ میں فدا کی ہیں۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خون و خاک غلطیدن
خدا رحمت کند بر عاشقانِ پاک طینت را

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

ہم اپنے مذہبی بھائیوں سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ اس معاملہ میں وہ ضبط و تحمل کو ہاتھ سے جانے نہ دیں گے۔ اور ان گرفتارانِ بلا کی اعانت کی تدابیر پر غور کریں گے۔ جو اس وقت زیر عتاب ہو رہے ہیں۔ آئندہ ہم ان تدابیر اور نیز دیگر امور کے متعلق بحث مفصل کریں گے۔

اداریہ

کشکول

واقعہ کانپور کے متعلق ہز آنر کی رائے ———!

جمعہ ۸ر اگست ۱۹۱۳ء

ہز آنر جیمس میسٹن نے آگرہ کی تقریر میں شہدائے کانپور کی بیواؤں اور یتیم بچوں کی آہ و بکا - اور مسجد مچھلی بازار پر قربان ہونے والوں کی حالت زار کا پُر درد سماں بیان کرنے کے بعد جس شاعرانہ طریقہ پر حکام وقت کی رحم دلی اور انصاف پروری کی مدحت سرائی کی طرف گریز کیا ہے ہم افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم اس کی داد دینے سے قاصر ہیں - ہم ہز آنر کے ضرور مشکور ہیں کہ انہوں نے زخمیوں کی عیادت کی - گرفتاروں کے حالات دریافت کئے اور بیواؤں اور یتیموں کی فریادیں سنیں - مگر مسٹر ٹائلر جیسے ناعاقبت اندیش، خود سر، ضدی اور بے پرواہ حاکم کی دانشمندی کی تعریف میں افسوس ہے کہ مسلمان ہز آنر کا ساتھ دینے سے معذور ہیں - بلکہ ہم کو اس کا بھی افسوس ہے کہ کانپور کے معاملات کی طرف سے اتنی غفلت کی گئی کہ صورت حال کچھ سے کچھ ہو گئی - اور بہ جائے اس کے کہ بپھرے جوش والے مسلمانوں کی قلبی کیفیت کو ان کی زبانوں سے سنتے ہز آنر کو ان میں سے اکثر کا ماتم کرنا پڑا - پھر بھی غنیمت ہے کہ ان جان سے جانے والوں کے ساتھ ہمدردی تو ہے -

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزۂ خود را بہ نماز آمدہ

پائیونیر اور بلوۂ کانپور :-

ہمارے قدیم مہربان اور ہم عصر پائیونیر حسب معمول تحریر فرماتے ہیں کہ منہدم حصہ مسجد کو دوبارہ بنانے کا ارادہ کرنا دراصل مجمع کی طرف سے حکام کو بلاوا تھا کہ وہ اپنا سارا زور لگالیں - اگر واقف رموز مملکت پائیونیر کی یہ رائے صحیح ہے تو ہم یہ امید کرتے ہیں کہ وہ آئین ملک داری کے اصول کی رو سے یہ بھی ضرور مان لے گا کہ جن عہدہ داروں میں سے اس قدر انتظامی مادہ نہیں ہے کہ وہ برافروختہ رعایا کے احساسات اور جذبات کو سمجھ کر امن عامہ کو قائم رکھ سکیں وہ حاکم بننے اور رہنے کے اہل بھی نہیں ہیں - ہمیں سخت افسوس آتا ہے کہ اخبار مذکور حکام کی ذاتی غلطیوں کی تائید کرتے ہوئے یہ محسوس نہیں کرتا کہ اخبارات کا فرض تو یہ ہے کہ گورنمنٹ کو واقعات کی اصل حقیقت سے آگاہ کرتے رہیں - نہ یہ کہ اسے اندھیرے میں رکھ کر اور ٹھوکریں کھانے کے لئے غلط راستہ پر ڈال دیں - اس قسم کی غلط بیانیوں پر اعتماد کر کے سر جیمس میسٹن جیسے زیرک اور حق پسند فرمانروائے صوبہ نے منہدم حصہ مسجد کی شہادت کا حکم دے کر مسلمانان ہند کی دلآزاری کی - اور پھر اس کے بعد جیسا کہ معزز ہم عصر انڈین ڈیلی ٹیلیگراف صفائی کے ساتھ تسلیم کرتا ہے سرکاری اعلان شائع کر کے مسلمانان کانپور کو وہ الی از جوش بتایا اور یا یوں کہئے کہ جوش کی دبی ہوئی چنگاریوں کو مشتعل کر دیا - عیدگاہ میں کثیر التعداد مسلمان جمع ہوئے اور حقیقت واقعات معلوم ہونے پر غم و غصہ کھانے لگے لیکن لکھے پڑھے مسلمان سمجھدار مسلمان، اعتدال پسندی اور قانونی پابندی کی تلقین کرتے رہے - اور علمائے دین بھی جو فساد سے کر جملہ حاضرین کو ہیجان میں لا سکتے تھے - ضابطہ کے اندر ہی رہنے پر زور دیتے رہے - مگر کوئی تین ہزار شرکائے جلسہ میں سے چند سو سیدھے

ساڑھے ۱۱ رجان پر کھیل جانے والے مسلمان جلسہ بغاوت ہونے کے بعد واپسی میں کچھ ایسے جوش میں آگئے اور اپنی جاہلانہ سمجھ کے مطابق صرف اس قدر جوش میں آگئے کہ اگر گورنمنٹ اپنی غلطی کی اصلاح میں پس و پیش کرتی ہے یا لیڈران قوم سرگرمی و چابک دستی کے ساتھ گورنمنٹ سے غلطی کی اصلاح کرانے میں تاخیر سے کام لے رہے ہیں تاہم وہ اپنے ہاتھوں سے شہید حصہ کو زندہ کر کے گورنمنٹ کی اصلاح کردیں۔ مگر وہاں تو ایک اور غلطی ہونے والی تھی جس طرح سے مسلح پولیس کی نگرانی میں حصہ زیر بحث شہید کیا گیا تھا۔ اسی طرح مسلح پولیس اور سوار نہتے، جاہل افراد رعایا پر حملہ کرنے کے لئے بلوائے گئے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ مسٹر ٹائیلر یا مسٹر ڈوڈ نے اس معاملہ میں جرأت، تحمل، دانش مندی یا موقع شناسی کی صفات میں سے کونسی صفت پر عمل کیا۔ صاحبان بہادر کے جلو میں مسلح پولیس ہے جو ایک "بزن" پر غریب رعایا پر گولیاں برسانے کو تیار ہے۔ ادھر مجمع جوش مذہبی میں از خود رفتہ ہے، ایسی حالت میں اگر مجمع میں سے بعض نا سمجھ لڑکوں نے جنہیں لڑکے سمجھ کر ہز آنر نے رہا بھی کر دیا ہے۔ اور متعدد اشخاص نے ان پر اینٹ پتھر پھینک بھی دیئے تو چنداں قابل مواخذہ نہیں کہا جاسکتا۔ ابتدائی معاملہ سے وقوع بلوہ تک صاحبان امن پسند مسلمانوں کو اشتعال دلاتے رہے اور اشتعال بھی مذہبی۔ ہم امید کرتے ہیں کہ گورنمنٹ اس معاملہ کو اصلی روشنی میں دیکھے گی۔ اور اس افسوسناک بلوہ کے لئے حکام ضلع کو جواب دہ ٹھہرائے گی۔ نہ کہ جاہل مسلمانوں کو بے قصور متولیان مسجد کو۔

HIL
روشنی کے بغیر زندگی
"ایک جسم ہے بے روح"
کوئی ایک ماچس —— !
حبیب کی طرح طرح کی ماچسوں میں سے منتخب کر لیجیے !
EXPRESS
SAFETY MATCHES
HURRICANE
SAFETY MATCHES
THE BANDUK
PARROT
SAFETY MATCHES
HABIB INDUSTRIES L. DACCA
حبیب ماچس کبھی خراب نہیں ہوتی
حبیب انڈسٹریز لمیٹڈ ڈھاکہ

آزمودہ کوالٹی
آزمودہ نام
Treet
BLADES
DOUBLE EDGE
ٹریٹ
بلیڈ
۷۰ پیسے کے ۱۰ بلیڈ
PRESTIGE
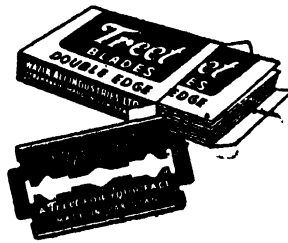
خانہ داری میں
اِن کا جواب نہیں

طیبی
UNANI

سر جیمس مسٹن کی تقریر آگرہ میں

(سہ شنبہ ۱۲-اگست ۱۹۱۳ء)

مسجد مچھلی بازار کانپور کے حصہ معلوم کے شہید ہونے سے قبل ہمیں سر جیمس میسٹن اور اپنی باہمی خط و کتابت اور مسلمانان کانپور کی مصروفیات و اکثر ممبران میونسپلٹی کے اختلاف رائے سے خوش گوار نتائج پیدا ہونے کی بہت کچھ توقع ہے۔ مگر وہ توقعات جس طرح خیالِ باطل ثابت ہوئیں وہ ناظرین سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اس کے بعد ہمیں امید تھی کہ ہندوستان بھر کے سرکردہ مسلمانوں، اسلامی انجمنوں اور علماء کی تقریروں، تحریروں اور فتاوے پر نظرِ ثانی اور اپنی رائے میں ترمیم کر کے سر جیمس میسٹن مذہبی مداخلت کے الزام سے بری ہو جائیں گے مگر اس طلسم امید کو گورنمنٹ صوبجات متحدہ کے سرکاری اعلان نے توڑ دیا۔ کانپور کے حادثہ قلق انگیز و خون ریز کے بعد سر جیمس میسٹن کی انصاف پسندی حق گوئی اور رحم دلی پر بھروسہ کر کے ہم ہر روز نقارہ دار کی طرح گوش برآواز تھے کہ جناب والا قدر کی تقریر آگرہ نے اس آخری امید پر بھی پانی پھیر دیا۔

اس تقریر سے عمر بھر میں پہلی مرتبہ ہم کو یہ معلوم ہوا کہ رسم عزاداری ہیں کشت گان محبت کے وارثوں سے الٹا گلہ بھی کیا جاتا ہے چنانچہ سر جیمس میسٹن بالقابہ نے اپنی تقریر آگرہ کو سراپا حیرت سے لبریز کر دیا ہے اور منجملہ ان امور کے جن پر جناب موصوف نے حیرت ظاہر کی ہے وہ ان لوگوں پر ہے جنہوں نے دورہ کر اور محفوظ رہ کر تقریروں اور تحریروں سے جاہل خلقت خدا کے جذبات میں آگ لگا دی اور جن کے اوپر خدا کی نظروں میں اور انسان کی نگاہوں میں اس بے ضرورت خونریزی اور مصیبت بپا کرنے کا گناہ ہے "ہز آنر کی یہ حیرت بجا ہوتی اور ہم" ان کے ساتھ متحیر ہونے کو تیار ہو جاتے بشرطیکہ ہمیں یہ یقین بھی ہو کہ کانپور سے باہر رہنے والوں نے دورہ کر اور محفوظ رہ کر تقریروں اور تحریروں سے جاہل خلقت خدا کے جذبات ہیں آگ لگا دی ہے۔

ہز آنر کے اس اظہار حیرت سے دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اوّل تو یہ کہ بیرونی اصحاب نے لطف تماشائی غرض سے گورنمنٹ اور مسلمانان کانپور کے درمیان بدمزگی پیدا کی اور دبے دبائے معاملہ کو سوتی ہوئی بھڑوں کی طرح جگا دیا۔ دوسرے یہ کہ خود کانپور میں بے حرمتی مسجد کے متعلق نہ کوئی احساس تھا اور نہ کوئی جوش، مگر چاروں طرف کی ہائے پکار سے احساس بھی پیدا ہو گیا، جوش بھی موجزن ہو گیا، اور شہیدان محبت اور دیوان گان عشق سنے سنائے یا تو مرنے مارنے اور جان ہارنے پہ کمربستہ ہو گئے۔ اگر بنائے حیرت پہلی وجہ ہے تو خود ہمیں اس پر کچھ حیرت نہیں ہے کیونکہ حضور موصوف سے پیشتر "لندن ٹائمس" اور بعض دیگر اہل الرائے جنگ ٹرکی و بلقان

کے متعلق ہمیں قصوروار ٹھہرا چکے ہیں کہ ہم ترکوں کو ان کی مرضی کے خلاف لڑوائے جاتے ہیں اور اب بھی اینگلو انڈین اخبارات اسی قسم کے آوازے کس کر مسلمانوں کے فریاد کرش گلوں میں رسہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ لیکن اب کہ گورنمنٹ نے وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو مانگنے اور گلہ پھاڑ پھاڑ کر مانگنے کا سبق ازبر کرا دیا ہے اور اب کہ مسلمان یہ بخوبی سمجھ چکے ہیں کہ ہمارے منصف مزاج فرماں روا حضرت مسیح علیہ السلام کی تعلیم "دروازہ کھٹکھٹا اور وہ تجھ پر کھولا جائے گا" پر شدومد کے ساتھ کاربند ہیں اور ہم سے بھی اسی تعلیم کی پیروی کرانا چاہتے ہیں۔ ہم افسوس کے ساتھ لکھتے ہیں کہ مسلمان اس سبق کو کبھی نہ بھولیں گے۔ اور جب تک ان پر دروازہ کھولا نہ جائے گا۔ وہ اسے برابر کھٹکھٹاتے رہیں گے۔ خواہ دروازہ کھلنے پر ان پر گولیوں کی بوچھاڑ یا پھولوں کی بارش ہو لیکن اگر اس سے مراد مسلمانان کانپور کے احساس و جوش کا عدم ثابت کرنا ہے تو ہم ہز آنر کا ذہن ان عذرات کی طرف منتقل کراتے ہیں جن پر ہز آنر کے تفقد ذہن نے توجہ نہ فرمائی تھی اور اگر اس وقت وہ مسلمانوں کے زخمی دل کو ملاحظہ نہ کر سکتے تھے تو اس وقت تو شہداء کے دہان زخم سے ضرور فریاد سنتے ہوں گے۔

شہیدوں کی خونیں چادروں پر جو حیرت ہونی تھی سو ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں سر جیمس میسٹن کی دوسری حیرت پر ہمیں بھی حیرت ہوتی ہے ہز آنر فرماتے ہیں مجھے اپنے افسروں کی انسانیت اور پولیس کے اس طریقہ پر حیرت ہے جس طرح کہ بلوہ فرو ہونے کے بعد انہوں نے مصیبت زدوں کی امداد زخمیوں کو ہسپتال لے جانا اور انہیں ہر قسم کا ممکن اور عارضی آرام دینے میں دل و جان سے کوشش کی اور جس طرح کہ مجسٹریٹ اور سپرنٹنڈنٹ کی ماتحتی میں انہوں نے بے ضرورت بدلہ لینے کے خیال سے اپنے آپ کو باز رکھا۔

ہز آنر کی حیرت بے شک بالکل بجا ہے اور ہمیں خود اس پر حیرت ہے۔ اگرچہ گمان غالب ہے کہ مزید و مفصل حالات کے وصول ہونے پر کم از کم ہماری یہ حیرت قائم نہ رہے گی لیکن جن افسروں اور پولیس والوں نے کچھ عرصہ قبل بے ضرر اور نیک نیت ہنگامہ کو اشتعال دلایا اور ان نہتے سادہ لوح فدائیان مذہب کو اشتعال دلا کر اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ ان افسروں اور پولیس والوں سے ہمدردی اور انسانیت کا ظہور ہونا یہ ہونا نہ صرف ادائیگی فرض منصبی سے خارج فعل تھا بلکہ ایسی صفات کا اظہار تھا جو صرف بے نفس اور دردمند بندگان خدا کی طبیعتوں میں مضمر ہوتی ہیں۔ کیا اس تقریر کو پڑھ لینے کے بعد ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہز آنر کو حیرت نہ ہوتی اور ہمیں بھی تقلید کو وہ ان کی زحمت نہ اٹھانی پڑتی اور محلہ بالا افسران و بالیان پولیس شہیدوں اور زخمیوں کی لاشوں کو عبرت دلانے کے لیے سڑک پر پڑے رہنے کے لیے چھوڑ دیتے جس طرح سے کہ بلقانی اتحادی ترک شہیدوں کی لاشوں کو بے گور و کفن اور زخمیوں کو سسک سسک کر دم توڑنے یا بھوک اور تکلیف سے جان بحق ہونے کے لیے راستوں پر چھوڑ جاتے تھے۔ اگر سر جیمس میسٹن بہادر اپنے افسروں کی اس قدر شائستگی و انسانیت ہی پر حیرت زدہ ہو گئے ہیں تو ہم خیال کرتے ہیں کہ مریضوں کی مرہم پٹی اور قیدیوں کے سلوک پر اور بھی زیادہ حیرت زدہ ہوں گے۔

ہز آنر نے تقریر کا ختم دعا پر کیا ہے جس میں آگرہ کے متعلق یہ خواہش کی گئی ہے کہ وہاں اسی قسم کا کوئی حادثہ پیش نہ آئے ہم کو ہز آنر کی اس دعا سے کلی اتفاق ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی دعا ہے کہ آگرے کی کسی مسجد کا وہ حشر نہ ہو جو کانپور کی مسجد مچھلی بازار کا ہوا۔

مسلمانوں کا وفد ہز آنر کی خدمت میں

سہ شنبہ - ۱۹ر اگست ۱۹۱۳ء

ایک وفد بسرکردگی راجہ صاحب محمود آباد - ۱۶ر اگست کو ۱۱ بجے ہز آنر لفٹیننٹ گورنر صوبجات متحدہ کی خدمت میں بمقام گورنمنٹ ہاوس لکھنؤ حاضر ہوا - اور مسجد کانپور کے متعلق حسب ذیل ایڈریس پیش کیا -

ہم جن کے دستخط ذیل میں ثبت ہیں، صوبجات متحدہ آگرہ و اودھ کے مسلمانوں کی طرف سے مسجد مچھلی بازار کانپور کے متعلق حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں -

قبل اس کے ہم اس سوال کے مختلف پہلوؤں سے بحث کریں جس کے متعلق ہم گفتگو کرنا چاہتے ہیں ہم یہ بیان کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم حضور کی خدمت میں ان ذمہ داریوں کو پورے طور پر سمجھ کر حاضر ہوئے ہیں - جو ہماری قوم اور ہز گورنمنٹ کی طرف سے ہم پر عائد ہوتی ہیں جس مسئلہ کو ہم حضور کی توجہ کے لئے پیش کرنے والے ہیں اس کی زبردست اہمیت کا لحاظ کرکے ہم نے یہ ذمہ داری اپنے اوپر لی ہے ہمارا یقین ہے کہ اگر اس نازک موقع پر ہم نے اپنی قوم کے جذبات کی ترجمانی نہ کی تو ہم اپنی قوم کے فرض اور گورنمنٹ کی وفاداری میں قاصر رہیں گے - اس قسم کے اہم امور پر لحاظ کرکے ہم نے حضور سے ایک وفد کے منظور کرنے کی درخواست کی اور ہم حضور کی عنایت آمیز اجازت کے ممنون ہیں - جس کی وجہ سے ہم حضور تک آج پہنچ سکے -

ہم سب سے پہلے حضور کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ مسجد زیر بحث کے قریب والے مندر کی خوش قسمتی پر ہماری قوم کو کوئی رشک نہیں ہے - ہماری قوم نے اس خیال کی بہت سخت مخالفت کی ہے کہ مندر کا بچ جانا اشتعال طبع کا باعث ہوا - ہمارا خیال ہے کہ اس کا بچانا ضروری تھا - اور مناسب ہوا کہ وہ بچا لیا گیا -

اب ہم چند الفاظ غفلت اور تساہل کے اس الزام کے متعلق کہنا چاہتے ہیں - جو کانپور کے مسلمانوں پر لگایا جاتا ہے جن کو براہ راست مسجد سے تعلق تھا - بغیر اس مسئلہ کو بحث میں لاتے ہوئے کہ آیا مسجد کا وہ حصہ جو یکم جولائی ۱۹۱۳ء کو منہدم کیا گیا واقعتاً اور قانوناً ۱۹۰۹ء میں حاصل کر لیا گیا تھا - ہم اس التماس کی جرأت کرتے ہیں کہ کافی ثبوت اس امر کے باور کرنے کے موجود ہیں کہ کانپور کی مسلمان پبلک کو اس حصول کے واقعہ کا علم نہیں تھا - زمین محصولہ پر کوئی نشان نہ تو موقع پر لگایا گیا - اور نہ اس زمین کا کوئی نقشہ ہی شائع کیا گیا - پھر ایک انگریزی نقل کی جو کلکٹر کے دفتر میں عوام کے معائنہ کے لئے آویزاں کر دی گئی تھی - اگر یہ آویزاں نقشہ مطالعہ کیا جائے تو اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مسجد کے کسی حصہ کا لینا مقصود تھا - علاوہ ازیں مسجد کے متولیوں کو کوئی اطلاع زیر دفعہ ۹ قانون حصول اراضی نہیں دی گئی - جیسا کہ قریب کی اور عمارتوں کے مالکوں کو دی گئی تھی - بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ اس قسم کے تمام شبہات اس وقت رفع ہو گئے جب کہ نومبر ۱۹۱۲ء میں کانپور کے مسلمانوں نے ہز آنر کے اس ارشاد کو جو ہز آنر نے قوم کے بعض اشخاص سے فرمایا تھا مسجد کلکٹر کا دو نیم ... الیسا بخشا سمجھا - یہ بھی معلوم ہوگا کہ استحصال سے تعلق کانپور میونسپل بورڈ لیعنی کے ممبروں کو بھی ... مارچ ۱۹۱۳ء سے

اجلاس تک کوئی علم نہیں تھا جیسا کہ ذیل کے ریزولیوشن سے ظاہر ہوتا ہے جو بورڈ مذکور کے اجلاس منعقدہ یکم اپریل ۱۹۱۳ء کو پیش کیا گیا۔

"امپروومنٹ ٹرسٹ کمیٹی کی کارروائیوں سے جو بورڈ کے سامنے ۴ مارچ ۱۳ء کو پیش ہوئیں اور جس کے متعلق بورڈ کے ایک ممبر کا اختلاف مسترد کر دیا گیا۔ بورڈ کو یہ معلوم ہوا ہے کہ مسجد مچھلی بازار کی عمارت کا ایک جزو اے۔ بی۔ سڑک کے لئے لیا جا رہا ہے۔ چنانچہ تجویز ہوا کہ مجوزہ حصول اراضی چونکہ مذہبی بنیاد پر قابل اعتراض ہے اور چونکہ ہز آنر لفٹیننٹ گورنر کے ۱۳ نومبر ۱۹۱۲ء والے بیان کی منشا کے خلاف ہے لہٰذا بورڈ کی رائے ہے کہ مسجد کا حصہ مذکور نہیں لیا جانا چاہئے۔ اور بورڈ کی کوئی تحریک جو صاف لفظوں میں یا مبہم طور سے اس حصول کی تائید کرتی ہو نامنظور کی جائے۔

بحث کے بعد اس ریزولیوشن کی اصلاح ہوئی اور مندرجہ ذیل الفاظ میں پاس کیا گیا۔

"یہ کہ ایک سفارش گورنمنٹ میں اس مضمون کی بھیجی جائے کہ اے بی سڑک کی مسجد کا کوئی حصہ مسلمانوں کے جذبات کے لحاظ سے نہ لیا جائے۔

بورڈ کے چیئرمین نے صاحب کلکٹر کے توسط سے ریزولیوشن مذکور کو گورنمنٹ کی خدمت میں بھیج تو دیا مگر ساتھ ہی یہ ریمارک جڑ دیا کہ وہ ریزولیوشن کو پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اس لئے گورنمنٹ نے بورڈ کی سفارش کو منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

بورڈ کے ایک جلسہ منعقدہ ۲۰ مئی ۱۹۱۳ء میں اس امر کی کوشش کی گئی تھی کہ ایک ریزولیوشن کو پیش کر کے مسجد کے دالان کو بچا لیا جائے۔ ریزولیوشن یہ تھا۔ "بورڈ اس امر کی سفارش کرتا ہے کہ گورنمنٹ نہایت مہربانی سے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرے گی"

اس میں چیئرمین نے یہ ترمیم پیش کی کہ بورڈ کی طرف سے اب کوئی نمائندگی نہیں ہونی چاہئے۔ اور یہ کہ گورنمنٹ کے فیصلہ کو قطعی سمجھنا چاہئے" جو پاس ہو گئی اور پہلی تحریک چیئرمین کے زائد ووٹ کی وجہ سے پاس نہ ہو سکی۔ اور جہاں تک کہ بورڈ کا تعلق تھا۔ معاملہ اس دن ختم ہو گیا۔

اس اثنا میں ۸ مارچ ۱۹۱۳ء میں کانپور کے مسلمانوں کا ایک وفد صاحب کلکٹر ضلع کی خدمت میں حاضر ہوا۔ لیکن اس کا کچھ نتیجہ نہیں نکلا۔ اس کارروائی کے بعد شیخ شاہد حسین کے ذریعے سے حضور کی خدمت میں ایک میموریل بھیجا گیا۔ لیکن وہ مئی کی ۲ تاریخ کو مسترد ہو گیا۔ اس کے بعد کانپور کے مسلمانوں کی طرف سے راجہ صاحب محمود آباد کے توسط سے ایک اور میموریل حضور کی خدمت میں بھیجا گیا۔ مگر دالان مسجد کے انہدام کے بعد انہیں اس کا جواب ملا۔ یادداشتوں کے علاوہ ہم نے اپنے دعوے کی صداقت کا اثر یور آنر کے دل پر بٹھانا شروع کیا۔ اس لئے کہ ہمارے علماء کے فتووں نے ہمارے دعویٰ کی تائید کی۔

یور آنر منہدمہ حصہ کے تقدس کا سوال بالکل اسلامی شرع کا قانون ہے موروثی یقین ہماری پشت پناہ ہے۔ علاوہ ازیں ہمارے علماء کے فتوے جو حال ہی میں دے گئے ہیں ہماری تائید میں ہیں۔ انہی باتوں کو مدنظر رکھ کر ہم پورے زور اور متانت کے ساتھ اس امر کی تصدیق کرنا چاہتے ہیں کہ ہم اس بات کا مطالبہ کر سکتے ہیں کہ منہدم شدہ حصہ مقدس تھا۔ اور مسجد کا ضروری جزو تھا۔

ہمیں کچھ شک نہیں ہے کہ یور آنر ہمیں معاف کریں گے اگر ہم مسئلہ کے اس حصہ پر ذرا آزادی اور جوش کے ساتھ گفتگو کریں ہمیں یہ دیکھ کر سخت رنج ہوا ہے کہ پبلک کے روبرو ایسے دلائل پیش کئے گئے ہیں جن سے متنازعہ فیہ مسئلہ کے متعلق ہمارے مذہبی خیالات کی ہتک ہوئی ہے۔ ہم مصلحت وقت کا لحاظ کر کے اس ایڈریس کے دلائل کو باطل ثابت کرنا نہیں چاہتے۔ یور آنر! اگر ہمیں اس امر کی اجازت ہو کہ ہم اس مسئلہ کے ایک پہلو پر اپنے جذبات کی گہرائی کا مقابلہ دوسرے پہلو سے کریں۔ تو ہمیں اس امر کے کہنے میں کچھ تامل نہ ہو گا کہ اس حصہ کے ہمارے

جذبات کو سخت صدمہ پہنچا یا ہے۔

ہم یور آنر کو یقین دلانا چاہتے ہیں کہ اس مسئلے کے متعلق ہماری کمیونٹی کے احساسات انفرادی، مقامی یا مصنوعی نہیں ہیں۔ یکم جولائی ۱۹۱۳ء کو دالان کے انہدام نے جس کے وقوع میں آنے سے بیشتر ہم نہایت خاموشی کے ساتھ حکام سے اس کے بچانے کی کوشش کر رہے تھے ہندوستان کی تمام اسلامی آبادی میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ یہ جذبات اصلی ہیں اور ہمارے مذہبی ایمان کی سخت چٹان پر قائم ہیں ہم کو اس امر کے کہنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اس معاملہ میں کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ہمیں امید واثق ہے کہ یور آنر اس کو تسلیم کریں گے بشرطیکہ آپ بھی اس مسئلہ پر اسی طرح غور کریں جس طرح کہ ہم کر رہے ہیں۔

ہم نے یور آنر کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ تین اگست کے افسوسناک واقعہ سے قبل کر لیا تھا۔ ہم سب ان اندوہناک واقعات پر روتے ہیں لیکن ہم ان معاملات پر رائے زنی کرنے سے احتراز کرتے ہیں۔ کہ اس معاملہ پر باضابطہ طور پر تحقیق و تفتیش ہو گی۔ بہرحال ہمیں بھروسہ ہے کہ ان واقعات کا یور آنر کے فیصلہ پر کچھ اثر نہیں پڑے گا۔

ہم یور آنر سے نہایت ادب اور جوش کے ساتھ التجا کرتے ہیں کہ مسجد کے منہدم حصہ کو دوبارہ تعمیر کر دیا جائے جس کے لئے ہم اور ہماری ساری قوم ہمیشہ آپ کی احسان مند رہے گی۔ ہم کو اس امر کا چنداں یقین دلانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر یور آنر نے وہ حکم صادر کر دیا جس کی ہم سب آپ سے التجا کر رہے ہیں۔ تو اس سے وہ جوش مدھم پڑ جائے گا۔ اور تمام مسلمان کمیونٹی کے زخم مندمل ہو جائیں گے۔ دستخط:۔

مولانا عبدالباری۔ آنریبل راجہ سر محمد علی خاں، خان بہادر کے سی۔ آئی۔ ای۔ (محمود آباد) آنریبل راجہ سید تصدق رسول خاں۔ کے سی۔ ایس۔ آئی۔ (جہانگیر آباد) آنریبل راجہ میر ابو جعفر (پیرپور) خانصاحب نواب محمد اسحٰق خاں۔ خان بہادر نواب محمد مزمل اللہ خاں۔ آنریبل مسٹر سید عبدالرؤف۔ آنریبل مسٹر شیخ شاہد حسین۔ آنریبل خواجہ غلام الثقلین۔ آنریبل مسٹر سید رضا علی۔ مسٹر سید نبی اللہ بیرسٹر ایٹ لا۔ خانصاحب مولوی محمد حبیب الرحمٰن۔ مولوی محمد نسیم صاحب ایڈوکیٹ۔ منشی احتشام علی صاحب۔

(اداریہ)

سر جیمس مسٹن سے التجا

شنبہ ۹ اگست ۱۹۱۳ء۔

کانپور کے روح فرسا حادثہ کے بعد خیال کیا جا سکتا تھا کہ حکام وقت کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ اور بہت سے مسلمانوں کے خون کے معاوضہ میں مسجد مچھلی بازار واپس کردی جائے گی۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہزآنر کو مسٹر ٹائیلر کی خاطر اتنے مسلمانوں کی جانوں سے زیادہ عزیز ہے۔ اور سر جیمس کا تفقہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ علمائے دیوبند، دہلی اور لکھنؤ کے فتاوے کو تسلیم کریں۔ اور اگرچہ قاضیوں نے قائل کردیا مگر ہزآنر قائل ہونا نہیں چاہتے۔

ہم نہیں سمجھ سکتے کہ جمہور مسلمانان اور علمائے اسلام کے ہوتے ہوئے ہزآنر کو کیا ایسی ضرورت پیش آئی کہ لفٹیننٹ گورنر کے فرائض سے زیادہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی مسائل پر رائے زنی کریں۔ اور رائے بھی ایسی کہ کتنے مسلمان شہید کتنے زخمی ہوئے اور سینکڑوں معتوب ہیں۔ مگر کسی طرح اس کی غلطی کا یقین نہیں آتا۔

یہ ہم نے مانا کہ مسجد کی طرف رخ کرنے والوں میں زیادہ تر غیر ذمہ دار لوگ تھے اور جن لوگوں میں زیادہ عقل تھی انہوں نے جلسہ سے قبل اور جلسہ کے بعد یہی یہ کوشش کی کہ کوئی خطرناک صورت نہ پیدا ہونے پائے۔ تاہم کیا ایک ہزار غیر مسلح مسلمانوں کا بے جگری کے ساتھ ایسی شدید بندوقوں کے فائر کے سامنے جس میں گولی چلانے والے اپنے اور بیگانوں کو بھی تمیز نہ کرسکے کھڑا رہنا اور اس وقت تک منتشر نہ ہونا جب تک ان پر سواروں نے حملہ نہیں کیا، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ مسجد کی شہادت کا ان پر ایسا گہرا اثر تھا کہ اس کے مقابلہ میں اپنی جانیں تک انہیں عزیز نہ تھیں۔ مگر ایسے صریح اور بدیہی نتائج کے بعد بھی ہزآنر کو اپنی رائے پر ناز ہے تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ کہاں تک انہیں رعایا کے صحیح جذبات کا اندازہ ہے اور کس حد تک وہ اصول ملک داری سے واقف ہیں۔

دوسری طرف جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہزآنر کو مسٹر ٹائلر کی بے رحمانہ اور قاتلانہ کارروائی میں وہ مجذوبیت اور خوش اسلوبی نظر آتی ہے جو شاید مجنوں نے حسن لیلیٰ میں بھی نہ مطالعہ کیا ہوگا۔ تو ہم کو شبہ ہوتا ہے کہ ہم ہزآنر کے ہاتھوں اپنی دل آزاریوں کی داد پا سکیں گے۔ کیا یہ اسی کا نام ہے کہ ایک بے دست و پا جماعت پر مسلح فوج سے ایسا سخت حملہ کیا جائے کہ اگر آج اسی تعداد میں "فوجوں کا بھی مقابلہ ہوتا تو شاید فریقین کے مقتولین اور مجروحین کی تعداد اس سے زیادہ نہ ہوتی! افسوس ہے اس قوم پر جس کے مسٹر ٹائیلر جیسے افراد اپنے افسروں کی زبان سے شجاع اور بہادر کا خطاب پائیں گے۔ اگر شجاعت و بہادری کا یہی معیار ہے تو آئندہ برٹش قوم کو امید منقطع کر دینا چاہیے کہ اس میں [illegible] کے بعد نیلسن اور ولنگٹن جیسے لوگ پھر پیدا ہو سکیں گے۔ اور اگر انصاف اسی کو کہتے ہیں جس کی تعریف میں ہزآنر کا قیمتی وقت [illegible] تشریف لے گئے اور عالم بے خودی میں کھڑے ہوتے ہی منصور وار انا الحق کہا تھے تو یاد رکھنا چاہیے کہ ایک ایسا بھی انصاف کرنے والا ہے جس کے روبرو ہم کو اور ہزآنر دونوں کو جواب دہی کرنا ہوگی۔ جس کا انصاف مصلحت وقت اور [illegible] کی پابندیوں سے آزاد اور افسر و ماتحت کی نہ پرواہ کرنے والا اور سخت گرفتار کرنے والا ہے۔ واللہ شدید ذو انتقام۔

ل ہزآنر ہی اس کے ذمہ دار لوگوں پر [illegible] جو ان لوگوں کو غیر ذمہ دار کہتے ہیں۔

ہم سر جیمس سے پھر درخواست کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات کے اندازہ کرنے میں زیادہ دانشمندی کو کام میں لائیں اور کسی ایک افسر کی غلطی پر سے بیسیوں مسلمانوں کے ساتھ حکومت برطانیہ کے انصاف کا بھی خون روا نہ رکھیں۔ ہم کو قوی امید ہے کہ ہز آنر ہماری التجاؤں پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔ اور اس قسم کے معاملات کو سرسری نگاہ سے نہ دیکھیں گے۔ اگر اس کے بعد بھی ہز آنر نے مسلمانوں کی دلی خواہش کو معدوم کر دیا اور ان کے صحیح جذبات کو دریافت کرسکے تو ہم سمجھیں گے کہ بیس مسلمانوں کی جانیں بے سود ضائع نہیں ہوئیں۔ اور ہم کو ان کا خون بہا مل گیا۔ ورنہ ۔ ع

جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے تو اس بت سے خدا سمجھے

ہم غریبوں کو نہ پہلے تھا نہ اب ہے انکار
کہ ہر اک شہر میں ہے آپ کے انصاف کی دھوم

یہ بھی تسلیم ہے ہم کو کہ یہ جو کچھ کہ ہوا
اس میں ملحوظ رہے عدل کے آداب و رسوم

آپ قانون کی حد سے نہ بڑھے یک سرِ مو
فیر کا حکم دیا آپ نے جب بڑھا ہجوم

گولیاں کھا کے جو گرتے تھے جوانانِ متین
سب یہ کہتے تھے قیامت ہے کہ جھڑتے ہیں نجوم

گولیوں کے تھے نشاں منبر و محراب پہ بھی
بسکہ درکار ہیں مسجد کے لئے نقش و رسوم

جابجا خون سے مسجد ہے نگاریں اب تک
یہ وہ صنعت ہے کہ تا حشر نہ ہوگی معدوم

واقعہ یہ ہے غرض کوئی نہ مانے نہ سہی
"آپ ظالم نہیں زنہار، پہ مظلوم ہیں ہم

سرجیمس مسٹن کے نزد متمیز مسلمانوں کا وفد

ہز آنر کا جواب

پنجشنبہ - ۱۲ اگست ۱۹۱۳ء -

مسلمان معززین کا ایک وفد ہز آنر لفٹیننٹ گورنر کی خدمت میں ۱۶ اگست کو بمقام گورنمنٹ ہاؤس (لکھنؤ) حاضر ہوا - وفد میں راجہ صاحب محمود آباد ، راجہ صاحب جہانگیر آباد - مولانا عبدالباری ، آنریبل مسٹر عبدالرؤف ، آنریبل مسٹر شاہد حسین ، آنریبل مسٹر رضا علی - مسٹر سید نبی اللہ ، مولوی محمد حبیب الرحمان خاں - مسٹر محمد نسیم اور منشی احتشام علی شامل تھے -

آنریبل راجہ صاحب محمود آباد نے ایڈریس کو پڑھ کر سنایا - اور اس اثناء میں وہ بہت متاثر نظر آتے تھے -

ایڈریس کے اختتام پر مسٹر سید نبی اللہ خاں نے کہا کہ میرے خیال میں عدالت ہائے دیوانی کے ذریعہ مہاراجت ہی اچھا مقدمہ در پیش ہے

مسٹر عبدالرؤف نے اس کے بعد یہ کہا کہ ہم یہاں دیوانی یا فوجداری قانون کے مطابق اپنے حقوق پر بحث کرنے نہیں آئے ہیں - اس وفد کا مقصد یہ ہے کہ ہز آنر کی خدمت میں ایک ایڈریس پیش کیا جائے تاکہ لفٹیننٹ گورنر حال کے واقعات پر قطع نظر کر کے مسلمانوں کے جذبات پر خیال اور مذہبی راستوں پر غور کریں -

مسٹر رضا علی نے عبدالرؤف کی تائید کرتے ہوئے کہا کہ میں نکتہ پیش کرتا چاہتا ہوں کہ آیا دالان مسجد کا اصلی اور ضروری جزو ہے یا نہیں اسلامی شرع میں "ضروری جزو" کے الفاظ نہیں پائے جاتے - بلکہ تمام مسجد یکساں طور پر متبرک و مقدس سمجھی جاتی ہے خواہ وہ غسل خانہ ہو یا ہیں یا نہ - اس لئے مسجد کے کسی حصہ پر قبضہ حاصل نہیں کیا جا سکتا -

راجہ صاحب جہانگیر آباد اور مسٹر شاہد حسین نے کہا کہ ہم سب مرحمت خسروانہ کے خواستگار ہیں -

ہز آنر لفٹیننٹ گورنر نے ایڈریس کا جواب دینے سے پیشتر وفد کی توجہ چند نقشوں کی طرف مبذول کراتے ہوئے کہا کہ ان کے متعلق اخبارات میں غلط فہمیاں پھیل گئی ہیں - نقشے ہر ممبر کو فرداً فرداً انہوں نے دکھلائے -

سرجیمس میسٹن — کی تقریر

پنجشنبہ ۱۲ اگست ۱۹۱۳ء

حضرات جس طریقہ سے آپ نے میرے سامنے مچھلی بازار کانپور کی مسجد کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے - میں اس کا نہایت گرم جوشی کے ساتھ شکریہ ادا کرتا ہوں - جو رویہ کہ آپ نے اختیار کیا ہے وہ نمایاں طور پر اس غیر معتدل زبان درازی اور واقعات کی غلط بیانی کے طریقہ سے بالکل مختلف ہے - جس روش پر کہ پریس کے بعض طبقات نے اس پر بحث کی ہے - میرے لئے یہ امر سخت افسوس کا

ہے کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی جماعت گورنمنٹ اور اس کے افسروں کی نسبت ایسا بُرا خیال رکھے نہیں بلکہ یقین رکھئے کہ ہم نے ان کے منسوب کردہ خیالات کی بناء پر یہ کارروائی کی ہے اور یہ کہ ہم ان کے جذبات اور مراسم کی طرف سے بالکل غافل ہیں۔ یہ امر ان اخباروں نے فرض کر لیا ہے اس لئے میں آپ کا مشکور ہوں کہ آپ نے آج موقع دیا ہے کہ ہم اپنی کارروائیوں اور اپنے خیالات کو صحیح روشنی میں پیش کریں۔ جس طرح سے کہ آپ نے اعتدال اور آزادی کے ساتھ مجھے مخاطب کیا ہے اسی طرح میں بھی آپ کے ساتھ صفائی قلب کے ساتھ گفت و گو کروں گا۔ اور غسل خانہ کے انہدام کی وجوہات مختصراً بیان کروں گا۔ تین چار سال قبل ۱۹۰۹ء کانپور میں اس امر کا سب کو علم تھا کہ ایک نئی سڑک مچھلی بازار کے علاقہ میں سے گزرے گی جس سے بہت سی عمارتیں لازمی طور پر منہدم ہو جائیں گی۔ اور کچھ شبہ نہیں کہ جو لوگ ان عمارتوں میں تعلق رکھتے تھے وہ بہت دلچسپی کے ساتھ اسکیم کی رفتار کو دیکھتے رہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ۱۹۰۹ء کے ماہ مارچ میں حکام کی خدمات میں ایک میموریل ارسال کیا گیا جس میں ایک دوسرے راستہ کا مشورہ دیا گیا تھا۔ اور ضمناً اس امر کا بھی ذکر کر دیا گیا تھا کہ اسے جی سڑک (جیسی کہ اس وقت تجویز کی گئی تھی) تین مساجد اور دو مندروں کے انہدام کا باعث ہو گی۔ میں اس واقعہ کا ذکر یہ ظاہر کرنے کے لئے کرتا ہوں کہ کوئی شریف آدمی یہ بہانہ نہیں کر سکتا کہ اہل کانپور مجوزہ کام سے تعلق یا دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ سڑک کی داغ بیل کو پورے طور پر ڈالنے کے بعد نقشے پبلک کے معائنہ کے لئے معمولی طریقہ سے پیش کر دئے گئے۔ میں سڑک کے ایک نقشہ کی نقل آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔ اس کا معائنہ کرنے پر آپ دیکھ سکیں گے کہ صحن مسجد کا ایک حصہ و نیز غسل خانہ لئے جانے کی تجویز کی گئی ہے۔ مسجد اراضی نمبر ۹۰ میں واقع ہے اور جیسا کہ پیمائش کرنے سے معلوم ہوا ہے اس کا کچھ حصہ اراضی نمبر ۸۹ میں بھی آتا ہے۔ اس معاملہ کے متعلق آپ کے میموریل میں جو ریمارک کئے گئے ہیں نیز بعض بعض غلط بیانات جو سڑک کی داغ بیل کے متعلق شائع ہو گئے ہیں۔ بالضرورت نقشہ کے غلط پڑھنے پر مبنی ہیں۔ اس یقین کا دوسرا ثبوت کہ لوگ جانتے تھے کہ مسجد کا ایک حصہ لیا جائے گا۔ اور اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کی گئی۔ یہ ہے کہ نومبر ۱۹۱۱ء میں مسجد کے متولیوں نے میونسپل بورڈ کو ایک متصل مکان کی فروخت کی نسبت ایک درخواست پیش کی جو اراضی نمبر ۸۹ کے باقی ماندہ حصہ پر واقع تھا۔ اس درخواست سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس مکان کی مغربی دیوار، صحن مسجد کے احاطہ کی مشرقی دیوار تھی۔ مکان کی فروخت اور اس کے عملہ کے ہٹانے کا مطلب متولیوں کے الفاظ کے مطابق مسجد کی شہادت تھا۔ انہوں نے اس لئے دیوار قائم رکھنے کی اجازت دے دی۔ مسٹر ادھو بہاری لال نے جو زمین حاصل کرنے کے کام پر خاص طور پر متعین تھے، موقع کا معائنہ کیا اور ایک تحریری رپورٹ لکھ دی کہ دیوار کو فی الحال چھوڑ دینا چاہئے اس لئے کہ اس حصہ کی اس وقت ضرورت ہو گی جبکہ غسل خانہ لے لیا جائے گا۔ ان کاغذات کو کمیٹی کے روبرو رکھ دیا گیا۔ اس لئے کہ شہر کی ترقی و تزئین کا کام اسی کمیٹی کے متعلق تھا۔ اس کی ساری کارروائیاں میونسپل بورڈ کے روبرو پیش کر دی گئیں۔ ان دونوں جماعتوں میں مسلمان اصحاب تھے اور اس لئے یہ کہنا مشکل ہے کہ مسلمان ان دونوں امور سے واقف نہیں تھے۔ کہ مسجد کی شرقی دیوار کا تعلق مسجد سے کچھ بھی نہیں ہے اور یہ کہ عمارت کا وہ حصہ سڑک کے لئے لیا جائے گا۔ مگر مجھے اس امر سے کچھ تعلق نہیں ہے کہ مضمون مذکور کے متعلق اسلامی پبلک کا کیا خیال تھا۔ یہ امر بالکل بدیہی ہے کہ مسجد کے متولی جن سے پہلے پہل ہمیں معاملہ طے کرنے کی ضرورت تھی واقعہ سے پورے طور سے باخبر تھے اور ہمارے پاس کوئی ایسا ریکارڈ موجود نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ مجوزہ قبضہ کے خلاف کوئی اعتراض کیا گیا تھا۔

نومبر ۱۹۱۲ء میں میں کانپور گیا اور بذات خود تیل کے مندر کے موقع کو جس کے انہدام کے برخلاف مجھے متعدد احتجاج وصول ہو چکے تھے ملاحظہ کرنے گیا۔ اور لازمی طور پر مسجد سے چند گز کے فاصلہ پر کھڑا ہوا مجھے یاد ہے کہ نہ خود میں نے مسجد کو دیکھا۔ اور نہ کسی نے میری توجہ

اس جانب طرف منعطف کی۔ یہ ممبران بورڈ و دیگر عمائدین کانپور میرے ہمراہ تھے۔ اور جہاں تک میرا حافظہ کام کر سکتا ہے وہاں جس قدر گفت و گو ہوئی، آزادانہ اور عام دلچسپی کی باتوں پر ہوئی۔ باایں ہمہ کسی نے مسجد کا ذکر تک نہ کیا۔ اور نہ اس کے متعلق کسی قسم کی شکایت کا اظہار کیا۔ مگر ہاں اس کے بعد جب مجھے ممبران بورڈ سے ٹرکٹ ہاؤس میں ملاقات کرنے کا اتفاق ہوا۔ تو جلسہ برخاست ہونے پر ایک مسلمان ممبر نے مجھ سے سوال پوچھا جس کے صحیح صحیح الفاظ مجھے یاد نہیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ اس نے یہ امر دریافت کیا کہ آیا مندر کو بچا دینے کی صورت میں جب سڑک کے نقشہ میں رد و بدل کی جائے گی تو اس کے سبب کسی مسجد کو تو ضرر نہیں پہنچے گا! بظاہر سڑک پر دو مسجدیں تھیں، ایک اس کنارے پر اور ایک اس کنارے پر۔ مجھے اس بات کی نسبت پہلے کچھ علم نہیں تھا۔ اور ان صاحب کو جواب دینے سے پہلے ممبر صاحب صدر بورڈ سے استصواب کرنا ضروری تھا۔ صاحب موصوف نے جواب دیا کہ اگرچہ مسجدوں میں سے ایک کا غسل خانہ حاصل کرنا کسی صورت میں بھی رک نہیں سکتا۔ مگر سڑک کے نقشہ میں جو تبدیلی ہم نے کی ہے اس سے مسجدوں میں کوئی زبردست اندازی نہیں کی جائے گی بنا بریں میں نے سوال کرنے والے صاحب کو نفی میں جواب دیا۔ بعد میں جو نقشے مرتب ہوئے، ان سے بوضاحت پایا جاتا تھا کہ مندر کو بچا دینے کی صورت میں مسجد سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جائے گا۔ صورت حال یہ ہے کہ ایک چوڑی سڑک کو دو تنگ شاخوں میں تقسیم کرنے سے معلوم ہوا کہ ممکن ہے کہ احاطہ مسجد میں جس کا حاصل کیا جانا ابتدائی نقشہ میں قرار پایا تھا۔ کمی واقع ہو۔ پس فیصلہ یہ ہوا کہ نہانے دھونے کی جگہ تو حاصل کی جائے۔ لہذا یہ امر کہ مندر کو مسجد کے ایک بڑے حصے کی گرانے سے بچا دیا جانا قرار پایا۔ غلط ہے۔

صاحبان، جب پہلے پہل مسجد کے متعلق عمل درآمد شروع ہوا تو یہ سب امور میرے اور مقامی حکام کے پیش نظر تھے۔ ان سے ظاہر تھا کہ در اصل کوئی شکایت نہیں تھی۔ اور نہ تو مذہب میں دست اندازی کا شکوہ تھا۔ اور نہ ایک نہایت ضروری تمدنی اصلاح میں رکاوٹ ڈالنے کا منشا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ وہ اصحاب جن کو براہ راست مسجد سے تعلق نہ تھا۔ ان تجاویز سے واقف تھے، اور مقامی حکام کے ارادہ کو منظور کر چکے تھے۔ کہ عمارت کا وہ حصہ جو مشرقی اور شمالی دیوار کے درمیان واقع تھا حاصل کر لیا جائے۔ جس میں نہ تو مسجد میں مداخلت ہونے کا خدشہ تھا۔ اور نہ نمازیوں کو کسی قسم کی دقت پیش آنے کا اندیشہ تھا۔ پس جب اواخر مارچ اور اوائل اپریل میں مجھے کاغذات احتجاج آنے لگے تو میں سخت کشمکش و پیچ میں ہوا کہ صورت حالات میں ایسی تبدیلی کیوں کر واقع ہوئی ہے۔ مجھے آپ کے اس اطمینان دلانے سے خوشی ہوئی ہے کہ اس تبدیلی کا باعث کوئی حسد یا بغض نہیں تھا جو ہنود کے مندر بچ جانے پر مسلمانوں میں پیدا ہونا ممکن تھا۔ اگر بعض مسلمان اصحاب کی ناراضگی کا باعث ایسا خیال ہوا ہے تو مجھے وجہ نہایت افسوس ہے۔ لیکن اگر غیر متوقع احتجاجات کے ظہور کا یہ سبب نہیں تھا تو آخر کوئی اور ہوگا۔ میرے دل میں احساسات کی یاد تازہ ہی تھی کہ لکھنؤ میں بھی ایک مسجد کی عمارت میں اسی قسم کی خفیف سی تبدیلی کی گئی تھی۔ مگر وہاں کے مسلمانوں نے بلا حیل و حجت اسے منظور کیا۔ مجھے تو اس قسم کے بہت سے نظائر یاد ہیں۔ اور آپ کو بھی یاد ہوں گے۔ نظر بریں حالات کانپور میں جو ایسی ہی مدنی اصلاح تجویز ہوئی تو کیا وجہ ہے کہ اس پر اعتراضوں کی بوچھاڑ کی گئی؟ کیا نہانے دھونے کی جگہ مسجد کے اس حصہ میں زیادہ مقدس تھی جو لکھنؤ یا دوسرے مقامات میں دوسری جگہ پر منتقل کیا گیا؟ کیا وضو خانوں سے کوئی خاص مذہبی خیال وابستہ ہے؟

صاحبان! یقین کیجیے کہ اس امر میں میں نے خود ہی کوئی نتیجہ نہیں نکال لیا۔ یہ امر صحیح ہے کہ میں نے علمائے اسلام سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ جیسے کہ اب معاملہ کے بگڑ جانے سے کر رہا ہوں۔ اور جس کا جواب کسی نے کچھ اور کسی نے کچھ دیا ہے۔ مگر میں نے بعض مسلمان عمائد سے مشورہ کر لیا تھا۔ جو خود پرانی وضع کے مسلمان ہیں۔ اور اپنے ہم خیال مسلمانوں کے نمائندے ہونے کے باعث پورے طور سے معتبر خیال کیے جاتے ہیں۔ ان حضرات نے

مجھے مطلع کیا کہ وضو خانہ یا استنجہ خانہ ایسا مقدس نہیں جیسے کہ مسجد کی جائے عبادت ہوتی ہے ۔ مقامی تحقیقات سے بھی اس امر کی تصدیق ہوئی اور مسجد کے حصہ متنازعہ میں لوگوں کا جوتی سمیت جانا حسیات کی مزید شہادت ہے ۔ میں باوجود ان تمام مخلوں کے جو اس شہادت پہ اخبارات میں کئے گئے ہیں ۔ اس کو معتبر خیال کرتا ہوں ۔ اور اگر آپ ٹھنڈے دل سے معاملات پر غور کریں تو قطع نظر اس قسم کے اصطلاحی نکات کے کہ مسجد کے ایک حصہ میں جوتی سمیت جا سکتے ہیں اور ایک حصہ میں انہیں اتارنا ہوتا ہے ۔

آپ بھی میری رائے سے اتفاق کریں گے ۔ اوسط درجہ کا انسان تو یہی خیال کرے گا کہ ان دونوں حصوں میں بہ اعتبار تقدس فرق ہے ۔ جو تقدس ایک حصہ کو حاصل ہے وہ دوسرے کو نہیں ۔ قطع نظر شرعی موشگافیوں کے فہم عامہ میں تو یہی بات آتی ہے اور حکام نے بھی نہانے دھونے کی جگہ کی نسبت یہی خیال ملحوظ رکھا ہے ۔ آپ کی عرضداشت سے پایا جاتا ہے کہ گورنمنٹ کے کسی الفاظ نے مسلمانوں کی اتنی دل شکنی نہیں کی جتنی کہ اس فقرہ نے کہ نہانے دھونے کی جگہ اور دیگر حصص کی پاکیزگی میں فرق ہے ۔

میں اس سے بڑھ کر اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ یہ بیان محض نیک نیتی پر مبنی تھا ۔ اور اس کی تائید طرز قدیم کے بہتر سے مسلمان بزرگوں نے کی تھی ۔ اور اس سے ہرگز یہ مقصود نہیں تھا ۔ کہ آپ کے مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچایا جائے ۔ آپ میں سے اکثر حضرات میری خصوصیات طبع سے واقف ہیں اور بنابریں یہ وثوق ہے کہ آپ میری بات پر یقین کریں گے ۔

میں اس درخواست کی طرف متوجہ ہوتا ہوں جس پر آپ کا میموریل ختم ہوا ہے اور وہ درخواست یہ ہے کہ منہدم شدہ غسلخانہ کی دوبارہ تعمیر کا حکم دے دوں ۔ جیسا کہ میں نے آپ سے کہا ہے ۔ میں ہمیشہ مستعد رہا ہوں اور اب بھی مستعد ہوں کہ مسجد کو شمال کی طرف سے ایک ٹکڑا زمین کا پوری قانونی کاروائی اور وقعت کے اصول کے مطابق دے دوں ۔ اور یہ ٹکڑا غسل خانہ کے لئے کافی سے زیادہ ہوگا ۔ ساتھ ہی اس کے میں اس رقبہ پر غسل خانہ تعمیر بھی کرا دوں ، یا متولیوں کو اس تعمیر کے لئے کافی ذیادہ روپیہ دے دوں ۔

میری طرف سے یہ پیشکش پہلے سے ہو چکی ہے ۔ اور اب بھی موجود ہے ۔ اگر آپ کی درخواست کا یہ منشا ہے کہ غسل خانہ اس سرزمین پر تعمیر کیا جائے جو حاصل کر لی گئی ہے ، تو مسئلہ کی حیثیت بالکل بدل جاتی ہے ۔ اگر ہم چند ہفتہ پہلے بیٹھے ہوتے اور معاملہ پر ایسے ہی بحث کرتے جیسے کہ آج کی ہے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا نتیجہ ہوتا ۔ لیکن صورت معاملہ ۳ ؍ اگست کے واقعہ کے بعد بالکل دور ہو جاتی ہے ۔ اور میں افسوس کرتا ہوں کہ اس قسم کا کوئی حکم دینا میرے لئے ناممکن ہے ۔ افسوس کا اظہار میں نے از راہ تصنع نہیں کیا ہے ۔ اس لئے کہ میں آج اپنے پاس بہت بڑے دوستوں کو بیٹھا دیکھتا ہوں ۔ جن ہندوستانی کی رائے کی میں بڑی قدر کرتا ہوں ۔ اور جن کی نصیحتوں کو میں دس میں سے چار مان لونگا ۔ لیکن اس معاملہ میں مجھے وسیع انتظامی امور کا لحاظ کرنا ہے جو قانون اور ضابطہ کے قیام کے لئے ضروری ہیں ۔ اور جن کی فروگذاشت کو بدنظمی اور اندھیر کہیں گے ۔ آپ لوگوں کی طرح میں بھی ۳ ؍ اگست کے حادثہ پر بحث نہیں کر سکتا ۔ جو عدالت کے زیر غور ہے ۔ اگرچہ میں بہت صداقت کے ساتھ آپ ہی لوگوں کی طرح جانوں کے تلف ہونے اور مصیبتوں پر افسوس کرتا ہوں ۔ لیکن بغیر اس کے عدالتی تحقیقات کے نتائج پر کہ پیشین گوئی کی جائے یہ میرا فرض ہے کہ اس اصول کو مدنظر رکھوں کہ گورنمنٹ زور و زبردستی کی باتوں کو نہیں مان سکتی یا ان کے ماننے کو ظاہر نہیں کر سکتی ۔

صاحبان ! اب میں آپ سے امداد طلب کرتا ہوں آپ پر روشن ہے کہ حکومت برطانیہ دیدہ دانستہ تمہاری مقدس عمارات کو تباہ نہیں کرنا چاہتی ۔ اس کے برخلاف آپ کو معلوم ہے کہ گورنمنٹ نے آپ کی ان عمارات مذہبی کو واگذار کیا ہے ۔ اور آپ کے ان آثار قدیمہ

کے لئے تحفظ کا انتظام فرمایا ہے، جنہیں آپ اپنا سرمایۂ ناز تصور کرتے ہیں۔ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس قسم کا خفیف رد و بدل جیساکہ کانپور میں ہوا ہے۔ رعیت کی مدنی ضروریات کی بنا پر ملک کے اکثر حصص میں مسلمان پبلک کی منظوری سے وقوع میں آتا رہتا ہے۔ اس سے ہرگز یہ ہمارا مطلب نہیں ہوتا کہ آپ کی شریعت کی توہین کی جائے۔ بلکہ ان کا مطلب محض رفاہ عام ہوتا ہے۔ اس صوبہ کے مختلف حصوں میں اس قسم کے اکثر نظائر پائے جاتے ہیں۔ جن کا تذکرہ تضیع اوقات ہوگا۔ مگر آپ اور میں بخوبی جانتے ہیں کہ ہماری نشست گاہ سے دو میل کے اندر ایسی نظیر موجود ہے۔ عامہ ناس کے سیرت میں ایسا غیر معمولی انقلاب عظیم کیسے آیا ہے۔ اور کیا وجہ ہے کہ وہی انتظام جسے چند ماہ پہلے لکھنؤ میں بلا مخالفت اور ہی پبلک نے منظور کیا ہے۔ کانپور میں اعتراض قرار دیا جاتا ہے؟

امید ہے کہ ان حالات پر غور کرتے ہوئے جو آج صبح میں نے آپ سے بیان کئے ہیں آپ مجھ سے اس امر میں اتفاق کریں گے کہ تضیہ نامرضیہ کانپور میں مبالغہ، اور غلط فہمی سے کام لیا گیا ہے کہ گورنمنٹ کے فعل سے کڑوڑہا مسلمان رعایا کی مذہبی محسوسات کو صدمہ پہنچا ہے مگر وہ کیا چیز ہے جس نے آپ کے مذہبی احساس کو ضرر پہنچایا ہے۔ کیا اس کی وجہ گورنمنٹ کا کوئی فعل ہے؟ یا گورنمنٹ کے افعال اور ارادوں کی تمسخر انگیز ترجمانی؟ آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم روز افزوں بے چینی کو گھٹانے کی کوشش کریں۔ اور مسلمانوں کے زخم دل پر مرہم لگائیں اس بارے میں جو کچھ معقول بات بھی مجھ سے ہو سکے گی مجھے اس کے کرنے سے دریغ نہیں ہوگا۔ مگر آپ میں اس کام کی اہلیت اور طاقت مجھ سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ یہ امر آپ کے احاطہ استطاعت کے اندر ہے کہ ان مختلف افواہ و غلط بیانیوں کی تردید کریں جو ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل رہی ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ آپ مسلمان پبلک کو صحیح صحیح معاملات سے آگاہ کریں۔ اور ان کو ہدایت کریں کہ اس گورنمنٹ پر اعتماد کرے جس کے قرین دل بجز اس کے کچھ نہیں رہا کہ آپ ترقی اور بہبودی کے وسائل اختیار کرتے رہیں۔

اداریہ

ہز آنر کا جواب

انہدام مسجد مچھلی بازار کے حق بجانب ہونے کے دلایل بیان کرنے کے بعد ہز آنر نے سب سے زیادہ جس بات پر زور دیا ہے وہ یہ ہے کہ چونکہ ۴ر اگست کے واقعہ کے بعد صورت معاملہ بالکل بدل گئی ہے اس لئے مسلمانوں کی کوئی درخواست منظور نہیں ہو سکتی۔ یہ امر کہ صورت معاملہ کیوں اور کیسے بدل گئی ہے۔ اس کے متعلق جہاں تک ہز آنر کی تقریر سے مترشح ہوتا ہے یہ ہے کہ اگر اس واقعہ کے بعد گورنمنٹ نے اپنا حکم واپس لیا تو اس کی کمزوری سمجھی جائے گی۔ غالباً یہ سبق ہز آنر کو تقسیم بنگلہ کی تنسیخ کے بعد حاصل ہوا ہے۔ مگر ہم کو افسوس ہے کہ ہز آنر مسلمانوں کو اس طریقہ سے کچھ اور سبق دے رہے ہیں۔

یہ کہنا کہ گورنمنٹ بزور کسی بات کو نہیں مان سکتی واقعات کو چھپانا ہے۔ ہم نے ۱۲ر دسمبر ۱۹۱۱ء کو دیکھا کہ کس طرح بعض اوقات بڑے سے بڑے حکام بھی زور کو تسلیم کر لیتے ہیں۔ ان چند نفوس میں غالباً ہز آنر بھی ہوں گے جن کو دربار کے اہم تغیرات کا علم پہلے سے تھا۔ مگر معلوم نہیں ہز آنر کی یہ پالیسی کہ "گورنمنٹ کو کسی بات کو بزور نہیں ماننا چاہیئے"۔ اس وقت کہاں سوئے تھے؟ بہرحال ہم یہ سمجھیں کہ جس زور کو گورنمنٹ نہیں تسلیم کرتی وہ اور قسم کا زور ہے۔ اور جس زور کو وہ تسلیم کرتی ہے وہ اور طرح کا ہے؟ ہز آنر کو معلوم رہنا چاہئے کہ اس قسم کی ابلہ فریب اور طفلانہ دلایل کے وہم سے مدت ہوئی کہ ہندوستان آزاد ہو چکا۔ اور حکومت برطانیہ کی لائی ہوئی روشنی میں وہ اب ان کی حقیقت کو بخوبی دیکھ لیتا ہے۔

ہز آنر کا ارشاد ہے کہ اگر چند ہفتے پہلے معاملہ ان کے سامنے پیش کیا جاتا تو وہ نہیں کہہ سکتے کہ کیا جواب ملتا"۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت موافق جواب کے ملنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ مگر کون سی وجہ اب مانع ہے؟ غالباً یہ ہوگی کہ چونکہ مسلمانوں کی ایک تعداد کثیر کا خون پیدا ہو چکا ہے۔ لہذا اب ان کے دعووں کو تسلیم کرنے میں ایک سفاک کی گردن بھی بیچ میں حائل ہے۔ جس کو بچانا ہز آنر اپنا فرض سمجھتے ہیں ورنہ گورنمنٹ یا کسی حاکم کی کمزوری کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔ کہ وہ انصاف سے صرف اس وجہ سے گریز کرنا چاہتا ہے۔ کہ اس کے اقتدار کے کم ہو جانے کا خوف ہے؟ انصاف اور قانون کا اقتدار ہمیشہ اس کے برتنے سے بڑھتا ہے۔ البتہ شخصی اقتدار ممکن ہے کم ہو جائے۔ اور یہاں ہز آنر کو شخصی اور قومی اعتبار کا شاید زیادہ لحاظ ہو بہ مقابلہ قانونی اقتدار کے؟

مسلمانوں کے لئے یہ کہنا کہ وہ کسی بات کو بزور منوانا چاہتے ہیں، ایک صریح بہتان ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ کون سی مسلح پولیس یا نیزہ بردار سوار ان کے ساتھ ہیں جن کے بھروسے پر ڈیپوٹیشن کے ارکان ہز آنر کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے۔ اور جن کے مقابلے میں سینہ تان کر کھڑے ہو جانا۔ ہز آنر نے اپنے لئے فخر سمجھا۔ غریب مسلمانوں کے پاس اس سے زیادہ اور کیا زور ہے کہ:۔

عبث سعی کئے تو مر رہئے میر بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

اور انہوں نے یہ کر دکھایا۔ اگر ہز آنر کا اشارہ اسی زور اور زبردستی کی طرف ہے جس کے مقابلے میں حکومت برطانیہ کے نمائندہ کی حیثیت سے ۲۰ سوار اور پیدل فوج اور لکھوکھا پولیس لا کھڑی کرنا اپنے اقتدار کے لئے ضروری سمجھتے ہیں تو ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ اقتدار

کب تک قائم رہے گا ؟

اے زبردست زیردست آزار
گرم تا کے بماند ایں بازار ؟

ہز آنر کے لئے مناسب ہے کہ ضد اور ہٹ سے باز آجائیں ۔ انصاف کا خون نہ کریں ۔ اور یہ جاننے کی کوشش کریں کہ رعایا ان کے افعال کو کس نظر سے دیکھ رہی ہے ؟

"سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا
کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا"

ہز آنر کی پوری تقریر میں جتنے دلائل انہدام جزو مسجد کے بجا ہونے پر پیش کئے گئے ہیں ان میں سے (اگر الہ آباد کے سرکاری ساز کی آواز کو ہم باور کریں تو) دو دلیلیں بہت زبردست خیال کی جاتی ہیں ۔

۱۔ یہ کہ لکھنؤ میں کسی گمنام مسجد کا ایک حصہ اسی طور پر منہدم کیا گیا مگر کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا ۔

۲۔ یہ کہ غسل خانہ اور وضو خانہ اس قدر متبرک نہیں ہیں جتنا کہ مسجد کے اور حصے ۔ لکھنؤ کی مسجد کے انہدام کے متعلق تو اس قدر کہہ دینا کافی ہوگا کہ معلوم نہیں وہ کونسی مسجد تھی اور کیسی مسجد تھی جس کے دیگر جزو نامعلوم کو منہدم کر کے ہز آنر مساجد کے انہدام کے لئے حجت قائم کرتے ہیں غالباً وہ اس بات سے بے خبر ہیں کہ مساجد کے احترام کے تسلیم کر لینے کے بعد یہ کہنا کہ حکام نے اکثر مسجدوں کو ڈھا دیا ۔ اور کسی نے دم نہیں مارا ان حکام کی بے پرواہی اور زبردستی اور رعایا کی بے بسی اور مجبوری کو ثابت کرتا ہے ۔

ایک لکھنؤ کیا بلکہ ہمارا خیال ہے کہ سینکڑوں مقامات پر مساجد کی اس قسم کی بے حرمتی روا رکھی گئی ہوگی ۔ اور بے زبان رعایا نے بندوقوں اور سنگینوں کے خوف سے دم نہ مارا ہوگا ۔

لکھنؤ یا کسی اور جگہ پر کسی مسجد یا جزو مسجد کو منہدم کر دینا اور اسے سند میں پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے ایک قاتل اپنی بریت میں یہ دلیل پیش کرے کہ وہ اس سے پہلے قتل کا مرتکب ہو چکا ہے ۔ اور کسی نے اس کی گرفت نہیں کی ۔ ہم نہیں سمجھتے کہ سیاست برطانیہ کے حامی سر جیمس مینسٹن اس قسم کے دلایل کو پیش کر کے حکومت کے کس پہلو کو مستحکم کرنا چاہتے ہیں ۔ اور اس سے کہاں تک ان کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے ؟

دوسری بحث تقدس کے مدارج کے متعلق ہے جس کی بابت شاید ہز آنر یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ایک خط ممبر سے صحن مسجد میں ہوتا ہوا دروازہ اور سیڑھیوں تک کھینچا جائے تو جن حصص میں سے یہ خط گذرے گا تو وہ بہ ترتیب درجہ تقدس سے گرتے جائیں گے ۔ حتی کہ جب وہ خط وضو خانہ اور غسل خانہ تک پہنچ جائے گا تو اس کا احترام اتنا کم ہو جائے گا کہ جس وقت ہز آنر چاہیں سم اور ٹائلر جیسے لوگوں کو شہادت اور اپنے اجتہاد پر محض ایک سڑک کی زیبائش کے لئے اسے منہدم کر سکتے ہیں ۔

جس سائنٹفک اصول پر ہز آنر نے تقدس کا معیار قائم کرنا چاہا ہے وہ فلسفیانہ حیثیت سے ضرور قابل داد ہے اور ہز آنر کے مفید مطلب بھی ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ "جاہل" مسلمان تعلیمی حیثیت سے ابھی اس رتبہ پر نہیں پہنچے ہیں کہ خدا کے بنائے ہوئے قانون کے مقابلہ میں ہز آنر کے ایجاد کردہ موازنہ تقدس کے طریقے کو تسلیم کر لیں ۔ کاش کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے مقابلہ اس اصول کو برتنے کی بجائے ہز آنر یورپ کے کسی اکیڈمی کے سامنے یہ فلسفیانہ طریق استخراج تقدس پیش کرتے تو زیادہ داد پاتے ۔

مسلمانوں کے نزدیک احاطہ مسجد کا ہر حصہ ویسا ہی محترم ہے جیسا کہ ممبر اور اس کی ایک ایک اینٹ کو وہ ایسے ہی عزیز رکھتے ہیں جیسے اپنے دل و جگر کو۔ ہز آنر اگر اس کے مقر ہیں کہ ان کے حکم سے لکھنؤ کی کسی مسجد کا حصہ منہدم کیا گیا۔ اور وہ مسجد عام مسلمانوں کی ملکیت تھی تو ہز آنر کو واضح ہونا چاہیے کہ ان کا یہ فعل اس بات کی شہادت میں پیش کیا جائے گا کہ وہ مسلمانوں کی دل آزاری کے درپے ہیں۔ اور اس پر جداگانہ باز پرس کی جائے گی۔ اس لئے کہ ایک خلاف قانون فعل کی سند دوسرے خلاف قانون فعل سے نہیں دی جا سکتی۔

وفد کی درخواست نامنظور کرنے میں ہز آنر نے سب سے زبردست بات جو اپنے نزدیک کہی ہے وہ یہ ہے کہ مسجد کی دوبارہ تعمیر کرا دینے سے گورنمنٹ کی کمزوری ثابت ہوگی۔ شاید انہیں دانادل لارڈ ماری بالقابہ کا یہ قول یاد نہیں ہے کہ سچی طاقت اس بات میں نہیں کہ انسان اپنی کمزوری پر ہمیشہ پردہ ڈالتا رہے۔ اور ڈرتا رہے کہ لوگوں پر اس کی غلطی عیاں نہ ہو جائے۔ ہندوستان میں تو بے چینی کا یہ علاج تھا جو صوبجات متحدہ کے سیاسی طبیب نے کیا۔ مگر اہل آئرلینڈ باوجود اپنی طبعی شورہ پشتی اور عملی ناتوان شکستی کی حکومت خود اختیاری حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ آب و ہوا کا اختلاف یا جغرافیائی حیثیت ہو۔ یا یہ ہو کہ ہز آنر کے وطن سے زیادہ قریب رہتے ہیں۔؟

وفد کو دل شکن جواب دینے کے بعد ستم ظریف سر جیمس نے مسلمانوں سے الٹی یہ درخواست کی کہ وہ اس قدر بے چینی کو رفع کرنے اور شورش کو دبانے میں گورنمنٹ کی مدد کے لئے تیار ہیں۔ مگر اس ہنگامہ کا ہمارے پاس کوئی علاج نہیں ہے جس پر ہز آنر جیسے اعلیٰ عہدہ دار اپنی بزم حکومت کی رونق موقوف سمجھتے ہوں۔ ہز آنر خود تسلیم کرتے ہیں کہ وفد میں ان کے بعض ایسے دوست موجود تھے جن کی دس باتوں میں نو کو وہ تسلیم کرنے کے لئے تیار تھے۔ کیا اس سے نہیں ثابت ہوتا کہ ہندوستان کے ہر طبقہ کے مسلمان اس مسجد کے معاملہ میں متفق ہیں۔ اور خوشی کا مقام ہے کہ بعض ان اصحاب نے بھی جن کے متعلق عام طور پر خوشامد پسندی اور ہاں میں ہاں ملانے کا الزام لگایا جاتا تھا۔ اس موقع پر اخلاقی جرأت سے کام لے کر اپنے فرض کو سمجھا۔ اور بالآخر وہ دسویں بات کہہ ہی گئے جس کے ماننے کے لئے ہز آنر کبھی تیار نہیں ہو سکتے۔ ایسی حالت میں معلوم نہیں سر جیمس کس توقع پر مسلمانوں سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ وہ ان کے ہم آہنگ ہوں۔

تم اپنی خو نہ چھوڑو گے ہم اپنی وضع کیوں بدلیں
سبک سر بن کے کیوں پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو

کانپوری شہید کے گھر میں "پہلی رات"

(شنبہ ۲۳۔ اگست ۱۹۱۳ء)

(نوشتہ مولانا خواجہ حسن نظامی صاحب دہلوی)

کانپور کے اسٹیشن کے پلیٹ فارم بنچ پر دلی کا آستانہ فقیر مغرب سے کچھ پہلے سر جھکائے بیٹھا تھا۔ یہ وہ دن تھا جب کہ کانپور میں ہولناک خون ریزی ہو چکی تھی اور جب کہ الٰہ آباد سے دہلی جاتے وقت یہ فقیر بھی چند گھنٹے کے لیے کانپور ٹھہر گیا تھا۔ اور خون ریزی کے بعد کانپور کے بازاروں میں ایک گشت لگا کر اس وقت اسٹیشن پر آیا تھا۔ ریفرشمنٹ روم میں بکثرت یورپین عورت مرد بچے بیٹھے ہوئے تھے اور پلیٹ فارم کے قلیوں کو دیکھ رہے تھے جو ایک جمگھٹ بنائے بیٹھے کچھ کانا پھوسی کر رہے تھے۔

ایک منظر کو دیکھ کر میں نے مغرب کی طرف نظر اٹھائی، جہاں سورج ڈوب رہا تھا اور لرزتی ہوئی شعاؤں کا ہاتھ بڑھا کر آنے والی رات سے مصافحہ کر رہا تھا۔ اس نظارہ کو جسم کی آنکھوں نے دیکھ کر دل سے کہا تو بھی دیکھ۔ دل اس وقت خود فراموش تھا۔ اس کے کان رات کی آخری باتیں سننے میں مصروف تھے۔ دن نے کہا۔ پیاری کلو۔ میں جاتا ہوں اور دنیا کا چارج تجھ کو دیتا ہوں۔ رات۔ پیلی ڈیرسن خدا حافظ جاؤ۔ مگر حساب کا پرچہ دیتے جاؤ تاکہ میں خدا کے بندوں کے اعمال کا جائزہ لے سکوں۔

دن سکرات کے عالم میں موت کی ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس کے منہ سے فقط اتنا نکلا، اندھیری رات، آج سفید آدمیوں کے اعمال تیری صورت سے زیادہ کالے ہیں تو مجھ سے اعمال نامے نہ مانگ اور کانپوری مظلوموں کے گھروں میں جا جہاں بے قرار جانیں تیری راہ دیکھتی ہوں گی۔ بیوہ عورتیں اکیلی جن کے شوہر مسجد کے سامنے تیغ ستم سے ہلاک کر دئے گئے۔ یتیم بچے باپ کے انتظار میں رو رہے ہوں گے۔ تو جا اور ان سب کو آغوش شفقت میں لے۔

ان کی دلخراش وصیت سنکر رات نے دنیا کی طرف منہ موڑا، اور پہلے تاریکی برسانے والی آنکھوں سے ایک سکوت حیرت کی نگاہ کائنات پر ڈالی۔ جونہی میں نے نماز مغرب کی سنتوں کے بعد دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے رات نے جھک کر میرے قدموں پر سر رکھ دیا۔ سیاہ برقع والی نامحرم کے سر سے میرے پاؤں نے پوچھا تجھ کو جس کی طلب ہے۔ یہ چوکھٹ ظلمات و انوار کے لیے نہیں ہے تو اور کہیں جا۔ اور مجھ کو ساڑھے سات بجے کی ایکسپریس میں سوار ہو نے دے جو دہلی جاتی ہے۔

رات نے اپنے دائیں بازو کا آنچل اٹھایا اور اپنی دھن سیاہ فام کو میرے کانوں کے پاس لا کر کہا دلیل افتادگی کی آبرو ایسی نہیں۔ ہے کہ جسد خاکی کا مقید بشریوں دامن چھڑانے میں کانپوری شہداء کے گھروں میں لے کر چلوں گی اور تم کو چلنا ہو گا۔

نذر عقیدت

میں نے کہا اور یہ بدن جس کو لوگ حسن نظامی کہتے ہیں؟ رات نے ایک قیامت خیز قہقہہ کے ساتھ جواب دیا اس کو گاڑی میں ہٹا کر دہلی بھیج دو۔

ادھر نیچے کرتے۔ لمبے بالوں والا وجود ریل کی کھڑکی کے سامنے کھڑا تھا اور لال پگڑی پر طلائی طرے لگانے والے چار چار تھانہ داروں کی شکی نگاہوں میں کھٹک رہا تھا۔

ادھر شب نو خیز کے ہمراہی تھے جو غریب چھپروں میں جھانک جھانک کر مظلوموں کی آہ و بکا سن رہے تھے

ادھر ریل روانہ ہو گئی اور پولیس کے دستے گھورتے کے گھورتے رہ گئے ادھر پھر اپنی میزبان رات کے ہمراہ ایک گھر میں داخل ہوا۔ جہاں چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اور دو عورتیں ٹوٹے ہوئے بورے پر بیٹھی تھیں ان میں ایک بڑھی تھی اور ایک جوان۔ مگر دونوں متفکر اور سراسیمہ معلوم ہوتی تھیں۔ دروازے کی آہٹ پر کان لگے ہوئے تھے جہاں ذرا کھٹکا ہوا۔ اور بڑھیا نے کہا۔ کون بیٹا جمن۔ مگر کوئی جواب نہ دیتا تھا۔ آخر ایک دفعہ دروازے میں کوئی شخص دو بچوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے داخل ہوا اور بولا لو یہ بچے تمہارے حوالے بڑی کوشش اور پوچھ گچھ کے بعد اٹھا تو معلوم ہوا کہ میاں جمن مار ڈالے گئے۔ مگر لاش کا پتہ نہ چلا۔ کوئی کہتا ہے سینکڑوں آدمی مرے ہیں اور گولی چلانے والوں نے بدنامی کے ڈر سے لاشیں دریا میں پھینک وادیں ہیں فقط پندرہ سولہ کا مرنا ظاہر کیا ہے۔ کوئی اس کے خلاف کہتا ہے غرض ہم نے تو اپنے منظور کے موافق بہتیرے جتن کر لئے مگر کچھ پتہ نہ چلا۔ ایک صاحب گھوڑے پر سوار جا رہا تھا۔ میں نے اس کو آواز دی ذرا ٹھہرنا۔ اس نے گھوڑا روک لیا میں نے کہا یہ دو بچے ہیں ان کا باپ آج کی لڑائی میں مارا گیا ہے۔ اس کی لاش مل جانی چاہیے۔ صاحب نے آنکھ نکال کر میرے ایک کوڑا مارا اور کہا ہٹ جاؤ کتے کے موافق آدمی۔ وہ کوڑا میرے تو لگا نہیں۔ ان غریب بچوں پر پڑ گیا اور بیچارے بلبلا گئے اور صاحب گھوڑا بڑھا کر چل دیا۔

یہ قصہ سنکر بڑھیا عورت نے چھاتی پیٹنی شروع کی اور ہائے ہائے میرا جمن کہہ کر ماتم کرنے لگی۔ جوان عورت نے چوڑیاں توڑ ڈالیں اور نوحہ و زاری میں شریک ہو گئی۔ بچے یہ سماں دیکھ کر سہمے ہوئے کھڑے تھے۔

آخر ایک بچہ ست اپنی دادی کے گلے میں ہاتھ ڈال دئے اور بے اختیار رونے لگا۔ دوسرا اپنی ماں کو چمٹ گیا۔

فریاد

بڑھیا عورت نے فریاد شروع کی۔ الٰہی میرا اکلوتا لال کہاں بچھڑ گیا۔ اب میں اس کی جوان بیوی اور ان چھوٹے چھوٹے بچوں کو کیونکر پالوں گی۔ گھر میں تو فجر کے لیے بھی کچھ کھانے کو نہیں ہے۔ جب یہ بچے صبح روٹی مانگیں گے تو میں کیا دوں گی۔

خدایا میری فریاد کو پہنچ۔ میری گود کے پالے کی لاش بھی کہیں غائب ہو گئی۔ ہائے آخری وقت صورت دیکھنی بھی نصیب نہ ہوئی۔ میرا جمن تو بڑا نمازی تھا۔ مرتے وقت اس کو کفن بھی نہ ملا۔ خیر میں کیوں کہوں لوگوں نے اس کے مردہ کو اٹھایا ہو گا۔ مگر وہ تو شہید تھا اور سنتی ہوں کہ شہید کو کفن و غسل کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اچھا تو اے خدا میں تیرا شکرانہ بھیجتی ہوں کہ جمن کو شہادت نصیب ہوئی۔

دوسرا گھر:-

جب یہ سیر ہو چکی تو دوسری جھونپڑی کو دیکھا۔ وہاں ایک عورت بیمار پڑی تھی۔ گھر میں کوئی نہ تھا۔ اندھیرے میں بیمار کی آواز نہایت خوفناک ہو رہی تھی۔ وہ کہتی تھی ارے کوئی پانی پلاوے۔ یہ آج اب تک گھر میں نہیں آئے۔ مولوی صاحب کا وعظ عیدگاہ میں کب تک رہے گا۔ میرا حلق تو پیاس کے مارے سوکھا جاتا ہے یکایک پاس کے گھر میں رونے کی آواز آئی اور غل مچا کہ فلاں فلاں آدمی لڑائی میں مارے گئے ان میں اس کے خاوند کا نام بھی تھا۔ اس صدا کو سن کر بیمار نے ایک آہ کی اور بیہوش ہو گئی۔

حافظ احمد اللہ کے گھر میں سحری

ظلمات کی سیر کرتے کرتے سحری کا وقت آگیا آخر اپنے دوست حافظ احمد اللہ کے گھر پہنچے۔ ان کو اس روز گرفتار کیا گیا تھا خدا نے سب کچھ دیا ہے۔ مال و دولت آل اولاد۔ بوڑھے باپ اور گھر والوں نے ساری رات آنکھوں میں کاٹی تھی۔ سحری کے وقت اس گھر میں عجیب حسرت و یاس تھی۔ در و دیوار سے حافظ احمد اللہ کی صدا آتی تھی۔ گھر والوں کے حلق میں نوالے اٹکتے تھے اور آنسو اڑے چلے آتے تھے ... دل کی تعمیل میں سحری کھانی ضرور تھی۔

مولانا آزاد سبحانی کا مدرسہ

ایک نظر مدرستہ الحیات پر بھی ڈالی۔ کتابیں غمگین نہ تھیں ان میں غیظ تھا۔ طیش تھا۔ اپنے قدر دان کی حمایت میں ولولہ تھا۔ فقہ حدیث فقہ کے حروف سے قرآن کے حروف نے کہا تم کیوں نہیں بولتے۔ یہ وقت تمہاری لیڈری کا ہے ہماری ترجمانی کرو اور جو دل میں ہو کہو۔

قرآنی حروف بولے ہم بظاہر خاموش مگر باطن میں گویا ہیں مسجدوں میں ہمارا ہی پرچہ کیا جاتا ہے ہم میں بھی وہ اسٹیم ہے جس سے مومن کے قلب کی مشین چلتی ہے۔ ہمارا ناظم منظور نظر آزاد سبحانی اس مسجد کی خاطر قید کیا گیا جس میں ہماری عزت کی جاتی تھی تو کیا ہم اس کو معاف کریں گے نہیں ہرگز نہیں۔ آج جو بولتے تھے خاموش ہیں۔ اس واسطے ہم کہ خاموش تھے بولیں گے۔ اور کہ ہمارا بولنا آثار قیامت میں شامل ہے۔ کاغذ کے لکھے ہوئے حرف کا جوش دیکھ کر میری روح قلب و ذہن کے حروف بھی تو بولنے لگے۔ اور مجھ کو اندیشہ ہوا کہ میری سیر و سیاحت میں رخنہ نہ پڑ جائے اس واسطے میں نے ... کو زور نہشت سے کہا اب مجھ کو جانے دو۔ رات جس کی زندگی کا چراغ سحری ہو رہا تھا آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور بولی کہ ان کے عزیزوں میں اتنی انسانیت ہے کہ پیاسے لوگوں کی خبر لیں۔ مرنے والوں کے اہل و عیال کی مدد کریں۔ بے زر اور مضطرب الحال اشخاص کی فریاد پر متوجہ ہوں۔

میں نے جواب دیا۔ ہاں ان میں درد شناسی ہے۔ وہ اپنے نوالے روک کر اپنے بھائی کے نوالہ کی فکر کریں گے۔ وہ اپنے بچوں کا حصہ مظلوم بچوں کو دیں گے۔

مسلمان ہمدرد قوم ہے۔ اس کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصیحت کی ہے کہ مسلمان بھائی کا دوسرے مسلمان بھائی پر بہت بڑا حق ہے تب تو ضعیفۃ العمر رات بہت خوش ہوئی اور نور سحر کے سامنے مصافحہ کرتے ہوئے آسمان پر چلی گئی۔

اس وقت میں نے بھی اس وجود کی جانب توجہ کی جس کو حسن نظامی کہا جاتا تھا اور دیکھا کہ صبح چھ بجے وہ دہلی کے پلیٹ فارم پر گاڑی سے اتر رہا تھا۔

کانپور کے قیدیوں اور مجروحین کی کیفیت

ہمارے خاص نامہ نگار کے قلم سے

پنجشنبہ ۲۸ر اگست ۱۹۱۳ء

آج میں اور شیخ ذکرالرحمٰن صاحب وکیل سول سرجن کی کوٹھی پر ساڑھے آٹھ بجے صبح پہنچے صاحب بہادر حاضری تناول فرما رہے تھے ہم اطلاع کر کے ان کے کمرۂ دفتر میں بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تو چھری کانٹے کی آواز آتی رہی۔ اس کے بعد ہم چشم بر راہ ہوئے کہ صاحب اب آتے ہیں اب آتے ہیں۔ لیکن آنکھیں تو انتظار کرتی ہی رہیں۔ کان بھی آہٹ نہ سن سکے۔ ۲۰ منٹ گذرے۔ آدھ گھنٹہ ہوا۔ پون بھی ختم ہو چکا۔ انتظار مایوسی کی شکل اختیار کرنے لگا۔ ہمارا خیال ہوا کہ صاحب موصوف بھول گئے۔ اور پورا ایک گھنٹہ صبر آزمائی کرائیں گے۔ لیکن گھنٹے کے پورے ۶۰ منٹ نہیں گذرے تھے کہ صاحب موصوف تشریف لائے۔ خندہ رو ہو کر ہاتھ ملایا۔ اور عذر کیا کہ "میں بھول گیا تھا۔ معاف کیجئے۔ آپ کو انتظار کھینچنا پڑا"۔ غرض ہم نے بھی حق تہذیب ادا کرتے ہوئے بادل نخواستہ یہی کہا کہ "کچھ بات نہیں"۔ صاحب موصوف نے سوال کیا کہ "میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں"۔ ہم نے جواب دیا کہ "جیل خانہ میں ملزمین اور شفاخانہ سے مجروحین کو ملنا چاہتے ہیں۔ اور آپ سے اجازت طلب کرتے ہیں"۔ انہوں نے دوبارہ نام دریافت کر کے اجازت نامہ لکھ دیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ "بعض اخباروں میں طریق علاج کی نسبت شکایت درج ہوئی ہے۔ حالانکہ میں بہت غور اور توجہ کے ساتھ علاج کر رہا ہوں"۔ اس پر ہم نے یہ جواب دیا کہ "ہم نے کسی اخبار میں آپ کی شکایت نہیں پڑھی"۔ انہوں نے فرمایا کہ "پنجاب کے کسی پرچہ میں ایسی شکایت چھپی ہے۔ بہرکیف اگر آپ صحیح واقعات معلوم کرنا اور شائع کرنا چاہتے ہیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں پوری توجہ اور ہمدردی کے ساتھ مریضوں کی دیکھ بھال کر رہا ہوں مجروحین کے علاج پر بہت خرچ ہو رہا ہے۔ اور قیمتی دواؤں کا استعمال کرنے کی وجہ سے خرچ اس قدر ہو رہا ہے کہ میں شفاخانہ کے معمولی بجٹ سے اس کی گنجائش نہیں نکال سکتا۔ اس لئے میں نے صاحب کلکٹر سے رپورٹ کی ہے کہ ان اخراجات کو کسی اور فنڈ سے ادا کرنا چاہئے"۔

ہم نے کہا کہ "ہم بہت مشکور ہیں کہ آپ مجروحین کے علاج معالجہ میں اس قدر دلچسپی لے رہے ہیں ہم اپنے اخباروں میں غلط اور سماعی واقعات درج کرنا نہیں چاہتے۔ صحیح صحیح واقعات تو معلوم کرنے کے لئے جس میں خاص طور پر یہاں بھیجا گیا ہوں۔ ہمارا اصول اور مقصد تو محض حاکم و محکوم کے تعلقات کو خوشگوار کرنا ہے۔ ہم ہمیشہ گورنمنٹ اور پبلک کے سامنے راست راست اور بے کم و کاست حالات پیش کرنے کی کوشش میں رہتے ہیں"۔ اس پر انہوں نے فرمایا کہ "اگر میرا سلوک قابل اطمینان نہ ہوتا تو میں آپ صاحبان سے حالات کو چھپانے کی کوشش کرتا۔ آپ خود مریضوں سے دریافت کر سکتے ہیں"۔ غرض ہم شکریہ ادا کر کے رخصت ہوئے اور صاحب بہادر نے دوبارہ دیر تک بٹھائے رکھنے کی معذرت چاہی اور ہم نے بھی دوبارہ حق تہذیب ادا کر دیا۔

وہاں سے ہم جیل کا ارادہ کر کے چلے کیونکہ سول سرجن صاحب خود اس وقت شفاخانہ کو تشریف لے جا رہے تھے۔ جیل پر پہنچے تو وہاں خلقت انبوہ دروازہ پر کشمکش میں مبتلا تھا۔ محمد عثمان صاحب سوداگر نے ہمارا اجازت نامہ داروغہ صاحب تک پہنچا دیا۔ داروغہ صاحب نے بمشکل

راستہ صاف کرا کر ہمیں اندر تک پہنچایا۔ خود لوگوں نے بھی ہمیں دیکھ کر اور اپنے عزیز و مظلوم کا ہمدرد سمجھ کر ہمارے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

ہم دروازہ کے اندر پہنچ گئے۔ مگر اتوار کی وجہ سے عام اجازت تھی اور قیدیوں کے عزیز و اقربا، دوست و غمخوار کا ہجوم تھا۔ اس لئے اس قدر بھیڑ بھاڑ میں ہم اپنے قومی قیدیوں سے اچھی طرح سلام وعلیک بھی نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ہم نے پہلے شفاخانہ میں جا کر مجروح بھائیوں کی تیمارداری کو ترجیح دی۔

شفاخانہ پہنچے۔ مسٹر عثمان ہمارے ساتھ ہی تھے۔ سب انسپکٹر منظور احمد صاحب کو جو مجروحین پر مامور ہیں پاس دکھلایا گیا۔ نہایت تپاک سے ملے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ زخمیوں کے ساتھ ہمیشہ مہربانی و مروت کے ساتھ پیش آتے ہیں اور اب تک کسی قسم کی سختی نہیں کرتے۔ خود پولیس کی بندوقوں، بھالوں اور تلواروں کے مضروبین نے ان کی شرافت اور حسن سلوک کی شہادت دی۔ ہم نے ان کا مناسب شکریہ ادا کیا۔ مجروحین میں سب سے پہلے دو غریب برآمدہ میں پڑے ملے۔ ان میں سے ایک کا نام امید علی ہے اس بیچارے کے بہت ضربیں آئی ہیں۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ بندوق کے چھروں اور نیزے کی کچوکوں نے اس پر خوب ارمان نکالے ہیں۔ جگہ جگہ سے اس کا جسم چاندماری بنا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی حالت زار دیکھ کر دل خود بخود پگھلتا جا رہا تھا۔ اگرچہ اس کا سراپا یاس ڈھیر زبان حال سے بھی کہہ رہا تھا کہ "صورت ببیں حالم مپرس"۔ مگر مزاج پرسی ہمارا فرض تھا۔ اور ہم نے اس سے پوچھا "کہو بھائی کیا حال ہے" کہا شکر ہے۔ اب اچھا ہوں" ہم نے تسلی دی اور کہا "گھبراؤ نہیں تم جلدی اچھے ہو جاؤ گے۔ تمہارا علاج غور سے ہو رہا ہے۔ صبر سے کام لو۔ خدا رحم کرے گا۔ ساری قوم کے دل میں تم لوگوں کا درد ہے" اس پر غریب پھوٹ پڑا۔ بدن کانپنے لگا۔ آنکھوں سے آنسو ابل پڑے۔ قریب تھا کہ ہم بھی دو اشکوں کے گنہگار ہو جاتے۔ لیکن دل کو سنبھالا اور اسے "صبر" کہہ کر آگے کو بڑھے۔ دوسری جانب ایک اور صاحب ماتھے پر پٹی باندھے لیٹ رہے تھے۔ ان کی حالت اچھی تھی اور وہ بالکل مطمئن و خوش معلوم ہوتے تھے۔ انہوں نے سب انسپکٹر صاحب مذکور الصدر اور افسران شفاخانہ کی تعریف کی۔ اور ہم اظہار ہمدردی کے بعد اندر مجروح خانہ میں گئے۔ وہاں بوڑھے۔ ادھیڑ اور کم عمر کے زخمی بیٹھے ہوئے تھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک دو چل پھر رہے تھے۔ سب سے بات چیت ہوئی۔ انہوں نے سب کو دعا دی۔ اور سب نے ہمارا اور ان سب بزرگان قوم کا اظہار احسانمندی کیا جو کانپور میں ان کی تیمارداری اور ان کے ساتھی قیدیوں کی قانونی پیروی کے لئے اپنا گھر بار اور سکھ چین چھوڑ کر یہاں آئے ہوئے تھے۔ یہ سب لوگ زخمی تھے۔ مصیبت زدہ تھے۔ بال بچوں سے علیحدہ تھے۔ مقدمہ کے حشر سے جو خواہ مخواہ بلائے بے درماں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑا بے خبر تھے۔ مگر سب کے سب اپنے حال پر صابر و شاکر تھے اور ان کے چہروں پر بے گناہی اور توکل کے آثار نمایاں تھے۔ ان قومی مجروحوں میں دو لڑکوں کی حالت خصوصاً قابل ذکر اور واجب الرحم ہے۔ نور الہی اور اشفاق الہی۔ دونوں سگے بھائی تیروں اور بندوقوں کے بے پروا اندھا دھند حملوں سے لہولہان ہوئے۔ اشفاق کوئی دس بارہ برس کا ہوگا۔ بیچارہ انہی صدموں میں خدا کو پیارا ہوا۔ اور قادر ذوالجلال کے عرش کے نیچے شہیدوں میں جا ملا۔ بڑا بھائی نور الہی ابھی بیمار ہے۔ اس کی حالت نازک ہے۔ سول سرجن صاحب نے ملاقات میں اس کا کچھ حال بیان کیا تھا۔ ان کی رائے میں اب اس کے بچ جانے کی کچھ امید ہو چلی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر بعد رہائی بھی وہ عام مریضوں کی طرح شفاخانہ ہی میں رہا تو اس کی زندگی اغلب ہے۔ ورنہ اس کا بچنا محال ہے۔ مگر آج دوپہر کو ایک ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ مظلوم کی رہائی کا حکم صادر ہو چکا ہے۔ مگر ڈاکٹر عبدالصمد صاحب جنہوں نے ابتدا ہی سے جملہ زخمیوں کی مرہم پٹی نہایت دلسوزی اور

دردمندی کے ساتھ کی ہے۔ اور ہمیشہ خاص توجہ اور محبت سے ان کی دیکھ بھال کرتے رہے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر وہ جانبر بھی ہوگیا تو غالباً اس کا دماغ صحیح نہ رہے گا۔ کیونکہ اس کے ماتھے پر متعدد چھرے لگیں ہیں۔ اور دماغ پر اثر پہنچ چکا ہے۔ غریب اکثر بے ہوشی کی حالت میں رہتا ہے کبھی کبھی ہوش آتا ہے۔ تو اماں! ابا جی مجھے کروٹ دو، پکار اٹھتا ہے۔ اسی حالت میں کلمہ طیبہ " لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ" کا ورد بھی کرنے لگتا ہے۔ اس سے دریافت کیا جاتا ہے کہ "چوٹ کیسے لگی تو وہ جواب دیتا ہے کہ "خدا کے رستہ میں مجھے چوٹ لگ گئی"۔ میرے سامنے بھی وہ ہوش میں آیا۔ اور دل ہلا دینے والی آواز میں پکارنے لگا ابا جی! بڑے میاں!! کروٹ لے دو!! ہم اس صدائے درد کی تاب نہ لا سکے۔ کمرہ سے باہر نکلے تو آگے امید علی مجروح مذکور الصدر کے پاس ڈاکٹر عبد الصمد صاحب اور ایک اور ڈاکٹر کھڑے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کی جان بری کی کچھ کم امید ظاہر کی کیونکہ چھرے پھیپھڑے میں بیٹھ گئے ہیں اور سوزش پیدا ہوگئی ہے۔ پچکاری سے وہ اپہنچائی جاتی ہے۔ خدا غریب کو صحت دے۔ شفاخانہ میں ہم کو منظور احمد صاحب سب انسپکٹر نے یہ بھی بتلایا کہ سول سرجن صاحب ہمارے وہاں پہنچنے سے قبل تشریف لائے تھے۔ اور حکم دے گئے تھے کہ ایک وکیل صاحب اور ایک نامہ نگار صاحب زخمیوں کو دیکھنے کے لیے آئیں گے۔ انہیں اچھی طرح سے زخمیوں کو دکھلا دینا۔

آخر ڈاکٹر عبد الصمد کی دلی توجہ اور سب انسپکٹر صاحب کی مہربانی کا شکریہ ادا کرکے ہم جیل کی طرف روانہ ہوئے۔ اکثر لوگ تو باہر نکل آئے تھے۔ مگر کچھ چلے آ رہے تھے۔ سردار گنڈا سنگھ صاحب داروغہ جیل آگے بڑھے۔ انہوں نے کہا کہ ۹۲ لوگ صبح آ چکے ہیں ۱۳ اب آئے تھے۔ ان کے علاوہ پانچ آدمی ہم تھے۔ گویا گیارہ بجے تک چھ سو سے اوپر زائرین ۱۰۷ گرفتاروں کو دیکھنے کے لئے آئے۔ خیر ہجوم کچھ کم ہوا۔ تو داروغہ صاحب آدمیوں کو روک کر ہمیں اندر لے گئے۔ حوالات پر پہنچے اسیر سلاخوں میں سے جھانک رہے تھے۔ گویا ہمارے منتظر ہی تھے مصافحہ کے لیے ہاتھ نکلنے شروع ہوئے۔ معانقہ تو ہمارے سینوں کی بجائے سنگین سلاخوں نے کیا۔ سب سے تسلی و تشفی کی باتیں کرتے ہوئے مولانا آزاد سبحانی کے قفس کی آہنی تیلیوں کے سامنے پہنچے۔ انہوں نے نہایت اشتیاق اور خندہ پیشانی کے ساتھ سلاخوں میں ہاتھ نکالے ہم نے ان بے گناہ ہاتھوں کو بوسہ دیا آنکھوں سے لگایا۔ مگر دل و جگر کو حسرت ہی رہی کہ حافظ احمد اللہ اور مولانا محمد سعید صاحب کے ہاتھ چومے۔ یہ ہر دو صاحبان کے رفقا، بالکل شادماں نظر آتے تھے۔ ہم نے ان سے عرض کیا کہ قوم کی آنکھیں آپ صاحبوں پر لگی ہوئی ہیں۔ اس پر انہوں نے نہایت وقار اور استقلال سے فرمایا کہ " اسلام زندہ ہے۔ اس کے سچے شیدائیوں کی ہمیشہ آزمائشیں ہوتی رہیں۔ اور اب امید ہے کہ خدائے کریم اپنے فضل و کرم سے ہمیں اور ہماری قوم کو اس آزمائش میں ثابت قدم رکھے گا"۔ انہوں نے بار بار شکریہ ادا کر کے ہمارے شرمندہ کیا۔ آخر ہم قادر مطلق کی عظمت و جلال کو یاد کرتے ہوئے وہاں سے واپس ہوئے۔ اور قریب بارہ بجے کے بنگلہ پر پہنچے۔

اداریہ

سر جیمس مسٹن کی ضد

(۱)

چہار شنبہ ۲۰ اگست ۱۹۱۳ء

مسلمانوں کے وفد کو ہز آنر نے جو جواب دیا ہے اس پر کلیتاً بحث کرنے سے پہلے ہم ہز آنر کی تقریر کے مختلف حصوں پر مختصراً بحث بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ سب سے پہلے ہز آنر نے وہ دلائل پیش کئے ہیں جن کی بنیاد پر وہ مسجد کے منہدم حصہ کی عظمت کو تسلیم نہیں کرتے ہز آنر نے اس امر پر زور دیا ہے کہ متولیوں کو یہ علم تھا کہ مسجد کا ایک جزو سڑک کے لئے لیا جائے گا۔ لیکن ہم سے خود کریم احمد اور عبدالرحیم متولیان مسجد نے ملکر کہا کہ ان لوگوں کو کوئی علم جزو مسجد کے شامل لئے جانے کا مارچ ۱۹۱۳ء سے پہلے نہیں تھا۔ اور کون کہہ سکتا ہے کہ ہز آنر اور متولیوں میں کون سچا ہے؟ البتہ اتنا ضرور ہے کہ متولی جو کچھ کہتے ہیں اپنے ذاتی علم کی بنیاد پر کہتے ہیں۔ اور ہز آنر مسٹر ٹائیلر کی شہادت پر۔ علاوہ ازیں اس بات پر خواہ مخواہ زور دیا گیا ہے کہ دالان اور وضو خانہ وغیرہ مسجد کے حصے نہیں ہیں۔ جس کے صریح معنی یہ ہیں کہ آئندہ جب کبھی گورنمنٹ چاہے گی تو اس قسم کے حصوں کو مسجد سے علیحدہ کرکے اپنے تصرف میں لے آئے گی۔ اور کیا تعجب ہے کہ آئندہ شاہی دار الحکومت کی زیبائش و آرائش کے لئے ایک کسی غیر مسلم فقیہ کے فتوے پر جامع مسجد کی سیڑھیاں سڑک کی نذر کر دی جائیں۔ اس لئے کہ وہ مسجد کا "جزو خاص" نہیں ہیں۔

مگر معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کی اہمیت پر نظر ثانی کرکے ہز آنر نے صرف اپنے ہی فتوے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جب معاملات کو زیادہ طول پکڑتے دیکھا تو بعض مفتیوں سے بھی آپ نے تنہائی میں مشورے لئے۔ اور اگرچہ بمصداق "تنہا پیش قاضی روی راضی آئی" ممکن تھا اس قسم کے تمام فتاوے ہز آنر کے حسب دلخواہ ملتے۔ مگر پھر بھی لوگوں نے "مختلف نوعیت" کے جواب دئے۔ اس کی وجہ بجز اس کے کیا ہو سکتی ہے کہ دنیا میں "مختلف نوعیت" کے لوگ رہتے ہیں ممکن ہے کہ جن مفتیوں کو ہز آنر جیسے فقیہوں کے ہاتھ سے تمغہ اور سند ملے ہوں، انہوں نے "اجی حضور" کہنے کی پرانی عادت کی بنیاد پر اپنے مذہبی حکم "ہل جزاء الاحسان الا الاحسان" بہانہ قرار دے کر بمصداق "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" ہز آنر کے ساتھ ہاں میں ہاں ملا دی ہے۔ اور بعض نے ہز آنر کے اشارۂ ابرو کو سمجھنے سے قاصر رہ کر یا خوف خدا کی وجہ سے اس فتوے پر صاد کرنے سے انکار کر دیا ہو۔

پھر ہز آنر نے اس سوال کا ذکر کیا ہے جو سڑک کی ترمیم پر کسی مسلمان نے ان سے کیا تھا کہ "مسجد کا کوئی حصہ تو سڑک میں نہ آ جائے گا۔" اور اگرچہ بعض وجوہ سے سوال کے الفاظ تو ہز آنر کے حافظے میں نہیں رہے۔ مگر شکر ہے کہ اپنا انکاری جواب یاد تھا۔ مگر واقعات کی رو کلیہ وسیع تدبیر کی پاسداری کی وجہ سے رفتہ رفتہ اس دو حرفی انگریزی لفظ "نو" کی تفسیر کے لئے ہز آنر کو بہت سی نئی مصطلحات مثلاً "جزو خاص" اور "جزو عام" کی مسجد کے مختلف حصص کے لئے وضع کرنے پڑے اور اس تکلیف دہی کا جواب "خدا اور اس کے بندوں کے نزدیک دجال اور وحشی مسلمانوں" اور دور بیٹھ کر فتنہ انگیزی کرنے والوں کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔

ڈالے ہوئے اس "شہر خموشاں" کی شاہراہوں سے (خاک بدہن خدا اسلام اور مسلمانوں کو ہمیشہ زندہ سلامت رکھے) ہوتے ہوئے "تنگ گلیوں" میں پہنچے خیال تھا کہ گھروں سے تو بچوں کی چہل پہل کی آوازیں سننے میں آئیں گی۔ معصوم ننھے بچوں کی جن کے صدقہ سے عید عید ہوتی ہے، خوش خوش شکلیں اور اچھی اچھی پوشاکیں نظر آئیں گی۔ مگر آہ! مچھلی بازار کی مسجد نے ان کو بھی "کشتگان معرکۂ کانپور" کا نوحہ گر بنا رکھا تھا۔ جو بچے ہیں نظر پڑتے ان کے چہرے اداس، کپڑے میلے، سراپا یاس و حسرت کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ غرض مسجد کی حدود میں پہنچے۔ مسجد کے باہر تک راستہ پر نمازی صف باندھے بیٹھے ہوئے تھے۔ آس پاس کی چھتیں بھی آدمیوں سے پٹی ہوئی تھیں۔ مگر کچھ رونق نہ تھی، خاموشی تھی، اداسی تھی۔ کسی نے کپڑے بھی نہ بدلے تھے۔ مسٹر مظہر الحق کو دیکھ کر لوگ فوراً کھڑے ہوگئے۔ پھر تو یہ باور ہوا کہ جاندار ہستیاں تھیں۔ اگر میں امریکہ کی سرزمین میں ہوتا تو شاید گمان ہوتا کہ کہیں مسٹر ایڈیسن کا کوئی شعبدہ نہ ہو۔ مگر جب السلام علیکم کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اور لوگ ان سے مصافحہ کرنے کو لپکے تو مجھے یقین ہی ہوگیا کہ یہ سب لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پر ایمان رکھنے والے ہیں اور یہ بھی ہماری طرح اللہ اکبر کے آگے سر جھکانے آئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب تشریف لائے۔ بہت باخدا اور شب بیدار بزرگ ہیں۔ عید کی نماز ہوئی، خطبہ ہوا مگر مختصر۔ جب ہم اٹھے تو ایک [illegible] لیا۔ صاحب موصوف کو تو اتنی ہوش کہاں رہی کہ کس کس نے ان کے ہاتھوں کو چوما۔ اور آنکھوں سے لگایا۔ میں خود بھی نہ دیکھ سکا۔ اور ایک بھیڑ میں غائب ہوگیا۔ ہاں میرے سینہ پر "خدام کعبہ" کا نشان چسپاں تھا، کہ کام آگیا۔ خدا کرے کہ اس نشان کی لاج دنیا میں رکھ سکوں۔ کہ محشر کی بھیڑ بھاڑ میں بھی کام آجائے۔ کسی کی نظر پڑ گئی اور ان صاحب نے بمشکل راستہ صاف کرا کر مجھے جناب موصوف تک پہنچا دیا۔ مگر وہاں اس سیلاب کا زور تھا۔ آخر چند صاحبوں نے لوگوں کو زبردستی دو رویہ کھڑا کیا کہ صاحب موصوف باہر کھلی ہوا میں آجائیں۔ مگر پھر بھی دونوں طرف سے ہاتھ پر ہاتھ پڑتا تھا۔ جو لوگ مصافحہ کرنے کا ارمان نہ نکال سکے انہوں نے سبحان اللہ، مرحبا کے نعرے بلند کرنے شروع کئے۔ مسجد سے باہر آئے تو باہر ایک اور مجمع منتظر تھا۔ غرض اسی صورت سے گاڑی تک پہنچے۔ مگر وہاں بھی دو طرفہ ہاتھ بڑھنے لگے۔ گاڑی چلی تو کچھ لوگ ساتھ دوڑے۔ آخر بمشکل انہیں دست بستہ سلام کرتے ہوئے مسجد سے روانہ ہوئے۔ واپسی میں پھر وہی سوتے ہوئے مکان، بند بازار جو دکانیں کھل رہی تھیں ان پر دکاندار یا مکھیوں کے سوا کوئی خریدار نہیں نظر پڑا۔ خاموش گلیاں، سنسان سڑکیں اور پولیس کا لال دوپٹہ اور خاکی وردی! بنگلہ پہنچے ہی پائے ہوں گے کہ عید ملنے والے آنے شروع ہوئے کوئی ساڑھے دس بجے تک تو چار چار پانچ پانچ کی ٹولیاں آتی رہیں۔ پھر تو ایک بجے تک بیس بیس، تیس تیس کے غول آنے لگے۔ کرسیاں کافی نہ ہوئیں تو لوگ اردگرد کھڑے ہونے لگے جب کمرہ میں کھڑے ہونے کی بھی جگہ نہ رہی تو برآمدے میں چل آئے۔ آخر جب چاروں طرف سے ہوا بھی رک گئی اور یہیں نعرہ اور عیدی کے روپیہ لینے اور رسیدیں کاٹنے میں دقت ہونے لگی تو یہ قرار پایا کہ جو لوگ چندہ دینے چاہیں وہ رسیدیں لے کر تشریف لے جائیں۔ اور ہم چندہ گھر دوسرے کمرہ میں بنائیں، ایک آدمی آکر مسٹر مظہر الحق سے رسیدوں پر دستخط لے جایا کرے۔ اسی بھیڑ بھاڑ پر ایک ستم ظریف نے فقرہ چھوڑا کہ پولیس کا انتظام تو یہاں ہونا چاہئے تھا، فضول سڑکوں، مسجدوں اور عیدگاہوں پر کیوں پہرہ دے رہی ہے: —

قصہ مختصر محلہ محلہ کے لوگ جوق در جوق آئے تھے۔ وہ اپنی اپنی مسجدوں اور گھروں سے جمع کیا ہوا چندہ پیسے، اکنیاں، دوانیاں وغیرہ لا کر عاجزی اور انکسار کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ صاحب استطاعت لوگوں نے اپنے بچوں کی عیدیوں کی معقول رقمیں بھی شہداء اور زخمیوں کے بچوں کے لئے پیش کش کی۔ رات کے نو بج گئے اور یہ معمول رہا۔ چند ممتاز اصحاب کے جن کا فرض تھا کہ جماعت اسلامی سے الگ رہ کر اپنی اغراض کی تکمیل کریں۔ اور بجز عورتوں کے سارا کانپور مسٹر مظہر الحق کی خدمت میں اظہار عقیدت و احسان مندی کے لئے حاضر ہوا۔ احساس قومی یہاں تک تیز ہو گیا ہے کہ شام کے وقت ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ اگر صاحب سے تم اجازت لے لو تو طوائفیں بھی برقع پوش ہو کر چندہ پیش کرنا چاہتی

ہیں۔ مزید تحقیق سے معلوم ہوا کہ ان لہو و لعب کی بندیوں اور عیش و عشرت کی دیویوں نے بھی، کشتگان ظلم کانپور کے غم میں نہ آنکھوں میں سرمہ لگایا نہ ہاتھوں میں مہندی، نہ سر میں کنگھی چوٹی کی اور نہ تن پر زرق برق کپڑے پہنے۔ قوم کی سیہ روسیہ نصیباں بھی منہ تکتی بلکہ میلے کچیلے کپڑے صرف تن ڈھکنے کو۔ اس ماتم کن دل کے ساتھ انہوں نے بھی دریافت کرایا کہ کیا وہ بھی شریک قوم ہوسکتی ہیں۔ کاش ہم بھی اپنی خفیف گناہوں کو یاد کرکے اپنے دامنوں میں نگاہ ڈالیں اور اسلام کے حقیقی مفہوم کو سمجھنے لگیں، ہاں یہ احساس کوئی اور نہیں۔ اس سے قبل بھی یہ طبقہ جن کو حقارت کے ساتھ دیکھنے کی بجائے ہمیں اپنے معاصی پر نگاہ کرنا چاہئے۔ جنگ ٹرکی دینا فنڈ میں فیاضی کے ساتھ چندہ دے چکا۔

یہ تو چندہ آنے کی خبر ہی تھی۔ لیکن جو چندہ لوگ خود ادا کر دیتے رہتے تھے۔ اس کا اور اس کے لانے والوں کا تانتا ۹ بجے شب کے بعد بند ہوا۔ میں نے اس چندہ کی فہرست کچھ مرتب کرلی ہے۔ مکمل کرکے ارسال خدمت کروں گا۔

آج شام کے پانچ بجے ہیں تو بھی چند مقامی صاحبوں کو لے کر عیدگاہ اور شہر کی حالت دیکھنے گیا۔ مگر جو خاموشی سکوت اور ویرانی صبح کے وقت ہر سڑک پر چھائی تھی۔ وہی اب بھی تھی۔ عیدگاہ مقفل تھی۔ چھوٹی عیدگاہ جو نئی سڑک پر واقع ہے اور جہاں میلہ کا ازدحام اس قدر ہوا کرتا ہے کہ گاڑی یکہ چل نہیں سکتا۔ اور تل دھرنے کو جگہ نہیں ملا کرتی وہاں اس وقت پولیس اور فائر بریگیڈ کے جمعداروں کے سوا شاذ و نادر ہی کوئی متنفس نظر آتا تھا۔ یہ فرق حضرت دل کی شادمانی اور نوحہ خوانی میں۔ گھر آباد ہیں، لوگ زندہ ہیں۔ سب سامان موجود ہیں۔ لیکن صرف ایک دل کے ساتھ نہ دینے سے گھر خالی معلوم ہوتے ہیں۔ اور سب ساز و سامان صرف جگہ روکنے کو دھرے رکھے ہیں۔

راستہ میں معلوم ہوا کہ مسجدوں پر مسلح پولیس کے پہرے تھے۔ ایک جگہ یہ بھی سنا کہ کسی مسجد میں پولیس والوں نے امام سے عید پڑھانے کے متعلق کچھ باز پرس بھی کی اور بعض لوگوں کے نام بھی لکھے۔ مجھے یہ امر ابھی تک تحقیق نہیں ہوا۔ اور میرا خیال ہے کہ پولیس نے یہ غلطی تو نہ کی ہوگی۔ اسی سلسلہ میں مجھے یہ معلوم ہوا کہ امام صاحب جامع مسجد میں نماز میں تکبیریں کہنا بھول گئے۔ اور نماز دوبارہ ہوئی۔ اس کی وجہ لوگوں نے انتشار بتلایا۔ مگر میرا خیال تھا کہ اس کی وجہ سہو ہوگی۔ (یا شاید یہ ہو کہ ہندوستان کے ایک صوبہ کی گورنمنٹ نے "کہو تکبیر" کو ممنوع قرار دیا ہے) چنانچہ بہ نظر تحقیق میں خود جامع مسجد میں گیا۔ وہاں کچھ لوگ عصر کی نماز پڑھ کر نکل رہے تھے۔ کچھ ٹہل رہے تھے۔ جو ٹہل رہے تھے وہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کے طلبہ تھے۔ میرے سوال پر لوگ پہلے تو کچھ ٹھٹکے " آخر انہوں نے تمام عوام کو یہ خیال کرنے کہا کہ امام صاحب کو ہم بلوائے دیتے ہیں۔ امام صاحب تشریف لائے۔ میں نے سوال کیا وہ کچھ خاموش سے ہوگئے۔ آخر میں نے اپنے ساتھیوں کو بلا کر انہیں یقین دلوایا کہ میں کوئی غیر آدمی نہیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ ہاں صاحب آج کل ہر شخص پر خفیہ ہی کا شبہ ہوتا ہے۔ اور خاموش ہی رہنا پڑتا ہے پھر انہوں نے فرمایا کہ اصل میں پولیس کا چاروں طرف پہرہ تھا۔ قریب ہی معلوم ہوا تھا کہ ایک چوکی میں مسلح گارد اور اندر پولیس موجود تھے۔ اور خود نمازیوں میں اکثر گھورنے والے نظر آتے تھے۔ اس لئے طبیعت کچھ پریشان و خوف زدہ تھی۔ غالباً (کھٹک کر) اس قسم کے خیالات مخل انداز ہوگئے۔ شاید ان کا یہ خیال ہو کہ ان کا اقرار ایک عالم و امام کی شایان شان تھا۔ کیونکہ وارث تو انہیں بزرگوں کے ہیں جنہوں نے تلواروں کے سایہ میں جبین نیاز کو سجدہ آمیز کیا ہے۔ یہ کیفیت ہے عید کی، عید کانپور کی۔ دیکھئے یہاں کب تک صف ماتم بچھی رہتی ہے؟ مقلب القلوب سے دعا ہے کہ وہ جلد حاکم و محکوم کو مسجد مچھلی بازار کے متعلق ہم خیال و ہم آہنگ کردے۔

سید رضا علی کی تقریر

اسپیچ جو آنریبل سید رضا علی صاحب نے ۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو عام جلسہ منعقدہ جامع مسجد مراد آباد میں دی۔

السلام علیکم۔ میرے بزرگوارو! عزیزو! بھائیو! خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہم کو اس دین میں پیدا کیا جو بہترین ادیان ہے اور ہم کو وہ نبی دیا جو خاتم الانبیا اور رحمۃ للعالمین ہے۔ آج کل کے مسلمانوں کے اعمال کیسے ہی زشت کیوں نہ ہوں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ آخرت کی تمام نعمتیں ہم کو عطا ہوئی ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں بھی ہم نے وہ کام کئے ہیں کہ جب تک آفتاب مشرق سے طلوع اور مغرب میں غروب ہوگا ہمارا نام صفحۂ ہستی سے مٹ نہیں سکتا۔ یہ سچ ہے کہ اب ہمارے پاس حکومت نہیں ہے مگر ہماری موجودہ حالت خود ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ محکوم ہو کر رہنا کوئی عیب کی بات نہیں ہے جب ہم حاکم تھے تو تاریخ شاہد ہے کہ اچھے حاکم تھے اب اگر ہم اپنے کو اچھے محکوم ثابت کریں تو یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہے۔ حاکم و محکوم کے تعلقات پر میں چند الفاظ کہنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

آپ کو معلوم ہے کہ یہ جلسہ مظلومان کانپور کی اعانت کے لئے منعقد کیا گیا ہے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ اس جلسہ کی شرکت ہمارے اور ہماری حکمران قوم کے تعلقات پر کیا اثر ڈالتی ہے۔ بعض اصحاب کا اصلی اور بعض اصحاب کا مصنوعی خیال ہے کہ اس جلسہ کی شرکت گورنمنٹ کے خلاف ہے۔ قبل اس کے کہ اس سوال کا جواب دیا جا سکے یہ امر دریافت طلب ہے کہ گورنمنٹ سے کیا مطلب ہے۔ اگر گورنمنٹ سے مطلب وہ تمام اہل کار افسر و عمال ہیں جو گورنمنٹ کے عہدوں اور مناصب پر اس لئے مامور ہیں کہ رعایا کی فلاح و بہبود کی کوشش کریں تو ممکن ہے کہ اس جلسہ پر ایک حد تک یہ الزام لگایا جا سکے مگر پھر بھی ہم زیادہ مورد الزام نہیں ہو سکتے کیونکہ ہم گورنمنٹ کے تمام امور پر نکتہ چینی نہیں کرتے صرف انہیں پر اعتراض کرتے ہیں جو قابل اعتراض ہیں حضرات اگر آپ ایک منٹ کے لئے بھی یہ باور کرنے کے لئے تیار ہوں کہ مسٹر ٹائلر مجسٹریٹ و مسٹر ڈاڈ سپرنٹنڈنٹ پر اعتراض اور بجا اعتراض کرنا گورنمنٹ کی مخالفت ہے تو میں یہ تسلیم کروں گا کہ ہم گورنمنٹ کے مخالف ہیں مگر یہ اصول نہایت اندیشہ ناک اصول ہے۔ اگر اس اصول کو بیان کیا جاوے تو جیسا کہ ایک مقدمہ میں ہائی کورٹ کلکتہ میں بطور مذاق کہا گیا تھا کہ کانسٹبل کو بھی گورنمنٹ ماننا پڑے گا اور کسی شخص کو یہ حق حاصل نہ رہے گا کہ بغیر کئے الزام کا خطرہ اپنے اوپر عائد کئے کانسٹبل پر اعتراض کر سکے مگر حضرات یہ تمام تخیلات اور بے جا تخیلات ہیں نہ کانسٹبل گورنمنٹ ہے نہ مسٹر ٹائلر و مسٹر ڈاڈ گورنمنٹ ہیں۔ جس طرح ہم کو ایک کانسٹبل کی نازیبا حرکت پر اس کی شکایت کرنے کا حق حاصل ہے اسی طرح مسٹر ٹائیلر اور مسٹر ڈاڈ کی غلطیوں پر حکام بالادست کی خدمت میں استغاثتاً معروض کرنے کا حق ہم کو حاصل ہے اور یہ ہمارا وہ حق ہے جو اس وقت تک کوئی طاقت ہم سے نہیں لے سکتی جب تک ہم کو برٹش گورنمنٹ کی رعایا ہونے کا حق حاصل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس معاملہ کا تعلق ہمارے صوبہ کے لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر میسٹن سے ہے۔ اور اس طرح کے جلسوں سے ان کی مخالفت منظور ہو سکتی ہے۔

یہ خیال بھی اس قدر غلط اور بے بنیاد ہے جیسا کہ پہلا خیال بالفرض سر جیمس میسٹن کے کسی فعل پر بحیثیت لفٹنٹ گورنر ہونے کے ہم اعتراض کریں تو اس سے گورنمنٹ کی کیا مخالفت ہو سکتی ہے۔ اگر لفٹنٹ گورنر کے ہر فعل کو خواہ وہ زیبا ہو یا نازیبا ہم آمنا و صدقنا کہہ کر تسلیم کریں تو پھر اصول حکمرانی کو ہمیں خیرباد کہہ دینا پڑے گا جو انگریزی حکومت کا سنگ بنیاد ہے۔

حضرات! ہم ملک معظم جارج پنجم کی رعایا اور وفادار رعایا ہیں اور ایسی رعایا ہیں جن کی وفاداری، جانبازی و جاں نثاری کی صدائیں شنگ ہائے سے سومالی لینڈ اور بوشہر تک گونجتی رہیں اور گونجیں گی۔ ہم وہ وفادار رعایا ہیں جنہوں نے گورنمنٹ کی طرف سے خود اپنے ہم مذہبوں سے جدال و قتال کرنے میں بھی دریغ نہیں کیا۔ بلوچیوں کو خون میں ہم نے رلایا، کابلیوں سے ہم لڑے، ایرانیوں کے مقابلہ میں ہم نے تلوار نکالی کیا ۱۸۹۷ء کی سرحدی لڑائی میں مسلمان فوجیں سب سے زیادہ سرفروش ثابت نہیں ہوئیں اور میرے ایک قابل دوست مجھے اس جلسہ میں یاد دلاتے ہیں کہ خود کانپور میں جن سنگینوں اور بندوقوں نے مسلمانوں کو عالم حیات سے عالم ممات میں پہنچا دیا ان میں سے بہت سی سنگینیں اور بندوقیں خود مسلمانوں کی تھیں۔ کیا ہماری وفاداری کے کافی امتحانات نہیں ہو چکے؟ یہ باتیں کون نہیں جانتا اور کس کو نہیں معلوم پھر آج سے کیوں کہا جاتا ہے کہ ہماری وفاداری زبانی ہے۔ ہم کو عقیدت اور وفاداری جارج پنجم کے تخت و تاج سے ہے۔ ہم نے اپنے بادشاہ کے لئے خون بہایا ہے۔ اور ہمیشہ بہائیں گے مگر ہم نے کوئی معاہدہ ایسا نہیں کیا ہے کہ ہم اپنی چھاتیوں کو ٹائیلر کی پولیس کی سنگینوں اور ہم ان کا نشانہ بنائیں اور اف نہ کریں۔

حضرات گورنمنٹ کے تمام اعمال کے افعال پر نکتہ چینی کا ہمیں حق حاصل ہے مگر ہم سب پر نکتہ چینی نہیں کرتے ہم اجلا کو سفید اور سیاہ کو سیاہ رکھتے ہیں۔ جہاں مسٹر ٹائیلر کے بیداد کی فریاد کرتے ہیں وہاں کلکٹر کراچی کی انصاف پسندی کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔ جہاں مسٹر فورڈ مجسٹریٹ لکھنؤ کے جابرانہ اختیارات مجسٹریٹی کا ذکر زبان پر لاتے ہیں جنہوں نے ۱۶ اگست کو مظلومان کانپور کی امداد کے لئے جلسہ نہیں ہونے دیا وہاں مسٹر لپٹن کی بیدار مغزی کے بھی قائل ہیں جنہوں نے باوجود پولیس کی ناجائز کارروائیوں کے ہم کو یہ جلسہ منعقد کرنے کا موقع دے کر اپنے خلق کا گرویدہ بنایا۔ ہم کہتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ انگریزی حکام کثرت سے انصاف پسند اور راستی باز ہیں اگر بعض ایسے ہیں کہ انگریزی حاکم کج رائے ہیں تو ہم کو اپنی رائے کثرت کے لحاظ سے قائم کرنا چاہیے۔ یہ نہایت ناانصافی ہو گی کہ اگر ہم صرف قلت پر نظر رکھیں۔

دوسری بات فراہمی چندہ کے متعلق ہے۔ بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ یہ چندہ کس لئے کیا جا رہا ہے۔ حضرات آپ سب کو معلوم ہے کہ چندہ پس ماندگان شہدائے کانپور اور مجروحین واقعہ ۳ اگست کے لئے اور ان ملزمین کی پیروی کے لئے کیا جا رہا ہے جن کی تعداد سو سے اوپر ہے اور جن پر سنگین سے سنگین جرائم کے مقدمات قائم ہیں۔ ان اغراض کے لئے ایک رقم کثیر کی ضرورت ہے اور ہم دل و جان سے اس کی فراہمی کی کوشش کر رہے ہیں۔ مگر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے سوائے چندہ کسی اور کام میں بھی خرچ کیا جائے گا۔ جس کام کی طرف یہ لوگ اشارہ کرتے ہیں مگر نام لینے سے اجتناب کرتے ہیں وہ غرض ایسی ہے کہ مصیبت زدگان کانپور کی امداد اور پیروی مقدمہ سے بھی زیادہ ہمارے دلوں کو عزیز ہے۔ مجھے اس غرض کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں اس لئے کہ قبل اس کے کہ میری آواز آپ کے کان تک پہنچے آپ کا دل آپ کو خبر دے رہا ہو گا کہ وہ غرض کیا ہے۔

حضرات! وہ مقدس غرض یہ ہے کہ ہم سب مل کر وہ تدابیر جو انگریزی گورنمنٹ کے قوانین نے ہم کو بتائی ہیں اس غرض سے عمل میں لائیں کہ ہماری مسجد کا منہدم شدہ حصہ ہم کو واپس مل جائے۔ بعض اشخاص کا خیال ہے کہ یہ امر نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی ناراضی کا باعث ہو گا مگر یہ خیال بے بنیاد ہے۔ لاٹ صاحب نے جو حکم مسجد کے بارے میں دیا ہے اس کا قانونی اثر عدالت دیوانی کے فیصلہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔ تو کیا کوئی ذی عقل یہ کہہ سکتا ہے۔ اگر کسی عدالت دیوانی کے فیصلہ کی ناراضی سے اپیل کیا جائے تو اس سے اس عدالت کی تحقیر مقصود ہو سکتی ہے؟ ہرگز نہیں، اس طرح اگر ہم ہز آنر مسٹر جیمس میسٹن کے حکم کی چارہ جوئی حضور وائسرائے ہند یا سیکرٹری آف اسٹیٹ سے کریں اور اس کے لئے چندہ جمع کریں تو اس میں کسی کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ لہٰذا میں آپ کے سامنے یہ کہنے کے لئے تیار ہوں کہ یہ غرض ہرگز ایسی نہیں ہے جو منشا قانون کے خلاف ہو اور کیا سبب چندہ دینے سے کوئی قاعدہ یا قانون آپ کو مانع ہو۔ مسجد کی واپسی ایسا امر ہے جو ہر مسلمان کے دل کو دنیا و مافیہا سے زیادہ عزیز اور پیارا ہے۔ میرا ذاتی خیال اس معاملہ میں جو کچھ بھی ہو مگر جن مسلمانوں سے مجھ کو بات چیت کا موقع ملا ہے ان میں کثیر حضرات کا جو خیال ہے وہ میں آپ کے سامنے عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا خیال ہے کہ شاید حضور وائسرائے ہم کو جزو منہدمہ مسجد واپس نہ دلائیں۔ صاحب وزیر ہند کے یہاں سے بھی ان کو کامیابی کی پوری امید نہیں ہے مگر ان کا عقیدہ ہے جس پر وہ نہایت زور سے قائم ہیں کہ ہماری پوری مسجد کا منہدمہ جزو ہم کو ملک معظم جارج پنجم خلد اللہ ملکہ کی بارگاہ سے واپس ملے گا اور ضرور ملے گا۔

۲۰- نومبر ۱۹۱۳ء

(از جناب کیفی چریا کوٹی)

رباعی

ابن مریم کو شعلہ کی سوجھی	اور موسیٰ کو طور کی سوجھی
مل فرصت جو حشر والوں کو	فتنۂ کانپور کی سوجھی

شبلی

اگرچہ آنکھ میں نم بھی نہیں ہے اب باقی

اگرچہ صدمۂ طوفان سے جگر شق ہے

بچا رکھے ہیں مگر میں نے چند قطرۂ خون

کہ کانپور کے بھی زخمیوں کا کچھ حق ہے

دہلی کا پُراسرار جلسہ انگریزوں کی حمایت میں

نواب صاحب رام پور اور دوسرے حضرات کے کارنامے

(ہمارے نامہ نگار کی رپورٹ)

(یک شنبہ۔ ۵۔ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

قسمت کا پہیہ اپنا دورہ ختم کر چکا ہے ۔ اور دیر یا سویر وہ حصہ جو آج نیچے ہے کل اوپر آجائے گا۔ جو لوگ کل تک بھی دم سکتے تھے آج شیر پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہے ہیں۔ اور دنیا بھر کو اپنی طرف مخاطب کر رہے ہیں۔ زمانہ نے بہت سے روپ بدلے اور کروٹیں بدلیں، مگر ہندوستان اور خصوصاً دہلی کے لوگوں میں نادر شاہ کے تلخ نتیجہ کے باوجود بھی میل نکالنے والوں میں (افواہ پھیلانے والوں) ایک شمہ برابر فرق نہ آیا۔ لطف یہ ہے کہ خبر جو نکلتی ہے وہ دور دار تک کا لفظ نقش کیوں نہ ہو بالکل صحیح ہوتی ہے۔ مگر جب وہ منہ سے نکل کر کوٹھوں پر چڑھتی ہے، تو اس پر وہ وہ حاشیے چڑھتے ہیں اور وہ رنگا رنگی جامے پہنائے جاتے ہیں جس کی وجہ سے عام اور خاص میں خود بخود سنسنی پیدا ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصہ سے یہ بات دیکھنے سننے میں آ رہی ہے یہ چلی تھی کہ دہلی میں بوساطت حکیم اجمل خاں و زیر صدارت ہز ہائنس نواب صاحب بہادر رام پور ایک جلسہ دلاکل ایسوسی ایشن بمبئی کی وضع کا منعقد ہوگا۔ جس میں ان کارروائیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جائے گا جو قوم کے سچے بہی خواہ اور ایثار پرست ہمدردوں نے اب تک کی ہیں، اور نیز مسٹر محمد علی آکسس، اور مسٹر وزیر حسن کو فعل مجنونانہ تصور کیا جائے گا، اور یہ کہ وہ قوم کے سچے نائب کی حیثیت میں نہیں ہو سکتے۔"

پرسوں ہمدرد کے مطالعہ اور نیشلسٹ کے تار نے اور انگریزی دانوں میں آئی۔ ڈی۔ پی۔ کے مقالہ میں، خوش گپیوں کے لیے من و سلویٰ تیار دیا۔ دہلی میں ایک سرے سے لے کر دوسرے تک آگ کی طرح یہ خبر مشہور ہوئی اور بڑے بڑے حاشیوں کے ساتھ سارا نزلہ گرا تو بیچارے حکیم اجمل خاں صاحب کے اوپر۔ ہر شخص اپنی ایک نئی بات سناتا تھا کوئی کہتا تھا حکیم اجمل خاں صاحب اس جلسہ کے اہتمام پر نواب صاحب رام پور کی طرف سے مقرر کیے گئے ہیں، اور یہ جلسہ انہی کے مکان پر ہوگا۔ کوئی کہتا تھا نواب محمد اسحق خاں آنریری سیکرٹری، علی گڑھ کالج اس کے مہتمم ہیں اور حکیم صاحب صرف مہمانوں وغیرہ کے ٹھہرانے کے منتظم قرار دیے گئے ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ جلسہ مسٹر محمد علی اور وزیر حسن کی مخالفت میں کیا جا رہا ہے کیونکہ ان کی یہ رائے تھی کہ نواب صاحب رام پور مسجد کانپور دوبارہ بنوانے اور اس کی نسبت مشورہ

کرنے کے لیے یہ جلسہ کر رہے ہیں۔ کوئی یہ کہہ کر اس کی رد کرتا تھا کہ جی نہیں یہ جلسہ محض اس غرض سے منعقد کیا گیا ہے کہ ایک ڈیپوٹیشن خاص قومی لیڈرں کا منتخب کیا جائے اور وہ حضور وائسرائے سے یہ درخواست کرے کہ اس وقت تک جس قدر شورش ہو رہی ہے وہ دو چار اخباروں کا نتیجہ ہے جن کی آواز عام مسلمانوں کی آواز نہیں ہے۔ اور ہم لوگ سچے وفادار گورنمنٹ کے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ مسجد کی تعمیر کی اجازت اس طرح دے دی جائے کہ نیچے کی زمین سڑک کے کام آ جائے اور اس جگہ جہاں حمام اور وضو خانہ تھا ہم چبوترے کے طریقے سے بڑھا کر کے اس پر اس طرح سے حمام اور وضو خانہ بنا دیں۔ کوئی کہتا تھا کہ نہیں میاں یہ جلسہ محض اس غرض سے کیا جا رہا ہے کہ ان لوگوں کی مخالفت ہیں جو کانپور کے واقعہ کی نسبت چندہ کر رہے اور دلچسپی لے رہے ہیں نیز ان اخباروں کی نسبت جو اس کے متعلق مضمون لکھ رہے ہیں اور سر جیمس میسٹن کی گورنمنٹ کو برا بھلا کہہ رہے ہیں ایک رزولیوشن پاس کرے اور گورنمنٹ سے استدعا کرے کہ سوائے ہمارے سب باغی ہیں۔ کوئی کہتا تھا کہ بھائی کچھ ل میں کالا ضرور ہے۔ کیونکہ جو لوگ بلائے گئے ہیں ان میں خصوصیت رکھی گئی ہے۔ سنتا ہے کہ راجہ صاحب محمود آباد اور نواب وقار الملک جو ہمارے مسلّم لیڈر ہیں اسی لیے مدعو نہیں کیے گئے، غرض ہزار منہ اور ہزار باتیں۔

مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ جس قدر اور جلدی کے ساتھ دہلی میں اس جلسہ کی نسبت افواہیں مشہور ہوئی ہیں اس سے پہلے کبھی کسی جلسہ کی مخالفت یا موافقت میں نہیں اڑی تھیں۔

لوگ نہایت مضطرب معلوم ہوتے تھے۔ یہاں تک عملی طور پر دہلی والوں نے کر کے دکھایا کہ کئی نوٹس بورڈوں پر قلمی اشتہار اس جلسہ کی مذمت میں چسپاں کیے جس میں حکیم اجمل خاں صاحب کی نسبت بھی بہت بے ہودہ باتیں لکھی گئی تھیں یہ بھی سنا گیا ہے کہ کئی تار حکیم صاحب کے پاس بھیجے گئے تھے جس میں جلسہ کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔

یکم اکتوبر کو بہت سے لوگ اسٹیشن پر اس امر کی ٹوہ لینے پہنچے کہ جلسہ کہاں ہو گا کیونکہ کئی خبریں اس کی نسبت مشہور تھیں ایک تو یہ تھی کہ مسلمان ڈولینڈ ہوٹل میں ٹھہرائے جائیں گے اور جلسہ حکیم اجمل صاحب کے مکان میں ہو گا دوسری یہ خبر تھی کہ ٹاؤن ہال میں ہو گا۔ تیسری خبر یہ تھی کہ روشن آرا باغ میں ہو گا۔ اور چوتھی خبر یہ تھی کہ رام باغ میں ہو گا۔ لوگ بھٹکتے بھٹکتے اس تلاش میں پھرتے رہے تھے۔ وقت کے متعلق بھی پریشان تھے کہ کس وقت اور کہاں ہو گا۔

بالآخر بعض اصحاب کو معلوم ہوا کہ رام باغ میں بوقت گیارہ بجے یہ جلسہ شروع ہو گا۔ چنانچہ کچھ آدمی وہاں کی نیت سے چلے۔ دل میں سوچتے جاتے تھے کہ ممکن ہے وہاں پولیس کا پہرہ ہو یا اگر نہ ہو اور ہم پہنچ جائیں تو شاید ہم کو یہ کہہ دیا جائے کہ چلے جاؤ یہ جلسہ عام نہیں ہے۔ مگر وہاں جا کر جو دیکھا تو کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ وہاں کئی اور اصحاب ہم ہی جیسے تھے یعنی بے بلائے مگر فرق یہ تھا کہ وہ دس بیس اسٹیشن پر سے تحقیق اس لیے آئے تھے۔ اور ہم یہیں سے۔ حاضرین میں جو نواب صاحب رام پور کی طرف سے مدعو کیے گئے تھے ایک کافی تعداد تھی۔

ٹھیک ساڑھے بارہ بجے نواب صاحب رام پور تشریف لائے اور کرسی صدارت پر متمکن ہوئے۔ صاحب موصوف نے ایڈریس پڑھا اور اس میں تین مقاصد بیان کیے جو آپ کے اخبار میں شائع ہو چکے ہیں۔

نواب صاحب کا اڈریس نہایت معقول تھا اور ہمیں تعجب ہوا کہ جب یہ افتتاحی کارروائی ہے تو ناحق ایسی بے بنیاد باتیں شہر میں اڑائی گئی تھیں۔ اس کے بعد آنریبل رضا علی صاحب نے ایک مختصر تقریر کی اور فرمایا کہ میں بغیر بلائے ہوئے آیا ہوں اور ممکن ہے کہ مجھے تقریر کا کچھ حق نہ ہو۔ مگر اس امر کے لیے تیار ہوں کہ اگر مجھ سے اب بھی کہا جائے کہ چلے جاؤ تو میں چلا جاؤں گا۔ اس پر میر مجلس صاحب نے نہایت خندہ پیشانی سے فرمایا کہ یہ جلسہ آپ سے مشورہ کی غرض سے کیا گیا ہے اور ہم سب آپ کی نیک صلاح سے بھی ضرور مستفید ہوں گے۔ آپ ضرور اپنے خیالات سے ہمیں مدد دیں۔ اس پر رضا علی صاحب نے تقریر دوبارہ شروع کی اور فرمایا کہ میرے نزدیک اس جلسہ میں بعض بہا قومی لیڈر مثلاً نواب وقار الملک بہادر، راجہ صاحب محمود آباد وغیرہ مدعو نہیں کیے گئے ہیں اور اس لیے اس جلسہ کی کارروائی کو تمام مسلمانوں کی کارروائی نہیں سمجھنی چاہیے اور نہ یہ جلسہ تمام مسلمانوں کی نیابت کرتا ہے۔ اس لیے میری رائے یہ بھی ہے کہ اس کی تمام کارروائی ملتوی کی جائے اور کسی دوسری تاریخ میں یہ جلسہ منعقد کیا جائے۔ اور اس کی نسبت ایک باضابطہ نوٹس شائع کیا جائے۔ اور تمام ہندوستان سے سربرآوردہ لوگ اس میں مدعو کیے جائیں۔

اس کے بعد حامد علی خاں بیرسٹر کھڑے ہوئے اور انہوں نے فرمایا کہ میں نواب وقار الملک اور راجہ صاحب محمود آباد کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، مگر یہ ضروری نہیں سمجھتا کہ جس جلسہ میں یہ صاحبان نہ ہوں اس جلسہ میں کوئی کارروائی بھی نہ کی جائے۔ یہ لوگ ہر جلسہ کا دم چھلا نہیں ہو سکتے۔ میں نہایت ایکسٹریمسٹ ہوں مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان لوگوں کا پالیسی کا مقلد بھی ہوں۔

اس کے بعد مسٹر اظہر علی وکیل لکھنؤ نے تقریر فرمائی اور مسٹر حامد علی خاں کی تقریر کی تردید کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ یہ درست نہیں ہے کہ جس جلسہ میں تمام سربرآوردہ مسلمانوں کے ممبر نہ ہوں اس میں کوئی کارروائی کی جائے اور اس جلسہ کو عام مسلمانوں کی آواز اور ان کی قسمت کا فیصلہ کیا جائے۔

اس کے بعد مسٹر محمد یعقوب وکیل نے ایک نہایت مدلل اور معقول تقریر کی جس میں فرمایا کہ ایک انگریزی مثل مشہور ہے کہ بادشاہ یا والیان ملک کو سیاسی معاملات سے کچھ تعلق نہ ہونا چاہیے۔ ہم بالکل مانتے ہیں کہ نواب صاحب رام پور ہمارے بہی خواہ اور سچے ہمدرد ہیں۔ مگر میری رائے میں ابھی وہ وقت نہیں آیا ہے کہ حضور نواب صاحب جیسے والیان ملک ہمارے ان معاملات میں دخل دیں جن میں ہم بغیر ان کے کارروائی کر سکتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ جب ہم بالکل تھک جائیں اور کوئی علاج ہمارے پاس اپنے مرض کا نہ رہے تو ہم آپ جیسے والیان ملک کو تکلیف دیں۔ اور یہ بہت قبل از وقت ہے کہ جلسہ نواب صاحب رام پور کی طرف سے منعقد کیا جائے۔ اس لیے میری رائے ہے کہ جلسہ ملتوی کیا جائے۔

اس کے بعد سربلند جنگ حمید اللہ خاں بیرسٹر الہ آباد نے تقریر کی اور فرمایا کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر راجہ محمود آباد اور نواب وقار الملک اس جلسہ میں شریک نہیں کیے گئے ہیں تو اس جلسہ میں کوئی کارروائی بھی نہ کی جائے۔ ہم سب لوگ بھی قوم کے سربرآوردہ لیڈران میں سے ہیں اور اس امر کا حق رکھتے ہیں کہ جو مقاصد ہم لے کر یہاں

جمع ہوتے ہیں ان پر فیصلہ کریں۔

ان صاحب کی تقریر نہایت لمبی چوڑی تھی۔ اس لیے تمام حاضرین گھبرا اٹھے۔ اس لیے راجہ غلام حسین صاحب سب ایڈیٹر کامریڈ کھڑے ہوئے اور انھوں نے میر مجلس صاحب کو مخاطب کر کے یہ فرمایا کہ میری رائے میں یہ زیادہ مناسب ہوگا کہ ہر ایک بولنے والے کے لیے کچھ وقت مقرر کر دیا جائے۔ یا یہ کہ اگر وقت مقرر نہ کیا جائے تو میر مجلس صاحب ہر تقریر کرنے والے سے [illegible] کہ جب مناسب سمجھیں حکم دیں کہ وہ اپنی تقریر ختم کر دے۔ نواب سربلند کی تقریر نے حاضرین کو کچھ اس قدر اکتا دیا تھا کہ ہر شخص ایک دوسرے سے گفتگو کر رہا تھا۔ اور یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہاں کوئی میٹنگ ہو رہی ہے۔ اس قدر گڑبڑ شروع ہو گئی تھی کہ کمرہ میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس دوران میں نواب سربلند جنگ بٹھا دیے گئے اور دو چار تقریریں بھی ہو گئیں جو کسی نے سنیں اور کسی نے نہیں سنیں۔ نواب مزمل اللہ خاں، کرنل عبدالحمید صاحب وغیرہ کی تقریریں اسی دوران میں ہوئی تھیں اس لیے افسوس ہے کہ ہم ان کے سننے سے بوجوہات بالا قاصر رہے اور نہیں لکھ سکے۔

اس کے بعد آنریبل محمد شفیع نے ایک مختصر تقریر میں یہ بیان کیا کہ یہ مناسب معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ سب صاحبان کا منشا بظاہر یہ ہے کہ ایک اور جلسہ اس کارروائی کے متعلق منعقد کیا جائے، اور اس میں مختلف جگہ کے مسلمانوں کو مدعو کیا جائے اس پر رضا علی صاحب نے فرمایا کہ اس کو رزولیوشن کی طرح پیش کیا جائے تو مناسب ہے۔ اس پر باجازت صاحب میر مجلس یہ رزولیوشن پیش کیا گیا۔

اب جھگڑا اس بات پر شروع ہوا کہ مدعو کون کرے اور داعی کس کو بنایا جائے۔ بہت سے اصحاب کی رائے تھی کہ نواب صاحب رام پور مدعو کریں۔ اس پر رضا علی صاحب نے فرمایا کہ نواب صاحب رام پور اور راجہ صاحب محمود آباد دونوں کی طرف سے بلاوے بھیجے جائیں۔ اس پر نواب صاحب رام پور نے فرمایا "میری رائے میں داعی ایک ہونا چاہیے خواہ آپ لوگ راجہ صاحب محمود آباد کو بنائیں یا مجھے مقرر کر دیں۔ میرے تعلقات راجہ صاحب محمود آباد سے بہت گہرے ہیں اور اگر آپ لوگ انہیں داعی بنائیں گے اور وہ مجھے مدعو کریں گے تو میں ضرور اس جلسہ میں شریک ہوں گا۔ اس پر اظہر علی صاحب نے یہ بات پیش کی کہ اگر نواب صاحب رام پور راجہ صاحب محمود آباد کو اپنے ساتھ شریک کرنا نہیں چاہتے ہیں تو میں نواب وقار الملک بہادر کو پیش کرتا ہوں۔

اس وقت بھی کچھ ایسی گڑبڑ ہو رہی تھی کہ کوئی کچھ کہتا تھا، اور کوئی کچھ، اس پر ایک دم نواب محمد اسحٰق خاں صاحب آنریری سیکرٹری علی گڑھ کالج کھڑے ہوئے اور وہ اس قدر غصہ میں بھرے ہوئے تھے کہ باوجود نہایت تیز آواز کے اُن کی تقریر کا اصل مفہوم سمجھنے سے لوگ قاصر تھے۔ جو دو ایک فقرے سمجھ میں آسکے وہ یہ تھے کہ اتنا بڑا آدمی تمہارے جلسہ میں شریک ہوتا ہے اور تمہارے معاملات میں دلچسپی لیتا ہے اور تم لوگ اس طرح اس کی توہین کرتے ہو۔ پھر نواب صاحب رام پور سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اگر یہ لوگ آپ کی نہیں سنتے ہیں تو بس آپ بھی تشریف لے چلیے اور میں بھی چلتا ہوں۔ اس پر چونکہ رضا علی صاحب بھی بار بار کھڑے ہو کر کچھ فرماتے رہے تو آنریبل محمد شفیع اور حاذق الملک

حکیم اجمل خاں صاحب نے رضا علی صاحب سے کچھ کان میں گفتگو کی اور اُن کو باہر علیحدہ لے گئے۔ اس کے بعد رضا علی صاحب پھر کمرہ میں واپس آئے اور نواب محمد اسحٰق خاں صاحب سے اُن کی غصہ بھری تقریر میں مداخلت کرتے ہوئے جو برابر جاری تھی یہ کہا کہ آپ مجھ سے علیحدگی میں ایک بات سن لیں۔ اور یہ دونوں صاحب باہر چلے آئے اور پھر جب یہ صاحبان واپس آئے تو کسی نے یہ بات پیش کی کہ چلیے فیصلہ ہو گیا کہ نواب صاحب رام پور پریذیڈنٹ اور دائمی بنائے جائیں اور راجہ صاحب محمود آباد سیکریٹری۔

اس کی مخالفت عبد العزیز صاحب مینیجر پیسہ اخبار اور مولوی انشاء اللہ صاحب ایڈیٹر وطن نے کی اور نہایت جوش و خروش سے دونوں نے ہم زبان ہو کر کہا کہ ہم ہرگز اس بات کو منظور نہیں کریں گے اور ہم اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ مگر بالآخر قیل و قال غیاڑے کے بعد یہ رزولیوشن پاس ہوا کہ نواب صاحب رام پور پریذیڈنٹ اور دائمی بنائے جائیں اور راجہ صاحب محمود آباد سیکریٹری اور آئندہ بہت جلد کسی مناسب موقع پر جلسہ کیا جائے۔

اس کے بعد نواب صاحب رام پور باہر برآمدہ میں تشریف لے گئے جہاں کچھ کھانے پینے کا سامان نہایت سلیقے سے میزوں پر چنا ہوا تھا۔ اندر کمرے میں کچھ لوگوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اور آنریبل رضا علی صاحب و مسٹر محمد یعقوب صاحب نے اپنی موافقت کے ووٹس سردار بہادر صاحب سے لکھوائے اور سربلند جنگ صاحب نے بھی فرمایا کہ میں جن جن باتوں کا مخالف رہا ہوں اُن کو ضرور لکھوں گا۔

اسی عرصہ میں وطن کے ایڈیٹر صاحب اپنے تیہے (غصہ) میں مغلوب میز پر جھپٹے اور ان کاغذات پر جن میں رزولیوشن لکھے گئے تھے اور ووٹس لکھنے میں سردار بہادر صاحب مصروف تھے وطن صاحب نے ہاتھ رکھ کر نہایت تحکمانہ لہجہ میں پوچھا کہ

"جلسہ ختم ہو گیا ہے آپ کس قاعدہ سے لکھ رہے ہیں؟"

وہ بے چارے ہکا بکا ان کی صورت دیکھتے رہے اور آنکھوں آنکھوں میں تہذیب کی الف بے کو یاد دلا رہے تھے۔ مگر وطن صاحب نے کاغذات اُٹھا لیے اور بالآخر اُسے پھاڑنے لگے۔ مگر ایک تماشائی نوجوان نے اُن کو چراغ پا کر دیا۔ پھر سب لوگ باہر برآمدہ میں آئے اور ٹی پارٹی کا لطف اُٹھا اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہو گئے۔

حکومت اور رعایا

(از حکیم الطاف حسین آزاد[1])

جمعہ ۵ ستمبر ۱۹۱۳ء

رعایا حکومت سے ناخوش نہ ہو	اسی میں ہے مضمر حکومت کی زیست
مگر لاٹ صاحب کو پروا نہیں	بریں ملک داری بباید گریست

---

[1] یہ مشہور شاعر آزاد انصاری ہیں۔

پُراسرار جلسہ دہلی کی کیفیت آنریبل سید رضا علی کی زبانی

چہارشنبہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۳ء

مسٹر اظہر علی بحیثیت سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ اور یہ خاکسار بحیثیت قائم مقام مسلمانان روہیل کھنڈ ۹ اکتوبر کے جلسہ منعقدہ دہلی میں ناخواندہ مہمان کے طور پر شریک ہوئے ہم کو یہ خیال تھا کہ ہم جلسہ سے خارج کر دیے جائیں گے۔ مگر اس کی نوبت نہ پہنچی۔ ہز ہائینس نواب صاحب بہادر رامپور نے ایک مختصر تحریری اسپیچ فرمائی جس میں مسلم پریس کو اعتدال پر رہنے کا مشورہ دیا۔ کانپور کے افسوسناک حادثہ پر اظہار تاسف کیا۔ اور مجروحین کی مدد کے بارہ میں بیان کیا کہ کس طرح مدد کی جائے اور حضور والا نے یہ بھی ظاہر کیا کہ اگر گورنمنٹ سے مصالحت کرنے کی خواہش ہے تو میری خدمات قوم کے واسطے حاضر ہیں۔

اس کے بعد آنریبل مسٹر محمد شفیع صاحب بیرسٹرایٹ لا نے تقریر کی جس نے موجودہ معاملات پر بحث کی اور چند مسلمان قومی لیڈروں کے جلسہ امروزہ میں عدم موجودگی پر توجہ دلائی

ازاں بعد خاکسار نے قوم کے نقطۂ خیال کو جلسہ کے سامنے پیش کیا۔ اور عرض کیا کہ چونکہ قوم کے دو مسلّمہ اور واجب التعظیم لیڈر یعنی عالی جناب مشتاق حسین صاحب بہادر مدظلہ العالی اور آنریبل راجہ محمود آباد نہ مدعو کئے گئے ہیں۔ اور نہ جلسہ میں تشریف رکھتے ہیں۔ لہذا یہ جلسہ جائز طور پر اس امر کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ اپنے کو مسلمانوں کا قائم مقام جلسہ قرار دے۔ اگر آپ حضرات کی یہ خواہش ہے کہ قوم فرقہ بازی کی مصیبت سے بچ جائے تو اس جلسہ کو ہرگز کسی ایسے مسئلہ پر بحث نہیں کرنی چاہئے۔ جس کا اثر مسلمانوں کی پالیسی پر پڑتا ہو۔ بلکہ اس غرض کے لئے ایک عام جلسہ مناسب مقام پر منعقد کیا جائے۔ اور اہم قومی مسائل اس جلسہ میں پیش کئے جائیں۔ اس کے بعد خان بہادر مسٹر آل نبی صاحب رئیس آگرہ نے ایک نہایت مدلل تقریر میں میری تائید فرمائی۔ بعد ازاں مسٹر حامد علی صاحب بیرسٹرایٹ لا لکھنؤ نے فرمایا کہ اگرچہ دو لیڈران قوم شریک جلسہ نہیں مگر ان کی عدم شرکت سے جلسہ پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ صاحب موصوف نے دوران تقریر ایک ایسا جملہ بھی فرمایا کہ جس سے جلسہ میں برہمی پیدا ہوئی۔ اور بیرسٹر صاحب موصوف کو اپنے جملے کی توضیح کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مسٹر اظہر علی صاحب سیکرٹری آل انڈیا مسلم لیگ اور مسٹر محمد یعقوب صاحب وکیل مراد آباد نے پرزور اور قابلانہ تقریروں میں ظاہر کیا کہ اس جلسہ کا کسی امر کو طے کرنا نہایت غیر مآل اندیشانہ اور نامناسب کارروائی ہوگی۔ اور ممدوحین نے اس امر پر بھی زور دیا کہ یہ جلسہ قوم کا قائم مقام نہیں ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اس جلسہ کے انعقاد میں جو ریشہ دوانیاں کی گئی ہیں۔ ان پر اس واقعہ سے کہ جناب نواب صاحب وقار الملک بہادر و آنریبل راجہ محمود آباد مدعو نہیں کئے گئے۔ کافی روشنی پڑتی ہے۔

اس کے بعد عام مباحثہ شروع ہو گیا۔ جس میں مسٹر حبیب اللہ خاں صاحب سربلند جنگ نے نمایاں حصہ لیا، اگرچہ بدقسمتی سے اہل جلسہ ان کی فصیح و بلیغ تقریر کا بیشتر حصہ سمجھنے سے قاصر رہے۔

آخر میں مسٹر محمد شفیع صاحب نے ایک ریزولیوشن پیش کیا۔ جس میں ہز ہائینس کی قابل قدر افتتاحی تقریر کا شکریہ ادا کیا اور یہ تجویز پیش کی کہ اہم معاملات قومی پر غور کرنے کے لئے ایک قائم مقام جلسہ منعقد کیا جائے۔ یہ تحریک بالاتفاق منظور ہوئی۔ اس بارہ میں کہ جلسہ کس کی طرف سے منعقد کیا جائے، تھوڑا سا اختلاف پیدا ہؤا۔ مسٹر محمد شفیع صاحب نے ایک درمیانی صورت تصفیہ کی نکالی۔ جس کو ہز ہائینس نواب صاحب بہادر رام پور نے بھی منظور فرمایا۔ لیکن منشی عبدالعزیز صاحب منیجر پیسہ اخبار اور مولوی انشاء اللہ خانصاحب ایڈیٹر اخبار وطن نے اس تصفیہ کی مخالفت کر کے خواہ مخواہ جھگڑا بڑھا دیا۔

بالآخر کثرت رائے سے یہ امر طے پایا کہ جناب نواب صاحب بہادر والی رام پور کی طرف سے ایک عام جلسہ منعقد کیا جائے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قوم اس منزل پر پہنچ گئی ہے۔ جہاں سے دو راستے پھٹتے ہیں مجھے پورا بھروسہ ہے۔ کہ ہز ہائینس نواب صاحب رام پور کی دور اندیشی ایثار نفسی اور عالی ہمتی قوم میں کسی طرح تفرقہ اندازی نہ ہونے دے گی۔ ہز ہائینس نے وعدہ فرمایا کہ راجہ صاحب محمود آباد سے بغیر مشورہ کئے کوئی کام نہیں کریں گے۔

سر دست تجویز ہے کہ یہ جلسہ اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں منعقد کیا جائے۔

کانپور میں حضور وائسرائے کا ورود مسعود

جمعہ ۱۷، اکتوبر ۱۹۱۳ء

ایسے وقت میں جب کہ مسلمان ہر طرف سے مایوس ہوکر درد دل کو اپنے لئے دوا سمجھنے لگے اور ہر قسم کی چارہ جوئی سے ناامید ہو چکے تھے۔ یکایک کانپور سے یہ خبر آئی کہ خود حضور وائسرائے شملہ سے تشریف لا رہے ہیں تاکہ تمام معاملات کا تصفیہ اس طرح پر کر دیں جو مسلمانوں اور گورنمنٹ دونوں کے لئے قابل پذیرائی ہو۔ خاص خاص حلقوں میں پہلے سے خبریں گرم تھیں اور لوگوں نے بہت بے چینی کے ساتھ نتیجہ کا انتظار کرنا شروع کیا۔ سب سے پہلی خبر جو موصول ہوئی وہ مسجد کے معائنہ اور راجہ صاحب محمود آباد، مسٹر مظہر الحق اور مولانا عبدالباری سے ملاقات کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی قیدیوں کی رہائی کی خبر شائع ہوئی۔ اس وقت مسلمانوں نے ایک آہ سرد اور ان بے کسوں کی تصویریں آنکھوں کے سامنے پھر گئیں۔ جنہوں نے مسجد کے سامنے داعی اجل کو لبیک کہا تھا۔ آہ!

وہ کہتے ہیں ہماری نعش پر آج
تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے

مسلمانوں نے جو اڈریس حضور وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا اس کے مختصر اور جامع الفاظ بہت وضاحت کے ساتھ اس انصاف اور انسانی ہمدردی کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کی توقع ہز ایکسیلنسی کی ذات ستودہ صفات سے مسلمان ہمیشہ رکھتے تھے اور انہوں نے اس اعتماد پر تمام امور کا تصفیہ ہز ایکسیلنسی کی رائے پر چھوڑ دیا۔

ہز ایکسیلنسی کا جواب ممکن ہے کہ مسلمانوں کی توقعات سے کامل مطابقت نہ رکھتا ہو۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جن الفاظ میں انہوں نے مصیبت زدگان کانپور کے ساتھ اظہار ہمدردی فرمایا ہے اور جس شفقت آمیز طریقہ پر مسلمانوں کو گزشتہ واقعات کے فراموش کر دینے کے لئے ارشاد فرمایا ہے وہ بالکل اس منصب عالی کے شایاں ہے جس پر وہ فائز ہیں۔ اور اگر فیصلہ میں مسلمانوں کی امیدوں کے خلاف کچھ بات کی کمی بھی رہ گئی ہو تو جس طریقہ پر اس کا سرانجام ہوا ہے وہ غالباً مسلمانوں کے لئے تشفی بخش ہوگا۔

واقعات پر نظر ڈالتے ہوئے قیدیوں کی رہائی ایک ایسا منصفانہ اور شریفانہ فعل تھا جس نے مسلمانوں کے دلوں سے اس غم و غصہ کو قریب قریب دھو دیا ہوگا جو ۲ اگست اور اس کے بعد پے در پے واقعات سے پیدا ہو گئے تھے۔ البتہ مسجد کی دوبارہ تعمیر کی اجازت جس شرط کے ساتھ دی گئی ہے وہ محتاج تنقید ضرور ہے، اور ہمارے نزدیک چونکہ یہ مسئلہ بالکل مذہبی بنیاد پر پیدا ہوا تھا۔ اس لئے اس کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ مذہب ہی کے نقطہ خیال سے کہا جا سکتا ہے۔ اور ہم بعض خود پسندوں کی طرح اپنا تصفیہ خواہ مخواہ پبلک سے منوانا نہیں چاہتے۔ اس لئے اس بارہ میں صرف اسی قدر کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ اگر علماء کے فتوے سے اور امت کا اجماع اس فیصلہ کے ساتھ ہے تو مذہبی حیثیت سے ہم کو کوئی وجہ اعتراض کی نہیں ہو سکتی۔

قیدیوں کی رہائی اور تعمیر مسجد کے علاوہ دو امور ایسے ہیں جن کے متعلق خواہ مخواہ سوال پیدا ہوتے ہوں گے۔ ان میں سے ایک تو بیواؤں

اور یتیموں کی مستقل امداد کا مسئلہ ہے اور دوسرے کانپور کے مقامی حکام کے طرزِ عمل کے حق یا ناحق ہونے کا سوال ہے۔ یتیموں اور بیواؤں کی امداد کی ضرورت کو گورنمنٹ کے ذہن نشین کرنا یہ لقمان آموختن کے مصداق ہے اور اگرچہ ہز ایکسیلنسی نے اپنی تقریر میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا لیکن ہماری یہ توقع بے جا ہوگی کہ ہز ایکسیلنسی اس ضرورت کی طرف سے غافل نہیں ہونگے۔ اور عن قریب اس کے لئے بندوبست فرمائیں گے۔ حکام کے طرزِ عمل کے متعلق ہز ایکسیلنسی کی خاموشی ان کی دانشمندی اور اعلیٰ تدبیر کی دلیل ہے ممکن ہے کہ یہ خیال کیا جائے کہ جب مسلمانوں نے کمالِ ایمان داری اور قانون ورزی کے ساتھ ان لوگوں کے طرزِ عمل پر اظہارِ ناپسندیدگی یا جواینٹ پتھروں کو پھینکنے میں یا اور طریقہ جو قانون شکنی کی مرتکب ہونے تو حکام نے بھی جو کچھ بے احتیاطیاں اس موقع پر ہوئیں ان پر بھی تاسف کا اظہار ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اگر ملزموں کی رہائی بلا شرط کے نہ ہوئی ہوتی تو ہم اس مطالبہ میں بالکل حق بجانب تھے کہ واقعات کی تحقیقات اور تفتیش کے عفو درگذر ہی کی تھی اس لحاظ سے حکام کے طرزِ عمل کی پوری تنقید خاتمہ ملزموں کو بغیر پرسش رہا کر کے عملی طور پر کر دی گئی ہے۔

بہرحال جہاں تک ہم اس صلح کارروائی کو دیکھتے ہیں جو ۱۴ اکتوبر کو کانپور میں تمام پذیر ہوئی ہے ہم کہہ سکتے ہیں مسلمانوں کے مطالبہ کا بیشتر حصہ پورا ہو گیا اور اس کے ساتھ جس وقت ہز ایکسیلنسی کے اس ارشاد پر غور کرتے ہیں کہ میں تمہارے باپ کی جگہ ہوں اور تم میرے بچے ہو اور یہ زمانہ کہ مسلمانوں کو تمام گذشتہ واقعات بھول جانا چاہئے۔ ان تمام باتوں کا مجموعی اثر ہمارے نزدیک مسلمانوں کے لئے ہر طرح قابلِ اطمینان ہوگا۔ ہم کو امید ہے کہ مسلمان اس قضیہ نامرضیہ سے فارغ ہونے کے بعد اس قوتِ یگانگت کو جو اس وقت ان میں پیدا ہو گئی ہے زائل نہ ہونے دیں گے بلکہ فوراً اس کو دوسرے مفید اور کار آمد مشاغل میں صرف کریں گے۔

تیرے ہی صدقے میں تو خاں بہادر ہوں میں

(پنجشنبہ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۳ء)

پردۂ ساز سے اک آتی تھی شیریں آواز — میں نے خوش ہو کے جو پوچھا تو کہا سر ہوں میں
پیار سے مجھ کو خوشامد بھی کہا کرتے ہیں لوگ — کوشش منصب کے لئے بیش بہا در ہوں میں
بندۂ جاہ کے لب پر ہوں اگر میں "جی ہاں" — خود غرض کی ہوں جو دل میں تو تشکر ہوں میں

دم میں کر دیتی ہوں حل عقدۂ ماہ نیمل تو — ہدیا ساری پڑھا دیتی ہوں وہ گر ہول میں
پالیسی بھی مجھے کہتے ہیں سیاست والے — جس کو ایمان سے نہ مطلب وہ تدبر ہوں میں

سن کے چپکے سے کہا میں نے قمرؔ صدقے تنا
تیرے ہی صدقے میں تو خاں بہادر ہوں میں

سید قمر الدین احمد قمرؔ
سندیلوی

حضور وائسرائے کی تقریر

پنجشنبہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء

حضرات!

جو ایڈریس آپ نے ابھی پڑھا ہے۔ اس سے مجھے بہت زیادہ اطمینان حاصل ہوا ہے۔ اس لئے کہ اس میں صرف میرے رحم اور انصاف ہی پر اعتماد کا اظہار نہیں کیا گیا۔ بلکہ ایسی بات کی گئی ہے جس کی میں بہت زیادہ قدر کرتا ہوں۔ یعنی ہمارے ملک معظم کے ساتھ اس وفاداری کا اظہار کیا ہے جس کے متعلق میں یہ خیال کرکے خوش ہوتا ہوں کہ اس ملک کے مسلمانوں کی خصوصیت رہی ہے۔ اگر مجھے آپ کی قوم کے وفادارانہ جذبات کا یقین واثق نہ ہوتا تو میں آج تمہارے کانپور نہ آتا۔ میرے لئے یہ بالکل غیر ضروری ہے کہ جو یقین میں نے سپریم لیجسلیٹو کونسل کے اجلاس میں اس بارے میں دلائے ہیں کہ حضور ملک معظم کی رعایا کے مذہبی عقائد کے متعلق گورنمنٹ ہند کی پالیسی میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے۔ اس کو پھر دہراؤں۔ اس لئے کہ آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ یہ ایک واقعی بات ہے۔ ترقی اور تہذیب کی رفتار کے ساتھ یہ ہمیشہ ممکن ہے کہ سڑکوں، ریل اور نہروں کی تعمیر موجودہ مذہبی یا اور قسم کی عمارتوں کے ساتھ ٹکرائے لیکن آپ لوگوں کو یقین رکھنا چاہیے کہ گورنمنٹ کافی توجہ سے ان لوگوں کے تمام مطالبات پر غور کرے گی جن کے مفاد پر اس طرح اثر پہنچنے کا اندیشہ ہوگا۔ اور ہمیشہ کوشش کرے گی کہ مسئلہ متنازع کو اس طور پر حل کرے جو تمام اشخاص متعلقہ کے لئے قابل اطمینان ہو۔ چونکہ میں آپ کے لفٹیننٹ گورنر کے فیاضانہ اور مہربانہ کیرکٹر سے بخوبی واقف ہوں۔ اس لئے مجھے پورا بھروسہ ہے کہ اگر آپ بھی میرے ہی طرح مسجد کا حل ڈھونڈنے میں فکرمند ہوئے تو سر جیمس میسٹن کی خواہشات کے متفق ہو جاتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ۳ اگست کے افسوسناک واقعات کبھی ظہور میں نہ آتے۔ اور بیواؤں اور یتیموں کو اپنے خاوندوں اور سرپرستوں کے لئے رونا نہ پڑتا۔ اب یہ تمام باتیں ہو رہی ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ لوگ انہیں جلد بھول جائیں گے۔ میں خاص تمہارے اسی غرض سے آیا ہوں کہ آپ کے واسطے پیغام امن لاؤں۔ آپ اپنے ایڈریس میں مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ موجودہ صورت حالات کے مسائل اور نتائج کو فیصلہ کے لئے میرے ہاتھ میں چھوڑ دینے پر کلی طور سے مطمئن ہیں۔ اس لئے کہ آپ کو یہ یقین ہے کہ میں تمہاری کمیونٹی کی طرف سے بہت اچھے خیالات رکھتا ہوں۔ یہ سب صحیح ہے کہ میں تمہاری کمیونٹی کا بہی خواہ ہوں۔ اور میں نے اس معاملہ پر خاص توجہ مبذول کی ہے اور یہ کہ میں نے کامل غور و فکر کے بعد متنازع فیہ مسئلہ کا ایک ممکن حل معلوم کر لیا ہے۔ میں اس فیصلہ پر پہنچا ہوں کہ ۸ فیٹ بلند ایک چھتہ بنا دیا جائے اور اس پر دالان اسی طرح اور اسی مقام پر تعمیر کر دیا جائے جیسا کہ پہلے سے موجود تھا۔ مگر پہلے سے ذرا بلندی پر۔ تاکہ نیچے اس طرح ایک سڑک نکل آئے جس سے مسجد کی متعلقہ عمارت میں کسی قسم کی مداخلت اور فتور نہ ہو۔ میں اس امر کو کچھ بھی وقیع اور اہم نہیں خیال کرتا کہ وہ زمین جس پر دالان تعمیر ہوگا۔ کس کے قبضہ میں رہے گی۔ مگر یہ ضروری ہے کہ عام پبلک اور نمازی اسے بطور سڑک کے استعمال کرنے کے مجاز ہوں۔ علاوہ ازیں متولیوں کو ایک چھتہ دار محراب بنا لینی چاہئے اور ان عمارات کے نیچے بھی ایک گذرگاہ تعمیر کر لینی چاہئے جو میونسپل بورڈ کی مجوزہ تجاویز کے عین مطابق ہے۔

بلوائیوں پر اظہار نفرت :۔

اب میں ان لوگوں کی نسبت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ جنہوں نے ۳؍ اگست کو بلوہ کا ارتکاب کیا۔ میں آپ کے باپ کی جگہ پر ہوں اور آپ سب میرے بچے ہیں جب بچے غلطی کریں تو یہ ان کے سرپرست کا فرض ہے کہ باوجود قلبی محبت کی ان کی تنبیہ کریں۔ تاکہ انہیں عقل آئے اور وہ دوبارہ ویسی غلطی نہ کریں۔ میرے الفاظ کے مخاطب صرف آپ صاحبان ہی نہیں ہیں بلکہ وہ تمام لوگ جن پر بلوہ کے جرم کا الزام لگایا جاتا ہے۔ اور جو گذشتہ دس ہفتوں سے جیل خانہ میں مقید ہیں۔ جو لوگ واقعی طور سے فساد کے مرتکب ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنے آپ کو غلطی میں ڈال دیا ہے۔ کہ ان پر قانون کا مقابلہ کرنے کا الزام لگایا گیا ہے انہوں نے نہ صرف قانون کو توڑا ہے بلکہ اسلام کے اس وسیع اور مسلمہ اصول کی خلاف ورزی کی ہے جس پر ان کا ایمان ہے۔ گورنمنٹ کا فرض ہے کہ وہ تمام شدہ قانون کی پیروی کرے اور گورنمنٹ آف انڈیا کا افسر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے یہ بات کہتا ہوں کہ قانون کا ادب ہمیشہ ملحوظ رکھا جائے گا۔ معمولی حالات میں گورنمنٹ کا یہ فرض تھا کہ وہ قیدیوں پر مقدمہ چلائے اور انہیں سزا دے۔ مگر وہ کافی سزا بھگت چکے ہیں۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ میں کانپور اس لئے آیا ہوں کہ پیغام امن لاؤں میں ان لوگوں پر بھی رحم کرتا ہوں جنہوں نے بلوہ کی اشتعالک دی اور اس طرح سے اس نقصان رسانی کے مرتکب ہوئے جو اب تک ہو چکا ہے اور اس لئے کسی خاص سلوک کے مستحق نہیں رہتے۔ مگر مسجد کے متعلق موجودہ مشکل کا حل ڈھونڈنے میں اس امر کے لئے فکرمند ہوں کہ جن واقعات نے اس قدر احساس اور جوش پیدا کر دیا ہے وہ بالکل بھلا دینے چاہئیں بہرحال مجھے بھروسہ ہے کہ اگر اشتعالک دینے والوں کے ساتھ رحم کیا جائے تو ان کی غیر معتدل فصیح البیانی کے افسوسناک واقعات ان لوگوں کے لئے باعث تنبیہ ہوں گے۔ اور نیز ان لوگوں کے لئے جو آئندہ اس طرح بے پروائی کے ساتھ تقریر کرنا چاہیں گے۔ میری خواہش ہے کہ جن لوگوں پر بلوہ میں شامل ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے ان کی تکلیفات ختم کر دی جائیں۔ اور اس لئے میں نے سر جیمس مسٹن اور آنریبل مسٹر ٹیلی کے ساتھ اتفاق رائے کرتے ہوئے لوکل گورنمنٹ سے درخواست کی ہے کہ وہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۴۹۴ کے مطابق ان تمام لوگوں کے ساتھ کارروائی کرے جن کا بلوے کے ساتھ تعلق تھا۔ اور جو مقدمہ کے فیصلہ کے لئے سیشن سپرد ہو گئے تھے۔ مجھے پورے طور پر بھروسہ ہے کہ مسئلہ مسجد کا جو حل میں نے کیا ہے یا ماخوذین کے متعلق جو میں نے ابھی بیان کیا ہے اس سے نہ صرف کانپور کے مسلمانوں میں اطمینان ہو جائے گا بلکہ ہندوستان کی تمام مسلمان آبادی بھی مطمئن ہو جائے گی۔ مقامی اور بیرونی طور سے اب ایسی کارروائی کرنی چاہئے جس سے گذشتہ مہینوں کے واقعات کی افسوسناک یاد دلوں سے جاتی رہے۔ اور تمام مسلمان اپنے شہنشاہ کی وفاداری میں متحد ہو جائیں۔ اور اس خوبصورت زمین پر جہاں کہ ہم سب رہتے ہیں قانون کا انتظام، امن اور خوشحالی کے قائم و برقرار رکھنے کے لئے مقررشدہ حکام کے ساتھ وفادارانہ اتفاق کریں۔

ہز ایکسیلنسی کے جواب کا خان بہادر مولا بخش مترجم نے اردو میں ترجمہ سنایا۔

ملزمین کی رہائی :۔

ایک بہت بڑا مجمع سیشن عدالت میں ۱۰۶ ملزمین کی رہائی کی امید میں کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ مسٹر لائل سیشن جج جو اس مقدمہ کی سماعت کرنے کے لئے خاص طور پر بلائے گئے تھے، عدالت میں موجود تھے۔ اگرچہ آج کی تاریخ مقدمہ کی سماعت کے لئے مقررنہ

تھی۔ تاہم دن کے بارہ بجے جی پی۔ بوائز وکیل سرکار، مسٹر مظہر الحق، سید فضل الرحمان، اور دیگر وکلائے استغاثہ بھی عدالت میں موجود ہوئے۔ مسٹر بوائز نے بیان کیا کہ لوکل گورنمنٹ کی ہدایات کے مطابق انہوں نے تمام ملزمین کے خلاف مقدمہ واپس لینے کی درخواست کی تھی جو تین مختلف مقدمات کے ذریعے پروسیکیوشن کئے گئے ہیں۔ مسٹر مظہر الحق نے جواب میں کہا کہ وہ بخوشی اس موقع کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ اس کے بعد قیدی رہا کر دئیے گئے۔ اور گاڑیوں میں بیٹھ کر جو پہلے سے اس غرض سے مہیا رکھی گئی تھیں وہ اپنے اپنے گھروں میں پہنچا دئیے گئے۔

خلقت کا اژدہام اس قدر تھا کہ پولیس کو مجمع کا انتظام کرنے میں بہت زیادہ دقت اٹھانی پڑی۔

مساجد کی حفاظت کے لئے پولس کی حاجت ہے
خدا کو آپ نے مشکور فرمایا، عنایت ہے
پنہائی جا رہی ہیں عاملان دیں کو زنجیریں
یہ زیور سیّد سجادؑ عالی کی وراثت ہے
یہی دس بیس اگر ہیں کشتگان خنجر اندازی
تو مجھ کو سستی بازوے قاتل کی شکایت ہے
شہیدان وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے
عروس مسجد زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے
شہیدان وفا کے خون سے آتی ہیں آوازیں
کہ شبلی بمبئی میں رہ کے محروم سعادت ہے

اداریہ

وائسرائے کی تقریر پر ایک نظر

۱۰ اکتوبر ۱۹۱۳ء

وائسرائے نے واقعہ کانپور کو حاکم و محکوم یا رعیت و رعیۃ کا مسئلہ نہیں بنایا۔ بلکہ اسے خانگی رنجش سے تشبیہ دی ہے۔ جو باپ اور بیٹے میں بھی غلط فہمی سے پیدا ہو جایا کرتی ہے۔ اس تشبیہ کو استعمال کرتے ہوئے وائسرائے نے اپنی انتظامی حیثیت گورنر جنرل با جلاس کونسل کو مدنظر نہیں رکھا۔ اور نہ ماخوذین مقدمہ کو اس نظر سے دیکھا ہے جس نظر سے لوکل گورنمنٹ اور عدالت دیکھتی ہے۔ بلکہ اس میں انہوں نے زمرہ سول سروس اور افراد رعایا کو ایک ہی پدری سلطنت کا جزو خیال کیا ہے۔ جن کی باہمی یکجہتی، موافقت و موانست میں خطا اور انبساط اس فرمانروا کے لئے ہے جو دونوں سے سلطنت کے بقا و قیام امن و آسائش، فلاح و بہبودی کو قائم و مستقل رکھنے کا متمنی ہے۔ اور جس نے اپنے گورنر جنرل کو ظل الٰہی کا دامن پھیلانے کے لئے بھی سرفراز کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کارپردازانِ جلسہ دہلی کو جو مسلمانوں کی بیتابی کا اعلان کر کے اپنی وفاداری کے صدقہ میں قوم کے لئے توقیع خوش دلی لانا چاہتے تھے لطف آمیز لہجہ میں سبق دیا ہے کہ شہنشاہ عالم پناہ کے نائب اور گورنمنٹ ہند نے کبھی اہل اسلام کی وفاداری میں شبہ نہیں کیا۔ اور مسلمان ہمیشہ سلطنت کی عقیدت مندی و وفا کوشی میں سرگرم رہے ہیں اور یہی یقین واثق ہے جو ان کو شملہ سے کانپور تک لایا ہے۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝

اگر حضور وائسرائے کے ان دونوں خیالات کو ملا کر پڑھا جائے تو اس سے صاف ٹپکتا ہے کہ کم از کم اس ماہ میں سلطنت کے دل میں اگر کچھ رنج تھا تو اتنا ہی جتنا کہ ایک شفیق باپ کے دل میں اپنی نوجوان اولاد کی آزادروی سے پیدا ہو جایا کرتا ہے۔ ورنہ حقیقت میں نہ تو نوجوان اولاد کی منشا گستاخی تھی اور نہ شفیق باپ نے اسے گستاخی سمجھا۔ اور نہ اس کی اس روش پر دوسرے بھائیوں کی دلسوزی و رفاقت کو دوسرے بیٹوں کی تمردی پر محمول کیا۔ یہ ایک طریق جہانبانی ہے جو متفرقوں کے دل کو مٹھی میں کر لیتا ہے۔ اور یہی ایک ادا ہے جو انہیں واقعی مرغوب کر سکتی ہے۔ اور انہیں بندۂ بے دام بنا لیتی ہے۔ جو صدمہ کہ حضور وائسرائے کو ملک کی اس "خانگی رنجش" سے ہوا ہے۔ اس کا اظہار وہ ہر موقع پر درد بھرے دل کے ساتھ ظاہر کر چکے ہیں۔ مگر ہم کو معلوم ہے کہ آج تک جو وہ ہمارے زخموں پر مرہم نہیں رکھ سکے اس کے مزاحم وہ معاندین رہے ہیں جو فرزندان سلطنت کے ساتھ وہ پیار اور محبت بھرا رشتہ قائم رکھنا نہیں چاہتے۔ جیسے ظل اللہ کے نائب مستحکم کرنا چاہتے ہیں بلکہ وہ صرف وہ تعلق رکھنا پسند کرتے ہیں جو ایک غالب و مغلوب یا نادر و دبلی میں ہو سکتا ہے۔ ورنہ جہاں تک آپ کو معلوم ہے یہ خسروانہ فیصلہ بہت پہلے فریاد و مصیبت کو داد و راحت سے بدل دیتا۔ بہرحال ہم مشکور ہیں ان ذی منزلت صاحبان کے بھی جنہوں نے حضور وائسرائے کی سوز قلبی کے ساتھ سانحہ کا سر ملایا۔ اور احسان مند ہیں آنریبل مسٹر سید علی امام اور آنریبل مسٹر بیلی قائم مقام لفٹیننٹ گورنر کے جنہوں نے کانپور تشریف لا کر اس رشتہ کو مضبوط کرنے میں قابل ستائش امداد دی۔

اور رہا مسٹر جیمس کا تعلق ۳ اگست کے حادثہ سے حضور وائسرائے انہیں نیک سرشت اور نرم دل فرماتے ہیں اور ہم نے بھی کبھی انہیں

ان صفات۔ بہ صراحت نہیں کیا۔ ہم ہمیشہ یہ کہتے رہے ہیں کہ انہوں نے معاملات کی کامل تحقیق کرکے ان صفات کا حسب ضرورت اظہار نہیں کیا۔ مسٹر جمیس کی خدمت میں دیفیع تر ڈیپوٹیشن پیش ہوا۔ مگر انہوں نے "اقتدار" پر اپنی نیک سرشتی و نرم دلی کو نثار کر دیا۔ اور اگر وہ حضور وائسرائے ہی کی عجز ہمارے ورد گھو ہیں کر کے دوبارہ اپنی نیک سرشتی و نرم دلی کے اظہار کے میلان کا تلمیحاً بھی ارشاد فرماتے تو ممکن تھا کہ ایک اور ڈیپوٹیشن انہیں وہ سہرا باندھنے کا موقع دیتا جو بالآخر نیک سرشت اور نرم دل وائسرائے کے سر بندھا۔

این سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

جو فیصلہ ہز ایکسیلنسی نے صادر فرمایا ہے وہ پیام امن کے نام سے معنون ہے اور جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں کہ وہ بہت دیر تک اور احتیاط کے ساتھ غور و خوض کرنے کے بعد اس فیصلہ پر پہنچے ہیں ہم بھی اسے دُور اندیشی تدبر اور باہمی مصالحت کا بہترین حل مشکلات سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم اس عنوان میں نہ ماخوذین کی حیثیت پر بحث کرنا چاہتے ہیں اور نہ ان افسروں کی حیثیت پر جو اس مقدمہ میں فریق ثانی کا درجہ رکھتے تھے۔ اب ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ عہدہ داران کانپور بھی اس وقت گزشتہ قصہ کو بھلا کر اس ملاپ کی قدر کریں گے جو حضور وائسرائے کی ذات بابرکات نے آپس میں کرا دیا ہے اور مسجد کے متعلقہ ان جزئیات کو لطف و آشتی کے ساتھ طے کریں گے جو مقامی افسروں کی نزاکت پر چھوڑ دی گئی ہیں۔ خدا کرے کہ مسلمان کانپور کو دائمی امن و امان نصیب رہے اور افسروں کے ساتھ ان کے تعلقات خوشگوار رہیں، اور ہم امید کرتے ہیں کہ ایسے ہی رہیں گے۔

جھکی ذرا وہ چشم جنگ جو بھی نکل گئی دل کی آرزو بھی
بڑا مزا اُس ملاپ کا ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر

مسجد کانپور کے فیصلہ پر ایک نظر

(نوشتہ مولانا عبدالباری صاحب فرنگی محلی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حامداً و مصلیاً و مسلماً

یکشنبہ ۱۹ اکتوبر ۱۹۱۳ء

میرے اکابر حضرات اور میرے اعزہ و دیگر احباب اس وقت مجلس موید الاسلام کے دفتر جلسہ میں موجود ہیں۔ جس کے اکثر اجلاس اس دو سال کے عرصہ میں فرنگی محل میں ہوئے اور اس میں یہ حضرات شریک ہوتے رہے ہیں۔ مگر ان مع العسر یسرا جس قدر دشواریوں کا زمانہ اور سختی اور امتحان کا وقت تھا وہ بظن غالب گذر گیا۔ اس واسطے اس جلسہ کو ان جلسوں سے بلحاظ نوعیت کے فرق ہے۔ وہ مجلسیں ماتم کی ہوتی تھیں اور یہ مجلس سرور ہے۔ ہم کو نہایت مسرت ہے آپ حضرات کی خدمت میں یہ عرض کرنا ہے کہ اب سلطنت ترکی کو سکون اور طمانیت کی امید ہوئی۔ اور مسلمانان ہند کو اطمینان اور دلچسپی نصیب ہوئی۔ چونکہ آخر الامر میں مجھے بھی ایک تعلق ہے اس واسطے میں مختصراً کچھ جامع تقریر میں ان امور گذارش کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ اور اہم امور کے ظاہر کرنے سے بھی موقع اور محل کے لحاظ سے کچھ عذر نہیں ہے۔ وقت سے ان کو بھی بیان کر سکتا ہوں۔ لیکن اس وقت چونکہ بے محل ہے اس واسطے ان کے عرض کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ میرا مدعا اصل حال سے باخبر کر دینا ہے۔ میری غرض یہ نہیں ہے کہ میں قوم کے مسلّم محسن مسٹر مظہر الحق اور مسٹر راجہ علی محمد خان صاحب کو لوگ برا بھلا نہ کہیں۔ کیونکہ ہماری کارروائیاں جن حضرات کے خلاف قواعد اہل اسلام معلوم ہوں۔ ان کو حق ہے کہ وہ ہم سب کو سخت و سست کریں۔ اور جو لوگ ہم سے کسی طرح کی مخالفت رکھتے ہیں وہ بھی اس کے مستحق ہیں۔ کہ ہماری ان کارروائیوں کو بطور استحسان نہ دیکھیں۔ میں اس واسطے اس امر کو خود تسلیم کرتا ہوں کہ مجھ میں بہت سی کمزوریاں ہیں۔ میں خود غرض جاہ طلب خودستا اور قوم فروش ہوں۔ خدا میرے خبیث وجود سے یا تو دنیا کو پاک کرے یا مجھ سے ان عیوب کو دفع کر کے مجھ کو پاک کرے۔ میں ان حضرات کا دل سے اور خدا کی قسم دل سے ممنون ہوتا ہوں جو میرے عیوب مجھ سے خود یا لوگوں سے کہہ کے میرے اوپر تعلیم و شفقت کا احسان رکھتے ہیں۔ یہ لوگ تو میرے محسن ہیں۔ میں ان صاحبوں کی بھی بہی خواہی کرتا ہوں جو مجھ سے اس قدر ناخوش ہیں۔ کہ مجھ کو اور میرے متعلقین یا فتہ بزرگوں کو ناحق برا بھلا کہتے ہیں۔ بلکہ فحش گالیاں دیتے ہیں۔ یہ امر میں نے شکایت سے نہیں کہا ہے بلکہ واقعتاً ان صاحبوں کو اپنے اصلی خیالات سے آگاہ کرتا ہوں۔ یہ بھی گذارش خلاف نہ ہوگی کہ مجھے اپنے واقعی عیب چینی پر عقلاً ناراض نہ ہونا چاہئے۔ اور خیر خواہی کا تقاضا کہ خدا نے اپنے فضل و کرم سے خود ہی کر دیا ہے کہ انہیں کثیر التعداد افراد کا میری طرف حسن ظن اور عقیدہ نیک پیدا کر دیا ہے بلکہ ایسے قلوب کو میری جانب متوجہ کر دیا ہے جنہوں کو اپنے دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور مجھ پر جان نثار کرنے کو اپنی نجات تصور کرتے ہیں۔ میں خدا کا جس قدر شکر کروں کم ہے۔ مگر اس وقت آپ کے سامنے یہ ضرور ظاہر کروں گا کہ دیگر بہی خواہان قوم اور خدام اسلام ایسے نہیں ہیں کہ ان کی خدمات کو نظر

تیسرے یہ کہ ایک قاعدہ بنا دیا جاوے کہ آئندہ تحفظ مقامات متبرکہ سے مسلمانوں کو اطمینان ہو اور بدقسمتی سے پھر ایسی غلطی نہ پیش آئے جس سے مسلمانوں کو بے چینی پیدا ہو۔

چوتھے یہ کہ ان لوگوں کی خاطر خواہ تنبیہ ہو کہ جن سے آئندہ ہماری جانیں ضائع نہ ہوں۔

پانچویں یہ کہ جو عزیز جانیں مسلمانوں کی تلف ہوئیں ان کی تلافی تو ناممکن ہے مگر ان کے پسماندگان کی اشک شوئی ہو جائے۔

چھٹی یہ کہ اخبارات سے جو اس معاملہ میں ضمانتیں لی گئی ہیں ان سے درگزر کیا جائے۔

حضور وائسرائے بہادر نے تمام معاملات کے تصفیہ کے لئے بالآخر نواب لفٹیننٹ بہادر اور نواب مڈ علی امام ممبر کونسل کو کانپور بھیجا۔ ما بہ النزاع امور سے صرف بالائی تین دفعات موضِ بحث میں آئے۔ اول حصہ کے متعلق بہت زیادہ بحث ان ممبروں سے گفتگو ہوئی۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ احکام مذہبی میں کوئی کچھ نہیں دخل دے سکتا۔ حقیقتاً جس طرح سے کہ وہ حصہ لے لیا گیا ہے اسی طرح سے واپس کیا جائے۔ نہایت تنزل اور بقول ضعیف اور مخلص کے طور پر صورت مجوزہ ہے۔ اگر اس پر بھی رضامندی نہیں ہوتی تو عام حکام کو اختیار ہے۔ آخر میں یہ بھی کہہ دیا کہ میں بری الذمہ ہوں۔ علمائے کرام کی ایک مجلس جمع کی جائے۔ وہ اگر اس صورت کو جو ہم سے کہی جاتی ہے منظور فرمائیں مجھے قطعاً دریغ نہ ہوگا میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا ہوں۔ اس گفت و گو میں تمام وقت صرف ہو گیا۔ مصالحت کی امید منقطع ہو گئی۔ اس وقت میں نے یہ صورت پیش کی کہ سردست حضور وائسرائے یہ کو دالان کی چھت پر شاید دے دیں کہ ہم بنا لیں اور زمین بھی دے دیں۔ اس کو بھی ہم ہی بنائیں حسب قواعد میونسپلٹی جو تمام عمارات کی راستہ عام سے۔ پھر ہمارا اور میونسپلٹی کا معاملہ ہو جائے گا۔ اس کو تمام قانونی حضرات نے پسند کیا اور میں نے اس لئے اس کو اپنی صدارت مجوزہ سے بھی بہتر خیال کیا کہ قواعد میونسپلٹی سے ممکن ہے کہ ہم کو بہترین موقع اس کے حاصل کرنے کا ہو۔ اگر نہ ملا تو ہم مجبور ہیں۔ ویسے ہی تصور کریں گے جیسا کہ اس وقت دہلی کی جامع مسجد میں ہے ہماری حد ہے مگر تحویل میں وہ احترام نہ کرا سکتے ہیں جس کے ہم مستحق ہیں۔ انگریزوں کو جوتا پہن کے آنے سے روک نہیں سکتے۔ لیکن ہم کو امید ہے کہ رفتہ رفتہ اس جانب گورنمنٹ کو متوجہ کرنے سے ہمارا مطلب حاصل ہو جائے گا۔ اس کے واسطے نہ اس قدر جوش و خروش کی ضرورت ہے نہ اتنی بے چینی ہے۔ نہ وہ دیوانی کے مقدمات کا ہر وقت اختیار ہے مسلمانوں کو مذہبی احکام کی چارہ جوئی ہر وقت ممکن ہے۔ غرض کہ اول کی تینوں دفعات حسب دل خواہ ہو گئیں۔

کل حضور وائسرائے تشریف لائے حسب تجویز مجھ سے مسجد متنازعہ میں ہار پہنانے کی خدمت لی گئی۔ میں ان کو محسن اول اسلام تصور کر کے بخوشی اس خدمت کو انجام دینے کے لئے تیار ہو گیا۔ حضور وائسرائے نے نہایت خندہ پیشانی سے اس کا شکریہ ادا کیا اور انتہا رحمت کے ساتھ کہا کہ یہ مسجد نہایت عالیشان مستحکم بنا لی جائے۔ شاہی عطیہ بھی مسلمانوں کو اس کے واسطے دیا جائے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ جو کچھ توہین اس واقعہ سے مسلمانوں کی ہوئی تھی اس کے کچھ مقامات جناب کی اس مخصوص سرفرازی سے بھر گئے۔ میں جہاں تک اپنے علم سے کام لیتا ہوں مجھے یہ پہلا موقعہ معلوم ہوتا ہے کہ جب مجرمین کو رہائی دلانے کے واسطے خود حاکم وقت اور بادشاہ ہند کو تکلیف گوارا کرنا ہوئی ہیں خاص طور پر اس کو مسلمانوں کے احترام سے تعبیر کرتا ہوں۔ اور اسلام کی عزت سمجھتا ہوں۔ اور جناب وائسرائے والقابہ کی انتہائی مہربانی تعبیر کر کے انتہائی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور تمام مسلمانوں سے توقع ہے کہ اس امر میں میرے ہم خیال اور ہم زبان ہوں گے۔

اس کے بعد موافق تجویز دیروزہ تینوں مقاصد ہمارے حاصل ہوئے۔ تقریر کے الفاظ کی نشست اور طرز ادا نہ مجھے اس سے واقفیت تھا اس کی طرف کوئی التفات کرنا چاہئے۔ مجموعی حیثیت سے ہم اس خاص مہربانی میں حضور وائسرائے کے دلی شکر گزار ہیں نہ زیادہ

طمانیت اس وجہ سے ہو گئی کہ ہم کو نہایت معتبر طریقوں سے معلوم ہو گیا کہ معاملہ جزو مسجد میں حضور وائسرائے بہ القابہ نے ہمارے صوبے کے اعلیٰ افسر مسٹر جان ہیلی بہ القابہ سے خاص تاکیدی حکم فرمایا کہ اس کی تعمیر میں احکام اسلامیہ کے احترام کو ہر طرح مد نظر رکھنا چاہیئے۔ ہم کو ایسی نیک نام صفات حاکم مسٹر جان ہیلی بہ القابہ کی موجودگی میں ذرہ برابر بھی اس کا اندیشہ نہیں کہ ہمارے واجبی مطالبات اتباع احکام اسلامیہ دوبارہ جزو مسجد نظر انداز کئے جائیں گے۔

ہم کو بالخصوص اس معاملہ میں جناب نواب مسٹر علی امام صاحب اور جناب نواب اعلیٰ افسر صوبہ مسٹر جان ہیلی کا دل سے مشکور ہونا چاہیئے جنہوں نے اس وقت ہماری حسب دل خواہ اور آئندہ بھی ہم کو اپنی تائید کرنے کا وعدہ فرمایا ہے کل کا واقعہ نہایت مسرت خیز ہے۔ اور اسلامی تاریخ کے زریں ایام سے کل کا روز ہے۔ میں پھر حضور وائسرائے اور ان کے اسٹاف اور اپنے معزز ترین بھائی مسٹر علی امام صاحب اور صوبہ کے اعلیٰ افسر مسٹر جان ہیلی کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اور علماء سے اپیل کرتا ہوں کہ جس طرح ان حکام سے جنہوں نے اسلامی احترام کا لحاظ نہیں رکھا جائز شکایات تھیں اسی طرح ان حکام سے جنہوں نے ہر طرح اسلام کا احترام قائم رکھا اور آئندہ رکھنے پر تیار ہیں واجبی طور پر شکریہ ادا کیا جاوے۔

اب میں اپنے بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے فرائض ادا کئے۔ بلکہ اس سے پہلے ان گرامی مرتبہ نفوس کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں جنہوں نے خدا کے گھر کی حفاظت میں اپنی عزیز جانیں قربان کی ہیں۔ میں تمام مسلمانان ہند کی فیاضی اور ہمدردی اور اخوت کا دل سے مقر ہوں اور باہمی اتفاق کے لئے دست بدعا اور ہر طرح سے ساعی بنا اپنا فرض تصور کرتا ہوں۔ خدا تمام آفات ارضی و سماوی سے ان کو محفوظ رکھے اور سچے اسلامی درد میں بروز اضافہ ہو اور فلاح دارین عطا فرمائے۔ آمین۔

عام طور سے شکریہ ان وکلاء اور قانون پیشہ حضرات کا ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے مالی نقصان کا خیال نہ کر کے کامل ہمدردی کا ثبوت دیا۔ مثلاً مسٹر ناظر الدین حسن صاحب، مسٹر محمد وسیم صاحب، مسٹر محمد نسیم صاحب، مسٹر راس مسعود صاحب، مسٹر رضا علی صاحب، مسٹر ظہور احمد صاحب، خواجہ عبد المجید صاحب، مسٹر محمود صاحب و دیگر حضرات۔ یہ لوگ مستحق شکریہ کے ہیں۔ ان کی قدر ہمارے دلوں میں ہے۔ مخصوص شکریہ میں تین حضرات کا ادا کرتا ہوں۔ سب کے پہلے مستقل مزاج خطرات سے ڈر نہ رکھنے والا فدائے قوم مسٹر سید فضل الرحمن صاحب وکیل کانپور کا ہم کو مشکور ہونا چاہیئے۔ ان کی ثابت قدمی اس وقت جبکہ ان کا کوئی ہاتھ تھامنے والا موقع واردات پر نہ تھا۔ ان کے خطرات کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے اپنی سچی ہمدردی اسلام کا ثبوت دے دیا۔ ہمارے اختیار میں اس کے مکافات نہیں۔
بجز اس کے کہ ہم ان کے مشکور ہوں۔ اور ان کے لئے فلاح دارین کی دعا کریں۔ ان کے بعد میں اس شخص کا نام لوں گا جس نے مسلمانوں کا شیرازہ باندھا۔ اور جس نے اپنے اوپر حیثیت سے زیادہ بار لاد لیا۔ اور گھر بار چھوڑ کر کانپور کو اپنا مسکن بنا لیا۔ مسٹر مظہر الحق صاحب کے واسطے کسی وصف کا ذکر کرنا بے محل ہے ان کے ظاہر سے باطن بہت اچھا ہے اور مجھے اپنے نفس سے زیادہ ان کے دل میں اسلامی درد معلوم ہوتا ہے۔ دوسروں کے متعلق میں نہیں کہہ سکتا۔ ان کا جہاں تک شکریہ ادا کیا جائے وہ کم ہے۔ خدا جزائے خیر دے۔
ان سب کے بعد ——— خاص طور پر اپنے محترم عزیز سر راجہ علی محمد خاں صاحب والی ریاست محمود آباد کا شکریہ ادا کرتا ہوں یہ مستغنی عن الالقاب اس طرح اپنی ذمہ داریوں کو انجام دینے کے لئے خطرات کے مقابل ہو گئے جو انہیں کا کام تھا۔ ان کا اگر قوم و تاریخ کہا ان کی عزت اگر دلوں میں نہ ہو تو میں سمجھوں گا کہ ایسے دلوں میں حیات نہیں ہے۔ میں ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور ان کے لئے دست

یہ دعا ہوں کہ خدا ان کو مسلمانوں کی ہمدردی کا اجر عطا فرمائے۔ اور آفات ارضی و سماوی سے محفوظ رکھے۔

آخر میں وہ امر جو اول میں کہنے کے قابل تھا ذکر کرتا ہوں، وہ اسلامی اخبارات کی خدمات ہیں بالخصوص "زمیندار" "الہلال" "ہمدرد" "توحید" وغیرہ انہیں کا سبب یہ اثر ہے جو ہم عام احساس مسلمانان ہند میں پاتے ہیں۔

ہم کو ماننا پڑے گا کہ یہ ہماری زبان و ہماری قوت بازو ہمارے سچے خیر خواہ ہیں۔ انہوں نے گورنمنٹ کی بھی سچی خدمات انجام دیں۔ ان کی دشواریوں کو تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے اوپر برداشت کریں۔ علاوہ مقام کو ان سے صاف لائیں۔ ان کی ضمانتیں واپس کرا دیں۔ اگر اس میں ناکامی ہو تو خود مسلمان ان کو ادا کریں ان کی تائید نہیں اپنی تائید ہے۔

اس کے بعد مجھے اس کی بھی امید ہے کہ ہر ایک انجمن کو اپنے مصرف میں لانے کی تدبیر سوچنا چاہیے۔ پس ماندگان شہداء کی تائید اور مسجد کے استحکام سے جو بچے وہ بھی عمدہ مصرف میں خرچ ہو۔

حقیقتاً ان سب امور میں مستحق حمد و شکر وہی ذات ہے جس نے ہم کو نبی کریم کا ایسا نبی عطا فرمایا۔ اسلام نے ایسے جہانگیر و عالمگیر مذہب کی ہم کو ہدایت کی۔ تمام مسلمانوں کو ایک اخوت کے سلسلہ میں پرو دیا۔ وقتاً فوقتاً اس نے ہماری غفلتوں سے ہم کو متنبہ کیا۔ اس کے غضب میں بھی رحمت مضمر رہی۔ اسلام ہمیشہ عزت اور عزت کے لئے مسلمانوں کو پیدا کیا۔

فالحمد للہ اولہ و آخرہ والصلوٰۃ والسلام علیٰ نبی لا نبی بعدہ وعلیٰ آلہ و اصحابہ اجمعین ۰

مسجد سے خطاب

(ترجمان حقیقت مسٹر حامد اللہ صاحب افسر کی تازہ نظم)

اے عبادت گاہ مسلم سجدہ گاہ بے کساں — خانۂ اخلاق عالم باب مقصود جہاں

جلوہ فرما ہے تجھی میں شاہد حسن ازل — تیرا ہر گوشہ ہے محبوب حقیقی کا نشاں

پیاری مسجد تیری ہر اینٹ کوہ طور ہے — ذرہ ذرہ میں ہے تیرے نور حق جلوہ فشاں

ہے سحاب لطف جلوہ سقف پر انوار کا

ظل سبحان ہے سایہ تیری دیوار کا

تو مدینہ والے مولا کی ہے زندہ یادگار — تجھ سے قائم ہے ہمارے دین کا جاہ و وقار

ساری دنیا میں حفاظت دل سے ہوتی ہے تری — ہر جگہ یکساں تجھے حاصل ہے عز و افتخار

زندگی تجھ پر فدا ہو یہ ہے اپنی زندگی — مسلم دل ریش کہلاتے ہیں تیری جاں نثار

کچھ تیری تقدیس پر دھبہ نہ آنے پائے گا

تو ہو بے حرمت کبھی ہم سے نہ دیکھا جائیگا

تصفیۂ کانپور پر ایک نظر

چہارشنبہ ۲۲۔ اکتوبر

تصفیہ کانپور کے متعلق اب تک ہم کو جس قدر واقفیت ہو سکی ہے عام طور پر مسلمان ایک حد تک اظہار اطمینان کر رہے ہیں اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمانوں کا جو مطالبہ مسجد کے متعلق تھا وہ لفظ بہ لفظ پورا نہیں کیا گیا لیکن یہ بات بھی ضرور تشفی بخش ہے کہ جو کچھ تصفیہ ہوا ہے وہ احکام شرع کے مطابق ہے۔ مساجد کا شمار اوقاف میں ہے اور اوقاف میں کسی قسم کی ترمیم جو اغراض اوقاف کے خلاف ہو نا جائز ہے۔ ایسی حالت میں مسجد میں اگر کوئی ترمیم ہو سکتی تھی تو وہ صرف نمازیوں کے لیے ہو سکتی تھی۔ چنانچہ مسجد مچھلی بازار میں جو ترمیم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ زمین سے کم سے کم آٹھ فیٹ بلند ایک چھتہ بنا لیا جائے جو سابق کی طرح وضو خانہ اور غسل خانہ وغیرہ کے کام میں آئے اور نیچے ایک محراب دار راستہ نمازیوں کی آمد و رفت کے لیے ہو۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس صورت کے اختیار کرنے کی وجہ صرف یہی ہے کہ مسلسل پبلک راستہ میں چلنے والوں کے لئے راستہ مل سکے، لیکن چونکہ کل عمارت متولیوں کی طرف سے تعمیر ہوگی اور قبضہ دراصل متولیوں ہی کا رہے گا اگرچہ حضور وائسرائے نے کسی مصلحت کی بنیاد پر صاف لفظوں میں اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھا اس لئے ہماری دانست میں درپیش شدہ معاملات کے لحاظ سے فیصلہ مسلمانوں کے موافق اور قابل اطمینان ہے۔ قیدیوں کی رہائی کا حکم دیتے ہوئے ہز ایکسیلنسی کا یہ کہنا کہ وہ کافی سزا بھگت چکے۔ ممکن ہے کہ بعض دلوں میں کھٹکے خصوصاً اس لیے کہ ان پر ابھی تک کوئی جرم قانوناً ثابت نہیں ہوا۔ لیکن ہم کو اس فقرے پر تنہا نظر نہیں ڈالنی چاہیئے بلکہ کل تقریر کو مجموعی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہز ایکسیلنسی کی پوری تقریر اور ماخوذین کے مقدمہ کا تصفیہ انسانی شرافت، انصاف، ہمدردی اور رعایا پروری کا اعلیٰ نمونہ ہے جس کے ساتھ ساتھ سیاست کو بھی انہوں نے ملحوظ رکھا ہے۔

مسجد کی بے حرمتی اس کو گرانے اور اس کے بعد اس مقدس سرزمین پر معصوموں کو خون ریزی سے جو ہوئی تھی اس کا کفارہ ہم نہیں سمجھتے کہ کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن ہز ایکسیلنسی کا محض اس کام کے لئے شملہ سے کانپور آنا اور تمام امور متنازعہ کا خود فیصلہ کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ انہوں نے واقعہ کی اہمیت کو بخوبی سمجھا، اور اگر فیصلہ میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو ہم اس کو ان لکاؤلوں

پرمحمول کرتے ہیں جو ہزایکسیلینسی کے راستہ میں یقیناً پیش آئی ہوں گی، جو شخص گورنمنٹ ہند کے نظام کو بخوبی سمجھتا ہوگا وہ ان مشکلات سے بھی آگاہ ہوگا جو کسی امر کے فیصلہ اور بالخصوص ایسے فیصلہ میں پیش آسکتی تھیں۔ جس میں مخالفین کو اقتدار کے مسئلہ پر بحث کرنے کا موقع ملے۔ ہم حضور لارڈ ہارڈنگ کی نیک دلی شرافت اور عدل گستری کی ذاتی اوصاف سے بخوبی واقف ہیں اور مسلمانوں سے عام طور پر امید رکھتے ہیں کہ کم سے کم اس ذات کے ضرور مشکور ہوں گے جس نے ان کے احساسات کو سمجھا اور ان کے مذہبی جذبات کے احترام کا باوجود سیاسی دشواریوں کے لحاظ کیا۔

مسلمانوں سے ہزایکسیلنسی نے کہا ہے کہ وہ کل واقعہ کو بھول جائیں سلسلہ واقعات نے جو اہمیت اور نوعیت اختیار کر لی تھی۔ اس کے لحاظ سے ممکن ہے کہ مسلمانوں کے دلوں سے عرصہ تک یہ بات فراموش نہ ہو۔ لیکن کم سے کم وہ ہزایکسیلنسی کے اس ارشاد کو پورا کرنے کی ضرور کوشش کریں گے اور ساتھ ہی اس کے جہاں مسلمانوں سے ہم واقعات کو بھول جانے کی امید کرتے ہیں وہ اس کا بھی یقین ہے کہ وہ نتیجہ کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔

کانپور کے مشاہدات حالات

مشکل حکایتے ست کہ تقریر مے کنند

(ہمارے خاص نامہ نگار کے قلم سے)

(چہار شنبہ - ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۳ء)

جس عظیم الشان ڈرامہ کا اختتام ماخوذین مقدمہ مسجد مچھلی بازار کی رہائی پر ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو ایک بجے کانپور کے اسٹیج پر ہوا اس کی تیاریاں یوں تو بہت قبل سے ہو رہی تھی۔ مگر ۱۶ اکتوبر کو واقعات پبلک کے سامنے آ گئے تھے، اس روز ہز آنر ڈبلیو۔ سی بیلی قائم مقام لفٹننٹ گورنر صوبہ جات متحدہ ہمراہی آنریبل مسٹر سید علی امام شملہ سے اور آنریبل سر راجہ محمد علی محمد خاں بہادر، جناب مولوی عبدالباری صاحب، ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب، مسٹر محمد نعیم اور مسٹر شاہد حسین اور دیگر اصحاب لکھنؤ سے یہاں تشریف فرما ہوئے۔ اور وہ روہیل کھنڈ ریلوے اسٹیشن پر استقبال کے لیے مسٹر مظہر الحق، مفتی محمد اسماعیل تاجر چرم، حافظ صمد اللہ و سید فضل الرحمن وکیل اور دیگر معززین کانپور موجود تھے۔ یہاں پر راجہ صاحب مع دیگر ہمراہیان ایسٹ انڈین ریلوے اسٹیشن پر گئے۔ وہاں ہز اکسی لینسی اور آنریبل سید علی امام سے ملاقات کرنے کے بعد سرکٹ ہاؤس میں مولوی عبدالباری صاحب، راجہ صاحب محمود آباد، مسٹر مظہر الحق، آنریبل سید رضا علی، مسٹر شاہد حسین، مسٹر حبیب اللہ منیجر علاقہ محمود آباد، سید ظہور احمد وکیل لکھنؤ، اور آنریبل سید علی امام کی ایک باہمی کانفرنس قریب چار گھنٹے تک رہی۔ اس کانفرنس میں مقامی حضرات میں سید فضل الرحمن وکیل بھی موجود تھے۔ خدا جانے اس مجلس شوریٰ میں ایسی کیا بات ہوئی تھی کہ ممبران مجلس سے جو گفتگو سرکٹ ہاؤس کے باہر اور لوگوں سے ہوئی اُن کے چہروں سے خوشی یا رنج کی کوئی علامات ظاہر نہیں ہوتی تھیں۔ عام پبلک کو صرف اس قدر معلوم ہو سکا تھا کہ حضور وائسرائے ۲۴ اکتوبر کو ۹ بجے کانپور میں رونق افروز ہونے والے ہیں۔ اس خوشی میں ایسٹ انڈین ریلوے اسٹیشن من جانب مسلمانان کانپور پھولوں سے آراستہ کر دیا گیا تھا اور پلیٹ فارم پر سرخ رنگ کا فرش بطور پا انداز ہز اکسیلنسی کے لیے بچھا دیا گیا تھا۔

ٹھیک ۹ بجے حضور وائسرائے مچھلی بازار کے معائنہ کے لیے بہمراہی آنریبل مسٹر سید علی امام مع اپنے اسٹاف تشریف لائے۔ جہاں آنریبل مسٹر مظہر الحق، راجہ صاحب محمود آباد، حافظ محمد ہاشم صاحب، شیخ ثناء الدین صاحب راجہ عبدالغفور، مفتی محمد اسمٰعیل صاحب تاجر چرم، حاجی عبدالقیوم صاحب، سید فضل الرحمن صاحب وکیل و دیگر حضرات

نے ہز ایکسی لینسی کا خیر مقدم کیا۔ ہز ہائینس صاحب سے فرداً فرداً تعارف اور رسم سلام کے بعد حضور وائسرائے اندرون مسجد تشریف لے گئے۔ جہاں سیاہ باتات کا فرش پہلے ہی سے بچھا دیا گیا تھا۔ یہاں خون شہداء اور گولیوں کے نشانات دیکھنے کے بعد مولوی عبدالباری صاحب سے کچھ گفتگو بواسطہ سید علی امام صاحب ہوتی رہی۔ جس کے دوران میں حضور ممدوح نے مولوی عبدالباری صاحب سے فرمایا کہ واقعات گذشتہ کو خواب پریشاں کی طرح فراموش کر دینا چاہیے۔ جواب میں مولوی عبدالباری صاحب نے کہا۔ کہ اگر ہمارا مذہبی احترام باقی رہے گا تو فی الحقیقت ہم کو پچھلی باتیں یاد نہ رہیں گی۔ تزئین مسجد کے لیے حضور وائسرائے نے اپنی جیب خاص سے ایک معقول رقم عطا کرنے کا وعدہ فرمایا ہے۔

اس کے بعد سرکٹ ہاؤس میں ممبران ڈیپوٹیشن جمع ہونا شروع ہو گئے۔ جہاں مقامی حضرات کے علاوہ بیرونجات کے معززین مثل مولوی محمد نسیم صاحب ایڈوکیٹ لکھنؤ۔ سید نبی اللہ صاحب بیرسٹر۔ آنریبل سید رضا علی صاحب۔ اور اکثر وکلا اور بیرسٹران مقدمہ موجود تھے۔ حضور وائسرائے کے تشریف لانے پر جملہ ممبران ڈیپوٹیشن اور حاضرین نے کھڑے ہو کر تعظیم کی۔ اس کے بعد نواب سید سید علی خاں صاحب بہادر نے ایک خوشنما نقرئی کاسکیٹ میں رکھ کر ایڈریس پیش کیا۔ جس کو مولوی سید فضل الرحمن صاحب وکیل کانپور نے با آواز بلند پڑھا۔ ممبران ڈیپوٹیشن کے نام حسب ذیل ہیں:۔

(۱) نواب سید سید علی خاں صاحب بہادر
(۲) نواب سید جعفر علی خاں صاحب بہادر
(۳) حافظ محمد حلیم صاحب
(۴) حافظ احمد اللہ صاحب
(۵) منشی محمد اسمٰعیل صاحب تاجر چرم
(۶) شیخ محمد نثار الدین صاحب
(۷) حافظ محمد ہاشم صاحب
(۸) شیخ کریم احمد صاحب
(۹) مولوی سید فضل الرحمن صاحب وکیل۔

باوجود اس امر کے کہ ممبران وفد مقامی مسلمانوں کے صحیح قائم مقام اور معززین طبقہ کے منتخب اصحاب تھے جن میں نواب سید سید علی خاں صاحب بہادر اور نواب سید جعفر علی خاں صاحب بہادر کی شرکت ایک خاص اہمیت رکھتی تھی۔ اور شہر میں بعض حضرات کو تعجب ہے کہ ڈیپوٹیشن میں بیرونجات کے معززین کیوں شریک کیے گئے۔

ایڈریس کے ختم ہونے پر ہز ایکسی لینسی نے ایک طولانی جواب انگریزی میں پڑھا جس کے دوران میں حاضرین کسی موقع پر چیرز دیتے تھے، اور کسی موقع پر خاموش تھے۔ جواب ایڈریس حضور ممدوح نے کھڑے ہو کر پڑھا تھا۔ جس کو ممبران ڈیپوٹیشن نے حسب ارشاد عالی بیٹھ کر سنا۔ جس وقت اس جواب کا اردو ترجمہ خان بہادر مولا بخش صاحب

فرما رہے تھے۔ مسٹر بوائڈ مسٹر مظہر الحق و سید فضل الرحمٰن صاحب موٹر پر عدالت کی طرف روانہ ہو گئے۔ جہاں ہجوم کی یہ کثرت تھی کہ موٹر کے نکلنے کا راستہ قطعاً بند تھا۔ بدقت یہ لوگ عدالت کے کمرے میں داخل ہوئے۔ مسٹر لائل سشن جج کے آنے پر من جانب گورنمنٹ تین درخواستیں حسب ذیل دفعہ ۴۹۴ باضابطہ فوجداری دی گئیں۔ جن کا مضمون یہ تھا کہ "بلحاظ چند وجوہات گورنمنٹ کو ان مقدمات کا چلانا منظور نہیں ہے"۔

اس پر عدالت نے مسٹر مظہر الحق سے دریافت کیا کہ آپ کو ان درخواستوں میں کوئی عذر تو نہیں ہے؟ جس کے جواب میں مسٹر مظہر الحق نے کہا کہ میں خوشی کے ساتھ حالت موجودہ کو قبول کرتا ہوں۔

منظوری درخواست اور حکم رہائی کے بعد مسٹر مظہر الحق نے عدالت کو مبارکباد دی۔ اس کل کارروائی کے ختم ہو جانے کے بعد ماخوذین مقدمہ حافظ احمد اللہ صاحب کے اہتمام میں نہایت اطمینان کے ساتھ گاڑیوں میں بیٹھ کر اپنے گھروں میں چلے گئے۔ قریب تین بجے کے آنریبل مسٹر سید علی امام، مسٹر مظہر الحق اور راجہ صاحب محمود آباد حضور وائسرائے کے لنچ کی شرکت کے بعد بنگلہ پر تشریف لائے، جہاں جملہ وکلا و بیرسٹران و دیگر مقامی و بیرونجات کے معزز مسلمان موجود تھے۔ چار بجے راجہ صاحب محمود آباد اپنے موٹر پر سوار ہو کر لکھنؤ واپس تشریف لے گئے۔ آنریبل مسٹر مظہر الحق نے کانپور میں دو روز اور قیام کیا اور ۱۶ اکتوبر کو علی گڑھ روانہ ہو گئے۔ بوقت روانگی اسٹیشن پر مسلمانان کانپور کا اس قدر مجمع تھا کہ بدقت کھڑے ہونے کو جگہ مل سکتی تھی۔ حاضرین نے چاروں طرف سے پھولوں کی بارش کر کے اور متعدد ہار پہنا کر آپ کی ایک دلچسپ صورت بنا دی تھی۔ حکیم نواب علی برقی نے فارسی میں ایک نظم پڑھی جو آئندہ کسی مضمون کے ساتھ "ہمدرد" کے لیے بھیجوں گا۔ معلوم ہوا ہے کہ دوران سفر میں کچھ دیر کے لیے الہ آباد بھی قیام کریں گے۔

حضور وائسرائے کے تشریف لانے اور ماخوذین مقدمہ کی رہائی کا حکم سنانے نے جو مسرت اور اہمیت یہاں پیدا کر دی ہے اس کی نظیر کانپور کی تاریخ میں مفقود ہے۔ جواب ایڈریس اور فیصلہ دالان مسجد کے متعلق مختلف آوازیں سنی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ حضور وائسرائے کا حکم رہائی ملزمان بلحاظ مضمون ایڈریس ایک طرح کی کمزوری کی دلیل ہے۔ فیصلہ دالان کے متعلق بھی مختلف چہ میگوئیاں ہو رہی ہیں۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ مسٹر محمد علی اور سید وزیر حسن کی اطلاع کے بغیر یہ فیصلہ کر لینا نامناسب تھا۔ دوسری رائے جس کو وقعت دی جا رہی ہے یہ ہے کہ معاملات میں اس قدر نزاکت پیدا ہو گئی تھی کہ اس فیصلہ کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو فیصلہ حضور وائسرائے نے کیا یہی فیصلہ کلکٹر ضلع کے ذریعہ بھی ہو سکتا تھا۔ مگر اس کے جواب میں سنا جاتا ہے کہ حضور وائسرائے کے فیصلہ میں ایک خاص وقعت اور اہمیت ہے جو دوسری صورت میں حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ کچھ اس قسم کی خوش گپیاں بھی ہو رہی ہیں کہ انگلینڈ میں مسٹر محمد علی اور وزیر حسن کی (گفتگو) نے جو کام کیا ہے اس کا نتیجہ عنقریب دالان مسجد کی بحالی یا واپسی کی صورت میں ہونے والا تھا۔ اور اس لیے اس فیصلہ نے نفاذ میں عجلت کی گئی تاکہ ہوم گورنمنٹ میں اب کوئی مزید کارروائی نہ ہو سکے۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ نواب رام پور والی کانفرنس کی کامیابی کے خوف نے بھی اس

فیصلہ کے قبول کرانے میں بڑا کام کیا ہے۔ آپ کے نامہ نگار کے کانوں تک اُڑتی اُڑتی یہ خبر بھی پہنچی ہے کہ مسٹر محمد علی اور سید وزیر حسن نے تار سے اطلاع دے دی تھی کہ وہ کامیاب ہونے والے ہیں۔ بہر حال "دیکھتے منہ اُتنی باتیں" ع

ناموس عشق در تن عشاق می برند
عیب جواں ز سرزنش پیر می کنند

یہاں جس بات پر اتفاق ہے وہ یہ ہے کہ مسٹر مظہر الحق اور راجہ صاحب محمود آباد نے خصوصاً و دیگر قانون پیشہ حضرات و بزرگان قوم نے عموماً اس معاملہ میں جو قومی خدمات کی ہیں، اس کے بار گراں سے یہاں کے مسلمان کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے ہیں۔ آپ کو نامہ نگار کو یقین ہے کہ اگر اگست کے پہلے ہفتہ میں جب کہ کانپور میں قیامت صغریٰ برپا تھی بزرگان لکھنؤ مدد نہ کرتے تو یہاں کی حالت کا سنبھلنا دشوار تھا۔

سرمایہ مسجد میں اس وقت قریب مبلغ نو ہزار روپے نقد مسٹر مظہر الحق صاحب کی تحویل میں جمع ہیں۔ اس سرمایہ کے صرف کا اختیار تو بالکل ان بزرگوں کو ہے جنھوں نے اپنی جیبیں خالی کر دی ہیں۔ مگر یہاں بعض اسلامی حلقوں میں یہ رائے ظاہر کی جاتی ہے کہ اس قومی سرمایہ سے شہر میں ایک اسلامیہ سکول جس کے ساتھ ایک مسجد جامع بھی ہو اس بے نظیر قومی ایثار کی یاد میں قائم کر دیا جائے۔ تاکہ کانپور کے مسلمانوں کی سب سے بڑی ضرورت اس آسان طریقے سے رفع ہو جائے۔

لیڈر اخبار اور حضور والسرائے کا جواب اس خط کے پہنچنے تک آپ کے پاس دیگر ذرائع سے آ گیا ہو گا، اس لیے ضرورت نہیں سمجھتا کہ ان کو بھیج کر ملال انگیزی کا باعث بنوں۔

حضور وائسرائے کی تقریر

(۱)

مسلمانوں کی دل جوئی

(یک شنبہ ۲۱ ستمبر ۱۹۱۳ء)

جنگ بلقان اور اس سے پہلی جنگ طرابلس کے دوران میں مسلمانوں نے طرح طرح سے برٹش گورنمنٹ کو اس طرف توجہ دلائی کہ برطانیہ ان کے ہم مذہبوں کی خونریزی کو روکنے کی کوشش کرے۔ لیکن تمام نہاد لبرل وزارت اور اس کے بے خبر وزیر خارجہ نے بھی ثابت کرنے کی کوشش کی کہ برطانیہ کو مسلمانوں کے جذبات کی کوئی پروا نہیں ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ طریق عمل زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتا تھا، اور بالآخر لارڈ مارلی اور خود سر ایڈورڈ گرے نے اس مذہبی تعلق کو تسلیم کیا جو مختلف ممالک کے مسلمانوں کے مابین قائم ہے۔

لیکن اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کے دل میں برطانیہ کی بیگانگی اور انہیں وزراء میں سے بعض کے اقوال سے یہ بدگمانی پیدا ہو چلی تھی کہ خدانخواستہ برٹش گورنمنٹ اندرونی طور پر ٹرکی کی مخالفت پر تو آمادہ نہیں ہے؟ ہمیں پہلے بھی یقین تھا اور بعد کے نتائج سے بھی ثابت ہوتا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ان وزراء نے خاص خاص موقعوں پر ٹرکی کی مخالفت میں کہا تھا وہ ان کی ذاتی رائیں تھیں۔ اور حضور ملک معظم کی گورنمنٹ مسلمانوں کے جذبات سے ضرور متاثر ہوئی۔

۱۷ ستمبر کو شملہ میں حضور وائسرائے نے لیجسلیٹو کونسل میں جو تقریر فرمائی ہے وہ در اصل آئینہ ہے ان تمام اثرات کا جو مسلمانوں کی گذشتہ دو تین برس کی مسلسل بے چینی کی وجہ سے گورنمنٹ ہند اور حضور ملک معظم کی گورنمنٹ پر ہوا ہے۔ ہز ایکسی لینسی نے اپنی تقریر کی ابتدا بلقان اور ایران کے معاملات سے کی اور یہ کھلا ہوا ثبوت اس بات کا ہے کہ مسلمانوں کی بے چینی کو کس حد تک انہوں نے اہم سمجھا ہے اور کہاں اسے بجا تسلیم کرتے ہیں۔ ان کا یہ فرمانا کہ "جیسا کہ لارڈ مارلی نے دارالامراء میں بیان کیا تھا زمانہ جنگ میں برٹش گورنمنٹ نے جنگ جویوں کے مقابلہ میں، جس حد تک اس مرتبہ مسلمانوں کی طرف سے نمائندگی کی ہے ایسی کبھی اس سے پہلے نہیں کی تھی" صاف بتلا رہا ہے کہ مسلمانوں کی آواز رائیگاں نہیں گئی۔ اور بالآخر اس کا اثر ذمہ داران کار گورنمنٹ پر ہوا۔

ہز ایکسی لینسی نے ہم کو صرف موجودہ معاملات ہی کے متعلق اطمینان نہیں دلایا ہے بلکہ آئندہ کی بابت بھی یقین دلایا ہے کہ برطانیہ اور ٹرکی کے باہمی تعلقات زیادہ خوشگوار رہنے کی امید ہے۔ انہوں نے ٹرکی کے متعلق آئندہ امیدوں کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے کہ "اگر ٹرکی اصلاحات کی پالیسی کو مسلسل جاری رکھے تو کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ مستحکم نہ ہو جائے اور دنیا میں سب سے بڑی اسلامی سلطنت کی حیثیت سے دوسرے نمبر پر قائم نہ رہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اسلامی آبادی اور وسعت مملکت کے لحاظ سے برطانیہ اس وقت سب سے بڑی اسلامی سلطنت کہلانے کا مستحق ہے اور ٹرکی بے شک اس سے دوسرے نمبر پر ہے۔ لیکن جب اس مذہبی تعلق کا خیال کیا جاتا ہے جو صرف ہندوستان یا مصر بلکہ تمام عالم کے مسلمانوں کو ٹرکی کے ساتھ وابستہ کیے ہوئے ہے اور جسے ہز ایکسی لینسی نے بھی اپنی تقریر کے دوران میں تسلیم کیا ہے۔ تو ٹرکی کی آبادی کی کمی اس کے لیے اس بات میں حارج نہیں ہوتی کہ برطانیہ بحیثیت ایک ہم چشم کے وہ اپنی اغراض کی تائید کی توقع رکھے اور نہ غالباً برطانیہ ہی کو یورپ کی برادری میں اس بات کے اظہار کرنے میں عار معلوم ہونا چاہیے تو ازن قوت کے مسئلہ میں اس کا یہ ٹرکی کی طرف جھکنا ہوا ہے، چنانچہ حضور والسرائے نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ہم امید کرتے ہیں کہ وہ انہیں نتائج کا پیش خیمہ ثابت ہوں گے۔

ایران کے متعلق ہز ایکسی لینسی نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی بہت کچھ تسلی بخش ہے۔ ایران کی بہبودی اور فلاح کی کوشش کے امید دلانا اور اس بات کا یقین دلانا کہ ہندوستانی فوج بشیراز سے واپس بلا لی جائے گی۔ بلاشبہ اس بدگمانی کو دور کرنے کے لیے کافی ہے کہ برطانیہ ایران کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ لیکن جنوبی ایران کی تخصیص اور شمالی ایران میں روسی پیش قدمی کی وجہ سے اس ملک کے کم سے کم ایک حصہ کی طرف سے ہم ہنوز غیر مطمئن ہیں۔ ہم کو توقع رکھنا چاہیے کہ برطانیہ عنقریب اس حقیقت کو بھی معلوم کرلے گا کہ روس کی موجودگی ایران میں نہ صرف ایران کے لیے خطرناک ہے بلکہ برطانیہ کے تمام ایشیائی اغراض کے لیے مضر ہے۔

ٹرکی اور ایران کے متعلق مسلمانوں کو اطمینان دلانے کے بعد ہز ایکسی لینسی نے مسلمانوں کو ضبط و تحمل کی دوستانہ تنبیہہ کی ہے اور ان سے کہا ہے کہ برطانیہ کی غیر ملکی پالیسی کے متعلق وہ ہمیشہ وسیع النظری سے کام لیں، ہمارے نزدیک اس مشورے میں کوئی نقص نہیں نظر آتا اور غالباً ہز ایکسی لینسی نے مسلمانوں کو کبھی حد سے متجاوز ہوتے نہ دیکھا ہوگا۔ بشرطیکہ کسی خارجی اثر نے جس سے ہماری مراد سر جیمس کے پیرہ نے شورش پھیلانے والے نہیں ہیں۔ ان کو مجبور نہ کیا ہو اور ہم گورنمنٹ کو یقین دلاتے ہیں کہ جب تک وہ مسلمانوں کے غیر ملکی تعلقات کو ملحوظ خاطر رکھے گی اور جب تک ہندوستان کے اندر بلاوجہ محض ضد اور ہٹ کی بنا پر ان کی خرخشات مسترد نہ کی جائے گی۔ اس وقت تک ہمارے اور گورنمنٹ کے درمیان کسی قسم کی کشیدگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ بہرحال مجموعی طور پر ہز ایکسی لینسی کی اس تقریر کو ہم مسلمانوں کے لیے ایک پیغام امید سمجھتے ہیں۔ اور کیا عجب ہے کہ اب سے اگر معاملات کی طرف خاطر خواہ توجہ کی گئی تو جو کچھ خرابیاں پیدا ہو چکی ہیں ان کی تلافی ہو سکے۔

جس دن تم آکے ہم سے ہم آغوش ہو گئے
شکوے جو دل میں تھے وہ فراموش ہو گئے

---

(۲)

دل ربائی ہمہ آں نیست کہ عاشق بکشند
خواجہ آں ست کہ باشد غم خدمت گارش

اس سے بیشتر ہم حضور والسرائے بہادر کی تقریر کونسل کے ان حصص پر بحث کر چکے ہیں جن کا تعلق مسلمانوں کے غیر ملکی معاملات کے ساتھ مربوط تھا۔ آج ہم ان امور پر اپنی رائے پیش کرتے ہیں جن کا رشتہ ملکی معاملات کے ساتھ منسلک ہے اور ان حالات کے ساتھ وابستہ ہے جن میں ہندو مسلم ہم ردیف ہیں۔

تبت کی صورت حال پر گفتگو فرمانے کے بعد حضور والسرائے نے ان ہندوستانیوں کے حال پر توجہ فرمائی ہے جو شومی طالع سے سلطنت عظمیٰ کی خود بیں نوآبادیوں کی مقدس سرزمین پر اپنے قدم رکھ بیٹھے ہیں۔ لیکن حضور والسرائے نے ہندوستانیوں کو جزو سلطنت سمجھتے ہیں۔ وہ کالے گورے کے تفرقہ اندازامتیاز کو ناپسند کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے ملک کو یقین دلایا ہے کہ اگرچہ خود مختار نوآبادیوں کے ساتھ اس مسئلہ کا تصفیہ نازک پہلو لیے ہوئے ہے۔ تاہم گورنمنٹ ہند اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرتی ہے اور سلطنت برطانیہ کے ہر حصہ میں مسلمانوں کے مساوات حقوق پر زور دینا چاہتی ہے۔ حضور والسرائے فرماتے ہیں نوآبادیوں میں ہندوستانیوں کی شکایات کے متعلق ۱۹۱۰ئہ سے خط و کتابت ہو رہی ہے اور جب تک یہ شکایت رفع نہ ہوگی ہم برابر ان کے انسداد پر زور دیتے رہیں گے۔ ....

ہم ہز ایکسیلینسی کو اس بلند آہنگی، عالی ظرفی اور ہندی ہمدردی پر مبارک باد دیتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ نیم سرکاری ہمعصر الہ آباد اگر حضور والسرائے کی اس ہمدردی کو لارڈ ہارڈنگ کا ذاتی احساس قرار دیتا ہے اور اسے گورنمنٹ کی پالیسی کا عنوان تسلیم کرنے سے جھجکتا ہے۔ اس مسئلہ کو تو ضرور گورنمنٹ ہند کی پالیسی مان لے گا۔ لیکن پایونیر جو چاہے کہے۔ ہم جملہ ہندوستانی بھائیوں سے التماس کرتے ہیں کہ وہ اپنی متفقہ آرزوں کو اس حوصلہ کے ساتھ بلند کرتے رہیں گے کہ ان کے کار داں کے حدی خوان خود حضور والسرائے اور گورنمنٹ ہند ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ اب حافظ علیہ الرحمۃ کے اس شعر سے فال لیں۔

دست از طلب ندارم تا کام من بر آید
یا تن رسد بجاناں یا جاں ز تن بر آید

جس طرح گورنمنٹ ہند اپنی رعایا کے حقوق کو منوانے پر مصر ہے، اسی طرح ہم بھی جب تک گوہر مقصود سے اپنا دامن پر نہ کرلیں اپنے ان بھائیوں کو ذلت اور تحقیر کی زندگی سے بچانے میں سرگرم رہیں جو اس وقت جنوبی افریقہ و کناڈا

وغیرہ میں ہر قسم کے مصائب کے مقابلہ میں سینہ سپر بنے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد ہندوستان کی مرفہ الحالی کا ذکر آتا ہے جس کے متعلق اعداد و شمار ہم شائع کر چکے ہیں۔ جن سے ناظرین خود ہندوستان کی تجارتی ترقی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مگر جہاں ہزایکسلنسی کو ہندوستان کی تجارت درآمد برآمد پر بجا مسرت ہے، وہاں پنجاب کے بیشی جرائم اور بنگال کی ڈکیتیوں پر دلی رنج بھی ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ صوبہ پنجاب میں زمینداروں میں مرفہ الحالی کی وجہ سے شراب خوری اور اس ام الخبائث کے اثر سے قتل، زنا و قمار بازی کے جرائم فطرت ثانیہ ہو گئے ہیں۔ اور ہم خوش ہوں گے کہ اگر پنجاب گورنمنٹ سختی اور مصلحت کے ساتھ ان خرابیوں کو مجوزہ اصلاح کو جلد عمل میں لائے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ ان جرائم کے انسداد میں خالصۃً سیاسی معقول امداد مل سکتی ہے لیکن جاہل زمینداروں کے جرائم کی نسبت صوبۂ بنگال کی ڈکیتیاں ہر بہی خواہ ملک کے لیے درحقیقت موجب شرم و رنج ہیں۔ جیسا کہ ہزایکسلنسی فرماتے ہیں ان ڈکیتیوں کو کوئی پولٹیکل اہمیت نہیں دی جا سکتی ہے۔ اس لیے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اس قتل و غارت کی ابتدا تقسیم بنگال کی بے چینی سے ہوئی تھی۔ تو اب، حضور ملک معظم کے مراحم خسروانہ سے بدامنی اور بے چینی کا ہر ایک بہانہ رفع ہو گیا ہے۔ لیکن ان حرکات غارت گری کی وجوہات خواہ کچھ بھی ہوں ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ تعلیم یافتہ افراد اور معزز خاندانوں کے لڑکے اپنے ہی بھائیوں کے مال و جان پر حملہ کر کے عام ڈکیتوں کی طرح ملک کو تہلکہ میں ڈالیں۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ ملکی لیڈر اس دفعہ کانگریس میں اس مسئلہ پر ضرور توجہ کر کے ملک میں امن پھیلانے کی کوشش کریں گے۔ برخلاف ان ناقص العقل ڈکیتوں کے (حضور والسرائے کی رائے کے مطابق) کلکتہ کے اسکولوں اور کالجوں کے وہ طلبہ مستحق تحسین ہیں جنہوں نے حال کی طغیانی میں مصیبت زدگان کو امداد دی اور تعلیم کی برکات کو ملک پر ظاہر کیا۔ ان دونوں صورتوں پر نظر تعمق ڈالنے کے بعد ہمارا خیال ہے کہ: بدلوگ، جو ڈاکہ زنی کرتے ہیں وہ اپنے حصول مقاصد کے لیے غلط راستہ پر چل رہے ہیں۔ اور ہم توقع رکھتے ہیں کہ اب وہ اپنے رویہ کو بدل کر ایسی ملکی خدمات میں اپنے اوقات کو صرف کریں گے جن کو ہر طبقہ بہ نظر استحسان دیکھ سکے گا۔

عام ملکی حالات پر تبصرہ کرنے کے بعد حضور والسرائے مسجد کانپور کے حادثہ پر مسلمانوں کو توجہ دلاتے ہیں۔ صورت معاملات کی گتھی سلجھانے کے متعلق تو ہزایکسلنسی نے کوئی خیال ظاہر نہیں فرمایا، کیونکہ مقدمات عدالت کے زیر غور ہیں۔ مگر ان مصیبت زدگان سے قلبی ہمدردی کا اظہار فرمایا ہے جو اس حادثہ میں بیوہ ہو گئی ہیں، یا یتیم ہو گئے ہیں یا بے اولاد ہو گئے ہیں، ہم حضور کی اس تعزیت و فاتحہ خوانی کے بہت مشکور ہیں اور امید کرتے ہیں کہ ورثاء بھی اس شاہی رسم تعزیت پر سلطنت برطانیہ کے حق میں دعاگو ہوں گے۔ لیکن ہمارے کان اس سے زیادہ امید افزا پیغام کے منتظر تھے۔

کاش اگر حضور ملک معظم کے نائب السلطنت مقدمات کو عدالت کی چھان بین پر چھوڑ کر خود مسجد کے متعلق اپنے ہمدردانہ خیالات کو بھی ظاہر فرما دیتے تو جو بے چینی اس وقت مسلمانانِ ہند کو مضطرب کیے ہوئے ہے وہ مبدل

بے سکونی ہوجاتی، تاہم ہم حضور والسرائے کے احسان مند ہیں کہ انہوں نے سلطنت کی مذہبی رواداری و آزادی و حفاظت کا کھلے کھلے لفظوں میں ہمیں یقین دلایا ہے، اور ہم کلی اعتماد رکھتے ہیں کہ نکتہ رس افسران اس ارشاد کو عاقلے را اشارہ کافی ست پر محمول کر کے اپنے ہی ہاتھوں سے ان زخموں پر مرہم لگا دیں گے جن پر انہوں نے جراحی کی ہے۔

حضور والسرائے تو

خواجہ آں ست کہ باشد غم خدمت گارش

کے مصداق ہو چکے ہیں اور ہم منتظر ہیں کہ دیگر افسران بھی

دل ربائی ہمہ آں نیست کہ عاشق بکشند

کے غلط اصول کو چھوڑ کر حضور والسرائے کے سچے خاشیہ بردار بن جائیں گے۔ سردست ہم بھی کانپور کے دردانگیز واقعہ کو پس پشت ڈالتے ہیں اور سیشن جج کی عدالت پر معدلت گستری کی امید باندھتے ہیں۔

گرچہ افتاد ز زلفش گرہے در کارم
ہم چناں چشم امید از کرمش مے دارم

مسلمانوں کی فریاد

(فقیر کی صدا)

(سہ شنبہ۔ ۹ ستمبر ۱۹۱۴ء)

تیرے در پر آئے ہیں، ہم لے کر فریاد اے اللہ ‏ ‏ ‏ ہم سے بڑھ کر اس دنیا میں کون ہے ناشاد اے اللہ

ہوتی ہے اب قوم ہماری کیسی برباد اے اللہ ‏ ‏ ‏ گھر گھر ماتم ہے گھر گھر ماتم، تو ہی دے داد اے اللہ

کانپور میں خون بہا اور ملک میں بہتا پھرتا ہے ؏

کہنے کو تو لالؔ[1] ہے، لیکن سب کچھ کہتا پھرتا ہے

خون میں زخمی خوب نہائیں، تجھ کو کچھ پروا ہی نہ ہو ‏ ‏ ‏ جانیں مٹی میں مل جائیں، تجھ کو کچھ پروا ہی نہ ہو

تو جو خدائی سے کر بیٹھا، آخر یہ کس کام کی ہے؟

گھر تیرا یوں ڈھایا، تجھ کو کچھ بھی اپنے نام کی ہے؟

بیٹوں کی موت آئی، بیوائیں دل دُنیا میں کیا شاد کریں ‏ ‏ ‏ قیدی، زخمی، مُردے، آخر کس کس کو ہم یاد کریں ؏

ننھے ننھے بچے، جن کو بھیجہ کے ٹکڑے مشکل ہیں ؏ ‏ ‏ ‏ قوم جلائی ان کو تو یہ جی جانے کے قابل ہیں ؏

بندوقوں سے جسم ہوا ہے چھلنی زخم رسیدوں کا ‏ ‏ ‏ پھیلا ہے مقتل کی زمین پر یہ خون شہیدوں کا

روتے روتے نور گیا سب بیواؤں کے دیدوں کا ‏ ‏ ‏ خون ہوا بیچارے کمسن لڑکوں کی امیدوں کا

قہر کے ہاتھوں بے دردوں نے کیسے پاپڑ بیلے ہیں ‏ ‏ ‏ ہم حق پر اور ناحق ہم پہ چاروں طرف کے ریلے ہیں

مٹی کے کچھ ڈھیلے لینا جرم ہوا ہے، جور یہ ہے ‏ ‏ ‏ برچھا جائز، گولی جائز، چھرا جائز، غور یہ ہے

قہر ہوئے ہیں صدہا ہم پر، قہاری کا دَور یہ ہے ‏ ‏ ‏ پھر بھی ہم ٹھیرے ملزم، طرہ اس پر اور یہ ہے

ہاتھوں میں ہتھ کڑیاں ہیں اور پاؤں میں زنجیریں ہیں ‏ ‏ ‏ قید کی کڑیاں جھیلیں بے کس، اس کی سب تدبیریں ہیں

باپ ہے بوڑھا، بیٹا زخمی، جینے کی کچھ آس نہیں ‏ ‏ ‏ بچہ ننگا بھوکا ہے اور کوڑی اس کے پاس نہیں

قومی بہنیں لاوارث ہیں، قوم کو کیا احساس نہیں ‏ ‏ ‏ جیبوں میں سے کچھ بھی نہ نکلے، ایسا تو افلاس نہیں

اپنے گھر کے کام سے بڑھ کر کام ہے ان مجبوروں کا ‏ ‏ ‏ قوم کا وہ آرام ہے جو کام ہے ان مجبوروں کا

ہائے یتیمی! پڑ گئے اب تو جان کے لالے بچوں کو! ‏ ‏ ‏ رحم کرے قوم اور بچا لے، موت نہ کھا لے بچوں کو!

کون سخی داتا ایسا ہے جو اب پالے بچوں کو ؏ ‏ ‏ ‏ کوڑی پیسہ جو تجھے ہو، وہ دے ڈالے بچوں کو

کام یہ ساری قوم کا ہے اور کام خدا کی راہ کا ہے ‏ ‏ ‏ جو کرنا ہے کر لو یارو، یہ سودا اللہ کا ہے

(راقم فریادی)

---

[1] لالؔ کے معنی گونگے کے ہیں۔

خطوط و مقالاتِ شوکت علی

مولانا شوکت علی، جنھیں گاندھی جی پیار سے Big Brother کہا کرتے تھے اور جو دوستوں کی محفل میں "بڑے بھیا" کے نام سے پکارے جاتے تھے اور جنھیں مولانا ظفر علی خاں نے "بابائے خلافت" کا خطاب دیا تھا صرف قدوقامت ہی کے اعتبار سے بھاری بھرکم اور بڑے آدمی نہیں تھے بلکہ اپنے کردار سیرت اور شخصیت کے اعتبار سے بھی بہت بڑے، بہت اونچے اور بہت کھرے آدمی تھے۔ یہ وہ شخص تھا جو خدا کے سوا کبھی کسی سے خائف نہیں ہوا نہ بم سے ڈرا اور نہ پستول سے!

اگلے صفحات میں مولانا شوکت علی کے وہ غیر مطبوعہ خطوط بالکل پہلی مرتبہ حضرت جمال میاں کی نوازشِ خصوصی کے باعث منظرِ عام پر آ رہے ہیں جو انھوں نے اپنی نظربندی اور قید کے زمانے میں اپنے مرشد مولانا عبدالباری مرحوم کو لکھے تھے۔ ان خطوط سے جہاں آج سے پچاس سال پہلے کی سیاست کے بعض اہم واقعات نظر کے سامنے آتے ہیں وہاں ایک مردِ مومن کے وہ جذبات و حسیات بھی نظر آتے ہیں جنھوں نے زندان کی تاریک کوٹھڑی میں اسے شوقِ جہاد اور شوقِ شہادت سے بیقرار کر رکھا تھا۔

"اودھ پنچ" اور "ہمدرد" وغیرہ کے قدیم فائلوں سے شوکت صاحب کے بعض مقالات بھی اس عنوان کے تحت موجود ملیں گے۔ جو دلچسپ بھی ہیں اور تاریخی بھی!

—★—

حرفِ آغاز

(از حضرت مولانا جمال میاں خلف الصدق حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ)

برِ عظیم ہندو پاکستان کی سیاست میں انجمن خدام کعبہ کی یہی وہ پہلی انجمن ہے جس نے حکومت برطانیہ کے خلاف برملا تحریک شروع کی، یہی انجمن ہے جس نے ممالک اسلامیہ کی طرف، مسلمانان ہند کو متوجہ کیا۔ خلافت کی تحریک کے لیئے فضا تیار کی، ہندو مسلم اتحاد کا بیج بویا۔ تقسیم بنگالہ اور اُس کے بعد اس کی تنسیخ نے ہندو مسلمانوں دونوں کی نگاہوں میں برطانوی عزائم کو عریاں کر دیا تھا۔ طرابلس اور بلقان کی لڑائیوں نے برطانیہ کے خلاف جذبات بغاوت کو انداز مقاومت، سکھایا۔ مسلمانوں کو نظر آنے لگا کہ دول مغرب کی سرگرمیاں اور یونان و اٹلی کی دھمکیاں صلیبی لڑائیوں کی بچی کھچی چنگاریاں ہیں جس سے ملت ختم رسل شعلہ بر پیراہن ہے۔

اسلامی اخوت و ہمدردی اور انگریز بیزاری کا ایک ایسا عام جذبہ اس زمانہ میں پیدا ہوا جس سے مسلمانوں کا کوئی طبقہ نہیں بچا۔ علی گڈھ کے تعلیم یافتہ مغرب زدہ طبقے نے ایسے لوگ پیدا کئے جنھوں نے سرکاری نوکریوں اور دنیاوی عشرتوں سے منہ موڑ کر بلقان کے زخمیوں کی تیمارداری کے لیئے وفد روانہ کیا اس وفد میں مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی شریک تھے۔

سنہ ۱۹۱۳ء میں کانپور کی مسجد مچھلی بازار کے انہدام کا حادثہ پیش آیا جس کے ساتھ فائرنگ ہوئی اور کشتگان معرکۂ کانپور کے خون کی گلکاریاں ساری ملت کی بیداری اور عبرت کا سامان ہوگئیں، قومی مزاج سنہ ۱۹۰۷ء سے بدلنا شروع ہو گیا جب علی گڈھ کے ایک نوجوانؔ شاعر نے عہدوں اور جاگیروں کو چھوڑ کر زنجیرہ سلاسل کو اختیار کیا اور رسم عاشقی کی ایک نئی طرح ڈالی تھی ۱۸۹۸ء و ۱۸۹۹ء سے ۱۹۱۱ء، ۱۹۱۲ء تک اس ہلکے ہلکے بہنے والے چشمے نے ایک ندی کی صورت اختیار کر لی تھی جس کی رو میں نئے پرانے سب بہنے لگے تھے، شاعروں نے گل و بلبل کی جگہ "آبروئے امت مرحوم"، "تہذیب نو کی خودکشی" اپنے مضامین قرار دیئے علماء نے انگریزی اقتدار کے خلاف فتاوے دیئے اور فقہی تحریروں سے انگریزی مال کے مقاطعہ کی ترغیب دلائی، کلکتہ سے مولانا آزاد کے "الہلال" نے ضیا پاشی کی، یہی وہ وقت تھا جب علی گڈھ کے "دو رند" بڑھے اور انہوں نے زمانہ کو ایک نیا رنگ دکھا دیا۔ کرکٹ و شاعری، عیش و ملازمت، سب چھوڑ چھاڑ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی ملت کو بیدار کرنے اٹھ کھڑے ہوئے۔

مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ عالم دین و مرشد طریقت تھے انہوں نے بھی یہ محسوس کیا کہ عالم اسلام

ؔ مولانا حسرت موہانی مرحوم

پر نازک وقت آگیا ہے اور درس و تدریس و ذکر و اوراد سے بڑھ کر عبادت کا موقع سلطان جائر کے خلاف اعلاءِ کلمۃ الحق کے جہاد افضل میں ہے، کارگزاری کا دائرہ "انجمن خدام کعبہ" تھی، ۱۳۳۱ھ میں فرنگی محل ہی میں اس انجمن کی بنیاد رکھی گئی۔

خادم الخدام یا صدر مولانا عبدالباری مقرر ہوئے۔ معتمد یا سیکرٹری مولانا شوکت علی اور شیخ مشیر حسین قدوائی تھے۔ جمعیتہ اصلیہ کے ارکان مندرجہ ذیل بزرگ ہیں۔

حکیم عبدالولی صاحب جھوائی ٹولہ لکھنؤ۔ مولوی غلام محی الدین صاحب وکیل۔ قصور۔ نواب وقارالملک بہادر امروہہ۔ مولوی غلام محمد صاحب فاضل۔ ہوشیار پوری۔ مسٹر مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹر ڈاکٹر ناظرالدین حسن جناب بیرسٹر لکھنؤ اس موقع پر کچھ روپے فراہم ہوگئے۔ جو سیٹھ عبداللہ ہارون کی تحویل میں دے دیئے گئے یہی خلافت کا بنیادی سرمایہ تھا۔

مولانا شوکت علی:۔ مولانا شوکت علی کی ملکی اور ملی خدمات کو افسوس ہے کہ ابھی تک کسی غیر جانبدار مورخ نے اپنا موضوع نہیں بنایا اور کرکٹ کے اس کھلاڑی کو سیاست قومی کے میدان میں گھسیٹ لانے والے جذبہ کی تلاش کی طرف بھی کسی نے ہنوز توجہ نہیں کی اس جذبہ کی قدر کرنے کا کیا سوال ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جن کو علی برادران کے نام سے سیاسی تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی علی گڑھ کی وفادارانہ سیاست کے سایہ میں پروان چڑھنے والے وہ پہلے رہنما تھے جن کی سعیِ عمل سے ہندوستان کی پوری آبادی میں مقابلہ کے دم خم پیدا ہو گئے اور اسی کی پاداش میں جنگ عظیم اول کے زمانہ میں یہ دونوں نامور بھائی نظر بند کر دیئے گئے۔ تحریک خلافت کے زمانہ میں ترک موالات کی تجویز کو جس نے گاندھی جی کی رہنمائی میں ایک ہلچل مچادی تھی مسلمانوں کے نمائندوں سے منظور کرانے کا اہم فریضہ انجام دینے والے بھی مولانا شوکت علی تھے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ میں" سال کے آغاز میں (۱۹۲۰ء) اس طریقہ کار پر (ترک موالات و عدم تشدد) غور کرنے کے لیئے مسلمانوں کا ایک جلسہ شاید مسلم لیگ کی کونسل کا جلسہ تھا بمقام الہ آباد سید رضا علی کے مکان پر ہوا، مولانا محمد علی ابھی یورپ سے واپس نہیں آئے تھے مولانا شوکت علی موجود تھے۔ مولانا شوکت علی تو واقعی سراپا جوش تھے لیکن ان کے سوا باقی سب لوگ بہت افسردہ اور گھبرائے ہوئے تھے۔ وہ کوئی سخت کارروائی کے لئے تیار نہ تھے لیکن مخالفت کرنے کی بھی ان میں ہمت نہیں تھی، جلسہ کو گاندھی جی نے خطاب کیا جس میں تحریک چلانے کے سلسلے میں بعض شرائط منوائیں جن کے بعد ان فوجی اصطلاحوں سے جو گاندھی جی نے اپنی تقریر میں استعمال کیں اور کہنے والے کے اٹل جوش صداقت سے اکثر سامعین کے رونگٹے کھڑے ہوگئے لیکن مولانا شوکت علی وہاں موجود تھے تا کہ قدم نہ اکھڑنے دیں چنانچہ جب رائے شماری کا وقت آیا تو اکثریت نے شرما حضوری میں چپ چاپ اس تجویز یعنی جنگ

کے حق میں رائے دی ۔ (میری کہانی جلد ا)

پہلی نظر بندی کے ساتھ مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی کے افکار و اعمال میں انقلاب آگیا غیرت اسلامی اور حمیت ایمانی تو ہمیشہ سے تھی اب مطالعے اور مجاہدے سے بصیرت دینی اور معرفت کی تشنگی پیدا ہوئی یہ حضرت مولانا عبدالباری کے دست حق پرست پر ان دونوں بھائیوں نے بیعت کی اور باقاعدہ سلسلۂ عالیہ قادریہ رزاقیہ میں داخل ہوئے ۔

زیر ترتیب مکاتیب میں اُس بکھری ہوئی کہانی کی کڑیاں مل جاتی ہیں۔ یہ خطوط مرشد کے نام مرید کی بے ساختہ تحریریں ہیں جن میں سادگی و پرکاری دونوں کے مظاہرے ہیں ۔

دونوں بھائی مقید تھے اس لئے سیاسی مسائل پر زیادہ لکھ بھی نہیں سکتے تھے. اس لئے ان تحریروں میں زیادہ تر قلبی کیفیات اور شخصی مسائل پر اکتفا کیا گیا ہے ۔

مکاتیب شوکت کی ترتیب و اشاعت کا خیال کئی سال سے میرے ذہن میں تھا عرصہ ہُوا والد کے ذخیرہ تبرکات میں ایک فائل ملا جس میں مولانا شوکت علی کے بہت سے خطوط مرتب موجود تھے، مولانائے مرحوم راقم تحریر کے خاص مربی اور شفیق سرپرست تھے اور راقم تحریر کو آج جو کچھ میسّر ہے وہ بہت حد تک مولانا شوکت علی مرحوم کی توجہ اور سرپرستی کے طفیل میں ہے اس لئے تمنا تھی کہ مولانا کی سوانح کے ساتھ ان کی یہ تحریریں شائع کر دی جائیں :۔

برادرم رئیس احمد جعفری نے کراچی سے ریاض خاں پور [illegible] مجھے (۲) کے لئے مضمون لکھنے کی فرمائش کی جس کی تعمیل میں نہ کر سکا لیکن بعد کو یہ فائل میں نے جعفری صاحب کو بھیج دیا اور وعدہ کیا کہ لکھنؤ میں جو خطوط موجود ہیں ان کے نقول جلد ارسال کر دوں گا، ابھی یہ نقول جعفری صاحب تک نہیں پہنچے تھے کہ برادرم مولانا رضا صاحب نے "عبدالباری اکاڈمی" کا خاکہ بنایا اور مجھے خیال ہُوا کہ "مکاتیب شوکت" کی اشاعت اکاڈمی ہی کی طرف سے ہو۔

اس شرافت اور دیانت کی مثال آجکل کم ہے جس کا مظاہرہ رئیس احمد صاحب نے کیا میں نے جیسے ہی اپنے خطوط اُن سے مانگے انہوں نے پورا ذخیرہ بحفاظت مجھے ارسال کر دیا[1]۔ اس مجموعہ میں مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کے بہت سے خطوط شائع نہیں کئے جا رہے ہیں جو بعد کو حضرت مولانا عبدالباری کی یادداشتوں کے ساتھ شائع ہوں گے۔ اس مجموعہ میں مولانا محمد علی کے بھی وہ خطوط درج کر دیئے گئے ہیں جو مولانا شوکت علی کے خطوط کے ساتھ موصول ہوئے تھے۔ مولانا عبدالباری کے علاوہ ان میں چند خطوط مولانا سلامت اللہ مرحوم اور مولانا شہید انصاری...... کے نام بھی ہیں جس طرح مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی یکجان دو قالب تھے اسی طرح مولانا عبدالباری اور مولانا سلامت اللہ تھے اور مولانا شہید انصاری کو بھی خصوصی نسبت حاصل تھی۔

[1] بعد میں مولانا نے ازراہِ کرم یہ ذخیرہ مجھے مرحمت فرما دیا۔

از مولانا صبغۃ اللہ
شہید فرنگی محلی

حرفِ گفتنی

مکتوب نگار اور مکتوب الیہ

حضرت الحاج مولانا شوکت علی خادم کعبہ کے مکتوبات کا مجموعہ آپ کے سامنے ہے: کاتب مکاتیب کو وصال فرمائے اتنا زمانہ گزر جانے اور معیار مقتدائی کے بہت کچھ بدل جانے کے باوجود وہ ان سب خوش نصیبوں کی آنکھوں کے سامنے ہیں اور حافظوں میں رچے ہوئے ہیں جنھوں نے ان کو کبھی دیکھا یا سیدھی سادھی اردو میں ان کی سیدھی دل میں اترنے والی تقریروں کو سنا یا کسی ذاتی یا قومی مقصد کے لیے آں مرحوم کے پاس حاضری کا اتفاق ہوا۔ غالباً ہندوستان میں مولانا شوکت کے خطوط کا اتنا بڑا ذخیرہ یکجا کہیں نہ ہوگا اور ہوگا کیسے شوکت مرحوم کے اتنے گہرے، فدایانہ، مخلصانہ مسترشدانہ اور دوستانہ اور بے تکلفانہ تعلقات کسی سے نہیں تھے، جتنے حضرت مکتوب الیہ سے تھے۔ روحانی ارتباط سیاسی رفاقت اور ہم آہنگانہ اتحاد مقصد و عمل اور تھا کس کے ساتھ، مرشد کے ساتھ مسترشد کا تعلق کچھ ایسا ہوتا ہے جو کسی اور کے ساتھ نہیں ہوتا۔ مرشد روحانی باپ ہوتا ہے۔ قلبی طبیب ہوتا ہے مرکز خیال ہوتا ہے، منتہائے نظر ہوتا ہے، تمام دنیاوی اور اُخروی حاجات میں آخری امید گاہ مجازی اور پھر وہ محرم اسرار بھی جس کی جناب میں اپنے تمام حالات، خواب، واردات اور مقدس مشاغل تک مزید تعلیم کے لیے عرض کر دیے جاتے ہیں، چنانچہ ان مکاتیب میں بھی لاڈلے اور بے تکلف مسترشد نے اپنے گھریلو حالات اپنے تجارتی معاملات ہی نہیں اپنی سبحہ گردانی اور شب بیداری تک کا ذکر کر دیا ہے، اس لیے ان مکاتیب کے ذریعہ سے وہ مولانا شوکت علیؒ بھی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے۔ جن کو بہت کم آنکھوں نے دیکھا ہے، یہ اہم اسٹیج والے، مرکزی خلافت والے، میدان حریت وطن والے، کام میں نہ تھکنے والے پیکر مسلسل مجسمہ خلوص و ایثار اور بے مثال تنظیمی اور تربیتی صلاحیت رکھنے والے شوکت بھائی کا نہیں بلکہ وہ اہم ہے جس میں شوکت اپنے بہت سے خصوصیات، کمالات، معتقدات اور مصروفیات کے ساتھ صاف روشنی میں نظر آئیں گے۔

۴۱۸

۷۸۶

دہلی - ۹ مئی ۱۹۱۵ء　　　　　ضروری

قبلہ وکعبہ - السلام علیکم

میں کل صبح رامپور سے واپس آیا، مزید حالات لکھتا ہوں، جس سے حضور کو تمام معاملہ کا اندازہ ہو سکے گا۔ نواب صاحب نے اجازت دے دی تھی کہ محمد علی منصوری چلے جائیں، کیونکہ خود ان کو بخار آتا تھا، اور بچیاں بھی بیمار تھیں، ڈاکٹر صاحب نے اور انہوں نے مل کر اول سے بنگلہ منصوری میں لے لیا تھا، نواب صاحب نے جو کچھ کارروائی کرنی چاہی تھی، وہ صرف انسپکٹر جنرل پولیس ڈگلس اسٹریٹ کی وجہ سے تھی، جو سر جیمس مسٹن کا پیام زبانی لائے تھے، صاف صاف الفاظ میں کہا ہو یا نہ مگر اشتعال اور خوف ضرور نواب صاحب کو دلا کر یہ کام کرنا چاہا تھا، کیونکہ محمد علی ۱۶ اپریل کو رامپور گئے تھے، اور اسی دن شام کو سرکار کے سلام کو گئے تھے، سرکار ملے تو نہ تھے، مگر اُن کو اطلاع ضرور ہو گئی ہوگی، ۱۷ اپریل محمد علی علاقہ میں شکار کو چلے گئے، ۲۰ کو ڈگلس اسٹریٹ وہاں آیا تھا، اور اول ملاقات سے واپس آتے ہی محمد علی کو سرکار نے دریافت کیا، کہ وہ کہاں تھا، اور یہ کہ جب وہ آئے تو اس کو بلانا، کانپور میں خون برسنے کی خبر جو نامہ نگار کانپور نے بھیجی تھی، اس کا تذکرہ بھی کیا، اور کہا کہ جب مشہد مبارک میں اُس سخت واقعہ کے بعد خون نہ برسا تو کانپور میں کیا برسنا، اُس کے بعد حالات حضور کو معلوم ہیں، حکیم اجمل خاں صاحب، ڈاکٹر انصاری صاحب اور خود رامپور کے حکام نے سرکار کو سمجھایا کہ حضور کیوں اس معاملہ میں پڑتے ہیں، اگر سر جیمس مسٹن اور گورنمنٹ محمد علی کو پکڑنا چاہتی ہے تو وہ پکڑ لے، حضور کیوں پھانسی ڈالنے کا کام اپنے ذمہ لیتے ہیں، محمد علی نے آپ کے قانون کے خلاف کوئی فعل نہیں کیا ہے، نواب صاحب اسی وقت نرم پڑ گئے کیونکہ جو کچھ انہوں نے کیا تھا وہ سر جیمس مسٹن کی وجہ اور ڈگلس اسٹریٹ کے اُکسانے سے کیا تھا، ڈگلس اسٹریٹ کا رامپور آنا بلا وجہ نہ تھا ڈاکٹر انصاری سے سرکار نے مجھ کو یہی پیام بھیجا، اور چونکہ مجھ کو اُن سے اُنس تھا باوجود تمام باتوں کے میں نے اُسی وقت جواب تحریری بھیج دیا جس کی نقل بھیجتا ہوں، صاف صاف میں نے اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا، یعنی ۳۰ کو رامپور گیا بھی اور سرکار سے ملا، اور تمام معاملات پر صاف صاف گفتگو کی، میں نے کوئی بات لگی لپٹی نہیں رکھی، حضور کو تمام حالات معلوم ہو گئے ہوں گے، سرکار نے محمد علی کو منصوری جانے کی اجازت دے دی تھی، اس عرصہ میں سر جیمس مسٹن کی کوئی تحریر آئی کہ جس میں یہ لکھا تھا، کہ گورنمنٹ ہند نے مجھ سے محمد علی کی نسبت کہا تھا کہ وہ کہاں ہیں، میں نے کہہ دیا کہ اُن کو نواب صاحب رامپور نے بند کر دیا ہے، یہ یقینی امر ہے کہ نواب صاحب نے گورنمنٹ صوبہ کو کوئی اطلاع نہیں بھیجی تھی کہ محمد علی کو میں نے نظر بند کر دیا ہے، کیونکہ محمد علی نظر بند نہ تھے، پھر لوکل گورنمنٹ نے کیسے بالا بالا تملہ لکھ دیا اور بغیر نوا[illegible] صاحب سے دریافت کئے ہوئے، نواب صاحب نے اگرچہ ظاہر نہیں کیا مگر یہ بات اُن کو بہت بری معلوم ہوئی، واقعی والیان ملک کی بے توقیری کی حد ہو گئی، میرے خیال میں نواب صاحب جس وقت غور کریں گے تو اُن کو صاف معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب ظاہری باتیں مطلب کی ہیں، سر جیمس مسٹن سے زیادہ بد ظن کوئی انگریز حاکم مشکل سے ہوگا، اور ایسے حاکموں سے سلطنت برطانیہ کو دنیا میں سخت سے سخت مصیبت پڑے گی، خواہ مخواہ مخلوق کو تنگ کر کے گورنمنٹ سے دل برداشتہ کرتے ہیں۔

اس لوکل گورنمنٹ کے خط آنے کے بعد گورنمنٹ ہند کا دوسرا خط آیا جس کی عبارت میں اعتراضانہ جھلک تھی، اس میں دریافت کیا گیا کہ محمد علی کو نواب صاحب نے نظر بند خود کیا ہے یا کسی کے کہنے سے شرائط کیا ہیں، کیا محمد علی نواب صاحب کے مہمان ہیں،۔

نواب صاحب نے کمشنر بریلی کو بلایا مگر اس نے ٹال دیا، بلکہ یہ لکھ بھیجا کہ آپ کسی معتبر آدمی کو مع جواب کے بھیج دیں، اور میں جواب کو دیکھ کر اس کو مناسب مشورہ دوں گا، وہ اس وجہ سے نہیں آیا کہ گورنمنٹ ہند کو اطلاع ہونے پر نتیجہ برا ہوگا، اور سب کو اور صاف صاف معلوم ہو جائے گا جیسا کہ اب بھی ہے، کہ یہ سب کارروائی سر جیمس مسٹن اور اس کے نالائق افسروں کی ہے۔
نواب صاحب نے جواب دیا کہ محمد علی کو میں نے خود نظر بند کیا تھا، (جیسا کہنا اُن کو مجبوراً لازمی تھا) وہ صرف ایک شب میرے محل میں رہے، اور اب اپنے مکان پر ہیں، اور چونکہ وہ اور ان کے بچہ زیادہ بیمار ہو گئے ہیں، میں نے اُن کو منصوری جانے کی اجازت دے دی ہے، اب چونکہ یہ معاملہ گورنمنٹ تک پہونچ گیا ہے، اس کے بارے میں یعنی منصوری جانے کے بارے میں اگر گورنمنٹ کو کچھ اظہار رائے کرنا ہو تو قبل روانگی فرما دے، نواب صاحب نے اب سارا بوجھ گورنمنٹ پر ڈال دیا ہے، جواب کا انتظار ہے، انشاء اللہ جواب آنے پر محمد علی ۱۴ یا ۱۵ رمئی تک دہلی آکر منصوری چلے جائیں گے، یہ خط حضور جس کو مناسب سمجھیں دکھا دیں، نواب صاحب کو ہمارے ساتھ ہمدردی ہو گئی ہے، مگر وہ کسی طرح لوکل گورنمنٹ کے خلاف نہ کریں گے، ہم کو بھی کافی ثبوت مل گیا ہے، یہ سب کارروائی مسٹن صاحب کی تھی، اس لئے ہم کو نواب صاحب سے کوئی شکایت نہیں، خدا اُن کی کمزوریوں کو دور کرے، اور اُن کو ہمت دے، کہ وہ اپنے بُرے بھلے کو دیکھ سکیں، ہم اُن سے لڑنا پسند نہیں کرتے کیونکہ وہ صرف بنا لیئے گئے ہیں، ہم کو اصل بات پر توجہ کرنی چاہیئے، ابھی ہم خاموشی اور صبر سے دیکھتے ہیں، جواب آنے پر سب حالات معلوم ہو جائیں گے، اس کے بعد اگر ضرورت ہوگی، تو ہم اپنی آواز بلند کریں گے، محمد علی کے ساتھ اس قسم کی زیادتیاں کرنا ہم ہرگز گوارہ نہ کریں گے، حضور اجمیر شریف کس تاریخ جائیں گے، ہم سب کا ارادہ ہے تاریخ ورود سے مطلع فرمائیں۔

ضروری
معلوم ہوتا ہے کہ سر جیمس مسٹن کی کوشش کہ مسلمانوں میں کبھی کسی نہ کسی طرح شورش پھیلے اور ناکسرائے بدنام ہوں۔
حضور کا خادم شوکت علی،

بسم اللہ الرحمن الرحیم
لینڈ سڈاون

۱۲ اپریل ۱۹۱۵ء

محبی شوکت علی، ممالک متحدہ کی گورنمنٹ نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ تم کو اطلاع کرنے کی کہ تم کو مسلمان نوکروں کو انجمن خدام کعبہ میں داخل کرنے سے پرہیز کرنا چاہیئے، اس قسم کے تمام کام روک دینا چاہیئے،

دستخط بی۔اے اینڈرسن

۴۲۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

لینڈ سٹاؤن

۱۴ ر نومبر ۱۹۱۵ء

مجھی اینڈرسن۔ تمہارا بارہ تاریخ کا خط بہونچا جس کا جواب میں تمہیں بھیجتا ہوں، امید ہے کہ تم ممالک متحدہ کی گورنمنٹ کو اطلاعًا یہ خط روانہ کردوگے میں نے اپنے خیال میں تمام اُن احکام کی پابندی پورے طور سے جو مجھے ۱۲ر جون ۱۹۱۵ء کو نظربندی کے حکم کے ساتھ روانہ کئے گئے تھے، خواہ یہ احکام سخت ہی ہوں خواہ ناانصافی کے، اپنی موجودہ حالت میں میں کسی سے بحث نہیں کرسکتا بالخصوص گورنمنٹ عالیہ سے، لیکن انصاف یہ ہے کہ جو اطلاع گورنمنٹ کو ملی ہے کہ میں مسلمانوں کو ترغیب دلاتا رہا ہوں: کہ انجمن خدام کعبہ میں داخل ہوں، جسکے سکرٹری ہونے کا شرف خود مجھ کو حاصل ہے، اور جس اطلاع ظاہرا گورنمنٹ کو یقین معلوم ہوتا ہے، وہ واقعی سراسر بے بنیاد و غلط ہے، میں نے یہاں ایک شخص سے بھی خدام کعبہ میں داخل ہونے کی خواہش ظاہر نہیں کی، اور اگر میں نے ایسا کیا بھی ہوتا تو کوئی سرکاری حکم کی جو میرے بارے میں نافذ ہوا ہو فروگذاشت نہیں کی، اول ہی سے میں نے تمام اُن افعال سے پرہیز کیا ہے، جو میرے کسی بدخواہ کے دل میں کوئی بدگمان پیدا کرسکتے ہوں، میں اس کے مثال میں ایک امر پیش کرتا ہوں، تم جانتے ہو کہ لینڈ سٹاؤن ایک چھوٹی جگہ ہے، اور کئی ہفتہ سے یہاں کوئی امام نماز جمعہ پڑھانے کو نہیں ہے، اور جب ایک تھا تو وہ اس قدر ضعیف اور کمزور تھا، کہ خطبہ بھی درست نہیں پڑھ سکتا تھا، مسلمان ہونے کی حیثیت سے مجھ پر اور اگر کوئی اور قابل آدمی موجود ہو اُس پر یہ فرض تھا کہ نماز پڑھاتا تا کہ نماز درستی کے ساتھ ادا ہوتی، لوگوں نے بارہا مجھ سے نماز پڑھانے کے واسطے سخت اصرار کیا، لیکن میں نے محض اس وجہ سے انکار کیا کہ میرے بارے میں کوئی بدگمانی نہ پیدا ہو، واقعی میں یہ میری ایک مذہبی کمزوری تھی، جسے میں دعا کرتا ہوں، اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا، میں نے جمعتہ الوداع کو نماز پڑھانے باوجود لوگوں کے سخت اصرار قطعًا انکار کیا، اور صرف مجبور ہوکر آخر میں دعا مانگی جو دعا میں اپنی تمام زندگی مانگتا رہا ہوں، مسٹر پارکر کے سامنے مانگ چکا ہوں، اور خوشی سے لفٹنٹ گورنر یا کسی اور شخص کے روبرو مانگنے کو تیار ہوں، ہر نماز کے آخر میں ہر مسلمان اس دعا کو پڑھتا ہے، جس میں وہ اسلام فتح اسلام، خلیفتہ الرسول خود اپنے، اپنے اعزا، احبا اور تمام دنیا کے مسلمان مرد و عورت کے تحفظ کے واسطے دعا کرتا ہے، ہر مسجد میں بلا اعلان یہ دعا ہندوستان کی ہر مسجد میں نماز کے بعد مانگی جاتی ہے، اور خاص کر بمبئی، کلکتہ، مدارس اور رامپور کی مساجد میں، اب خدام کعبہ کے بارے میں میں سخت پشیمان ہوں کہ میں نے اب تک یہاں کسی شخص کو خدام کعبہ میں داخل ہونے کی ترغیب نہیں دی ہے، وہ خدام کعبہ جو واقعی ایک بہت بڑی مذہبی تحریک ہے، اور جو مجھے یقین ہے، کہ اسلام کو زندہ کردینے میں بہت مدد کرے گی، اور ہم لوگوں کو بہتر مسلمان بنا دے گی، اور یوں گورنمنٹ کی بہتر اور زائد قابل قدر رعایا بنا دے گی، یہاں کئی آدمی خدام کعبہ میں داخل ہوئے ہیں، لیکن میرے کہنے سے نہیں، مجھے امید ہے کہ گورنمنٹ میری بات کا یقین کرے گی، اور اگر نہیں تو ان اشخاص سے خود دریافت کرے گی، تب گورنمنٹ کو اس بات کا یقین ہوجاوے گا کہ مجھ پر ایسے فعل کا الزام لگایا گیا جو واقعی میں میں نے ہرگز نہیں کیا تھا، چند مسلمانوں نے میرے پاس آکر یہ ضرور دریافت کیا تھا، کہ اس تحریک کا مقصد کیا ہے

اور میں نے بخوشی حتی الامکان پورے طور پر سے اُنہیں مطلع کردیا، اور یہ جو میں نے کہا ہر مسلمان کا فرض ہے، میں خود دل و جان
سے کعبہ شریف کی خدمت کے واسطے تیار ہوں، اور زندگی بھر اگر خدا نے چاہا تو حتی المقدور کرتا رہوں گا، اور ہر مسلمان پر فرض
ہے، مجھے اس امر کی ضرورت ہیں اپنے سے لئے۔ کوٹ اور زرد نشان خدام کعبہ کا تذکرہ کروں کیونکہ تم اُسے خود متعدد بار دیکھ
چکے ہو، جو جب میں ۶ر مئی ۱۳ء کو خدام کعبہ میں شامل ہوا ہوں یہ کوٹ اور نشان برابر میرے جسم پر رہا ہے، اور جس نے
مجھے دیکھا ہوگا، انہیں بھی دیکھا ہوگا اور شاید لفٹننٹ گورنر اور چیف سکرٹری نے بھی جب میں نے اُن سے رامپور کی ۱۳ء
کی جون کی دعوت میں ملاقات کی تھی ضرور اس کوٹ اور نشان کو دیکھا ہوگا، میں نے ان چیزوں کو لینڈ سٹاؤن کے مسلمانوں
کو ترغیب لانے کے واسطے نہیں پہنا تھا، اگر انہیں چیزوں نے مسلمانوں کے دلوں کو تسخیر کرکے اُن میں شریف و پاک خواہش
پیدا کردی کہ اس بڑی تحریک میں حصہ لیں اور اس طور پر زندگی بہتری اور خلوص کے ساتھ بسر کریں تو مجھے اس امر کی بہت
خوشی ہے، اور امید کرتا ہوں کہ یہاں اور عاقبت میں، دونوں جگہ مجھے اجر نیک ملے گا، میں نہیں جانتا کہ گورنمنٹ ممالک متحدہ
کے خیالات خدام کعبہ کے بارے میں کیا ہیں، لیکن یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے خادم الخدام حضرت مولانا عبدالباری صاحب
قبلہ فرنگی محلی تک اور وائسرائے کے پرائیویٹ سکرٹری کے درمیان جو خط وکتابت ہوئی تھی، جس میں ہم نے تمام اپنے اعلیٰ اعلیٰ
خیالات و جذبات ظاہر کئے تھے، اُس کے جواب میں ہر ایکسیلنسی نے لکھا تھا کہ وہ ایسی مذہبی انجمن کے بارے میں کوئی رائے ظاہر
کرنا مناسب نہیں خیال کرتے، میں نے خود گورنر بمبئی اور دوسرے بڑے بڑے سرکاری حکام سے ملکر جن میں سی آئی ڈی کے
افسران بھی ہیں، تمام قوانین و ضوابط کی نقلیں اُنہیں دی ہیں، اُن سے اپنے کام کی حالت بیان کی ہے، اور کئی بار انجمن کے
مختلف امور پر بحثیں کی ہیں، حجاز شریف کے زائرین کی جو خدمت ہم نے کی ہے، اُس کی بے حد تعریف کی گئی ہے، اور اب
بھی ہمارے کارندے اس معاملہ میں بمبئی میں اور دوسری جگہوں پر خوب کام کر رہے ہیں، جنگ کے اختتام پر ہمارا قصد ہے کہ اگر
خدا نے چاہا تو ایک آل انڈیا شپنگ کنسرن قائم کرکے گورنمنٹ کو زائرین کے حجاز کے تمام تردوات و افکار سے سبکدوش
کردیں گے، اس کمپنی میں رئیس سے لے کر فقیر تک، اپنی حیثیت کے مطابق حصہ لے گا، اور انشاء اللہ یہ مرحلہ بالکل طے
ہوجاوے گا، میں نے دوبارہ ہز آنر سر جیمس مسٹن سے خواہش کی مجھے ملاقات کی اجازت دیں تاکہ میں خود اُنہیں تمام امور سے مطلع
کردوں، لیکن وہ اور امور ضروری میں بیحد مشغول تھے اور اُنہیں موقع نہ ملا، میں پھر یہ خواہش پیش کرتا ہوں، کہ میں بہت
ممنون ہوں گا اگر ہز آنر مجھے موقع دیں کہ میں مل کر اس اہم اور عمدہ انجمن کے بارے میں اُنہیں پوری پوری اطلاع دوں،
مجھے بالکل خواہش نہیں کہ میں اپنے ذاتی امور پر بحث کروں، اگر میرے ساتھ زیادتی یا نا انصافی کی جاوے تو یہ چنداں مضر نہیں؛
لیکن میرے خیال میں یہ گورنمنٹ یا لوگوں کے واسطے کوئی معمولی برائی نہ ہوگی، اگر ایک اہم مذہبی انجمن جو احکامات قرآنی پر مبنی
ہو مثل خدام کعبہ بد ظنی کی نگاہ سے دیکھی جاوے، میں اس بارے میں یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ خدمت کعبہ شریف ہر مسلمان
مرد و عورت و بچہ پر فرض ہے، اور ہر مسلمان کو اگر وہ مسلمان رہنا چاہتا ہے، تو خدام کعبہ ہونا چاہیئے، ہماری انجمن صرف اس وجہ
سے قائم کی گئی ہے، کہ مسلمانوں کو خدا کے ایک ایسے حکم پر عمل کرنے میں مدد کرے جسے انہوں نے فروگذاشت کردیا تھا، خاص کر
حال میں جب کہ خادم الحرمین الشریفین خلیفۃ الرسول امیر المومنین سلطان المعظم ترکی خلد اللہ ملکہ وسلطنتہ، ایسے کمزور ہوگئے ہیں، کہ

مقامات مقدسہ کی حرمت غیر مسلم سلطنتوں کے خلاف قائم رکھنا ایک مشکوک امر باعتبار اُن کی طاقت کے تمام دنیا کے مسلمان خیال کرنے لگے ہیں، مجھ کو یہ تحریر کرنے کی ضرورت نہیں، کہ سرکاری دس کروڑ مسلمان رعایا کس قدر خوش ہوئی، اس اعلان سے جو اوائل جنگ میں شائع کیا گیا تھا، کہ اسلام کے مقامات مقدسہ کی حرمت برقرار رکھی جائے گی، یہ فعل نہایت مدبرانہ تھا، اور تمام وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ عرب پاک کو سلطنت انگلشیہ میں ملالینا چاہیئے، اور اس طور پر گورنمنٹ کو دھوکا دے کر اپنی زبانی وفاداری کا یقین دلانا چاہتے ہیں، اس سلطنت کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اور اس قابل ہیں کہ پھانسی دے کر سب سے اونچے درخت سے لٹکا دیئے جاویں، میرے بعض بعض عقائد ہیں جو میرے ایمان کا جز ہیں، اور جن کے بارے میں قرآن پاک میں صاف صاف تنبیہ ہے۔ ہز آنر لفٹنٹ گورنر خود بھی ایک مذہبی آدمی ہیں، مجھے یقین ہے کہ اس بات کو پسند کریں گے کہ ہر شخص اپنے مذہب کا پابند رہے، خواہ اُس کا مذہب اُن کے مذہب سے بالکل جدا ہی کیوں نہ ہو، میں حتی الامکان کوشش کروں گا کہ گورنمنٹ کے تمام احکام کی پابندی کروں، اگر وہ ان احکام کے خلاف ہونگے جو تیرہ ۱۳ سو برس قبل ایک کہیں بالاتر بارگاہ سے ملے ہیں یعنی میرا اشارہ جو تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے، مجھے یہ خوف نہیں ہے کہ گورنمنٹ کسی کو مجبور کرے گی کہ اپنی طبیعت کے خلاف عمل کرے کیونکہ اب تک اُس نے ایسا کبھی نہیں کیا، لیکن گورنمنٹ کو یہ جاننا چاہیئے، کہ میں مسلمان ہوں اور شاہ معظم اور اکثر بڑے بڑے سرکاری افسران عیسائی یعنی غیر مسلم ہیں، تیرہ ۱۳ سو برس سے زائد ہوئے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہمارے خدا نے ہمارے روزانہ زندگی کے تمام امور کے بارے میں تعلیم کی ہے، نہ میں نے اُن میں کوئی تغیر کیا ہے، اور نہ میں کسی حالت میں اُن میں کوئی تغیر کرسکتا ہوں،۔

تمام غلط فہمیاں اور شکایت رفع کرنے کے واسطے میری خواہش ہے کہ سرکاری اعلےٰ افسران قرآن پاک اور احادیث کی تعلیم حاصل کریں، اور میں اُن کو خاص طور پر قرآن پاک کی ذیل کی آیتوں کی طرف توجہ دلاتا ہوں جن پر انجمن خدام کعبہ مبنی ہے،

واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا واتخذوا من مقام ابراھم مصلےٰ ط وعھدنا الی ابراھم واسمٰعیل ان طھرا بیتی للطائفین والعٰکفین والرکع السجود ○ سورۃ البقر رکوع (۱۵)-

ترجمہ:- (اور یاد دلاؤ بنی اسرائیل کو) کہ جب ہم نے مقرر کیا اس مکان (کعبہ شریف) کو بنی آدم کے جمع ہونے اور اُن کی حفاظت کا گھر اور لوگوں کو حکم دیا کہ (حضرت) ابراہیم (علیہ السلام) کے گھر کو عبادت گاہ بنائیں اور حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ علیہ السلام سے عہد لیا کہ اُس کو پاک رکھیں اُن لوگوں کے واسطے جو اُس کا طواف کرتے ہیں، عابدوں کے واسطے اور اُن لوگوں کے واسطے جو عبادت میں جھکتے ہیں،

یا ایھا الذین امنوا انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھٰذا ج وان خفتم عیلۃ فسوف یغنیکم اللہ من فضلہ ان شآء ط ان اللہ علیم حکیم ○ -سورۃ التوبۃ رکوع (۴)-

ترجمہ:- اے وہ لوگ جو ایمان رکھتے ہو یقینی مشرک نجس ہے پس اُن کو نہ جانے دو مقامات مقدسہ میں اُن کے اس سال کے بعد اور اگر کمزوری سے ڈرتے ہو اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے تمہاری کمزوری دفع کردے گا، اگر وہ چاہے گا، یقینی خدا تعالےٰ سب جانتا ہے، اور سب درست سمجھتا ہے۔

ان دونوں آیتوں سے صاف ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے ایمان حضرت ابراہیمؑ کے مثل ہیں یعنی مسلمان، اُنہوں نے کعبہ شریف کی حرمت قائم رکھنے کی قسم کھائی ہے، اور اُس وقت سے نہ تو کوئی غیر مسلم وہاں داخل ہو سکا ہے اور نہ کوئی اثر اپنا پیدا کر سکا ہے، قرآن پاک کا ہر حکم ہر شخص مسلم پر فرض ہے اور کوئی اپنی ذمہ داری کو دوسرے پر نہیں چھوڑ سکتا۔

کنتم خیر امّۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ ط ولو اٰمن اھل الکتاب لکان خیراً لھم ط منھم المؤمنون واکثرھم الفاسقون ٥ سورۃ آل عمران رکوع (۱۲)

ترجمہ:۔ تمام ان قوموں میں جو انسان کی تعلیم و تربیت کے واسطے پیدا کی گئی ہیں تم سب سے بہتر ہو، کیونکہ تم اُن کو نیکی کی ہدایت کرتے ہو، برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، اور اگر اہل کتاب نے (یہود و نصاریٰ) یقین کیا ہوتا (اسی طور پر) تو اُن کے واسطے اچھا ہوتا لیکن اُن میں سے بعض مانتے ہیں، اور اکثر نہیں مانتے،

الّذین ان مکّنٰھم فی الارض اقاموا الصّلوٰۃ واٰتوا الزّکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر ط وللہ عاقبۃ الامور ٥ (سورۃ الحج رکوع ۶)۔

ترجمہ:۔ یہ (مسلمان) اگر ہم ان سے دنیا کو بھر دیں (یعنی انہیں پیدا کریں دنیا میں) نماز پڑھیں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور لوگوں کو نیکی کرنے کی تنبیہہ کریں گے، اور برائی سے روکیں گے، اور تمام امور کا انجام اللہ کے ساتھ ہے،

بالآخر میں کہنا چاہتا ہوں کہ میں جانتا ہوں کہ میں کیا ہوں، اور کوئی مجھے مجھ سے بہتر نہیں جانتا، میں نہیں کہتا کہ میں خدا رسیدہ ہوں یا عالم ہوں، نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں ایک پولیٹیکل لیڈر ہوں، میں ایک بالکل معمولی مسلمان آدمی ہوں، جس نے بہت تجسس کے بعد قرآن پاک میں ایک طریقہ دنیا و آخرت میں عاقبت بخیر ہونے کا پالیا ہو، میں نے نبی محترم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کے مطابق اپنے روزانہ زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ معین کر لیا ہے، مجھے افسوس ہے کہ بعض اوقات آرام و زندگی آسائش حاصل کرنے کی غرض سے اور کبھی اس خوف سے کہ میں اِن کو کھو بیٹھوں گا اور تکلیف اُٹھاؤں گا میں نے دوسروں کی خواہش کے مطابق اس طریقہ پر عمل نہیں کیا ہے، اور اپنے پیدا کرنے والے کے احکام کے خلاف ورزی کی ہے، اس وجہ سے میں نے اس نظر بندی کے حکم کو اپنے گذاشتہ اعمال بد کی معقول سزا خیال کر کے منظور کر لیا ہے، درحقیقت یہ سزا بہت خفیف ہے اور کسی طور پر میرے گناہوں کا خیال کر کے کافی نہیں،

کیا میں اب بھی وہی غلطی کروں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کروں خواہ کسی حالت میں کسی وجہ سے کسی جبر سے کیوں، میرے اعتقادات ہیں اور میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ مجھے استقلال دے کہ میں اُن پر قائم رہوں، میں نے تمام امور کے بارے میں آزادی سے لکھا ہے اور مجھے امید ہے کہ گورنمنٹ اس آزادی سے فائدہ اٹھاوے گی، (دستخط) شوکت علی، مکرر یہ کہ اس تحریر کو ختم کرنے کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا تبادلہ ممالک متوسط میں چھندواڑے میں ہوگا، میں ممالک متحدہ کی گورنمنٹ سے استدعا کرتا ہوں کہ اس تحریر کی ایک نقل گورنمنٹ ممالک متوسط کو روانہ کر دے، تاکہ مجھے آئندہ فضول خط و کتابت نہ کرنا پڑے دستخط شوکت علی

ا۔ میں نے اواخر فروری میں ارادہ کر لیا تھا، کہ لاہور کے چیف کورٹ میں کامریڈ کا جو مقدمہ دائر تھا، اُس کی سماعت اور دہلی کے لیجسلیٹو کونسل کے سشن کے بعد کچھ عرصہ کے لئے اپنی صحت کی اصلاح اور دماغی کام سے فرصت حاصل کرنے

کے لئے دہلی سے باہر چلا جاؤں گا، کامریڈ بند ہونے سے جو فرصت مل گئی اُس کے وجہ ذیابیطس کے مرض میں مبتلا ہو چکا تھا اور اُس کے علاوہ بھی اپنی صحت خراب کر چکا تھا، مجھے ضروری معلوم ہوا، اس فرصت کو غنیمت جان کر کچھ عرصہ کے لئے آرام کر دوں۔

۲۔ اس تعطیل کے زمانہ کو کہاں گذاروں اس کے متعلق مختلف مقامات کا خیال آیا، پہلے میرا ارادہ ہوا کشمیر چلا جاؤں، لیکن اول تو بعد دوسرے کشمیر میں مسٹر کوپ سابق رزیڈنٹ بڑودہ کا رزیڈنٹ ہونا جو غالباً مجھ سے اُن مضامین کے باعث برافروختہ ہیں جو مہاراجہ صاحب بڑودہ کے واقعہ دربار کے متعلق کامریڈ میں شائع ہوئے، ان دونوں وجوہ سے میرے احباب نے مجھے کشمیر جانے سے روکا، بعض نے صلاح دی کہ میں پچمڑی چلا جاؤں مگر وہاں جانے میں ہی کچھ بعد مانع ہوا، اور کچھ یہ خیال کہ پچمڑی میں میں بالکل اجنبی ہونگا، اور کسی قسم کی صحت میسر نہ آئے گی، خود میرا خیال شملہ کے متصل کسی پہاڑی پر ایک مکان لینے کا تھا لیکن بعض احباب نے اس کے برخلاف رائے دی، اس لئے کہ انہیں خوف تھا، کہ مبادا پنجاب گورنمنٹ جو مسٹر ظفر علیخان پر نا روا تشدد کر چکی تھی، اپنی دست تشدد کو مجھ تک پہنچائے، بعض احباب کا خیال تھا، کہ مجھے منصوری جانا چاہیئے، اور اس میں ایک فائدہ یہ تھا، کہ ڈاکٹر انصاری بھی منصوری میں مکان لے رہے تھے، مگر ممالک متحدہ کے حکام سے جو میرے تعلقات تھے، وہ ظاہر ہیں، اور منصوری کی حالت شملہ سے بھی بدتر ہوتی، ایسی حالت میں چارہ نہ تھا کہ یا تو دارجلنگ یا مہابلیشور وغیرہ کا دُور دراز سفر اختیار کیا جائے، یا دہلی ہی میں اقامت رہے، مؤخر الذکر حالت میں دراصل فرصت ملنا ناممکن ہے، اس لئے کہ میرا دہلی میں ہونا اور ہمدرد کے متعلق کچھ کام نہ کرنا اور متعدد احباب سے نہ ملنا اور کسی پبلک معاملات کے متعلق استفسارات کا جواب نہ دینا ناممکن تھا، آخرش یہ رائے قرار پائی کہ کم سے کم کچھ عرصہ کے لئے رام پور رہوں اور اس کے بعد اگر میری صحت کے لئے ضروری ہو تو، ڈاکٹر انصاری کے ہمراہ منصوری جا کر رہوں، میرے بہت سے احباب اس فیصلہ کے بالکل خلاف تھے اور اُن کی رائے تھی، کہ ممالک متحدہ کے حکام جس کام کو خود کرتے ہوئے ڈریں گے، اُس کو ریاست کے ذریعہ سے کرانے میں انہیں کچھ تامل نہ ہوگا، اس لئے کہ ان کی خواہش انتقام تو پوری ہو جائے گی، مگر ساری بدنامی ریاست کے سر رہے گی، میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ شبہات بیجا تھے، خصوصاً اس حالت میں جب کہ واقعات نے اس کی تصدیق کر دی ہے، مگر مجھے خارجاً معلوم ہوا تھا کہ اس سے قبل ایک بار میرے اور شوکت علی کے رامپور آنے کے متعلق لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ نے نواب صاحب کو کچھ طنزاً لکھا تھا، جس کے جواب حضور ممدوح نے صاف لکھ دیا تھا کہ رام پور ان کا وطن ہے، اور میں اُن کی رامپور کے آمد و رفت کو نہیں روک سکتا، اس لئے مجھے قوی امید تھی، کہ ریاست میں میرے ساتھ کوئی کارروائی نہ کی جائیگی جس کے کرنے میں خود گورنمنٹ کو تامل ہو۔ جب کہ ریاست کو میرے طرز عمل سے شکایت پیدا ہونے کا شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا،

۳۔ رام پور آنے کے متعلق میں آخری فیصلہ غالباً ۲۶ مارچ تک کر چکا، اور بمبئی میں کچھ قانونی مشورہ کر لے اور علی گڈھ میں اولڈ بوائز کے سالانہ جلسہ اور مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کے اجلاس کے بعد میں اپنے تمام مشاغل سے فارغ ہو کر پندرہ اپریل کو عازم رامپور ہوا، میرا قصد ۱۳ اپریل ہی کو جانے کا تھا، مگر رامپور میں طاعون کا زور ہونے کے باعث ڈاکٹر انصاری نے اصرار فرمایا کہ میں مع اپنے متعلقین طاعون کا ٹیکہ لگوانے کے بعد رامپور جاؤں، چنانچہ ۱۳ تاریخ کو ہم سب کے ٹیکہ لگا یا گیا،

اور دو دن حرارت کے باعث دہلی میں رہ کر پندرہ اپریل کو شب کے پونے دس بجے کی گاڑی سے رامپور روانہ ہوئے اور سولہ تاریخ کے سوا چھ بجے رامپور پہونچ گئے۔

۴۔ شب ماقبل میں میرے سالے مسٹر معظم علی ڈھاکہ سے رامپور پہونچ چکے تھے، اور اُن کے ایک دوست تشریف لائے ہوئے تھے، رامپور پہونچنے کے بعد ہم سب کا ارادہ ہوا کہ چند دن کے لئے سوار کی تحصیل میں شکار کے لئے چلے جائیں، چنانچہ سترہ کی صبح کو میں اپنے بھائی کے گاؤں موضع رامپور کو مع چند احباب کے اور چند عزیزوں کے روانہ ہوگیا، مگر جیسا کہ میرا دستور رہا ہے، میں جس دن رامپور پہونچا اُسی دن حضور نواب صاحب کے سلام کے واسطے کوٹھی خاص باغ کو جہاں حضور والا تشریف رکھتے تھے گیا،

مگر جب سے کانپور کا واقعہ پیش آیا ہے، حضور ممدوح کی باریابی کا شرف حاصل نہیں ہوا ہے، گو میں اپنی حاضری کی اطلاع ہمیشہ دیا کرتا ہوں، چنانچہ اس بار بھی یہی ہوا، چند گھنٹہ کوٹھی خاص باغ میں سیکرٹری کے پاس بیٹھنے کے بعد میں شب کو مکان واپس آیا اور دوسرے دن صبح کو شکار کے لئے روانہ ہوا،

۵۔ ۱۷-۱۸-۱۹-۲۰- تاریخوں کو ہم نے تحصیل سوار میں شکار کھیلا، اور موخرالذکر تاریخ کو عازم رامپور ہو کر شب کے آٹھ بجے مکان پر پہونچا اس عرصہ میں میری طبیعت کچھ نادرست تھی اور شکار و سفر کے کسل کے باعث مجھے شب کو مکان آتے ہی بخار آگیا، البتہ صبح کو بخار میں کمی تھی، ۲۱ر کی صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ ہز آنر کہ ممالک متحدہ کے انسپکٹر جنرل پولیس مسٹر ڈگلس اسٹریٹ رامپور آئے ہوئے ہیں، اور قلعہ معلی انگریزی مہمان خانہ میں مقیم ہیں، اس کے کچھ دیر بعد میرے چچازاد بھائی کپتان حشمت علی صاحب جو قلعہ معلی کے کپتان اور مجسٹریٹ ہیں، میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ نواب صاحب صبح کو تشریف لائے تھے، اور میرے متعلق دریافت فرماتے تھے، کہ شکار سے واپس آگیا یا نہیں، اور مسجد کانپور میں خونباری کے متعلق ہمدرد میں جو حالات شائع ہوئے تھے، اس کے متعلق فرماتے تھے کہ یہ کیا واقعہ ہے، مشہد مقدس میں تو خونباری ہوئی نہیں، کانپور کی مسجد میں کیسے ہوئی، میں نے عرض کیا کہ اگر جناب سے پھر دریافت فرمائیں تو کہہ دیجئے گا کہ میں تو پندرہ اپریل کو دہلی سے رخصت ہو چکا ہوں، اور اخبار کا تمام کام اُس دن سے دوسرے دل کے سپرد کر چکا ہوں، مجھے مسجد کانپور کی خونباری کا کیا علم ہو سکتا ہے، محض اتفاقاً بیس کی شب کو شکار سے واپس آنے پر اُنہیں کے یہاں اُس دن کا ہمدرد نظر سے گذرا اور اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، ورنہ میں نے تو پندرہ اپریل کے بعد سے ہمدرد بھی نہیں دیکھا،

۶۔ یہ غالباً صبح کے نو ساڑھے نو بجے کا واقعہ ہے، اس کے چند ہی منٹ کے بعد قلعہ سے ایک ہرکارہ میرے پاس آیا اور مجھے اطلاع دی کہ چیف سیکرٹری صاحب نے کوٹھی خاص باغ سے ٹیلیفون دیا ہے کہ مسٹر محمد علی کو کوٹھی خاص باغ بھیجا جائے ایک سرکاری کام کے لئے ضرورت ہے، کچھ عرصہ گاڑی کا انتظار کرنے کے بعد میں کوٹھی خاص باغ کو گیا اور غالباً گیارہ بجے تک وہاں پہونچ گیا، چیف سیکرٹری صاحب کو اپنے پہونچنے کی اطلاع دلائی، اور اُن کے دفتر کے ڈیرہ میں بیٹھا رہا تھوڑی دیر بعد وہ تشریف لائے، اور مجھ سے مسجد کانپور کی خونباری کے متعلق دریافت فرمایا، میں نے اُن کو بھی وہی جواب دیا جو اپنے بھائی کپتان حشمت علی خاں صاحب کو اس کے قبل دے چکا تھا، اس کے بعد وہ سرکار

میں تشریف لے گئے، چند منٹ کے بعد ایک صاحب سرکار ہی سے تشریف لائے، اور مجھ سے فرمایا کہ سرکار کا حکم ہے، کہ آپ کوٹھی میں دفتر کے کمرہ میں آجائیں، جب میں دفتر کے کمرہ میں پہونچا، تو چیف سیکرٹری صاحب نے فرمایا، کہ سرکار نے آپ کو اپنے استراحت کے کمرہ میں طلب فرمایا ہے، چنانچہ جوتا اُتار کر میں اُن کے ہمراہ سرکار کی خوابگاہ میں حاضر ہوا، حسب معمول دو تین حکام اور دو تین مصاحبین اس کمرہ میں موجود تھے، اور سرکار پلنگڑی پر تشریف فرما تھے، چونکہ مجھے پونے دو برس سے شرف باریابی حاصل نہیں ہوا تھا، اس لئے میں نے اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ پر قدم بوسی کی اور سلام کرنے کے بعد حسب الحکم سرکار پلنگڑی کے پاس بیٹھ گیا، اُس کے بعد سرکار نے فرمایا، کہ میں پالیسی کی باتیں نہیں جانتا ہوں بس میں کہتا ہوں، آپ دوران جنگ میں رامپور ہی میں رہیں، قلعہ میں آپ کو ایک کمرہ مہمان خانہ میں دے دیا جائے گا، وہیں آپ قیام رکھیں، اور اخبار کو بند کریں، جب لڑائی ختم ہوجائے تو سو گالیاں آپ گورنمنٹ کو دیں اور چار سو مجھے جب تک لڑائی رہے گی آپ کو قلم دوات نہیں دی جائے گی، میں بغیر سوچے سمجھے ہاتھ نہیں ڈالتا ہوں، میرے ہاتھ کو کرانہ ہونے دینا، اس پر میں نے عرض کیا، کہ میں اخباروں کے لئے کوئی مضمون نہیں لکھنا چاہتا، میری صحت خراب ہو چکی ہے، اور آرام کرنے کی غرض سے گھر آیا ہوں، اس پر سرکار نے قلعہ میں رہنے کے متعلق فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ انگریز مجھ سے کہا کرتے ہیں، کہ تم ہی نے تعلیم دلاکر دونوں بھائیوں کو ہمارے پیچھے لگایا ہے، اس لئے یہ مناسب ہے، کہ تم دوران جنگ میں قلعہ میں رہو، اور اخبار کو بند کردو، میرا ناک میں دم ہوگیا، ہر انگریز تمہاری شکایت کرتا ہے، سارے جہان کو شیطان کی طرح گمراہ کر رکھا، یہ مشہور کر دیا ہے کہ میں بھی تمہارا ہم خیال ہوں، میں نے اس کی تردید کی، مگر نواب صاحب برہم فرماتے رہے، جس کی وجہ سے میں نے خاموش رہنا مناسب سمجھا، مگر اسی سلسلہ میں سرکار نے فرمایا کہ تو نمک حرام ہے اس پر میں نے کہا کہ یہ درست نہیں، اس پر اور بگڑ کر سرکار نے فرمایا کہ تو نمک حرام اور تیرا باپ نمک حرام، میں نے عرض کیا کہ جو کچھ میرے باپ نے کیا وہ اُن کا فعل تھا، اور اُس کا عذاب ثواب اُس کی گردن پر، میں ذمہ دار نہیں، لیکن اپنے متعلق پھر عرض کردوں گا، کہ میں نے کبھی نمک حرامی نہیں کی ہے، اس پر سرکار اور برافروختہ ہوئے اور کہا کہ میرے سامنے جواب دیتا ہے، میں نے عرض کیا سرکار نے اس سے قبل بھی بہت کچھ برا بھلا کہا، مگر میں نے گردن نہیں اٹھائی، البتہ نمک حرامی کے الزام کا جواب دینا میرا فرض ہے، میں سرکار کے سامنے پھر عرض کردوں گا کہ یہ الزام بالکل غلط ہے.

اور جس کسی نے سرکار سے یہ کہا ہے، وہ جھوٹ بکتا ہے، رہا قلعہ میں مقید رہنا یہ تو کوئی چیز نہیں ہے، اگر سرکار جیل ہی بھیج دیں تو ایک مرتبہ اپنی اطاعت شعاری ثابت کرنے کے لئے، اور سرکار کا کہنا نیچے نہ ڈالنے کے خیال سے میں خود بیڑیاں پہن کر جیل خانہ چلا جاؤں گا، میرے خاندان میں جو کچھ دولت و ثروت جاہ و عزت ہے وہ سرکار اور سرکار کے آباؤ اجداد کی دی ہوئی ہے، اور اُن کی خدمت میں حاصل ہوئی ہے، اگر سرکار یہ سب کچھ لے لیں گے تب بھی اپنی ہی دی ہوئی چیز لے لیں گے ہم یہ چیزیں کہیں اور سے نہیں لاتے تھے، اور میری تو تعلیم بھی سرکار ہی کے قرض دیئے ہوئے روپیہ سے ہوئی تھی، اس کی بدولت جو کچھ تھوڑی بہت قابلیت یا عزت حاصل ہے، وہ سرکار ہی کا طفیل ہے، اس گفتگو کے بعد بھی سرکار مجھے قلعہ بھیجنے پر مُصر رہے، اور فرمایا کہ ہندوستانی مہمان خانہ کے نیچے کے درجہ میں اُن کو ایک کمرہ دے دیا جائے، وہاں آج کل مقابلتاً گرمی کم ہوگی، بجلی کا پنکھا موجود ہے، کھانے کے لئے ہندوستانی اور انگریزی باورچی خانہ کو حکم دے دیا جائے، کہ یہ جو کچھ طلب

کریں، اُن کو دیا جائے، اور ہندوستانی اور انگریزی دوا خانوں کو بھی حکم دیا جائے کہ حکیم یا ڈاکٹر جو اُن کے لئے دوا تجویز کریں وہ
ملتی رہے، اس کے بعد چیف سیکرٹری سے فرمایا کہ اس کی اطلاع علی امام صاحب کو ضرور کر دینا، اُس پر انہوں نے کہا کہ پہلے
سرکار یہ مناسب نہیں ہے، تو فرمایا کہ نہیں ان کو ضرور لکھ دینا، وہ ہی مجھے لکھ سکتے ہیں، اور کوئی نہ لکھے گا، پھر اخبار کے متعلق
بھی فرمایا کہ ہاں ہمدرد میں ضرور چھاپ دینا کہ میں نے یہ حکم دیا ہے، اس کے اخبار بند کرنا، میں نے اس کے جواب میں عرض
کیا کہ یہ تو قلعہ میں رہنا ہے، اگر سرکار مجھے جیل میں رہنے کا حکم دیں بلکہ سزائے موت بھی دیں، تو میری زبان پر حرف شکایت نہ آئیگا
سرکار نے اور سرکار کے آباؤ اجداد نے ہماری پرورش قاعدہ اور قانون کی پابندی میں نہیں کی اس لئے آج اگر سرکار سزا دیتے ہیں، تو ہم
بھی قاعدہ و قانون کی تلاش نہیں کریں گے، اگر گورنمنٹ ہمیں مقید کرتی تو جہاں تک قاعدہ اور قانون اجازت دیتا ہے اپنے حقوق کے
لئے لڑتا، اس لئے کہ گورنمنٹ دیتی بھی ہے، تو قاعدہ و قانون کے اندر مانگ بھی سکتی ہے تو قاعدہ اور قانون کے اندر، افسوس ہے
کہ سرکار ایسا خیال فرمائیں، کہ ہم سرکار کے احکام کی شکایت اخباروں میں کرتے جائیں گے، اگر سرکار کے حکم سے میری جان بھی جاتی
رہے، تو اس کے متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر اپنے اعزا کے متعلق کہہ سکتا ہوں کہ وہ تو اس کا خیال نہ کریں گے کہ ہمارے خاندان
میں محمد علی نام کا بھی کوئی شخص کبھی پیدا ہوا تھا، البتہ اخبار کے متعلق مجھے کچھ عرض کرنا ہے، اور مجھے امید ہے، کہ اس کو توجہ سے سُنا
جائے گا، اس لئے کہ اس سے قبل بھی سرکار کو جو شکایت واقعہ کانپور کے تعلق مجھ سے ہے، اس کے متعلق میری طرف سے
میری مجبوریوں کا اظہار ہو جائے گا، میں عرض کر چکا ہوں کہ جو کچھ میرا ہے، خواہ وہ دولت ہو یا عزت سرکار پر سے نثار ہے، مگر
میں اپنے حقوق کو سرکار پر سے تصدق کر سکتا ہوں، حق العباد کی قربانی خدا کے لئے بھی نہیں کی جا سکتی، اور خداوند کریم بھی حق اللہ
معاف کر سکتا ہے، حق العباد کا معاف کرنا بندوں کی مرضی کے بغیر وہ بھی گوارا نہیں فرماتا، سرکار میرے تمام حقوق صلب کر لیجئے
مگر جو خدمت میں کامریڈ و ہمدرد کے ذریعہ سے قوم و ملک کی کرتا رہا ہوں، وہ کسی حالت میں ترک نہیں کی جا سکتی، اس عرصہ میں حکیم
اجمل خاں صاحب بھی وہیں تشریف لے آئے اور انہوں نے بھی ہمدرد کے متعلق فرمایا کہ اس کی روش قابل اعتراض نہیں معلوم ہوتی
بلکہ نہایت معتدل ہے، اس پر سرکار نے فرمایا کہ خیر اخبار جاری رہے مگر تم قلعہ میں رہو، اس کے بعد متفرق امور پر گفتگو ہوتی رہی،
اور پھر جب سرکار، حکیم صاحب سے کچھ گفتگو فرمانے لگے تو ہم سب اٹھ کر باہر چلے آئے اور میں صاحب چیف سکرٹری کے ہمراہ
اُن کے دفتر کے ڈیرہ میں چلا گیا۔

۷۔ میں نے مناسب سمجھا کہ کم از کم اپنے بریت کے لئے ایک امر کے متعلق اُن کے توسط سے سرکار کی خدمت میں عرض حال کی
جائے، اور وہ یہ تھا کہ اگر سرکار کے احکام معلوم ہونے کے بعد پبلک میں کچھ شورش ہو تو میں ذمہ دار نہ ہونگا، چنانچہ میں نے
چیف سیکرٹری صاحب سے کہا کہ میں اس وقت آپ سے بحیثیت ایک دوست کے گفتگو نہیں کر رہا ہوں، بلکہ محض بحیثیت ایک
عہدہ دار ریاست کے، ریاست میں اس وقت کوئی وزیر یا مدار المہام نہیں ہے، بلکہ چند سیکرٹری ہیں، اور آپ کا لقب چیف
سیکرٹری ہے، اس لئے آپ کا فرض ہے، کہ آپ میرے متعلق احکامات کے بارے میں سرکار کو اُن کے تمام نتائج سے مطلع کریں
سرکار کی عمر کا زیادہ حصہ رام پور میں گزرا ہے، اور بالعموم اُن کے تعلقات لوگوں سے والئی ملک اور رعایا کے رہے ہیں شخصی
حکومت الگ چیز ہے، اور جمہوریت دوسری چیز ہے مجھے خوف ہے کہ نواب صاحب کافی طور پر نہیں جانتے کہ اُن کے ان احکام

کا پبلک پر کیا اثر ہوگا، اگر اُن کا یہ فرمانا تسلیم کر لیا جائے کہ میں نے پبلک کو گمراہ کر رکھا ہے، تو بھی چونکہ پبلک میرے بتائے ہوئے راستہ پر چل رہی ہے، اس لئے جب تک غلط رہبر نہ سمجھے پبلک میری تکلیف سے ضرور پریشان ہوگی، اور میرے مقید ہونے پر غالباً ایک شورش ہو اور گو پبلک ایک منٹ کے لئے بھی یہ تسلیم کرے کہ تمام کارروائی صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ کے ایما و اشارہ سے یا کم از کم اُن کے خوش کرنے کے لئے کی گئی ہے، تاہم پبلک میں سرکار کے خلاف بھی بد دلی ضرور پھیلے گی، میرا خیال ہے کہ تمام نشیب و فراز سے سرکار کو مطلع کرنا آپ جیسے حکام کا فرض ہے، لیکن شاید آپ اسے گستاخی سمجھیں کہ میں آپ کو آپ کے فرائض کے متعلق کچھ بطور پند و نصیحت کے کہوں، اس لئے یہی سمجھ لیجئے کہ ایک اہل غرض آپ سے محض اپنے بچاؤ کی خاطر کچھ عرض کر رہا ہے، اگر آپ سرکار کو ان امور کے نشیب و فراز سے مطلع نہیں کر سکتے تو کم سے کم میری جانب سے یہ عرض سرکار کی خدمت میں پہونچا دیجئے کہ میں نے خود تو سرکار کے احکام کو سمعنا و اطعنا کہکر آنکھوں پر رکھ لیا، لیکن اگر میرے سلب آزادی اور پبلک سے قطع تعلق کے بعد پبلک سرکار یا سر جیمس مسٹن کے خلاف شورش کرے تو میں اس کا ذمہ دار نہ ہونگا چنانچہ چیف سیکرٹری صاحب سرکار کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور میری طرف سے میری معروضات کو سرکار میں دہرایا، اُس کے بعد چیف سیکرٹری صاحب باہر تشریف لائے، اور مجھ سے فرمایا کہ سرکار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس وقت میں سوتا ہوں شب کو آٹھ بجے بیدار ہونگا، اس وقت محمد علی کو پھر بلاؤں گا، اور احکام جاری کرونگا، چیف سیکرٹری صاحب کو خوف تھا کہ چونکہ مسٹر ڈگلس اسٹریٹ انسپکٹر جنرل پولیس ممالک متحدہ قلعہ میں بطور مہمان کے مقیم ہیں اُن کی موجودگی میں میرے قلعہ کے رہنے میں مبادا کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے، اس لئے سرکار نے حکم دیا کہ شام تک مجھے کوٹھی خاص باغ میں دفتر کے قریب ایک کمرہ میں رکھا جائے،

۸۔ میں اس کمرہ میں عصر کے وقت تک رہا اور اسی عرصہ میں مجھے حرارت بھی ہوگئی، عصر کے وقت میں چیف سیکرٹری صاحب کے ہمراہ اُن کے دفتر کے ڈیرہ میں رہا اور شب کو انہیں کے ساتھ کھانے کے ڈیرہ میں کھانا کھایا، سرکار کے بیدار ہونے پر میں پھر کوٹھی خاص باغ کے کمرہ میں چلا گیا، اور حرارت کی وجہ سے وہیں پلنگ پر لیٹا رہا اس عرصہ میں معلوم ہوا کہ مسٹر ڈگلس اسٹریٹ سرکار کی ملاقات کو آئے ہیں، سرکار اُن سے ڈرائنگ روم میں ملے اور چند منٹ کے بعد چیف سیکرٹری صاحب نے مجھے اطلاع دی کہ سرکار مجھے ڈرائنگ روم میں یاد فرماتے ہیں، چنانچہ میں ڈرائنگ روم میں حاضر ہوا اور سرکار کو آداب بجالایا اس پر مسٹر ڈگلس اسٹریٹ نے بھی اُٹھ کر مجھ سے رسم مزاج پرسی کی اور مصافحہ کیا، سرکار نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے بیٹھنے کا حکم دیا اس گفتگو کے صرف وہی حصہ درج کئے جاتے ہیں، جو میری نظر بندی سے متعلق معلوم ہوتے ہیں، انسپکٹر جنرل نے دوران گفتگو میں مجھ سے کہا کہ آپ ہم سب کو دشمن سمجھتے ہیں، جس سے ممکن ہے، کہ اُن کا مفہوم خاص اپنا دشمن یا تمام مسلمانوں کا دشمن ہو، میں نے جواب دیا، کہ کیا آپ کا یہ خیال نہیں ہے کہ غلط فہمی کی دونوں جانب گنجائش ہے، نواب صاحب نے دوران گفتگو میں فرمایا کہ کچھ عرصہ سر جان ہیوٹ سابق لفٹننٹ گورنر ممالک متحدہ نے مجھے کہا تھا کہ دونوں بھائیوں کو رامپور سے نکال دو، میں نے پوچھا کہ کیوں کیا وجہ ہے میں تو اُن کو ہرگز نہ نکالوں گا، اس پر سر جان ہیوٹ نے کہا کہ اچھا آپ ان کو سمجھا سکتے ہیں، میں نے کہا ہاں یہ ہو سکتا ہے، چنانچہ میں نے تو ان دونوں بھائیوں کو سمجھا دیا اور سر جان ہیوٹ کو آئندہ شکایت کا موقع نہیں ملا، مگر جب

سرجیمس مسٹن لفٹنٹ گورنر ہوئے، تو میں نے محمد علی سے کہہ دیا کہ دیکھو یہ میرے دوست ہیں، اُن کے خلاف کبھی کچھ نہ لکھنا، کامریڈ میں سرجیمس مسٹن کی کئی بار تعریف بھی چھپی، لیکن کانپور کا واقعہ ہوا اور محمد علی نے کامریڈ میں سرجیمس مسٹن کے خلاف لکھنا شروع کر دیا، اُس دن سے میں نے اسے اپنے پاس نہیں آنے دیا، اور آ بھی جب میں نے اسے اپنے پاس بلایا تو اور لوگ اُٹھ کر جانے لگے، مگر میں نے روک لیا اور کہا کہ میں اس سے دس بارہ آدمیوں کی موجودگی میں ملنا چاہتا ہوں، سرجیمس مسٹن آخر جون ۱۹۱۳ء میں بجلی کے کارخانہ کی بنیاد رکھنے رامپور تشریف لائے تھے، اس وقت کانپور کے تمام فائل اُن کے پاس موجود تھے، انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی کیا رائے ہے، میں نے کہا کہ اس عمارت کو منہدم نہ کرایئے، چنانچہ انھوں نے مان لیا مگر چند ہی روز بعد ٹائیلر، وکلکٹر کانپور نے عمارت کو ڈھوا دیا، اس میں سرجیمس مسٹن کا کیا قصور ہے، اس پر میں نے عرض کیا، کہ مجھے حضور کی خدمت میں واقعہ کانپور کے متعلق کچھ عرض کرنے کا یہ پہلا موقع ہے، اگر حضور کامریڈ کے مضامین منگوا کر دیکھیں گے تو واضح ہو جائے گا کہ میں نے سرجیمس مسٹن پر انہدام مسجد کانپور کا الزام کہیں نہیں لگایا، میں نے صرف یہ لکھا تھا، کہ اُن کے ایک ماتحت نے اُن کے خلاف منشا، اور شاید خلاف حکم ایک غلط کارروائی کر دی، اگر یہ واقعی ایک مضبوط حاکم ہوتے تو اس تمرد و سرکشی کی سزا اُس کو دیتے مگر وہ سخت کمزور نکلے، اور ایک سولین کے تمرد کو بھی انھوں نے گوارا کیا اور اُس کی سزا دہی کو گوارا نہ کیا، اس پر نواب صاحب نے فرمایا کہ نہیں یہ تو اُن کی کریم النفسی ہے کہ انھوں نے دوسروں کی غلطی کو اوڑھ لیا کوئی دوسرا شخص لفٹنٹ گورنر ہوتا تو سارا الزام ٹائیلر پر دھر دیتا، اس کے بعد سرکار نے خود اپنی ریاست کا ایک واقعہ دہرایا جس میں انھوں نے اپنی غلطی کے عام اعتراف سے باز رکھا، تاکہ داب حکام قائم رہے، سرکار نے یہ بھی فرمایا کہ ٹائیلر سے زیادہ قصور وار انسپکٹر منیر الدین کا تھا، اور مسٹر ڈگلس اسٹریٹ اُس کو سزا بھی دینا چاہتے تھے، مگر سرجیمس مسٹن نے اسی بنا پر روک دیا، مسٹر ڈگلس اسٹریٹ نے اعتراف کیا کہ واقعی منیر الدین کا قصور تھا، پھر سرکار نے فرمایا کہ اُس نے دوسری غلطی یہ کی کہ محمود آباد سے روپیہ لے کر یہ اور وزیر حسن چلے گئے، میں اس تمام تقریر کے دوران میں صرف ایک بار لب کشا ہوا تھا، اور چند امور میں سرکار کو غلط فہمی ہوئی تھی، یا حافظہ نے سرکار کے صحیح طور پر یاد آوری نہیں کی تھی تاہم میں نے تردید کرنا سوء ادب خیال کیا تھا، البتہ جب سرکار نے یہ فرمایا کہ ہم راجہ صاحب محمود آباد کے روپیہ سے ولایت گئے تھے، تو میں نے اس غلط فہمی کو دور کرنا مناسب سمجھا اس کے بعد سرکار نے کہ لارڈ کریوان سے ضرور ملتے، مگر چونکہ دہلی میں ہماری میٹنگ ہو چکی تھی اس لئے وزیر ہند نے ملنے سے انکار کیا اور کہہ دیا کہ تم تمام مسلمانوں کے نائب نہیں ہو، ایک پارٹی اور بھی ہے غرض کہ ایک طرف میں نے کھینچا اور ایک طرف اس نے کھینچا، اُس کے متعلق میں نے اتنا عرض کیا کہ میں صرف کانپور کے متعلق ولایت نہیں گیا تھا، بلکہ میرے مقدمہ کا فیصلہ کلکتہ ہائی کورٹ سے ہو گیا تھا اُس کے متعلق مجھے پریس ایکٹ کی منسوخی کی بھی کوشش کرنا تھی، دوسرے ٹیڈریا نیل کا مسئلہ پیش تھا اور میرا اور غالباً تمام مسلمانوں کا یہ خیال تھا، کہ مسٹر اسکوتھ اس معاملہ میں ترکوں کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں، اور جنگ بلقان کے دوران میں ان کی متضاد تقریریں اس کا ثبوت دے چکی ہیں، اس لئے میں نے ولایت کو بھی متعدد تار بھیجے تھے، اور حضور والا سرکار نے کو بھی ایک طویل تار دیا تھا، اس پر سرکار نے فرمایا کہ تم سے زیادہ سخت تار میں نے دیئے تھے، اور اس کے بعد روس اور مشہد مقدس پر گولہ باری کے متعلق سرکار اپنے خیالات کا اظہار فرماتے رہے، پھر موجودہ جنگ کا ذکر چھڑ گیا، مسٹر ڈگلس اسٹریٹ کو سرکار کی اور میری رائے سے کہیں کہیں اختلاف تھا ہندوستانی اخباروں کے خلاف مسٹر ڈگلس اسٹریٹ بہت کچھ کہتے رہے

اس پر میں نے اُن کے بعض الزامات کی تردید کی اور ہمدرد کے متعلق جو شروع سے میرا اصول رہا ہے، یعنی ایسے مضامین جو کامریڈ میں شائع ہوتے تھے، اُن کے ہمدرد میں شائع کرنے سے عمداً احتراز کیا جاتا تھا، مسجد کانپور میں خونباری کے متعلق جو خبر درج ہمدرد ہوئی تھی، اس کا مسٹر ڈگلس اسٹریٹ نے ذکر کیا، میں نے کہا کہ یہ واقع میرے دہلی سے چلے آنے کے بعد کا ہے مگر مجھے اس وقت اطلاع ملی کہ یہ واقع صحیح ہے، گو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خون کی بوندیں کتنی خلاف قدرت طور پر مسجد میں گریں، ہمارے کانپور کے نامہ نگار نہایت معتبر اشخاص ہیں، اس لئے اُن کی مرسلہ خبروں کی زیادہ چھان بین بھی غیر ضروری ہے اگر یہ خبر میرے سامنے لائے ہوتے تو ممکن ہے کہ میں اسے نہ چھاپتا، اس لئے کہ اس سے بجائے پبلک کی تعلیم کے وہم پرستی کو بھی تقویت ہو سکتی ہے، اس گفتگو کے بعد کوئی ساڑھے گیارہ بجے شب کے مسٹر ڈگلس اسٹریٹ رخصت ہوئے، اور سُنا ہے کہ موٹر کے چلتے وقت مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ امید ہے کہ اب آپ ممالک متحدہ کی پولیس کو کچھ زیادہ نہیں سمجھتے!

مسٹر ڈگلس اسٹریٹ کے رخصت ہونے کے بعد سرکار سے چیف سیکرٹری صاحب نے دریافت کیا کہ محمد علی کے متعلق کیا ارشاد ہے فرمایا کہ انہیں تو قلعہ میں رہنے دو، چنانچہ میں چیف سیکرٹری صاحب اور پرائیویٹ سیکرٹری صاحب کے ہمراہ موٹر میں اپنے مکان آیا اور بستر اور چند ضروری چیزیں نوکر کے ساتھ قلعہ بھیج دیں، اور خود موٹر میں اُن دونوں صاحبان کی معیت میں قلعہ پہونچا،

میرے بھائی کپتان حشمت علی خاں صاحب کپتان اور مجسٹریٹ قلعہ، قلعہ میں سو رہے تھے، اُن کو جگوایا گیا، اور میری نظربندی کے متعلق اطلاع دی گئی، چونکہ سرکار نے فرمایا تھا، کہ میں ملنے سے منع نہیں کرتا چیف سیکرٹری ہیں، احمد علی خاں ہیں، حشمت علی خاں ہیں، اُن سے ملو، بات چیت کرو، اس لئے چیف سیکرٹری صاحب نے کپتان صاحب قلعہ سے کہا کہ فی الحال مناسب ہے کہ یہی حضرات ملیں، کل سرکار سے زیادہ مفصل احکام اس بارے میں حاصل کر لوں گا، چنانچہ صبح کو جب میرا بھانجہ اور اُس کے بعد میرا ایک بھائی مجھ سے ملنے قلعہ میں آئے، تو کپتان حشمت علی خاں نے معذرت کی، اور فرمایا کہ سرکار کا حکم ابھی حاصل نہیں ہوا ہے، میں یہاں اس امر کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں، کہ پرائیویٹ سکرٹری صاحب، چیف سکرٹری صاحب نے میرے آرام و آسائش کے لئے جو کچھ ممکن تھا کر دیا، اور جب تک میں قلعہ میں رہا، مجھے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملا بلکہ میں ہر اس شخص کا شکر گذار ہوں جس کے متعلق میری خورد و نوش یا قیام وغیرہ کا انتظام تھا، میں نے ہندوستانی مہمان خانہ کے اوپر کی منزل میں ایک کمرہ پسند کیا، اور جب تک قلعہ میں رہا وہیں قیام کیا، میں پہلے بھی اس کا اظہار کر چکا ہوں کہ مجھے ۲۰ر کی شب کو بخار آ گیا تھا اور ۲۱ر کی سہ پہر سے پھر حرارت ہو گئی تھی، شب کو بخار بڑھ گیا، اور باوجود کسل درماندگی اور نیند پوری نہ ہونے کے میں ساری رات نہ سویا، صبح کو اس خیال سے کہ سرکار شاید قلعہ تشریف لائیں میں نے شب خوابی کے کپڑے اُتار کر دن کے پہننے کے کپڑے پہن لئے، سرکار قلعہ تشریف لائے، مگر مہمان خانہ کی طرف تشریف فرما نہ ہوئے، غالباً دس گیارہ بجے مسٹر ڈگلس اسٹریٹ انگریزی مہمان خانہ سے اسٹیشن چلے گئے، مجھے اس وقت حرارت کی شدت ہو گئی تھی، اس لئے شب خوابی کے کپڑے پہن کر لیٹ گیا، حکیم اجمل خاں صاحب کے نسخہ کے مطابق دفع حرارت کے لئے گھر سے دوا منگا کر پی، مگر حرارت کم نہیں ہوئی، برابر بڑھتی رہی اور میری بے چینی میں اضافہ ہوتا رہا، اس عرصہ میں سنا کہ ڈاکٹر انصاری صاحب بیگم صاحبہ کے

معالجہ کے لئے حسب الطلب سرکار تشریف لائے ہیں، میں نے انہیں بُلوایا مگر ۷ بجے تک وہ تشریف نہ لا سکے تو ریاست کے ایک ڈاکٹر کو بُلوا بھیجا، اتنے میں ڈاکٹر انصاری صاحب اور اُن کے ہمراہ چیف سکرٹری صاحب میرے کمرہ میں تشریف لائے، ڈاکٹر صاحب سے معلوم ہوا کہ سرکار سے انہوں نے میرے متعلق گفتگو کی تھی، اور سرکار کو نظر بندی کے آئندہ خراب نتائج سے بھی مطلع کیا تھا، ڈاکٹر انصاری صاحب مجھے دیکھ رہے تھے کہ سرکار نے انہیں یاد فرمایا اور وہ تشریف لے گئے، اس عرصہ میں چیف سکرٹری صاحب نے مجھے فرمایا کہ تم بھی سرکار کی خدمت میں حاضر ہو تو مناسب ہے،

سرکار کا حکم ہے کہ تم اپنے مکان جا سکتے ہو، مگر تا اختتام جنگ رامپور سے باہر نہ جاؤ نہ کسی سے خط و کتابت کرو نہ یہاں کسی خاص و عام جلسہ میں پالیٹکس پر گفتگو کرو، میں نے کہا کہ مجھے رات سے سخت حرارت ہے اس وقت کچھ پسینہ آرہا ہے، اگر میں اس وقت باہر نکلا تو ہوا لگ جانے اور مرض بڑھ جانے کا اندیشہ ہے، اس پر انہوں نے فرمایا کہ خیر تم لکھ دو کہ تم ان شرائط کی پابندی کروگے، واضح ہو کہ نہ قلبی، اپنی خوشی آیا نہ یہ شرائط مجھے پسند ہیں، دونوں کو حکم سرکار سمجھا، اور جس طرح پہلے حکم پر عامل ہونا اپنا اخلاقی فرض سمجھا، اسی طرح اس نئے حکم پر بھی سمعاً و اطعناً کہا، چنانچہ تینوں امور جن کا چیف سکرٹری صاحب نے ذکر کیا تھا، ایک عرضی کے چھپے ہوئے فارم پر ایک سرکاری محرر نے لکھ دیئے اور میں نے دستخط کر دیئے، البتہ دو امور کے متعلق میں نے عذر پیش کیا، ایک یہ کہ تا اختتام جنگ میں شہر رامپور سے باہر نہ جاؤں، میں نے کہا کہ مجھے اختتام جنگ سے کیا واسطہ، چاہے جنگ کل ختم ہو، چاہے ہزار برس رہے، مجھے صرف سرکار کے حکم سے واسطہ، اس لئے بلا اجازت سرکار باہر نہ جاؤں گا، دوسرے یہ کہ خط و کتابت میں ویسے بھی کم کرتا تھا، اور اب تو اور بھی کم خط و کتابت کرنے کی ضرورت پیش آئے گی، لیکن ضرورت ہوگی تو لکھنا پڑیگا، البتہ مجھے کچھ عذر نہ ہوگا اگر سرکار ڈاک میں پڑنے سے پیشتر میرے خطوط ملاحظہ فرمالیا کریں، چنانچہ چیف سکرٹری صاحب نے فرمایا کہ اسی طرح لکھ دو اور میں نے ان دو امور کے متعلق عرضی میں اسی طرح لکھ دیا، عرضی کی عبارت حسب ذیل ہے:

غریب پرور سلامت، جاں نثار کو رات سے بخار شدت سے چڑھا ہوا ہے، اور پسینہ آرہا ہے، اس وجہ سے اس وقت حاضری سے معذور ہوں ورنہ خود حاضر ہو کر امور ذیل کے متعلق عرض کرتا۔

۱۔ میں اقرار صالح کرتا ہوں کہ بغیر اجازت سرکار کے شہر رامپور سے باہر نہ جاؤنگا۔

۲۔ میں اس کا بھی اقرار کرتا ہوں کہ کسی سے ریاست کے باہر خط و کتابت نہ کرونگا، اگر کسی کو مجبوری سے کوئی تحریر بھیجنا ہوئی تو اول وہ تحریر سرکار میں پیش ہو جائے گی، اور اگر سرکار اس کو ناپسند نہ فرمائیں گے تو ارسال کی جائے گی۔

۳۔ میں یہاں پولٹیکل امور کے متعلق خاص یا عام جلسہ میں گفتگو نہ کروں گا، واجب تھا عرض کیا آفتاب دولت و اقبال تاباں و درخشاں باد، عریضہ جانثار محمد علی مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۱۵ء۔

دس بارہ منٹ کے بعد چیف سکرٹری صاحب واپس آئے اور فرمایا کہ سرکار نے اجازت دی ہے تم گھر جا سکتے ہو، چنانچہ میری علالت کے باعث پالکی منگوائی گئی، اور میں اس میں سوار ہو کر مغرب کے وقت مکان واپس آیا، قلعہ میں میں کل آٹھ گھنٹہ رہا، میرے مکان آجانے کے کچھ عرصہ بعد مسٹر شوکت علی نے حسب ذیل تحریر نواب صاحب کی خدمت میں ارسال کی۔

شوکت کا خط

عرض حال

حضور پر نور دام اقبالہم، ڈاکٹر انصاری صاحب دہلی تشریف لائے اور مجھے حضور کا محبت آمیز حکم سنایا، حضور کو میں خوب جانتا ہوں اور حضور مجھ کو بخوبی جانتے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ میرے ایمان اور حمیت میں اب پہلے سے اور اضافہ ہوگیا ہے کوئی کمی اور تبدیلی واقع نہیں ہوئی اور جہاں تک میرا گمان ہے، حضور بھی نہیں بدل سکتے ہیں، ہاں

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

حضور کو ضرور علم ہوگا کہ ہم نے اپنے طرز عمل میں اب تک کوئی فرق نہیں ہونے دیا، ہم دل سے نمک حلال اور وفادار ہیں، جیسے کہ ہمیشہ تھے، رامپور ہمارا پیارا وطن ہے، اور وہ ہم سے کبھی چھوٹ نہیں سکتا، حضور ہمارے آقا ہیں، اور کوئی طاقت ہمارے اور حضور کے درمیان تفرقہ نہ ڈالے گی، ہم نے آج تک کوئی کام قانون یا اپنے آقا کے خلاف نہیں کیا، اس کو خدا، خود حضور اور تمام حکام و رعایا شہر اور باقی دنیا جانتی ہے، اسی وجہ سے ہم کو کبھی رامپور آنے جانے میں نہ ڈر ہوا ہے نہ ہوگا، جس وقت محمد علی کی صحت کا سوال آیا تو سب کے خلاف میری یہ رائے ہوئی کہ وہ آرام سے جاکر دو مہینہ رامپور میں بیٹھیں اور وہاں اطمینان سے علاج کریں، اور اگر بعد کو ضرورت ہو تو شملہ یا منصوری جائیں، اس میں ہر طرح کا فائدہ تھا، ایک تو تمام خاندان اور دوست احباب تیمارداری کریں گے اور دوسرے مصارف کم ہونگے، مجھ کو اس بات کا ضرور خیال تھا کہ ممکن ہے کہ حکام صوبہ متحدہ جو محمد علی کے درپئے آزار ہیں کوئی ایسی کارروائی کریں، جس سے محمد علی کو حضور کے ذریعہ سے نقصان پہونچے اور اُن کا مطلب نکلے، اُن کا کام ہوجائے اور دنیا بھر میں حضور کی بدنامی رہے، میں خوب جانتا ہوں کہ مطعون کرنے میں خود ان افسروں کا بڑا حصہ ہوگا، وہ کہتے کہ باوجود اس کے کہ ہم محمد علی سے سخت ناراض ہیں، ہم کوئی کام خلاف قاعدہ نہیں کرتے، دیکھو وہ جن کی محمد علی اور تم لوگ تعریف کرتے ہو، اس طرح کی زبردست اور خلاف قانون کارروائیاں کرتے ہیں، اگر ہم ہندوستان سے چلے گئے تو بجائے انصاف کے اس طرح کے بلکہ اس سے زاید مظالم کئے جائیں گے، مگر مجھ کو یقین کامل تھا، کہ حضور وہی کریں گے، جو حضور نے کیا،

اگر محمد علی کے خلاف گورنمنٹ کوئی کارروائی کرنا چاہتی ہے، تو محمد علی کا مکان اور کارخانہ دارالحکومت دہلی میں موجود ہے، ذرا سی اطلاع پر وہ آج ہی رامپور سے واپس دہلی آجائے گا، اور حکام کے ساتھ ہی حاضر ہوکر اپنے مقدمہ کی پیروی کریگا۔

ہم نے اپنی خدمات، اپنی قابلیتیں، اپنی صحت، اپنی دولت، اور اپنے دوست اپنی اور اپنی ہر چیز اللہ اور اس کے رسولؐ کے کام کے لئے وقف کردی ہے، اور ہم ایک منٹ کے لئے بھی اپنے بار سے سبکدوش ہونا نہیں چاہتے، خدا سے بھی دعا ہے کہ وہ ہماری ناچیز خدمات کو قبول کرے اور ہم کو صراط مستقیم پر قائم رکھے، ہم گورنمنٹ کے ہرگز ہرگز خلاف نہیں ہیں، مگر ہاں ہم اپنے دین کے سچے حامی ہونا چاہتے ہیں، اور اس کے خلاف کسی اور کو جائز نہیں سمجھتے ہیں، چاہے ہمارا کیسا ہی نقصان کیوں نہ ہو ہم روپیہ شہرت آرام کے بھوکے نہیں ہیں، یہ ممکن ہے کہ ہم بہت سی غلطیاں کرتے ہوں، مگر ہماری نیت بخیر ہے،

اوران غلطیوں کی سزا کے لئے ہم ہر وقت تیار ہیں، وہ سزائیں، ہمارے تنزکیہ اور نجات کا باعث ہوں گی،

حضور والا کو منصوری اور شملہ کا واقعہ خوب یاد ہوگا، غیر ہمیں اگر سنگ سار بھی کرے تو اُس کی چوٹ نہیں لگتی، ہاں اپنے کا پھول مارنا گولی سے زیادہ تکلیف پہونچاتا ہے،

حضور والا گورنمنٹ کے افسروں کو اس قدر اختیارات اور طاقت ہے کہ محمد علی غریب تو کیا اگر وہ چاہیں تو حضور نظام دائی دکن کو بھی ایک چوکیدار کی معرفت پکڑوا بلوائیں، بعد کا نتیجہ چاہے کچھ ہو،

حضور والا، رامپور ہمارا وطن ہے، رامپور ہی میں ہم اور ہمارے باپ دادا پیدا ہوئے اور وہیں باپ دادا مرے اور دفن ہوئے، رامپور ہی میں مرنے اور دفن ہونے کی ہم کو خود خواہش ہے، اور رہے گی، جب تک کہ ہم حضور کے مجرم ثابت نہ ہوں، رامپور اور حضور ہمارے ہیں اور ہم اپنے وطن میں آئیں گے اور جائیں گے، بس دن حضور کا حکم ہوگا مت آؤ ہم بدرجہ مجبوری تعمیل کریں گے، مگر دل وہیں پڑا رہیگا،

رہی میری اپنی ذات - تو سرکار میرا دل تو وہیں رامپور میں پڑا رہے گا، اگر زندوں سے ملاقات نصیب ہو تو بریلی دروازہ ایک سفید قبر سے ملاقات کرنے کے لئے دل تڑپے گا، میں ہر وقت حضور کے حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں، مجھے یہاں کی اور چیزوں سے کام نہیں، ہر خدام کعبہ کا کام عقبہ عمر کرنا ہے، میں حلف بھی لے چکا ہوں وہ میں دہلی نہ سہی رامپور بیٹھکر کر سکتا ہوں، مگر اس وقت محمد علی کے کارخانہ کو سنبھالنا ضروری ہے، کیونکہ ہم سب کا اسی پر گذر ہے، بفضلہ تعالیٰ آمدنی معقول ہے، مگر مصارف اس قدر بڑھا رکھے تھے، الامان - اس پر بدنامی اور لے تو بھی، اس وقت مجھ کو پندرہ ہزار روپیہ کا انتظام کرنا ہے، تاکہ تمام قرضہ کے بل ادا کر سکوں، خدا مددگار ہے، حضور کی اور میری بیچ آقا اور نوکر کے درمیان کبھی کوئی پردہ نہ تھا اور نہ ہوگا، اپنے دل کا سب حال عرض کر دیا، یعنی سوائے حضور کے کسی دوسرے شخص کو دنیوی معاملات میں مربی نہیں بنایا اور اب آخر وقت میں کیا بناؤں گا،

حضور خفا ہوں یا خوش، سزا دیں یا انعام، ہم حضور ہی کے ہیں، اس لئے بس یہی التجا ہے کہ اگر ہماری قسمت میں اسلام کی خدمت کرنے کے صلہ میں پھانسی ہو تو وہ پھانسی غیر کے ہاتھ سے ہماری گردن میں ڈالی جائے کسی عزیز کا مبارک ہاتھ ہمارے خون سے گنہگار نہ ہو،

میں جب رامپور آتا ہوں تو حسب معمول قدیم سلام کو حاضر ہو جاتا ہوں، حضور کو اطلاع مل جاتی ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ ۲ مئی ۱۵ء کو ایک دن کے لئے حاضر ہوں گا، میں خوش ہوں اور حضور کے لئے دعا کرتا ہوں، خدا اسلام کا دنیا میں بول بالا کرے پہلے دیوانہ تھا اب مجنوں ہو گیا ہوں اقبال پڑھتا ہوں اور مست رہتا ہوں،

اس کے بعد ۳ اپریل ۱۵ء کو مسٹر شوکت علی رامپور تشریف لائے اور سرکار کی خدمت میں تقریباً روز حاضر ہوتے رہے، میرے متعلق بھی چند بار گفتگو ہوئی اور میری علالت کا خیال فرماکر سرکار نے مسٹر شوکت علی کی استدعا کو منظور فرما لیا، کہ میں منصوری چلا جاؤں، مسٹر شوکت علی نے یہ بھی استدعا کی تھی کہ چونکہ دس بارہ دن میں مجھے کئی بار بخار آ چکا تھا، اس لئے مجھے دہلی جاکر ڈاکٹر انصاری سے مل آنے کی اجازت دی جائے، انہوں نے عرض کیا کہ اس سے ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہوگا کہ سینکڑوں آدمی جو میری

نظر بندی کے متعلق اُن سے ہزاروں استفسارات کرتے رہتے ہیں وہ خاموش ہو جائیں گے، اور سرکار کی بدنامی نہ ہوگی، خیال سے جو طریقہ اب تک خود انہوں نے اور ہمدردوں نے اختیار کر رکھا تھا اُس سے بھی بچا جاتا اور لوگوں سے آزادانہ ملنا جلنا بھی ممنوع ہوگا، مگر اس کی روانگی کے وقت سرکار نے اس درخواست کا کوئی جواب عطا نہیں فرمایا تھا، ۴ مئی ۱۹۱۵ء کو میں نے خود ایک عریضہ سرکار کی خدمت میں بھیجا جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے،

ترجمہ چٹھی

حضور والا مجھے سخت افسوس ہے کہ میں خاص باغ میں ایک بار بھی شرف باریابی کی حضوری حاصل کرنے سے محروم رہا تھا، بغرض تمام لوگوں سے حاضر ہوں گا، وجہ یہ ہوئی کہ میں بخار سے پہلے صاحب فراش تھا اور یہ حالت ابھی تک باقی ہے کہ دوسرا حملہ ہوا نتیجہ یہ ہے کہ اب تک چلنے پھرنے سے معذور ہوں، میں شکر گزار ہوں کہ حضور والا نے میری صحت کا خیال فرما کر مجھے منصوری جانے کی اجازت مرحمت فرمائی، پہلے ارادہ یہ تھا کہ دریا کا راستہ ایک ماہ تک پہاڑ پر چلا جاؤں، لیکن چند روز کے اندر چونکہ دو حملہ بخار کے ہو چکے اُن سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ شاید ایک مدت طویل جانے کے بعد بھی اس میں پیدا ہو چکے ہیں لہذا میری خواہش یہ ہے کہ چند روز کے لئے دہلی چلا جاؤں وہاں ڈاکٹر انصاری صاحب سے معائنہ بھی کرالوں اور ضرورت ہو تو ان کا علاج بھی شروع کردوں امید ہے کہ حضور والا کو اس پر اعتراض نہ ہوگا، حضور کا جان نثار و تابعدار خادم محمد علی،

یہ عریضہ چیف سکرٹری صاحب کے نام کے خط میں ملفوف کرکے چیف سکرٹری کے پاس ۴ مئی کی شام کو بھیج دیا گیا تھا، مگر معلوم ہوا کہ ان کو ۵ مئی کی صبح تک موصول نہیں ہوا، اس اثنا میں ۴ مئی اور ۵ مئی کے درمیان رات کے گیارہ بجے چیف سکرٹری صاحب میرے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ بھائی ایک عجیب آفت ہے، آج ریزیڈنٹ صاحب (کرنل ہربلی) کے پاس سے ایک اطلاع تحریری اس مضمون کی موصول ہوئی ہے کہ گورنمنٹ ہند نے پوچھا تھا کہ محمد علی کے متعلق کیا واقعہ ہے جس کے جواب میں لوکل گورنمنٹ (مسٹر مسٹن) نے لکھ دیا ہے کہ دربار رامپور نے انہیں نظر بند کر دیا ہے، واضح ہو کہ اب تک اس معاملہ میں گورنمنٹ کو ریاست کی طرف سے کوئی تحریر نہیں بھیجی گئی تھی، اس لئے بظاہر مسٹر ڈگلس سٹریٹ ہی لوکل گورنمنٹ کا ذریعہ ہو سکتے ہیں، اب چونکہ مسٹر مسٹن نے ریاست سے دریافت کئے بغیر گورنمنٹ ہند کو یہ لکھ دیا کہ مجھے منصوری نہ جانے دیا جائے اور چونکہ وہ واپس چلے گئے تھے اس لئے حکم ہوا کہ مجھ سے کہہ دیا جائے کہ منصوری نہ جاؤں، مجھے اس زمانہ میں خود بھی حرارت تھی، اور ایک لڑکے کی حرارت رفع ہونے پر دوسرے لڑکے کو شدت سے بخار آگیا تھا، ۵ مئی کو میرے لڑکے کا بخار ۱۰۵ ڈگری تک پہنچ گیا تھا، اور پھر بھی ڈاکٹر نہ نصیب ہو سکا میں نے چیف سکرٹری کو ایک ذیل کی تحریر لکھی،

تحریر بنام چیف سکرٹری، اشد ضروری

مکرمی من،

میں نے آج آپ سے ذکر کیا تھا کہ اپنے منجھلے لڑکے کو بخار میں چھوڑ کر خاص باغ میں آیا ہوں، اس کو کئی گھنٹہ ہو چکے تھے

مسلسل ۱۰۳ کی حرارت ہے، سہ پہر کو حرارت اور بڑھ کر ۱۰۵ تک جا پہونچی، اس وقت گھر کے آدمیوں نے گھبرا کر ذریعہ ٹیلیفون اس کی اطلاع مجھے کرنا چاہی جس کا علم اب مجھے واپسی پر ہوا ہے، ڈاکٹر عبد الحکیم غریب تو اب یہاں ہے نہیں، لہذا باقی ماندہ ڈاکٹروں پر کام کا بار زیادہ پڑ گیا ہے، مجھے اب تک کوئی ڈاکٹر نہیں ملا کہ لڑکے کو دکھا سکوں، بخار ظالم ہے اور حرارت تقریباً ۱۰۴ سے کم نہیں ہوتی، اس عرصہ میں یونہی رہے دو حملہ مجھ پر ہوئے، ایک منجھلی لڑکی پر اور سنجھلی لڑکی پر، اس نے مجھے سخت پریشان کر دیا ہے ایسی حالت میں سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ جب ہی سفر کرنے کے قابل جب ہی ہو تو میں رامپور سے چلا جاؤں، براہ کرم سرکار سے میرے اس عریضہ پر حکم حاصل فرما لیجئے جو میں نے کل آپ کے خط کے ساتھ ملفوف کیا ہے، یہ ظاہر ہے کہ اس بار جیسے میں رامپور پہونچا ہوں، نصیب سے رہنا نہیں ہے، اور مجھ سے یہ توقع کرنا نامناسب ہے کہ اس زمانہ کہ ناگزیر ہے، میں یہاں زیادہ رہ کر اپنی اور اپنے بچوں کی صحت کو خراب کروں از راہ کرم میرے اس عریضہ کو ضروری سمجھیں کے

اس کے بعد میں نے ڈاکٹر انصاری کو دہلی سے بلایا، مسٹر شوکت علی علیگڑھ تھے، اُن کو اس تازہ واقعہ کی اطلاع دی گئی، چنانچہ ۸ رمئی کو دونوں صاحب تشریف لے آئے، ہم لوگ سہ پہر کو سرکار میں حاضر ہوئے، تو معلوم ہوا کہ سرکار نے گورنمنٹ کو میرے متعلق کچھ تحریر فرمایا ہے، اور جواب کے منتظر ہیں، اگر گورنمنٹ کو عذر نہ ہوا تو سرکار کو میرے چلے جانے میں کوئی عذر نہ ہوگا جہاں تک مجھے علم ہے اب تک کوئی جواب موصول نہیں ہوا ہے، یہ وہ واقعات ہیں، جو اب تک پیش آئے ہیں، اور میں نے ان کا قلمبند کرنا ضروری سمجھا ہے، تاکہ آئندہ میں موجود ہوں یا نہ ہوں اصل واقعات ہر شخص کو بآسانی دستیاب ہو سکیں،

ہمدرد میں جو کچھ میرے متعلق میری غیر حاضری میں چھپا ہے، وہ اور مضامین کی طرح نہ میرے ایما سے چھپا ہے نہ میرے علم سے، اس لئے میں اُس کا ذمہ دار نہیں، جو، جو کچھ شائع ہوا ہے، یقیناً میرے کسی خیر طلب کی مصلحت اندیشی پر مبنی ہوگا، اور غالباً اُس کی غایت اور غرض سوائے اس کے کچھ نہ ہوگی کہ ایک مسلمان والیٔ ملک جہاں تک ممکن ہو بدنامی سے بچایا جائے، اور آج کل کی پریشانیوں میں، ایک ذاتی شورش کا اضافہ نہ ہو،

وائسرائے کا اعلان

(۱)

۹ نومبر ۱۴ء قبلہ و کعبہ۔ السلام علیکم

حضور والا نے وائسرائے کا دوسرا اعلان ملاحظہ فرمایا ہوگا جس میں ہوم قوم کی جھوٹی ..... کی تردید کی گئی ہے کہ برطانیہ نے جدہ پر گولہ باری کی، اس قسم کی افواہیں ہر وقت اُڑیں گی، اور مخلوق میں سخت بے چینی کا باعث ہوں گی، اس کا علاج یہی ہے کہ حجاج وہاں ٹھہرنا شروع ہوں اور سیدھے طور ..... انکار کردینگے ۔ ...ؔ مسلمان ہرگز اس کو پسند نہیں کرینگے کہ حجاج کی ...ؔ یا کسی وجہ سے بھی ایک منٹ کے لئے بحاء یا عرب مقدس سے خادم الحرمین الشریفین کے علاوہ کسی دوسرے کا تعلق ہو۔ بدرجہا بہتر ہے کہ حجاج وہاں ٹھہر کر مریں اس لئے اب سب کی رائے ہے کہ وقت آگیا ہے کہ حضور انجمن خدام کعبہ کی طرف سے وائسرائے بہادر سے ملیں اور حجاج کی واپسی کی نسبت اُن سے دریافت کریں کہ آپ نے کیا سوچا ہے انگریزی جہاز وہاں نہیں جاسکتے اور وہاں کے جہاز یہاں نہیں آئینگے ۔ ..... امریکہ، اٹلی، سویڈن وغیرہ کے جہاز ...ؔ ..اُن کی واپسی کا انتظار کرے گی حضور ...ؔ.. اجازت دیں کہ ہم اس کا انتظام .... ہے کہ اس معاملہ میں سلسلہ جنبانی کریں اگر ممکن ہو تو حضور ایک دن کے لئے رام پور تشریف لے آئیں، نیز علی امام صاحب کو بھی لکھیں۔ میں تار بھیجتا ہوں۔ کارخانہ کا کام اجرا ہوگیا۔

حضور کا خادم۔ شوکت علی

ؔ عبارت ضائع ہوگئی ہے،

ہم ہر تکلیف برداشت کرینگے

(۲)

لینڈس ڈاؤن ۱۹ نومبر ۱۹۱۵ء

حضور والا، السلام علیکم،

حضور والا کا حکم نامہ مع دونوں پارسلوں کے ملا، خط تو اول ملا تھا، اور پارسلیں شام کو ملیں، کیونکہ وہ کھولنے کیلئے روک لی گئی تھیں، کل ہی محمد علی نے خط حضور کو لکھا تھا، اور ۱۲ تاریخ کے لئے ناشتہ کی یاد دہانی کی تھی، یاد دہانی کی حضور کو کب ضرورت تھی، اس سے بیشتر کہ ہم کو خیال ہوتا خدا کی طرف سے لینڈس ڈاؤن میں آموجود ہوا، جو حضور نے خط میں تحریر فرمایا ہے، اُس کو پڑھ کر ہمارا دل بھر آیا، خدا حضور کو خدمت دین کے لئے برسوں زندہ اور سلامت رکھے، تاکہ ہم لوگ اس قابل ہوسکیں کہ اپنے متبرک مذہب کی خوبیاں دیکھ سکیں، ۱۶ اکتوبر کو میں نے ایک خط اور لکھا تھا، جس میں ایک نقل اُس خط و کتابت کی شامل کر دی تھی، جو میرے اور صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ کے مابین نسبت خدام کعبہ کے ہوئی تھی، وہ رجسٹری شدہ بھیجا تھا، میں آج اُس کی نسبت پنسٹر سے دریافت کروں گا کیونکہ رسید رجسٹری میرے پاس اب تک نہیں آئی ہے، اپنے جواب میں میں نے تمام غلط فہمیوں کی جڑ کاٹ دی تھی، اور خدام کعبہ کی نسبت تمام حالات اور اپنے معتقدات بحیثیت مسلمان بیان کر دیئے تھے،

مجھ کو یقین کامل ہے کہ میری سچائی اور صاف گوئی کی گورنمنٹ داد دے گی، معاملات دین میں مصلحت آمیزی سے کام لینا سخت خرابیوں کا باعث ہوتا ہے، اور ہم نے دیکھ لیا کہ ...... کیسی بے قدری کی گئی، ہماری قابل قدر خدمات بجائے شکریہ کے مستحق ہونے کے ...... پہونچانے کا باعث ہوئیں، جو خدماتِ دین ہم پر فرض ہیں وہ تو ہم کسی طرح نہیں ترک کرینگے، جو تکالیف اور مصائب اُن کی وجہ سے آئیں، ہم اُن کے لئے بخوشی طیار رہیں گے، غالبًا وہ میرا خط حضور کو اب مل گیا ہو، انشاء اللہ اتوار کی ...... میل سے، لکھنؤ ہی میں قدم بوسی حاصل کروں گا، والدہ صاحبہ سلام عرض کرتی ہیں، حضور دعا فرماتے جائیں، اب تک بفضلہ تعالیٰ قلب میں بہت طاقت ہے، تہجد کی تھوڑی سی نماز سے قوت میں اضافہ ہے اور دل بہت مطمئن، خدا ہر مسلمان کو قوت ایمان دے، عجیب چیز ہے، بس یہی دعا ہے کہ خدا توفیق دے کہ کوئی خدمت اسلام اس ناچیز اور کمزور ہستی سے سرانجام کو پہونچ جائے، مولانا سلامت اللہ صاحب کی خدمت میں سلام مسنون، یہ بھی خدا کا بڑا شکر ہے کہ لکھنؤ ہو کر جانا ہوا، تاکہ حضور کی قدم بوسی ہو سکے گی، میرے گھر میں کا گذشتہ سال ۱۳ محرم کو انتقال ہوا تھا، غالبًا اُس دن میں ریل ہی میں ہونگا، اور معمولی فرائض کے علاوہ اس قدر فرصت نہ ہوگی کہ کچھ زاد راہ کا سامان کرتا، حضور توجہ فرما کر مرحومہ کے لئے دعاء مغفرت فرمائیے گا، یہ ایسے دن ہیں کہ انسان اطمینان سے یاد رفتگاں بھی نہیں کرسکتا،

حضور کا خادم شوکت علی معتمد خادم الخدام کعبہ

سے کاغذ غائب،

وائسرائے کو انتباہ

(۳)

حامد باغ رامپور ۱۲ نومبر ۱۳ء،

قبلہ وکعبہ۔ السلام علیکم،

حضور کا والا نامہ ملا جو خط حضور نے وائسرائے بہادر کے لئے لکھا ہے وہ نہایت مناسب ہے اول تو بہتر یہی ہوگا کہ حضور یہ تمام باتیں زبانی فرمائیں اور اسلئے حضور ناظر الدین حسن صاحب سے لکھوا کر محض ملاقات کے لئے وہ خط بھجوا دیں اگر وائسرائے بہادر ملاقات کا وقت نہ دے سکیں تو یہ تحریر اُن کی خدمت میں بھیجی جاوے، یہاں مولانا خواجہ احمد صاحب موجود نہیں ہیں، ابھی دو مرتبہ گیا علاقہ کو گئے ہوئے ہیں، دہلی اب تک میں گیا نہیں ہوں، ایک تو میں خود کام میں ہوں دوسرے محمد علی بھی وہاں مصروف ہونگے، ترجمہ میں خود کر لوں گا، ایک اور طریقہ تھا کہ یہ خط بجنسہ سرعلی امام کی معرفت وائسرائے بہادر کی خدمت میں پیش کیا جائے وہ اس کا ترجمہ کر کے اُن کو سُنا دیں گے آخر مسلمان اور ہندوستانی ممبر کا یہی مقصد تھا، مجھ کو امید ہے کہ حضور کے پاس اس خط کی اصل موجود ہو گی، میں مسودہ محمد علی کے پاس ابھی بھیجتا ہوں، یہاں ایک آدھ صاحب کو دکھایا سب نے پسند کیا، اس کا بعد کو شائع ہونا از بس مفید ہوگا۔ افسوس کہ انگریز حاکم اس قدر بدحواس ہو رہے ہیں کہ جو اُن سے کہہ دیا جائے اس کو یقین کر کے بے تکی اور بے موقع کاروائی شروع کر دیتے ہیں، مشورہ نیک نہ لیتے ہیں نہ اس پر توجہ کرتے ہیں۔ وائسرائے بہادر سے ملنا از حد ضروری ہے، میں نے سرجیمس مسٹن[1] کو اول ملاقات کے لئے لکھا تھا بریلی میں مگر اُن کا وہاں قیام نہ ہوا اس لئے انہوں نے ملاقات

[1] گورنمنٹ صوبہ متحدہ

کو ملتوی کردیا، اب میں نے لکھا ہے کہ جہاں ملیں گے اور جب، دیکھئے کیا جواب ملتا ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ صاف صاف ہماری سن لیں اور اُس کے بعد ان کو اختیار ہوجاہیں غلط فہمی قائم رکھیں، اگر نہ ملیں تو بھی ہمارا کچھ نقصان نہیں ہم اپنا فرض ادا کرچکے،

خط کا مضمون واپس بھیجتا ہوں اس کو حضور، زمیندار، سیارہ، ہیبہ اخبار، بمبئی کرانیکل، انقلاب، بمبئی اور دیگر اخبارات میں بھجوا دیں اور اگر آسانی ہو تو ایک ہزار کا بیان انجمن کے صرف سے طبع لکھنؤ میں کرا دیں، دہلی سے ظفر احسن صاحب کل شام کو بمبئی روانہ ہوگئے ۲۲ کو حجاج کی آمد ہے، سر علی امام کا جو جواب آئے حضور مجھ کو مطلع فرمائیں۔

۵ گورنر سوہنتھارہ　　　　　　　　حضور کا خادم۔ شوکت علی،

ٹرنر مارلیسن کمپنی[1] اور حجاج

(۴)

حامد باغ رامپور ۱۴/ دسمبر ۲۷ء

قبلہ و کعبہ۔ السلام علیکم،

میں آج صبح ڈاک سے بمبئی سے واپس آیا، میرا ارادہ اسی شب کو بمبئی جانے کا تھا جس شب کو سانحہ پیش آیا حضور دعا فرمائیں کہ خدا میری زندگی پاک کردے اور اپنی راہ میں میری قربانی قبول فرما دے، بمبئی ۷ کو روانہ ہوا تھا اور تین دن رہا علاوہ بیرسٹروں کے سر فیروز شاہ مہتہ، مسٹر واشا اور مسٹر واڈیا نے بمبئی بلایا تھا یہ لوگ اخبار کرانیکل کے کمپنی کے ڈائرکٹر میں مجھ سے سب حالات سننے کے بعد اُن کی رائے ہوئی کہ مقدمہ ضرور چلایا جاوے، یہی نہیں کہ ہم فتحیاب ہوں گے، بلکہ مسئلہ حج جو سارے ہندوستان کا مسئلہ ہے حل ہوجائے گا، خفیہ کارروائی جانبر نہ ہوگی، اور گھر بیٹھے ٹرنر مارلیسن کی رعایت نہ ہوسکی ٹرنر مارلیسن اب گھبراتا ہے کیونکہ عدالت میں تمام معاملات کھل جائیں گے جس سے اُس کی پردہ داری ہوجائے گی کہ غریب حاجیوں پر کیا کیا مظالم ہوتے تھے۔ اسی وقت ایک کمپنی قائم کی گئی ہے جس پر سر فیروز شاہ مہتہ، مسٹر پیٹشا سکرٹری کانگریس، مسٹر واڈیا، مسٹر ستلوڈ بیرسٹرایٹ لا، مسٹر جناح حضور میرے، ڈاکٹر انصاری محمد علی مظہر الحق، فاضل بھائی، کریم بھائی اور دیگر مجاہدین کے نام ہوں گے، اور راجہ صاحب محمود آباد، اور وزیر حسن صاحب کے نام بھی شامل کئے جانے کی اجازت چاہی ہے

اپیل مفصل اور اس کی نقل کل کو بھیجوں گا، امید ہے کہ کل تک بمبئی سے آجائے گی ''ترکوں کی حماقت،، حضور کو بھیجتا ہوں، حضور ایک وائسرائے کو لکھیں اور ایک عام اخبارات میں شائع کریں، اور اگر مناسب خیال فرمائیں تو تمام جمعیت اصلیہ کے نام اس میں ہوں (گشتی خط میں) محمد علی نے کل وائسرائے کو اپنا پرائیویٹ خط اس کی بحث شکایت میں بھیجا ہے ہم پر فرض ہے کہ ہم سچے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر کر دیں، ایسے پاجی اشخاص گورنمنٹ اور مسلمانوں کے بحث دشمن ہیں۔

آپ کا خادم۔ شوکت علی،

---

[1] حاجیوں کو لے جانے والی جہاز ران کمپنی

سلطان المعظم ترکی

(۵)

حامد باغ رامپور ۱۹ر دسمبر ۱۴ء

قبلہ و کعبہ — السلام علیکم،

حضور کا والا نامہ صادر ہوا، بہت مناسب ہے کہ حضور کا نام اس عام اپیل پر نہ ہو بلکہ حضور علیحدہ ایک اپیل خادم کعبہ اور دیگر مسلمانوں کے نام بھیجیں، میرے خیال میں براہ راست خط و کتابت پرائیویٹ سکریٹری صاحب کی معرفت ہو تو بہتر ہے، علی امام صاحب کے بیان میں ڈالنا میرے خیال میں نہ تو ہمارے لئے مفید ہے نہ علی امام صاحب کے لئے، ترکوں کی حماقت کی نسبت اخبارات میں تحریر ہونا نہایت ضروری تھا آخری تفصیل نسبت کیونکہ اُس سے ہم کو مذہبی تعلق تھا، تمام مسلمانوں میں اس وقت نہایت رنجیدہ بے چینی پھیلی ہوئی ہے، کیونکہ حقیقتاً اسلام کے خلاف کوئی [illegible] دینی کا باعث ہے، اس وقت عام مسلمانوں کی نگاہیں علماء کرام کی طرف لگی ہیں کہ وہ مذہبی احکام صاف صاف طور سے حکام کے سامنے پیش کر دیں، خوش اسلوبی کے ساتھ کسی قسم کی بدمزگی نہ ہو، مجھ کو یقین کامل ہے کہ حکام بھی [illegible] پر زور دیا جاتا تو ڈالیں گے مسئلہ خلافت کا تذکرہ اس وقت لانا حماقت ہے [illegible] سلطان المعظم کے تعلق [illegible] خادم الحرمین شریفین نہیں ہو سکتا، ہم دینی احکامات حکام پر اُن کے ہاتھوں سے باہر قبول کر سکتے ہم کو ان امور کو صاف کر لینا چاہئے، کیونکہ اندیشہ ہے کہ مفسد لوگ اس معاملہ میں ایسی [illegible] خیال کریں، جس سے مسلمانوں میں فضول اشتعال پیدا ہو، ایسے وقت میں بزرگان دین اور قوم کی زیادہ مصلحت آمیز خاموشی نقصان کا باعث ہوگی، عام مسلمانوں کو دینی ہدایت کی ضرورت ہے، میں آج رات کو علی گڑھ جاؤں گا، اور ۲۱ و ۲۲ کو وہی رہوں گا، یہاں سالانہ رپورٹ طیار کرنا ہے، انشاء اللہ ۲۳ کو رامپور واپس آؤنگا، حضور کے آنے سے بہت سے ضروری معاملات طے پا جائیں گے، تاریخ سے مجھ کو اول سے مطلع فرمایا جائے،

حضور کا خادم شوکت علی،

علماء سوء کا ذکر

(۶)

حامد باغ رامپور ۲۴ر دسمبر ۱۴ء

قبلہ و کعبہ، السلام علیکم،

حضور کا تار ابھی ملا تردد ہو گیا، خدا اپنا فضل کرے مجھ کو امید ہے کہ حضور کل ایک تار مجھ کو اور بھجوا دیں گے جس سے گھر میں کی خیریت معلوم ہو سکے۔ میں دہلی گیا تھا، محمد علی سے تو ملاقات ہوئی نہیں کیونکہ وہ لاہور گئے ہوئے ہیں۔ کاغذات کا بڑا لفافہ حضور کے لئے چھوڑ گئے تھے مگر اظہر علی صاحب[1] اس کو بغیر لئے چلے گئے ہیں اس کو بعد کو بھجوا دوں گا۔ امیں

[1] منشی اظہر علی کاکوری اودھ کے مشہور خادم اسلام، ایک عرصہ تک مرکزی اسمبلی کے ممبر رہے۔

وائسرائے کے خط کا ترجمہ اور حضور کا وائسرائے کو خط وغیرہ تھا، خدا حضور کو تندرست کردے۔ اس وقت نہایت ضروری ہے کہ ایک دن کے واسطے حضور دہلی تشریف لے آتے راولپنڈی میں بہت اچھا موقع تھا کہ سب احباب سے مشورہ ہو جاتا، یہاں ایک فتویٰ آیا ہے جس میں خلیل الرحمٰن صاحب دستخط علماء کے مانگتے ہیں کہ ہم کو سلطان المعظم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے، حضور کو غالباً اس کا علم ہوگا۔ جمعیۃ اصلیہ کا دہلی میں جلسہ ہونا مناسب ہوگا۔ اس موقع پر حضور اگر مناسب سمجھیں ایک عام جلسہ کرکے سالانہ رپورٹ جو میں تیار کررہا ہوں سُنا دی جائے اگر ممکن ہوسکے تو حضور ایک دن کے لئے بھی راولپنڈی آسکیں تو بہت مناسب ہے،

ظفر احسن صاحب علوی کی نسبت کانفرنس کے دفتر میں ایک مثل ہو اُن کے سخت خلاف ہے، میں اس کو خود علیگڑھ میں نہ دیکھ سکا مگر وہ راولپنڈی میں میرے دیکھنے کے لئے لائی جائے گی اس کے دیکھنے کے بعد میں رائے قائم کرسکوں گا، اور حضور کے ملاحظہ کے لئے بھیجوں گا،

حضور کا خادم شوکت علی،

سنسر کا حکم

(۷)

مہرولی۔ ۲۳ جون ۱۹۱۵ء ایک بجے دن،

قبلہ و کعبہ۔ السّلام علیکم،

اگر زاہد دعا خیر میخواہی مرا ایں گو،
کہ آں آوارہ کوئے بتاں آوارہ تر باشد،

پرسوں شام حکم ملا تھا کہ ہم کوئی خط و کتابت عام اخبارات میں شائع اُس وقت تک نہ کریں، جب تک اس کو سنسر پاس نہ کردے، دوسرے دن معلوم ہوا کہ اخبار کو حکم ہوا کہ اس کی ہر تحریر سنسر کے پاس جائے، جو ایسے احمق واقع ہوئے ہیں کہ انہوں نے شروع سے لے کر آخر تک نامنظور نامنظور ہی لکھ دیا، آج صبح ۹ بجے ایک موٹر آئی اور اس پر ایک مسلمان سب انسپکٹر تھے، وہ کاغذ لائے جس میں لکھا تھا کہ گورنمنٹ نے آپکو لینڈسڈون پہاڑ جانے کا حکم دیا ہے، محمد علی کا ڈھائی سو روپیہ اور میرا سو روپیہ خرچ کا منظور ہوا ہے، مَیں نے نہایت شکریہ کے ساتھ لینے سے انکار کردیا ایسی عنایت کیا جس سے نہ پیٹ بھرے نہ جسم، غالباً میری پنشن والے ڈیڑھ سو روپیہ مہینہ کر دیئے گئے ہیں، جن کو اس نظر بندی سے کچھ تعلق نہیں ہے، محمد علی نے عذر لکھ دیا کہ اس وقت مجھ کو پہاڑ بھیجنا میری تندرستی کے سخت خلاف ہوگا کیونکہ گٹھیا کا سخت ترین دورہ مجھ پر ہے، علاوہ ازیں میں اپنے طبیبوں سے دور ہوجاؤں گا، میرے دل میں بھی آئی، حضور کو لکھ دوں کہ مجھ کو پہاڑ سے کیا تعلق، میرے لئے درگاہ ہی مناسب جگہ تھی، اس خط و کتابت سے ۱۱ بجے فارغ ہوئے پھر ایک دوسری تحریر محمد کو لکھنا تھی، جس میں وہ غریب اب تک مشغول ہے، حضور کو اُس کی اطلاع ہوجائے گی معرکہ کا خط ہے، میں نے جلدی جلدی چند دوست و احباب کو یہ خبر سنا دی، اس عرصہ میں یہاں درگاہ کے لوگ اور اہل شہر مانوس ہوگئے تھے، اُن کو رخصت کرنا ہے، والدہ صاحبہ یہاں ہی موجود ہیں، اور محمد علی کے گھر میں اور کئی اور عزیز رامپور

سے آ گئے تھے، وہ رخصت ہو گئے تھے کہ اُن کو دوبارہ بلوایا اور اُن کے ہمراہ والدہ صاحبہ اور محمد علی کے گھر ہی کو سوار کرایا،
والدہ ماجدہ کسی طرح نہیں مانتیں، برقع اوڑھ ساتھ ساتھ جانے کو ہمراہ تھیں، اُن کو دہلی گھمائیں گے، اور وہاں سے وہ ۴ بجے
کی گاڑی سے مراد آباد جائیں گے اور پھر ہم اور وہ ہمراہ لینڈز ڈون جائیں گے، مراد آباد سے نجیب آباد کو ریل جاتی ہے، اور وہاں
سے کوٹ دوارہ ہوتے ہوئے کل ۱۰ یا ۱۱ بجے تک دن کے انشاء اللہ لینڈز ڈون پہونچ جائیں گے، وہاں سے مفصل حال لکھوں
گا، غالباً اس خیال سے کہ کہیں اہل دہلی ہماری آؤ بھگت اور خاطر داری دوبارہ نہ کریں، ہم کو موٹر میں ہی غازی آباد یا ہاپوڑ
لے جائیں گے، اور وہاں سے ریل میں بٹھادیں گے، خدا کی عجب شان ہے کہ کس طریقہ سے ہم کو لینڈس ڈاؤن کی سیر کراتا ہے،
میں بہت خوش ہوں، قریب سے دل میں تقویت آتی ہے، حضور دعا فرماتے رہیں، میرا سب کو سلام،

حضور کا خادم۔ شوکت علی،

لینڈس ڈاؤن میں نظر بندی

(۸)

بنگلہ سنزانڈیک لینڈس ڈاؤن ۲ / جون ۱۵ء،

قبلہ و کعبہ۔ السلام علیکم،

ہم پرسوں بخیریت یہاں پہونچ گئے خدا کی کیا شان ہے کہ اُس نے ہم غریبوں کو بغیر کسی تکلیف اور زیر باری کے
اس پہاڑ کی سیر سی کرا دی میں بفضلہ تعالیٰ خوب تندرست ہوں جو میرے لئے اب معمول ہو گیا ہے، محمد علی بھی اچھے ہیں، مگر
گھٹیا کا تھوڑا درد ہے، اُس کے علاج کی طرف عنقریب توجہ کی جائے گی، ڈاکٹر انصاری صاحب منصوری سے واپسی
پر یہاں آئیں گے، اور دیکھ کر علاج تجویز فرمائیں گے، محمد علی دونوں وقت پھرنے جاتے ہیں، اور انشاء اللہ ورزش برابر
جاری رہے گی، اور اُن کے لئے مفید ہوگی۔

مہرولی سے تو حضور کو رخصت ہوتے وقت ایک لکھ چکا تھا، جو ملا ہوگا، وہاں سے راستہ میں خدا نے ایسا کیا کہ ۲۴
گھنٹے مراد آباد میں ٹھہرنا ہو گیا، اگرچہ .... سیدھا آنے کی ہدایت ہوئی تھی، مگر دہلی کی گاڑی دیر سے ....
...... کوٹ دوار کو روانہ ہوتے ہیں صبح ۵ بجے، نجیب آباد سے ۱۵ میل ہیں اور ایک گھنٹہ کا راستہ ۶ بجے ہم کوٹ دوار
، ہم تانگہ میں سوار
، ماجدہ نے
راستہ کے، جاول کی

کاشت زیادہ ہوتی ہے، گورنمنٹ نے ایک بنگلہ ہمارے لئے، کرایہ پر لے لیا ہے جو ہر طرح سے آرام کا ہے اور جس میں
سب سامان موجود تھا، اس کا مالک گورکھا رجمنٹ کا افسر تھا مگر غریب لڑائی میں مارا گیا یہاں ۴ رجمنٹ فوج کی رہتی تھیں
یعنی گورکھا اور گڑھوال جنہوں نے لڑائی میں بڑی بہادری دکھائی، اکثر پرانے افسر مارے گئے، بنگلے خالی پڑے ہیں،

انتظام کی دیکھ بھال کے لئے صرف ایک افسر رہتے جو جنٹ مجسٹریٹ کے درجہ کے ہوتے ہیں، موجودہ جنٹ مجسٹریٹ نے ہمارے
راستہ کا انتظام عمدہ طریقہ پر کیا تھا، اور ہم کو کسی طرح کی تکلیف نہ پہونچی، آدمی معقول اور بااخلاق ہیں، ہم اُس وقت چونکہ
جمعہ تھا وضو کرکے نماز ادا کرنے مسجد گئے اور وہ . . . ہے . . . سابق طور سے ادا کیا، مسلمان مشکل سے ۵، یا ۶ ہوں گے
ہر جگہ صرف چھاؤنی ہے، اور کوئی آبادی نہیں خدا کا شکر ہے کہ ہمارا دین ایسا مقدس ہے کہ . . . ہے . . . طرح کی آسائش
مل جاتی ہیں، سب . . . کاغذ . . . . . . غائب . . . . پر واپس آئے، تو . . . . .
. . . . غائب . . . . مسٹر بارکر آئے یہ جائنٹ مجسٹریٹ ہیں، ہمارے خطوط آئیں گے
بھی ان ہی کی معرفت اور جائیں گے بھی انہیں کی معرفت، اگرچہ اس کا رنج ہوا، کہ اس صوبہ کی گورنمنٹ نے کیوں ہماری اس
قدر بے اعتباری کی مگر نقصان کچھ نہ ہوا، کیوں کہ ہم کو کوئی خفیہ بات کرنا ہی نہ تھی، حضور یقین رکھیں کہ یہ جگہ بھی خدا کی یاد کے
لئے بہت موزوں ہیں، تمام طرف جنگل اور پہاڑ ہیں نماز نہایت زور سے ہوتی ہے، محمد علی اپنی بڑی موٹی اور بھاری
آواز میں اذان دیتے ہیں، پانچوں وقت، جس سے تمام پہاڑ گونج جاتا ہے، میں امام بنایا گیا ہوں، صبح و شام ٹہلنے جاتے
ہیں، خوب دُور تک. صبح کو تلاوت قرآن پاک ہوتی ہے، مع . . . کاغذ غائب . . . . کے جس وقت سے خدام کعبہ میں
حضور کے طفیل سے داخل ہوا اُس وقت سے بفضلہ تعالی نماز کبھی قضا نہیں ہوئی، تلاوت قرآن شریف گنڈہ دار ہوتی
تھی اب جب سے مہرولی گئے تھے، تب سے باقاعدہ تلاوت بھی ہونے لگی ہے، خدا کو اس غرض سے ہم کو نظر بند کرانا
تھا، آب و ہوا یہاں کی عمدہ ہے، نینی تال کی سی خنکی نہیں ہے، مگر موسم ضرور خوشگوار ہے، حضور کو ضرور آنا ہوگا جب
طبیعت چاہے، اول سے اطلاع دینا ہوگی، تاکہ تانگہ اور سواری وغیرہ کا انتظام کیا جاسکے، یہاں ایک اور قاعدہ
اول سے جاری ہے، کہ کوئی باہر کا آدمی نہیں آنے پاتا جب تک اس کو ڈاکٹری معائنہ کے لئے . . . .

. . . .

. . . . کیونکہ جواغرہ . . . . .

بھی۔ اور نیز ہمارے نوکروں کے لئے، اب یہاں رنگروٹ بھرتی ہو کر لڑائی پر جاتے ہیں، ہم سب طرح بخیریت ہیں،
حضور خدا سے دعا فرمائیے گا کہ خدا مجھ کو ایمان اور اس کی رضا جوئی عنایت فرمائے،

صدر دفتر سے تمام کاغذات حسب معمول یہاں میرے پاس آئیں گے تاکہ کام کی غور و پرداخت ہو سکے، حضور کو
اس وقت میں زیادہ کام کا بار پڑ جائے گا، آمدنی اس وقت بہت کم ہے، اخراجات کے لئے حسب ضرورت حضور لکھنؤ
کی جمعیت عالیہ کے خزانہ سے یا بذریعہ چک تنخواہ وغیرہ بھجوا دیجئے گا، عملہ بہت کوشش کرتا ہے، اور اس میں کہ صرف
تھوڑے ہو سکتے ہیں، یہ دو تین ماہ جنگ کے ہیں، جو انشاء اللہ جلد گذر جائیں گے اور پھر خدا کے فضل سے ہم اپنے
اس مقدس کام کو آسانی سے چلائیں گے، یہ موجودہ بدگمانیاں اور شبہات دور ہو جائیں گے، میرا سب کو سلام فرما دیجئے
گا، خاص کر مولوی سلامت اللہ صاحب، بھائی الطاف، احسان، خواجہ الیاس، قاضی وحید الدین، مجید الدین، صبغۃ اللہ
صاحب اور دیگر برادران کو، بہت خوش ہوں، اور خدا سے ہر وقت اسلام کیلئے گڑگڑا، گڑگڑا کے دعائیں مانگتا ہوں، مراد آباد

پھر چونکہ اب یہاں قیام ہوگیا ہے اس لئے بہت سے ... کاغذ غائب ... دوست ملنے رامپور سے آ گئے تھے ......

غائب

....

.... پتہ کے لئے، ہمارا نام اور لینڈس ڈاؤن کافی ہوگا، حضور کا تار شام ملا تھا، ناظر الدین حسن اور ممتاز میاں کو بھی سلام، غرض سب کو سلام۔

شوکت علی،

مفسدوں کی افترا پردازیاں

(۹)

لینڈس ڈاؤن ۸ ستمبر ۱۹۱۵ء،

قبلہ و کعبہ، السلام علیکم،

یہ خط فقط حضور کی مزاج پرسی کے لئے لکھتا ہوں، کیونکہ اخبارات سے معلوم ہوا کہ لکھنؤ پر اور مزید مصیبت آئی، جس سے لاکھوں مخلوق کا برا حال ہوا، خدا اپنا فضل کرے، اول بارش اور طوفان اور طغیانی، بعد کو زلزلہ اور بارش، یہ سب ہمارے اعمال کی سزا ہیں، ہم لوگ اسقدر خدا کو بھولے ہوئے ہیں، اور اُس کے صریح احکام کی نافرمانی کرتے ہیں، کہ وہ ہم کو جو سزا نہ دے تھوڑا ہے، کاش اب بھی غفلت کو دور کریں، اور صراط مستقیم اختیار کریں، ناظر الدین حسن کے خط سے معلوم ہوا تھا کہ سوائے حضور کے مکان میں فرنگی محل میں اور بہت سے مکانوں کو نقصان پہونچا، خدا کرے سب احباب اور اعزہ بخیریت ہوں، بفضلہ تعالی ہم اچھے ہیں، اور حضور کو اکثر یاد کرتے ہیں، اور یاد کر کے دل کو تقویت ہوتی ہے، خدا حضور جیسے مسلمان اور دنیا میں پیدا کرے تاکہ دین متین کی تقویت کا باعث ہوں، اور دنیا میں سے کفر کی ظلمات کی جگہ نور حق کی اشاعت ہو، محمد علی دست بستہ سلام عرض کرتے ہیں، کل مفصل خط خدام کعبہ کی نسبت مولانا صاحب کو بھیجوں گا، میں نے دفتر سے سب کاغذات منگا کر دیکھے جس سے صاف صاف معلوم ہوگیا کہ ہمارے برخواست شدہ حضرات سب سے زیادہ انجمن کو نقصان پہونچاتے ہیں، رسیدیں میرے پاس آگئیں، جس سے خط بھی پہچان لیا گیا، بالکل صاف ہے، ہمیشہ اخبار کو بھی میں سب حالات بھیجتا ہوں تاکہ وہ گمنام خطوط اور مفسدوں کی افترا پردازیوں پر توجہ نہ کریں، اور تعجب اور جہالت سے کام نہ کریں، ہمارے تبادلہ کی نسبت ابھی کوئی اطلاع نہیں ملی کہ کہاں جائیں گے، اور کب، ہم ذرہ پریشان نہیں ہیں، نہ ہم کو تنہائی محسوس ہوتی ہے، ہمارا اللہ ہمارے ساتھ ہے، اور وہ سب سے عمدہ محافظ ہے، حضور دعا فرماتے رہیں، کہ خدا ہم کو آخر وقت ایمان پر قائم رکھے، خدا کرے حضور اور تمام احباب بخیریت ہوں، خدا معلوم ان مصائب کا کب خاتمہ ہوگا، جب تک کہ ہم اپنے اعمال درست نہ کریں گے، اور خدا کے احکام کی پوری تعمیل نہ کریں گے، ہم اسی طرح مبتلائے آلام رہیں گے، خدا ہم کو توفیق دے میرے بھائی الطاف، احسان، عزیزی الیاس کو سلام، مولوی سلامت اللہ صاحب خدا کرے بخیریت ہوں، صدمہ دفتر پر حملے اگرچہ کم ہوگئے ہیں، مگر ان ۴ ماہ تک اور ان کی دل جمعی اور تقویت کی ضرورت ہے، اُس کے بعد انشاءاللہ

اطمینان سے عمدہ آدمی ڈھونڈیں گے اور کام کو گذشتہ کی طرح درست کریں گے اس وقت تو کسی نہ کسی طرح یہ کام برابر جاری رہے، بند نہ ہونے پائے دشمن اس کی فکر میں ہیں کہ کام کرنے والے خود گھبرا کر اور تنگ آکر کام چھوڑ دیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ

لینڈرن۔ ۱۱ اکتوبر ۱۵ء، (۱۰) ضروری

حضور والا، السلام علیکم،

ہم کو کل اطلاع ملی کہ ہم کو یونیورسٹی کے اجلاس میں شامل ہونے کی اجازت نہیں مل سکتی، اس لئے مجبوراً تحریری رائے بھیجدی ہے، جو امید ہے کہ جلسہ میں پڑھ کر سنائی جائے گی، کم از کم اس قدر تو ہم دور افتادوں پر رحم کیا جائیگا کہ اس کو سنانے کی اجازت جائے گی، حضور کی شرکت اس جلسہ میں ضروری ہے، نہایت ضروری ہے تاکہ یونیورسٹی اگر قبول کی جائے تو صرف اُنہیں شرائط پر جن کی وجہ سے ہمارے دین مقدس کی تعلیم صاف صاف دی جائے، اور کسی قسم کی غیر مسلمین کی مزاحمت نہ ہو، حضور سے ہماری دونوں کی التجا ہے کہ حضور ضرور جائیں،

حضور کا تابعدار شوکت علی،

(اسی خط کی پُشت پر)

مجھے تعجب تھا کہ آپ لوگوں نے شرکت مجلس کی اجازت کیوں لینا چاہی ہے، کیونکہ میں خیال کرتا تھا، کہ آپ کے اجازت مل جانے سے آپ کی نظربندی کی اہمیت کم ہو جاوے گی، مگر میرا گمان غلط نکلا اس واسطے کہ ابھی تک عمدہ انتظام اور مناسب طبع تحفظ کرنے کی قابلیت موجودہ حکام میں ثابت نہیں ہو سکی، اور آپ کو انہوں نے جانے نہ دیا، بہتر ہوا میں خود شرکت جلسہ علیگڑھ کا خیال بھی نہیں رکھتا تھا، مگر ڈاکٹر انصاری صاحب کا تار آیا، اور آپ کے خط سے جانے کی ضرورت معلوم ہوئی، مگر میں دیانت سے کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکتا ہوں، میری رائے یونیورسٹی کے بارہ میں ابتدا سے یہ ہے کہ اگر تعلیم محض حصول کمال کے واسطے مسلمان دلانا چاہتے ہیں تو چارٹر کی پرواہ نہ کریں، اپنا کام شروع کریں مگر ایسا ہونا ناممکن ہے، بلکہ مقصد تعلیم محض تجارتی اصول پر ہے، اور ملازمت یا حکومت سے وابستگی مطلوب ہے، جس کا بدون ملازم رکھنے والے یا عزت افزائی کرنے والے کی خوشی کے ناممکن ہے، پھر اجازت سے قطع نظر نہیں ہو سکتی ہے، اس میں کد سے کیا فائدہ ہے، میں نے شرکت کے وقت علماء کو مطلع کر دیا تھا کہ میں جانتا ہوں کہ اس یونیورسٹی کا مقصد کیا ہے، تکمیل غرض سید احمد خاں اور تائید مدرستہ العلوم علیگڑھ ہے مجھے شرکت سے فائدہ

صرف اس قدر ہے کہ آپ لوگوں کی مخالفت مثمر نہ ہو، ممکن ہے کہ میری موافقت فائدہ بخش ہو اور جو مشکلات مسلمان بچوں کو سرکاری یونیورسٹی میں پیش آتے ہیں، اُن کی تفصیل ہو جاتی ہے، اس واسطے کہ میں اس سے زیادہ ہمت . . . کاغذ غائب . . . یونیورسٹی قائم کرنے والوں میں نہیں پاتا تھا، اب بھی مخالفت بے سود معلوم ہوتی ہے، میں نے تار ڈاکٹر صاحب کو دیا ہے اور اس کی نقل مرسل ہے، فقط . . . . کاغذ غائب . . . . . .

(یہ تحریر مولانا کی معلوم ہوتی ہے) محمد علی

منافقین اسلام

(۱۱)

لینڈس ڈاون، ۱۷ اکتوبر ۱۹۱۵ء،

مخدومی و مکرمی جناب مولانا صاحب، السلام علیکم،

کئی دن سے ارادہ لکھنے کا کرتا تھا، مگر اس یونیورسٹی کے قضیہ کی وجہ سے علی گڑھ کو زیادہ لکھنا پڑا، اور کچھ تھوڑی سی سستی بھی تھی، اور معمولی خطوط کا تو اب دیا مگر چونکہ آپ کو ضروری امور پر لکھنا ہے، اس لئے اُس کو ملتوی کرتا رہا، بنگال کا خط بھیجتا ہوں، اُس کی ہدایت مطابق اُس کو لکھ کر روپیہ لکھنؤ کو منتقل کرا دیجئے گا اور بہتر ہے وہاں سے لیکر اپنے پاس احتیاط سے رکھوا دیجئے گا، یہ ضروری ہے، اس میں دیر نہ فرمایئے گا،

(۱) غالباً آپ نے وہ اشتہار دیکھا ہوگا جو منافقین نے دہلی سے نکالا تھا، دروغ گوئی کی حد ہوگئی ہے نہایت ضروری ہے کہ اس کا جواب دیا جائے، اور وہ ایک گشتی خط کی صورت میں ہو، اور زوردار ہو، جس میں منافقین اسلام کا سب حال کھول دیا جائے، حضور رسول اکرم صلعم کے زمانہ میں ان منافقین اور مفسدین کی کمی نہ تھی اب تو بدترین وقت ہے اور قریب قیامت، حضور صاف صاف الفاظ میں ایک مراسلہ کے ذریعہ سے جمعیت کے مقاصد کے علاوہ ان مفسدین کے حالات بھی کھول دیں، ہر شخص جو بددیانتی اور بد چلنی کی وجہ سے نکالا جائے، وہ قومی خیرخواہ بن کر آ کھڑا ہو اصل یہ ہے کہ یہ زمانہ ایسا ہے کہ مفسدوں کو موقع مل گیا ہے، کہ جس قدر فساد چاہیں کریں، جنگ کی وجہ سے ہم لوگ ملک کی دشواریوں میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے، اور کسی ناعاقبت اندیش حکام کی طرف سے اشارہ مل گیا ہوگا، یہ اُن کی بہت کمزوری ہے کہ اس قسم کے آلوں کو مذہبی اور کار خیر روکنے کے لئے استعمال کریں، ڈاکٹر ناظر الدین حسن کو اور اور قانون دان اصحاب کو بھی وہ اشتہار دکھا دیجئے گا، برادرم قدوائی کا خط دیکھا، خیر مقدمہ تو کیا، مگر خط ناظر الدین حسن بحیثیت قانون دان ضرور لکھیں اور ٹائمز سے جواب طلب کریں، کہ آیا اُس سے مقصد ہماری انجمن ہے یا کوئی اور، خط سخت ضرور ہونا چاہیئے، وہ اسلامک ریویو رسالہ بھیجتا ہوں جس میں قدوائی کا مضمون تھا، معاف فرمایئے گا کہ اول حسب وعدہ غلطی کی وجہ سے نہ بھیج سکا،

(۲) کریم بخش صاحب کے خطوط کی میری نظر میں زیادہ وقعت نہیں، اُس کی نسبت مفصل میں آپ کو لکھ چکا ہوں،

موجودہ کارکنوں میں میں امین صاحب اور اسد اللہ خاں کو ذاتی واقفیت اور تجربہ کی بنا پر انجمن کا سچا دوست، مستدین، اور پکا آدمی خیال کرتا ہوں، اس کی غلطی ضرور تھی، کہ اس نے دوسروں کو روپیہ قرض دیا،

(۳) ایوب احمد صاحب سے مجھ کو ہمیشہ سے محبت تھی اور اب تک باوجود تمام امور کے میں کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ نوعمر شخص بہت سے حوصلہ اور جوش لے کر نوکری چھوڑ کر انجمن میں آیا تھا، نہایت افسوس کے ساتھ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے دفتر کی آب و ہوا ایسے لوگوں کیلئے مضر تھی، جو کچھ رہا سہا جوش اور حوصلہ تھا اُس کو بھی ضائع کر دیا، اس میں سب سے زیادہ حصہ ظفر احسن کا تھا کہ بہتوں کے منہ کھلوا دیئے تھے، انشاء اللہ سب سے مقدم دفتر میں ایک ایسے عالم باعمل کا قیام ہوگا جو ہم سب کو روحانیت کا سبق دیں گے اور احکام الٰہی سے آگاہ کریں گے، ایوب احمد ہمارے ہاں کے کام کے نوجوان نہیں، مگر بلاشبہ انجمن کا وہ دوست ہے، اور دل میں اسلامی محبت کی چمک رکھتا ہے، سید تنظیم علی کو بھی میں قابل قدر جانتا ہوں، اگرچہ نوعمر ہیں اور گرد و نواح کا اثر اُن کے لئے زہر تھا، ہم لوگ اپنا چندہ کل بذریعہ تار بھیجیں گے، تاکہ لوین کو دفتر میں پہونچ جائے، وصولی چندہ کی طرف توجہ فرمایئے گا، گشتی خط مل گئے یہ جنگ تو جلد ختم ہونے والی نہیں، کیا اس کے لئے ہم تمام کاروبار بند کر دیں، خاص کر جب کہ ہماری وفاداری اور امن پسندی کی خاک بھی قدر نہ کی جائے اور ہمارے مقابلہ کے لئے ذلیل اور بدمعاش لوگ کھڑے کئے جائیں، ہم خدا کا شکر کرتے ہیں، کہ اُس نے ہمیں قوت ایمان دی ہے، اس لئے ہم کو کسی قسم کا خوف و خطر نہیں، مگر ہماری جماعت میں کچھ افراد ایسے بھی ہوں گے جن کا قلب کمزور ہوگا، اُن کے لئے ضرور ہم کو کچھ انتظام کرنا چاہیئے، تاکہ وہ ایسے لغو الزاموں سے پژمردہ اور خوف زدہ نہ ہوں، گشتی مراسلہ منافقین اسلام پر نہایت ضروری ہے، اور حضور قبلہ اُس کو نہایت خوبی سے لکھیں گے، کیونکہ تمام اسلامی روایات سامنے ہیں، اُس سے تمام مسلمانوں کے قلب میں طاقت آجائے گی، ضرور اس کی نسبت مجھے مطلع فرمایئے گا، محمد علی کی بھی یہی رائے ہے کل ایک بھائی نے ہم نام نے بیعت کی ہے ہمارے ذریعہ سے، وہ اپنا نام اور پتہ بھیجیں گے، مخلص اور نیک شخص ہیں، اور اچھے مسلمان ہیں، اُن کا نام فہرست میں داخل کر دیا جائے،

آپ کا ہر ماہ پر، دہلی جانا لازمی ہے، دفتر سے اطلاع ملی کہ آپ نے اُن کو ۲۵۰ روپیہ بھیج دیئے، نہایت مناسب کیا، کیونکہ ان کا مصارف سے تنگ ہونا اچھا نہ تھا، آپ کے خط کا انتظار رہے گا، دیکھیئے کیسی ہوا ہے شملہ کی کہ وہاں جاکر انسان مضمحل ہو جاتا ہے، کیا گھبراہٹ یونیورسٹی کی پڑی تھی کہ جیسے بٹلر صاحب دینا چاہیں وہ لے لیں، اور وہ دھمکیوں کے زور پر، کیا بٹلر صاحب اور موجودہ وائسرائے ہمارے نیکی اور فراخ حوصلگی کا ٹھیکہ لے لیا ہے، انشاء اللہ ان سے بعد از جنگ بہترین کام کرنے والے آئیں گے، جو ہماری زیادہ خاطر اور مدارات کریں گے اور ہماری ہی شرائط پر ہم کو یونیورسٹی دیں گے، آخر ہمارے امتحانوں اور مصائب کا بھی تو کچھ صلہ ملے گا، انشاء اللہ مالک حقیقی ہماری مدد کرے گا، اور روپیہ اور قوت اور سامان موجودہ زمانہ سے دگنا دے گا، میرا حضور کی خدمت میں دست بستہ سلام عرض کر دیجئے گا، تمام احباب کو سلام، بھائی الطاف نے اب تک مطلع نہیں کیا کہ گھڑی کی نسوائی کس قدر دی، اُن سے تقاضا کریں، خدا کرے آپ سب بخیریت ہوں، والد ماجد کی خدمت میں میرا سلام کہہ دیجئے، خدا آپ سب کو زندہ اور سلامت رکھے،

قوت اسلام ہے، اور ہم سب کو ثابت قدم رکھے اور توفیق دے کہ ہم کوئی نمایاں خدمت اسلام کریں،
آپ کا بھائی شوکت علی،

محمد علی سلام عرض کرتے ہیں، میرے دونوں چھوٹے بچے آگئے ہیں، اور محمد علی کی چھوٹی لڑکی بھی ہے، والدہ صاحبہ رامپور گئی ہیں، ان بچوں سے بڑی دل بستگی رہتی ہے، ہاں اکثر مار پیٹ کے مقدمات بھی ہو جاتے ہیں، جن کا تصفیہ اکثر اوقات راضی نامہ کے ذریعہ سے ہو جاتا ہے، یہ دونوں تصویریں عزیزی آلیاس کو دے دیجیئے گا حضور سے اطلاع نہ فرمایئے گا،

قیدی کا خط

(۱۲)

لینڈس ڈاون ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۵ء،

قبلہ وکعبہ، السلام علیکم،

حضور کا عرصہ سے کوئی حکم نامہ نہیں آیا جس سے صحت مزاج کی اطلاع ملتی، میں خود بھی اس عرصہ میں زیادہ خط وکتابت نہ کر سکا کیونکہ عید کے موقع پر چند اعزہ اور احباب آگئے تھے، اور رامپور سے میرے دو لڑکے بھی بھاگ آئے تھے، اُن کی وجہ سے قدرے عدیم الفرصتی بھی رہی تھی، علاوہ ازیں اس امر کا انتظار تھا کہ جلد اسباب وغیرہ باندھیئے کیونکہ یہاں خبر تھی کہ آخر ماہ تک ہمارا تبادلہ کسی اور مقام کو ہو جائے گا، اب تک تو کوئی اطلاع نہیں ملی ہے، کہ کب جائیں گے اور کہاں کو، خدا کرے دہلی کا قرب ہو تاکہ محمد علی صاحب کا بقیہ علاج بھی مکمل ہو جائے، بفضلہ تعالیٰ شکر تو آنا بند ہو گئی ہے درد اعضا میں ہوتا ہے مگر چونکہ بارش اب بند ہے، اس لئے اول کی سی تکلیف نہیں ہے، دہلی کے حالات حضور کو معلوم ہوتے رہتے ہونگے، وہاں دوسری مقامی جمعیت قائم ہوگئی ہے جو انشاء اللہ عمدہ کام کرے گی، میں اب فقط یہ چاہتا تھا کہ جو سامان اور دفتر ہمارا اُن منافقین اور مفسدین کے پاس ہی پاس ہے وہ ہم کو واپس مل جائے، میں ڈاکٹر انصاری صاحب کو اس بارہ میں لکھ رہا ہے اور اگر حضور بھی اس عرصہ میں دہلی جائیں، تو اس کی طرف توجہ فرمایئے گا،
نیا سال شروع ہے، ہم لوگوں نے تو اپنا چندہ ٹھیک یوم الحج کو بذریعہ تار کے بھیجدیا تھا، امید ہے کہ امسال پوری کوشش سے کام کیا جائے گا، یہ جنگ کولامتناہی معلوم ہوتی ہے، اس کی وجہ سے انسان کون کون سے ضروری امور بند کریگا، امید ہے کہ مولانا سلامت اللہ صاحب نے بھی کام شروع کر دیا ہوگا، اور وصولی کی طرف پوری توجہ کی ہوگی، حضور یہ میرا عریضہ اُن کو دکھا دیں، اضلاع کے پرجوش کام کرنے سے تاکید کی جائے، کہ وہ وصولی چندہ کی طرف متوجہ ہوں، انشاء اللہ ضرور کامیابی ہوگی، تاج محمد صاحب نے بمبئی میں امسال بڑی محنت سے کام کیا، مولوی غلام محمد صاحب شملوی کی شکایات آئی ہیں، اُن کی طرف ضرور توجہ کرنا ہے، اس قدر رنج ہوتا ہے کہ باوجود ہماری اس قدر خاطر اور

مدارات کے کارکن متدین اور خدا سے ڈرنے والے نہیں ملتے، مفصل حالات بعد کو حضور کو بھیجوں گا، اس عرصہ میں بلیہ انجمن کی نسبت غور کرتا رہا ہوں، اور انشاء اللہ اس جنگ کے مع الخیر ختم ہو جانے اُس کا مستقبل نہایت شاندار اور کامیاب ہوگا، صرف سوال کام کرنے والوں کا رہ جاتا ہے، اور اُن کی نگرانی کا، انشاء اللہ اس کی نسبت بھی مفید تجاویز گذشتہ تجربہ کی بنا پر کی جائیں گی، خدا کرے یہ عید مبارک تمام عالم اسلام کے لئے باعث خیر و برکت ہو اور مسلمان اس بڑی قربانی سے سبق حاصل کریں، اصل یہ ہے کہ اسلام کی خوبیاں اور برکتیں اب ہم پر ظاہر ہوتی جاتی ہیں، اس عید کو اور اس قربانی کو مسلمان عام طور سے مشکل سے سمجھے ہیں، خدا ہم سب کو توفیق دے کہ ہم بھی سنت ابراہیمی ادا کر سکیں میرا، بھائی الطاف الرحمٰن صاحب، احسان، الیاس، اور دیگر احباب کو سلام،

گھڑی کی مرمت کی اجرت کا ٹھیک حال باوجود تقاضوں کے نہیں معلوم ہوا، حضور بھائی الطاف سے دوبارہ تذکرہ فرما دیں، افسوس راجہ صاحب محمود آباد نے اس یونیورسٹی کے معاملہ میں بٹلر صاحب کا ساتھ دے کر اپنے کو بدنام اور گندہ کیا اور ناظر الدین حسن کو بھی لے ڈوبے اس معاملہ پر ایسے وقت میں بحث کرنا صرف چند افراد کا نظر بندی کی طرف کھینچتا تھا، اب جو نظر بند اور مقید ہوں گے ان کے ذمہ دار راجہ صاحب اور ان کے احباب ہوں گے،

محمد علی کا سلام دست بستہ،

حضور کا خادم شوکت علی معتمد خادم الخدام کعبہ

مسلمانوں کو کیسی یونیورسٹی چاہیئے؟

(۱۳)

لینسڈاون ۵ نومبر ۱۵ء،

حضور والا، السلام علیکم،

دو خط حضور کے پے در پے ملے تھے محمد علی نے مفصل جواب حضور کو دیا ہے، ملا ہوگا، یونیورسٹی کے مسئلہ میں میں اُن کا ہم خیال ہوں اور میرے نزدیک کوئی وجوہ ایسے ظاہر نہیں کئے گئے ہیں جن سے مسلمان اپنا خیال بدلیں، چند مفروضہ اور خیالی خطرات کا تذکرہ سُنا ہے، جن کی کوئی وقعت نہیں ہے، نہ نیک نیتی اور ہمدردی کا بٹلر صاحب اور لارڈ ہارڈنگ بہادر پر خاتمہ ہو گیا ہے، میرا گمان غالب ہے کہ نیا ممبر تعلیم بٹلر صاحب سے اگنا عمدہ اور ہمدرد آدمی ہے اور جو وائسرائے بھی آئے گا، وہ انشاء اللہ لارڈ ہارڈنگ صاحب بہادر سے اچھا ہوگا، علاوہ ازیں وہ اچھے ہوں یا بُرے، ہم کو انصافاً اپنی حالت کو دیکھنا ہے اور یہ کہ ہم جو طلب کرتے ہیں، وہ ہٹ دھرمی پر مبنی ہے یا اپنی ضروریات پر ہمارے مطالبات سب جائز ہیں اور وہ خود گورنمنٹ قبول کر چکی ہے، ہم کو یہ ترقی معکوس پسند نہیں ہے، آخر اس کی کوئی انتہا بھی ہے، حضور پر ہماری حالت روشن ہے، ہم کو تمام واقعات ہو چکنے کے بعد معلوم ہوئے، راجہ صاحب کو ہرگز زیبا نہ تھا کہ ذاتی مروت کی وجہ سے جو اُن کی بڑی خوبی ہے، وہ ایسی بات کھڑی کریں، جس کو وہ ضرور جانتے تھے،

مسلمان ہرگز پسند نہ کریں گے، محمد علی کو ناظر سے یہ شکایت تھی کہ اُن کو شملہ کے واقعات اور ضروریات سے بالکل بے خبر رکھا، وہ اس عرصہ میں برابر ہماری امداد کرتے رہے تھے، اور ہم اُن کے مشکور ہیں، اُن کی محمد سے خط و کتابت تھی مگر انہوں نے اصلی واقعات کا کچھ کبھی تذکرہ نہیں کیا، راجہ صاحب کو زیبا تھا کہ وہ اس مقابلہ میں اول ہر فریق سے مشورہ کر لیتے اور خاص کر اُس سے جو ہمیشہ اُن کا ہم خیال رہا تھا، ہم کو اپنی دینی عزت اور وقعت کے خیال سے کسی طرح ایسی کوئی کارروائی نہ کرنا چاہیئے تھی، جس سے ہمارے بھائیوں کے دل پژمردہ ہوں، اور مصائب کیا کم تھے کہ یہ نئی پریشانی کھڑی کر دی، اُس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ نئی پریشانی ہم لوگوں نے نہیں کھڑی کی تھی، ہم پر تو بلا ناگہانی کی طرح آن پڑی، ہم بے دست و پا تھے، محمد علی کا رجسٹری خط جو ۱۳ کو بھیجا تھا، جس میں مفصل رائے تھی، اُس کی رسید ۱۵ کو سوسن پہاڑ سے آئی، بجائے آنریری سکرٹری کے کسی انگریز کے دستخط تھے، ممکن ہے کہ کوئی اور مزید سنسر ہو گا، دفتر علی گڑھ میں ۲۲ اکتوبر کو بجائے ۱۴ اکتوبر کے پہونچی، ان صاحبوں کو ذرہ یہ تو خیال چاہیئے تھا کہ جب وقت ایسا ہو کہ معمولی اور نہایت قابل اور معتدل رائے تعلیمی معاملات پر دینا ناممکن ہو تو اُس میں ایسے ضروری مسئلہ چھیڑنا مناسب تھا یا غیر مناسب، راجہ صاحب نے صرف اپنے مخالفین اور دشمنان اسلام کا دل خوش ہوا، میں حضور کو یقین دلاتا ہوں کہ کسی شخص کو راجہ صاحب کو تکلیف دینا منظور نہیں ہے بلکہ سب کو صدمہ ہے، ایسی تحریک اگر آفتاب احمد یا محمد شفیع یا عبد اللہ کی طرف سے ہوتی تو کسی کو رنج نہ ہوتا، ناظر کو میں نے خط لکھا تھا، خدا معلوم اُنہوں نے حضور کو دکھایا یا نہیں، ہم کو اُن سے بہت محبت ہے، اور اُن کا خلوص قابل قدر ہے، میرے خیال میں عمر کے ساتھ اُن میں پختگی بھی آئے گی، سنی سنائی باتوں سے وہ بہت جلد متاثر ہو جاتے ہیں، اور خوفزدہ بھی ہو جاتے ہیں، اور دوسرے کو بھی خوفزدہ کر دیتے ہیں، میرا ذاتی تجربہ ہے مگر یہ فقط اُن کی نیک نیتی کی وجہ سے، مثلاً اگر مجھ سے ایک نہیں ۲۰ آدمی کہیں کہ مولوی سلامت اللہ صاحب سے کوئی ایسی حرکت سرزد ہوئی ہے جو اُن کی شان کے زیبا نہ تھی اور ناروا تھی، تو حضور میں تو اُس وقت تک یقین نہیں کروں گا، جب تک خود بعد دریافت مجھ کو یقین نہ ہو جائے، اور بہمہ وجوہ اس کا جواب خود مولانا صاحب سے نہ حاصل کر لوں، اُس وقت تک ہر جگہ اُس کی تردید کروں گا، اور ہرگز اُن کو قصوروار نہ ٹھہراؤں گا، یہی بات میرے نزدیک محمد علی میں بھی قابل اعتراض ہے طبیعت کے خلاف بات سُن کر فوراً بگڑ جانا، ہاں خوف کا پتہ نہیں ہے، ناظر نے ضرور غلطی کی اور اُن کے عزیز دوستوں کو اُن کی اول کی تقریر سے رنج نہیں ہوا جس قدر کہ اُن کی دوسری تقریر سے جو انہوں نے جلسہ سے اُٹھ آنے کے بعد کی تھی، یونیورسٹی کا کچھ نہیں بگڑا صرف اس کارروائی سے راجہ صاحب کی قدر سے بدنامی ہوئی، ہندو اپنی یونیورسٹی سے ذرہ خوش نہیں ہوئے، اور یہ ہمارے حکام کی بدقسمتی ہے کہ جو چیز دیتے ہیں، وہ اس قدر بدمزگی کے بعد کہ اس کے دینے کا سب نتیجہ بیکار ہوتا ہے، اگر اس جنگ کے دوران میں لارڈ ہارڈنگ کو کسی متنازع فیہ معاملہ کو چھیڑنا نہ تھا تو اس یونیورسٹی کے معاملہ کو جھگڑا سے علیحدہ کر دیتے اور ہم کو اور ہندوؤں کو اُن کی خواہش کے مطابق یونیورسٹی دے دیتے، تمام لوگ خوش اور مطمئن اور ملک بھر میں واہ واہ۔ نہیں۔ یہ اصول تو افسوس حکام وقت کو پسند نہیں، ملک کی خواہش جائز خواہش دبائی جائے، اور پھر بھی تمام ملک میں اُن کی ناموری ہو، حضور یہ سب ناموری

جھوٹی ہے، لارڈ کرزن جب ہندوستان میں تھے، بوجہ تمام میں واہ واہ تھی، میکڈانل تھے ان کی ان کے زمانہ میں تعریف تھی، ان کے جانے کے بعد ہر شخص ان کو گالیاں دیتا ہے: آج کل کا اصول حکومت مجبور کرتا ہے، مخلوق خدا "از راشحنہ مردک نام" بدکار آ... بو، جو لوگ اچھے اور نیک ہوتے ہیں ان کا ہمیشہ نام چلتا ہے، لارڈ ریپن کی آج تک تعریف، نوشیرواں کافر تھا، مگر مسلمان اور دیگر افراد اس کی عزت کرتے ہیں، مجھ کو امید ہے کہ یونیورسٹی کے قضیہ کو ملتوی کر دیا جائے اور اس لیگ کو زندہ کیا جائے جس کو مارنے کی کوشش کرائی جاتی ہے حضور، ہماری ناقص عقلیں اس تدبر کے سمجھنے سے قاصر ہیں لیگ زندہ رہے گی مگر کیسی بدمزگی ہوگی، آخر میں نتیجہ اس کا خود حکام کی بدنامی کا باعث ہوگا سب لوگ جانتے ہیں کہ کون پس پردہ ہے، ہم ملک اور امن کے دوست ہیں، اور ہم پر فرض ہے کہ صحیح حالات حکام کے گوش گذار کریں، چاہیں وہ ہم کو بجائے عزت دینے کے سزا دیں، مگر ہم انشاء اللہ اب سچ کہیں گے،

اس یونیورسٹی کے معاملہ میں حضور بے تعلق نہ رہیں، میں نے اپنے خط میں جو اجلاس یونیورسٹی میں پڑھا گیا تھا صاف صاف لکھ دیا تھا اور میں دعویٰ کرتا ہوں کہ مجھ سے زیادہ کسی کو اس کے اظہار کا حق حاصل نہ تھا، کیونکہ میں یونیورسٹی کی طرف سے پیغامبر بنا کر تمام ملک میں بھیجا گیا، کیا اور سینکڑوں تقریریں اس کی تائید میں کی تھیں، کہ یہ مسلم یونیورسٹی جرمنی کی طرح آلات حرب طیار کرنے اور سائنس کے تکمیل کی غرض سے نہیں قائم کی جاتی تھی، بلکہ "اشاعت دین حق" کے لئے۔ ہمارا منشا تھا کہ تم موجودہ نام نہاد مسلمان سچے مومن ہوں، اور ہمارے تعلیم یافتہ "نور اسلام" کی شمع سے تمام عالم کو منور کر دیں، کیا عمادہ نور ایمان ہوگا جس کو جب چاہیں مسٹر ٹول یا نول یا کول بجھا دیں، جہاں ایسے با اختیار اسلام کے بدنام کرنے والے ہوں جیسے ضیاء الدین، عبداللہ، آفتاب احمد، جو علماء دین کو خود مرکز تعلیم میں دین حق کی تعلیم اور قرآن پاک کی تلقین سے منع کر سکیں، مولوی سلیمان اشرف صاحب کی نظر بندی ہمارا معلوم ہے نہ بھی، ٹول نے تو کالج کے آنریری سکرٹری کو نینی تال سے اطلاع دی تھی کہ وہ نظر بند کر دیئے گئے، اور کوئی دوسرا شخص ان کی جگہ مقرر ہو، ہم ایسی ہی یونیورسٹی لیں گے، جس میں ہمارے علماء کرام تلقین دین بلا روک ٹوک کر سکیں، کیونکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ ہمارا دین "نقض امن" نہیں بلکہ "حفظ امن" کی اعلیٰ تعلیم دیتا ہے، انشاء اللہ یہ جنگ جلد ختم ہوگی اور اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا، اس وقت ہم کو ایسی یونیورسٹی حکومت ہند سے ملے گی، جیسی کہ ہم چاہتے ہیں، اور ہماری اس جنگ میں خدمات کا شکریہ کے ساتھ اعتراف کیا جائے گا، ایک لاکھ سالانہ نہیں انشاء اللہ ۲۰ لاکھ سالانہ ملے گا، میری اس تحریر کے بعد حضور کو یقین ہو گیا ہوگا کہ میں بذات خود تفریق کو کچھ اہمیت نہیں دیتا، مضیٰ ما مضیٰ۔ حمائد کو زیادہ صدمہ ہوا، کیونکہ اس کو راجہ صاحب اور ناظر دونوں سے بہت محبت تھی اور ہے، اور قدرتی طور سے اس کی ذرہ سی بھی چوٹ دل کو صدمہ دیتی ہے، تار حضور کو مل گیا ہوگا، جب مقام معلوم ہوگا حضور کو اطلاع دونگا، کل دوپہر ہم کو اطلاع ملی کہ ہم عنقریب کہیں بھیجے جائیں گے، اور ہم ۲ گھنٹہ قبل ہم کو مطلع کر دیا جائے گا، مقام نہ معلوم ہے، خدا معلوم ان مضحکہ انگیز رمزوں میں کیا بھید ہے، ہم کو جہاں حکم ملے گا ہنسی خوشی جائیں گے، اگر وہ جگہ اور زیادہ خراب ہوگی، تو قیود سخت ہوں گی، اور زیادہ خوشی ہوگی کیونکہ اس کا اجر ہم کو "احکم الحاکمین" کے یہاں سے بہترین ملے گا، دوست احباب عزیز نہ ہوں مگر ہمارا خدا ہمارے ساتھ اور احباب اور بزرگوں کی دعائیں، حضور دعا فرمائے جائیں، بفضلہ تعالیٰ دل اور ایمان اب تک خوب قوی ہیں تو بلغمی مزاج ابتدا

سے تھا، محمد کو بھی میری محبت نے خراب کر دیا ہے، بھائی الطاف کو سلام وپیار، میں نے اول سے ارادہ کر لیا تھا کہ صرف تقاضوں پر ہی اُن کو ۸ روپیہ بھیجتا اب تو انہوں نے خود مجھ کو رہائی دی، انشاءاللہ یا تو اُن کو جب مجھ کو وہ اپنے مطبخ سے عمدہ کیک بھیجیں گے جواہرات کے کھنڈوے عنایت کروں یا ایک نادہند مدت کی یاد چھوڑ جاؤں گا، عزیزی الیاس، قطب میاں احسان سب کو پیار والدہ صاحبہ سلام کہتی ہیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

اسٹیشن الہ آباد کا ایک واقعہ

(۱۶)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۶ر دسمبر ۱۵ء

قبلہ وکعبہ، السلام علیکم،

حضور کا تار پرسوں ملا تھا، اُسی دن کتابیں اسٹیشن سے منگالیں تھیں، ایک دو دن میں باقاعدہ درس شروع کیا جائے گا، خدا حضور کو جزائے خیر دے، کہ حضور ہمارے تزکیہ نفس کے لئے اس قدر تکالیف اور توجہ فرماتے ہیں، میں نے پرسوں بعد تلاوت قرآن پاک شجرہ کو شروع سے آخر تک پڑھا، اُس کے آخر میں جو چند الفاظ حضور کے دست مبارک کے لکھے ہوئے تھے جس میں ہمارے غائب ہونے کا تذکرہ تھا، اور یہ کہ حضور نے دعا دی تھی، کہ خدا ہم کو قوت دے کہ ہم فسق وفجور سے بچے رہیں، ان الفاظ کا میرے دل پر نہایت گہرا اثر پڑا اور قلب میں از سر نو نئی قوت پیدا ہوگئی، خدا ہم کو توفیق دے کہ ہم روز محشر شرمندہ نہ ہوں، اور اُس دن بجائے سیاہ رو ہونے کے سرخرو ہوں، اور راجہ خیبر پائیں، میرا خط مولانا سلامت اللہ صاحب کو مل گیا ہوگا اُس میں میں نے مفصل حالات سفر کے لکھے تھے، حضور نے ملاحظہ فرمالیا ہوگا، برادرم ناظر الدین حسن کو بھی محمد علی نے مفصل خط لکھا تھا، الہ آباد میں صرف بدمزگی کا اظہار ہوا اور وہ بھی تھوڑا ہم سے اور زیادہ تر اُن بزرگان سے جو ہم سے ملنے آئے تھے، افسوس ہمارے صوبہ کے حاکم ایسی غلطی کرتے ہیں، کہ ڈاکٹر ناظر الدین حسن، مسٹر وسیم، مسٹر ولایت علی، اور مسٹر ظہور احمد، سید ظہور احمد صاحب، وغیرہ جیسے معزز حضرات کے ساتھ اسٹیشن پر وہ برتاؤ کیا جو ان حضرات کی توہین نہیں تھی بلکہ خود گورنمنٹ پر ایک بدنما دھبہ تھا، جب ہماری شام کو وہاں کے کلکٹر مسٹر فری منٹل سے ملاقات ہوئی، جو میرے پرانے ملنے والے تھے، اور محمد سے بھی کلکتہ میں ملے تھے، تو ہم نے صاف صاف اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اُن سے کہہ دیا گیا کہ اس قسم کی، نازیبا حرکات کی وجہ سے گورنمنٹ کو اُس کے نالائق عہدہ دار بدنام کرتے ہیں اور مخلوق کے دلوں میں نفرت کے خیالات پیدا کرتے ہیں، ریل کے افسر کو اُن کی گستاخی اور بدتمیزی سے آگاہ کر دیا گیا تھا، جو پونے کے بڑے افسر وہاں موجود تھے، اُن کو خود اُس ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کی حرکت پر بہت غصہ آیا، بجائے بھیڑ کو کم کرنے کے تمام ریل کا اسٹیشن اُن پر ہنستا تھا، خدا معلوم ان لوگوں کی عقلیں کہاں گئی ہیں، اس زمانہ جنگ میں بجائے غیر معمولی سختی کرنے کے غیر معمولی خاطر و مدارات کرنا چاہیئے تھا، جبل پور میں سب نے ہماری بہت خاطر کی اور یہاں پر بھی سب شرافت سے پیش آتے ہیں، ڈپٹی کمشنر

صاحب جو ہمارے ہم ملک ہیں، نہایت قابل اور مدبر آدمی ہیں، اور ہماری بہت خاطر کرتے ہیں، اور لوگ بھی، حضور والا خدا کا عجب کرم اور حضور کی دعا کا طفیل ہے کہ ہمارے آنے سے قبل ہی مخلوق کو ہم سے محبت تھی، اور ہندو مسلمان یکساں جوق در جوق ملنے آتے ہیں، اور محبت کا اظہار کرتے ہیں، کسی چیز کی ضرورت ہو فوراً آجاتی ہے، اور ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ مَیں مہیا کروں کل بہت سے تعلیم یافتہ مرہٹہ وکلا ملنے آئے تھے، نہایت درجہ اخلاص سے ملے مسلمانوں کی حالت عجیب ہے، بفضلہ تعالیٰ ہر ایک دل میں اسلام کی محبت موجزن ہے، اور نماز کا عام طور پر شوق ہو چلا ہے قاضی عبدالکولی صاحب کی توجہ سے یہاں بہت پھیل گئی تھی، اُن کی روحانیت میں عجیب غریب اضافہ ہو گیا تھا، ہر ہندو مسلمان جو اُن سے ملتا تھا، اُن کا ہو جاتا تھا، خاص کر عوام ہندوؤں کو اُن سے بڑی عقیدت مندی تھی، اُن کو یہاں سے ہماری وجہ سے تبدیل کر دیا گیا، تبول کہ جو یہاں سے ۸۰ میل پر ہے، خدا کو اس میں بھی بہتری کرنا منظور تھی، والدہ صاحبہ حضور سلام کہتی ہیں، محمد علی کے گھر میں اور بچیاں اور زاہد دست بستہ آداب عرض کرتے ہیں، سامان کلکتہ اور بمبئی منگایا گیا ہے، مگر ابھی نہیں آیا ہے، کل یہاں چیف کمشنر صاحب آئیں گے، ایک پل کا افتتاح کریں گے، اور پارٹی ہے، ہم کو بھی دعوت آئی ہے، میر ابھائی الطاف، احسان، الیاس، قطب میاں صاحب، جناب مفتی صاحب کو سلام، مَیں بہت خوش ہوں، افسوس کوئی کہنے والا نہیں، کہ بغداد شریف ہمارے متبرک مقامات میں ہے، اور وہاں ایسے بزرگ زیر خاک دفن ہیں، جن کی وجہ سے بغداد شریف کی فتح نہایت دشوار ہوگی، اور سخت نقصان کا باعث، مناسب ہی تھا کہ اس خیال سے درگذر کی جاتی اور اور طرف توجہ کی جاتی، حضور غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ اس کے محافظ ہیں، جو حکم خدا سے وہاں دفن ہیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

میرا رجسٹری شدہ خط حضور کو لینڈس ڈاؤن سے ملا یا نہیں، شوکت،

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز

(۱۵)

چھنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۲ر دسمبر ۱۵ء،

قبلہ وکعبہ، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ آیا تھا، اس کو آنکھوں سے لگایا، حضور دعا فرمائیں کہ ہم کو روز محشر اور نیز دنیا میں شرمندہ ہونا نہ پڑے کیونکہ ذاتی کمزوریوں کا مجموعہ موجود ہے، اور صرف فضل ایزدی ہی اُن کو بچا سکتا ہے حضور کے خطوط سے دل کو از حد تقویت ہوتی ہے، اور اور قوت ارادہ میں مضبوطی پیدا ہو جاتی ہے، حکیم صاحب کا خیال بالکل صحیح ہے مجھ کو بمبئی کے حالات معلوم ہوئے ہیں، سید منظور علی ابھی نہیں جا سکے ہیں، حکیم صاحب کا مستقل قیام بمبئی میں نہایت مفید ہوگا، کیونکہ اُن کے اثر سے وہاں ہمارے کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، حضور کا تار نہایت عمدہ اور

موزوں تھا، اور مجھ کو امید ہے کہ ذمہ دار افسر اُس پر پوری توجہ فرمائیں گے، اور اس مہم سے دست بردار ہوں گے، کیونکہ ان مقدس مقامات میں جہاں ہر قطعہ زمین پر بزرگان دین دفن ہیں، اور جن کی وجہ سے وہ حصہ ملک متبرک ہوگیا ہے کبھی اس کی ذلت گوارہ نہ کریں گے اور نہ مسلمان اس جگہ کی جنگ سے خوش ہونگے، حضور نے مسلمانوں کی طرف سے فرض ادا کر دیا کہ اُن کے سچے جذبات کا اظہار کر دیا، میرے خیال میں ہر ملک کے اور سلطنت کے بھی خواہ کا یہی فرض ہے کہ سچے حالات کا اظہار کر دے اور گورنمنٹ تو حضور کی ضرور ممنون ہوگی، خدا کرے کہ جلد حضور سلطان المعظم خلیفۃ المسلمین خادم الحرمین شریفین اور ہماری سرکار میں عزت کے ساتھ صلح ہو جائے، تاکہ اسلامی ممالک میں امن ہو اور تمام مسلمانان عالم اطمینان سے اپنے دین مقدس کی خدمت کی طرف متوجہ ہو جائیں، مسئلہ حج ڈاکٹر ناظرالدین حسن مسلم لیگ میں پیش کریں گے، اور کانگریس میں بھی پیش ہوگا، سر فیروز شاہ مہتا نے وعدہ کیا تھا کہ کانگریس کا فرض تھا کہ وہ اس تمام ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے میں مسلمانوں کی مدد کرے، حضور کو تجویز کی نقل بھیجتا ہوں، یہ وہی ہے جو میں نے گورنر صاحب بمبئی سے بروقت ملاقات پیش کی تھی، اور جس کو انھوں نے پسند کیا تھا، یہ اس قدر معقول ہے کہ کسی کو اختلاف کی گنجائش باقی نہیں رہتی، گورنمنٹ خود تمام والیان ملک اور امرا اور عام مسلمانوں سے درخواست کرے کہ وہ خوش ہوگی، اگر مسلمان خود متفقہ کوشش سے ایک بڑی جہاز راں کمپنی قائم کرے جو حجاج کے آرام کے لئے تھوڑے منافع پر اس تجارت کو اصول تجارت کے مطابق کرے، مگر کار خیر کی حیثیت سے، دوسرے دلائل صرف سر برآوردہ اسلامی انجمنیں مقرر ہوں جو ہر طرح حجاج کی مدد کرے گی، اس طریقہ سے مسئلہ حج کا خاتمہ ہو جائے گا، اور تمام پریشانیاں اور بدگمانیاں رفع ہو جائیں گی، سالانہ رپورٹ ۱۳۳۲ھ میں صفحہ ۲ سے لے کر صفحہ ۴۲ تک میں نے مفصل طور پر تمام واقعات درج کئے ہیں حضور آج ہی ناظرالدین سے مل کر اُن کو ہدایت فرما دیں، اس مسئلہ پر تمام خیالات کے لوگ متفق ہونگے، محمد علی نے یہ تحریک باقاعدہ طور سے مسلم لیگ کے دفتر کو بمبئی بھیجدی ہے، اور یہ بھی کہ ڈاکٹر ناظرالدین حسن اس کو پیش کریں گے، مسٹر مظہرالحق صاحب اپنے ایڈریس میں بھی مسئلہ کا پورا ذکر کریں گے، میرا اسلام برادرم قطب میاں صاحب، بھائی الطاف، عزیزی احسان، اور ..... الیاس، صبغۃ اللہ کو فرما دیجئے گا، مولوی سلامت اللہ صاحب پر آج کل خاص کیفیت طاری ہے، اُن کی شاعری میری تقریر ہوگئی ہے، انسان آخر کب تک بک اٹھے :-

کیوں دل جلوں کے لب پہ ہمیشہ فغاں نہ ہو ⁂ ممکن نہیں کہ آگ لگے اور دھواں نہ ہو،

حضور اگر راجہ[1] صاحب سے ملیں تو ہمارا اسلام پہونچا دیں، ہم ان کے بہت ممنون ہیں، اور ان سے بہت محبت کرتے ہیں، یہ وقت خموشی کا نہیں ہے، بلکہ ہر مسلمان کی زبان پر (دل کے علاوہ) اللہ کا نام ہو، اقبال نے میرے ہی لئے لکھا تھا،

مژدہ اے پیمانہ بردار خمستان حجاز ⁂ بعد مدت کے تیرے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

نغمہ پیرا ہو کہ یہ ہنگام خاموشی نہیں ⁂ ہے سحر کا کارواں خورشید سے مینا بدوش،

آنکھ کو بیدار کر دے وعدہ دیدار سے ⁂ زندہ کر دے دل کو سوز جوہر گفتار سے،

حضور کا خادم شوکت علی،

[1] محمود آباد،

نماز میں کیا پڑھتے ہو؟ انگریز کا سوال!

چھنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۵؍فروری سنہ ۱۶ء، اللہ اکبر

قبلہ وکعبہ، السلام علیکم،

حضور کے دونوں خط بھائی کے نام آئے تھے، اُن سے خیریت مزاج والا کا حال معلوم ہوا تھا، اس عرصہ میں میں کاروباری خط وکتابت میں زیادہ مصروف رہا تھا، اس لئے بھائی کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ حضور کو تمام حالات سے مطلع کرتے، میرا خیال ہے کہ، چیف کمشنر صاحب ضرور اپنے ان احکامات کو جو انہوں نے غلط فہمی کی وجہ سے اور امورات مذہبی سے ناواقفیت کے سبب سے اجرا فرمائے تھے، واپس لے لیں گے، ۳ دن ہوئے کہ مجھ سے دریافت کیا گیا تھا کہ بجواب میری مفصل تحریر کے جس میں میں نے تمام حالات درج کر دیئے تھے، اور یہ بھی کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے کسی طرح ان کی پابندی کا وعدہ نہیں کر سکتا، بعض اوقات امامت احکام فرض ہو جاتی ہے، اگرچہ نہ تو مجھ کو امامت کا شوق ہے اور نہ میں اپنے آپ کو اس ممبر خانہ خدا میں چڑھنے کے قابل پاتا ہوں، جس پر ہمارے رسول مقبول صلعم اور صحابہ کرام اور دیگر بزرگان اسلام کھڑے ہو کر خطبہ پڑھتے تھے، اس گئے گزرے زمانہ میں بھی علماء کرام اور دیگر نایاب بزرگ اس پر چڑھنے کی مشکل سے ہمت کر سکتے تھے، نہ کہ میں جو ایک ناچیز جاہل اور گنہگار مسلمان ہوں، جو بمشکل نماز اور دیگر فرائض کی ادائیگی کی کوشش کرتا ہوں، مگر تاہم میرے اور میرے خدا کے معاملات میں تیسرے شخص کے احکام کی گنجائش نہیں ہے، اور میں مجبوراً ایسے احکامات کی جن کا تعلق مذہب سے ہو اور جو خلاف حکم شریعت ہوں تعمیل نہ کر سکوں گا، مجھ کو یقین کامل تھا کہ چیف کمشنر صاحب بہادر ہرگز دیدہ ودانستہ کسی کے مذہب میں دست اندازی کرنا پسند نہ فرمائیں گے، اب مجھ سے دوبارہ دریافت کیا گیا کہ میں نے نماز میں کیا پڑھا تھا سکے جواب میں میں نے پورا خطبہ بھیجدیا اور اس میں، اس حصہ کا ترجمہ بھی بھیجدیا جس کا تعلق حضور سلطان المعظم خلیفۃ الرسول خادم الحرمین الشریفین سے تھا، تاکہ اُن کو معلوم ہو جائے کہ مسلمان کس طرح سے اپنے خلیفہ کیلئے دعا مانگنے کے عادی ہیں، یہ کتاب خطبوں کی میری ملکیت نہ تھی بلکہ ملکیت مسجد تھی، اور تقریباً ۳۰ برس ہوئے کہ طبع ہوئی تھی، میں نے جو نماز میں قرآن پاک تلاوت کیا تھا، وہ بھی مع ترجمہ کے لکھ دیا، اول رکعت میں سورہ بقر میں سے یاایھا الذین امنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ اور دوسری میں "لا یستوی اصحاب الجنۃ واصحاب النار" دعا میں نے وہ پڑھی جو ہر روز پڑھتا ہوں، اسلام کی ترقی، اُس کے دشمنوں کی تباہی، کفر کا دنیا سے غائب ہونا، مسلمانوں کو قوت ایمان کا نصیب ہونا، دین کی راہ میں ہر ایک کو توفیق ہونا کہ وہ جان، مال، وقت، قابلیت سب کچھ خوشی سے صرف کرے، حضور سلطان المعظم خلیفۃ الرسول کے لئے دعا کہ خدا اُن کی مدد فرمائے، اور ان کے مرتبہ میں ترقی کرے، عساکر مسلمین کے لئے دعا، وہ دعا جو ہمیشہ مانگتا رہا ہوں، خطبہ کی دوسری کتاب بھی تھی جس میں سے یہاں اکثر خطبہ مع اردو ترجمہ کے پڑھا جاتا تھا، اس میں نو ۷، ۲ صفحہ سلطان المعظم اور خلیفۃ الاسلام کی تعریف میں، اور کفار کی مذمت میں تھے، مجھ کو وہ کتاب نہیں ملی تھی ورنہ اس

کو پڑھتا یہ دین کے معاملات اور ہم مسلمان مجبور رہیں، مجھ کو یقین ہے کہ میری تحریر کا بہت عمدہ اثر سب پر پڑے گا میں نے دونوں خطبہ کی کتابیں، اور تمام عبارت، یہاں کے ڈپٹی کمشنر مسٹر چیٹلویس صاحب کو سنائیں، اُن پر بہت اثر پڑا، واقعات ایسے ہیں کہ جو کلام الٰہی کو پڑھے گا، متاثر ہوگا حضور والا مجھ کو ان معاملات کی ذرا بھی پرواہ نہیں ہے، فکر ہے تو اپنی.. کمزوریوں اور اپنے اعمال کی، حضور دعا خیر فرماتے رہیں، خدا کی امداد غیبی کا پورا یقین ہے، بفضلہ تعالیٰ دل میں پوری قوت ہے، بلکہ اور اضافہ ہوگیا ہے،

دعا کا طالب حضور کا خادم شوکت علی،

محمد علی کی علالت

چھنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۷ / مارچ ۱۶ء (۱۷) اللہ اکبر

قبلہ و کعبہ / السلام علیکم،

پرسوں حضور کو بڑا خط لکھ چکا ہوں، آج صرف اس وجہ سے لکھتا ہوں، کہ حضور کو مطلع کردوں کہ محمد علی کا قارورہ کل سول سرجن نے دیکھا تھا، اور اس کا امتحان کیا، شکر زیادہ آتی ہے، اور تقریباً ۲ فی صدی ہے جو بہت زیادہ ہے اس عرصہ میں پرہیز برابر جاری ہے، اور دوا بھی حکیم اجمل خاں صاحب کی پیتے ہیں، اس زیادتی پر تعجب ہے، ازقد خربوزہ یہی ایک معمولی چیز تھی، جو کھاتے تھے مجھ کو خیال تھا کہ اُس کی اجازت تھی اس لئے دیا جاتا تھا، اب اُس کو بھی بند کر دیا اگرچہ ٹھیک معلوم نہیں کہ وہ بھی منع ہے یا نہیں، انشاء اللہ ۴ دن میں پیشاب دوبارہ امتحان ہوگا، تو بہتر نتیجے کا اظہار ہوگا، میں حضور مطلع کردوں گا، جنگاسوں میں داد ہوگئے ہیں، جو سخت تکلیف دہ ہے، اور وہ دو دن سے پلنگ پر ہی رہتے ہیں، اُٹھنے بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے، حضور کو سلام عرض کرتے ہیں اور دعا کے طالب ہیں، اس عرصہ میں پریشان بھی رہتے تھے، اور میموریل وائسرائے بہادر کو بھی طیار کرتے تھے، خدا اپنا فضل کرے اور مزید حالات بعد کو لکھوں گا،

حضور کا خادم شوکت علی،

حکومت کی طرف سے مزید پابندیاں

چھنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۳۰ مارچ / ۱ اپریل ۱۶ء، (۱۸) اللہ اکبر

حضور والا / السلام علیکم،

میں خود کئی دن سے خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا، مگر اطمینان قلب نہیں ملا تھا، کہ بڑا سا خط لکھتا اور معمولی خط لکھنے کو دل نہیں چاہتا خاص کر حضور کو۔ خدا کا شکر ہے کہ محمد علی کی ذیابیطس میں اول کی نسبت کمی ہے اشکر ۵ فی صدی آتی

سے مجھ کو تعجب ہوا تھا، کیونکہ گذشتہ دو ماہ سے سخت پرہیز کیا گیا تھا، صرف ایک اجنبی پھل تھا جس کی نسبت ہم کو پورا یقین نہ تھا کہ اُس کی اجازت تھی، ارنڈ خربوزہ" جو یہاں کثرت سے ہوتا ہے، خیال تھا کہ وہ مفید ہوگا، اُس کو بھی فوراً بند کر دیا گیا اول ہفتہ میں شکر ۶½ فی صدی آگئی، اور کل کے امتحان میں ۵ فی صدی، خدا سے امید ہے کہ کچھ عرصہ میں وہ بالکل جاتی رہے گی، اُس غریب کے پرہیز کو دیکھ کر رنج ہوتا ہے، مگر کھانے پینے کی چیزوں کی تو ہم احتیاط کر سکتے ہیں، بیرونی پریشانیوں کا دفعیہ مشکل تھا، ایک تو ویسے ہی قلب مسلم کے لئے آج کل ایک لمحہ آرام کا نہیں ہے، اُس پر اور اضافہ ہو جانا تکلیف کا باعث ہوتا ہے، بعض اوقات تو ایسی غلطی کی جاتی ہے کہ خاموشی سے خود ایمان میں فرق آتا ہے، ویسے خدا کا شکر ہے کہ اب زیادہ خط و کتابت کرنا نہ پڑے گی، نئے ڈپٹی کمشنر اب ہم سے واقف ہوگئے ہیں، اور یہ بھی کہ ہم قانون کے پابند ہیں، مگر اس کے ساتھ تمام قانونی چارہ سازیوں کو کام میں لائیں گے، اور خلاف قانون احکام پر متوجہ نہ ہوں گے، بفضلہ تعالیٰ قوت ایمان اب تک تو کمی نہیں ہے، آئندہ کے واسطے حضور دعا فرماتے رہیں، خدا ہم سے کوئی کام خلاف نہ کرائے، جس سے ہمارے دین کی کمزوری ہو، حضور سے دعا کا طالب ہوں کہ ذاتی کمزوریاں خدائے برتر دور کرے، ہم لوگ انشاء اللہ العزیز کوشش کریں گے کہ صبر و تحمل کے ساتھ زندگی بسر کریں، خط و کتابت کے بارے میں یہ فیصلہ قطعی نہیں ہوا کہ کوئی خط و کتابت خانگی تھی، علی گڑھ وغیرہ کے معاملات پر اجازت ہے، مگر مسلم یونیورسٹی کی نسبت نہیں، "خدام کعبہ" پر خط و کتابت میں نہیں کر سکتا کیونکہ اُس کو یہ حضرات پولٹکل کہتے ہیں، میں نے بھی عرض کر دیا کہ نفس "خدمت کعبہ" سے تو میں کسی وقت بے تعلق نہیں ہو سکتا، رہا انتظامی امور میں مشورہ دینا تو اُس میں اپنے دوری کی وجہ سے ویسے بھی مجبور تھا، اور بفضلہ تعالیٰ اُس کے خواہاں بہت موجود ہیں، ہم نے خود ہی تا اختتام جنگ اپنے کاروبار کو کم کر دیا ہے، مگر اس مقدس اور قابل قدر کام کو پولٹیکل ٹھہرانا ایک نہایت تعجب انگیز امر تھا کل کو نادان لوگ فقط غیر واقفیت کی بنا پر قرآن پاک کو پولیٹکل کہہ دیں گے، مذہبی امور کی ہم کو پوری آزادی ہے، اور اُس پر ہر طرح کی خط و کتابت کر سکتے ہیں، جس مسئلہ میں انتشار قلب ہوگا حضور کی طرف رجوع کروں گا، کچھ دنوں سے مجھ کو اس کی بڑی خواہش ہوگئی ہے کہ خدا ایسا سامان کر دے کہ چند دنوں کے لئے حضور کی خدمت میں رہتا مگر صرف تزکیہ نفس کی طرف متوجہ ہوتا تاکہ اُس کے بعد دنیاوی معاملات کو پورے انہماک کے ساتھ کرتا، مگر اصلی غایت اور غرض اعلائے کلمۃ الحق ہوتی، انشاء اللہ جلد وہ وقت آئیگا، ہم لوگوں نے درخواست دی ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے جلسہ میں شرکت کی اجازت دی جائے، جواب تقریباً تو معلوم ہے، مگر زیر قانون ایک دفعہ ہے جس کا ہم نفع اُٹھانا چاہتے ہیں، آج برادرم مسٹر سجاد حیدر آئے اور اُن سے مل کر طبیعت بہت خوش ہوئی، محمد علی اور وہ ہم درجہ تھے اور بہت عزیز دوست، کل معاملات پر بہت دلچسپ گفتگوئیں ہوئیں، ہم کو بڑا اندیشہ افتراق کا ہے، یہ وقت ہم سب میں محبت اور میل کا تھا تاکہ سب مل کر دین مقدس کی خدمت کر سکتے، اور کچھ مدد نہیں کر سکتے تھے، بوجہ مجبوریوں اور غیر استطاعت کے تو کم از کم اپنے گھروں، مسجدوں، خانقاہوں میں بڑے عجز و انکسار کے ساتھ باری تعالیٰ کی بارگاہ میں دعائیں مانگتے کہ وہ ہم مسلمانوں کو مع الخیر و ایمان اس زمانہ ابتلاء سے نکالتا، ان موجودہ آفتوں میں اضافہ کرنا گناہ عظیم ہے خدا ہم کو توفیق دے کہ ہم خدمت دین کر سکیں، حضور کو علم ہے کہ ہم کو راجہ صاحب سے کس قدر محبت ہے، اور علی الخصوص

محمد علی کو جس بات کا اُس کو صدمہ ہے وہ یہ ہے کہ عزیز دوستوں میں ایک تفرقہ کھڑا کیا جاتا ہے جس سے دونوں کا نقصان ہے، اور ہمارے دشمن فائدہ اُٹھائیں گے، اس وقت مذاق اڑاتے ہیں، اور یہ شعر پڑھا جاتا ہے :-

ہر چہ دانا کند کند نا داں ✿ لیک بعد از خرابی بسیار

خدا دانا اور بینا ہے، کہ ہم سب مسلمانوں کی فلاح اس وقت اور ہمیشہ محبت اور اتفاق میں ہے، مگر اُس کے آثار نظر نہیں آتے، کیونکہ جس سے محبت اور مدد کی امید تھی، وہی سب سے زیادہ معترض ہے، حضور اس بلا کو قوم اور مسلمانوں کے سر سے ٹالیں، میں جانتا ہوں کہ حضور کی مدد مانگی جائے گی، اور بغیر حضور کی مدد کے کامیابی ناممکن ہے۔ اور خدا سے یہ بھی امید ہے کہ وہ مدد انشاء اللہ نہیں ملے گی، کیونکہ اس وقت کوئی ایسا کام جس کا یقینی نتیجہ توہین اسلام ہو یا مسلمانوں کے ایمان کو کمزور کرنے والا ہو اُس میں حضور کی شرکت ناممکن ہے، کم از کم اس معاملہ میں خدا کا شکر ہے کہ ہم پر کوئی الزام نہیں آسکتا، خدا ہم سب پر اپنا فضل کرے، محمد علی کے بچے اور گھر میں علیل ہیں، بخار اور جاڑہ اور زکام ہے، تو کبھی سب بیمار پڑے ہیں، حضور دعا فرمائیں، والدہ صاحبہ کے چوٹ زیادہ آئی تھی، اب تک اشاروں سے نماز ادا کرتی ہیں، مگر خدا نے بڑا فضل کیا، غالباً ۶ یا ۷ اپریل تک رامپور سے روانہ ہوں گی، ہم تو ہر وقت دست بدعا ہیں کہ خدا اسلام کی برتری کرے، برادرم الطاف پر خدا رحم فرمائے، اُن کو آج خط لکھتا ہوں،

حضور کا خادم شوکت علی،

محمد علی کا ذکر

چھنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۵/اپریل ۱۶ء، (۱۹) اللہ اکبر

قبلہ وکعبہ، السلام علیکم،

ہم تو خدا سے چاہتے تھے کہ بھائی احسان یا کوئی اور دوست حضور کا یہاں ملے تو اُس سے دل کھول کر باتیں کریں اس لئے احسان بھائی سے مل کر دل از حد خوش ہوا، اور یہ وقت نہایت پر لطف گفتگو میں صرف ہوا، اُن سے حضور کو تمام حالات کی اطلاع ملے گی، یہاں کے آنے کی نسبت سب کو طرح طرح کی غلط فہمیاں ہیں، جو احباب آنا چاہیں ہم کو ایک ہفتہ قبل اطلاع دیدیں ہم ڈپٹی کمشنر صاحب کو مطلع کرکے اُن کی اجازت لے لیں گے، اور احباب کو خبر کر دیں گے کسی قسم کی دقت اور دشواری نہ ہوگی، جہاں تک ہم کو علم ہے، گورنمنٹ کا منشا نہیں ہے کہ ہمارے پاس اعزہ اور احباب کے آنے کو روکیں،

اس یونیورسٹی کے بارے میں حضور کو ہماری رائے کا علم ہے، محمد علی ضدی آدمی ہرگز نہیں ہے، مگر دل کا کمزور بھی نہیں ہے، کہ خواہ مخواہ فرضی یا اصلی خوف کے قصوں اور فسانوں سے متاثر ہو کر راہ حق چھوڑ دے، اس نے اپنی سچی رائے تحریر کر دی ہے، اور برادرم احسان اُس کا ترجمہ حضور کو سنا دیں گے، میری ذاتی رائے کا حضور کو علم ہے کہ

میں اس وقت اس مسئلہ کا چھیڑنا اسلام کی تضحیک خیال کرتا ہوں کیونکہ یہ وقت جنگ کا ہے صاف صاف گفتگو کرنے کے مانع ہیں ہم کو اس وقت تمام کام چھوڑ کر اپنے ایمان کی درستی اور قائم رہنے کی فکر چاہیئے، ان قصوں کا ایسے بے وقت چھیڑنا غریب مسلمانوں کے زخمی دلوں پر نمک پاشی ہوگی، اور وہ ضرور برہم ہوں گے، اور چھیڑنے والوں کی طرف سے بدظن، یہ تحریری رائے ہے مگر اگر خدانخواستہ کسی وجہ سے حضور اس معاملہ میں .... کا ناجائز ......

اسلامی نقصان گوارہ کریں اور افتراق دور کرنے کے لئے سر کٹوانے میں بیا کریں، تو ہم حضور کو تنہا آر انڈسل میں نہ جانے جانے دیں گے، بلکہ دیدہ دانستہ حضور کے ہمراہ جائیں گے، اور اپنا فخر سمجھیں گے کہ حضور کے ہمراہ تھے، اس لئے جس وقت حکم ملے گا، تو فوراً بذریعہ تار مطلع کریں گے، کہ علیحدہ یونیورسٹی سے ہم کیسے فیوز ہو گئے، بلکہ خود پہ خط بذر اس کا آخری حصہ کافی ہوگا، حکم کی تابعداری سے انشاءاللہ کسی وقت دریغ نہ کریں گے، مگر عرض حال کر دیں گے، اگر اجازت ہوگی حضور کو ہر وقت اختیار ہے کہ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، حضور بغیر اطلاع کے میری طرف سے جو وعدے چاہیں دیدیں، اور مجھ کو اس حکم کی اطلاع دیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

سنسری زیادتیاں

(۲۰)

چھپنا نہ دارہ (صوبہ متوسط) ۲۳ اپریل ۱۹۱۵ء،

قبلہ وکعبہ، السلام علیکم

پرسوں حضور کو خط لکھا تھا، مگر خدا معلوم کسی وجہ سے ہمارے اردو کے سنسر نے اُس کو پاس کرنے سے انکار کر دیا، فضول خط وکتابت کرنا ہیں نے بیکار سمجھا، اس لئے اُس کے بجائے آج دوسرا لکھتا ہوں، معظم علی صاحب بانکی پور سے آئے ہوئے ہیں، کل دن بھر اُن سے لطف صحبت رہا اس لئے نہ لکھ سکا، معافی کا خواستگار ہوں، مولانا سلامت اللہ صاحب کے خطوں سے مسلم یونیورسٹی کے جلسہ کے حالات معلوم ہوئے، اُن کی شوخ تحریر سے میرا دل ہمیشہ خوش ہوجاتا ہے، خدا اُن کی زندہ دلی کو قائم رکھے، بلکہ اُس میں اور اضافہ ہو، حضور کو معلوم ہے کہ میں ان معاملات کو ضروری تصور کرتا ہوں مگر یہ وقت ہم پر سخت ہے اور صرف بارگاہ الٰہی میں دعا اور عجز وانکسار کا ہے، تاکہ وہ ہماری مدد کرے، اور اسلام کی بہتری اور برتری ہو، برادرم حسرت موہانی کے حالات سے دل کو صدمہ ہوا، وہ ہمارے عزیز ہیں، اور ہم پر اُن کی مدد فرض ہے خاص کر اُن کی بیگم صاحبہ کی جو ہماری بہن اور عزیز ہیں، چونکہ مسلمان ہیں اور اُن کا اسلام مضبوط ہے اس لئے اُن کا دلیر ہونا لازمی تھا، وہ تمام مصائب کو صبر وشکر کے ساتھ برداشت کریں گے، مگر ہم سب پر اُن کی مالی اور ہر طرح کی امداد فرض ہے، محمد علی نے تو کل اُن کو خط لکھ دیا، بجواب بیگم حسرت صاحبہ کے خط کے، مجھ سے ہمیشہ سے اُن کی خط وکتابت تھی، والدہ صاحبہ غالباً کل رات کو یہاں آئیں گی، انشاءاللہ حضور سے ملنے کو لکھنؤ اُتریں گی اگرچہ بچے وغیرہ بڑے

بھاری کارواں ہوں گے، مجھ کو از حد خوشی ہوگی اگر وہ حضور کی قدم بوسی کا موقع پا سکیں گے، اس مسئلہ یونیورسٹی میں حضور نے راجہ صاحب کو بچایا، اُمید ہے کہ وہ آئندہ مشکلات میں بغیر سوچے سمجھے نہ کود پڑیں گے، مولوی عطا محمدؐ صاحب کا خط بھیجتا ہوں، وہ قابل امداد ہیں، بڑے نیک آدمی ہیں، حضور اُن کو بلوالیں تو بہتر تھا، حضور کو اختیار ہے، میرا برادرم الطاف، احسان، عزیزی الیاس، قطب میاں صاحب اور تمام احباب اور اعزہ کو سلام اور پیار، محمدؐ اور معظم سلام عرض کرتے ہیں، محمدؐ علی کو ہم سب نے خراب کر دیا ہے، اس کی خاطر داریاں کر کر کے، حضور بھی اس کی بہت خاطر کرتے ہیں، جس کی وجہ سے وہ گستاخ ہو گیا ہے، گو حضور کا سچا خادم ہے،

حضور کا تابعدار شوکت علی،

"جان و مال حاضر ہیں"

(۲۱)

چھنداڑواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۸ / اپریل ۱۶ء، اللہ اکبر

اُنہیں ہے عقل جو محتاج غیر ہے ہر دم ؛ مجھے ہے عشق کہ جو خود ہے مدعا میرا
غرور اُنہیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبر ؛ سوا خدا کے سب اُن کا اور خدا میرا

حضور والا، السلام علیکم،

والدہ صاحبہ مع پورے کارواں کے پرسوں شب کو یہاں پہونچیں، وہ کمزور ہیں، مگر اُن کی ہمت دیکھ کر ہم کو شرم آتی ہے، میرا کل دن بھر باوجود روزے کے بچوں کے ساتھ کھیلنے اور اُن کے مقدمات کے تصفیہ میں گذرا، حضور کی خیریت مزاج دریافت فرما کر دل کو خوشی ہوئی، میں اور میرے تمام حضور پر قربان ہوں، خدا حضور کو زندہ اور سلامت رکھے، حضور سے ہماری تقویت ہے اور اسلام کا مرتبہ اس خراب زمانہ میں قائم ہے، خدا کی قدرت اب نظر آتی ہے، باری تعالیٰ کس کس طریقہ سے ہم لوگوں کو متوجہ کرتا ہے، اور بیدار، ان آلام اور مصائب کی وجہ سے دل میں اس قدر قوت آتی جاتی ہے کہ دل خوش رہتا ہے، جو اس کی مرضی ہوگی وہی ہوگا، مگر انشاء اللہ تمام امور دین کی بہتری کے لئے ہوں گے، عجب تماشا دنیا میں نظر آتا ہے، بس اب تو یہی دعا ہے کہ خدا ہمارے ایمانوں میں تقویت دے اور ہم کو توفیق دے کہ ہم خدمت دین کر سکیں، تبلیغ اسلام کا کام انشاء اللہ بعد از جنگ نہایت اطمینان اور طاقت سے کریں گے، اور تمام دنیا کو نور اسلام سے روشن کر دیں گے، حضور مجھ کو جلد جلد خط لکھتے رہیں، والدہ صاحبہ اب آگئی ہیں، انشاء اللہ نمازیں اور زیادتی اور آسانی ہوگی، کیونکہ تہجد کو اُن کی غیر حاضری میں کوئی جگانے والا نہ تھا، وہ اور سب حضور کو دست بستہ سلام عرض کرتے ہیں، محمدؐ علی بھی خط لکھتا ہے مگر چونکہ اُس کا خط تو ایک دفتر ہوتا ہے اس لئے کل کی ڈاک سے پڑے گا، میں آج کل بہت خوش ہوں، اور جب حضور کا خط آجاتا ہے تو دل کو اور تسکین ہوتی ہے، اجمیر شریف تو غالباً حضور ضرور جائیں گے، کاش کہ میں بھی اس گروہ کے ہمراہ ہوتا، انشاء اللہ حجاز کو ساتھ جانے والوں میں ہونگا، میری چچی صاحبہ جو عربی نژاد ہیں ابھی حجاز سے ۴ برس کے بعد واپس

آئی ہیں، اُن سے وہاں کے قحط کا حال معلوم ہوا مگر وہ لوگ بڑے بہادر اور ہمت والے ہیں، عورتوں کا صبر وشکر اور مضبوطی دیکھ کر ہم شرماتے ہیں،
حضور کا خادم شوکت علی،

ہم لوگ کس قابل ہیں، مگر جان و مال حاضر ہیں، جس وقت درکار ہو، خدا حضور کو زندہ اور سلامت رکھے، (شوکت)

سر مسٹن گورنر یوپی

چھنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۳ مئی ۱۹۱۶ء، (۲۲) اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

خیریت مزاج کا تار پڑھ کر طبیعت کو اطمینان اگرچہ فکر اور پریشانی ہم کو ذرہ نہ تھی، کیونکہ خدا ہر وقت نگہبان اور محافظ ہے اور اس کے ہوتے ہوئے خواہ مخواہ فکر کرنا سراسر ناشکری تھی، اس لئے میں تو جہاں تک ممکن ہوتا ہے، دل کو بات نہیں لگاتا ہوں، اور جو کام میرے ضمیر کے نزدیک اچھا ہوتا ہے، اس میں کوشاں ہوتا ہوں، کامیابی اور غیر کامیابی خدائے برتر کے ہاتھ میں ہے، مگر اتنا ضرور کہونگا کہ حضور کے مرتبہ کے بزرگوں کی نسبت اس طرح کی لغو اور بیہودہ افواہوں کا اُڑانا نہایت نقصان پہونچانے والا تھا، اور مشتہر کرنے والا مستحق سزا تھا، لاکھوں نفوس کے دلوں اور مذہبی جذبات کو صدمہ پہونچا، دشواریوں کا پیدا کرنا تھا، محمد علی کی طبیعت اس ہفتہ اچھی ہی شکر میں کمی ہو کر ۲ فی صدی رہ گئی، اور آئندہ امید ہے کہ بالکل جاتی رہے گی، اس عرصہ میں میں خطوط بالکل نہ لکھ سکا، اول تو بچے یہاں تھے، اُن کے مقدمات سے فرصت نہ تھی، دوسرے خلیق الزمان صاحب اور علی گڑھ سے مسٹر شعیب قریشی اور مسٹر عبد الرحمٰن آ گئے، ان سے تمام دنیا کی باتیں ہوتی تھیں، خلیق صاحب تو غالباً اس عرصہ میں اپنے وطن میں ہیں گے، اور حضور سے ملے ہوں، مخدومی ومکرمی جناب مولانا سلامت اللہ صاحب کو بھی خط نہ لکھ سکا، انشاء اللہ کل لکھوں گا، اُن کا آخری پوسٹ کارڈ ہمارے سنسر صاحب نے ہم کو اطلاع دی کہ گورنمنٹ متوسط نے سر جیمس مسٹن کو بھیجدیا، یہ نہایت اچھا اور مناسب ہوا تاکہ صوبہ کے بڑے افسر کو مسلمانوں کے اصلی اور سچے جذبات کا علم ہو جائے جو ان کے اپنے مذہبی پیشواؤں کے ساتھ ہیں، مجھ کو یقین کامل ہے کہ وہ اگر تدبر سے کام لیں گے تو ایسے مفسدوں کو جو جھوٹی خبریں اُڑا کر ملک میں بدامنی اور بے چینی پیدا کرنا چاہتے ہیں، سخت سزا دیں گے، والدہ صاحبہ حضور کو اور تمام گھر کو سلام اور دعا کہتی ہیں، میرا سلام مولانا سلامت اللہ صاحب، برادرم احسان، الطاف، الیاس، اور مولوی عنایت اللہ صاحب سے فرما دیجئے گا، قطب میاں صاحب کو سلام مسنون ہم لوگ خوب تندرست ہیں، گرمی ۲ دن سے بہت تھی، جو یہاں کیلئے غیر معمولی تھی، رات کچھ آندھی آئی تھی اور کچھ بوندا باندی بھی جس سے ٹھنڈ بھی ہو گئی، ہم لوگ ہر وقت درست بار ہا ہیں، محمد علی بہت سست ہو گئے ہیں، کل حضور کو ضرور خط لکھیں گے، جب دل چاہتا ہے تو کچھ شاعری کر لیتے ہیں، نواب مصطفےٰ خاں شیفتہ کا ایک شعر اخبار میں دیکھ کر بہت بیتاب ہو گئے اور اس پر غزل لکھی، جو حضور مولانا سلامت اللہ صاحب کو سنا دیجئے گا، عجیب طبیعت پائی ہے،

حضور کا خادم شوکت علی،

محمد علی کا ایک خط

چھنڈواڑہ ۳۰ رمئی ۱۹۱۶ء، (۲۳)

حضور اقدس، السلام علیکم،

عرصہ سے حضور کی خدمت میں کوئی عریضہ نہ لکھ سکا کچھ تو علالت کچھ کاہلی اس کا باعث ہوئیں، شکر کا عجب حال ہے، میں نے حکیم اجمل خاں صاحب کی دوا ترک کر کے یہاں کے سول سرجن صاحب کا علاج شروع کر دیا تھا، اس سے اسقدر فائدہ ہوا کہ شکر ۵ ½ سے ۲ ½ فی صدی تین سے چار ہی روز میں رہ گئی، مگر دوا نہ رہی، دہلی سے تار دے کر منگائی اس عرصہ میں پھر شکر ۶ فی صدی ہوگئی، اب دوا آگئی ہے، سول سرجن صاحب ہی کا علاج ہے، پیشاب کی مقدار کم ہو گئی ہے، جو مرض کی کمی کی نشانی ہے، آئندہ جمعہ کو قارورہ پھر بھیجوں گا، تاکہ شکر کی مقدار معلوم ہو جائے، یہاں امسال گرمی سخت پڑی جس سے مرض بڑھ گیا اور دو بار حرارت بھی ہوگئی، اس خوف سے کہ مبادا انتقال قیام اس کوروہ سے بھی بدتر جگہ کو نہ کر دیا جائے، (جیسا کہ اب تک تجربہ ہوا ہے) میں نے یہیں گرمیاں گذارنا مناسب سمجھا، "از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است"، کیا عجب ہے کہ اس صبر کے باعث میرے دوزخ میں سے چند انگارے کم کر دیئے جائیں، گو اُس پاک پروردگار سے جو گناہوں کا بخشنے والا ہے امید ہے کہ بطفیل رسول اکرم دوزخ کی آنچ کو ہم پر حرام فرما دیگا،

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جو افواہیں حضور اقدس کے متعلق دشمنوں نے اُڑائیں تھیں، اُن کا نتیجہ سوائے اُن کے خذلان کے کچھ نہ نکلا، یہ وہ ہوائی غبارے ہیں، جو ہوا کا رُخ اور اُس کی تیزی رفتار جانچنے کے لئے کبھی کبھی چھوڑے جاتے ہیں، اُن کا جواب وہی استقامت ہے، جو ہر مسلمان کا شیوہ ہونا چاہیئے، کاش ہم بھی حضور کی سی استقامت حاصل کر سکیں، ہمارے نبی صلعم اُن کے اصحاب پاک اور اہل بیت نے ہمارے لئے اپنے نقش چھوڑے تھے، مگر امتداد زمانہ کے باعث اور زائد تر اپنی کم ہمتی سے ہم نے وہ نقوش اپنے دلوں سے محو کر دیئے تھے،

(یہ خط مولانا محمد علی صاحب کا لکھا ہوا ہے، صرف ایک ورق ہے، باقی حصہ غائب ہے)

کچھ ذاتی مسائل

چھندواڑہ ۳ رجون ۱۹۱۶ء، (۲۴) اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ ملا تھا، اس عرصہ میں حضور کو یہاں کے سب حالات معلوم ہو گئے ہوں گے، محمد علی کا خط بھی پہونچا ہوگا نئی دوا سے اُن کو فائدہ محسوس ہوتا ہے، کل کو قارورہ کا پھر امتحان ہوگا اور خدا سے امید ہے کہ نتیجہ مفید ہوگا، پارسل مل گئے تھے، آم تو عمدہ آئے، مگر خربوزے خراب ہو گئے تھے، راستہ میں ۲ سیر خرپزا بھی لئے گئے، آم بہت مزے دار تھے،

اور محمدؐ علی نے بھی کھالئے، خدا کے فضل سے کوئی برائی ظہور پذیر نہ ہوئی، اس طرح کی خبروں سے سوائے انتشار اور بدمزگی کے کچھ پیدا نہیں ہوتا ہے، اور ملک میں بدامنی بھی ہوتی ہے، آخر مخلوق اپنے ننگ و ناموس کو بھی دیکھتی ہے، اور ناموس کا جب معاملہ آجاتا ہے تو انسان سربکف ہو کر سب کچھ کر گزرتا ہے، مولوی عطا محمدؐ صاحب ہر طرح قابل امداد ہیں، اور چونکہ حالات خراب ہیں نوکری اور جگہ ملنا دشوار ہے، سید فیض الحسن حسرت اپنے خیالات میں پختہ آدمی ہیں، . . . کاغذ غائب . . . جو وہ کرنا چاہتا تھا، محمدؐ نے بھی سمجھایا تھا، مگر وہ رائے قائم کر چکا تھا، رہی امداد تو وہ ناامید نہ ہوگا، کیونکہ اُس کا عمل نیازؔ کے مشہور شعر پر تھا:۔

طمع فاتحہ از خلق نداریم نیازؔ ۞ عشق من در پس من فاتحہ خوانم باقیست

اور میرے ناچیز خیال میں ہر کام کرنے والے کا خدا پر ہی بھروسہ چاہیئے، اب میں برابر خطوط لکھتا رہونگا، مولانا سلامت اللہ صاحب کو کئی دن ارادہ خط لکھنے کا کرتا ہوں، مگر طبیعت لکھنے پر مائل نہیں ہوتی، اور میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ قرض اُتارنے والا خط اُن کو لکھنا بیکار ہے، برادرم الطاف کی بیماری کی وجہ سے پریشانی تھی، خدا اُن کو صحت دے، اُن کا منصوری پتہ حضور تحریر فرمادیں تاکہ میں خیریت پاسکوں، معظم غالباً مجبوری کی وجہ سے اجمیر شریف نہ لے جاسکے ہوں گے، کام از سرِ نو شروع کیا ہے، اس لئے بانکی پور سے غیر حاضری دشوار ہوگی، افسوس کہ علی امام مظہر الحق صاحب کے خلاف نواب سرفراز حسین خاں کے لئے کوشش کرتے ہیں، ان کا حال بھی معلوم ہوگیا، مگر کس قدر تجربوں کے بعد، والدہ صاحبہ نے نشاط بیگم صاحبہ کو علی گڑھ خط لکھا ہے، اور اُن کی تشفی و تسلی کی ہے، اُن کی امداد ہم سب پر فرض ہے، اور ہم سے جو کچھ ہوسکے گا باقاعدہ ماہ بماہ اُن کے مصارف کیلئے بھیجے جائیں گے، قلب آج کل مضطرب رہتا ہے، مگر سوائے صبر و شکر کے کیا چارہ ہے، حضور دعا فرمائیں کہ یہ دن جلد گزر جائیں، اور وہ وقت جلد آئے کہ ہم سب اطمینان سے خدمت دینی کو کاغذ غائب . . . قوت اور شوق سے متوجہ ہوں، ہم سب بخیریت ہیں، یہاں موسم اچھا ہے، رات کو سردی ہوتی ہے، برآمدہ میں سوتے ہیں، تھوڑی بارش ہوگئی ہے گرمی صرف ۷ یا ۸ دن سخت پڑی ورنہ موسم قابل برداشت تھا، محمدؐ علی کا دست بستہ سلام، والدہ صاحبہ حضور کو اور تمام اہل خاندان کو دعا دیتی ہیں، محمدؐ علی کی شکر کل کے امتحان میں صرف ۱/۲ فی صدی تھی، انشاء اللہ اگلے ہفتہ میں غائب ہو جائے گی،

حضور کا خادم شوکت علی،

؎۵ راجہ غلام حسین مرحوم کی اہلیہ،

بزرگانِ دین کی عقیدت

(۲۵)

چھندواڑہ ۱۲؍جون ۱۶ء،

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا دوسرا خط ملا۔ اس سے رنج ہوا، افسوس کہ ذمہ داران اس متبرک زمینؑ کی پوری قدر نہیں کرتے جس پر برسوں سے کتب الٰہی کا درس ہوتا رہا ہے اور سینکڑوں بزرگانِ دین کے قدم اس پر سے گزرے ہیں، وہاں کی چپہ چپہ

علہ مکتوب الیہ رح کی محل سرا کے مغربی حصہ پر لکھنؤ امپرومنٹ نے زبردستی قبضہ کر لیا تھا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حکومت سے اس کا مالی معاوضہ لینا پسند نہ کیا اور فرمایا کہ میں اس کے بدلے میں لارڈ کچنر کی جان چاہتا ہوں، اتفاق دیکھئے کہ اس واقعہ کے چند دن بعد لارڈ کچنر غرق ہو گئے اور مولانا شوکت علی نے جس خطرہ کا اشارہ اس مکتوب میں کیا تھا، بھی پیش آگیا۔

زمین کا تقدس تھا اس کی بے حرمتی کرنا ضرور ہمارے اعتقادات کی رو سے خرابی کا باعث ہوگا، یہی اسی وجہ سے بغداد شریف کے قریب کی لڑائی سے پریشان تھا اور ہندوستان میں اپنے سب ملنے والے انگریز دوستوں کی توجہ مبذول کی تھی کہ یہ متبرک جگہیں جن کا دین سے تعلق ہے اور ان کی حرمت فرض تھی، متعدد ایسے واقعات رامپور اور اور جگہ دیکھے گئے کہ علم ہو جانے پر بے حرمتی کی گئی ہے ان جگہوں کی جو کسی بزرگ کے نام سے وابستہ تھیں اور کسی نہ کسی طرح اس گھر کے تمام رہنے والوں پر مصیبت ناگہانی آئی، حال کا واقعہ نواب بشیر الدین احمد خاں صاحب کے بھائی کا حیدرآباد میں جس کا حضور کو بھی علم ہوگا کیونکہ ان کا انتقال غالباً لکھنؤ ہی میں ہوا تھا کہ باوجود منع کرنے کے زعم حکومت میں لوگوں کا کہنا نہ مانا اور ایک مخصوص جگہ اجلاس کرنے کا چبوترہ بنایا۔ نواب صاحب مجھ سے بیان کرتے تھے کہ اول دن کے اجلاس کے بعد وہ یکایک اس نئے مہلک مرض میں مبتلا ہوئے جس سے باوجود علاج کے وہ جان بر نہ ہو سکے، اور فرنگی محل تو سیکڑوں برس سے بزرگوں کا مخزن رہا ہے باوجود آج کل کی تعلیم کے ہمارا بحیثیت مسلمان پختہ اعتقاد ہے کہ اس قسم کی دینی بے عزتی ہمیشہ زوال اور ذلت کا باعث ہوتا ہے۔ بزرگان دین کے حضرت نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ اور کسی بادشاہ دہلی کا (غالباً کوئی تعلق تھا) واقعہ مشہور تھا کہ وہ حضور کی تباہی کا سامان کر رہا تھا اور نہایت درجہ گستاخ تھا کہ آپ کو غصہ آگیا اور جس دن وہ کاٹھ کا نیا دروازہ جس کو اس نے بڑے شوق سے تیار کرایا تھا اول مرتبہ مکمل ہوا دیکھنے گیا تو وہ یکایک گر گیا اور اس کے نیچے وہ مر گیا اس وقت بہت لوگوں نے حضور کو دیکھا کہ غصہ میں ٹہل رہے تھے اور زبان پر یہ شعر تھا۔

اے روبہک چرا نہ نشستی بجائے خویش :: با شیر پنجہ کردی و دیدی سزائے خویش

خدا کے نیک بندوں سے گستاخی کرنا اور ان کی دل آزاری ہمیشہ نقصان کا باعث ہوتی ہے، خدا حضور کو زندہ و سلامت ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ دعا میں حضور ہم کو ضرور یاد فرمالیا کریں، انگوٹھے کے درد سے فکر ہو گئی ہے خدا کرے معمولی اور عارضی ہو، مولانا مولوی سلامت اللہ صاحب کو کل خط لکھ چکا ہوں، میری اور ان کی خط و کتابت کا معاملہ دوسرا ہے جب دل چاہتا ہے لکھتا ہوں واقعی خفگی جائز تھی مگر میں معذور تھا یہاں موسم نہایت ..... وجہ ہے رمضان قریب ہے ورنہ حضور کو تکلیف دیتے مگر ایک بار کے دیدار میں سیری نہیں ہوتی، انشاء اللہ جلد خدا ملائے گا۔

حضور کا خادم شوکت علی،

چھندواڑہ ۲۱ جون سنہ ۱۶ء،

حضور والا، السلام علیکم،

میرا پہلا خط پہونچا ہوگا، پرسوں آم مع الخیر پہونچ گئے۔ اگرچہ ریل کا گارڈ ان میں ضرور شریک ہو گیا تھا، لکھنؤ

میں ٹوکریاں مضبوط زیادہ نہیں ملتیں اس سال خدا نے ایسی عمدہ گھڑی سے آموں کی فصل شروع کی تھی کہ اول دن سے جبکہ حضور کے مرسلہ آم و خربوزہ آئے تھے آج تک برابر سلسلہ قائم ہے اور اس قدر آم کھانے کو ملے کہ معمولی سالوں میں نہیں ملتے تھے۔ تمام احباب و اعزہ بھیج رہے ہیں تقریباً چار پانچ پارسلیں ہر ہفتہ آجاتی ہیں۔ کل ولایت علی کے آم آئے نہایت عمدہ تھے اس سے ایک دن مولانا ابو الکلام صاحب نے لکھنؤ سے بھجوائے تھے، بانکی پور، غازی پور، رام پور، غرضیکہ ہر جگہ سے آم آرہے ہیں اور اب تو انشاء اللہ تعالیٰ اور اضافہ ہوگا۔ خدا اپنے غریب بندوں کی ہر طرح پرورش کرتا ہے، بارش یہاں تقریباً ۲۰ دن سے یکساں ہورہی ہے، اب تو فصل کو نقصان کا اندیشہ ہے، شب کے روزے رکھے تھے بالکل معلوم نہیں ہوئے دہلی سے خبر آئی ہے کہ وہاں سخت گرمی پڑ رہی ہے، ہمارے لکھنؤ میں امن ہے، محمد علی دست بستہ سلام کہتے ہیں، اُن کی طبیعت اب اچھی ہے، ہمارا منشاء یہ تھا کہ ان کو بھی آم کھانے کو مل جائیں، مگر میں بڑی محنت کرتا ہوں اور نہایت مشکل سے دو یا تین آم دیتا ہوں، مگر وہ حضرت ایک دو اور چُرا لیتے ہیں پرہیز اب کی انہوں نے بہت سخت کیا، آج کل آموں کے پارسلوں سے بہت دلچسپی ہے ان کو اسٹیشن سے منگواتے ہیں اپنے ہاتھ سے کھولتے ہیں، بندش پر اور ٹوکروں اور ریل کے گارڈوں جیسے دشوار مضمون پر اعلیٰ لیکچر دینے کی قابلیت پیدا کرلی ہے آموں کے پال کا خاص انتظام ہے، مجھ کو اندیشہ ہے کہ اس معاملہ میں ان کی دلچسپی خالی از علت نہیں ہے، حضور دعا فرمائیں کہ خدا ایمان میں تقویت دے اور ہم کو توفیق دے کہ ہم خدمت دین سے کسی حال میں منہ نہ موڑیں خدا دین و دنیا کی رسوائی سے بچائے اور روز حشر ہم کو شرمندہ نہ کرے،

خورشید نے دوسرا مکان کرایہ پر لے لیا ہے، کیونکہ غالباً کچھ خاندان کی مستورات بھی آجائیں، رشید میاں جو میرے ماموں زاد بھائی ہیں اُن کی اکلوتی لڑکی جو مشکل سے ۲۰ برس کی ہوگی دق میں مبتلا ہے خدا اپنا رحم کرے خدا کا شکر ہے کہ عزیزی التفات کی صحت اب اچھی ہے، خورشید کو خدا صحت دے ان کی بیماری سے مجھ کو از حد پریشانی ہے، کیونکہ کارخانہ کا کام سب وہ کرتے ہیں، میں کوشش کروں گا کہ اس عرصہ کیلئے ہماری نظر بندی رام پور رہ جائے، فصل کی نسبت رام پور سے ملازم عمدہ چیزیں دیتے ہیں بارش موقع سے ہوتی ہے اس لئے کاٹن مل کی نسبت اول نہایت امید دلانے والی خبریں ملی ہیں، حضور نقصانات کی وجہ سے پریشانی ہے، ایک دو سال اچھے ہو جائیں تو سب کسر نکل جائے گی،

(شوکت علی)

خدا کا قانون: قرآن

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۶ / جولائی ۱۶ء، (۲۶) اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

ہمارے خطوط نہ آنے سے حضور پریشان نہ ہوں، انشاء اللہ جلد حضور کو تین چار اکٹھے چیف سکرٹری گورنمنٹ

کے دفتر سے ملیں گے، حضور کا خط بھی وہاں سے واپسی پر ملے گا، ڈپٹی کمشنر آج کل یہاں نہیں ہے، ناگپور رخصت پر
گئے ہیں، اگر وہ ہوتے تو غالباً خطوط مل گئے ہوتے۔ ہم بفضلہ تعالیٰ بالکل تندرست ہیں، محمد علی کو شکر آنا بند ہے، خدا نے
بڑا فضل کیا، والدہ صاحبہ اور تمام بچے اچھے ہیں، اور حضور کو سلام عرض کرتے ہیں، اور دعا کے ملتجی ہیں، نماز تہجد کے بعد
میں حضور کو اپنا خادمانہ سلام پہونچا دیتا ہوں، حضور کو مل جاتا ہوگا۔ جو تعلقات اب ان کے بڑے فضل سے قائم ہو
گئے ہیں وہ انشاء اللہ مٹنے والے نہیں ہیں، ملاقات بند کر دی جائے یا خطوط بھی بند، حضور کا فیض محبت دل سے
کبھی زائل نہیں ہوسکتا ہاں اپنی کمزوریوں سے ضرور قلب کو تکلیف پہونچتی ہے، اور ان کی صفائی کے لئے حضور کی دعا
اور توجہ کے ہمیشہ طالب رہتے ہیں، میں نے اور محمد نے صاف صاف سرکار والا تبار کو لکھ دیا ہے کہ ہم ہر حکم کو جس کا
دنیاوی معاملات سے تعلق ہوگا چاہے وہ کتنے سخت ہوں مانیں گے مگر معاملات دینی میں ہم کو مجبوراً انکار کرنا ہوگا۔
اس کے لئے خدا کا بھیجا ہوا قانون "قرآن مجید" موجود تھا، اور اس کی نسبت کوئی رائے یا مشورہ کسی شخص کا سوائے
ہمارے علمائے کرام اور مشائخ عظام کے قابل پذیرائی نہ ہوگا ہم کسی طرح بے دین اور مرتد ہونا نہیں چاہتے، سوائے
اس وجہ سے کہ ہم کمزور اور ناتواں تھے، ہمارا خدا زبردست اور طاقت والا تھا۔ مجھ کو یقین کامل ہے کہ ہم کو بالکل آزادی
رہے گی کہ ہم اپنے روحانی اور مذہبی معاملات میں بلا روک ٹوک کسی پولیٹیکل جماعت کے حضور کی طرف رجوع کر
سکیں گے، دین کے مقابلہ میں ہم کو جان و مال پیارا نہ تھا، اور اب تو مزہ آ رہا ہے۔ انشاء اللہ خدمت دین کا سوال
اب آئندہ پس پشت نہ ڈالا جائیگا، تمام مالی آمدنی [illegible] جو ہم نے چھوڑ دیا، سب دین کے واسطے پہونچ گئے،
دو روپے کوئی [illegible] اور پھر بھی نتیجہ یہ نکلا، خدا ہمارے گناہ معاف کرے، اور آئندہ ہم کو ان سے
محفوظ رکھے، [illegible] اعزہ [illegible] معلوم ہو [illegible] ہو رہی ہے، مگر وہ لوگ مسلمان ہیں اور صبر و شکر
سے تمام مصائب کا مقابلہ کر رہے ہیں ہمارے [illegible] سے بڑھ کر ریاست میں کوئی قابل
اور متدین شخص نہ تھا، ان پر بھی مقدمات طیار کئے جا رہے ہیں، گواہوں پر زور دیا جاتا ہے، ان کو ۲۰ دن سے جیل خانہ
میں مقید رکھا گیا ہے، مگر وہ سچ پر قائم ہیں، اور کہتے ہیں کہ ہم سے کیا آج تک کسی نے [illegible] انہوں نے رشوت تو کیا نذرانہ تک
یا شکرانہ تک نہیں قبول کی ہے، ۲۰ ہزار سے اپنے محکمہ کی آمدنی دو لاکھ سالانہ کر دی، خدا مالک ہے، ہماری درخواست
کا کوئی بھی جواب نہیں ملا ہے، حضور دعا فرمائیں، انشاء اللہ اس سال کا ان میں ضرور بڑا نفع ہوگا، اور تمام سالوں کی کسر
نکل جائے گی، مولانا سلامت اللہ صاحب کو بہت بہت سلام، میاں الطاف، قطب میاں صاحب، الیاس اور
تمام اعزہ کو سلام،

حضور کا خادم شوکت علی،

ہم ان آزمائشوں میں پورے اُتریں گے

اللہ اکبر

(۲۷)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۲ جولائی ۱۶ء،

قبلہ و کعبہ، السلام علیکم،

حضور کا خط مورخہ ۱۹ جولائی آج صبح ملا، اس کو پڑھ کر قلب میں قوت آئی حضور کا فرمانا درست ہے، اب تعلقات دلی بفضلہ تعالیٰ اس درجہ کو پہونچ گئے ہیں، کہ خطوں کی ضرورت نہیں ہے، اگر ہمارے ہاتھ قلم کر دیئے جائیں، اور زبان کاٹ دی جائے، تب بھی دل سے رشتہ محبت اور راز و نیاز قائم رہے گا، مجھ کو ذرہ فکر نہیں ہوتی جب کہ حضور کے خطوط چیف کمشنر صاحب کو بھیجے جاتے ہیں، یا ہمارے خطوط، بہت عمدہ بات ہے کہ کلمۃ الحق اُن کے کانوں تک بھی خدا اس ذریعہ سے پہونچا دیتا ہے، میں تو حضور سے بعد نماز تہجد عرض کرتا ہوں جو کچھ کہنا ہوتا ہے، حضور دعائیں ہر وقت یاد فرماتے رہیں، حضور اطمینان رکھیں کہ جب سے اُس قادر مطلق کی محبت دل میں پیدا ہو گئی ہے، اور اس کا ہی خوف ہے تو تمام دنیا اور اُس کے انعامات اور سزائیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں، انشاء اللہ اب ہم کو دین کے راستہ میں مسلمان مضبوط پائیں گے، تمام مصالح دینوی کا نتیجہ بجز بدگمانی اور بے اعتباری کے کچھ نہ ملا، تمام اور آزادیاں سلب تھیں، مذہب کی بڑ بھی کھود کھلی کرنا منظور ہے، تو انشاء اللہ اُس کی جڑ مضبوط ہوگی، ہمارے خطوط نہ لکھنے سے حضور متفکر نہ ہوا کریں، اگرچہ انشاء اللہ میں برابر لکھتا ہوں گا، رامپور کارخانہ روئی کے کام کے زمانہ میں جانے کی درخواست منظور نہ ہو سکی کل جواب ملا، اس میں بھی خدا کی کوئی بہتری ہوگی، کیونکہ وہاں پر ہمارے خاندان پر سخت بے جا عتاب ہو رہا ہے، ایک عزیز کو برطرف ہی نہیں کیا گیا، بلکہ دس ہزار روپیہ جرمانہ بھی کیا گیا، باوجودیکہ کوئی جرم نہ تھا، مقدمہ نہ ہونے کی کوشش کی گئی مگر کچھ واقعہ ہو تو مقدمہ بنے، دوسرے عزیز جو نہایت قابل عہدہ دار تھے، اُن کو بھی معطل کر دیا گیا ہے، اور قلعہ میں رکھ لیا گیا ہے، بڑے بھائی مسٹر ذوالفقار علی صاحب جن کو سال بسال زبردستی ترقی دے دے کر گورنمنٹ سے مانگا تھا اور جنہوں نے ۱۰ برس میں اپنے محکمہ کی آمدنی تقریباً ۳ گنا کر دی، اُن پر بھی مقدمہ تیار کیا جاتا ہے، اور کمیشن تحقیقات مقرر ہوا ہے، گواہ رشوت ستانی سے انکار کرتے ہی نہیں ہیں بلکہ تمام شہر گواہ موجود ہے مگر گواہوں کو جیل میں رکھا جاتا ہے، غرضیکہ طرح طرح کی زیادتیاں یکایک شروع کی گئی ہیں، ... دسمبر ہی میں اُن کی خدمات خاص طور پر تعریف لکھ کر حاصل دوبارہ کی گئی تھیں، اب یہ حال ہے، ہم ان آزمائشوں میں انشاء اللہ پورے اُتریں گے، حضور دعا فرمائیں، یہ زمانہ نہایت پر لطف ہے اور غالباً خدا کو ہماری بہتری اور پاکیزگی انہیں مصائب کے ذریعہ سے منظور ہے، والدہ صاحبہ کا سلام حضور کو گھر سب کو، میرا اور محمد کا سلام اور پیار سب کو، خاص کر مولانا سلامت اللہ صاحب، بھائی الطاف، احسان، قطب میاں اور الیاس کو،

حضور کا خادم شوکت علی،

ہمیں صرف خدا کی رضا جوئی درکار ہے

(۲۸)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۲ اگست ۱۶ء

اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ آیا تھا، محمد علی کے نام، اس کو میں نے بھی کئی بار پڑھا، اور دل پر گہرا اثر ہوا اور اپنی بدکاری اور بداعمالیوں سے شرم آئی، دنیا میں لوگ ہم کو نہایت اچھا اور نیک کہتے ہیں، مگر ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کیا ہیں، دنیا کو دھوکہ دے لیں مگر خدا دانا اور بینا ہے، وہ تمام حالات جانتا ہے، خدا توفیق دے کہ ہم صراط مستقیم پر قائم رہیں، اور روز محشر ہم کو شرمندگی نصیب نہ ہو، حضور برابر دعا فرماتے رہیں، کہ ہمارے ایمان میں تقویت ہو اور ہم گناہوں کے بوجھ سے ہلکے ہوں، جہاں اس قدر سیاہ کاریاں ہیں وہاں اس میں شک نہیں اب تھوڑی تھوڑی اپنی بداعمالیوں پر شرم بھی آتی ہے، اس کی ذات سے امید ہے کہ وہ نظر ترحم فرما کر ہمارے قلب کو پاک کر دے گا اور اس کی نفسانیت کو دور کر دے گا اور ہم کو سوائے اس کی محبت اور اس کی رضا جوئی کے کسی دوسرے کام سے تعلق نہ ہوگا،

میں کئی دن سے خط کا ارادہ کرتا تھا، مگر کوئی نہ کوئی امر مانع ہو جاتا تھا، آج ہمت کر کے بیٹھ گیا ہوں، اور تمام ضروری خطوط کا جواب دیتا ہوں، والدہ صاحبہ بعد عید رامپور تشریف لے گئیں اور وہاں سے منصوری گئیں، عزیزی خورشید کو بخار برابر رہتا ہے اور اب تک کچھ افاقہ نہ تھا، خدا کرے، اب چونکہ موسم بھی خوشگوار ہو گا، اُن کو صحت ہو، اُن کی طرف سے بہت ہے، غالباً والدہ صاحبہ بھی اکتوبر تک منصوری رہیں گی، میں شاید حضور کو لکھ چکا ہوں، کہ چیف کمشنر صاحب کے یہاں سے جواب آگیا کہ ہماری ——— دوبارہ نظر بندی رامپور روئی کے موسم تک کیلئے ہونے کا انتظام نہیں ہو سکتا، امید کم تھی، مگر ہم نے اپنا دستور رکھا ہے کہ جو واجبی ضرورت ہم کو ہو ہم اس کا اظہار کر دیں، منظوری اور نامنظوری کا اُن کو اختیار ہے، حضور والا ہم لوگ خدا کی رحمت سے ہرگز ناامید نہیں ہیں، اس لئے انشاء اللہ جلد یہ دن ختم ہو جائیں گے، حضور کے دیدار کو بہت دل چاہتا ہے، انشاء اللہ جب حکم ہوگا حضور کی قدم بوسی ہو جائے گی، ہمشیرہ عزیزہ نشاط بیگم صاحبہ کا خط آیا اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے رفیق مجلس حسرت نے الٰہ آباد میں اپنے تمام ساتھیوں کی امارت کی اور نماز عید ادا کی، خدا اس کی عید کو ضرور مبارک کرے گا، نماز میں اب لطف آنے لگا ہے مولوی سلامت اللہ صاحب کو ہمارا دست بستہ سلام، وہ بہت یاد آتے ہیں، اُن کی امداد کی جلد ضرورت ہوگی، انشاء اللہ کیونکہ کاٹن مل کے کام کا وقت قریب آگیا ہے فصل کا حال ابھی معلوم نہیں، مگر انشاء اللہ جلد حالات معلوم ہونگے، ان کے خطوط کا انتظار ہے، بھائی الطاف کی خیریت بھی معلوم نہیں ہوئی، اب یہاں قائم ڈپٹی کمشنر کی جگہ دوسرے نئے ڈپٹی کمشنر آ گئے ہیں، مسٹر ہمنگ سے جو پہلے تھے، وہ یکایک سخت بیمار ہو گئے، اور اب سنا ہے کہ وہ ناگپور سے دو برس کی رخصت پر انگلستان جائیں گے، فی الحال سخت بیمار ہیں، متواتر تبدیلیوں سے قدرے تکلیف ہوتی ہے، کیونکہ نیا شخص ہم سے واقف نہیں ہوتا، اور ہم اس کے طرز عمل سے نہیں، حضور ہمارے لئے دعا فرمائیں ہم بھی ہر وقت دست

بدعا ہیں، خدا ضرور ہماری سنے گا، رامپور کی دشواریوں میں کمی ہوئی ہے، فضول مفسدین ہماری جنگ کراتے تھے، محمد علی نے ایک تازہ غزل لکھی ہے، مولوی سلامت اللہ صاحب کے لئے، جلد ارسال کروں گا، عزیزی قطب میاں صاحب، الیاس اور احسان کو پیار، بچے سب سلام عرض کرتے ہیں،

حضور کا خادم شوکت علی

ایک معقول انگریز

(۲۹)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۵ ستمبر ۱۶ء

اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ ملا۔ اس کو نہایت غور سے کئی مرتبہ پڑھا، کیونکہ اس میں ہماری ہدایت کے لئے بہت سامان ہوتا ہے اور ہم کو تقویت ملتی ہے کہ ہم دنیا کی خواہشات و لغویات سے بچ سکیں۔ حضور کی شکایت بالکل بجا تھی کہ ہمارے یہاں سے جواب دیر سے ملے، جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں، اس عرصہ میں یہاں افسر پہ افسر تبدیل ہوا، اور ہم نے از راہ سہولیت نئے آدمی کو آرام اس وقت تک دینا چاہا کہ وہ اپنے نیام وغیرہ کا مناسب انتظام کرلے، جو ڈپٹی کمشنر یہاں پہلے تھا وہ سخت بیمار ہو کر ولایت بھیج دیا گیا، ان کی جگہ یہاں کا مہتمم بندوبست کام کرتا تھا، علاوہ خود اپنے کام کے، ان کے بعد ایک دوسرے آفیسر آئے ہیں، جس غریب پر علاوہ دیہاتی بنکوں کے کام کے ضلع کا کام بھی کرنا، اور اس پر اضافہ ہماری ڈاک کا دیکھنا، ایک تو نیا آدمی خواہ مخواہ اجنبیت کی وجہ سے نئے کام سے گھبراتا ہے اور اس کی تکمیل میں زیادہ وقت لیتا ہے، اور دوسرے خود اس کا اپنا کام ہوتا ہے، اس نئے پھیر اور کسی کا نقصان ہو یا نہ ہو ہمارا ہرج ہوتا ہے، اور خطوط دیر میں روانہ ہوتے ہیں اور دیر میں ملتے بھی ہیں، پھر اردو کی ناواقفیت اور مصیبت ہے۔ مترجم ہر وقت مکان پر موجود نہیں رہتا، ہم لوگ واقعی خط لکھ... کاغذ غائب... تھے، ہوئی غالباً... کاغذ غائب، ہوئی تو ہم... کاغذ غائب... کریں گے، کہ وہ کوئی دوسرا انتظام تھا، جیسا کہ لین ٹروئی تھا، وہاں ہم کو ذرہ تکلیف نہ ہوئی، ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولس، انگریز تھا، اور ایک ہندو سب انسپکٹر اردو کے لئے، یہاں اردو کے خطوط میں زیادہ دقت ہوتی تھی، کیونکہ مترجم خود خط و کتابت میں بہت دلچسپی لیتے تھے، اور اس کو عوام میں مشہور کرتے تھے، مذہبی امور جو انسان کی زندگی کا سب سے خانگی کام تھا، اس میں نئے نئے معنی پہنائے جاتے تھے، اس شریف مردود و ملعون کے معاملہ میں نہ حضور کو میرے خطوط ملے اور نہ حضور کے مجھ کو، سوائے صبر کے کچھ چارہ نہ تھا، اور ہم نے بازرگی کرنا چاہی نہیں، اگرچہ ارادہ تھا کہ چیف کمشنر صاحب کو تمام حالات سے اطلاع دی جائے، مذہبی معاملات میں مداخلت مخدوش بات ہے اور قانون کے خلاف، میں جانتا ہوں کہ دینی معاملات میں مصلحت اندیشی کا نتیجہ ہمارے حق میں مضر تھا، ہر لحاظ سے، دینی و دنیوی، حضور کم از کم اس بات کا تو یقین رکھیں کہ انشاء اللہ ہم اس معاملہ میں ذرہ بھی کمزوری آئندہ نہ دکھلائیں گے، حضور دعا فرمائیں،

نئے ڈپٹی کمشنر ایک نوجوان ہیں جو محمدؐ کے زمانہ میں، آکسفورڈ میں تھے، اور اگرچہ محمدؐ سے ملاقات نہ تھی، مگر محمدؐ کے چند اور
انگریز اور ہندوستانی دوستوں کے دوست تھے، ہم جب ملنے گئے، تو حسب معمول اخلاق سے ہی پیش نہ آئے بلکہ ہم
گھنٹہ تک تمام معاملات پر بہت صاف صاف اور دلچسپ گفتگو ہوئی، سول سروس کے لحاظ سے روشن خیال
اور اس ملک سے ہمدردی رکھنے والے معلوم ہوتے ہیں، اور خوشامد سے متنفر، مگر یہ کم بخت ایسی بلا ہے کہ حاکم کاغذ غائب ......
ماتحت کا محکوم کر دیتی ہے، اور اس کے پھندے سے بچنا دشوار معلوم کاغذ غائب ...... ہم کو سوائے خدا کے کسی سے کاغذ غائب ......
اور انشاء اللہ تعالیٰ، ہم ایسے ارادوں پر قائم رہیں گے، اس عرصہ میں یہاں چند بدباطن کوشش کر رہے تھے کہ
اندر ہی اندر یہاں کے لوگ ہم کو بائیکاٹ کر دیں اور ان کو خلاف حکم گورنمنٹ طریقہ طریقہ سے دھمکایا جاتا تھا کہ وہ ہم
سے نہ ملیں، اس کا نتیجہ سوائے ناکامی کے کچھ نہ ہوگا، کیونکہ اگر مسلمان اور ہندو ہمارے مصائب پر اور غیر مستحق نظر
بندی پر افسوس کرتے ہیں تو اس قسم کی باتوں سے اس میں فرق نہیں آتا ہے، ویسے ہم تو حضور کو علم ہے کہ ہم تو
تن پسند ہیں، اطمینان سے جب تک خدا کا حکم ہے اس خدا کی زمین اور خدا کے ایمان کے نیچے بیٹھے ہیں آج چھندواڑہ میں
ہیں تو کل کو مانڈلے میں ہوں گے یا اپنے وطن دہلی یا رامپور میں، اس بیچ جو ہم سے ملے گا ہم اس سے ملیں گے، اخلاق
سے ملے گا، اخلاق سے ملیں گے، برے طور پر ملے گا، ہم اس کو ذلیل اور کمینہ سمجھ کر اس سے کنارہ کشی اختیار کریں۔
بفضلہ تعالیٰ ہر گوشہ ملک میں والیان ملک سے لے کر غریب سے غریب تک سچے مسلمان سے ہماری محبت ہے، ہم کو کسی
کے ملنے یا نہ ملنے کی پرواہ نہیں۔

قسمت بری سہی پہ طبیعت بری نہیں　　　ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

یہ خدا کا شکر اور اس کی نعمت ہے کہ اس نے ہم کو منکسر مزاج اور خوش طبع پیدا کیا ہے اور ہمارے اخلاق
سے امیر اور غریب سب یکساں خوش ہوتے ہیں، اور ہم کو دعائے خیر دیتے ہیں، حاضر اور غائب، ان کو ہمارے
اخلاق گرویدہ کرتے ہیں، جب کہ وہ دیکھتے ہیں، کہ معمولی حیثیت کے انسان تھوڑی سی حکومت اور اختیار پہ
ان سے گالی و گفتار، شیخی اور اکڑ سے برتاؤ کرتے ہیں، اور بات بات پر تازیانہ دکھاتے ہیں، غریبوں اور بےکسوں
پہ ظلم اور زیادتی، اور بڑوں کے سامنے خوشامد اور چاپلوسی، یہ کمینہ خصلت کی ظاہری نشانی ہے، خدا کا شکر
ہے کہ حضور کی صحبت اور دعا سے رہی سہی شیخی بھی ہمارے دماغ سے نکل گئی، حضور دعا فرماتے رہیں، حضور یقین
رکھیں کہ ہم کو اب کسی کو راضی کرنے کی خواہش نہیں، سوائے اس مالک حقیقی کے جو ہم سب کا آقا ہے، مولانا سلامت
اللہ صاحب کو ہمارا بہت بہت سلام اور پیار حضور پہونچا دیں، حضور سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے، انشاء اللہ
خدا جلد سامان ملاقات پیدا کر دے گا، ظاہراً تو میرے کارخانہ روئی کے حالات نہ ہوں مگر سامان ایسے معلوم
ہوتے ہیں کہ اگر اس کی خوشی ہوئی تو امسال ضرور کچھ عمدہ نتائج نکلیں، بیوپاریوں کو میں نے طلب کیا ہے، سپاپانی،
ریلے برادری اور خود رامپور کے خریدار، چند اعزہ کا بھی خریدنے کا ارادہ ہے، اگر میں موجود کارخانہ میں ہوتا تو بہتر
تھا، مگر گورنمنٹ صوبہ تبادلہ کا انتظام نہ کر سکی، غالباً تبادلہ کرنا پسند نہیں کیا، خیر، اب جو کچھ ہو، بمبئی سے انجینیر

عمدہ بلایا ہے کہ تمام کارخانہ کو درست کر دے، ۱۵ اکتوبر تک مولانا صاحب ناامید نہ ہوں، دعا فرمائیں۔ انشاء اللہ کامیابی ہو گی، کم از کم مصارف نکل آئیں گے، برادرم الطاف، احسان، قطب میاں صاحب کو ہمارا اسلام مسنون والدہ صاحبہ مع خورشید علی کے ہمارے پاس اکتوبر میں بعد عید آئیں گی، حضور سے ضرور ملیں گی، جاتے وقت جلدی میں تھیں، اس لئے نہیں ٹھہریں، اور اسٹیشن پر حضور کو تکلیف دینا انہوں نے قبول نہیں کیا، عزیزی زاہدہ بیمار ذرہ تھے، اس وجہ سے امتیاز الحق صاحب کو جواب نہ دے سکے، میرے پاس کوئی کتاب یا رجسٹر موجود نہیں ہے سب چیزیں دہلی میں تھیں، حضور ان کو . . . . کاغذ غائب . . . . دیں، امین صاحب کو غالباً علم نہ ہو گا۔ محمد علی کو . . . . کاغذ غائب . . . .

احسان کو ایسے وقت میں انگلستان کے سفر کا کیوں خبط ہوا ہے، بعد از جنگ جائیں۔ حضور کا خادم شوکت علی

کشورِ کفر میں کعبہ کو بھی شامل کر لو

(۳۰)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۱ ستمبر ۱۶ء اللہ اکبر

حضور والا السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ ملا تھا، مع اس تمام خط و کتابت کے جو حضور اور پرائیویٹ سکرٹری وائسرائے کے درمیان ہوئی، بہتر ہوتا اگر لوکل گورنمنٹ کے ذریعہ سے بھی حضور تمام مرحلے طے فرما لیتے، جیسا کہ سکرٹری کے خط میں درج ہے، میں خود اس خط و کتابت اور خاص کر جواب پر رائے نہیں دے سکتا، رہا شریف صاحب کا معاملہ تو قلب اور ضمیر سے میں مجبور ہوں، ان کی بہت تعریف سنی تھی، چند احباب سے اور حضور نے بھی ان سے بذات خود ملاقات کی تھی، خدا کرے کہ یہ عام خبریں ان پر اتہام ہوں، اور غلط ثابت ہوں، عام لوگ اور میں جو ان کو برا کہتا ہوں صرف اظہار خیالات اور جذبات اسلامی کے لحاظ سے کہ اگر کوئی شخص اماکن مقدسہ میں فساد اور کشت و خون کرے، اور خاص کر ایسے زمانہ میں تو وہ ضرور جیسا کہ حضور نے اول لکھا تھا "قابل دار" تھا، میرا خود بھی گمان غالب ہے کہ اس معاملہ میں ان کو بدنام کیا گیا ہے، خدا کرے ایسا ہی ہو، اخبار القبلہ حضور کے پاس اگر آتا ہو تو بعد پڑھنے کے حضور میرے پاس بھیجا کریں، تاکہ ہم بھی دیکھ لیں، خدا کرے اس کو پڑھ کر ایمانوں میں تقویت ہو، کہیں اسی شعر کا سا مصداق نہ ہو۔

کشورِ کفر میں کعبہ کو بھی شامل کر لو ⁂ سیرِ ظلمات کو تھوڑی سی فضا اور سہی،

ان معاملات میں میں اپنی جہتی اور معمولی حسن ظن سے کام لینا چاہتا ہوں، مگر یہ ایمان کا معاملہ ہے اس لئے دل میں ڈرتا ہوں، کہ کہیں یہ کارروائی شیطان تو نہیں کراتا ہے، تاکہ میں اپنے ضمیر کو خاموش کر دوں، اور اپنے آپ کو تکلیف سے بچاؤں، محمد علی نے قریب ۱۰ برس ہوئے ایک غزل لکھی تھی، جس کے دو شعر انہوں نے اپنی تقریر میں

الہ آباد میں سنائے تھے، چلبلے اور موزوں تھے وہ حضور کا خط دیکھ کر بار بار یاد آتے ہیں:۔

تیری خاطر بھی ہے مدنظر، پاسِ ادب بھی ہے ۔۔۔ مگر میں کیا کروں دل کی جلن کچھ اور کہتی ہے

یقین آنے کو تو آجائے تیرے عہد و پیماں کا ۔۔۔ تیری آنکھ ادب و عدہ شکن کچھ اور کہتی ہے

پچھلے خط میں حضور کے کچھ افسردگی سی معلوم ہوتی تھی، خدا کرے طبیعت حضور کی بالکل تندرست ہو، یہ ضرور ہے کہ ہم مسلمانوں کی موجودہ مذہب سے علیحدگی ضرور تکلیف دہ ہے، اور جس کی ہم کو سزا بھی مل رہی ہے، مگر پھر بھی ہم کو خدائے برتر کی ذات پر بھروسہ کرنا چاہئے اور میرے خیال میں تو ہمارے حالات میں تبدیلی بہت امید افزا ہے۔ ہم کو تو ہر حال میں راضی برضا رہنا اور خوش رہنا ہے، میں تو آج کل بہت خوش ہوں، اور مست، دست بدعا رہتا ہوں، اور پوری امید رکھتا ہوں کہ ہمارے تمام مصائب جلد تر ختم ہو جائیں گے، انشاء اللہ حضور کے قدموں کے نیچے بیٹھ کر اللہ اور رسول صلعم کی باتیں سیکھوں گا، اور اپنی بساط کے مطابق ان کی اشاعت کروں گا، اپنے خانگی معاملات تو اُن کو خدا کے سپرد کر دیا ہے، وہ کارساز ہے، انشاء اللہ بہتری ہوگی، رامپور میں کارخانہ کی درستگی ہو رہی ہے بمبئی سے انجن وغیرہ آگیا ہے، سال کی پیداوار کی نسبت کچھ ہونا فضول ہے، اگر خدا کو منظور ہوگا تو وہ آناً فاناً سب انتظام درست کر دیگا، خریداروں کا آنا لازمی تھا کیونکہ ہمارے پاس . . . کاغذ غائب . . . نہ تھا کہ خود خریدتے، جاپانی یا ریلے برادرس آگئے تو بہتر ہو جائے گا، کاٹن مل کے تمام امور کو خدا کے سپرد کر دیا ہے، مگر خدا سے قوی امید ہے کہ امسال کچھ ضرور بہتری ہوگی، حضور دعا فرمائیے گا، مولانا سلامت اللہ صاحب کو میرا اسلام، میرا یہ خط حضور اُن کو دکھا دیں والدہ صاحبہ بعد عید آئیں گی اور حضور سے ضرور ملیں گی:

حضور کا خادم شوکت علی عفی عنہ خادم الخدام کعبہ،

علالت طبع کا ذکر

(۳۱)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۴ اکتوبر ۱۶ء ۔۔۔ اللہ اکبر

بہار آئی نشہ میں جھومتے ہیں، ٭ مریدان پیر مغاں کیسے کیسے،

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا والانامہ اور عید کے موقع پر دعاؤں کا تار بھی آیا تھا، میں فوراً جواب لکھنے سے معذور تھا، کیونکہ مجھ کو پلنگ سے ہلنے کا حکم نہ تھا، اور تیز بخار میں بھی مبتلا رہتا تھا، پانوں میں بال توڑ نکلا تھا، ایک تو اچھا ہو گیا تھا مگر دوسرا کچا ہی تھا کہ میں نے اس کو ڈاکٹر کو دکھایا، اس نو عمر دوست نے فوراً نشتر سے کام لینے کا ارادہ کر دیا، میں نے سمجھایا بھی مگر اس نے کچھ نہ سنا اور میں نے زیادہ اصرار بھی نہیں کیا، ڈر تھا کہیں خوف زدہ ہو جانے کا الزام عائد نہ ہو، کیونکہ ڈاکٹران معاملات میں، زیادہ جانتا ہے، عمل جراحی کے بعد زخم کی حالت اور خراب ہو گئی، اور سب طرف ورم ہو گیا،

بدقسمتی سے کوئی زہریلا مادہ بھی زخم کے ذریعہ سے اندر پہونچ گیا، جس سے خون میں خرابی پیدا ہوگئی اور مادہ اوپر نیچے آنے جانے لگا، اسی ٹانگ میں ورم تھا کہ ایک ران میں پیدا ہوگیا، کبھی گھٹنے میں، غرضیکہ بہت تکلیف رہی، بخار ہمراہ رہنے لگا، آخر کو سول سرجن نے خون اور معدہ صاف کرنے کی دوا دی، اور چلنا پھرنا قطعی منع کر دیا، دودھ یا کھچڑی کھانے کو دی، میں اچھا ہوں، اصلی زخم تو بہت اچھا ہوگیا ہے، مگر تھوڑا مادہ باقی ہے، اس کا اخراج بھی ہو رہا ہے، پلنگ پر لیٹے لیٹے لکھتا ہوں عید کی نماز کو تو ضرور گاڑی پر گیا تھا، نماز بھی بیٹھ کر اور ایک ٹانگ پھیلا کر پڑھتا ہوں، انشاء اللہ دو چار دن میں بالکل اچھا ہو جاؤں گا، بچے سب اچھے ہیں، خدا کا شکر کہ معظم کے چھوٹے بھائی کو جو انڈک اپنے ہمراہ لائے تھے، اب افاقہ ہے، اور بخار ٹوٹ گیا ہے، [illegible] اور غور و پرداخت خوب ہوا اور خدا نے صحت دی، سب حضور والا کو سلام عرض کرتے ہیں، ہم جانتے ہیں کہ حضور کی دعائیں ہماری ممد و معاون ہیں، خدا حضور کو زندہ اور سلامت رکھے انشاء اللہ اس زندگی کے ذریعہ سے کوئی [illegible] خدمت سرانجام ہوگی، ہماری دعائیں ضرور بارگاہ اعلیٰ میں [illegible] ہوگی خدام [illegible] اسلام کی مدد کریگا، اس عرصہ میں بعد کچھ چھٹی ہی، انشاء اللہ [illegible] دن میں پھر شروع کر دوں گا، جاڑوں کی راتوں میں [illegible] لطف نماز کا آتا ہے، خدا کا شکر ہے کہ باقی نمازیں ہو جاتی ہیں، [illegible] غرض ہم سب کی تیمارداری میں لگے ہوئے تھے، بفضلہ تعالیٰ خوب تندرست ہیں، ایک نئی غزل لکھنا شروع کی ہے، کسی پرانے استاد کا خوب شعر ہے اس پر لکھتے ہیں:-

تم تو کعبے کے [illegible] ہوں گے ۔۔ [illegible] ہوتے ہوتے رہ گئی

صرف ایک شعر [illegible] سنایا تھا، خوب [illegible] ہے، دل خوش ہوگیا، حضور مولانا سلامت اللہ صاحب کو سنا دیں:-

مستحق [illegible] ۔۔ [illegible] ہوتے ہوتے رہ گئی

برادرم الطاف احسان، قطب میاں صاحب، مولانا سلامت اللہ صاحب اور احباب کو سلام، حضور کی قدم بوسی کو بہت جی چاہتا ہے، انشاء اللہ جلد [illegible] حافظ الدین [illegible] کو سلام [illegible] حضور ملیں،

([illegible])

حضور کا خادم شوکت علی،

محمد علی کی بیماری،

(۱۳۲)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۳؍ نومبر ۱۶ء،

اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا پوسٹ کارڈ ملا تھا، جس سے علالت طبع کی اطلاع ملی تھی، والدہ صاحبہ کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ ہاتھ پر بہت زور تھا، خدا اپنا فضل و کرم کرے، امید ہے کہ ان سہلوں سے فائدہ ہوگا، میں بہت دنوں سے دیکھتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی سلسلہ ہاتھ اور انگلیوں میں برابر چلا جاتا ہے، حضور اب کی مرتبہ ڈاکٹروں اور حکیموں کو پورے طور پر ہاتھ کو ملاحظہ کرائیے گا، تاکہ وہ اصل وجہ اس درد اور تکلیف کی بتا سکیں، اور جم کر علاج ہو، غالباً اس عرصہ میں ڈاکٹر انصاری صاحب

بھی لکھنؤ آئیں گے، اُن کی رائے بھی ضرور معلوم ہونا چاہیئے، پہلے تو ہمارا خیال تھا کہ مرض صرف جلدی تھا، مگر اب معلوم ہوتا ہے، کہ خون میں کچھ حدت یا فساد تھا، خدا حضور کو بلد تر صحت کامل عطا فرمائے، ہم لوگ بفضلہ تعالیٰ اچھے ہیں، عزیزی خورشید والدہ صاحبہ کے ہمراہ آ گئے ہیں، یہاں کی خشک آب و ہوا سے اُن کو معتدبہ فائدہ نظر آتا ہے، خدا اپنا فضل فرمائے۔ ان کے گھر میں اور بچے کو بھی بلوا لیا ہے، تاکہ ان کے دل بہلنے کا سامان ہو جائے، چند ماہ سے ڈاکٹر کے حکم سے دوا محمد علی نے بالکل بند کر دی تھی، اور طبیعت بالکل اچھی تھی، پرہیز بھی ترک کر دیا تھا، اور شکر بھی معمول سے زیادہ استعمال کی تھی، گزشتہ ہفتہ میں تھوڑی شکایت ظاہر ہوئی تھی، فوراً سخت پرہیز اور دوا پھر شروع کر دی، اب طبیعت پھر اچھی ہونا شروع ہو گئی ہے انشاء اللہ امسال وہ تندرست رہیں گے، حضور کی دعا کے خواستگار ہیں، ان کے گھر میں اور بچیاں سال بھر رہنے کے بعد مستحق نہیں کہ تبدیل آب و ہوا کریں، فی الحال معظم علی صاحب کے پاس بانگی پور گئے ہیں اور اب عنقریب رامپور.. کاغذ غائب . . . واسطے جائیں گے، غالباً لکھنؤ بھی ضرور قیام کریں گے تاکہ حضور کی اور تمام خاندان کی قدم بوسی کر سکیں عزیزی زاہد علی رامپور گئے تھے، غالباً ایک دو روز میں ضرور آ جائیں گے، ان کو تاکید الکھ دیا گیا تھا، کہ وہ لکھنؤ ضرور ٹھہریں، ان کی حالت حضور کی توجہ کی محتاج ہے، پڑھنے سے دل چراتے ہیں اور لغویات پر زیادہ توجہ ہے، حضور اُس کے واسطے دعا فرمائیے گا، اور سامنے بٹھا کر صاف صاف اسلام اس کو اس کی زندگی کے متعلق فرما دیجیئے گا، انشاء اللہ ان کا اثر ہوگا، اور اُس کی زندگی درست ہو جائے گی، میں اُس کی طرف سے بہت زیادہ پریشان ہوں۔ یہ وقت کسب علم اور درستگی اخلاق ہے اور اس کو ضائع کر دیا تو بہت آئندہ تکلیف اٹھائیں گے، برادرم مشیر کو خط لکھ رہا ہوں، خدا ان کو زندہ اور سلامت رکھے، وہ کلمہ حق سے دنیائے کفر کو منور کرنا چاہتے ہیں، برادرم احسان الرحمان کا خدا حافظ تھا، ابھی خیال آیا کہ وہ بھی جہاز عربیہ میں سوار تھے، نام اُن کا پڑھا تھا مگر اس وقت ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا۔ فہرست میں مسٹر شیخ ایم، ای، رحمان درج تھا، مجھ کو یقین کامل ہے کہ یہ سب مسافر فقط ان کی وجہ سے بچ گئے، حضور کی دعا ان کے ہمراہ تھی، ورنہ میں کیا باقی رہا تھا، صرف خدا کا فضل اُن کے ہمراہ تھا، ایک انگریز خاتون جو مسلمان ہو گئی ہیں، اور ہمارے دوست مسٹر حسن شاہ کی بیوی ہیں، وہ اور اُن کی چھوٹی بچی بھی ہمراہ تھی، خدا ان سب کو اپنی امان میں رکھے، ایسے وقت سفر کرنا مناسب نہ تھا، ہم لوگ یہاں اطمینان سے زندگی بسر کرتے ہیں، اور جب تک خدا کا حکم ہے، آرام سے رہیں گے، خدا اسلام کا بول بالا کرے، صرف حجاز مقدس کی فکر ہے، خدا اُس ملک میں امن و امان رکھے، اور کفار کی نگاہ بد سے بچائے، وہ ہماری جان ہے، ہم وہاں کے مسلمانوں کو اور ہم سب کو باایمان رکھے، حضور ہمیشہ اماکن مقدسہ کی طرف متوجہ رہیں، وہاں غیر مسلموں کے معاملہ میں دخل نہ دینا چاہیئے ورنہ بڑا سخت خمیازہ اُٹھانا پڑے گا، اس عرض پاک کا خدائے برتر محافظ ہے، کل مولانا سلامت اللہ صاحب کو مفصل خط لکھوں گا، اُن سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے، جب اُن کو فرصت ملے ایک دو دن کے لئے آ جائیں، حضور کا خط اخبارات میں دیکھا، نہایت عمدہ تھا، کاش کہ امین صاحب حضور کے ہمراہ رہتے، ان کو تمام معاملات کا علم تھا، اور اُن کا رہنا مفید پڑتا، میرا سب کو سلام و دعا، والدہ صاحبہ سلام کہتی ہیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے!

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۴ فروری ۱۹۴۸ء (۳۴۳) اللہ اکبر

ہوئی ہے عشق سے پس فنا بسر ے ✤ کہ اسبق ہیں جو مشہور جا بجا میری (حسرت)

حضور والا، السلام علیکم۔

حضور کا حکم نامہ محمدؐ کے نام آیا تھا، اُس کو پڑھ کر قلب کو تسکین ہوئی دل تو چاہتا ہے کہ روز بڑے بڑے خط حضور کو لکھوں اور اپنے دل کے تمام جذبات کا اظہار کروں، تاکہ قوت ایمان کا سامان ہو اور دل سے کدورتیں اور وہ بلائیں جو ہم کو خدا سے جدا رکھتی ہیں، دور ہوں، مگر اول تو مجبوری، دوسرے لکھنے کے لئے دفتر درکار اور پھر آخر انسان لکھے تو کیا لکھے میرے اظہار کی ضرورت نہیں ہے، خدا پر ہمارے قلوب کیا خوب روشن ہیں، حضور خود اندازہ فرما سکتے ہیں اس لئے

سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے،

مشکل سے کسی وقت اپنی موجودہ دشواریوں کا خیال کرتا ہوں، مگر ہاں ایک خیال ہے کہ سوتے، جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، دل کو تو... کاغذ غائب ہے اور کعبہ مکرم کی محبت اور عزت کا.. کاغذ غائب.. اور مدینہ منورہ کے دیدار کی دھن، خدا اُن کی حرمت کو برقرار رکھے گا، اور ہماری ایک آرزو کو پورا کرے گا، کہ ہم حج بیت اللہ سے جس کا ارادہ مجبوراً.... کرنا پڑا فارغ ہو سکیں نہ معلوم ابھی گزشتہ یوم الحج کی ایک نظم سیماب وارثی اکبرآبادی کی نکلی تھی، وہ ہر وقت یاد آتی ہے، مرصع تھی اور دل جلے کی محبت کا اظہار تھا، انشاء اللہ ہم کو ثواب حج بیت اللہ یہاں پر مل جائیگا، اگر قسمت میں نہیں لکھا ہے۔

(۱)
لاشہ مرا مدینہ کے جنگل میں ہو پڑا ✤ لے نسیم روضہ سے لبیک کی صدا،
تشریف لائیں خود میری میت پہ مصطفےٰ ✤ چہرہ سے ہوں عیاں مری حسرت نصیبیاں

(۲)
ٹھوکر لگا کے پھر مجھے زندہ کریں حضور ✤ آجائے جان اس تن بیجان میں بن کے نور
قربان جاؤں دیکھ کے دیدار پر سرور ✤ قدموں پہ پھر نبیؐ کے نکل جائے میری جان

(۳)
حاصل جو ایسی موت ہو اور ایسی زندگی ✤ ارمان میرے دل میں نہ باقی رہے کوئی
آباد ہوں مدینہ میں بربادیاں میری، ✤ مطلب ہے کہ مجھ کو ملے عمر جاوداں،

(۴)
لنگر اٹھا قریب ہے ہنگامہ سحر، ✤ اب دل ہے ناشکیب نہ لالہ دیر کر
پیک خیال نے مجھے دی ہے ابھی خبر ✤ وہ دیکھ مسجد نبویؐ میں ہوئی اذان،

حضور کا دوسرا خطاب تک نہیں ملا ہے، میں دریافت کروں گا، حضور کو یقین ہونا چاہیئے، کہ جو حضور کی رائے ہوگی وہی ہماری، تمام دینی معاملات میں ہم کو حضور سے بڑھ کر کون راہنما ملے گا، یہ ہماری خوش قسمتی تھی، عنقریب ولایت علی، غلام حسین وغیرہ یہاں آئیں گے، اُن کے لئے اجازت لے لی ہے، محمد علی کے گھر میں مع بچوں کے ۸ کو رالمپیر

سے روانہ ہوں گے، لکھنؤ قدم بوسی کے لئے ضرور ٹھہریں گی، حضور اطمینان رکھیں، ہم انشاء اللہ کوئی امر ایسا نہیں کریں گے، جس سے توہین اسلام ہو، ہاں انسانی کمزوریوں سے ڈرتے ہیں اور اس کے . . کاغذ غائب . . سے بھی درخواست دست بستہ ہے کہ حضور بھی دعا میں ضرور یاد فرما لیا کریں، قدم بوسی کو بہت دل چاہتا ہے، مگر صبر کرتے ہیں، جب اس کا حکم ہوگا یہ مسرت دلی بھی حاصل ہوگی، اب نمازوں اور دعاؤں میں لطف آنے لگا ہے، اور کلام پاک میں تو نئے نئے روز مزے پاتے ہیں، ایک صاحب کا خط لکھنؤ سے آیا تھا، جو مالک کارخانہ رکابگنج فلور مل ہیں، وہ خط کہیں ضائع ہوگیا ہے، نہیں ملتا تھا کہ جواب دیتا، جناب مولانا سلامت اللہ صاحب جو اسی سلسلہ میں تجارت ہے، غالباً اُن کا نام اور پتہ جانتے ہوں گے، اُن کو میرے کارخانہ کے متعلق کچھ دریافت کرنا تھا، اشتہار بھیجتا ہوں، مفصل حالات بعد کو لکھوں گا، میں انشاء اللہ پرسوں تک ضرور شبیر حسین صاحب اور عزیزی احسان کو خط لندن لکھوں گا، بھائی الطاف، مولانا عنایت اللہ صاحب، قطب میاں صاحب، عزیزی الیاس، صبغۃ اللہ سب کو سلام مسنون،

حضور کا خادم شوکت علی

یہ وقت دعا اور صبر کا ہے!

(۴۴)

چھندواڑہ ۱۷ اپریل ۱۹۲۸ء،

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا ✽ آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا (غالب)

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کے دو خط آئے ہوئے رکھے تھے، اور جواب دینے کو دل بار بار تقاضا کرتا تھا، مگر اپنی بے بضاعتی اور پابندیوں کا اندازہ کرکے دل پر جبر کرتا تھا، صبر کئے بیٹھا ہوں، جب خدا آزادی دے گا دل کھول کر شکوہ و شکایت کروں گا، مگر یہ وقت شکوہ اور شکایات کا نہ تھا، بلکہ امداد کا، سختی سے سخت مخالفت کو دبانا چاہیئے، نہ کہ تفرقہ ڈالنا، تمام امور میں میری رائے کا حضور کو علم ہے، اور ان میں ذرہ بھی فرق نہیں آیا ہے، بلکہ اور تقویت ہوگئی ہے، حجاز کے معاملات سے دل کو اذیت پہونچتی ہے، خدائے واحد القہار ہے، ان امور کا فیصلہ کرے گا، اور مستحقوں کو سزائے سخت اور عذاب دردناک دے گا، رہے مبارک علی اور ان کے ذریات تو خدا ان حشرات الارض کو جلد فنا کرے گا، ان سب کو دعا میں ضرور یاد کرتا ہوں، خدا کا شکر ہے کہ جمعیت نے مناسب فیصلہ فرمایا، جو شکایت مجھ کو سیٹھ صاحبان سے ہے، وہ یہ ہے کہ یہ وقت فتنہ و فساد کا نہ تھا بلکہ یکجہتی اور امداد کا، گو معاملات ہم سب کی مدد سے بعد کو

اطمینان کے وقت طے پا جانے، خانگی امور کی نسبت رائے قائم کرنے کے لئے ہمارے پاس صحیح ذرائع موجود نہیں ہیں، مگر جیسے کچھ ہیں، ان سے بھی اپنی قدیم رائے میں اور پختگی پیدا ہو گئی ہے، یہ وقت دعا اور صبر کا ہے، اور ہمت اور استقلال سے کام کرنے کا، کلمہ حق کہنے کا اگر کوئی وقت ہے تو یہی ورنہ ویسے تو معمولی انسان بھی کہہ سکتا ہے میرا تو اقبال کے دو شعروں پر عمل ہے:-

یہ رسم بزم فنا ہے اے دل، گناہ جنبش نظر بھی،
رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا
واعظ ثبوت لائے جو پینے کے جواز میں،
اقبال کو یہ ضد ہے کہ پینا بھی چھوڑ دے،

ہم مسلمانوں کو اب استحقاق نہیں ہے، کہ ایک لفظ بھی گستاخانہ ان لوگوں کی شان میں کہیں جو تمام معاملات پر غور کرنے کے بعد راہ حق میں جدوجہد کرتے ہیں غریب انزاک اور راجہ صاحب کا کیا قصور ہے، اگر مقامات مقدس میں ہم لوگ خود بت پرست ہو جائیں، اصل قصور وار تو دوسرا ہے، غریب خوف زدہ جو حکم سننے والوں پر اعتراض جائز نہ تھا، حضور سے ملنے کی از حد تمنا تھی مگر افسوس کہ نئے سامان دشواری کھڑے ہو گئے۔ جناب قبلہ راجہ صاحب جہانگیر آباد سے توقع تھی کہ وہ اپنے اس بڑے اثر کو جو ان کو حکام سے تھا، ہمارے لئے استعمال کر کے ہم کو آزادی دلائیں گے، مگر وہ تو نہ ہو سکا، اور ہماری تکلیف اور پریشانی کا باعث ہوئے، اور اس روحانی غذا کو ہم سے روک دیا جس کے لئے ہم بیتاب تھے، خدا ان مصلحتوں کا برا کرے، ہم غریبوں کے لئے سوہان روح ہو گئی ہیں، دوسرے کو مارین شاہ مدار ہ جب حضور راجہ صاحب سے ملیں تو میری طرف سے شکایت ضرور پیش کر دیجئے گا، عزیزہ گلنار کی بسم اللہ ملتوی کر دی گئی ہے، اب جب خدا حضور سے ملائے گا اس وقت ہی وہ رسم ادا کی جائے گی، خیر اس دنیا میں ملاقات جسمانی ہو یا نہ ہو سکے، مگر حوض کوثر پر کی ملاقات کے لئے ناامید نہیں ہوں، اور حال کے واقعات دیکھ کر صرف کافر ہی ناامید ہوگا، دعاؤں میں تاثیر آ چلی ہے، جہاں گناہوں کا بوجھ لیتا ہوں، وہاں کبھی کبھی دل سے گڑگڑا کر دین کے لئے بھی دعا نکل جاتی ہے، اگر دس مرتبہ اپنے لئے ہوتی ہے، تو ایک مرتبہ خالص دین کی بہتری کے لئے بھی نکل جاتی ہے جو اس خالق مطلق کے دربار تک ضرور پہنچ جاتی ہے، انشاء اللہ اچھے نتائج نکلیں گے، اب تو حضور پیران پیران رحمۃ اللہ کی جن کے ساتھ حضور کے توسل سے ہم کو بھی رشتہ کی عزت نصیب ہو گئی ہے۔ ہمارے ساتھ دعائیں شریک ہوں گی، حضور ہم سب کو صبر و شکر کرنا چاہئے۔ اس میں عجیب لطف ہے۔ اور حقیقی بہتری انشاء اللہ چند دنوں میں اس کا پھل مل جائے گا، حضور کے ہمراہ مولانا سلامت اللہ صاحب سے ملنے کی بھی امید تھی، ان کو میں نے پرسوں سے خط نہیں لکھا ہے، وہ بڑے زوروں کے آدمی ہیں، اور ان کی بانگ سے ہم سب بیدار ہو جاتے ہیں، اس لئے

فضول خطوط سے سوائے دل بے چین ہونے کے کوئی نتیجہ نہیں نکلتا، اس لئے صبر کرتا ہوں، مگر ملنے کو دل تڑپتا ہے، خدا ایسا جلد کرے کہ حضور سے ہم لوگ مل سکیں، کیا معلوم پھر حضور کو حکم گذشتہ طریقہ سے حکم مل جائے، میں تو ذرہ خوش ہوا تھا کہ اب کچھ نئے لطف دیکھنا نصیب ہوں گے، اُس کے لئے اچھے اچھے کپڑوں کی تیاری کی تھی، تاکہ مرنے سے پیشتر دل کی بھڑاس نکال لوں، مگر اب تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایسے خوش قسمت کہاں کہ راہ حق میں اذیتکالیف نصیب ہوں، ایک دوست نے سہرہ لکھنے کا وعدہ کیا تھا، مگر اب تو غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

محمد مجھ سے از حد رنجیدہ اور کشیدہ ہو گئے تھے، کیونکہ یہ عزت میرے ساتھ منسوب کی گئی تھی، اور اُن کا تذکرہ نہ تھا، خدا کی عجب شان ہے:۔

تیغ قاتل نے یہ کیا اپنے دکھائے جوہر
سر بکف پھرتے ہیں اب جان چرانے والے (اکبر)

حضور والا میں تو اب مست ہو گیا ہوں، ہاں صبر کو ہاتھ سے اب تک نہیں دیا ہے، اگرچہ دل چاہتا ہے کہ بے ننگ نام ہو جاؤں:۔

پھر وضع احتیاط سے گھبرانے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے (غالب)

حضور دعا فرمائیے، دل قبول نہیں کرتا کہ حضور یہاں تک نہیں آئیں گے، اس لئے صبر کئے بیٹھا ہوں، مگر دل میں ملنے کی بہت خواہش ہے، جب تک آنے کی امید ہوتی ہے، دل خوش رہتا ہے، اسی لئے محمد تو روٹھا رہتا تھا کہ حضور کو تکلیف نہ دے، مگر اس کو اس انس خاص کی وجہ سے جو حضور کو اس سے ہے، اور جس کی وجہ سے وہ حضور پر زیادتی بھی کر لیتا ہے۔ اس سے ضبط نہ ہو سکا، اس نے درخواست کر بھی دی، اب کی مرتبہ ارادہ مصمم تھا کہ حضور کو زبردستی ۳ یا ۴ دن کم از کم روکتے، اگرچہ یہ جانتا تھا کہ حضور کا لکھنو سے علیحدہ ہونا، وہاں سب کو شاق گذرتا ہے، شیطان مجھ کو ورغلاتا ہے کہ اس مقام چھندواڑہ کی طرح طرح سے تعریف لکھوں، کہیں آب و ہوا کی نسبت مدح کا قصیدہ پڑھوں، کہیں یہاں کے پھلوں کی تعریف لکھوں، کہیں قدرتی منظر کا تذکرہ کر دوں، غرضیکہ طرح طرح سے حضور کو سبز باغ دکھا کر بلالوں تاکہ قدم بوسی ہو سکے آخر، امہینوں کے بعد ملنے کا استحقاق تو ضرور پیدا ہو گیا ہے۔ سب لوگ مستدعی ہیں، آج مجبور ہو کر حضور کو میں نے بھی لکھ دیا، اب تک صبر کرتا رہا تھا، میرا یہ خط حضور، مولانا سلامت اللہ صاحب کو بھی دکھا دیجئے گا، اور اُن کو میرا بہت بہت پیار، اب پھر راجہ صاحب مسئلہ مسلم یونیورسٹی کو اٹھاتے ہیں، اور مسلمان پریشان ہیں،

اور ادھر خود گورنمنٹ مصیبت میں ہے، مناسب تو یہی تھا کہ اس وقت یہ پریشان بحث نہ چھڑتی، دعا کا طالب ہوں، اپنے نفس سے بہت پریشان ہوں، وہ بڑا زبردست ہے، حضور توجہ فرماتے رہیں ہم سے بے فکر نہ ہوں، غیر سے مجھ کو ذرہ خوف نہیں، اور خود اپنے سے،

حضور کا خادم شوکت علی،

اقبال کی ایک نظم

(۳۵)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۶ر اپریل ۱۷ء،

اللہ اکبر

منظور مجھے شکوہ بیداد بتاں ہے،
للہ بتا دے کوئی اللہ کہاں ہے،

حضور والا، السلام علیکم،

تقریباً ۵ یا ۶ دن ہوئے کہ حضور کا حکم نامہ آیا تھا، مگر صرف لفافہ ہی دیکھنے کو ملا، دریافت کرنے پر ۳ دن کے بعد معلوم ہوا کہ وہ خط روک لیا گیا اور ہم کو نہیں ملے گا، حضور کو ہماری معذوریوں کا علم ہے اس لئے کبھی ہم کو دوسرے سیاسی امور پر حضور نہیں لکھتے ہاں جو کچھ ہماری روحانی دشواریاں ہوتیں ہیں، ان کو ہم حضور میں پیش کر کے اطمینان قلب طلب کرتے ہیں، ہم کو صرف خانگی اور ذاتی امور پر خط و کتابت کی اب اجازت ہے، اور مذہبی امور مسلمان کی زندگی کا سب سے بڑا جز دتھا، اس پر ہم مصر ہیں اور ہمیشہ رہیں گے، دنیوی معاملات کے متعلق جو حکم ملے چاہیں کیسے ہی لغو اور سخت کیوں نہ تھے ہم نے ان پر اپنی رائے کا صاف اظہار کرنے کے بعد جس طرح بن پڑا عمل کیا مگر اول دن سے ایسے احکام کو جو خدا کے بھیجے ہوئے حکموں کے خلاف تھے ہم نے قبول کرنے سے انکار کیا اور انشاء اللہ کریں گے، حضور اور ہمارے درمیان میں تو صرف کعبہ مکرم" اور رب کعبہ" کا ایسا مضمون جس سے ہم کو دلی عشق تھا اور اب حضور کے طفیل سے اس بڑے رشتہ میں شامل ہو گئے تھے، جس کی بنا پر حضور پیران پیر شاہ جیلان رحمۃ اللہ علیہ سے غلامی کا تعلق ہو گیا تھا، بدقسمتی سے اس امر کا فیصلہ بھی غیر مسلموں کے ہاتھ میں کہ کون مسئلہ مذہبی تھے اور کون غیر مذہبی، میں تو اول دن سے صبر سے کام لیتا ہوں، اور جب دل پر کوئی سخت چوٹ لگتی ہے تو "رب کعبہ" کی بارگاہ میں عرض معروض کرتا ہوں، اور اس کی امداد طلب کرتا ہوں، کہ وہ سمیع اور بصیر ہے اور ہماری خوب سنتا ہے اس پر ہمارا بھروسہ ہے، ہاں جب حضور کا خط نہیں ملتا ہے تو رنج ہوتا ہے، خدا کا شکر ہے خدا کا شکر ہے کہ اس کی محبت میں یہ بھی تکلیف نصیب ہوتی ہے، اقبال نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی نسبت ایک نظم میں خوب لکھا ہے، جس کو پڑھ کر تسکین ہوتی ہے، اور قلب میں نئی طاقت آتی ہے،

اپنے خطوں کی مجھ کو ذرہ بھی فکر نہیں ہوتی اول تو میں خود بے کار معاملات پر جن کا سیاسی دنیا سے تعلق ہوتا ہے،

وقت نہیں ضائع کرتا اور اگر کسی فقرہ پر اعتراض ہوتا ہے تو اس کو نکال دیتا ہوں ورنہ دوسرا خط لکھ دیتا ہوں، اس میں کیا دشواری ہے۔

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے،

انشاء اللہ اس جنگ کا خاتمہ بالخیر ہوگا، اور ہم سب اطمینان کے ساتھ حضور کی قدم بوسی کریں گے یہ زمانہ پرُ آشوب زیادہ دنوں رہتا نہیں معلوم ہوتا:۔

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے، (غالب)

حضور دعا میں ہم کو ہرگز نہ بھولیں، ہم لوگ صبر و شکر کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، مگر خدا کے طالب ہیں خدا صراط مستقیم پر آخر دم تک قائم رکھے قرآن پاک میں صبر کی میرے خیال میں سب سے زیادہ تعلیم دی گئی، نمازیں پڑھو اور صبر سے کام لو، تمام ایسے اموریں جن میں ہم صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے ہم خاموش رہ کر گناہ سے بچتے ہیں، مولانا اکبر حسین صاحب نے اپنا نیا دیوان ہم کو بھیج دیا تھا، اس میں بعض اوقات تو وہ گوہر اور نکتہ موجود ہیں جن سے دل شاد ہو جاتا ہے، کیا خوب اور سچ لکھا ہے:۔

ہر عمل تیرا ہے اکبر تابعِ عزمِ حریف،
جب یہ موقع ہو تو بھائی کچھ نہ کرنا چاہیئے،

ہم لوگ سب بخیریت ہیں، محمد علی کے پاؤں میں خراش ہوگئی تھی جس کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے منع کر دئے گئے ہیں، ذیابیطس والے کے لئے زخم برا ہوتا ہے، وہ اب اچھا ہوگیا ہے، انشاء اللہ کل یا پرسوں یہ چلنے پھرنے لگیں گے، اُن کے گھر میں اور بچے حضور کو اور گھر میں سب کو آداب کہتے ہیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

یہ وقت استقلال کا ہے

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۰ مئی ۱۷ء، (۳۶) اللہ اکبر

جو خدا کا حکم ہے خوب ہے، مجھے تو بہ کرنے میں عذر کیا
مگر ایک بات ہے واعظا، کہ بہار اب تو قریب ہے اکبرؔ

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا تار ملا تھا، جواب سے حضور کو خیریت معلوم ہوگئی ہوگی، اسی عرصہ میں میرا مفصل خط جناب مولانا سلامت اللہ

صاحب کو ملا ہوگا، اس سے مزید حالات معلوم ہو گئے حضور کے پوسٹ کارڈ سے سہولوں اور علالت طبع کا حال معلوم ہوا تھا، مگر دو ہی دن کے بعد مولانا سلامت اللہ صاحب کے خط سے اطلاع ملی کہ حضور اجمیر شریف تشریف لے گئے تھے، امید ہے کہ مع الخیر واپس تشریف لے آئے ہوں گے، ایک عزیز دوست کے خط سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ واپسی میں حضور بمبئی بھی تشریف لے گئے تھے، خدا کرے سب بخیریت ہوں، کل اخبارات میں یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ اجمیر شریف کے موقع پر مولانا سلامت اللہ صاحب کا وعظ ہوگا، مجھ کو کبھی سننے کا اتفاق نہیں ہوا، مگر اندازہ کرتا ہوں کہ جس وقت وہ مرد خدا جوش میں آکر فرمائیں گے تو بیان ضرور پُرلطف ہوگا، اور پُر اثر، خدا کرے ہم کو بھی سننے کا موقع جلد ملے، حضور اب مفصل حال اپنی طبیعت کا تحریر فرمائیں، تاکہ اطمینان ہو، میرے خیال میں تو حضور احسان بھائی کو ولایت سے بلالیں اگر جہاز مل جائے، وہاں اس وقت رہنا مناسب نہ تھا، ایک طوفان برپا ہے، گیہوں کے ساتھ غریب گھن بھی پس جائے گا، یہ وقت ایسا نہ تھا، کہ وطن چھوڑ کر باہر جاتے، مگر ان پر تو یورپ کا بھوت سوار تھا، حضور کی دعا تھی کہ جاتے میں بچ گئے، ورنہ موت میں کیا باقی رہا تھا، خدا اپنا فضل کرے، حضور، یہ وقت استقلال کا ہے اور صبر کا، ہم لوگوں کو خدا کی رحمت پر بھروسہ کرنا چاہیئے، وہ معاملات جو ہم کو تشویش میں ڈالتے ہیں، ان پر صبر کرنا چاہیئے اکبر نے کیا خوب فرمایا ہے :-

> ہر عمل تیرا ہے اکبر تابع عزم شریف
>
> جب یہ موقع ہو تو بھائی کچھ نہ کرنا چاہیئے،

میرا تو اس پر عمل ہے، جو معاملات ایسے ہوں کہ جن کی نسبت ہم کو صاف صاف اور سچے حالات معلوم نہ تھے ہم کوئی رائے قائم نہیں کرتے، اب تو بس یہی دعا ہے کہ خدا اس جنگ کا جلد خاتمہ بالخیر کرے تاکہ ہم لوگ زیارت بیت اللہ شریف اور روضہ اطہر کر سکیں، ممکن ہے کہ اس وقت مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ تک ریل بھی تیار ہو جائے، اور ہم سب اطمینان اور آسانی کے ساتھ سفر کریں، اگرچہ وہاں کی تکالیف یہاں کی .. آسائشوں سے زیادہ ہم کو عزیز ہیں، خدا سے دعا ہے کہ آپس کے نفاق اور قضیئے بھی سب طے ہو جائیں گے، اور حرم محترم واقعی حرم محترم ہوگا، اور کفر اور شرک کی نجاست سے پاک، حماد علی خود حضور کو مفصل لکھیں گے، ۸ یا ۱۰ دن سے حمیدہ کی بیماری سے پریشان ہے، اُس کو پانوں سرد ہو کر جاڑہ آجاتا ہے، اور اب تک افاقہ نہیں ہے، اگرچہ بخار کم ہے، سول سرجن کا علاج ہے جو اب ایک ہمارے ہم قوم بنگالی ہیں، اول کا انگریز ڈاکٹر بھی بہت بھلا آدمی تھا، اور ابتداء سے ہمارے ساتھ شریفانہ برتاؤ تھا، والدہ صاحبہ ابھی رامپور سے واپس نہیں آئی ہیں، فروخت جائداد کا کاغذ ابھی نہیں ہوا، ۲۰ ہزار کی قیمتی جائداد علیحدہ کر دی ہے، تاکہ موجودہ نزخشوں سے نجات ملے، واپسی میں لکھنؤ ضرور قیام فرمائیں گی، زاہد علی مع اپنے دونوں بھائیوں شاہد اور عابد کے آج یا کل تک آئے گا، وہ بھی غالباً لکھنؤ ٹھہرے، اب انٹرنس میں آگیا ہے، میری خواہش تھی کہ وہ حضور میں حاضر ہوتا، یہ زمانہ بھی انشاء اللہ جلد گزرنے والا ہے،

حضور نے صبر و استقلال کو اول دن سے نصیحت فرمائی ہے، اس پر ہمارا عمل ہے، بغیر تکالیف کے کوئی امر حسب خواہش نہیں ہوتا ہے، :-

جلوۂ حسن کچھ آسان نہیں لئے دیدۂ شوق،
جور کا ذکر بھی ہے، حشر کی تمہید کے بعد،

بغداد شریف سے ۵ یا ۶ روز ہوئے کہ ایک خط ہمارے دونوں کے نام آیا تھا، لکھنے والے دونقیب زادہ سید سیف الدین گیلانی، تھے، معمولی دریافت خیریت تھی، اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کو ہمارا بھی سلسلہ قادریہ میں بحیثیت غلام کے داخل ہونے کا علم تھا، حضور مزید حالات سے مطلع فرمائیے گا، اس وقت وہ خط ملتا نہیں ہے، بعد کو بھیج دوں گا، محمد علی کے گھر میں اور تمام بچے درست بستہ سلام کہتے ہیں، موسم نہایت خوشگوار ہے، غیر معمولی بارش سے اندیشہ قحط و گرانی ہوتا ہے، خدا محفوظ رکھے۔

حضور کا خادم شوکت علی متعد خادم الخدام کعبہ،

حسرت کی ایک غزل

(۳۷)

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۸ رمئی ۱۷ء، اللہ اکبر

کچھ دامن کی خبر ہے نہ گریباں کا ہوش،
دل و دین کا تیرے عاشق کو نہ ہے جان کا ہوش، (حسرت)

حضور والا، السلام علیکم،

پرسوں تار ملا تھا، اور کل خربوزے اور آج خط، اس نے فضل کیا، بارش نے موسم کو ضرور خنک کر دیا، مگر بیماری اور خاص کر بخار میں زیادتی کر دی؛ اور غریب خربوزوں کا تو سنڈیا ناس کر دیا، کل محمد کاٹنے بیٹھے، اور جس کو کاٹتے تھے، علیحدہ رکھتے جاتے تھے۔ مقام عبرت تھا کہ لکھنؤ کے چنیدہ خربوزے اور اس قدر پھیکے، کہ اگر محمد بھی ان کو کھا لیتا تو شکر میں اضافہ نہ ہوتا، حضور کی یادآوری کا شکریہ ادا کرنا تو گستاخی ہوگا، اس لئے زیادہ نہیں لکھتا، حضور کے خط کی پشت پر مولانا سلامت اللہ صاحب کے لکھے ہوئے چند الفاظ تھے، ان سے گونہ تشویش اور صدمہ ہوا، خدا حضور کو جلد تر تندرست فرما دے، تبدیل آب و ہوا کے لئے چھندواڑہ مناسب مقام ہوگا، کیونکہ یہاں گرمی بہت کم ہوتی ہے اور بارش کے بعد تو موسم نہایت خوشگوار ہو جاتا ہے، کبھی پہاڑ پر جانے کی ضرورت نہیں ہوتی، چند ہفتوں کا قیام انشاء اللہ بہتری صحت کا باعث ہوگا، ہر طرف چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں، اور جنگل، انسان ہر وقت تفریح اور ورزش کے لئے باہر جا سکتا ہے، حضور خون کا ملاحظہ ڈاکٹر انصاری یا سعید الظفرخاں

صاحب سے فرمالیں کیونکہ ہمیشہ سے وہ تکلیف[1] دیتا ہے، کل میں حسرت کا دیوان پڑھ رہا تھا جو اُن کی بہادر اور بیوی، بہن نشاط بیگم نے مجھ کو بھیجا تھا، تمام کلام مرصع ہے، مگر ایک غزل کو پڑھ کر دل بھر آیا، اور قلب پر عجیب اثر ہوا، میرا ارادہ تھا کہ حضور کو وہ بھیجتا مگر وہ تو عزیزی مولانا صبغۃ اللہ صاحب کے رسالے میں شائع ہو چکی ہیں، مرصع ہیں، مطلع فقط لکھتا ہوں:-

دستگیری کا طلب گار ہوں شیئاً للّٰہ
میر بغداد میں ناچار ہوں شیئاً للّٰہ،
حال دل شرم سے ابتک نہ کہا تھا لیکن
آج میں درپئے اظہار ہوں شیئاً للّٰہ
غوث اعظم سے جو مانگو گے ملیگا حسرت
بس کہو حاضر دربار ہوں شیئاً للّٰہ،

پوری غزل مرصّع ہے، حضور کا خط صداقت میں دیکھا، الناظر نہیں دیکھا ہے، مگر کل ولایت کے انگریزی خط سے معلوم ہوا کہ محمدؐ کا پرائیویٹ خط جو اُنھوں نے راجہ صاحب محمود آباد کو مسلم یونیورسٹی کے بارے میں لکھا تھا، اُس کو حاصل کرکے شائع کر دیا گیا، جو نا جائز تھا، حضور کو علم ہے کہ میں مسئلہ یونیورسٹی کو اس وقت قابل توجہ نہیں سمجھتا، جب وقت آئے گا، اس ضروری مرحلہ کو طے کرلیں گے، مگر محمدؐ کو اُس کی نسبت نہایت درجہ قلق ہے اس وجہ سے کہ ہماری کمزوریوں سے تمام مسلمان کہیں بددل نہ ہو جائیں، وہ اپنے دلی جذبات کو ضبط کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے، حضور دعا فرمائیں، حضور والا کے خطوط میں یاس کی بُو آتی ہے، حضور یہ وقت یاس کا نہیں، انشاء اللہ تمام تکالیف اور پریشانیاں جلد تر دور ہو جائیں گی، حضور بس دعا فرمائے جائیں، خدا ہمارا مددگار ہے، انشاء اللہ یقینی بہتری اور برتری ہوگی، باران رحمت اس وقت ہوتا ہے جب کہ گرمی کی شدت سے مخلوق خدا پریشان ہو جاتی ہے، خدائے برتر سے بس یہ دعا ہے کہ ہم ناکاروں سے بھی کچھ کام لے لے،

حضور کا خادم شوکت علی،

---

[1] حضرت رحمۃ اللہ علیہ کو احتراق خون کی شدید تکلیف تھی،

یہ بھی دِن کٹ جائیں گے دو چار دن کی بات ہے

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ار جولائی ۱۹۱۷ء، (۳۸) اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

خدا آپ کو زندہ اور سلامت رکھے، تاکہ حضور کے ذریعہ سے ہم لوگ بھی کچھ خدمت دین کرسکیں، والدہ صاحبہ تشریف لے آئیں، اور اُن سے حضور کی صحت مزاج اور دیگر حالات اور پریشانیوں کی اطلاع ہوئی انشاء اللہ یہ دن جلد تر خواب پریشان کی طرح گذر جائیں گے، اور ہم سب پھر اطمینان اور جوش کے ساتھ اشاعت کلمہ حق میں کوشاں ہونگے، اور دنیا کو اسلام کے نور سے منور کردیں گے، برادرم الطاف کو ہمارا پیار کہہ دیجئے گا، اُن کی پریشانیوں سے رنج ہوا، خانگی امورات میں آج کل بدمزگی ہونا نہایت درجہ تکلیف دہ تھا، خدا اپنا فضل کرے، ... کی نسبت مجھ کو اول بھی شبہہ ہوا تھا کیونکہ علی گڑھ میں ایک آدھ مرتبہ مَیں نے ایسا کچھ سُنا تھا، جس سے اُن کی نسبت مجھ کو حسن ظن نہ تھا، اگرچہ ایک دوست اُن کے مداح تھے اب حال معلوم ہوگیا کہ میرا خیال صحیح تھا، خدا اُن کو راہ راست پر لائے، حضور والا، ان پریشانیوں سے زیادہ صدمہ نہ اُٹھائیں، ہر بڑے خاندان میں بعض اوقات ایسے معاملات پیش آتے ہیں، خدا حضور کو جلد تر درست فرمادے، نقصان مایہ کوئی بڑی حیثیت نہیں رکھتا مگر ہاں قلبی تکلیف ضرور پریشان کن ہوتی ہے، مگر آج کل اس پر بھی کچھ زیادہ تعجب نہ کرنا چاہیئے، خدا یہ دن بھی جلد گذار دیگا،:-

رنج و غم گھٹ جائینگے دو چار دن کی بات ہے

یہ بھی دن کٹ جائیں گے دو چار دن کی بات ہے

اور معاملات خوش کن ہیں، ہم تو خدائے برتر پر بھروسہ کئے بیٹھے ہیں، اور خوش ہیں، وہ ضرور ہماری سنے گا، اپنے لئے تو نہ عزت کی خواہش ہے، اور نہ ذلت سے ڈر ہے، ہم سے لاکھوں قربان ہوجائیں مگر خدا دین کا بول بالا کرے، اور وہ انشاء اللہ ضرور ہوگا، میں ہرگز نا امید نہیں ہوں، ہمارے خانگی معاملات کا حال حضور کو والدہ صاحبہ سے معلوم ہوا ہوگا، بہر حال میں خوش ہوں اور درست، حضور کی بدولت ایسا کام نصیب ہوگیا ہے، کہ ہر وقت قلب میں خوشی رہتی ہے، اور طاقت، صداقت میں کل ایک غزل حضرت تپش کی خوب نکلی ہے، دل جلے ہیں، ہمارے علی گڑھ کے اولڈبوائے ہیں،:-

ذرا آنے تو دو مجنوں کو زنداں سے بیاباں میں

چھپی بیٹھی رہے گی لیلے، ہم بھی دیکھیں گے،

ہوئی تھی بے خودی حائل وہاں اک دشت پیما کو

چل اے جوش جنوں، صحرائے سینا ہم بھی دیکھیں گے

مولانا سلامت اللہ صاحب کی شکایت بالکل درست تھی، محمدؐ نے اُن کو بڑا سا خط لکھا تھا، مگر وہ پاس نہ ہوسکا، میں انشاء اللہ کل ضرور لکھوں گا، انشاء اللہ اس سال بیراروئی کا کارخانہ یا تو کرایہ پر اُٹھ جائیگا یا عمدہ قیمت پر بک جائے گا، بہرحال ضرور نتائج اچھے نکلیں گے اگرچہ میری غیر حاضری وطن سے ضرور نقصان کا باعث ہوگی، اگست میں وہاں نظر بند ہونے یا رہا ہونے کی درخواست دونگا، تاکہ روئی کے موسم میں کام کرسکوں، نتیجہ خدا کے ہاتھ میں ہے، اگر نہ بھی ملی تو یہاں ہی سے انتظام کروں گا، اس سال تھوڑے روپیہ کی ضرورت ہوگی، تاکہ انجن جو مرمت طلب ہے، درست ہوجائے، انشاء اللہ روپیہ کا بھی انتظام ہوجائے گا، حمیارہ بانو کو بخار نہایت درجہ سخت ملیریا تھا، اب کمی ہے، مگر نہایت درجہ کمزور کر دیا ہے، حضور دعا فرمائیے، ممتاز میاں صاحب نے نہایت عمدہ طور پر بندش کرکے آم بھیجے تھے، جو اچھی حالت میں پہونچے، بالکل طیار تھے، کل اُن کو کھا کر بھیجنے والے کو دعائیں دیں، قطب میاں صاحب، مولوی عنایت اللہ صاحب، صبغت اللہ صاحب، بھائی الطاف سب کو سلام، خدا احسان کو جلد تر باصحت واپس لائے، اب تو حالت اور خراب ہوگئی، گھر تک یہ خبر پہونچ گئی ہے، بمبئی خطرہ میں ہے، خدا فضل کرے گا، والدہ صاحبہ سلام کہتی ہیں، اور سب بچے دعا کے طالب،

حضور کا خادم شوکت علی،

راجہ غلام حسین

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۱ر اگست ۱۸ئ، (۳۹) اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کی شکایت بالکل بجا تھی، کہ ہمارے خطوط دیر سے آتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ دو بڑے خط محمدؐ علی کے جو اس نے حضور کو لکھے تھے، اب تک لاپتہ ہیں، اور ان کا انتظار رہتا ہے، کہ آج پاس ہوکر آجائیں تو حضور کو روانہ کئے جائیں، بالکل خانگی اور پرائیویٹ امور پر تھے، کسی سیاسی مسئلہ سے تعلق نہ تھا، مگر خدا معلوم وہ کیوں سنسر نے ناگپور بھیج دیئے، ہم کو یہ بھی علم نہیں ہے کہ ناگپور گئے یا یہیں پر تھے، آج محمدؐ علی پرانے اور نئے دونوں سنسروں سے مل کر اُن کی نسبت فیصلہ کریں گے، اور اگر ضرورت ہوگی، تو چیف کمشنر کو تحریر بھیج کر واقعات سے اطلاع حاصل کریں گے، پرانے ڈپٹی کمشنر اور سنسر آج کل کسی وجہ سے معطل ہیں، یہ ۲۳ برس کی خدمت کے انگریز ہیں، ان کی جگہ ایک اور صاحب قائم مقام ہیں، جو اول ہماری اردو کی خط و کتابت کا ملاحظہ کرتے تھے، چونکہ نئے ہیں اس لئے احتیاط سے کام لیتے ہیں، جس کا اثر خط و کتابت میں تاخیر ہوتی ہے، حضور ہم کو قابل معافی تصور فرمائیں، جس وقت محمدؐ علی کے

دونوں خطوط حضور کو مل جائیں گے، تو حضور کو تمام حالات سے آگاہی ہو جائے گی، اور تشفی بھی، کل شام غلام حسین کے سانحہ کا حال سُن کر دل کو از حد صدمہ ہوا، ہم سب لوگ سب دست بدعا ہیں، خدا ہم بے کسوں کی ضرور سُنے گا، اور اُس غریب کو صحت عطا فرمائے گا، وہ مرد مسلمان ہے اور اُس کی زندگی میں عظیم الشان تبدیلی واقع ہو گئی ہے، اور آئندہ اور ہوگی، انشاء اللہ وہ اسلام کی بڑی خدمت کرے گا، خدا اپنا فضل کرے، ہم سب نے عجز و انکساری کے ساتھ دعا مانگی تھی، آج صبح ڈاکٹر انصاری کا تار آیا جس سے معلوم ہوا کہ حالت اب بہتر تھی، خدا صحت عطا فرمائے ہم سب لوگ تار کو پڑھ کر خوشی سے رونے لگے، اور نماز نفل شکرانہ ادا کی، حضور نے ضرور دعا فرمائی ہوگی، ہماری خاص خواہش ہے کہ حضور راسیہ غلام حسین پر توجہ فرمائیں، قلب مومن ہے، خدا اُس کو صحت کامل جلد عطا فرمائے، محمد علی کا تو ارادہ تھا کہ فوراً تار دے کر اجازت طلب کرے مگر میں نے منع کیا کیونکہ ہماری درخواست دس دن ہوئے کہ گورنمنٹ صوبہ اور عالیہ کو بھی گئی ہے، ہم نے درخواست کی ہے کہ اب ہم کو ۲ ماہ نظر بند ہوئے گذر گئے، ہم نے صبر کے ساتھ تمام قانونی ہدایات کی پابندی کی، یا تو گورنمنٹ ہم کو بالکل آزاد فرمائے، یا اگر یہ مصلحت کے خلاف تھا تو ہم کو اول ستمبر سے آخر فروری تک رام پور میں نظر بند کر دیا جائے، تاکہ ہم روئی کے کاروبار کو دیکھ سکیں، اور یہ بھی خلاف منشا تھا تو ہمارے تمام نقصانات کا بوجھ گورنمنٹ اُٹھائے، ۱۵ ہزار سالانہ محض سود کا دینا ہوتا ہے، وہ ادا کرے اب ہم میں برداشت کی گنجائش نہ تھی کیونکہ ہم ساری جائداد اپنی فروخت کر چکے ہیں، ہم کو امید قوی ہے کہ گورنمنٹ متوجہ ہوگی، اور ہماری معقول درخواست کو منظور کر کے ہم کو آزاد کر دے گی، جواب کی آج کل میں امید ہے، کیونکہ مرمت کارخانہ کا کام اول ستمبر سے ضرور شروع ہونا چاہیے، حضور دعا فرمائیں، کہ خدا گورنمنٹ کے مشیروں کو ہدایت نیک عطا کرے، تاکہ موجودہ دشواریاں دور ہوں، حضور دعا فرمائیں، والدہ صاحبہ اور تمام بچے حضور کو سلام کرتے ہیں، ہمارا دست بستہ سلام مولانا سلامت اللہ صاحب کو برادرم قطب میاں صاحب، عنایت اللہ صاحب، صبغۃ اللہ صاحب، الطاف، اور ممتاز میاں صاحب پیار اور سلام،

حضور کا خادم شوکت علی، معتمد خادم الخدام کعبہ،

برادرم الطاف کو ایک تحفہ بھیجا تھا، زاہد نے، غلام حسین صاحب کے تحفہ کے ساتھ، وہ یا کوئی اور "نیو ایرا"، کے دفتر جا کر لے آئیں، خدا غلام حسین[۱] صاحب پر اپنا فضل کرے، شوکت

---

[۱] محمد علی کے چہیتے رفیق کار، کامریڈ کے سب ایڈیٹر، محمد علی کی نظر بندی کے بعد لکھنؤ سے "نیو ایرا" نکالا، خوب چلا، ایک حادثے کے شکار ہو کر اس جہان فانی سے گزر گئے، محمد علی نے مرثیہ کہا،

ابھی مرنا نہ تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جئے ہوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے — ہم غریبوں سے بھی لئے ہوتے

مسٹر جناح کی خط و کتابت

(۴۰)

چھند واڑہ ۱۳؍اکتوبر ۱۹۱۷ء،

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا، (غالب)

حضور والا، السلام علیکم،

محمد علی کے گھر میں غالبؔ لکھنؤ راستہ میں اُتری ہوں گی اور معظم بھی، ہماری خیریت حضور کو مل گئی ہو گی میں اس عرصہ میں بنگلہ کی مرمت وغیرہ میں لگا ہوا تھا، اس وجہ سے حضور کو نہ لکھ سکا، علاوہ ازیں مہمان آئے ہوئے تھے اور اُن کی موجودگی خطوط نویسی میں حارج ہوئی مجھ کو احباب سے معلوم ہوا کہ میرے کسی خط کی خاص طور پر شکایت کی جاتی ہے کہ جو میں نے حال میں حضور کی خدمت والا میں لکھا تھا حضور کو علم ہے اور حضور اس کی گواہی دے سکتے ہیں کہ میری عادت سخت خطوط لکھنے کی کبھی نہ تھی، طرح طرح کی افواہیں سُنی ہیں جن سے بعض اوقات ہنسی آتی ہے مجھ کو امید تھی کہ قبل اس کے کہ کوئی کارروائی کی جاتی ہم سے دریافت حال تو کر لیا گیا ہوتا اور یہ کہ آیا وہ خط ہمارا تھا یا کسی حضرت کی شرارت تھی میں نے اس معاملہ کا تذکرہ حضور سے بھی صرف اس غرض سے کیا کہ میرے نام کے ساتھ حضور والا کا نام بھی لگا ہوا تھا، ہم نے مسٹر جناح کو لکھا ہے کہ وہ برائے مہربانی اس خط کی نقل ہم کو بھجوا دیں بہتر تو اصل ہوتا یا اس کی عکسی تصویر۔ یہاں بفضلہ تعالیٰ خیریت ہے اور ہم سب لوگ تندرست ہیں ہاں محمد علی کی شکر میں زیادتی ہے حال کی کشمکش اُن کے لئے سخت خراب تھی خاص کر حمیدہ بانو[1] کی بیماری کے بعد۔ انشاء اللہ علاج اور پرہیز سے فائدہ ہو گا، والدہ صاحبہ کو جاڑہ آ گیا تھا مگر خدا نے اُن کو دو دن کے بعد ہی صحت دے دی حضور سے قدمبوسی کو از حد دل چاہتا ہے، مگر راجہ صاحب جہانگیر آباد کے پھر مخل ہونے کا اندیشہ ہے، انشاء اللہ جلد لکھنؤ حاضر ہو کر ہی اطمینان سے ملیں گے۔ مولانا سلامت اللہ صاحب کا خط آیا خدا اُن کی زندہ دلی کو سلامت رکھے اب کی مرتبہ مرغ کے جنم سے بدل کر جنگل کے ہاتھی ہو گئے تھے۔ اور الٰہی اور اُن کی ہیئت کذائی کے بعد یہ ادا پسند آئی تھی۔ میں الزام سے بالکل بری ہوں۔ زیادہ غصہ سے نہ تھا۔ موسم یکساں رہتا ہے۔

نہ ستم کا کبھی شکوہ نہ کرم کی خواہش
دیکھ تو ہم بھی ہیں کیا صبر و قناعت والے

والدہ صاحبہ حضور کو اور گھر میں سب کو سلام و دعا کہتی ہیں۔ بچے اور محمد حضور کو سلام عرض کرتے ہیں،

---

[1] مولانا محمد علی کی صاحبزادی جو اندنوں مدقوق تھیں،

اور سب دعا کے طالب ہیں، میرا سلام اور پیار، مولانا سلامت اللہ صاحب، بھائی الطاف، ممتاز میاں صاحب، مفتی صاحب، قطب میاں صاحب تک حضور پہونچا دیں۔

حضور کا خادم شوکت علی،

بی امّاں

(۱۴)

چھندواڑہ ۲۰ نومبر ۱۹۱۸ء،

حضور والا، السلام علیکم،

عرصہ سے حضور والا کی خیریت مزاج نہیں معلوم ہوئی، خدائے برتر سے امید ہے کہ حضور مع تمام اعزا کے بخیر وخوبی ہوں گے، اخبارات سے مصروفیت کا حال معلوم ہوا تھا، اور ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان تمام امور میں وقت کس قدر صرف ہوتا ہے۔ پرسوں ہمارے سنسر نے ہم کو مطلع کیا تھا کہ مولانا عنایت اللہ صاحب کو دوبارہ ہمارے پاس آنے کی اجازت دی گئی ہے، مگر ابھی یہ نہیں معلوم ہے کہ وہ کب تک آئیں گے اُن کو تاریخ روانگی کے لئے لکھا گیا ہے خدا کرے جلد تشریف لائیں، غریب محمد علی کو ۵ روز سے جاڑا بخار آنا شروع ہو گیا ہے، تین باریاں زور کی آئیں آج ناغہ ہوا ہے اور خدا سے امید ہے کہ اب وہ اس سے بناہ میں رہیں گے۔ پت اور بلغم زیادہ تھا جس نے زیادہ تکلیف دی، بہ گرین کونین دی گئی کان گنگ ہیں، کمزور ہو گئے ہیں، انشاء اللہ جلد تر صحت ہوگی، حضور دعا فرمائیں، یہاں کی آب وہوا اچھی ہے مگر بلغم زیادہ پیدا ہوتا ہے، مجھ کو بھی کچھ شکایت تھی مگر ہلکا سا مسہل لے کر میں تو بچ گیا۔ عزیزی سلطانہ بانو کو بھی جاڑا آنے لگا ہے اور آج بھی زور سے آیا خدا کا شکر ہے کہ والدہ صاحبہ اب اچھی ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اُن کی ہمت کے مقابلہ میں کسی بیماری کا ٹھہرنا دشوار معلوم ہوتا ہے رام پور کے خطوط سے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ حمیدہ بانو کو اب دس دن سے بخار نہیں آیا وہ مراد آباد میں معظم علی کے پاس تھی اب غالباً دہلی گئی ہوگی مع محمد علی کے گھر کے۔ اُن کی طبیعت بھی خراب ہے پھر قلب پر وہی پرانا دورہ پڑا تھا ان پریشانیوں کی وجہ سے محمد علی کی پریشانی بالکل بجا تھی، خیر یہ دن بھی جلد تر گزر جائیں گے، اور ہم سب پھر خوش وخرم یکجا رہیں گے، ہم اخبارات کو بہت شوق وغور سے پڑھتے ہیں، اس لئے تمام بیرونی اور اندرونی حالات سے آگاہی ملتی ہے، حضور خیریت مزاج سے مطلع فرماتے رہا کریں، حضور کی صحت کی طرف سے فکر ہے، اب تک افاقہ نہیں ہے، خدا صحت کامل عطا فرمائے۔ محمد علی حضور کو دست بستہ سلام عرض کرتے ہیں، اور طالب دعا ہیں۔

مولانا سلامت اللہ صاحب، مولانا عنایت اللہ صاحب، قطب میاں صاحب، مفتی صاحب، بھائی

الطاف، ممتاز میاں صاحب، صبغۃ اللہ صاحب، سب کو سلام اور پیار، مولانا عنایت اللہ صاحب کا انتظار ہے، ویسے سب خیریت ہے، ہم دونوں کی درخواست کہ سکرٹری ہند سے ہماری ملاقات ہو مسترد کر دی گئی، محمد علی کو ۲۶ کے ڈپوٹیشن میں جانا ہے مگر ابھی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے کہ اجازت ملے گی یا نہیں، غالباً نفی میں اس کا بھی جواب ہوگا پر لطف زمانہ ہے ہم لوگ اس گوشہ عافیت میں بیٹھے ہوئے دنیا کے دنگل کا تماشا دیکھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں، محمد علی کی صحت کی طرف سے ذرا پریشانی ہے،

حضور کا خادم شوکت علی،

خود اپنے ہاتھ سے پھر دست بستہ آداب عرض کرتا ہوں، محمد علی،

ذاتی حالات

اللہ اکبر (۴۲) چھندواڑہ (صوبہ متوسط)، ۲۰ دسمبر ۱۷ء،

ایسا بھی دے کے دل کوئی مجبور غم نہ ہو
یوں بھی نہ خانہ ہو کسی کے غرور کا (حسرت)

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا خط ملا تھا، اور اس کے بعد کا تار بھی، اجازت کے لئے ڈپٹی کمشنر کو لکھ دیا ہے اور انہوں نے ہم کو بھی بتایا کہ بالا بالا حضور کی تحریر بھی آئی تھی، جس دن اطلاع ملی فوراً تار دیا جائے گا، حضور کی قدمبوسی کا از حد اشتیاق ہے اور خدا جلد یہ عزت دے، حضور کے خط کا جواب دینے کو تھا مگر اس عرصہ میں اور ضروری امور پیش کرتا کہ اس کو لکھنا اطمینان کے وقت کے لئے ملتوی کیا، حضور دعا فرمائیں، انشاء اللہ... کارخانہ کی فروخت میں فائدہ ہوگا، اگرچہ اس کی قیمت اب دوگنی ہو گئی ہے، مگر مجبوری کو جس قدر مل جائے اچھا ہے، اتنا ضرور یقین ہے کہ تھوڑا بہت فائدہ ضرور ہوگا، اگر وہ ہمارے پاس رہتا تو ضرور بڑا فائدہ رہتا مگر موجودہ حالت میں اس کا سنبھالنا دشوار تھا، تمام اعزہ خود اپنی زمینداری کی افکار میں تھے، اور فضول کام کا بوجھ ڈالنا جب کہ کام کی فرصت نہ تھی، عقلمندی نہ تھا۔ انسان اُس وقت بوجھ اٹھائے جب طاقت ہو، انشاء اللہ میں خود آزاد ہو کر سب کی مدد کروں گا، اور چند سالوں میں خود دوسرا کارخانہ بنالوں گا، اب جس کے ہاتھ فروخت کرتا ہوں، اگرچہ بالکل مسلمان نہیں ہے، مگر خوجے ہیں، اور وہ بھی آغاخانی نہیں، اس لئے امید پڑتی ہے کہ آئندہ ان کو صراط مستقیم پر لایا جا سکے گا، خیر جو کچھ نتیجہ ہو، موجودہ قرضہ کے بوجھ سے سبکدوشی لازم ہے، کیونکہ سود دینے کی اب تاب نہیں ہے، دین اور دنیا دونوں کا خسارہ ہے، کارخانہ کے بیع کے بعد انشاء اللہ سب ادا کر کے اتنا بچ جائے گا کہ بچے تعلیم اور پرورش

پا جائیں گے، اور میں قرضے سے آزاد ہو کر حج بیت اللہ شریف سے سبکدوش ہوں گا، اور دل کھول کر خدمت دین اطمینان قلب کے ساتھ کروں گا، حضور بھی دعا فرمائیں، ابھی کوئی بات پختہ نہیں ہوئی ہے، مولوی عنایت اللہ صاحب کو مفصل حالات معلوم ہیں، اور انہوں حضور سے میرا پیام کہہ دیا ہوگا، اب اطمینان سے سب عرض کرونگا، جب قدم بوسی ہوگی، والدہ صاحبہ رام پور گئیں، عزیزی خورشید کی علالت میں اضافہ ہے، حضور سے غالباً ملی ہوں گی، دنیا میں اب کسی کے قول کا اعتبار نہ رہا اور دل میں اب مصمم ارادہ ہے کہ صرف ذات باری تعالےٰ پر بھروسہ کیا جائے اور اس کے بعد اپنی قوت بازو پر، ہم لوگ صبر اور صلوٰۃ سے کام لیتے ہیں، حضور بھی ضبط فرمائیں، خدا ہماری سنتا ہے، اور گڑگڑا گڑگڑا کر دعائیں مانگیں گے، کہ خدا ایمان پر قائم رکھے اور آزمائش کے وقت مضبوط رکھے، حسرت موہانی خوب لکھتا ہے، خدا اس کو اجر دے، :-

ایمان و اتقا ہی نہیں شان اولیاء،
بےخزن و خوف غیر بھی ہے جان اولیاء

محمد سلام عرض کرتے ہیں، حضور کا خادم شوکت علی،

"لیڈر" کے دو مضمون،

(۴۳)

چھندواڑہ ۲۲ جنوری ۱۹۱۸ء،

حضور والا، السلام علیکم،

اس عرصہ میں خاموش رہا جس کی معافی کا خواستگار ہوں، بیکار نہ تھا۔ اس ماہ مبارک میں ۱۴ مولود شریف ہوئے اور سب میں شریک ہوا اور کچھ بیان بھی کیا، اور نظمیں بھی سنائیں، محمد نے حسب معمول نہایت فصاحت کے ساتھ ان صحبتوں میں تمام حالات اس پاک زندگی کے فرمائے جس سے ہماری عزت اور نجات تھی، آخر میں غزوات کا حال ناتمام رہا کیونکہ ان کو زکام کی وجہ سے ۲ دن بخار رہا تھا، اب تندرست ہیں۔

اخبارات سے حالات معلوم ہوتے ہیں "لیڈر" نے حال میں دو مضمون نقل کئے ہیں جس سے معلوم ہوا تھا کہ عجیب و غریب حالات دنیا میں پیش آنے والے تھے۔ خوب پر لطف شرائط تھیں، حضور نے ملاحظہ فرمائے ہوں گے۔ میں بھیجدونگا۔ افسوس کہ حضور کے ملنے کی اجازت نہیں ملی، ہم نے دوبارہ لکھا ہے اور سختی کے ساتھ دریافت کیا ہے، کہ کیوں ہم کو اجازت نہیں ملی، کہ ہم حضور کی قدم بوسی کرسکتے۔ خدا معلوم کیا خوف اور وجہ ہے کہ فضول روکا جاتا ہے، میں نے اخبارات میں حضور کا گشتی خط پڑھا، جمعیۃ کا احیا ضروری تھا، مگر میں جمعیت کے روپیہ سے کسی قسم کی امداد قبول نہیں کروں گا۔ ہاں جب ضرورت ہوگی نہایت خوشی کے ساتھ اپنے تمام اعزا اور احباب اور خدام کعبہ سے روپیہ طلب کرلوں گا۔ اور اس کو استعمال کروں گا،

فی الحال امید ہے کہ گورنمنٹ کو مجبوراً ہمارے الاونس میں اضافہ کرنا ہوگا، ہمارے بچے اب بڑھ گئے ہیں اور تین۔۔ لڑکوں کو علی گڑھ امسال پہونچنا ہوگا، جس کے معنی یہ ہیں کہ مصارف میں (۱۵۰) ایک سو پچاس ماہوار کا اضافہ ہوگا امید ہے کہ گورنمنٹ ہمارا الاونس ۵۰۰ ماہوار کا کردے گی، میرے کارخانہ کے نقصانات ۵۴ ہزار ادا کرنے سے اب تک گورنمنٹ انکاری ہے، اب شیران قانون کو تمام کاغذات بھیجتا ہوں، حضور دعا فرمائیں، والدہ صاحبہ بخیریت پہونچ گئیں، باوجود تکان وغیرہ کے اُن کے قلب میں طاقت معلوم ہوتی ہے اور خوش ہیں۔

میرا سلام برادرم الطاف الرحمٰن، مولانا سلامت اللہ مولوی عنایت اللہ صاحب، قطب میاں صاحب، ممتاز میاں صاحب اور دیگر احباب کو عرض کردیجئے گا شعیب[۱] یہاں آئے تھے وہ نیوپیپر کے کام میں مدد دینگے اُن کو اور کام بھی تھا، حضور کی امداد نہیں کرسکیں گے، مسجد کا پرانا سامان بیکار فروخت کرکے اس کا روپیہ وصول کیا جاسکتا ہے؟ اور اس کو مسجد میں لگایا جائے،

حضور کا خادم شوکت علی،

[۱] شعیب قریشی مشہور خادم خلافت جو بعد کو گاندھی جی کے اخبار ینگ (انڈیا) کے ایڈیٹر ہوئے اور اُن کو مولانا محمد علی کی چھوٹی صاحبزادی گلنار بیگم بیاہی گئیں۔ قیام پاکستان کے بعد کراچی گئے، روس میں پاکستان کے سفیر بن کر گئے دہلی میں پاکستان کے ہائی کمشنر رہے پھر وزیر اطلاعات ہوئے منصب سے فائز رہ کر کچھ عرصہ ہوا انتقال فرما گئے۔

خوددار قیدی

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۲ر فروری ۱۸ء (۴۴) اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ ملا تھا، اس سے قدرے تشویش ہوئی تھی، ادھر کو صحت خراب اور اُدھر طرح طرح کے روزمرہ نئے زخم، خدا حضور کو صبر و استقلال فرمائے جس کے ہم اب مستحق ہیں، یہ زمانہ ابتلاء انشاء اللہ جلد گزر جائے گا، اور پھر ہم ساتھ ساتھ حج بیت اللہ شریف کے لئے جائیں گے، حضور تو ایک مرتبہ زیارت فرما چکے ہیں اس لئے بغیر ساتھ ہوئے ہم لوگ جانے نہیں دیں گے، اُس وقت انشاء اللہ تمام طرف امن و امان ہوگی، اور ہم لوگ اطمینان قلب کے ساتھ اپنے فرائض سے سبکدوش ہوں گے، میں نے حمام میں حضور کا خط پڑھا خدا حضور کو زندہ اور سلامت رکھے، تاکہ تقویت دین ہو اور ہدایت کا سامان ہو میں ممنون ہوا کہ حضور نے میری خواہشات کا اظہار فرما دیا تھا، اپنے احباب اور برادران خدام کعبہ سے خانگی امداد طلب کرنے میں ہم کو ذرہ باک نہ ہوگا، اور انشاء اللہ تھوڑا تھوڑا کرکے بڑی رقم فراہم ہوجائے گی، فی الحال ہم کو امید ہے کہ جائز مطالبات پر گورنمنٹ ہند توجہ کرے گی، کلکتہ کے احباب سے لکھ

کہ ہم نے ۵ روپیہ ماہوار ہر ایک کا مقرر کرا لیا ہے، تاکہ شرکت ہو جائے، اور ہمارا حق خراج قائم رہے، ۵ روپیہ کا منی آرڈر فوراً بھیجدیا گیا اور اس کے علاوہ کمیٹی اعانت نظر بندان نے ۵۰؎ ماہوار کا منی آرڈر اور بھیجدیا، جس کا مطلب میں اول نہ سمجھا مگر بعد کو خط سے معلوم ہوا کہ یہ میرے بچوں کی تعلیم کے لئے تھا، اس قدر توجہ اور محبت کا دل پر اثر ہوا اور یقین ہو گیا کہ نظر بندان اسلام اور ان کے اہل و عیال کے ساتھ فراخ حوصلگی سے کام لیا جائے گا، اس کا اثر خود ہم سب پر اور تمام دنیا پر پڑے گا، خود سب کو اور توفیق خدمت دین دے یہ ۵۰؎ ماہوار میں واپس کر رہا ہوں، کیوں کہ ان کی فی الحال ضرورت نہیں، امید ہے کہ گورنمنٹ جلد تر ہمارے الاونس کو ۳۰۰ روپیہ ماہوار سے بڑھا کر ۵۰۰ ماہوار ہر ایک کا کر دے گی، ہاں کارخانہ کے نقصانات کی ادائیگی سے اب تک انکار ہے مگر کل میں نے دوسرا اور صاف صاف خط لکھا ہے، جس پر امید ہے کہ توجہ کی جائے گی، یہ بھی عجیب تماشہ ہے کہ میرے روئی کے کارخانہ کی قیمت بھی اس عرصہ میں دوگنی ہو گئی ہے، میری کاٹن مل ضرور کامیاب ہوگی، ایک سال کی محنت میں تمام نقصانات کی تلافی ہو جائے گی، انشاء اللہ تعالےٰ میں اس سے ہرگز مایوس نہیں ہوں، امسال روئی کا بھاؤ نہایت عمدہ اور بڑا تیز ہے، جو چیز معمولاً ۲½ سو کو ملتی تھی، اس کی قیمت اب ۶۰۰ کے قریب ہے، اور مانگ بھی زائد، اس لئے صرف باری تعالےٰ کے حکم کی دیر ہے، آزاد ہو کر ایک سال میں انشاء اللہ کافی کما لیں گے، خدا حضور کو صحت کامل عطا فرمائے، مولانا سلامت اللہ صاحب کو ہمارا اسلام مسنون پہونچا دیں، اور کارخانہ کے متعلق اطلاع فرما دیجئے گا، انہوں نے ہمیشہ سے دلچسپی اس کے معاملات میں لی ہے، یہ ہماری قسمت تھی کہ ہم لوگ نظر بند ہو گئے، اور اس تین سال میں برابر نقصانات ہوئے، خیر خدا مالک ہے، حضور دعا فرمائیں، انشاء اللہ جلد خدمت والا میں حاضر ہو کر قدم بوسی کریں گے، حضور کو کیوں یہاں تشریف لانے کی اجازت نہیں ملی، اس کا جواب ہماری سمجھ سے باہر ہے، ہم لوگ مجبور ہیں، اور جہاں تک ممکن ہوگا، تمام ایسے معاملات میں احکام کی پابندی کریں گے، مسجد کی تعمیر نہایت سرعت سے جاری ہے، انشاء اللہ قبل برسات ختم ہو جائے گی، ایک شرعی مسئلہ کی نسبت حضور کو غالباً لکھا گیا تھا، اس مسجد کے اوپر کہیں مل تھی، اس کے کپڑے اور لکڑی فروخت کر دی گئی تھی، اور اس کا روپیہ مسجد میں لگایا جاتا تھا، مگر بعد کو شبہ ہو جانے سے معاملہ کو ملتوی کر دیا ہے، بظاہر تو درست معلوم ہوتا ہے، کہ مسجد کے سامان کا روپیہ اگر مسجد میں ہی لگایا جائے تو خلاف حکم نہ ہوگا، ورنہ اس کا کیا مصرف ہوگا، پڑے پڑے ضائع ہوگا، حضور مطلع فرمائیں، والدہ صاحبہ اور محمد علی کے گھر میں زکام اور بخار میں مبتلا تھیں مگر اب افاقہ ہے، والدہ صاحبہ کو اب بھی کچھ باقی ہے، محمد علی کو رات کو بخار آ گیا تھا، خفیف تھا، اُن کی صحت بظاہر درست ہے، مگر اب وہ طاقت نہیں ہے، جو اول تھی، اور اور زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی، یہ منحوس بیماری اندر اندر جسم اور صحت کو کھوکھلا کرتی ہے، علی گڑھ کے

معاملات میں کامیابی ہوئی، ان مفسدوں اور منافقوں کا ایسا تدارک کیا جائے کہ آئندہ ہمت نہ پڑے کہ خواہ مخواہ مسلمانوں میں نفاق ڈلوائیں، والدہ صاحبہ حضور کو سلام کہتی ہیں، اور قطب میاں صاحب اور تمام گھر کو پیار اور بچے دست بستہ آداب عرض کرتے ہیں، امین صاحب اور اسداللہ خاں صاحب معقول آدمی ہیں، اور حضور ان کو دوبارہ بلوائیں،

حضور کا خادم شوکت علی،

زیارت بیت اللہ کی حسرت

اللہ اکبر (۴۵) پھنار واڑہ (صوبہ متوسط) ۲۳/۲۴ فروری ۱۹۱۵ء

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ ملا، حالات سے آگاہی ہوئی، حضور نے بالکل درست فرمایا ہے، جو تعلقات کہ ہماری خوش قسمتی سے حضور اور ہمارے درمیان قائم ہو گئے ہیں، اُن کے لئے جسمانی ملاقات کی ضرورت نہیں ہے انشاءاللہ نہ ملنے پر بھی وہ رشتہ اور مضبوط ہوتا جائے گا، جس قدر ہمارے ایمانوں میں پختگی آتی جائے گی، اُسی قدر ہمارا تقرب حضور سے اور ہوتا جائے گا، تاہم اگر قدم بوسی ہوتی جاتی تو کسی کا کچھ نقصان نہ تھا خیر اس میں بھی خدا کی طرف سے کچھ بہتری ہوگی، ہم تو ہر حال میں راضی برضا ہیں، حسب حکم شرع شریف مسجد کا ملبہ فروخت کر دیا گیا ہے، اور اُس کی قیمت صرف کی جاتی ہے، مسجد کا کام نہایت سرعت سے چل رہا ہے، انشاءاللہ قبل از برسات وہ تیار ہو جائے گی، کام مضبوط اور عمدہ بنتا ہے، اور انشاءاللہ مسجد نہایت خوبصورت اور شاندار ہوگی، اگرچہ چھوٹی سہی۔ یہاں کی حیثیت کے مطابق، حضور کی مسلسل بیماری کی وجہ سے فکر ہے، خدا حضور کو بالکل تندرست کر دے، دہلی ضرور جا کر حضور، حکیم اجمل خاں صاحب سے بھی رجوع فرمائیے، خدا نے اُن کے اور ڈاکٹر انصاری صاحب کے ہاتھ میں، شفا دی ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ حضور اس پر آشوب زمانہ میں حجاز مقدس نہ جا سکیں گے، یقیناً اس وقت مدینہ طیبہ ہی مقام امن رہ گیا ہے، جہاں قلب مومن تسکین پائے، خدا جلد تر بلاد اسلامیہ کو تمام حوادث سے محفوظ کر دے اور اس سے کفر کی گندگی اور نجاست دور ہو۔ انشاءاللہ بعد از اختتام جنگ یہاں کے کاموں سے فراغت حاصل کر کے زیارت بیت اللہ سے مستفید ہوں گا، تخمینا تو یہی ہے، اور اس کے بعد ایک لمبا سفر افریقہ، یمن، اور نجد وغیرہ کا یورپ کے دیکھنے سے قبل تمام ممالک اسلامیہ کی سیر کرنے کا ارادہ ہے، انشاءاللہ یہ تمنا بھی پوری ہوگی، خدا کرے یہ جنگ جلد تر خاتمہ بالخیر کو پہونچے، انشاءاللہ میری روئی کا مل ممبر بعد از جنگ کامیاب ہوگا، اور اُس کے ذریعہ سے اس اس قدر سرمایہ جمع ہو جائے گا کہ، اطمینان سے خدمت دین کی طرف ہم سب متوجہ ہونگے،

اور دنیا کے روزمرہ کے بکھیڑوں سے نجات ہوجائے گی، محبوب میاں صاحب نہایت درجہ بدمعاملہ ثابت ہوئے، جو روپیہ اور رسید بکیں جو اپنے ساتھ لے گئے تھے وہ اب تک واپس نہیں آئیں بلکہ گمان تو یہ تھا کہ ۵ رسید بکوں کا روپیہ وصول کرکے داخل نہیں کیا، وہ ہرگز اس قابل نہیں ہیں کہ اُن کو دوبارہ حضور کام دینی سپرد کریں، تندرست نہیں ہیں اور بیکار آدمی ہیں، جب حضور مولانا عبدالماجد صاحب کو خط لکھیں تو ہمارا بہت بہت سلام تحریر کردیں، اُن سے ہمیشہ شکایت رہے گی کہ وہ جبل پور تک ایک مرتبہ جلسہ وعظ کے لئے تشریف لائے مگر ہم تک نہ آسکے، یہاں موسم میں بہار کا لطف آگیا ہے، اور سردی غائب ہوگئی ہے، اگرچہ گرمی یہاں برائے نام ہوتی ہے، صرف مئی ذرہ سخت ہوتا ہے، وہ بھی دوپہر کے وقت جبکہ پنکھے کی ضرورت گرمی کو دفع کردیتی ہے، شب ہمیشہ پرلطف ہوتی ہے اور اکثر فرد کی ضرورت پڑتی ہے اور برسات کے بعد تو اندر سونے کی ضرورت پیش آتی ہے، ہم کو خدا کی رحمت سے ایک منٹ کیلئے مایوس نہیں ہونا چاہیئے، خدا ہم کو بس ایمان پر قائم رکھے دل میں وہی محبت دیتی ہے، اور صبر و شکر کے خزانہ میں اُس کے فضل سے کمی نہیں، آئندہ کا وہ مالک اور جاننے والا ہے، حضور کو علم ہے کریں . . . بیرونی معاملات اور اثرات کا ہمیشہ شکریہ ادا کرتا ہوں مگر کبھی اُن کے بھروسہ پر اپنے اعمال کو مبنی نہیں کرتا، اسی لئے کبھی مایوس نہیں ہوتا، دوسروں کی تعریف اور تحسین اور مدد کا ہمیشہ خواستگار اور ممنون ہوتا ہوں، مگر بھروسہ صرف ذات باری تعالےٰ پر کرتا ہوں، اور اُس کے احکام اور مرضی کی ماتحتی میں اپنی واحد ذات پر تمام دنیا کے کاموں کا انحصار کرتا ہوں،

طمع فاتحہ از خلق نداریم نیاز ؛ عشق من درپس من فاتحہ خوانم باقیست

بفضلہ تعالیٰ اب تک ایمان پر قائم ہوں، اور دل میں طاقت ہے، حضور کی دعا کا ہر وقت بھوکا ہوں، پُر لطف زمانہ میں دنیا کا تماشہ دیکھتا ہوں، محمد علی سلام عرض کرتے ہیں، وہ بہت کمزور ہوگئے ہیں، اور بیماری کا مقابلہ نہیں کرسکتے، میں بے فکری کا کھانا کھا کر موٹا ہوگیا ہوں، دبلے ہونے کی کوشش اور ورزش جاری کی ہے، حضور کی صحت مزاج کی دعا کرتا ہوں، غالباً حضور کا ۲۶ کو دہلی جانا ہوگا، شعیب ابھی وہیں ہے،

حضور کا خادم شوکت علی، خادم کعبہ

سنسر سنسر

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۴ مارچ ۱۹۲۱ء، (۴۶) اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم،

حضور کا حکم نامہ آیا تھا، مگر سوائے لفافہ کے اب تک اور زیادہ دیکھنا میری قسمت میں نہ تھا، سنسر نے مجھ کو مطلع کیا کہ انہوں نے حسب معمول چیف سکرٹری کو ناگپور بھیجدیا، علی العموم تو حضور کوئی بات ایسی نہیں لکھتے ہیں، جس پر

اعتراض ہو سکے، مگر آج کل اعتراض کا ہونا کوئی غیر معمولی بات نہ تھی، اس لئے مجھ کو زیادہ تعجب نہیں ہوتا ہے، خدا کرے حضور والا تندرست ہوں، گرمیوں میں طبیعت اکثر خراب رہتی تھی اس لئے اندیشہ لگا ہوا ہے۔ حضور جلد از خیریت مزاج سے مطلع فرمائیں، کل اخبارات میں حضور کا خط پڑھا خدا کا شکر ہے کہ حضور جمعیت کے کام سے بے خبر نہیں ہیں، ہم لوگ صبر و شکر کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، اور یہی نہیں کہ خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہیں، بلکہ اُس سے فضل کے امیدوار ہیں۔

حضور دعائیں یاد ضرور فرمالیا کریں، انشاء اللہ لکھنؤ میں ہی حاضر ہو کر قدمبوسی حاصل کریں گے، تمام گھر آجکل بھرا ہوا ہے، اور ہم سب بفضلہ تعالیٰ تندرست ہیں، موسم پر لطف ہے اور گرمی کے آثار ہیں، مگر گرمی یہاں زیادہ نہیں ہوتی ہے، آموں کی کثرت کی امید ہے اس لئے دل شاد ہے، میں دبلے ہونے کا علاج کرتا ہوں، تاکہ آموں کے کھانے کے لئے بہت سی گنجائش نکال لوں، حضور کو ہم سے نہ ملنے کا ضرور صدمہ ہوا ہوگا، مگر ہم کو خود بھی بہت صدمہ ہے، خیر یہ دن ہمیشہ نہ رہیں گے۔ آخر ایک دن تو اس جنگ عالمگیر کا خاتمہ بالخیر ہوگا، پھر اطمینان سے ہم تو قدموں میں بہت زیادہ رہوں گا، خدا وہ دن جلد لائے۔ والدہ صاحبہ حضور کو اور تمام گھر کو سلام اور دعا کہتی ہیں، محمد علی کے گھر میں بھی سلام عرض کرتی ہیں، زاہد انٹرنس کا امتحان دیتے ہوشنگ آباد گئے ہیں۔ امتحان ختم ہو گیا ہے، اب بھوپال ہوتے ہیں، انشاء اللہ پرسوں تک یہاں آجائیں گے، پرچے اچھے گئے ہیں، صرف ایک حساب کا پرچہ خراب تھا مگر امید اُس میں بھی کامیابی کی تھی، حضور دعا فرمائیں، گرمیوں کے لئے رامپور بھیجدونگا، یہاں مدرسہ عالیہ میں تعطیل میں فارسی اور عربی کی تعلیم کا سلسلہ شروع کراؤں گا، میرا مولانا سلامت اللہ صاحب، اور مولوی عنایت اللہ صاحب کو سلام پہونچا دیجئے گا، اور بھائی الطاف، ممتاز میاں صاحب، عزیزی قطب میاں صاحب کو بہت بہت پیار، سب سے ملنے کو دل چاہتا ہے، انشاء اللہ جلد تر ملاقات ہوگی، محمد علی سلام عرض کرتے ہیں، مسجد کے نقشہ کی درستی میں مصروف ہیں، ایک عزیز کی شادی رامپور میں تھی، ہمشیرہ صاحبہ کی سخت تاکید پر اجازت طلب کی گئی تھی مگر وہی معمولی جواب ملا جس کی توقع تھی، یعنی یہ کہ اجازت نہیں دی جائے گی، اضافہ الاؤنس کے بارے میں ابھی کوئی اطلاع نہیں ملی ہے، خدا معلوم کب تک جواب آتا ہے، اور کیا آتا ہے، تین مہینہ غور کرتے ہوگئے خدا کرے نتیجہ غور بہتر نکلے، موجودہ الاؤنس میں گذارہ دشوار تھا اور اس کی نسبت صاف صاف لکھدیا گیا تھا ہم لوگ ہر حالت میں خوش ہیں اور ہمارے سارے معاملات، ہم نے اُس دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے سپرد کر دیئے ہیں، اُس سے بڑھکر کون محافظ اور ناصر ملیگا، حضور کی خیریت مزاج کا طالب ہوں، حضور کی کبھی مسٹر واحد یار خان صاحب بی۔ اے سے ملاقات ہوئی تھی، یہ ہمارے کالج کے اولڈ بوائے ہیں، اور صاحب ایمان ہیں، مدبر نئی روشنی تھے، اُن کے دل میں درد اسلام ہے، اور کام کے آدمی ہیں، اُن کا پتہ "نئی بستی" الہ آباد ہے، حضور اُن کو بلا کر ضرور ملیں، ممکن ہے حضور کے معتمد ہو کر خدمت دین کریں، حضور اُن کو ضرور طلب فرمائیں، غالباً فرنگی محل کے جلسوں میں، حضور سے ملے تھے،

حضور کا خادم شوکت علی، خادم کعبہ

وہ مالک داتا ہماری مدد کریگا

(۴۷)

چھنڈواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۸ مئی ۱۸ء — اللہ اکبر

حضور والا السلام علیکم

حضور کا تار کل شام ملا تھا، آج صبح جواب میں تار ارسال کر دیا تھا، حضور کی خیریت کی اطلاع مل گئی ہوگی، اس عرصہ میں مجھکو علم ہوا تھا کہ حضور لکھنؤ سے باہر گئے تھے، اجمیر شریف سے گلبرگہ شریف وغیرہ تک کی زیارت کا ارادہ تھا، اور ٹھیک، پر یہ معلوم نہ تھا کہ کب تک واپس تشریف لائیے گا، اسی لئے خط نہیں لکھا گیا تھا، حاجی ماموں کے خط سے بعد کو معلوم ہوا تھا کہ حضور تشریف لے آئے تھے، اور عنقریب کسی پہاڑ پر جانے کا قصد تھا، آج والدہ صاحبہ سے اطلاع ملی کہ حضور نے کچھ دنوں کیلئے پہاڑ جانیکا ارادہ ملتوی کر دیا ہے، حضور کی خرابی صحت سے پریشانی رہتی ہے، یہ کس قسم کا زہری مادہ تھا کہ اب تک اوس کا تدارک نہیں ہوا، اس کا علاج حضور پوری کوشش سے فرمائیں خدائے برتر صحت عطا کریگا، اوس کو ابھی حضور کی ذات سے بہت سی خدمات لینا ہیں پس اس درجہ سے زیادہ پریشان نہیں ہونا، وہ مالک اور آقا ہماری مدد کرے گا۔ مولینا سلامت اللہ صاحب کا ایک پوسٹ کارڈ اپنے خاص رنگ میں لکھا ہوا آیا تھا، خدا کا شکر ہے کہ ہمارے موجودہ سنتر معقول آدمی ہیں ان الفاظ مذکور کو کوئی خفیہ سازش کا آلہ نہیں ٹھہرایا، میں شاعر نہیں ہوں، قوافی اور ردادف اگر کوشش کروں تب بھی دستیاب نہ ہوں، اس لئے خاموش رہا، اور ارادہ کیا کہ جب کبھی ملاقات ہوگی تو انشاء اللہ نثر میں جواب دونگا بفضلہ تعالیٰ ہم لوگ تندرست ہیں، اور خوش، صابر و شاکر ہیں اور دست بدعا، یہ ضرور ہے کہ اس نہیں زندگی سے دل اکتا گیا ہے، مگر قرآن پاک میں بھی صبر کی بہت زیادہ تعریف فرمائی گئی ہے اس لئے ہم لوگ پابند حکم ہیں، یہ ضرور ہے کہ ہم خود دیکھتے ہیں کہ صبر کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے اور انشاء اللہ اب بھی ہم کو مالک حقیقی کے یہاں سے اوس کے صلہ میں انعامات ملیں گے، تاہم غالب مرحوم کا کلام ہماری سچی تصویر کھینچتا ہے:۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن — بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

حضور کی قدمبوسی کا از حد اشتیاق ہے، اگر خدا کو منظور ہے تو جلد تر نصیب ہوگی، بعد نماز فجر اور عشا حضور حضور کو یاد کر لیتا ہوں، اور جب ہفتہ میں ایک یا دو بار نماز تہجد نصیب ہو جاتی ہے، تو دل کھول کر مل لیتا ہوں، حضور کی دعا اور مدد کی سخت ضرورت ہے، حضور ضرور بعد نماز یاد فرمالیا کریں، روئی کے کارخانہ کے اب کئی گاہک کھڑے ہوگئے ہیں، اور یقین کامل ہے کہ اچھے دام مل جائیں گے اگرچہ میں معاہدہ کرنا نہیں چاہتا ہوں، ایک چھندولی کا مارواڑی ۱½ لاکھ فقط مشینری کے دیتا ہے، کچھ لوگ اوس کو سالانہ ٹھیکہ پر بھی لینا چاہتے ہیں، میں بھی پسند کرتا ہوں کہ ٹھیکہ پر دے دوں، مسٹر عمر سبحانی رئیس بمبئی جو میرے دوست ہیں کوشاں ہیں کہ ٹھیکہ کی رقم کے اعتبار پر دوبارہ روپیہ قرض لے لیا جائے اور پرانے دینداروں کا قرض ادا کر دیا جائے، مجھ کو یہ رائے پسند ہے، حضور دعا فرمائیں، کہ معاملہ کامیابی کے ساتھ طے پا جائے حضور نواب صاحب رامپور نے ازراہ پرورش قدیمی میرے مقدمات کی تاریخ میری درخواست پر ۲ ماہ کیلئے ملتوی

[۱] جسٹس معظم علی، محمد علی کے برادر نسبتی حضرتؒ کے مرید

کردی، جس سے اون کی عنایت کا ثبوت ملتا ہے، حسرت موہانی نے کیا خوب تازہ غزل میں لکھا ہے:۔

بام پر آنے لگا وہ، سامنا ہونے لگا ‏ ‏ ‏ اب تو اظہار محبت، برملا ہونے لگا

میرا خیال ہے کہ اگر کوشش کی گئی تو حضور نواب صاحب۔ غالباً خود کارخانہ پر روپیہ دے دیں، حضور دعا فرمائیں حسرت کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے، اوس کی صداقت اور ہمت ہمارے لئے مشعل ہے، اور رہا کلام تو اوس میں بیڑیوں کی جھنکار کی آواز آتی ہے۔ جو قلب کو مسرور اور خوش کر دیتی ہے، مسٹر گاندھی کے نام حضور کا خط اخباروں میں دیکھا، جزاک اللہ، خدا حضور کو اجر دے گا، کلمہ حق انشاء اللہ دنیا میں بالا ہو کر رہے گا، والدہ صاحبہ حضور کو سلام فرماتی ہیں، اور گھر میں سب کو سلام و پیار، تازہ کوئی بات نہیں ہے، گورنمنٹ کے سامنے ہمارے الاونس نظر بندی کا مسئلہ چند ماہ سے درپیش تھا، اب تک جواب نہیں ملا تھا، یہی کہا گیا تھا کہ وہ زیر غور ہے، اس عرصہ میں مجبور ہو کر تار اور خطوط لکھے گئے ہیں، تاکہ فوراً اضافہ کیا جائے، مقامی اور بیرونی قرضہ بہت بڑھ گیا ہے، امید ہے کہ اول جون یا ابتداء جون میں جواب شافی ملے، ہمارا قطب میاں صاحب، بھائی الطاف، ممتاز میاں، مولوی عنایت اللہ صاحب، مولانا سلامت اللہ صاحب کو سلام مسنون۔

حضور کا خادم شوکت علی معنی خادم الحرم الکعبہ

میں نے ایف اے عربی میں کیا تھا

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۸ نومبر ۱۹۱۸ء ‏ ‏ ‏ اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم

پرسوں کے بعد حضور کو خط لکھتا ہوں، اگرچہ خطوط کی کچھ بہت زیادہ ضرورت بھی نہ تھی، جو تعلقات روحانی تھے، اون کے ہوتے ہوئے، اگر خط نہ بھی لکھا جائے تو کچھ حرج نہ تھا، خلیق اور دیگر احباب سے حضور کی خیریت مزاج کا حال معلوم ہوتا رہا تھا، سنا ہے ۱۵ نومبر کے بعد لندن سے اور عبدالرؤف یہاں ہم سے ملنے آئیں گے، غالب مرحوم نے خوب فرمایا ہے:۔

حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرش راہ ‏ ‏ ‏ پر کوئی اتنا تو سمجھا دے کہ سمجھائیں گے کیا،

یہ تحقیقات بھی بلا ہے جہاں ہوتی ہے، الحمد للہ ختم ہوا اور ہم لوگ اطمینان سے اپنے کاروبار میں مصروف ہوں، یہ خط حضور کو کام سے لکھتا ہوں، آج کل عربی پڑھنے کا گھر بھر میں زور ہے، میں اور محمد بھی کھوئے ہوئے تھوڑے بہت علم کو تازہ کرنا چاہتے ہیں، ایک کتاب معمولی بول چال کی جو حال میں مصر میں تصنیف ہوئی تھی، میرے پاس ہے، مگر مزید خطوط کے تازہ کرنے کی ضرورت ہے، ایک جلد [illegible] اور مصر [illegible] اور تفسیر کی ضرورت ہے حضور کے [illegible] سے طلب کی جائے، مصمم ارادہ ہے کہ چھ ماہ میں معمولی بول چال کرنا سیکھ لیں، خدا مدد کرے،

کاش اول سے خیال کیا ہوتا تو اب تک اچھی خاصی استعداد ہو گئی ہوتی، اوس وقت بھی بیکار نہ تھے، اب ذرا اطمینان ہوا ہے، تو آئندہ کی فکر ہو رہی ہے، قرآن پاک کی وجہ سے بہت سے الفاظ سے مانوس ہو گئے ہیں، علاوہ ازیں میں نے تو ایف اے عربی میں پاس کیا مگر صرف و نحو بالکل بھول گیا ہوں، انگریزی میں اوس سے بدتر حالت ہے، والدہ صاحبہ حضور کو اور گھر میں سب کو سلام اور دعا کہتی ہیں، حمیدہ بانو کو بخار آگیا تھا، مگر اب خدا کا فضل ہے، زاہد علی علی گڈھ سے نمونیہ لے کر آئے تھے، اور کچھ دن تو اون کی وجہ سے رامپور میں پریشانی رہی مگر خدا نے میری بے کسی پر رحم فرما کر اوس کو صحت دی، اب اچھا ہے، لکھنؤ میں بیماری کی کثرت ہے، خدا حضور کو اور تمام ہوا خواہان اسلام کو اپنی امان میں رکھے، مسہل کے بعد اجوائن کے پانی کا استعمال رکھنا، از حد مجرب ثابت ہوا ہے، ایک حصہ اجوائن اور دس حصہ پانی کو خوب جوش دے کر مثل چاے کے چھان کر ہر ۲ گھنٹے کے بعد نصف چھٹانک دیتے رہیں، مفید ہوگا، خدا سے امید ہے کہ وہ شفا دے گا، پرہیز سہل ہے، اور کوئی دشواری نہیں، بعد کے حالات سے حضور کو مطلع کروں گا،

حضور کا خادم شوکت علی معتمد خدام کعبہ

دو ماہ میں عربی بول چال سیکھنے کا عزم

چھندواڑہ، ۹ نومبر ۱۸ء　　　　　　　　　　　　　　　اللہ اکبر

یہ رسم بزم فنا ہے اے دل گناہ ہے جنبش نظر بھی　　رہے گی کیا آبرو ہماری جو تو یہاں بے قرار ہوگا، (اقبال)

حضور والا، السلام علیکم

والا نامہ ملا تھا، اور اوس سے قبل میزان منشعب اور دیگر عربی کی کتابیں، خدا کو منظور ہے تو دو ماہ میں عربی بول چال سیکھ لیں گے، یہ مقرر ارض مقدس میں، دشواری نہ ہو، حضور دعا فرمائیں جو ہم کو بریت میں لکھنا تھا وہ ہیں تو ہم یاد دن ہوئے ختم کر چکا تھا، باقی بھی کل ختم ہو گیا اور سب کل رجسٹری شدہ الہ آباد بھیج دیئے گئے، ۲۷ آخری دن تھا، اور اوس دن ہم بھیج دیتے مگر ڈاکخانہ بند تھا اور رجسٹری نہیں ہو سکتی تھی، آج گورنمنٹ کو ہم نے اپنے اون قرضوں کی ادائیگی کی نسبت بھی لکھا ہے جو مجبوراً ہم کو معمولی خورد و نوش کے لئے کرنا پڑتے تھے، تقریباً کچھ روپیہ ۳۰ ہزار ہے، ماہواری الاؤنس مشکل سے ۲۰ دن کو مہینہ میں کافی ہوتا تھا، قحط اور گرانی کا جو عالم ہے وہ ظاہر کہ گورنمنٹ کو تو ضرور معلوم ہوگا، ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا، اب کمیٹی جانے اور گورنمنٹ، مگر نظر بندی میں معمولی مصارف کا دینا اوس پر لازم تھا، ابھی معلوم نہیں ہے مگر غالباً کمیٹی اول ہفتہ دسمبر میں آئے گی، وہ ہمارے کاغذات کا انتظار الہ آباد میں کرتی تھی، یہاں ہم اوس کے منتظر تھے، ہمارے سر سے بوجھ ہلکا ہو گیا، اب وہ آئیں یا نہ آئیں ہم کو زیادہ فکر نہیں ہے، بہتر ہوتا کہ وہ جلد فیصلہ کر دیتے یا ادھر یا اودھر تاکہ ہم لوگ اپنی زندگی اطمینان سے بسر کرتے، خدا کا شکر ہے کہ حضور کی دعا سے بہ جان اور قلب میں ویسی ہی طاقت بلکہ اب تو اور اضافہ ہو گیا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم ہی غریبوں سے اس بڑی کی خدمت لی جائے گی،

بہر حال میں سست ہوں، خلیق الزماں صاحب کو میں نے ایک کاپی اپنے جواب کی دے دی تھی، دل تو نہیں چاہتا کہ کسی غیر کو اپنے مذہبی جذبات اور اعتقاد کا ثالث بناتا مگر "ایں ہمہ اندر عاشقی بالائے غمہائے دگر" یاس کفر ہے خدا کی رحمت کا ظہور دیکھ لیا، گذشتہ زمانہ کی دعاؤں کا اب اثر نکلا، حال کی دعاؤں کا ظہور خدا ایسے برتر عذر دکھائے گا، نجات کا طالب ہوں، اور اپنے گناہوں سے شرمندہ۔ اب تو دل آزاد نسبت کا عادی ہو گیا، خدا کا شکر ہے۔

جانے کیا ساقی کی آنکھوں نے اشارہ کر دیا ندر ساغر آج ہم نے زہد و تقویٰ کر دیا

حضور دعا میں ہرگز نہ بھولیں، قدمبوسی کا اشتیاق ہے، اور دل میں بہت کچھ بھرا ہے، قدموں پر سر رکھ کر خوب عرض معروض کروں گا، قاضی عبد الغفار صاحب یہاں موجود ہیں، اس سے قبل غالباً حضور کی خدمت میں حاضر ہو جائیں، عزیزی مولوی صبغۃ اللہ صاحب کا خط آیا تھا، اوس کا جواب کل لکھوں گا!

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

مولانا صبغۃ اللہ کے نام

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۳ر دسمبر ۱۸ء

اللہ اکبر

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

دل جو برباد محبت ہوا، آباد ہوا ساز تعمیر تھا اس قصر کو ویراں ہونا

لطف دیتا ہے تجھے مٹ کر تیری الفت میں ہمہ تن شوق ہوا ہے عرب تنان ہونا

یہی اسلام ہے میرا یہی ایماں میرا تیرے نظارۂ رخسار سے حیراں ہونا (اقبال)

عزیزی، مولانا صبغۃ اللہ صاحب، السلام علیکم

میں معافی کا خواستگار ہوں، کہ اب تک نہ تو آپ کے حکم کی تعمیل ہو سکی اور نہ خط لکھ کر یاد دہانی کا شکریہ اور اپنی معذوری کا اظہار کر سکا، واقعہ یہ تھا کہ جب آپ کا اوس وقت تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد انتظار کے بعد گورنمنٹ ہند کے ہاں سے فرد الزامات آئے، اور وہ بھی ادھورے ۳ ½ برس کے بعد ہم کو اس سے زیادہ کی توقع رکھنا ہی فضول تھا،

کی میرے قتل کے بعد اوس نے جفا سے توبہ ہائے اوس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

۱۲ دن کی مہلت تھی کہ اوس کے اندر اگر ہم چاہیں تو جوابات بھیج دیں، ۱۳ نومبر ۱۹۱۸ء کو یہ فرد ہمکو ملی اور اوس سے ایک دن قبل یہاں کے چیف سکرٹری نے یہ بھی ہم کو اطلاع دی تھی کہ ممبران کمیٹی مسٹر لنڈسے اور سید عبد الرؤف صاحب ۱۴ نومبر کو ہم سے ملنے چھندواڑہ آئیں گے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا کہ جوابات کا لکھنا ملتوی کر دیں ممکن ہے بر سر ملاقات کچھ مزید حالات معلوم ہوں، ایک ہفتہ اس انتظار معشوقانہ میں گذر گیا تب معلوم ہوا کہ کمیٹی کا اگر ہم یہاں انتظار کر رہے تھے، تو وہ بھی الہ آباد میں ہمارے بیانات کے بے قراری کے ساتھ منتظر تھے۔

یہ مزہ تھا دل لگی کا کہ برابر آگ لگتی نہ تجھے قرار ہوتا نہ مجھے قرار ہوتا

جلد جلد ایک ہفتہ میں بیانات مرتب کر کے ۲۷ نومبر کو الہ آباد روانہ کر دیئے، نہ تو میں زیادہ لکھنا پسند کرتا تھا اور نہ کچھ زیادہ مجھ کو کہنا تھا "صرف خدام کعبہ" کے متعلق غلط فہمیاں دور کرنی تھیں، جن کی بنا ناواقفیت پر تھی، بفضلہ تعالے ہمارے مقاصد تھے تو اس قدر اعلے اور ارفع کہ کسی کو اون کی نسبت سوال کرنے کی گنجائش نہ تھی، رہا ہمارا عملہ تو ہم کو سب کو فخر رہے گا کہ ہم نے اپنا وقت، روپیہ، اور فرصت ایسے نیک کام میں صرف کی تھی، ہمارے اعمال روز روشن کی طرح دنیا پر ظاہر تھے، اگرچہ ہم نے اسلامی انکساری سے کام لے کر اون کو دور تک شائع نہیں کیا تھا، اب انشاء اللہ سب کو معلوم ہو جائیں گے، میرا گمان ہے کہ ہمارے بیانات کے بعد جملہ شکوک رفع ہو جائیں گے، مشکل سے یہ کام ختم کیا تھا کہ مکان کے خطوط سے متوحش خبریں آنے لگیں، ۲۸، ایک عزیز ترین خاتون کا، ۲۴ برس کی عمر میں اس بخار سے انتقال ہوا، مرحومہ میری اہلیہ مرحومہ کی سب سے چھوٹی بہن تھیں، اور ہم سب کی چہیتی، ہم سے ملنے یہاں آنے کا ارادہ کر رہے ہیں، بلکہ اون کے شوہر تو لکھنؤ سے واپس آ گئے، اسی عرصہ میں معلوم ہوا کہ کمیٹی تحقیقات جمعرات کو ہم سے ملنے چھندواڑہ آئے گی، ایک غم سے نجات نہیں پائی تھی کہ بدھ کو یکایک تار ملا کہ ہماری اکلوتی بہادر بہن کی بڑی لڑکی نے جو پانچ ماہ ہمارے پاس رہ کر گئی تھی ۱۲ برس کی عمر میں اس دنیا سے کوچ کیا، والدہ صاحبہ نے مرحومہ کو بیٹی کر کے پالا تھا، اور جو صدمہ اون کو اور ہم سب کو ہوا اوس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، مگر سوائے صبر کے کچھ چارہ نہ تھا اور ابھی معلوم ہوا تھا کہ گھر میں ۱۰ اور چھوٹے بڑے مخدوش حالت میں بیمار پڑے تھے، صرف ایک تیماردار تھی اور جب یہ معلوم ہوا کہ ہماری غریب بہن بھی جو ہم سب کے کاروبار کی نگہداشت کرتی تھیں، اب خود سخت علیل تھیں اور ہم ضرور پریشان ہوئے، عارضی طور پر وطن جانے کی اجازت بھانجی کی علالت کی خبر پا کر کی تھی، مگر جب دو گھنٹے کے بعد موت کی خبر مل گئی تو اجازت کی درخواست کو تار دے کر منسوخ کرایا اسی عرصہ چیف سکرٹری کے یہاں سے نامنظور بھی آ گئی تھی، کیونکہ کمیٹی چھندواڑہ آ رہی تھی، جمعرات کی شام کو وہ آ گئے اور ہم لوگ بعد نماز جمعہ علی الصباح والدہ صاحبہ کو اسٹیشن پر رخصت کر کے اور اپنی عزیزہ کی سوئم کی فاتحہ خوانی کر کے اون سے ملے، اور مجھ سے گفتگو ہوئی، تین گھنٹہ ملاقات رہی، خوب گفتگو ہوئی، دلچسپ تھی، میرا گمان ہے کہ اون پر ایک مسلمان کی صاف گوئی اور اعلائے کلمہ حق کرنے کا اچھا اثر پڑا، وہ نہایت درجہ اخلاق سے پیش آئے، اور میں نے بھی نہایت درجہ خندہ پیشانی سے جوابات دیئے آخر میں ہم ایک دوسرے سے قریب مغرب رخصت ہوئے، اونہوں نے اپنی جائز خوش اخلاقی کا ثبوت دے کر سرٹیفکیٹ طلب کیا جو میں نے نہایت خوشی عطا کیا، میں نے بھی اپنی خوش اخلاقی اور پاک طینتی کا سرٹیفکیٹ مانگا جو ممبران کمیٹی نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ عطا کیا، گفتگو ہوئی انشاء اللہ بر سر ملاقات بیان کرونگا، غالب مرحوم کا پر لطف شعر اس وقت کافی ہے:-

تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

دوسرے دن ہفتہ کو ۱۰ بجے سے سارا دن محمد علی کے لئے دیا گیا تھا اور مجھ کو بھی اجازت دی کہ موجود رہ کر تمام

گفتگو قلم بند کروں، نماز ظہر کے لئے ایک گھنٹہ کام بند تھا، نماز عصر اور مغرب سرکٹ ہاؤس میں ہی ادا کی اور نماز ضرور پرلطف تھی، مسٹر لنڈ سے قرآن پاک سے ناواقف تھے، مگر سید عبدالرؤف صاحب، کو آیاۃ قرآنی سن کر ضرور لطف آیا ہوگا، گفتگو طویل تھی، مگر موضوع "مسلمان کے مذہبی فرائض" تھا، ہم قریب ۸ بجے شب کے مکان پر آئے، اور وہ صبح کو الہ آباد واپس گئے۔ ایک بوجھ تھا جو اتر گیا اور اب اطمینان سے ہم لوگ زندگی بسر کر رہے ہیں، مگر ہمشیرہ کی سخت علالت سے پریشانی ہے، دوسرا تار عارضی رخصت کا بھی ہے، اور اوس کی یاددہانی بھی کی گئی ہے، جواب ملا بھی کہ ہماری درخواست عارضی رخصت کی گورنمنٹ ہند کے پاس بھیج دی گئی ہے، خدا سے یہ دعا ہے کہ باقی اعزہ پر رحم فرما کر جلد صحت عطا فرمائے، محمد علی صاحب کو پرسوں بخار آگیا تھا، مگر اب اچھے ہیں، نقاہت ہے، آپ تحریر کرتے ہیں اور تقاضا فرماتے ہیں کہ ہم کچھ "دینی نمبر" کے لئے لکھیں، اول تو مضمون ایسا کہ اوس پر جسقدر لکھا جائے دین اور دنیا دونوں کے لئے مفید، دوسرے آپ کا تحریر کرنا، آپ کو علم ہے کہ جو تعلق اب ہمارا فرنگی محل سے ہے، تعمیل ارشاد ایک ادنےٰ خدمت ہوتی مگر:۔

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

عزیزی اگر ہم کوئی تحریر شائع کرنے کی غرض سے لکھیں تو اول اوس کو اس صوبہ کے چیف سکرٹری کے پاس بھیجنا ہوگا، وہ اس کے سنسر ہیں ہم نے آج تک کوئی تحریر نہیں بھیجی اور ایک اشتہار اپنے روئی کے کارخانہ کا جو دس دن میں واپس آیا تھا، معمولی تحریر ہوتی تو آپ کی خاطر بھیج دیتا، مگر دل یہ قبول نہیں کرتا، کہ وہ الفاظ جو حضور سرور کائنات صلعم کی شان میں ایک غریب مسلمان کا ہدیہ ہوں، غیر مسلم کی اجازت سے شائع کئے جائیں، یا اون میں کتر بیونت کرے، انسان ایسا فعل ہی کیوں کرے جس میں دل آزاری اور توہین کا اندیشہ ہو مجھ کو امید ہے کہ اب ہم کو معاف کر دیجئے گا، عزیزی! یہ وہ زندگی تھی جس کے تھوڑے حالات پڑھ کر بھی ہمارے سینوں میں نئی طاقت آتی ہے، دنیا میں کبھی قوت کا خوف دل میں نہیں رہا، بہرحال میں مست ہوں، کوئی مصیبت کیوں نہ آئے، کیسا ہی صدمہ کیوں نہ آئے، کیسا ہی صدمہ کیوں نہ ہو ہر حال میں اوس مکمل اور پاک زندگی کی مثال ہمارے سامنے موجود ہوتی ہے، اور رہنمائی فرماتی ہے، اللہ اللہ کیا کیا سبق سکھاتی ہے، برادر عزیز مولانا ابوالکلام آزاد اور محمد علی کی زبان سے حضور کے حالات سن کر وہ لطف آیا ہے، کہ اب تک دل میں ارادہ کر لیا ہے کہ اگر صحیح حالات بغیر کسی قسم کی حاشیئے کے مسلمانوں کے کانوں تک پہونچائی جائیں تو ہم لوگ دین اور دنیوی دولتوں سے مالا مال ہو جائیں گے، عجیب تعلیم تھی کہ معمولی اور ذلیل ترین انسان پر بھی ذرہ سا اثر پڑا اور وہ کندن ہوگیا، مجھ پر علاوہ اور بہت سے صحابہ کرام کے حالات کے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے حال سے بڑا اثر پڑتا ہے: وہ نہ تو یورپ کی تعلیم گاہوں کے سند یافتہ تھے نہ علی گڈھ کا اثر تھا، فرنگی محل اور دیوبند کی تعلیم سے بھی محروم تھے ہتمول نہ تھے، اعلےٰ خاندان نہ رکھتے تھے، کچھ خوبصورت بھی نہ تھے، غلام ابن غلام تھے اور وہ بھی حبشی بدشکل، مگر کیا قسمت تھی، ظالم کافر آقا زمین پر چلتے ہوئے زمین پر گرا گرا کر مارتا تھا، گرم ریت پر لٹاتا تھا، طرح طرح کی اذیتیں دیتا تھا، مگر وہ ایک لفظ "احد احد" "اللہ ایک اللہ ایک" زبان پر جاری تھا، کیا مجال تھی کہ عقیدہ میں کسی حالت میں بھی فرق آتا، دین کے معاملات میں مصلحت کون شئے تھی، خدا تو بس ایک تھا، اور اوس کا آخری رسول اکرم صلعم بھی اوس کا مکمل اور آخری

پیغام لے کر آیا تھا، اب ترنیم کیسی جان رہے یا جائے، بدنامی ہو یا نیک نامی، عاقل کہلائیں یا احمق، اب تو ایک کہہ ہو گئے، اوس حبشی جاہل غلام زادے کے ایمان کا ایک دسواں ٹکڑا بھی ہم کو میسر ہوتا تو فلاح دارین میں شبہ نہ تھا خیر دین اور آخرت ملتی یا نہ ملتی مگر دنیا کی سرداری اور بہتری تو ضرور ہمارے قدموں کے نیچے ہوتی، اقبال نے جس خوبصورت اور سچے الفاظ میں حضرت بلالؓ کی تعریف فرمائی ہے وہ ہر مسلمان کے دل میں جگہ پانیکے قابل ہے:۔
کیا قسمت تھی جس قدر رہیم رشک کریں بجا تھا، مگر وہ اُس کے مستحق تھے:۔

ازاں ازل سے تیرے عشق کا ترانہ بنی   زمانہ اُس کے نظارہ کا ایک بہانہ بنی

آج بھی اگر ہم عشق بلالی پیدا کر لیں تو نظارہ میں کسی قسم کی روکاوٹ باقی نہ رہے گی، حضور کے حالات پڑھ کر دل کو کس قدر تقویت ملتی ہے، احباب ہماری ہمت اور استقلال کی تعریف کرتے ہیں، کسقدر صبر سے ہم نے یہ زمانہ ابتلا اور آزمائش کاٹا ہے، یہ اُس کی پاک زندگی کے سبق کا نتیجہ تھا، مگر ہماری آزمائش ابھی ہوئی ہی کیا ہے، اُس حبیب خدا نے جس کی خاطر یہ سب کون و مکان پیدا ہو گیا تھا، ایک برس نہیں، دو برس نہیں، ۱۳ برس تک مسلسل طرح طرح کی ایذائیں سہیں، کوئی مصیبت نہ تھی، جو حضور اکرم صلعم کے سامنے نہ آئی ہو، مگر ایک لمحہ کے لئے بھی قدم نہ ڈگمگائے، ایسی مثال، ایسا اعلےٰ نمونہ سامنے موجود ہوتے ہوئے کیا ہوا اگر حضور مولانا محمود الحسن صاحب قبلہ نے مالٹا کی تکالیف بخوشی منظور فرمائیں، حسرت نے ہنسی خوشی جیل کاٹا، ابوالکلام نے رانچی کی اور شوکت اور محمد نے لینڈسڈاؤن، چھنڈواڑہ پر لطف اور صحت بخش ہوا میں ۳ ۳ برس کاٹے؛
خدا آپ کو اجر دے اور توفیق دے کہ دن رات اس مکمل زندگی کے حالات عام مسلمانوں میں پھیلانے کیلئے اپنا آپ وقف کرسکیں، حضور والا کی بیماری کا حال کل کے خط سے معلوم ہوا، ہم نے تو حضور کو اور تمام اعزہ اور احباب کو خدا کے سپرد کر دیا ہے، اور اس سے بس دعا ہے تو ایک اور وہ یہ ہے کہ وہ ہم کو زندہ رکھے تو اسلام پر اور مارے تو اسلام پر، دلی خواہش ہے کہ علی عون اور دیا سے ہم نہ مریں بلکہ آخر وقت تک دین کی خدمت کرتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوں، خدا کی رحمت کا منتظر ہوں، وہ ضرور آئے گی مگر اُسی وقت آئے گی جبکہ ہم اُس کے سچے مستحق ہوں گے، اور کیا لکھوں:۔

ہمہ حسرت ہوں سراپا غم بربادی ہوں   ستم دہر کا مارا ہوا فریادی ہوں

آپ کا خیر طالب شوکت علی خادم کعبہ

نوٹ ضروری، میرے اس خط کو پڑھنے کے بعد مسٹر عبدالحسین قاری صاحب کو ٹمیا محل دہلی بھجوا دیجئے گا،

پیرول پر رہائی

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۶ جنوری ۱۹۱۸ء　　　(۵۱)　　　اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم

حضور سے رخصت ہو کر ہم لوگ مع الخیر جمعہ کے دن شب کو یہاں پہنچے، راستہ کی تھکن اور اُس سے زیادہ رامپور[۵۱] کی مہمان نوازیوں کا اثر اب کہیں جاکر دور ہوا ہے، اخبارات اُس ۴ ہفتہ کے بالکل نہیں پڑھے تھے، یہانتک کہ اطمینان کے ساتھ لیگ اور کانگرس کے خطبات بھی نہیں دیکھے تھے، اس ہفتہ خوب ہوئے اور تمام گذشتہ اخبارات کو بھی پڑھا، اب جاکر طبیعت اور زندگی معمول پر آئی ہے، بڑا امکان ہے، اس کی تنہائی دیسے ممکن تھا وحشت پیدا کرتی، مگر اب کی مرتبہ خموشی سے دل خوش ہوا، اب خط وکتابت کا سلسلہ شروع کر دیا ہے، اور اس لئے حضور سے معافی کا خواستگار ہوں، کہ اب تک خیریت مزاج نہیں دریافت کرسکا تھا، رامپور اور لکھنؤ کی ملاقاتیں کچھ ایسی عالم خواب اور گھبراہٹ میں ہوئیں تھیں، کہ اُن سے نہ تو قلب کو اطمینان ہوا، اور نہ دل کو بالکل میلے ٹھیلے کی ملاقاتیں تھیں، خدا کرے کہ جلد خدمت عالی میں قدمبوسی کا موقع ملے، اور اطمینان سے عرض معروض کرسکوں، بالتوڑوں نے بھی یہاں تنگ کیا، اب ایک پاؤں میں رہ گیا مگر وہ بھی تکلیف دہ نہیں رہا ہے، کارخانہ کے متعلق رامپور سے ابھی مفصل اطلاع نہیں ملی ہے، کہ لکھنؤ سے کیا جواب گیا، انکار کی تو گنجائش نہ تھی مگر ان حضرات سے کوئی فعل بھی بعید نہ تھا، بمبئی کے خطوط سے طلبی تقاضا تھا، میں نے مفصل حالات رامپور لکھ دیئے ہیں، جہاں سے ضرور ہمدردی اور امداد کی امید ہے، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ ضمانت کارخانہ کی خود نہایت معتبر ہے، سوائے فائدے کے نقصان کا اندیشہ نہ تھا، گورنمنٹ ہند کا آخری جواب آگیا کہ وہ ہمارے کارخانوں کا سود کا نقصان نہیں دے سکتے، ۶۰ ہزار کا مطالبہ تھا، جو ہماری جیبوں سے گیا تھا، ہماری درخواست معقول تھی اور ممبران کمیٹی نے بھی اس کو اپنی رپورٹ کے ساتھ بھیجا تھا، سوائے صبر وشکر کے کیا چارہ ہے، خدا ہمیں نعم البدل دے گا، ایسی رقم حقیر سے ہمارا فائدہ تھا، اور جنگ کے اخراجات میں وہ معلوم ہی نہیں ہوتی، کمیٹی کی رپورٹ کا نتیجہ مانگا ہے، دیکھئے کب اطلاع ملتی ہے، ہم نے کل خط لکھ کر　　جانے کی اجازت طلب کی ہے، تاکہ حسب منشا روپیہ کا انتظام ہو کر ادائگی کر دی جائے، .... کاغذ غائب .... مل جائے گی....

اس عرصہ میں کچھ .... حضور اب شبیر حسین صاحب کو بھی تحریر فرما کر بلوائیں تاکہ کام میں آسانی ہو، انہوں نے بھی اس ۴ سال میں خوب آرام اور رفاقہ کشی کرلی ہوگی، اب تھوڑا کام بھی کریں، اس چار ہفتہ کی رخصت سے کافی تجربہ ہوگیا، کہ انشاء اللہ ہم لوگ پوری محنت اور جفاکشی سے کام کرسکیں گے، یہ زمانہ ہمارا بیکار ضائع نہیں ہوا، خدائے برتر کے تمام کاموں میں حکمت ہوتی ہے، ہم کو خوشی ہوئی کہ ہماری معمولی خدمات کو اسلامی، بڑھا چڑھا کر مسلمان دیکھتے ہیں، اس نرخ سے ہمارا بیوپار برا نہ تھا، لکھنؤ

[۵۱] چند روز کے لئے حکومت نے پیرول پر علی برادران کو اجازت دی تھی۔ حضرت ان سے ملنے رام پور گئے تھے۔

میں حضور دفتر کے لئے مکانات وغیرہ کی تلاش فرمالیں، زمین عمدہ مل جائے تو کیا کہنا، وسط شہر میں ہو اور مسلمان آبادی کے قریب مگر فی الحال تو کرایہ کا مکان وغیرہ لینا پڑے گا، علاوہ دفتر کے ۱۵ یا ۲۰ آدمیوں کے رہنے کے لئے کافی ہو جب سے ہم یہاں آئے ہیں، کم و بیش روزمرہ بارش ہو رہی مگر بیچ میں دھوپ بھی نکل آتی ہے، آج صبح سے پھر ابر موجود ہے، ہمدم اور اخبارات سے معلوم کر کے اطمینان ہوا کہ اُس طرف بھی معقول بارش ہو گئی ہے جس کی سخت ضرورت تھی، خدا نے بڑا افضل فرمایا ورنہ مخلوق تباہ ہو جاتی مولوی سلامت اللہ صاحب کی خدمت میں میرا سلام مسنون، اور بھائی الطاف کو بہت سا پیار لکھنؤ حاضر ہونے کے اشتیاق میں دل رہتا ہے، فرنگی محل کا میرے جسم کے برابر والا ناشتہ کا بکس آج کہیں جا کر خالی ہوا ہے، ہم لوگ کھاتے کھاتے، اور کھلاتے کھلاتے تھک گئے، مگر وہ ناشتہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا، میرے کمرے میں رکھا ہوا ہے، اُس کو دیکھ کر لکھنؤ کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، اگرچہ میرا ارادہ ہے کہ وہاں کے قیام میں ابتداً، جسمانی ورزشوں کا زیادہ زور رہے گا، تاکہ جسم کم ہو جائے اور اُس کے لئے شیرمال اور بالائی اور برفیاں زہر کا کام دیں گی، ہم لوگ بہرحال ہم لوگ ہر حال میں خوش ہیں، بچے وغیرہ ابھی تک یاد نہیں ہوتے ہیں، غالباً سفتہ عشرہ میں مکان اُن کے بغیر سونا معلوم ہوگا، مگر اس عرصہ میں کوئی نہ کوئی بات صاف ہو جائے گی، مولوی عنایت اللہ صاحب، مولوی صبغۃ اللہ صاحب، قطب میاں صاحب، مولوی محمد یونس[1] صاحب غرضیکہ سب کو سلام مسنون، خدا سے دعا ہے کہ حضور کی طبیعت اب بفضلہ تعالیٰ اچھی ہو گی، علاج ایک مرتبہ جم کر ہو جائے تاکہ تمام جسم صاف ہو جائے، محمد علی تندرست ہیں، اور حضور کو دست بستہ سلام کہتے ہیں،

حضور کا خادم شوکت علی

آرزوئے ملاقات

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۲ فروری ۱۹۱۹ء (۵۲)

حضور والا، السلام علیکم

اس سے قبل حضور کو مفصل خط لکھ چکا ہوں جو غالباً ملا ہوگا، جواب سے محروم رہا، خدا کرے طبیعت اس عرصہ میں درست رہی ہو، مجھ کو فوراً رامپور جانے کی اجازت آگئی، مگر اب تک محمد علی کی نسبت دوبارہ یاددہانی کا جواب نہیں آیا ہے، اُن کی اہلیہ بھی اس عرصہ بخار اور زکام میں سخت مبتلا رہی ہیں، اور ہم کو اُن کی طرف سے تشویش رہی تھی، اب کسی قدر افاقہ ہے، اگر کل صبح تک بھی جواب نہیں آیا تو معلوم ہو جائے گا کہ گویا اجازت دینا منظور نہ تھا، میں کل کی گاڑی سے چل کر یعنی جمعرات کو چل کر ہفتہ کے دن میل سے لکھنؤ گذروں گا، اگر حضور کو تکلیف نہ ہو تو مجھ سے اسٹیشن پر مل لیں، مع مولانا سلامت اللہ اور بھائی الطاف کے، میں تار بھی دوں گا، یعنی ۱۳ کو چل کر ۱۵

[1] استاذ الاساتذہ مولانا عبدالحی کے نواسے "ابن رشد" کے فاضل مصنف فرنگی محل کے یگانہ عالم، مرض دق میں فوت ہوئے۔

کی میل سے لکھنؤ سے گذروں گا، خلیقؔ کو بھی تار دوں گا، خدا کرے محمدؐ علی کی اجازت بھی آجائے، ۷ کو میں نے تار دیئے تھے، اور خود ڈپٹی کمشنر نے بھی، اب تک جواب نہیں دیا، تنہا جانا مجھ کو ناگوار ہوگا، مگر اس ہم اندیں عاشقی بالائے غمہائے دگر، انشاء اللہ رخصت کے ختم ہونے سے قبل ہی کام ختم کرکے واپس آجاؤں گا، حضور سے دعا اور مشورہ کا طالب ہوں؛

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ معتمد خادم انجمن کعبہ

فتوے کا انتظار

رامپور ۷ فروری ۱۹ء (۵۳)

حضور والا، السلام علیکم

عزیزی محمدؐ نظام الدین صاحب تشریف لائے تھے، اور اُن کا تار بھی حضور کو مل گیا ہوگا، وہ آج ہی واپس جاتے ہیں، میں حضور کا ہم خیال ہوں، ضرور ایسے نیک کام کے لئے، جن سے مقامات مقدس کی حرمت برقرار رہے، اور اسلامی نقطۂ خیال ذمہ دار وزراء کے سامنے پیش کیا جاسکے، امداد دینا چاہیئے، اس رقم سے زیادہ بھی ضرورت ہو تو دیا جائے، فضول بنک میں پڑا رہنا بیکار تھا، اتنی رقم رہنی چاہیئے جس سے انجمن کا کام پھر اجرا ہوسکے، چند علماء سے ملا ہوں، اور کل پوری کوشش کروں گا، اور ہر ایک سے ملوں گا، حضور کو ایک خط میاں خواجہ احمد صاحب کو بھی لکھ دینا چاہیئے، اگرچہ میں عرض کردوں گا کہ میں حضور کا پیامبر تھا، خدا کامیابی عطا فرمائے مفصل خط کل کو لکھوں گا، اتوار کے دن شعیب صاحب خلیق عبدالرحمٰن صاحب، اور چند اور احباب مراد آباد سے آئیں گے، معظم علی صاحبؒ ایک نقل فتوے مراد آباد کے لئے طلب کرتے ہیں، غالباً حضور کو لکھا ہوگا، قطب میاں صاحب، مولانا سلامت اللہ صاحب، اور بھائی الطاف کو سلام خدا حضور کو زندہ اور سلامت رکھے،

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

چیف کمشنر سے ملاقات

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۲۸ مارچ ۱۹ء (۵۴) اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم

خدا حضور کا مرتبہ اور بلند فرمائے، اس وقت حضور وہ کام کر رہے ہیں، جو حضور کے شایان شان تھا، اخبارات میں حالات پڑھ کر قلب کو جو مسرت اور ایمان میں جو تقویت ہوئی خدا ہی جانتا ہے، لاکھوں مسلمانوں کے ایمانوں کو

ؔ چوہدری خلیق الزمان ؔ تحریک خلافت کے متعلق پانسو علماء ہند کا وہ فتویٰ جسے حضرتؒ نے ممانعت خاص اہتمام سے شائع فرمایا۔

خالص آسٹریلین اون سے تیار کردہ
کاٹونی کے کمبل
پاس ہوں تو
جاڑوں کی کیا پرواہ
خوبصورت ڈیزائن
ارزاں مگر پائیدار
کاٹونی وولن ملز لمیٹڈ
اسماعیل آباد (ملتان)
کاٹونی سیلز ڈپو ۳۱ - دی مال لاہور

تازہ فرمادیا، "اللہم زد فزد" میں معافی کا خواستگار ہوں، کہ حضور سے لکھنؤ ملنے کے بعد اب تک خط نہ لکھ سکا، الہ آباد میں گاندھی صاحب سے پھر ملاقات ہوئی تھی اور مجھ کو بڑی خوشی ہوئی تھی کہ وہ دوسرے دن حضور سے ملنے لکھنؤ جا رہے تھے، اور حضور کے ہی مہمان ہوئے تھے، اخبارات میں تمام حال پڑھا تھا، امید ہے کہ وہ حضور سے مل کر مطمئن اور خوش ہوئے ہوں گے، مجھے اپنے بارے میں تو زیادہ لکھنے کی ضرورت نہ تھی، حضور سے تو عرض کر چکا تھا، اب ملاقات اور قدمبوسی کا اشتیاق ہے، خدا کے حکم کی پابندی ان معاملات میں اب تک کی ہے اور اب بھی بفضلہ تعالیٰ کسی قسم کا اضطراب ہم دونوں کو نہیں ہے، اطمینان سے یہاں زندگی بسر کرتے ہیں، ۴ دن ہوئے کہ چیف کمشنر اس صوبہ کے بیان آئے تھے، پہاڑ پکھرڑی کو جاتے تھے، یہی راستہ ہے، اُن سے ملاقات ہوئی، نہایت درجہ اخلاق سے پیش آئے اور بہت ہمدردی کی، ہم نے دریافت کیا کہ ہم کو معلوم ہونا چاہیئے، کہ کمیشن نے ہماری نسبت کیا رپورٹ کی اور گورنمنٹ نے اُس پہ کیا فیصلہ کیا، طرح طرح کی خبریں آتی ہیں مگر ہم کو آج ۴ ماہ ہوئے کوئی باضابطہ اطلاع نہیں ملی، اُن کو بھی تعجب تھا، کہ ایسا کیوں ہوا، ادھر یا اُدھر، جواب ضرور صاف صاف ملنا چاہیئے تھا، پھر ہم نے کہا کہ یہ نظر بندیاں بنظر تحفظ تھیں، نہ کہ سزاً، پھر کیوں ہم لوگوں پر ۱۵ ہزار روپیہ سالانہ جرمانہ ہوتا ہے، یہ وہ رقم جو ہم کو اپنی جیبوں سے سود میں ادا کرنی ہوتی ہے، گورنمنٹ ہم کو ۶۰ ہزار روپیہ واپس کردے، جو ہم نے سود کا ادا کیا ہے، اسکے علاوہ ہمارا الاؤنس کم از کم ۵۰۰ روپیہ ماہوار فی آدمی دسمبر ۱۹۱۷ء سے کیا جائے، اور ہم پر جو کمی الاؤنس کی وجہ سے قرض ہوگیا ہے تقریباً ۴ ہزار، وہ ادا کیا جائے، بچوں کی تعلیم کا سامان کیا جائے، اس الاؤنس میں کس طرح میں ۳ لڑکوں کو علی گڈھ پڑھا سکتا ہوں، کم از کم ۱۵۰ روپیہ ماہوار کا صرف ہوگا، بڑا لڑکا زاہد وہاں تقریباً ۷۰ روپیہ ماہوار صرف کرتا ہے لڑکیاں جوان ہو رہی ہیں، اُن کے مصارف اور تعلیم کا انتظام ہونا چاہیئے، اُن پر اثر پڑا اور اُنہوں نے تمام باتوں کے نوٹ لے لئے اور کہا میں اتوار کو (یعنی پرسوں) ۳۰ مارچ کو وائسرائے سے ملوں گا اور اُن سے مفصل گفتگو کروں گا، اور تم کو بعد کو اطلاع کروں گا، اُنہوں نے صاف صاف کہا کہ اس ۴ برس میں مجھ کو آپ حضرات سے کسی قسم کی شکایت نہ تھی، میں نے اپنے تمام ماتحت افسروں کو حکم دے دیا تھا کہ وہ آپ سے اخلاق سے پیش آئیں اور آپ کی ہر طرح کی مدد کریں، ہمارا کام فقط اس قدر تھا، کہ آپ کو چھندواڑہ میں رکھیں، دیکھیئے کیا نتیجہ نکلتا ہے، مالی نقصان دینا کسی طرح جائز نہ تھا، امید ہے کہ کچھ نتیجہ نکلے گا، حضور کو مطلع کروں گا، خدا کرے ہم سب یکجا ہوں، اور اطمینان سے اعلےٰ پیمانہ پر اپنے مذہبی فرائض ادا کریں، لکھنؤ کے خیال سے دل کو فرحت ہوتی ہے ایک تو حضور کا قرب، دوسرے تمام فرنگی محل کی پرجوش کام کرنے والی جمعیت، انشاء اللہ بہترین کام کرنے والے پیدا ہوں گے، حضور دعا فرمائیں۔ موسم یہاں پرلطف ہے، اور ٹھنڈا، عزیزی زاہد کا امتحان ختم ہوگیا، باوجود بیمار رہنے کے اُس نے پرچے اچھے کئے ہیں اور کامیابی کی امید ہے، حضور دعا فرمائیں، محمد علی کے گھر کے لوگ اور بچے غالباً والدہ صاحبہ بھی شروع اپریل میں یہاں آجائیں گی، میرا سلام مولانا سلامت اللہ صاحب بھائی الطاف الرحمٰن صاحب، قطب میاں صاحب، مولوی عنایت

اللہ صاحب، اور عزیزی صبغۃ اللہ صاحب تک پہنچوا دیجئے گا،

حضور کا خادم شوکت علی معتمد خادم الخدام کعبہ

بڑھتا ہے اور ذوق گناہ یاں سزا کے بعد

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ار مئی ۱۹۲۰ء (۵۵) اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم

حضور کا حکم نامہ ملا تھا، جس سے قلب کو تسکین اور اطمینان ہوا تھا، خدا کا شکر ہے کہ مسلمان دین کے کاموں سے اب غافل نہیں ہیں، اور ہر طبقہ کچھ نہ کچھ کر رہا ہے، یہ ضرور ہے کہ یہ کافی نہ تھا، ہم کو دین مقدس کے لئے ہر وقت جان سپر رہنا چاہیئے، انشاء اللہ وہ دن بھی جلد آئے گا، دنیا میں کوئی کام ایک وقت میں ہی مکمل نہیں ہوتا ہے، سامان خدا رفتہ رفتہ پیدا کرتا ہے، ہم لوگ دیکھتے ہیں کہ ان مصائب اور آزمائشوں کے ذریعہ خدا ہمارے ایمانوں کو دیکھ رہا ہے اور ہماری غفلت کو دور کرتا ہے، بعض نادانوں کی حرکات پر ہنسی آتی ہے، جو یہ خیال کرتے ہیں، چابک ہی ایک علاج ہے، اس کے ذریعہ سے نسل والے اور غیر نسل والے سب یکساں ہانکے جا سکتے ہیں، ان تمام واقعات سے جو پیش آتے ہیں، دل کو سرور ہوتا ہے، خدا کا شکر ہے کہ ہم لوگ بھی صرف تماشائی نہیں ہیں بلکہ خدائے برتر نے ہم کو بھی ایک ذلیل اور چھوٹا سا پارٹ دے دیا ہے، خدا صراط مستقیم پر قائم رکھے، حالی مرحوم خوب فرما گئے ہیں:-

تعزیر جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب ۔۔۔ بڑھتا ہے اور ذوق گناہ یاں سزا کے بعد

والدہ صاحبہ غالباً کل یا پرسوں یہاں سے مع میرے بچوں کے روانہ ہوں گی، حضور سے انشاء اللہ ضرور ملیں گی، رامپور چند ضروری خانگی امور کا تصفیہ کرنا تھا، عظیم الدین صاحب عزیزی الطاف پر کل یہاں قانون تحفظ ہند کی رو سے حکم ملا کہ وہ ۴۸ گھنٹے کے اندر چھندواڑہ ضلع چھوڑ دیں، امن عامہ اور خطرات ہند کے لئے مخدوش تھے، کل والدہ صاحبہ کے ہمراہ وطن جا رہے تھے، اُن کی بڑی عزت افزائی ہوئی، ہم اپنی آخری بیان والسرائے کو بھیج چکے ہیں، ۲۴ کو روانہ کیا تھا، اول کچہری کو ہی بھیجا گیا تھا، اب غالباً شملہ پہنچ گیا ہوگا، جواب تو معلوم ہے مگر مسلمان عمر بھر اُس وقت تک خاموش نہ ہوں گے جب تک کہ اُن کے مذہبی احکام کی پوری عزت نہ کی جائے گی، یہ معمولی بات نہ تھی، خدا حضور کو زندہ اور سلامت رکھے، اور ہمت اور استقلال عطا فرمائے، علماء کی بیداری اور بے چینی لازمی تھی، جب ہم گناہ گاروں اور جاہلوں کا یہ عالم ہے تو وہ لوگ وارث نبی صلعم تھے:-

فریاد و فغاں بلبل ناشاد کئے جا ۔۔۔ مہمان قفس خاطر صیاد کئے جا

فریاد ہو یا نالہ ہو یا آہ جگر سوز ۔۔۔ جو ہو سکے تجھ سے دل ناشاد کئے جا

آج خان جاتے ہیں، ہم سب مع اُن کے دیگر احباب کے اسٹیشن پہنچانے جاتے ہیں، وہ بفضلہ تعالیٰ مسلمان ہیں اور مضبوط، اس قسم کی تکالیف سے اُن پر کیا اثر پڑ سکتا ہے، یہ بھی خیر ہو جائے محمد علی کا خوب شعر ہے:۔

دورِ حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ۔۔۔ ہے ابتدا ہماری تیری انتہا کے بعد

انشاء اللہ حضور سے جلد ملاقات ہوگی، ورنہ حوضِ کوثر تو ہے ہی، دل آج کل خوش ہے، قلب میں حضور کی دعا سے کافی طاقت ہے، کفار کے سامنے مرعوب ہونا ناممکن ہے، حضور دعا میں یاد فرمائیں، انشاء اللہ قریب تر حضور کو مزید حالات سے مطلع کروں گا، ہم لوگ خدا کی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں، اور اُس کی امداد کی طلب ہے، شکر ہے کہ آنکھوں کا پردہ اٹھ گیا اور اب کفر اور اسلام کا فرق نظر آتا ہے، برادرم مولانا سلامت اللہ صاحب، بھائی الطاف الرحمٰن، قطب میاں صاحب، مولوی عنایت اللہ سب کو سلام مسنون،

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

چھندواڑہ (صوبہ متوسط) ۱۸ مئی ۱۹ء ۔۔۔ (۵۶) ۔۔۔ اللہ اکبر

اہلِ ایماں رکھتے ہیں کامل بہ فحوائے جنوں ۔۔۔ شان "لا خوف علیہم" شیوۂ "لا یحزنون" (حسرت)

حضور والا، السلام علیکم

حضور کا خط بلکہ دونوں خط اور تار ملے تھے، میں عرصہ سے لکھنے کا ارادہ کرتا تھا، مگر معمولی خط لکھنا بیکار تھا، اور اس بات کا مجھ کو یقین تھا کہ حضور اب ہمارا منشا سمجھ گئے ہوں گے، اور غلط فہمی کا اندیشہ نہ ہوگا، مگر یہ خیال غلط تھا، اس لئے میں چند ضروری گذارشیں کروں گا جن سے یقین کامل ہے کہ معاملات صاف ہو جائیں گے، اور غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی، حضور کو خط لکھتے ہوئے میں ہمیشہ ڈرتا ہوں، اس لحاظ سے کہ ممکن ہے کوئی لفظ ایسا نکل جائے، جس سے خلاف دلی محبت اور جذبات گستاخانہ معنی لئے جا سکیں، اگرچہ میں جانتا ہوں کہ حضور جب غیروں کا برا کہنا سن کر برا نہیں مانتے تو ہمیں نسبت تو گنجائش ہی نہ تھی، اُس زمانہ سے جب کہ میں قدمبوسی میں حاضر ہوا اب تک حضور کے اور ہمارے درمیان وہ تعلقات پیدا ہو گئے ہیں، جو انشاء اللہ آخر وقت موت تک قائم رہیں گے، پیری مریدی اور خدام کعبہ کے علاوہ حضور کو ہم اسلام کا سچا خادم اور جاں نثار جانتے ہیں، اور ہم کو یقین کامل ہے، کہ باوجود اور لاکھوں کمزوریوں کے حضور کو بھی اس بات کا یقین ہے کہ ہم اسلام کی توہین ایک منٹ کے لئے گوارہ نہیں کر سکتے اور اُس کے لئے جان و مال فدا کرنے کو طیار ہیں، یہ رشتہ خود اس قدر وسیع ہے کہ اس میں ہر سچے مسلمان کی کھپت ہو سکتی ہے، چاہے وہ سنی ہو شیعہ، حنفی ہو

یا غیر مقلد، اس قدر تمہید کے بعد میں چند باتوں کا حضور کو یقین دلاتا ہوں، تاکہ معاملات صاف ہو جائیں اور ہمیشہ کیلئے۔

(۱) ہم ایک منٹ کے لئے بھی یہ خیال نہیں کرتے کہ حضور عیش پرست یا آرام طلب ہیں، اور اس لئے اسلام کی راہ میں تکلیف اٹھانا گوارا نہیں کرتے "لاحول ولا قوۃ الا باللہ" حضور اسلام کے ایسے ہی سچے شیدا ہیں جیسا کوئی مسلمان ہو سکتا ہے، جان و مال قربان کرنے کا شوق ہے، مگر اس کو ضائع کرنا نہیں چاہتے، عمدہ غذا، عمدہ مکان، عمدہ لباس اور آرام کی زندگی سے دل میں نفرت ہے، اور اگر خدا یہ نشیمن حضور سے چھین بھی لے، تو حضور کو بجائے رنج اور افسوس کے خوشی ہو گی کہ اب تو اکابر اور صلحائے اسلام کی طرح خدا نے آپ کو بھی منتخب کر لیا،

(۲) حضور کی نیت ہمیشہ بخیر ہوتی ہے، اور بہادری سے اسلام کی خدمت کرنا چاہتے تھے ہیں، یہ کافی تھا، کہ حضور کو معلوم ہو جائے، تاکہ غلط فہمی کی گنجائش باقی نہ رہے، اور آپس میں فضول معاملات پر بحث نہ کی جائے

جس بات میں ہم کو شکایت ہے وہ یہ ہے کہ اگرچہ حضور پر الزام کم ہے۔

(۱) مسلمانوں کی کم ہمتی اور بے حسی سے جلد مایوس ہو جانا اور اس خیال سے کہ کام کا ارادہ کر کے ناکام رہنے سے کفار کی نگاہ میں ہم اور حقیر ثابت ہوں گے، اور وہ ہم پر اور مظالم اور زیادتیاں کریں گے اسے بہتر سمجھا کہ صرف ایسا کام کیا جائے جو کامیاب ہو سکے، یہ ایک حد تک صحیح تھا، مگر جب معلوم ہو گیا کہ مریض مہلک بیماری میں مبتلا تھا، تو پھر چشم پوشی کرنا بیکار تھا، پھر تو جان توڑ کر دیوانہ وار کوشش کرنا تھی، کہ علاج معالجہ وقت پر ہو جائے، اور صحیح طریقہ سے، اس وقت دشواریوں اور ناکامیوں کا کیا ڈر، سو مرتبہ ناکام رہیں گے اور ذلیل ہوں گے، اور پھر کوشش کریں گے آخر میں "ہمت مرداں مدد خدا" صحیح ثابت ہو گا، اس میں حضور مجھ کو معاف فرمائیں گے، کچھ قصور حضور کا تھا، مگر زیادہ تر ہم ساتھ والوں کا جو بے ہمت تھے، اور بجائے دل بڑھانے کے اعتراضات کی بوچھاڑ اور بحث مباحثہ سے پژمردہ کر دیتے تھے،

(۲) روزمرہ کے معمولی سیاسی معاملات میں لوگوں کی رائے سے جلد متاثر ہو کر رائے کو پلٹ دینا جس سے کام کرنے والوں کو یقین نہ تھا کہ کسی خاص مسئلہ میں حضور کیا کریں گے، اس میں کچھ قصور حضور کی ذہانت اور طباعی کا اور کچھ حضور کی مروت اور اسلامی شیوہ کا تھا کہ ان معاملات میں اپنی رائے کو جمہور اور احباب کی رائے پر بھروسہ کر کے بعض اوقات متضاد رایوں کا اظہار ہو جاتا تھا، اس بارے میں بھی میں حضور پر الزام زیادہ نہیں لگا سکتا، کیونکہ حضور کو خود اعتراف ہے کہ حضور کو سیاسی معاملات میں واقفیت نہ تھی، اور نہ کچھ بہت لگاؤ، مگر آج کل سیاسی معاملات اور مذہبی معاملات ایسے غلط ملط ہو گئے ہیں کہ ان کا علیحدہ کرنا دشوار تھا، اگرچہ مذہب اسلام میں سیاست اور مذہب کبھی جدا تھے ہی نہیں، مگر اب کفار کی حکومت میں مجبوراً ایسا امتیاز قائم کیا گیا ہے،

(۳) یہ میرے نزدیک سب سے بڑا الزام ہے کہ مذہبی احکامات کو بجائے صاف اور چند الفاظ میں ظاہر کرنے کے مبہم الفاظ کے دریا میں ملا دینا تھا، جس سے کافی ہدایت نہیں ملتی تھی، اور یہ کہ موٹے موٹے اصول لیکر ان کو بار بار نہ کہنا اور ان پر توجہ دلا کر مسلمانوں کو بیدار نہ کرنا، حضور نے بہت سے خطوط لکھے، اور خطبے پڑھے اور

سب میں اسلامی جوش اور سچائی بھری تھی، مگر وہ اس قدر پھیلی ہوئی تھی اور اُس کے گرد اس قدر توہمات جمع ہوگئے تھے کہ لوگ اُس سے ہدایت نہیں پا سکتے تھے، مثلاً حضور کو صاف کہنا تھا اور بار بار کہنا تھا، اور ہر جلسہ اور ہر موقع پر کہنا تھا، کہ خلیفۃ الرسول کے خلاف لڑنا، جب کہ وہ جہاد مقامات مقدسہ کی حفاظت کے لئے کرتا تھا، حرام تھا، بار بار اس پر زور دینا تھا تاکہ مسلمان سپاہی اور رسول والے عذاب دوزخ سے بچے رہتے، میرا ذاتی ایمان ہے کہ دین کے معاملات میں مصلحت وقت اور گلو خلاصی کا خیال دین کی کمزوریوں کا باعث ہوتا ہے، صاف سوال کا صاف جواب دیا جائے، اور اُس پر جمے رہنا چاہیئے، اور اگر ضرورت ہو تو اُس کی خاطر تمام تکالیف برداشت کرنا چاہئیں حضور نے سب کچھ کہا مگر بہت سی باتوں پر کہا، اصل بات اُن میں غائب ہوگئی یا کم از کم اُس پر کافی توجہ نہیں کی گئی حضور والا، میری عبارت بھونڈی ہے اور اکثر جگہ بے ربط مگر مجھ کو امید ہے کہ حضور میرا مطلب سمجھ جائیں گے، اور جہاں گستاخی ہوگی، اُس کو معاف فرمائیں گے، ہم کو حضور سے اس قدر توقعات ہیں اور اس قدر امیدیں ہیں کہ ہم چاہتے ہیں کہ اسلامی دنیا کو معلوم ہو جائے کہ حضور کے جسم میں کیسا سچا اور طاقتور قلب تھا اور دماغ تھا جو اسلامی بیداری اور برتری کے لئے، ہر وقت کوشاں تھا، حضور کا فتویٰ نہایت عمدہ کام تھا مگر بہرس دیر میں شائع ہوا اور اُس میں بھی یہ غلطی کی گئی کہ وہ فقط وائسرائے کو بھیجا گیا، اور مسلمانوں کو عام طور پر مختلف زبانوں میں ترجمہ کے ساتھ نہ ملا، تاکہ اُن میں بیداری اور قوت پیدا ہوتی، اور وہ اُس سے فائدہ اُٹھاتے، وائسرائے کو سب حال معلوم ہے، اُنہوں نے تو آنکھوں پر دیدہ و دانستہ اپنے حصول اغراض کے لئے پٹی باندھ لی ہے!

اب ہمیں تھوڑا اپنی نسبت عرض کرنا ہے، حضور ہم کو خوب جانتے ہیں کہ ہم لوگ عیش و آرام کے عادی فاسق و فاجر تھے، اور ہیں، ہم کو ان باتوں پر فخر نہیں ہے، مگر واقعات کو چھپانا بھی نہ چاہیئے، ہم شرمندہ ہیں، اور خدا سے دعا کرتے ہیں، کہ وہ ہم کو قلب مومن عطا کرے، اور ہماری گندگیوں کو دور کرے، تاکہ ہم سچے بندے ہو سکیں، ہم دنیادار ہیں، اور اُس کو کمانا خوب جانتے ہیں، بے ایمان نہیں ہیں کیونکہ بے ایمان واقعی دنیا میں پورا کامیاب نہیں ہوتا ہے، ملک کے سیاسی معاملات سے واقف ہیں اور اپنے مخالفین کے داؤں پیچ کو خوب پہچانتے ہیں، مگر خدا واقف ہے، کہ ان تمام ذاتی خواہشوں اور نفسانی خواہشات کے علاوہ اُس پاک پروردگار نے دل میں ایک چبھن بھی پیدا کردی ہے، اور وہ یہ ہے کہ اُس کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں جو خدا اور رسول اکرم صلعم کا دشمن تھا اور جس سے دین مقدس کو خطرہ تھا، جس کسی کو کافی تجربوں کے بعد اسلام کا دشمن پایا تھا تو اُس کی بیخ کنی اور دین مضبوطی کی فکر سے کسی وقت بے فکر نہیں رہے، ہم ضرور چاہتے ہیں کہ نیک نام ہوں، فقط شہرت نہیں چاہتے بلکہ نیک نامی کے خواہاں ہیں، مگر اُس کے ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ خدا ہم کو توفیق دے اور سامان دے، تاکہ ہم واقعی کچھ کام بھی کریں جس سے نیک نامی کے مستحق ہوں، غیر حقیقی شہرت نہیں چاہتے، ہم کو شوق ہے کہ خدا ہم سے کوئی خدمت لے مگر حضور جس صبر اور استقلال کے ساتھ اور جس قدر غور و فکر کے بعد ہم کام کرتے ہیں وہ یا تو ہمارا خدا جانتا ہے یا ہمارا دل ہم کو فخر ہے کہ ہم نظر بند کئے گئے اور اب تک آزاد صرف اس وجہ سے نہیں کئے گئے کہ ہمارے خیالات میں کچھ فرق نہ تھا، ہم آج بھی

ویسی ہی مستعدی کے ساتھ دین کی فکر میں ہیں جیسا کہ قبل نظر بندی کے تھے، احباب سے رنج ہے کہ انہوں نے ہماری اس ہم برس کے امتحان کے بعد یہ قدر کی کہ وہ ہمارے مشوروں پر اب یہ کہہ کر بدگمانی کریں کہ ہم اب نظر بندی کی مسلسل قیود سے اکتا گئے ہیں اور پریشان خاطر ہیں، ہم کو اس قدر دانی سے ضرور سخت صدمہ ہے، اور اس لئے صاف عرض کریں گے کہ چونکہ ہمارے احباب میں سے کثیر التعداد خود کم ہمت تھے، اس لئے وہ ہم پر الٹا الزام لگاتے ہیں، حسرت نے صحیح کہا ہے اور تجربہ کے بعد:۔

اپنا سا شوق اوروں میں لائیں کہاں سے ہم گھبرا گئے ہیں بے دلی ہمرہاں سے ہم

ہمارا قدم آج بھی آگے کو بڑھتا ہے، خدا کا شکر ہے، کیونکہ ہم اس عقل سلیم کو استعمال کرنے کے بعد ہر فعل کرتے ہیں، جو خدا کی طرف سے ہم کو عطا ہوئی ہے، ہم آج بھی اپنی قوم کو تمام اور قوموں سے بہتر جانتے ہیں، کیونکہ ہم ہر طبقہ میں پہلے ملتے رہے ہیں، اور اب بھی برابر ملتے رہتے ہیں، ہم کو صرف ایک دھن اور وہ اپنی رہائی کی نہیں، لا حول ولا قوۃ الا باللہ، بلکہ اعلائے کلمہ حق کی، اس کے لئے ہم بے چین رہتے ہیں اگر عمدہ خبریں ملتی ہیں، تو ہم خوش ہوتے ہیں، اور اگر مردنی اور بے ہمتی کی اطلاع پاتے ہیں، تو ہم کو صدمہ ہوتا ہے، مگر خدا نے ایسا قلب دیا ہے کہ تھوڑی دیر بعد وہ پھر مایوسی کو لات مار کر نکال دیتا ہے، اور خدا پر بھروسہ کر کے از سر نو عمارت بناتا ہے حضور والا ہم برس گذشتہ کا تجربہ ہمارے احباب کے لئے کافی ہونا چاہیئے تھا، اگر دسمبر ۱۹۱۴ء میں وہ خطبہ پڑھا گیا ہوتا جو ۱۹۱۸ء میں پڑھا گیا تو آج اسلام کی فتح یقینی ہوتی اور مقامات مقدسہ کفار کے ہاتھ میں نہ ہوتے، یہ تجربہ کافی تھا ہماری رہنمائی کے لئے، خدا کی نعمتوں کو ہم نے ٹھکرا دیا تھا، بغداد شریف، کربلائے معلی، نجف اشرف، اور بیت المقدس کو ذلیل اور ناپاک کرنے والے ہم اور آپ ہیں اور ہماری ذلیل اور بزدلی سکھانے والی سلطنتیں جو آخر میں ثابت ہو گئیں، کہ ناکارہ تھیں، ہم نے ہزاروں مسلمان سپاہیوں کو جہنم کا راستہ دکھایا، ہم نے "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر" کی بجا آوری میں پہلو تہی کر کے اپنے آپ کو دین و دنیا میں خراب و برباد کیا، اب ہم دیکھتے ہیں کہ وہی سلسلہ پھر جاری ہے اگر کچھ کمی ہے تو خود حکام کی حماقت اور دیوانگی کی وجہ سے وہ پھر وہی جبر و ظلم کا نسخہ استعمال کر رہے ہیں، جو کامیاب ہوا تھا، اور ہم پھر اسی تدبیر اور مصلحت بینی کے پیرو ہیں جس نے دنیائے اسلام کو تباہ و برباد کیا تھا، حضور اب یکسوئی سے کام کرنے کا وقت تھا، ہم کو صاف کہہ دینا چاہیئے کہ یا تو فوراً ہمارے تمام مطالبات پورے کرو ورنہ ہم پر مذہبی احکامات کی رو سے تمہاری امداد حرام تھی، بلکہ جہاد فرض تھا، حضور ہجرت کے خیال کو تو اب چھوڑ دیں اب تو جہاد کا حکم نافذ ہونے کا وقت معلوم ہوتا ہے، بحث و مباحثہ کا وقت نہ تھا، ہم نے احکام نظر بندی صرف اس وجہ سے توڑے ہیں کہ کچھ تو کیا جائے، جس سے احباب میں گرمی آئے، وہ خود افسردہ تھے، اور دوسروں کو بھی نامرد کرتے تھے ہم کو مشورے کی اب ضرورت نہ تھی، ہم کو اس امر کی اطلاع کی ضرورت تھی کہ ہر دوست یہ لکھے کہ میں نے اسلام کے لئے یہ کیا، عمل چاہیئے نہ کہ باتیں، میں حضور سے دریافت کرتا ہوں کہ ڈاکٹر انصاری کے خط کی کیا ضرورت تھی، جو دہلی میں پڑھا گیا، کہ تمام مظاہرے بند کر دو، اور گورنمنٹ کی امداد مجاہدین کے خلاف کرو امیر ہندوستان

ذبح کرنے کو نہیں آیا ہے بلکہ وہ تو دشمنان اسلام کی سرکوبی کو آیا ہے، تاکہ وہ قوم جس نے دیدہ و دانستہ باوجود صریح وعدوں کے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ، بیت المقدس، اور عتبات عالیات کو کفر کی ظلمت سے گندہ کیا ہے، اُس کو تباہ و برباد کرے اور ہم کو ہمارے احباب مشورہ دیتے ہیں کہ تمام مسلمان دشمنان اسلام کی حمایت کریں، اور مجاہدین کی خون ریزی، یہ کیا مصلحت ہے، اس سے تو کفار کی ہمت بڑھتی ہے، اور مسلمانوں کو صدمہ ہوتا ہے، یکسوئی کے ساتھ صاف کہنا چاہیئے، اور عمل بھی کرنا، گاندھی نے حال میں بمبئی میں مسئلہ خلافت پر ایک لاجواب لکچر دیا، "ینگ انڈیا" اخبار منگا کر ملاحظہ فرمائیں، اُس میں شائع ہوا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنے مطالبات فوراً فوراً صاف طور سے پیش کریں، اور اپنی مجبوریوں کا بھی صاف اظہار کریں، سنسر کو ہم خط وغیرہ نہیں بھیجتے ہیں، قیام یہاں پر ہے اور رہے گا، جب تک یہ ہم کو زیادہ تنگ نہ کریں احباب سے درخواست ہے کہ وہ ہم پر بھروسہ رکھیں، ایک طرف تو ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں ہم منتخب لیڈر ہیں دوسری طرف ہمارے مشوروں کو لغو اور بے کار بتایا جاتا ہے، یہ وقت شکوہ و شکایت کا نہیں ہے، ہم کو اپنے مطالبات صاف صاف بیان کرنا چاہیں، کہ ہم اس جنگ میں کوئی مدد نہیں دے سکتے الّا یہ کہ ہمارے مطالبات فوراً قبول کئے جائیں، تب انشاء اللہ صلح کرادیں گے، خط کے جواب کی ضرورت نہ تھی حضور آیندہ لکھیں تو لفافہ پر "وزیرن بی بی آیا" کوشتی محلہ چھندواڑہ تحریر فرمائیں، بھائی الطاف، مولینا سلامت اللہ اور تمام احباب کو خط دکھا دیجئے گا

حضور کا خادم

شوکت علی معتمد خادم الخدام کعبہ

نیز اور عرض کرنا ہے کہ جو کچھ شکایت کی گئی ہے اُس میں بہت سے عزیز اور احباب شامل ہیں، روئے سخن خادم الخدام کعبہ حضور کی طرف نہ تھا، بلکہ حضور سے جو شکایت تھی، وہ تو علیحدہ عرض کردی گئی تھی، اور وہ کچھ ایسی شکایت بھی نہ تھی، بلکہ ایک مشورہ تھا، کہ اب صرف ایک امر کی طرف توجہ کی جائے، محمد کی طرف سے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں، کہ جو کام ہم کرتے ہیں، آپس میں پورے طور پر مشورہ اور بحث کے بعد اگر اختلاف ہوتا ہے تو ہرگز نہیں کرتے، ایک اپنی رائے کا زور دوسرے پر نہیں ڈالتا، اپنی اپنی رائے کا اظہار ضرور کرتے ہیں، مگر عمل اسی وقت جبکہ کامل اطمینان کے بعد رائے دونوں کی قائم ہوجائے، حضور کو علم ہے کہ ہم دونوں بھائی نفس مطلب پر تو مجتمع ہیں، مگر طریقۂ عمل دونوں کا مختلف بعض اوقات سخت اختلاف ہوجاتا ہے، مگر بفضلہ تعالےٰ عمل کے وقت ہم مشورے اور باہمی تشفی کے بعد قدم بڑھاتے ہیں، یہ خیال کرنا کہ ایک دوسرے سے مرعوب ہوتا ہے، بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے، ہر کام کے تمام پہلوؤں پر غور کرلیا جاتا ہے، ترجمہ کے بارے میں حضور کے خط سے تسلی ہوگئی، حضور کا مشورہ صحیح اور درست تھا، مولوی صاحب نے اپنے خط میں اُس کی تفصیل نہیں کی تھی، جس سے غلط فہمی ہوئی، صاحب مطبع کو انجان پریشانی میں ڈالنا زیبا نہ تھا اُس کی اشاعت سے غرض صرف یہ ہے کہ مسلمان کلمہ حق کہنے کے عادی ہوجائیں، زمانہ بے حجابی کا آگیا ہے، خدا توفیق دے کہ ہر مسلمان کا قدم احکام الٰہی کے مطابق پڑے، اور سب مل کر اعلائے کلمہ حق کریں، اس سے اسلام کی عزت ہوگی، خاموشی سے جمود پیدا ہوتا ہے اقبال نے خوب کہا ہے:-

ہاں اسے شراب عشق یہ دن ہیں نمود کے   ایسی او چھل کہ خلوت مینا بھی چھوڑ دے

والدہ صاحبہ آگئیں، اُن کی ہمت مردانہ پر دل فریفتہ ہے، خدا اُن کو زندہ اور سلامت رکھے تاکہ وہ کچھ دیر دین کی خدمت کریں محمدؐ کا دست بستہ آداب کسی غیر معروف شخص مگر معتبر کا پتہ اور نام چاہیئے تاکہ اُس کے نام ڈاک سے جائے، حضور کو وہ دستی جا کر دے دے، حضور کے خط تو مشکوک تھے،

حضور کا خادم شوکت علی معتمد خادم الخدام کعبہ

نماز تہجد کی عادت

جیل بیتول (صوبہ متوسط) ۸ ر دسمبر ۱۹ء   (۵۷)   اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم

حضور کو مفصل خط لکھنے کو ہمیشہ دل چاہتا ہے مگر بس صبر سے کام لیتا ہوں، اور صرف مجبوری کے وقت لکھتا ہوں جب فضول بدگمانیاں یہاں پیدا ہوں تو خواہ مخواہ اُن میں کیوں اضافہ کیا جائے، جو تعلقات روحانی حضور سے ہیں، وہ ہم جیسے گناہگاروں کے لئے بہت کافی ہیں، بعد نماز تہجد حضور کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں اور بعد دعا کے سلام علیک پہنچا دیتا ہوں یہ دل کی تسکین کے لئے کافی ہے، جب خدا کا حکم ہوگا، تو اُس کے بدلے حاضر خدمت ہو کر قدمبوسی کروں گا، اور لکھنؤ میں اس قدر رہوں گا کہ کوئی شکایت کی گنجائش باقی نہیں رہے گی، بلکہ برادرم مولانا الطاف الرحمٰن کو بھی رقابت پیدا ہو جائے گی، دل کی تمنا ہے کہ جلد تر حضور کے ہمراہ حجاز مقدس کا سفر کروں اور یمن، نجد اور عراق میں بھی پھروں اور زیارت مقدسہ سے فراغت حاصل کر کے کچھ ثواب دارین حاصل کروں، جو لطف حجاز مقدس میں اب آئے گا پہلے نہ آتا، کیونکہ بڑی خدمت درپیش ہے،

لائے اُس بت کو التجا کر کے   کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے

برادرم مولانا سلامت اللہ صاحب کو ۵ نومبر کو ایک خط لکھا تھا، اور عزیزی خلیق الزمان صاحب کے پتہ سے بھیجا تھا خیال تھا کہ ضرور مل گیا ہوگا مگر اب تک جواب نہ آنے سے اندیشہ ہوتا ہے کہ ڈاکخانہ کی غلطی یا کسی اور وجہ سے وہ نہ ملا ہو، اخبارات سے جناب مولانا عبدالعزیز صاحب فرنگی محل مرحوم کے انتقال کی اطلاع ملی، دلی رنج ہوا، مرحوم سچے مسلمان تھے، اور ہماری خدام کعبہ سے دلی محبت رکھتے تھے، خدا مرحوم کو .... (کاغذ غائب) میں جگہ دے، اور تمام اہل خاندان کو صبر جمیل عطا فرمائے، .... (کاغذ غائب) تک پہنچا دیں بفضلہ تعالیٰ ہم لوگ تندرست .... (کاغذ غائب) کرا لیتا ہے اُس کی ذات کے ہوتے ہوئے کسی کی .... (کاغذ غائب) سے خدمت (کاغذ غائب) ....

کس طرح بیکار تصور کئے جا سکتے ہیں، اُس کی رحمت سے مایوسی کی کوئی وجہ ہی نہیں ہے، قلب میں طاقت ہے

اور اس ۵ برس کے تجربہ کے بعد بجائے پستی کے اور نئی قوت پیدا ہوگئی ہے، خاص کر یہاں کے دلچسپ قیام سے ہم لوگوں کی زندگی بہت پرلطف ہے، جب قدمبوسی حاصل کروں گا، تو مفصل حالات بیان کروں گا، اخبارات ۱۷یا۱۸ آتے ہیں، اور خوب وقت ملتا ہے کہ اُن کو پڑھیں، تمام معاملات سے خبر ملتی ہے، عزیزی خلیق الزمان سے بہت کچھ توقعات تھیں مگر افسوس کہ اُن کا لکھنؤ کا قیام مفید نہیں ثابت ہو رہا ہے، کل "ہمدم" پڑھ کر سید نذیر حسین پر افسوس آیا، کاش یہ سچ ہوتا، کہ حضور میں ذاتی ترفع اور آگے بڑھنے کا نیا شوق پیدا ہوگیا ہے، ہم کو تو سب سے بڑی یہی شکایت تھی کہ حضور تصنع سے اس قدر بھاگتے ہیں، اور اس قدر شرمیلے ہیں، کہ بعض اوقات کام کو نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، دنیا اس قدر تصنع کی عادی ہوگئی ہے کہ اُس کے بغیر کام چلنا دشوار ہے، ہم لوگ حضور کے لئے دعا کرتے ہیں، اور اب بہت خوش ہیں، حضور کی خدمات کا صلہ تو وہ قادر مطلق اور بادشاہ دو جہاں ہی دے گا، ہم کو یکسو ہو کر اُس کی خدمت کرنا چاہیئے، والدہ صاحبہ کی دوبارہ علالت کی خبر — ملی، ہم لوگ صرف دعا ہی کر سکتے ہیں، پہلے کی نقاہت موجود تھی، اب پھر بخار اور پیچش کی شکایت ہے وہی پرانی آنتوں کی خرابی ہے، جس سے خطرہ ہے، خدا مالک ہے، آج بارہویں ربیع الاول ہے، افسوس محفل میلاد میں شرکت اس سال نصیب نہیں ہوئی، مگر میں سیرۃ نبوی پڑھ رہا ہوں، جس کی ایک جلد مولانا سید سلیمان صاحب نے بھیجی تھی آج انشاء اللہ ختم ہو جائے گی، مولانا ابوالکلام صاحب کا تذکرہ حضور نے پڑھا، ضرور کلکتہ سے الہلال پریس سے منگوائیے مولف کے دیباچہ کے علاوہ خود تذکرہ نہایت درجہ دلچسپ اور قابل قدر ہے، محمد علی اچھے ہیں، سلام عرض کرتے ہیں، ہمارا سلام مسنون مولوی سلامت اللہ صاحب مولوی عنایت اللہ صاحب برادرم الطاف الرحمٰن

کاغذ غائب

.... احباب، عزیزی قطب میاں صاحب کو دیدہ بوسی، دعائیں حضور، ....

کاغذ غائب

.... نہ نقی سید فضل الرحمٰن صاحب کو بہت

کاغذ غائب

بہت پیار .... (خادم شوکت علی معتمد خادم الخدام کعبہ)

پپن چندر پال اور خلافت

اللہ اکبر

(۵۸)

قبلہ و کعبہ۔ السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ،

ابھی حضور والا کو دہلی کی تشریف آوری کے متعلق تار دیا ہے، میں پرسوں یہاں آیا ہوں، کلکتہ میں حضور سے رخصت ہو کر ڈھاکہ، کریم گنج، چٹاگانگ چاندپور میں قیام کیا اور وہاں کی حالت دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، نواب صاحب ڈھاکہ نہایت ہی سچے مسلمان نوجوان ہیں، اور اس مذہبی کام میں کوشاں ہیں اور آسام وغیرہ کا دورہ کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے، ڈھاکہ میں اہل ہنود نے خاص طور پر دعوت دی، اور چاء وغیرہ کے بعد خلافت اور جزیرۃ العرب کے

متعلق سوالات کئے، میرے جواب سے وہ متحیر ہوئے اور بولے کہ اس کا تو ہم کو علم ہی نہ تھا، اور اب ہم ہر طرح آپ کے ساتھ ہیں، اور واقعی دنیا کے مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے، چٹگانگ جس کا پرانا نام اسلام آباد تھا وہاں کے اہل ہنود بھی ہمارے اس مقدس کام میں کوشاں ہیں، اور ہمارے ساتھ ہیں، کریم گنج میں جو ضلع کی کانفرنس ہو رہی ہے اس کے صدر بپن چندر پال تھے، انہوں نے خلافت میٹنگ میں شرکت کی اور بنگلہ زبان میں وہ تقریر کی جو کوئی مسلمان نہ کرتا، ان سے بہت امید ہے، ابھی حضور کا خط ختم نہ ہوا تھا کہ محمد علی کا تار جو رامپور گیا تھا، ابھی ملا، جس کی نقل ملاحظہ کے لئے تحریر ہے،

میں نے ابھی راجہ صاحب کو تار دیا ہے، اور درخواست کی ہے ان کی امداد کی ضرورت ہے، اور وہ اپنی رائے سے مطلع کریں کہ انگلستان معہ رضا علی کے جائیں گے یا نہیں مہاتما گاندھی جانے کے لئے آمادہ ہیں اور بہ بڑی قوت ہے، اس تار کے مضمون سے معلوم ہوگا، کہ وہاں ان لوگوں کی ضرورت ہے، آسام کے سفر کے بعد کلکتہ آیا اور ایک دن قیام کر کے بمبئی کے لئے روانہ ہوا اور راستہ میں ناگپور و برہان پور قیام کیا مسلمانوں کی حالت ہر جگہ یکساں ہے اور اس کے ساتھ ہی ناگپور کے ہنود نے بھی میری تقریر سن کر وہی وعدہ کیا جو دوسری جگہ کے ہندوؤں نے کیا تھا، بمبئی آخر ماہ تک قیام کرنے کا ارادہ تھا تاکہ صدر دفتر میں کام کا پورا انتظام کر جاؤں امید ہے کہ جب تک مقیم ہوں یہاں کی حالت درست اور کام باضابطہ ہو جائے گا، ۲۲ کو دہلی پہنچنا ہے، جیسا کہ ابھی حضور کو تار سے مطلع کیا ہے، اور اس محمد علی کے معاملے کے بعد کو مشورہ کی اور بھی ضرورت ہے، مشیر صاحب کل تشریف لائے اور وہ اس وقت یہاں موجود ہیں فرماتے ہیں کہ حضور ۲۲ کو ضرور دہلی آئیں مہاتمہ گاندھی بھی آئیں گے،

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

گاندھی جی سے ملاقات

۱۹۲- ۱۸ مئی ۲۰ء　　　　　　　　نہایت ضروری

قبلہ وکعبہ، السلام علیکم

حضور کا گرامی نامہ جو چوک کے ڈاکخانہ کے سپرد ۱۴ مئی کو کیا یہاں ۱۸ مئی ۲۰ء کو پہنچا، لفافہ کی حالت سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کھولا گیا، اور مجھے یقین ہے کہ آپ کے اور ہمارے خطوط برابر کھولے جاتے ہیں، تاہم اس کی کوئی پرواہ نہ کرنی چاہیئے،

شرائط صلح کے اعلان کے بعد سے جو کچھ بھی ہیجان وسوہان روح ہم لوگوں میں نہ ہو وہ کم ہے، پھر بھی ہمیں اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے کی غرض سے ضرور غور وتحمل سے کام لینا پڑے گا، اس موقعہ پر خدا مولانا فاخر صاحب کا بھلا کرے کہ ہم لوگوں میں ایک تازہ روح پھونک دی انہوں نے سنت نبوی کی زندہ نظیر پیش کر دی جس سے

ہماری قوت ایمان میں اور اضافہ ہوا، اس قسم کی نظیر پیش کرنے کے واسطے ہر مسلمان کو تیار رہنا چاہیئے، دعا یہ ہے کہ پروردگار ہم سب کو توفیق استقامت دے، میں ابھی گاندھی مہاراج سے ملا تھا، اور سب کی یہ رائے ہے کہ مرکزی خلافت کمیٹی کا دفتر کسی صدر مقام میں ہونا چاہیئے یہ جگہ دور و دراز ہونے کے باعث اکثر لوگوں کو یہاں آنے میں دقتیں ہوتی ہیں، نہ معلوم کتنی جلد جلد جلسوں کا انعقاد ہو، اس وجہ سے یہاں سے صدر دفتر لے جانیکا خیال ہے، اُس کے واسطے تین مقام زیر تجویز ہیں، دہلی لکھنؤ اور الہ آباد، میری ذاتی رائے یہ ہے کہ صدر دفتر لکھنؤ ہونا چاہیئے، ۲۷ مئی کو ایک میٹنگ ہونے والی ہے اور مقام انہیں تینوں مندرجہ بالا مقامات میں سے تجویز کیا جائے گا، ۱۲ مئی والی میٹنگ میں انقطاع تعلق کا مسئلہ بالکل طے ہو گیا، اُس کے چار مدارج رکھے گئے ہیں، جن کا آپ کو بھی علم ہے، اس مسئلہ کے متعلق جو اعلان لکھا گیا تھا، وہ گاندھی مہاراج نے بغرض ترمیم رکھ لیا ہے کیونکہ وہ اعلان قبل از اشاعت شرائط صلح تھا، اور اب جب کہ ہماری قسمتوں کا فیصلہ ہو چکا اُس میں تغیر و تبدل کے بعد اُسے بہت جلد شائع کیا جائے گا، اب مرکزی کمیٹی کا کام نہایت شد و مد سے شروع کیا جا رہا ہے، پراونشیل کمیٹی سے ایک ایک نمائندہ آئے گا جو مرکزی کمیٹی میں رہ کر مستقل طور سے کام کرے گا، مولانا آزاد بھی وہیں رہیں گے، مہاتما گاندھی نے بھی طے کر لیا ہے کہ جس جگہ خواہ الہ آباد دہلی یا لکھنؤ میں دفتر ہو مقیم رہیں گے، "انقطاع تعلق" کے متعلق جو عہد نامجات ہیں انہیں چھپنے کے واسطے بھیجا جا رہا ہے اس وقت ہم لوگوں کی حالت نہایت نازک ہے، اور ضرورت ہے کہ اس وقت غور و تحمل سے کام لیں، ہیجان قلبی ان تمام مصائب کا ایک جزوی نتیجہ ہے، لیکن ہمیں اُسے دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اس وقت اس کا صحیح طریقہ سے اندازہ کرنا ہے، کہ کون کون ایثار کر سکتا ہے، اور کتنا کر سکتا تاکہ اس موقع پر کوئی بھی ایک قدم پیچھے نہ ہٹنے پائے، ۲۷ مئی کو جس جگہ میٹنگ ہوگی، وہاں صرف رہائش کا انتظام کرنا ہے، باقی کھانے پینے کے واسطے ہر شخص فرداً فرداً انتظام کرے گا اور غیر ضروری بار کسی پر ڈالنے کی ضرورت نہیں، اگر کوئی مکان لکھنؤ میں صدر دفتر کے واسطے مل جائے، تو آپ اُس کی کوشش کیجیئے، ہمارا دفتر اُس میں رہے گا، اور دفتر کے تقریباً ۲۰ یا ۲۵ اشخاص ہوں گے، اور علاوہ ازیں اتنی اور گنجائش ہو کہ اس میں مہمان وغیرہ بھی آکر تھوڑی بہت تعداد میں ٹھہر سکیں، ایک مکان تو اس قدر وسیع ملنا دشوار ہے، اس لئے متفرق مکانات قریب قریب ہوں تو بھی غنیمت ہے، جمن صاحب بہادر کا ایک مکان وکٹوریہ گنج میں تھا، سنا ہے کہ بڑا تھا، مگر خلافت کے لئے تو اُس کا ملنا دشوار معلوم ہوتا ہے، ان رامپور کے واقعات کے بعد خود چھٹانی میاں صاحب کا ملنا بھی ایسا ہی ہے، کہ صدر دفتر ہندوستان چلا جائے، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں وہ صدر بھی نہ رہ سکیں گے، اس وقت اُن کی مشکلات کا خیال بھی لازمی تھا، بد قسمتی ضرور ہوگی کہ ایسے وقت مقام تبدیل کیا جائے، مگر مجبوراً کرنا پڑے گا، خانگی طور سے خاص خاص احباب سے حضور مشورہ فرمائیں، میرے خیال لکھنؤ کا صدر مقام ہونا مناسب ہوگا، اور دہلی سے بہتر، ۲۷ مئی کو یہ اہم معاملہ اور معاملات کے ساتھ ساتھ پیش ہوگا، اس زمانہ

میں ہر مسلمان کو لازم تھا، کہ وہ وقتاً فوقتاً اپنے قلب اور ضمیر کا محاسبہ کرے، اور دیکھے کہ جو مشورہ وہ دے رہا تھا، نفسانیت اور ذاتی آرام کے لحاظ سے تھا، یا محض مقاصد کی بہتری کے لئے، میرے خیال میں ہر کام یکسوئی سے درست ہوتا ہے، اگر آشتی سے کام لینا ہے تو آشتی ہو اور اگر جنگ ہے تو پھر جنگ ہی ہو، دوطرفہ کارروائی میں نقصان کا احتمال ہوتا ہے، اس لئے میں نہایت ادب سے مشورہ دوں گا کہ ہم کو ۴ یا ۵ ماہ تک مسٹر گاندھی کا نسخہ سچائی کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے، پورے پرہیز کے ساتھ، اُس کی ناکامیابی پر ہم وہ کریں گے، جو خدا کا حکم ہوگا، صبر و استقلال اور ہمت سے کام کرنا ہے، اور خدا کے فضل سے امید ہے کہ وہ ہماری کوششوں کو باریاب کرے گا، ابھی حضور اور مولانا ابو الکلام صاحب کا تار ملا، ۱۱۱ اصحاب اب بلانا اور پھر دوسری میٹنگ جلدی کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے، ضروری امور کا فیصلہ خلافت کمیٹی ہی کرے گی، میں نے ابھی حضور کو حسب ذیل تار دیا ہے، "وقت کم ہے، ۲۷ کو میٹنگ طلب کرتا ہے، ممبروں کا دوبارہ آنا دشوار ہے، لکھنؤ میں اگر صرف رہنے کا انتظام ہوجائے تو کھانے کے مصارف ہم سب خود کریں گے، جواب تار سے دیجئے، الہ آباد سے میٹنگ کرنے کے متعلق کوئی جواب نہیں آیا ہے۔"

حضور کے خط کا منتظر رہوں گا، اور تار کا بھی، رات یہاں غریب مسلمانوں نے محلہ مدنپورہ میں بڑا جلسہ کیا، تقریباً ۲۰ ہزار آدمی تھے، انقطاع تعلق کی تحریک کو سب نے قبول کیا، چندہ غریبوں نے دیا اور کرہندہ مل میں کام کرنے والوں نے وعدہ کیا کہ باقاعدہ دیں گے، چھوٹانی میاں صاحب نے ابھی ٹیلیفون پر بلاکر کہا کہ میں آپ کو تار کردوں کہ "اگر لکھنؤ میں جلسہ کا انتظام مشکل ہو تو بہتر ہے بمبئی ہی میں میٹنگ بلائی جائے، الہ آباد میں بھی دشواری ہوگی"، میں نے مناسب خیال کیا کہ حضور اور مولانا آزاد فوراً یہاں تشریف لے آئیں، تاکہ زبانی گفتگو ہونے کے بعد تمام امور کا تصفیہ ہوجائے، مہاتما گاندھی یہاں کل صبح آئیں گے، میں اُن کو روک لوں گا، زیادہ کیا لکھوں، بہتر، شبیر حسین صاحب بھی ہمراہ آئیں، اُن کا انگلستان جانا اب تو بے کار معلوم ہوتا ہے۔

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

زندہ باد الہ آباد

۲۲ رمئی ۲۰ء (۶۰) اللہ اکبر

حضور قبلہ و کعبہ جناب مولانا صاحب، سلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

امید ہے کہ حضور بخیریت ہیں، عرض یہ ہے کہ پہلی دوسری جون کو الہ آباد میں جلسہ کرنے کا ارادہ ہے، وہاں سے دعوت بھی آگئی ہے، مہاتما گاندھی صاحب کو تار دیا ہے، امید ہے کہ وہ رضامندی دیدیں گے، تو اس حالت میں کوئی شبہ ہی نہیں رہے گا، یہ تاریخیں اس وجہ سے تجویز کی گئیں کہ ۳۰، ۳۱ مئی کو بنارس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہے، خلافت کمیٹی کی طرف سے ہندوستان کے ہر خیال کے ہنود صاحبان

کو بلایا ہے تاکہ وہ اپنا مشورہ دیں، اس صورت میں جو اصحاب آنا چاہیں گے، انکو آسانی ہوگی، خلیق اور شعیب
کو حضور مطلع فرمادیں، اور حضور کی شرکت اس موقع پر بھی ضروری ہے، حالانکہ گرمی کی تکلیف بہت سخت ہوگی،
بفضلہ تعالیٰ چھوٹانی سیٹھ صاحب اب کام کے لئے طیار ہیں، نہایت درجہ خوشی ہوئی، مفصل حالات زبانی بر
وقت ملاقات عرض کروں گا، اُن کا مجسٹریٹی استعفا بھی تیار رہے، دو چار دن میں یہاں بڑی میٹنگ ہوگی شرائط
صلح سے اظہار ناراضمندی لے لی، مولانا فاخر صاحب کی بیگم صاحبہ کو کل ۵۰ روپیہ خلافت کمیٹی کی طرف سے روانہ
کردیئے گئے، ور آئندہ بھی ہر امداد کے لئے تیار ہیں، خدا کا شکر ہے کہ الٰہ آباد نے اور ہمارے صوبہ نے اپنی زندہ
دلی اور بیداری کا ثبوت دیا، ایک ہزار پرسوں روانہ کروں گا اور اور روپیہ بھی بعد کو،

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

ہم لوگ اپنے نئے دفتر میں آگئے ہیں، یہ بھی عارضی کیونکہ اصلی مکان دو ماہ میں تیار ہوگا، یہاں کا کرایہ اور مصارف
سخت زیادہ ہیں کل سے وصولی چندہ بھی شروع ہوگئی ہے، یہ ٹیلر پہاڑ سے کیوں اور تکرار ہے ہیں، ایک تو مسلمانوں
کو تنگ کریں اور پھر امید رکھیں بفضلہ تعالیٰ ہم صابر و شاکر ہیں اور آخر تک صبر سے کام لیں گے،

کانگریس ہمارے قریب آتی جاتی ہے

(۶۱)

الجمعیۃ المرکزیۃ الهندایۃ للخلافۃ الاسلامیہ (بمبئی)

بمبئی، دفتر سنٹرل خلافت کمیٹی، ۱۵ر جنوری سنہ ۲۱ء

اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم

عزیزی سعید الرحمٰن نے حضور کے خطوط دکھائے، اُن سے مجھ کو فکر ہوئی، مگر میرا خیال ہے کہ مولانا سلامت
اللہ صاحب سے گفتگو اور مفصل حالات سننے کے بعد صحیح حالات معلوم ہوئے ہوں گے، حسرت بھائی تو فضول
گھبراہٹ پیدا کرتے ہیں، احکام الٰہی کے مقابلہ میں ہم کو کانگریس یا مسلم لیگ یا کسی ملکی انجمن کے احکام عزیز نہیں اور
نہ اُن کی پابندی ہم پر فرض ہے اور نہ ہم نے کی ہے اور نہ آئندہ کریں گے، ترک موالات خلافت کمیٹی نے تمام
مراحل ہمارے لئے طے کردیئے ہیں، اور ہم اُن پر کاربند ہیں، کانگریس قبول کرے یا نہ کرے، ہم تو احکام اسلام
کے پابند ہیں، صاف صاف ہمارا یہ مطالبہ تمام دیگر اقوام نے قبول کرلیا ہے، کانگریس خدا کا شکر ہے روز بروز ہمارے
قریب آتی جاتی ہے، مگر ہمارے لئے تو اُن کے کوئی احکام مذہب کے احکام کے مقابلہ میں نہیں، یہ مہاتما گاندھی
صاحب نے صاف صاف اپنی تقریر اور تحریر دونوں میں بارہا صاف کردیا، پھر ہمارے بھائیوں کو بیجا بدگمانی کا موقع
کہاں تمام اہل الرائے نے اُن الفاظ کو مسلمانوں سے غیر متعلق کہا، کیونکہ مسلمان کے لئے تو تمام احکام ۱۳ سو برس سے

نقل آ گئے ہیں، ایک دوسرے حضرت جو راوی دروغ بھی ہیں، ایک فرضی من گھڑتی قیاس پر کہ سنا ہے محمد علی صاحب
نے راجہ صاحب محمود آباد کو اس امر پر مبارک باد دی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاغذ غائب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ پر لعن وطعن شروع کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاغذ غائب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تو اہ مخواہ غلط فہمیاں پیدا کر کے تماشہ دیکھنا چاہتے ہیں، یہ وقت کام کرنے کا ہے، فضول وقت ان جھگڑوں میں ہم
ضائع نہیں کر سکتے، ہم کو ۸ ماہ کے اندر تمام اپنے مطالبات حاصل کرنا ہیں بفضلہ تعالیٰ تمام ملک نے ہمارے
اسلامی اصولوں کو پسند کر کے اُن کی پابندی کی، تمام ملک ایک ہو گیا، اس پر خدائے برتر کا شکر کرنا ہے،

(۲) مولانا عبد القدیر صاحب کا خیال نہایت اچھا ہے، ۲ ہزار اُنہیں کے لئے اور ایک ہزار مصارف کے لئے
بھیجے جاتے ہیں، زبانی گفتگو میں تمام معاملات اور کام کا طریقہ طے ہو جائے گا،

(۳) کل میں اور چھوٹانی میاں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مشیر حسین صاحب جہاز پر پہنچیں گے، اُن کو یہ خیال ہرگز نہ کرنا چاہئیے
تھا، کہ ہم لوگ اُن سے بدسلوکی کریں گے، اور وہ بھی اس طرح کی کہ کسی قسم کا اُن کے لئے انتظام نہ کریں گے، محمد علی سے
جو واقعات پیش آئے تھے، اور جن کی نسبت دو بدو گفتگو ہو جائے گی، ضرور رنج پہنچا تھا، نیز آغا خاں کا مشیر پر بہت
اثر ہے، اور خود اُن کی رائے کو بھی تلون ہے، اس لئے اُن سے گفتگو کرنا ہوگی مگر اس کے یہ معنی ہرگز نہ تھے، کہ ہم اُن کو
اپنے سے علیحدہ کر دیں گے ہم تو اُن کو ساتھ رکھنے کی از حد کوشش کریں گے، اور خدا سے امید ہے کہ کامیاب بھی
ہوں گے، حضور اطمینان رکھیں، اُن کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے گی،

(۴) خدا کا شکر ہے کہ رائے بریلی کے تمام کسانوں نے بھی ترک موالات با امن کی فتح کا ثبوت دے دیا، یہ واقعہ تمام
ہندوستان کے کاشتکاروں کو جگا دے گا، بٹلر اور اُس کے ہم رائے کب تک تعلق داروں کو ہمارے راستہ میں حائل
کریں گے، ہمارے کسان بھائیوں کا صبر و تحمل قابل ستائش ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاغذ غائب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کاغذ غائب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

حساب کتاب

(۶۲)

اللہ اکبر

بمبئی دفتر سنٹرل خلافت کمیٹی ۲۹ جنوری سنہ ۱۹۲۱ء

حضور والا، السلام علیکم

حضور کا خط مجھ کو کل بمبئی واپسی پر ملا، دو دن کے لئے احمد نگر اور مالی گاؤں و ناسک دورہ پر گیا تھا، معظم نے
بھی اپنے خطوط دکھائے، سیٹھ چھوٹانی صاحب کو حضور کا تار اور خط دونوں دیدیئے تھے، آج غالباً سیٹھ صاحب بھی
حضور کو علیحدہ خط لکھیں گے، مجھے بھی کہا کہ جب میں واقعات بیان کروں گا، تو حضور کو اطمینان ہو جائے گا،

جو امور کہ حضور نے اپنے خطوط میں لکھے ہیں، اُن کی نسبت کچھ مجھ کو کہنا تھا تاکہ حضور کو تمام حالات سے واقفیت ہوجائے، برادر عزیز الطاف الرحمٰن صاحب کو بھی خط دکھا دیجئے گا؛

(۱) عزیزی سعید الرحمٰن کی نسبت حضور کو علم ہے کہ میری ذاتی رائے بہت اچھی ہے، وہ نہایت درجہ متدین اور قابل آدمی ہیں، اور کام کے، اگر وہ دفتر میں ہی رہتے تو آج اُن کی بڑی قدر و منزلت ہوتی اور ہمارا بہت سا کام ہوتا مگر وہ سیٹھ صاحب کے خانگی معاملات میں گئے، ظہور احمد صاحب ... کا کچھ قصور نہیں ہے، وہ غریب فضول زد میں آگئے؛ اصل بات یہ ہے کہ کسی شریف تعلیم یافتہ شخص کی بمبئی میں بحیثیت ملازمت گذر دشوار تھی، یہاں کے لوگ ہی ان معاملات کو خوب بناتے ہیں، سعید نے بڑی غلطی یہ کی کہ جاتے کے ساتھ ہی اس محنت اور تندہی سے کام کیا کہ دفتر کی گذشتہ خرابیوں کا پردہ فاش ہوگیا، یہاں کے لوگ اُن کے دشمن ہوگئے اور طرح طرح سے اُن کے خلاف کارروائی کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھوٹانی صاحب اُن کی نسبت از حد خراب خیال رکھتے ہیں، اور میری کوشش ہے کہ اُن کو اور موقع دیا جائے بے سود ثابت ہوا، وہ ـــــ مفسد اور ضرورت سے زیادہ چالاک ہیں، میں نے بے کار سمجھا کہ زیادہ اور رکھوں، سعید سے بھی کہا کہ تمہاری گذر وہاں ناممکن ہے، میں دفتر میں خوشی سے اُن کو رکھنے کو تیار تھا، مگر سیٹھ صاحب اور کھتری صاحب دونوں اس کے خلاف تھے، اور میں نے مجبوراً یہ مشورہ دیا کہ تم بہتر ہے محمد علی کے پاس علی گڈھ چلے جاؤ، قومی مسلم یونیورسٹی کے لئے ایک محاسب کی سخت ضرورت تھی، محمد علی سے بھی کہہ دیا تھا سعید وہاں خوش رہیں گے اور کام کرسکیں گے؛

(۲) مجھ کو افسوس ہے کہ حضور کو مفسد لوگ خواہ مخواہ دوسروں کے خلاف لکھ کر پریشان کرتے ہیں، بفضلہ تعالےٰ ہم میں کا کوئی بد دیانت نہیں ہے اور نہ خائن، ہمارا ضمیر اس سے پاک ہے، اور خدا ہم کو اُس دن کے لئے نہ رکھے کہ ہم اس روپیہ سے اپنا گھر بھریں، حضور کے خط سے ہم کو رنج ہوا، کیونکہ شبہ پڑتا ہے کہ حضور کو بھی گمان ہے کہ ہم ایسا کرسکتے ہیں، بفضلہ تعالےٰ ہمارے احباب موجود ہیں جو ہماری کفالت کرسکتے ہیں اور آج تک میں نے پورہ حساب کردیا ہے، جو موجود ہے، کہ میری ذات پر تمام سال بھر کے دورہ میں کل ۲۰۱۰۰ ـــ ۱۵۵۱ر ۹ صرف ہوا اس سے دوگنا تو میں اپنا صرف کرچکا ہوں؛

(۳) دفتر کا حساب آخر دسمبر تک مکمل ہوگیا، یعقوب حسن صاحب نے اُس کو جانچا اور اب بطور یہ کمپنی آڈیٹر کے سپرد جانچ کی جائے گی، دفتر میں بھی کوئی بے ایمان نہیں ہے اور جو الزام لگائیں اُن میں اتنی جرأت ہونا چاہیئے کہ وہ آکر چور کو پکڑ دیں، ہم سب ممنون ہوں گے؛

(۴) میں انشاء اللہ دہلی ۱۲ کو ہوں گا اور وہاں سے لکھنؤ حاضر ہوں گا، ہمارے صوبہ میں کام کم ہوتا ہے اور فضول کے اعتراضات زیادہ ہوتے ہیں مجبوراً مجھ کو محمد محسن صاحب میرٹھی سے صاف صاف گفتگو کرنا پڑی تھی؛ حضور ان تمام حضرات سے کہیں کہ ایک مرتبہ پورے غور سے حساب کو آکر جانچ لیں اور پھر جو مشورہ ہو وہ دیں، میں ہرگز مشورہ اور اعتراض سے نہیں گھبراتا مگر صرف سنی سنائی باتوں پر سخت اخلاقی الزامات لگا دینا گناہ

ہوگا، کل شیر حسین صاحب آئیں گے، اُن کا تار ہمارے تار کے جواب میں آگیا؛ حضور اطمینان رکھیں
حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

کراچی جیل سے ایک خط

کراچی جیل معرفت سپرنٹنڈنٹ جیل کراچی، ۱۵ راکتوبر ۲۱ء (۶۳)

حضور والا، السلام علیکم

مجھ کو کچھ علم نہیں کہ میرے دو خط قطب میاں صاحب کو ملے یا نہیں، اور دو خطوط کا حال معلوم نہیں ہوتا، بہت دنوں سے خط نہیں آتے ہیں، کلکٹر کی معرفت آتے ہیں، اور خدا معلوم اُن کا وہاں کیا حشر ہوتا ہے، اب خطوں کے ذریعہ سے ہم آوارگان اسلام کو اور کوئی کیا آوارہ کرے گا، مگر شاید یہ بھی ایک سزا کا مزید طریقہ ہوگا مقدمہ اب ۲۴ راکتوبر کو ہوگا، خدا کا شکر ہے کہ زیادہ انتظار کرنا نہیں پڑے گا، نتیجہ تو معلوم ہے، مگر ہم چاہتے ہیں کہ ایک مرتبہ صاف فیصلہ ہو جائے، تاکہ تمام دنیائے اسلام متنبہ ہو جائے، سنا ہے روس آسٹی الہ آباد کا بونا بیرسٹر آئے گا، میں اُن سے واقف ہوں، اُس کے ہمراہ کوئی حضرت عالم بھی آئیں گے۔

حضرت ناصح گر آئیں دیدۂ و دل فرش راہ   پر کوئی ہم کو یہ سمجھاؤ کہ سمجھائیں گے کیا

لطف ہوگا، معظم صاحب نے غالباً حضور مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کو اطلاع دی ہے اور درخواست کی ہے کہ حضور تشریف لائیں، زیارت کا اشتیاق ہے، وہ نصیب ہو جائے گی، رہا کام تو یعقوب حسن صاحب سب سنبھال لیں گے، معظم صاحب کو تمام حالات سے اطلاع ہے، کام کرنے والوں میں اور اضافہ کرنا ہوگا دفتر میں آدمی کم رہ گئے ہیں، اختر علی یہاں آئے ہیں، کل واپس گئے، اُن کو میں نے شہر بمبئی کے مضافات کا کام علاوہ دفتر کے خطوط کے، جو میری طرف سے سارے ہندوستان کے کام کرنے والوں کو لکھیں گے سپرد کیا ہے، اشفاق کچھ دنوں تو والدہ صاحبہ کے ہاں رہ کر سکریٹری کی حیثیت سے کام کریں گے، عام ملک میں احباب سے درخواست کریں گے، کہ روپیہ بھیجیں اور والدہ صاحبہ کے ہمراہ دورہ پر جائیں گے، جب عثمان رامپور سے آجائے تو والدہ صاحبہ کے پاس رہ کر یہ کام انجام دیں گے اور اشفاق مدراس یا کسی دوسرے صوبہ میں کام کریں گے، عابد صاحب کو حضور یہ خط دکھا دیجئے گا، اور کہئے گا کہ اس کا جواب اور شکریہ خود بھی لکھ کر بمبئی کے پتہ سے بھیج دیں، ہم خوشی سے امداد قبول کریں گے، جس وقت ضرورت ہوگی، انشاء اللہ عزیزی عابد محنت سے پڑھ کر کامیاب ہوں گے، عزیزی سید الرحمٰن کے کام سے تمام لوگ یہاں خوش ہیں، نہایت محنتی اور فرائض کو پہچان کر کام کرتے ہیں، کام لینے والا چاہیئے، میں تو ایسے آدمی کو ہمیشہ اپنے پاس رکھوں جس کو خود کام کے تکملہ کی فکر ہو، گھبراہٹ بھی مفید ہے، کیونکہ اس سے محنت اور فکر کا پتہ چلتا ہے، بفضلہ تعالے

کام رکنے والا نہیں ہے، اقبال نے خوب کہا ہے،

نہیں ہے وجہ وحشت میں اوڑانا خاک زنداں کا — کہ میں اس خاک سے پیدا بیاباں کرکے چھوڑوں گا

تسبیح ملی اُس کو آنکھوں سے لگایا، صبح کو پڑھتا ہوں، خوب اطمینان ہے اور بہت آرام، اس قدر آرام ناممکن تھا، مولوی نثار احمد صاحب سے عربی بول چال اور صرف پڑھتا ہوں، خوب آدمی ہیں، اور بہت سچے مسلمان، اور نیک . قطب میاں، مولانا سلامت اللہ صاحب بھائی شوکت علی مولوی عنایت اللہ صاحب حکیم عبدالقوی صاحب، صبغۃ اللہ صاحب سب کو سلام مسنون، عابد صاحب کو پیار،

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

ترک موالات

(۶۴)

نگینہ ضلع بجنور — ضروری

۸ار اکتوبر ۲۱ء — اللہ اکبر

قبلہ وکعبہ، السلام علیکم

علی گڈھ تشریف لے جانا ضروری ہے، میں تار وخط بھیج چکا ہوں طلباء مذہبی ارشاد معلوم کرنیکے خواہشمند ہیں اُن کو اطمینان اور امداد کے لئے تشریف لے جانا لازمی ہے، میں لاہور جا رہا ہوں مہاتما جی امرتسر تشریف لے گئے ہیں، میں بھی وہاں جاؤں گا، ۱۱ کو بمبئی روانہ ہوں گے، دہلی سے محمد علی کا قیام یوپی میں ہوگا

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

اسی کاغذ پر پنسل سے حضرت رح کا نوٹ

بھائی شوکت کی تحریر سے معلوم ہوا کہ مجھے مسئلہ ترک موالات کی تلقین علی گڈھ کالج کے طلباء کو کرنا چاہیئے، میں خود آتا تمام جلسہ کرنے کا حکم خدا ظاہر کرتا، مگر میرا دل قابو میں نہیں رہتا ہے، اور نام نہاد مسلمانوں کی لاپرواہی اسلام کے اس بُرے وقت میں غصہ دلا دیتے ہیں اور مطلب بھی ادا کرنا ناممکن ہو جاتا ہے، موقع ومحل کی پرواہ نہیں رہتی ہے، اس واسطے میرے مخصوص احباب نے تقریر عام کرنے سے مجھے روک دیا ہے، اُن سے وعدہ کر چکا ہوں، مگر اب عام جلسہ کی شرکت سے ہی اپنے کو معذور سمجھتا ہوں، اس ——— میں نے شرکت جلسہ لکھنؤ سے اندازہ کیا ہے کہ میری ذمہ داری خدا کی جانب سے بہت سخت ہے جس کے لحاظ کرنے کی صورت میں خلافت کمیٹیوں کے مقاصد کا اندیشہ ہے میں کبھی خوف وخوشامد کی پرواہ نہیں رکھتا مگر مفاد اسلام کے باعث سخت ونرم ہو جاتا ہوں، اس وجہ سے وہاں آنا

قبول سمجھتا ہوں، مسئلہ اکابر علماء نے ظاہر کر دیا ہے اُس کی موافقت کرتا ہوں ترک موالات یوں ہی حکم رہے تھا، اب وفاداری اسلام کے لئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک یہ ہی ذریعہ تجویز کیا گیا ہے، جس میں تشدد و خونریزی نہیں ہوتی ہے، لہٰذا اس متعین صورت کو بجنسہ اختیار کئے بغیر کوئی چارہ ـــ نہیں ہے، فرض و فا ہر عاقل بالغ پر ہے، لڑکے کو باپ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے، اس فرض کو انجام دینا چاہیئے، کالج اگر ترک موالات نہ کریں تو اپنی تصفیہ پر عمل کرنا چاہیئے، اور خدا کے گنہگار رہونے کے علاوہ دوست ہندؤں کے ساتھ بے وفائی اور مسلمانوں کی موت میں مدد دینا ہوگی آئندہ کالج کا کیا حشر ہوگا اسکے سوچنے کی ضرورت نہیں ہے اگر ہم کامیاب ہوئے تو کالج ـــ ہوگا اگر نا کامیاب ہوئے تو ہم ہی نہ رہوں گے تو کالج سے کیا ہوگا اب یہ قوم کے عام افراد کے ہاتھ ہے کہ وہ زندہ رہنے کے خواہش مند ہیں تو ترک موالات کریں، دنیا بھی پاویں اور دین بھی حاصل کریں۔ ورنہ ہندوستان کی موت ہے، قیامت ہے، سوچنے کا وقت گذر گیا، میں نے اور مالوی نے اول مجلس مشاورت پر ترک موالات سے حصول مقصود ہونے کی مخالفت کی تھی، مگر میں جلد متنبہ ہوگیا، اور شریعت کی ہدایت کے باعث گاندھی صاحب کے اتباع میں اس کا خاص مؤید بن گیا اور مالوی نے رفتہ رفتہ مدارج ترک موالات کا موقف سمجھا یا اس سے ظاہر ہوگیا، کہ عقل دین و دنیا دونوں آخر میں ایک جگہ مجتمع ہوگئیں، مسلمانوں کا تامل خطرناک ہے۔

کراچی جیل کا زندانی

کراچی جیل معرفت سپرڈنٹ جیل ۲۶ راکتوبر ۱۹۲۱ء (۶۵)

اللہ اکبر

گر کہا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی ۔۔۔ یہ جنون عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

حضور والا، السلام علیکم

مولانا عنایت اللہ صاحب سے حضور کو تمام مفصل حالات معلوم ہوجائیں گے، وہ تو کل اس قدر خفا تھے کہ بمشکل تمام حکم دے کر اُن کو روکا کہ ہم کو نمیہ سے کام لینا ہے، ع دروغ گوید رخانہ باید رسانید" ہم لوگ فقیر خاک نشین، ہم کو کرسیوں کی کیا ضرورت تھی، مگر سخن فہمی عالم بالا معلوم شد۔

ہم کو اُن سے وفا کی تھی اُمید ۔۔۔ جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

حضور کے نہ ملنے کا افسوس ہے اور اس سے زیادہ حضور کی علالت سے سخت فکر ہے حضور پورے طور سے علاج فرما کر تندرست ہوجائیں کیونکہ ابھی اسلام اور دین مقدس کو حضور کی بہت ضرورت ہے، عزیزہ حضرتی سلمہ کی علالت سے بھی تشویش ہے، خدا اپنا رحم کرے، بھائی الطاف کے خطوط پڑھ لئے تھے حالات سے آگاہی ہوئی، حضور زیادہ فکر نہ فرمائیں میں نے چھوٹا نی میاں کو صاف صاف خط لکھ دیا جس

پر وہ ضرور توجہ کریں گے، یہ وقت جمع کرنے کا ہے نہ کہ بہترین کام کرنے والوں کو علیحدہ کرنے کا، کمیٹی کے واسطے بھی میں نے اپنی تجویزیں پیش کر دی ہیں، جو دہلی میں حکیم صاحب اور ڈاکٹر انصاری پیش کر دینگے مجھ کو امید ہے کہ تمام امور کا مناسب تصفیہ ہو جائے گا، میں نے صبر سے کام لیا، اور کسی کو تنگ نہیں کیا ان باتوں سے ہمارا کچھ نقصان نہیں ہے بلکہ خود اُن حضرات کا، مگر اس کام کو آخر تک، صبر و سکون سے کرنا ہے، انشاء اللہ نصرمن اللہ وفتح قریب' پریشانی نظر آتی ہے، بفضلہ تعالیٰ، ہم سب متفقہ طور سے کام کریں گے، اتحاد اس وقت لازمی ہے، حضور کی کوششیں انشاء اللہ بارآور ہوں گی، عزیزی عابد سے ملاقات ہوئی، وہ حضور کے سپرد ہیں اور قطب میاں صاحب سے اچھا اُن کو نگراں کون ملے گا شاہد کو بھی حضور کے ہی پاس بھیجے دیتا ہوں، اُس کی صحت کی طرف سے پریشانی ہے، تھوڑی اردو فارسی نکل جائیگی اور انگریزی وحساب بھی، سعید الرحمٰن کو میں سب سمجھا دوں گا، عزیزی سعید اس قدر توجہ اور محنت سے کام کرتے ہیں کہ ہر شخص اُن کا مداح ہے، خدا اُن کی کوششوں کو بارآور کرے، لکھنؤ کی جاء خوب پی اور ٹکڑے تو نہایت ہی لطیف تھے، مولوی نثار احمد صاحبؒ جو میرے قریب رہتے ہیں اُن سے بہت محظوظ ہوئے، میرے حصہ میں بھی شریک تھے، کیونکہ مجھ کو علم ہو گیا ہے کہ اُن کو میری طرح میٹھا کا بہت شوق ہے، حضور اس قدر سامان کھانے کا ہے کہ مکان حلوائی کی دوکان ہو گیا ہے، خدا بڑا غریب پرور ہے، آج تک تو اُس کے نام سے بہت کچھ ملا ہے، کل اگر تھوڑی تکلیف ملے تو شکایت کیسی، پیشگی مزدوری مل گئی تھی، میں بعد نماز صبح وظیفہ سعور کی تسبیح پر پڑھتا ہوں، اور اُس کو چوم لیتا ہوں بعد نماز سعور دعایں یاد فرمایں، قطب میاں صاحب اور سب چھوٹے صاحب زادوں کو پیار و دعا، خدا اُن کو عمر اور ایمان اور صحت عطا فرمائے، مولوی سلامت اللہ صاحب، مفتی صاحب، عزیزی صبغتہ اللہ، الطاف بھائی، اور سب کو سلام مسنون؛

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

جیل میں اذاں اور نماز

(۸۶)

۲۲ جنوری ۲۲ء

شوکت علی از کراچی (جیل)

اللہ اکبر

حضور والا، السلام علیکم

حضور کو خط لکھنے کا ارادہ تھا مگر آج موقع ملا ہے، اصل غرض تو مبارکباد تھی کہ مولانا سلامت اللہ صاحب بھی بھینٹ چڑھ گئے، اور فرنگی محل اب نیا رہے، حضور کا تار اخبارات میں حیدر آباد والا پڑھا تھا، اب عزیزی

ف پکے از اسیراز کراچی

سعید کی گرفتاری کا حال معلوم ہوا حضور ہماری طرف سے مبارکباد اُس کو اور بھائی الطاف کو دیدیں وہ نہایت بہادر اور کام والا آدمی ہے، اور مجھ کو اُس سے محبت ہے، ابھی ونسٹڈٹ کی تقریر کونسل میں موثر ہے، جس میں حضور کا تذکرہ خاص ہے، اور برادرم حسرت کا، ان احمقوں کو نہیں معلوم ہے، کہ اگر حضور کی کوششیں نہ ہوتی اور ہم مسلمان اس پر کاربند نہ ہوتے تو ہزاروں انگریزوں کا خون ہوگیا ہوتا، مگر یہ لوگ بے ایمان اور بدنیت ہیں، ختم اللہ علی قلوبہم الخ ان سے کسی بات کی توقع رکھنا بے کار ہے، خدا ہم سب کو استقامت دے اور سارا ملک اس جنگ عظیم میں شریک ہو کر قربانی اور استقلال اور شجاعت کا ثبوت دے، آمین، حضور کی کوششیں بے کار نہیں گئیں، اور آج سارا ہندوستان مضبوط ہے، بفضلہ تعالے ہم لوگ بفضلہ تعالی تندرست ہیں، اور حسب دستور خوش وخرم نماز عمدگی سے ہوتی ہے، اور میں دو قرآن پاک مع ترجمہ ختم کرچکا ہوں، ان لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ ہم لوگ ان معمولی دشواریاں اور کھانے پینے کی تکلیفوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتے، مگر ہاں کوئی ایسی بات نہ کریں گے، اور نہ اُس کی اجازت دیں گے جس میں احکام الٰہی کی توہین ہو، یا ملک وملت کی بے عزتی،

(۱) ہم سے داڑھی کے بارے میں گفتگو ہوئی، ان جیلوں میں دستور ہے کہ سب بال منڈائے جاتے ہیں، ہم نے کہہ دیا کہ جب تک جان باقی رہے گی اُس وقت تک ہم کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیں گے،

(۲) اذان سے انگریز نے مجھے روکنا چاہا میں نے بہت ملائم مگر طاقت سے سخت الفاظ میں صاف صاف کہہ دیا کہ احکام الٰہی کے بارہ میں مجھ سے زیادہ مت کہنا ہرگز امید مت رکھو کہ ہم اذان کو بند کرینگے، اب بفضلہ تعالے ۳ یا ۴ جگہ اذان ہوتی ہے اور پہلے کے مقابلہ میں تین گنے نمازی جیل میں ہوگئے ہیں۔

(۳) میں نے زاہد کی معرفت کل مہاتما جی کو لکھا ہے، کہ وہ اب صاف صاف ہدایات عام کرنیوالوں کو اجراکر دیں کہ وہ جیل میں تمام غریب قیدیوں اور ہندوستانی سپاہیوں سے اخلاق کا برتاؤ کریں مگر ایسا کوئی قاعدہ اور دستور نہ بنائیں جس میں اُن کو منگوٹی لگا روزمرہ جھاڑا لیا جائے، یا جیل کے پریڈ اور ــــــ بہت سے آدمیوں کے ہمراہ پاخانہ جانا، نہ گالیاں اور برے الفاظ سنے، مار کا تو کیا ذکر، ہم لوگ جو سربرآوردہ ہیں، اُن پر تو ہاتھ ڈالنا مشکل مگر ہمارے غریب بھائیوں اور کام کرنے والوں پر زیادتی ہوتی ہیں، اور اس لئے اب جبکہ بہت سے قیدی جیلوں میں آئیں گے، ہم کو اُن کو اول سے خوب سمجھا بجھا کر مضبوط کر دینا چاہیئے، تاکہ گربہ کشتن روز اول پر عمل کریں، ہمارے چند ہندو اور مسلمان بھائی جو قبل آئے تھے، وہ بہت مصیبت میں ہیں کھانا بند کرنا اچھا علاج نہیں ہے، اس سے تو ہم خود کمزور ہونگے بلکہ ہم کو تو خوب یہاں آرام لینا چاہیئے، تاکہ صحت اچھی ہو جاوے، کام سے ہم کو انکار نہیں کرنا چاہیئے مگر اُتنا کرنا چاہیئے جتنا آسانی سے ہو سکے، مگر برے برتاؤ کا علاج ایک ہے، مفید ہے، اور وہ یہ کام سے انکار کر دیا جائے اس میں آزمائش ضرور ہوگی، اور ابتدا میں تکلیف بھی مگر بعد کو مجبور ہو کر درست ہو

ہوجائیں گے تمام جیل کام بند کردے تو پریشان ہوجائیں گے، ہمارے خیال میں اب وقت آگیا ہے کہ جس طرح باہر زور سے کام ہوتا ہے، ہم لوگ جیل کے اندر بھی زور سے کام کریں، مگر وہی باامن ترک موالات آزادر کھتے ہیں، تو مصیبت، جیل بھیجتے ہیں تو بھی خرابی، یہ لوگ تب ہی مانیں گے، ضرور ہمت اور بہادری کا کام ہے، مگر بہترین نتائج نکلیں گے، میرا سب کو حضور سلام پہنچادیں، خاص کر مولانا سلامت اللہ، خلیق، شوکت علی، اور پنڈت موتی لال جواہر لال کو، ہم دونوں بھائی مقدمہ کے بعد سے نہیں ملے ہیں، یہ سزا ہی ہنسی کو آتی ہے، مولوی نثار احمد صاحب میرے ہمراہ ہیں، سلام کہتے ہیں اور نیک آدمی ہیں، محمد علی اب تنہا ہیں، مولانا حسین احمد صاحب احمد آباد جیل کو یکایک تبدیل کردیئے گئے، ہمارے تبادلہ کی بھی خبر تھی، مگر اب تک ملتوی رہا، اب کانفرنس کا نتیجہ معلوم ممکن ہے تبادلہ ہو پیر صاحب، اور کچلو محمد کے قریب ہیں، تمام جیل ہم سے محبت کرتا ہے، انسپکٹر جنرل آنے والا ہے، آج صبح انگریز نے جو میرا بہت مداح ہے، کہا کہ آپ بھی کمرہ کے باہر کھڑے ہو جیئے گا، اور بستر بھی باہر، میں نے قطعی طور پر انکار کردیا، ہم سب سے خلاق کریں گے، مگر کوئی بات بے عزتی کی نہیں کریں گے، ہم تمام بدمزگیوں کے لیئے تیار نہیں ہیں، میں جانتا ہوں کہ حضور اگرچہ مجھ پر بھی بہت شفقت فرماتے ہیں، مگر محمد علی سے خاص الفت ہے، مجھ کو قدرتی رشک ہے، اس لئے میں نے مجبور ہو کر فیصلہ کیا ہے، کہ چھوٹے صاحبزادوں کو میں اپنا کرلوں، محمد میاں، نور میاں، اور صاحب زادی صاحب میری پارٹی میں ہوجائیں، میں یہاں ہوں ہوں، مگر غالباً بدمیرا کام کرتا ہے اور وہ بہت ہوشیار ہے، مولانا عنایت اللہ اور سعید کہتے تھے کہ صاحبزادے اس پر بہت ملے ہیں، اگر پدر نتواند پسر تمام کند، سیٹھ صاحب کو اور قطب میاں کو سلام!

حضور کا خادم شوکت علی خادم کعبہ

بخدمت جناب مولانا عبدالباری صاحب

مضمون واحد ہے، خداوند کریم کا فضل ہے صحت اچھی ہے، گو وزن ۱۲ سیر کم ہوگیا ہے، حفظ کیا ہوا سب بھول گیا تھا، مگر اب تک دو پارہ پھر حفظ کر لئے ہیں، اور نماز فجر میں سورہ بقر کی دو سَو سے زائد آیات کی تلاوت ہوجاتی ہے، گھر سے اطلاع ملی تھی کہ لڑکی کے مردہ اولاد ہوئی ہوئی تھی، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ لڑکی خود بچ گئی، دعا فرمائیے میرے لئے دعا کی سخت ضرورت ہے کہ تزکیہ نفس ہوجائے، نفس امارہ بہت ستاتا ہے، فتح کی امید قوی ہے!

تمہارے فضل کے بھوکے یقین رکھتے ہیں　　　کہ عید آئے گی بے شک مہ صیام کے بعد

(محمد علی)

۲۲ جنوری ۱۹۲۲ء

تحریکِ خلافت کے زمانے کے بعد
اولڈ بوائے بھوپال میں ایک مقالہ

شکوہ و شکایت

ایک درد بھرے دل کی صدا!
مولانا شوکت علی کے قلم سے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف ✲ آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

برادرِ عزیز، سلام علیکم۔ آپ کے حکم کی تعمیل مجھ پر فرض تھی۔ میں محبت کا بندہ ہوں۔ اور جس سے محبت ہوتی ہے۔ اس کے حکم کو بغیر چون و چرا مانتا ہوں۔ جو میرے تعلقات علی گڑھ سے تھے اس کا سب کو علم ہے مجھ کو دہرانے یا جتانے کی ضرورت نہیں۔

کہتے ہیں قدیمی ہے وہ یار ہوں تیرا ✲ زلفیں بھی نہ تھیں جب سے گرفتار ہوں تیرا

علی گڑھ پر کوئی مضمون لکھتے ہوئے مجھ کو دشواری نہ ہونی چاہئے۔ مگر آج اس وقت ایک ایک لفظ نکالنے کے لئے دل کا زور صرف کرنا ہوتا ہے۔ جیسے بھینسا لدی ہوئی بھاری گاڑی کو ریتے میں ساری طاقت صرف کر کے کھینچتا ہے۔ ؎

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد ✲ پر طبیعت ادھر نہیں آتی ؏

میری طبیعت میں دل آزاری یا دل شکنی نہیں ہے۔ تھوڑی بہت مروت بھی آنکھ میں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسی بات لکھوں جس سے کسی کا دل دکھے۔

میرے سامنے بفضلہ تعالیٰ نصب العین موجود ہے مجھے فرصت بھی نہیں ہے۔ کہ فروعات میں پڑ کر غیر ضروری جھگڑے یا مناظرے چھیڑوں۔

اولڈ بوائے کی پالیسی کا بھی آپ نے صاف صاف اظہار کر دیا ہے۔ اور اس سے پہلے بھی میں جانتا تھا۔ مگر میں کیا کروں مجبور ہوں۔ آپ سے اور تمام پڑھنے والوں سے معافی کا خواستگار ہوں۔ کہ میری بیوقت کی شہنائی سے برا نہ مانیں۔ ایک مرتبہ جو کچھ میرے دل میں ہے ظاہر کر دوں۔ محمد علی کے ایام جاہلیت کا ایک پرانا شعر اس ضمن میں موزوں ہے۔ ؎

تیری خاطر بھی ہے مدِنظر پاس ادب بھی ہے ✲ مگر میں کیا کروں دل کی جلن کچھ اور کہتی ہے ؏

اولڈ بوائے کے پڑھنے والے سب جانتے ہیں کہ مجھ کو علی گڑھ سے کتنی محبت تھی۔ مجھ کو اس سے کیسی کیسی توقعات تھیں مجھے یقین کامل تھا۔ کہ دنیا میں اسلام از سر نو علی گڑھ کے پڑھے ہوؤں کی کوشش سے چمکے گا، علی گڑھ کا نام دنیا میں بلند ہوگا اور ہم لوگ جس طرح اپنی کرکٹ اپنی ہاکی اپنی فٹ بال اپنے لباس اپنے مذاق پر فخر کیا کرتے تھے۔ اسی طرح اسلام و دین مقدس کی بڑی بڑی

عزت کرنے کے بعد اور بھی ہم زیادہ فخر کرسکیں گے۔ ہمارا آپ کا بھائی چارہ کوئی معمولی بناوٹ کی چیز نہ تھا۔ بلکہ دراصل ہم سب ایسے تھے۔ اور دنیا چاہے کچھ کہے ہم ایک دوسرے کے غم گسار اور مونس تھے اس پر میرا کامل ایمان تھا۔ اور اس کے زور پر میرا سارا کام تھا۔ اور اسی کے زور اور بھروسہ پر میں ساری دنیا میں منستا کھیلتا سر کو اونچا کئے ہوئے چکر لگایا کرتا تھا۔ عزیز و اقارب ساتھ دیں یا نہ دیں، دنیا کے اور دوست رفاقت کریں یا نہ کریں۔ مگر ہمارے علی گڑھ کے دوست اور بھائی ہم سے ہرگز جدا نہیں ہیں، تمام کھیلوں اور تمام جلسوں اور تفریحوں کے ساتھ ساتھ یہ ہی ایک بات مستقل طور پر ہمارے اور سب کے دلوں میں تھی کم از کم میرے دل میں تو تھی۔ کہ اسلام کے بہترین کام کرنے والے علی گڑھ سے ہی نکلیں گے۔ ہم لوگ طالب العلمی کے زمانہ میں نماز سے دل چراتے ہوں، مسجد میں فرضی حاضریاں لگواتے ہوں، جرمانہ بھی اپنے حقیر جیب خرچ میں سے خوشی سے دیتے ہوں۔ دینیات کی تعلیم کے گھنٹوں کو ہنسی مذاق میں اڑاتے ہوں۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ہی بار بار اور روزمرہ سنتے سنتے یہ ہمارے ضمیر میں داخل ہوگیا تھا کہ جب کبھی اسلام پر کوئی وقت آئے گا۔ علی گڑھ سے ہی اس کے علمبردار اٹھیں گے۔ اور مست جوانوں کی بڑی جماعت سب کاموں کو چھوڑ کر صرف دین کی حمایت کے لئے کھڑی ہو جائے گی جہاں تک میں علی گڑھ اور بانیٔ علی گڑھ کی تعلیم کا مقصد سمجھا تھا۔ وہ تو یہی تھا جیسے خود سرسید مرحوم بار بار اپنی تقریروں میں دہرا چکے تھے کہ فلسفہ اور سائنس ہمارے سیدھے ہاتھ میں ہو۔ ریاضی اور تاریخ ہمارے بائیں ہاتھ میں ہو اور ہمارے سر پر تاج کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللهِ کا ہو۔

آج میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہوں کہ ہمارے سیدھے ہاتھ کس قدر فلسفہ اور سائنس ہے۔ ہمارے بائیں ہاتھ میں کس قدر ریاضی اور تاریخ اور دیگر علوم جمع ہوتے ہیں مجھے تو کوئی چیز نہ دائیں ہاتھ میں نظر آتی ہے نہ بائیں ہاتھ میں نظر آتی ہے۔ اور اگر ہیں تو وہی معمولی سستی بے کار چیزیں کہ جو کلکتہ مدراس بمبئی الہ آباد ۔ لاہور ۔ لکھنؤ ۔ ناگپور ۔ پٹنہ وغیرہ کی یونیورسٹیوں میں ماری ماری پھرتی ہیں۔ اور چند حقیر روپیوں کی لالچ میں ہم نے اپنے سر سے تاج کلمہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ کو بھی اتار پھینک دیا۔ اس کے بغیر اگر ساری دنیا کے زر و جواہر ہمارے جسم پر ہوں تو وہ ہمارے لئے لعنت اور پھٹکار کا زیور ہیں اور ان سے نہ ہماری دنیا کے سامنے عزت اور نہ خود اپنے دل میں خود اپنی وقعت۔

یہ ضرور ہے کہ مدرسۃ العلوم مسلمانان یا محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج یا ایم، اے، او کالج اب مسلم یونیورسٹی ہوگیا ہے۔ بجائے پریذیڈنٹ سکریٹری اور پرنسپل کے اب چانسلر وائس چانسلر۔ پرو وائس چانسلر پرووسٹ اور بہت سے گونجتے ہوئے بھاری بھرکم عہدے موجود ہیں۔ یونیورسٹی کے رجسٹرار بھی ہیں۔ اور یونیورسٹی خود اپنی ڈگریاں بھی دیتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ ایک لاکھ روپے سالانہ آمدنی میں اضافہ ہوگیا۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب کہ اکتوبر ۱۹۲۰ء میں اور محمد علی علی گڑھ میں گئے تھے سینکڑوں کی تعداد میں طلبہ یونین کلب میں جمع تھے۔ اسٹیشن یا اسٹاف سے زیادہ توقع نہ تھی۔ ان کا اختلاف کرنا زیادہ تعجب کی بات نہ تھی۔ لیکن نوعمر نوجوان بھی موجود تھے جن کی رگوں میں گرم خون اور دنیا کے نفع نقصان کو سمجھانے والا کیمیاوی مادہ تھا۔ جوان کی امنگوں پر سرد پانی کا کام کرتا تھا۔ تقریباً پچاس برس سے ایک خاص مقصد کو لے کر ہم تیاری کر رہے تھے، جب کام کا وقت آیا۔ اس مقصد سے ایک بڑی جماعت نے منہ چرایا۔ اور وہ مسلمان جس کی شان میں لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ہے۔ وہ ظاہری جبروت اور سطوت سے مرعوب ہوکر بیٹھ گئے۔

ہمارے بہادر اور دیوانے حسرت نے خوب لکھا ہے ؎

اہل ایمان رکھتے ہیں کامل بہ فتوائے جنون
شانِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ شیوۂ وَلَا یَحْزَنُوْن

یہ تھیں میری توقعات اور ان توقعات کے ہوتے ہوئے جو نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں، اور مجھے گمان ہے کہ میرے سینکڑوں علی گڑھ کے اور بھائی بھی سمجھ سکتے ہوں گے۔ ان باتوں سے مجھ جیسے دیوانے کا دل کس درجہ کڑھا اور ٹوٹا ہوگا۔

میں اس وقت علی گڑھ اور اولڈ بوائز لاج میں موجود نہ تھا۔ جبکہ محمد علی سے ملنے اور اوس پر زور ڈالنے کے لئے کہ وہ اپنے کالج کو ترک سوالات کے ذریعے سے غلامی سے آزاد نہ کرائے۔ ایک جم غفیر میور رشدہ اولڈ بوائز کا علی گڑھ میں جمع ہو گیا تھا

حضرت ناصح جو آئیں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی ہم کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

میں اسے جانتا ہوں اور کسی کے اقرار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہ بہت سے لوگ بادل ناخواستہ مجبور ہو کر آئے تھے بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے واقعی کالج کا بُت خدائے برتر کے علاوہ اپنے دلوں میں بٹھا رکھا تھا۔ کہ کچھ ہو۔ اسلام جائے ملت تباہ و برباد ہو مگر یہ قومی تعلیم گاہ خطرے سے محفوظ رہے۔

میں اختلاف خیالات کے سننے کے لئے تیار ہوں۔ مگر اتنا بغیر کہے نہیں رہ سکتا۔ کہ ہم علی گڑھ والوں نے اپنی اس کمزوری سے مسلمانوں کے قلوب پر ایک بہت بڑا دھکہ لگایا۔ یونین کلب میں تقریر کرتے ہوئے میں نے بھرائی ہوئی آواز اور تر آنکھوں سے اپنا پیام محمد علی کی تقریر کے بعد سب کو دیا تھا۔ اور کہا تھا کہ "اگر تیس پینتیس ہزار گورنمنٹ کی سالانہ گرانٹ کالج نے اس اسلام پر آڑے وقت میں قربان کر دی۔ اور اسلام کی عزت رکھ لی تو مسلمان اوس کو ہرگز فراموش نہ کریں گے اور اگر روپیہ کی ضرورت ہوئی۔ تو اس کے بدلے اگر کالج ایک کروڑ مانگے گا تو ایک کروڑ بھی دیں گے"

اس وقت پانیر اور انگریزی اخبارات نے میرا مذاق اڑایا تھا۔ مگر زمانے نے دکھا دیا۔ کہ باوجود ایک بڑی تعلیم یافتہ جماعت کی امداد نہ ہوتے ہوئے بھی ۷۰-۸۰ لاکھ روپیہ مسلمانوں نے اسلام کے نام پر قربان کر دیا۔ اور انشاء اللہ میں اور آپ اور سب دنیا جلد اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گی۔ کہ باوجود آج کی سرد مہری اور سرد بازاری اور آپس کے نفاق اور کم ہمتی کے مسلمان ایک مرتبہ نہیں بلکہ متواتر ایک اور دو کروڑ روپے سالانہ جلد تر اسلام کی حمایت اور اسلامی تعلیم کے لئے مہیا کر دیں گے۔

ایک وقت تھا کہ علی گڑھ کے پڑھے ہوؤں کو لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ ہر شخص اپنے آپ کو اولڈ بوائے اور علیگ، لکھتے اور کہتے ہوئے فخر کرتا تھا۔ اور جانتا تھا کہ اس کا اتنا کہنا سب کی نگاہ میں عزت حاصل کرنے کے کافی تھا۔ آج علی گڑھ یونیورسٹی ہے۔ ڈگریاں اپنی دیتی ہے۔ بڑے بڑے نام کے عہدہ دار ہیں۔ گورنمنٹ سے بھی شاید ایک لاکھ روپیہ سالانہ عطیہ ملتا ہے۔ سنا ہے پانچ لاکھ روپیہ سالانہ کی آمدنی ہے۔ نئی نئی عمارتیں اور تیار بھی ہو رہی ہیں۔ سوئمنگ باتھ بھی جس کا مجھ کو ہمیشہ سے اشتیاق تھا تیار ہو گیا ہے۔ کالج کے گرداگرد بہت سے بھائیوں کے خوشنما بنگلے بھی بن گئے ہیں۔ گرسنہ ۱۹۲۰ء کے امتحان کے وقت فیل ہو جانے کی وجہ سے اللہ اور اس کے رسول اور ان پر ایمان رکھنے والوں کی

نگاہوں سے وہ اور اس کے گریجویٹ گر گئے ہیں۔ اور آج وہ لباس فاخرہ پہنیں۔ ہندوستان کے لباس خاصکر کھدر سے حقارت برتیں۔ سول سروس اور اعلےٰ فوجی عہدے پائیں۔ مگر مسلمانوں کی نگاہ میں ان کی کوئی وقعت نہیں اور میں رنج سے کہتا ہوں دل کے درد سے مجبور ہو کر کہتا ہوں۔ کہ نہ اُن کے سیدھے ہاتھ میں "فلسفہ و تاریخ" ہے نہ بائیں ہاتھ میں "ریاضی و سائینس" ہے اور نہ سر پر تمغۂ امتیاز و فخر کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کا تاج ہے اور میں تو اس رائے پر مضبوطی سے آگیا ہوں کہ مسلمان کے لئے بغیر سر پر تاج کلمۂ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ کے داہنے اور بائیں ہاتھ میں علوم تو کیا ایک پھوٹی کوڑی بھی نظر نہیں آئے گی۔

آج علیگ ہونے پر کون فخر کرتا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اسٹیشنوں پر بازاروں میں مختلف شہروں میں اگر کوئی مسلم یونیورسٹی کے نئے تعلیم یافتہ نظر بھی آتے ہیں۔ تو باوجود عمدہ کوٹ یا شیروانی۔ ترکی ٹوپی یا ہیٹ کے مسلمانوں کے مجمع سے شرما کر اور کترا کر نکل جاتے ہیں۔

میں یہ طنزاً نہیں کہتا ہوں۔ بلکہ دل کے رنج کے ساتھ ایک امر واقعہ کا اظہار کرتا ہوں۔ غریب جامعہ ملیہ اور اس کے کھدر پوش اور غریب طلبہ کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ عمارتیں نہیں تھیں اسٹاف بھی بڑا نہیں تھا مالی حالت بھی خراب تھی۔ مگر جو لوگ اُس کے سچے کارکن تھے۔ اوّل تو میں کہتا ہوں کہ دُنیا کی نگاہ میں خود مسلم یونیورسٹی کے طلبہ کی نگاہ میں ہر شخص کی یہاں تک کہ دشمنان اسلام کی نگاہ میں بھی اور ان سے بغض و دشمنی ہونے کے ساتھ ان کی عزت اور وقعت تھی۔ ممکن ہے کہ ہم میں سے بعض ارکان کی کمزوریوں نے اس نام کی عزت کو دھکا لگایا ہو۔ مگر اس امر واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا۔ کہ قربانی اور ایثار اگر انسان جان بوجھ کر اختیار کرے تو ناممکن ہے کہ دُنیا اس کی عزت نہ کرے اور دنیا کرے یا نہ کرے خود اس کا قلب اُس کو خوش اور مسرور رکھتا ہے ؎

طمع فاتحہ از خلق نداریم نیاز ؛ عشق من بر رپس من فاتحہ خوانم باقی است

فروری کے مہینہ میں جب میں دہلی تھا۔ تو کئی طالب العلم مسلم یونیورسٹی کے میرے اور محمد علی کے پاس آئے اور علی گڑھ کے جلسوں کی شرکت کی دعوت دی۔ اور بہت اصرار سے کہا کہ ہم سب آج بھی آپ کے ہم خیال ہیں اور آپ کے ساتھ ہیں مگر ہم کمزور ہیں اور مرعوب۔ ہماری کمزوریوں پر نظر کر کے ہم کو اور اپنے عزیز مادر کالج کو آئندہ کے آنے والے خطرہ سے بچایئے اگر آپ لوگ شرکت نہ کریں گے۔ تو مسلم یونیورسٹی بھی نہیں کہ مثل اور یونیورسٹی کے ہو جائے گی۔ بلکہ اس کے پڑھے ہوئے اور ان سے بدرجہا زیادہ ذلیل و خوار اور خراب ہوں گے۔ عمدہ بدیشی سوٹ، عمدہ بدیشی بوٹ ہوگا۔ اور ہم چند ... اور پیسوں کی خاطر اپنے آپ کو بیچنا پسند کرلیں گے۔ اور پھر جو اس کا نقصان ہوگا۔ اس کے ذمہ دار آپ اور آپ کی غیر حاضریاں ولاپرواہی ہوگی۔"

ان میں سے ایک عزیز وہ بھی تھے جو والدین کی مجبوری یا دُنیا کی رغبت یا خود اپنی میلان طبع یا کارکنان جامعہ ملیہ کی بدانتظامی غرضیکہ کسی وجہ سے جامعہ ملیہ اور کھدّر اور لباس وطنی کو چھوڑ کر سیاہ ولایتی نبات کا ٹرکش کوٹ اور سفید فلالین کی پتلون پہلے تھے۔ اور ہر چند وہ اپنے قلب پر زور ڈالتے تھے۔ مگر خود ان کا ضمیر ان کی گردن کو سینے کی طرف کھینچتا تھا۔ میں نے

اُن سے عرض کیا کہ تم کو بہت سے علی گڑھ کے جاننے والے اور لیکچر دینے والے مل جائیں گے۔ تم مجھے کیوں بلاتے ہو۔ ؎

در محفلِ خود راہ مدہ ہمچو منے را ؛ افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

میں تمہاری مجلس کے سامنے کیا کہوں گا۔ کیا تم چاہتے ہو؟ کہ مجھ کو بھی نیچے گھسیٹ کر اپنے رنگ میں ملالو؟ ہم کو چھوڑ دو۔ اسلام کی قربانی کے لئے پلے دُنبے مارے مارے پھر کر خوب فربہ اور تیار ہو جائیں۔ تم جاؤ، کھیلو اور کودو۔ اور اپنا کام کرو اور خدا سے دُعا مانگو کہ وہ یا تمہیں راہ راست پر لائے۔ یا اگر ہم غلط راہ پر ہیں تو ہم کو سیدھا راستہ دکھائے۔

یہی میری معذرت آج آپ جیسے عزیز بھائی اور تمام اپنے پُرانے عزیز بھائیوں اور اولڈ بوائز سے ہے۔ میں کسی سے بحث و مناظرہ کرنا نہیں چاہتا۔ میں کسی کے کام میں روڑا اٹکانا نہیں چاہتا۔ مجھ کو آج اپنے کاموں سے اتنی فرصت نہیں کہ میں فضول جھگڑوں میں پڑوں۔ نہ خود کوئی کام کرسکوں نہ اوروں کو کرنے دوں۔ میں کالج کا ٹرسٹی تھا۔ اور اب بھی شاید مسلم یونیورسٹی کی کورٹ کا ممبر ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہم علی گڑھ کے معاملات میں دخل دیں گے۔ تو سوائے اس کے کہ ڈاکٹر ضیاءالدین احمد صاحب سے فضول علمی مباحثے ہوا کریں اور کوئی نتیجہ نہیں ہوگا۔ اس لئے وہ جانیں اور صاحبزادے آفتاب احمد خاں جانیں۔ اب اگر نیک نامی ہے تو ان کی ہے۔ بدنامی ہے تو ان کی ہے۔ ہم لوگ کیوں مناظرے و مجادلے میں وقت صرف کریں۔ غالب مرحوم صحیح فرما گئے ہیں۔ ؎

یارب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے میری بات ؛ دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

اس لئے میں نے جو کچھ اوپر لکھا ہے۔ اس کی معذرت چاہتا ہوں اور اُمید ہے کہ آپ اور دوسرے پڑھنے والے میری تلخ بیانی سے درگذر کریں گے۔ اور اس کو ایک دیوانے مجذوب کی بڑ سمجھ کر بھول جائیں گے۔ میں نے یہ مضمون خود اپنی طرف سے نہیں لکھا ہے۔ بلکہ آپ کے حکم سے اس لئے اگر اولڈ بوائے کی پالیسی کے خلاف ہو اور یقینی ہے، تو اس کو معاف فرما دیں۔

میں یہ بھی آج اعتراف کرنا چاہتا ہوں جو چاہے اس فتح پر فخر کرے۔ اس کو اپنی کامیابی کا ثبوت یا ترقی کا آلہ بنائے کہ علی گڑھ کے بارے میں ہم لوگوں کو شکست ہوئی اور ہم اس شکست کا اعتراف کرتے ہیں۔ مجھ کو علی گڑھ پر دعویٰ تھا۔ اور اسی کے بھروسہ پر میں نے ۱۹۲۰ء کے جلسے میں دو شعر پڑھے تھے جس میں اپنے دعوے پر فخر کر کے اس کا اظہار کیا تھا۔

علی گڑھ کے بارہ میں مجھے بہت کم شک و شبہ تھا اور میں نے کہا تھا کہ ؎

بزمِ عشاق ہے کیا جانے کدھر دیکھیں گے ؛ دل تو دیتا ہے گواہی کہ ادھر دیکھیں گے

یہ مجھ جیسے عاشق کے موزوں نہ تھا۔ مجھ کو تو اپنے معشوق پر دعوے اور بھروسہ تھا۔ اس لئے میرے حسبِ حال تو یہ تھا۔ ؎

ہم اپنے جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں ؛ وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں

آج میں قبول کرتا ہوں کہ وہ شعر بے محل تھے۔ اور میرا دعوے غلط تھا۔ اس لئے یہ جانتے ہوئے میں کہاں سے اپنے پژمردہ آپ سے شکست خوردہ دل میں وہ پرانی امنگ پیدا کروں کہ علی گڑھ کے کھلنڈروں کی داستان لکھ کر خود بھی لطف اٹھاؤں۔

اور آپ کو لطف دوں۔ کس طرح ہنساؤں اور کیسے ہنسوں جب کہ دل میں ہنسی کا سامان نہیں۔ ع

قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی

کا مصداق بننے کا شوق نہیں۔ اولڈ بوائے کے مضامین کے لئے میرے پاس بہت سامان تھا۔ کسی قسم کی دشواری اور سوچنے اور فکر کی ضرورت نہ تھی۔ ہر طرف دلچسپ واقعات ہی واقعات نظر آتے ہیں ؎

تیری خاطر بھی ہے مدِ نظر پاس ادب بھی ہے مگر میں کیا کروں دل کی جلن کچھ اور کہتی ہے

حالی مرحوم معلوم ہوتا ہے۔ میرے لئے حکیم محمود خاں کے مرثیہ کے آخری دو بند لکھ گئے تھے۔

سنتے تھے حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی ٭ تھیں سخنور کے لئے چار طرف راہیں کھلی
داستان کوئی بیان کرتا تھا حسن و عشق کی ٭ اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی
گاہ غزلیں لکھ کے دل پارہ کئے گماتے تھے لوگ ٭ کہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ
پر ملی ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم ٭ راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم
نالۂ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم ٭ کوئی یاں رنگین ترانہ چھیڑنے پائیں نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا ٭ ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

اتنا لکھنے اور اظہار کرنے کے بعد میرے دل کا کچھ بوجھ ہلکا ہوا۔ اور مجھ کو اُمید ہے کہ کسی کی طبع پر یہ گراں نہ ہوگا۔ میں نے [illegible] اقبال کر لی۔ اور یہ میری شکست نہ تھی بلکہ وہ میرے عزیز کالج کی شکست تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی شکست تھی۔ اور دشمنانِ اسلام کے [illegible] اسلام کی شکست تھی۔ پھر بھی اس نیچر گڑھ سے یا بقول سید محمود مرحوم "قلعہ مرتضوی" (علی گڑھ) سے بہت سے دیوانے ہاتھ دھوئے مستانہ کرتے ہوئے [illegible] کھڑے ہوئے [illegible] کو گرا دیا۔ مسلمانوں کو بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ خدا کی قسم اولڈ بوائز لاج اور علی گڑھ کے جلسوں میں [illegible] بہت لطف اٹھایا۔ مگر جو لطف مہرولی لینڈ ڈاؤن اور چھندواڑہ کی نظر بندی میں پایا۔ جو لطف بیتول اور اس کے بعد کراچی اور راجکوٹ کے جیل میں پایا۔ اس کے بعد اولڈ بوائز لاج کے جلسے مجھ کھلنڈرے کی نظر میں تو ہیچ ہو گئے۔ محمد علی نے بیجاپور کی سخت جیل میں جو لطف اٹھایا وہ غالباً مجھ سے کہیں زیادہ ہوگا۔ وہ چیز کیسی پر لطف ہوگی جس نے بیجاپور کی تنگ و تاریک کوٹھری میں محمد علی جیسے نازک طبیعت اور بادشاہ مزاج شخص سے جہاں اور کلام لکھوایا ایک الٰہی غزل بھی لکھوا دی جس کو میں اوّل مرتبہ راجکوٹ کی جیل میں کسی طرح حاصل کر کے مست ہو کر گاتے اور ناچنے لگا۔ کاش ہمارے کھلنڈرے اس ناچ اس مستی کو دیکھتے۔ تو وہ سب پرانی باتیں بھول جاتے۔ مطلع ہی جان قربان کرنے کے لئے کافی ہے ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں ٭ اب ہونے لگیں اُن سے خلوت کی ملاقاتیں
ہر آن تسلی ہے ہر لحظہ تشفی ہے ٭ ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے وعدے ہیں ٭ ہر روز یہی چرچے ہر رات یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت ٭ اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں

بے مایہ سہی لیکن شاید وہ بلا بھیجیں ؟ ؛ بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں
شیطان کی چالوں سے اب ہو گئے سب واقف ؛ اب ہوں گی الم نشرح ملعون کی سب گھاتیں

مجھ سے اور محمد علی سے بڑھ کر ہمارے جیل خانوں کے کولمبس' اور اس ہندوستانی راہ آزادی کے "واسکوڈی گاما" حسرت موہانی' ان کے لطف کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں۔ انیس مرحوم نے اپنے مرثیہ میں ایک شعر لکھا ہے جس میں جائز فخر کا اظہار کیا ہے۔ ؎

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں ؛ پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

حسرت موہانی پانچویں پشت کا دعویٰ تو نہیں کر سکتے۔ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔ مگر ہاں اس کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ کہ بہت سے جیلوں کی خاک چھانی ہے۔ بہت سے شاہی خوان یغماؤں سے خوشہ چینی کی ہے۔ طرح طرح کے رنگین اور خوشنما لباس زیب تن کئے ہیں۔ طرح طرح کے دل کو بے چین کرنے والے جھنکار والے زیوروں سے اپنے آپ کو مزین کیا ہے۔ اور آخر مرتبہ تو پا بہ دست دگرے دست بدست دگرے کشاں کشاں کوچہ دلدار میں پہنچ گئے۔ انعاموں پر انعام پاتے رہے مگر آخر ظالم معشوق نے بھی یہ دیکھ کر کہ کتنا سخت جان ہے۔ کسی نہ کسی طرح کوچہ جاناں سے نکال کر اپنا پیچھا چھڑایا کس کس کا نام لکھوں۔ کس کس کا ذکر کروں۔ اس گئے گذرے زمانہ میں۔ اس چودھویں صدی میں، اس قدر کمزوری کا زہر پلانے والوں کی موجودگی میں، باوجود میرے شکست فاش کھانے کے پھر بھی سینکڑوں مست چھوٹے اور بڑے کھلنڈرے "انا الحق" کہتے ہوئے کربلا میں آن کھڑے ہوتے۔ ؎

مستی کے پھر آگئے زمانے ؛ آباد ہوئے شراب خانے
ہر پھول چمن میں سر بکف ہے ؛ بانٹے ہیں بہار نے خزانے
سب ہنس پڑے کھلکھلا کے غنچے ؛ چھیڑا جو لطیفہ اک صبا نے
سرسبز ہوا نہال غم بھی ؛ پیدا وہ اثر کیا ہوا نے
رندوں نے پچھاڑ کر پلا دی ؛ واعظ کے نہ چل سکے بہانے

اور انشاءاللہ

کر دوں گا میں ہر ولی کو مے خوار ؛ توفیق جو دی مجھے خدا نے
اب کل ہے کو آئیں گے وہ حسرت ؛ آغاز جنوں کے پھر زمانے

خیر توفیق ملے یا نہ ملے کوئی اور شریک ہو یا نہ ہو ؎

ہم نے تو نثار کر دیا دل ؛ اب جانے وہ شوخ یا نہ جانے

اب کس کس کا نام لوں۔ خدا کا شکر ہے کہ تعداد معقول ہے جہاں اس وقت بہت سے علی گڑھ کا نام روشن کرنے والے بزرگ ہیں۔ وہاں خدا کا شکر ہے۔ کہ بدنام کرنے والوں کی تعداد بھی معقول ہے کس کس کا نام لکھوں۔ بڑے بڑے شوقین رنگین مزاج۔ فیشن کے دلدادہ "فرزند دلپذیر"، "طرز یورپ" "قیس نژاد" "کپڑے پھاڑ" "دل پھینک" بن کر

لیلیٰ کی محمل کے پیچھے ہو گئے اور ؂

ما نہ می خواہیم ننگ و نام را

کا نعرہ لگا کر دُنیا و ما فیہا سے بے فکر ہو گئے۔ نواب محبّت خاں محبّت کا ایک شعر راجکوٹ کے جیل خانہ کی لائبریری کی ایک اُردو کی پُرانی کتاب میں سے ملا تھا۔ اور اس کی سچائی کا بھی وہیں دل پر نقش ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ اب تک وہ یاد ہے۔ ؂

قید ہوتے ہی ہُوا سارے جہاں سے آزاد ۔۔ میں تو بندہ ہوں محبّت کی گرفتاری کا

میں سب سے زیادہ بہادری کا تمغہ اُن جامعہ ملیہ کے پچاس ساٹھ نوعمروں کو دوں گا۔ جنھوں نے اس کارِ خیر میں ابتداء کی ؂

بنا کردند خوش رسمے بخون و خاک غلطیدن ۔۔ خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

سب کے نام تو اس وقت یاد نہیں ہیں۔ مگر عبد اللطیف خاں چھندواڑہ کا بچّہ غالباً سب سے اوّل سیونی کے جیل میں گیا تھا اور مشہور و معروف یوسفی یونیورسٹی کی تعلیم گاہ سے اعلیٰ ڈگری حاصل کی تھی۔ اس کے بعد ہمارے بہت سے عزیز بچے محمد عالم خاں۔ فیض اللہ خاں۔ عبد القیوم خاں اور چھ سات اور نے پشاور کے شاہی مہمان خانوں کو آباد کیا۔

سندھ میں دین محمد اور اُن کے ساتھیوں کو بھی رتبہ ملا۔ مدراس میں تو ایک بڑی تعداد ایسیوں کی تھی۔ نام اس وقت یاد نہیں آتے۔ اور صوبوں میں بھی یہی حال تھا۔ میں نے ان زخم خوردہ نوجوانوں کے نام اور تعداد اب منگاتا ہوں اُن سے بہت توقعات ہیں ؂

خدا ترا بُتِ نادان درازیِ سن تو کرے ۔۔ ستم کے تو بھی ہو قابل خدا وہ دن تو کرے

پرانے اولڈ بوائز بھی اس دولت سے مالا مال ہوئے۔ سیف الدین کچلو باوجود حبسِ دوام کی سزا پا جانے اور پنجاب کے مارشل گردی کا لطف چکھ لینے کے بجائے مرعوب ہونے کے پھر دو برس کراچی اور دھولیا میں گذار آئے۔

ظفر علی خاں بھی بڑے سخت جان تھے۔ نظر بندی اور زمینداری کی تباہی اور تمام مالی اور بڑے بڑے نقصانات اُن کے لئے کافی نہ تھے۔ تھوڑی میعاد نہیں بلکہ پانچ برس قید سخت کے منٹگمری پہنچ گئے۔ [illegible] نے تصدق احمد خاں شیروانی بیرسٹری کا روپیہ کمانے سے تھک کر بیرسٹری ہی کو نہیں چھوڑ گئے۔ بلکہ ایک سال کے لئے [illegible] نے منہ موڑے نینی تال نہ سہی نینی جیل کی ہوا کھا آئے۔ خوبصورت نثار شروانی پوسٹ آفس کی سپرنٹنڈنٹی کو لات مار کر اکبر آباد کو آباد کرنے گئے اور کہتے ہوئے شرماتا ہوں۔ کہ اُن کے خوبصورت چہرے پر تو ڈاڑھی اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ مگر اب اگر خدانخواستہ منڈوائیں گے تو میں صورت دیکھنا گوارا نہ کروں گا۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنے آپ کو ہی مالی حیثیت سے تباہ نہیں کیا۔ بلکہ باپ اور ماں کی جائداد کو بھی کھو دیا۔ اور افسوس کہ بعض عزیز و اقارب کی حرص و بغض نے بڑھاپے میں ان کو گھر سے بے گھر بھی بنایا۔ عبد المجید خواجہ بھی اللہ کا نام لے کر وکالت چھوڑ کر جیل کو چلے گئے اور مانا کہ آج وہ اڈریس پڑھنے کے لئے سابق علی گڑھ کے کلکٹر کے سامنے کھڑے ہوں۔ مگر اُن کی قربانی سے کون انکار کر سکتا ہے خدا استقامت

دیے۔ خلیق الزمان۔ عبدالوالی لکھنوی، شیخ شوکت علی۔ غلام محی الدین (جواب موپلاؤں کی خدمت کرتے ہیں) ملک رفیع۔ ملک علی افضل۔ نواب علی صاحب۔ رفیع احمد قدوائی، شیخ احمد قدوائی مصطفےٰ علی خاں۔ چودھری اطہر علی رستک۔ ہاکی ٹیم وغیرہ اودھ سے گئے۔ روہیلکھنڈ بھی پیچھے نہیں رہا۔ ظہورالدین وکیل بریلی ظفر حسن مرادآبادی وغیرہ وغیرہ معدود بدنام دلچسپ بدمعاشوں کے اور ایک فاروقی علی بھانجے کے جیل میں شریک ہوئے۔ اب صوبہ دار کہاں تک نام گناؤں۔ ڈاکٹر محمود بھی اپنی بڑھتی ہوئی پریکٹس کو چھوڑ کر کچھ دنوں بھاگل پور اور بکسر کی سیر کر آئے۔ آغا صفدر۔ شفیع داؤدی (بہاری) سیٹھ یعقوب حسن۔ عزیز انصاری۔ قطب الدین (چریاکوٹی) اور مرحوم کمال الدین جعفری۔ اطہر۔ عزیز احمد زبیری۔ یوسف امام مرزا پوری۔ بہت سے نام کے زندہ رکھنے والے شریک حال ہوئے۔

پرانے کھنڈروں کے جلسے مجھے ضرور یاد ہیں۔ مگر نئے تجربوں اور جلسوں کی آب و تاب نے ان کے رنگوں کو پھیکا کر دیا ہے۔ محمد علی کا شعر ہے ؂

تجھ سے مقابلہ کی کسے تاب ہے ولے ✧ میرا لہو بھی خوب ہے تیری حنا کے بعد

رنگت جلسوں کی پر لطف۔ خوبصورت اور سرخ تھی مگر حنا کی سرخی اور خون کی سرخی کا فرق تھا۔ خدا کرے اب کے دھاوے میں ہر طرف یہی سرخی ہو اور ہم مسرت کے خواب کو سچا کر دیں گے۔

ہر سو عیاں ہے صبغت اللہ کی بہار ✧ رونق پہ ہے خزاں میں بھی بستانِ اولیا
صبر و صلوٰۃ عشق میں ہیں سب کے دا و ہی ✧ ثابت قدم ہیں سارے مردانِ اولیا
جو نہیں ہوئی ہیں جن کی رہ شوق میں فدا ✧ حاشا کہ ہوں فنا وہ محبانِ اولیا
آئی ہوئی رضائے الٰہی کی ہے برات ✧ سب کربلا میں جمع ہیں مہمانِ اولیا
گلگوں لباس خون شہادت پہن کے آج ✧ دولہا بنے گا وہ شہ خوبانِ اولیا
زنجیر و طوقِ ظلم کا عابد کو غم نہیں ✧ ہم رنگِ بزمِ عیش ہے زندانِ اولیا
حضرت حسین ابن علی کا ہوں میں غلام ✧ حاصل ہے مجھ کو فضل نمایاں اولیا

بہت سے پرانے کھنڈروں کو پرانے جلسے ضرور یاد آتے ہیں مجھے بھی یاد آتے ہیں۔ اور دل چاہتا ہے کہ خدا وہ دن کرے کہ سب بھائی مضبوط ہو کر ازسرنو پختہ بھائی چارہ قائم کریں جو کسی کے توڑے ٹوٹ نہ سکے مجھے بھی اولڈ بوائز لاج اور بھائیوں کی طرح یاد آنا چاہیے۔ اس سے کچھ تھوڑا بہت تعلق میری ذات کو بھی تھا۔ اس کے اولڈ بوائز کے گروپ تصویریں فرش و فروش کرسی میز یاد آتے ہیں۔ ان سب سے بڑھ کر ملاقات کے کمرے میں اور کھانے کے کمرے میں اور برآمدے میں چھوٹی چھوٹی پتھر کی تختیاں لگی ہیں۔ ان میں لکھے ہوئے دوست احباب کے نام یاد آتے ہیں۔ ان سے زیادہ کچھ مرے ہوئے عزیزوں اور بھائیوں کے نام کے کتبے یاد آتے ہیں۔ اور ان کے دیکھنے کو دل بھی چاہتا ہے۔ یہ بھی دل چاہتا ہے کہ مثل داؤد مرحوم کے جو میرے کالج کے زمانہ کے ملک الشعراء تھے۔ اور جنھوں نے عبدالحکیم مرحوم سہارنپوری عرف بہوتان کے نام پر ان کے خالی کمرے کو دیکھ کر ایک قطعہ لکھا تھا جس کا یہ ایک مصرعہ یاد

ہے ؎

پھر یہی کمرہ ہو اور یہو ٹان ہو

خدا کرے ہماری مجلس جلد مضبوط ہو کہ آباد ہو اور پھر سب ایسے ملیں کہ آپس میں علیحدگی کی گنجائش باقی نہ رہے۔ ؎

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی ❊ تا کس نہ گوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری ❊

آپ کے اولڈ بوائے کو جس سے مجھ کو بھی کچھ تھوڑا تعلق رہا ہے۔ اوّل دن سے پڑھتا ہوں، اس میں سب بھائیوں کا سچا رنج اور افسردگی دیکھ کر رنج ہوتا ہے۔ وہ بھی اولڈ بوائز لاج کو یاد کرتے ہیں۔ اور افسوس کرتے ہیں کہ اتنی عالیشان عمارت پر مع اس کے خوبصورت فرنیچر قالینوں وغیرہ کے کالج نے قبضہ کر لیا۔ یہ خیال ان کو ضرور تکلیف دہ ہوتا ہے میں بھی جب علی گڑھ جاتا ہوں تو اپنے پرانے کالج میں بھی جاتا ہوں۔ چپّہ چپّہ زمین میرے لئے دلچسپی رکھتی ہے ہزاروں پرانے واقعات جبکہ میں مست کھلنڈرا تھا یاد آتے ہیں۔ پکی یارک کے ۱۳ نمبر کے کمرے میں بھی ضرور جاتا ہوں اور باوجود میری بھیانک صورت اور بھیانک ڈاڑھی۔ لحیم شحیم جسم اور ڈھیلے ڈھالے موٹے کھدر کے کپڑے کھدر کی خلافت کی فقیری کی جھولی کے مثل اور ہندوستان کے وہاں کے نئے رہنے والے بھی پہچان کر سلام کرتے ہیں اور بہت سے خاطر بھی کرتے ہیں۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ اب تو کالج میں دو ہزار لڑکے پڑھتے ہیں۔ پہلے سے زیادہ ہیٹ اوڑھنے اور انگریزی لباس پہننے میں غلو کرتے ہیں اور بے شرم اور ڈھیٹ ہو گئے ہیں۔ کوئی زندگی کا مقصد سامنے نہیں ہے۔ یہ صحیح ہو۔ میں نے تو اکثروں کو شرمندہ پایا۔ اور اکثروں کو اپنی کمزوری کا اعتراف کرتے ہوئے دیکھا۔ اور ہم لوگ اور ہماری تحریک ہر جگہ ناکامیاب رہی ہو۔ مگر اس انگریزی لباس کی بے توقیری پوری ہو گئی۔ بڑے بڑے سورماؤں کو دیکھتا ہوں کہ جب ہم کھدر پوش تاج محل ہوٹل میں پہنچ جاتے ہیں۔ تو ان لوگوں کا دل چاہتا ہے کہ اپنی ہیٹ کو کمرے پیچھے چھپا لیں اب انگریز بن کر اپنے بھائی بندوں کو مرعوب کرنے کے دن گئے۔ اسی علی گڑھ کی سیاحت میں حال میں اولڈ بوائز لاج کے سامنے بھی گیا چور چوری کرنے سے جاتا ہے مگر ایرا پھیری نہیں چھوڑتا۔

تیرے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنی ❊ کبھی اس سے بات کرنی کبھی اُس سے بات کرنی

اولڈ بوائز لاج میں ایک تماشا دیکھا جس سے رنج بھی ہوا صدمہ بھی ہوا۔ آنکھوں میں بھی تھوڑی سی نمی پیدا ہو گئی۔ مگر پھر بھی ہونٹھوں پر تبسم تھا۔ ہم سخت جانوں کو اس تبسّم کی بھی عادت ہو گئی ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ جو اولڈ بوائز کے سکرٹری ہونے کی حیثیت سے میرا مسکن تھا۔ اس کے سامنے کی پختہ سیڑھیوں پر بائیسکل کی آسانی سے آمد و رفت کے لئے مٹی بھر دی گئی تھی۔ کمرے کے دروازے کے سامنے اس صاف ستھرا برآمدہ میں جس میں نہایت عمدہ سبز ٹننگ بچھی ہوئی تھی۔ بہت سے خوبصورت گملے رکھے ہوتے تھے۔ ۲۵۔۳۰ نہایت عمدہ علی گڑھ کے بنے ہوئے مونڈھے بچھے ہوتے تھے جس میں بیٹھ کر ہم کرکٹ کی میچوں کی سیر کرتے تھے۔ وہاں دیکھا کہ یہ کوئی سامان نہیں ہے۔ ایک میلا کچیلا کرتا پائجامہ پہنے ہوئے باورچی مسالہ کی سل سامنے رکھے ہوئے ہلدی دھنیا۔ پیاز مرچیں پیس رہا ہے لباس کی رنگت ایسی ہو گئی تھی کہ جس کا تصور بھی

کرنا کہ وہ کبھی سفید ہو سکتا تھا ناممکن تھا۔ سچ کہا ہے ؎

اگر ٹی کا ہے گمان شک ہے علاگیری کا ✤ رنگ لایا ہے دوپٹہ تیرا میسالا ہو کر

اسی برآمدہ میں پاس ہی ایک مٹکا رکھا ہوا تھا قطعی غدر کے قبل کی پیدائش کا تھا۔ رنگت اصلی اُڑ گئی تھی۔ سبز کیٹ کائی جمی ہوئی تھی۔ اس کو دیکھ کر اس کے پانی کو کوئی انسان جانور تک کو پلانا نہیں چاہے گا۔ پاس کے چھوٹے سے گول کمرے میں جس میں ہم لوگوں کا ارادہ تھا۔ کہ اس میں سگار یا سگریٹ سے بیٹھ کر شغل کرتے۔ اس میں کوئلے لکڑی اور اسی طرح کا اور انبار تھا۔ خوبصورت کھڑکیوں کے کیواڑ موجود تھے۔ مگر شیشے سب ٹوٹ گئے تھے معلوم ہوا۔ کہ اس میں کیمبرج کے تعلیم یافتہ انگلستان کے واپس شدہ پروفیسر صاحب مقیم تھے۔ جن کو ہندوستان کی قومی اور اسلامی تحریکوں سے بہت تنفر ہے اور خاص کر ہم لوگوں کی تحریک سے۔ خیر یہ کوئی شکایت کی بات نہ تھی۔ اولڈ بوائز لاج کا اولڈ بوائے کے قبضہ سے نکل کر کالج کے قبضہ میں جانا کوئی بہت تکلیف کی بات نہ تھی۔ جس چیز کو دیکھ کر رنج ہوا وہ یہ تھا کہ معمولی سی عمارت کو صاف اور ستھرا نہ رکھا جا سکا۔ مجھ پر سخن فہمی "عالم بالا معلوم شد" روشن ہو گیا۔ اور میں سمجھ سکتا ہوں کہ بہت سے اولڈ بوائز پر بھی ایسا ہی اثر ہوا ہو گا۔ دو چار روپے کا پشت پر کہیں احاطہ میں چھپر ڈال دیتے اور یہ باورچی خانہ اور بھنگڑ خانہ کہیں اور آباد ہو جاتا۔ اولڈ بوائز لاج کی عمارت، فرنیچر اور سامان پر تقریباً ۲۵ ہزار روپیہ خرچ ہوا تھا ابھی وہ ناتمام تھا۔ دوسری منزل بننے کو باقی تھی۔ اس کی ظاہری آرائش کا بھی کوئی سامان نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے میں تو اپنے مستانہ خیالی کی وجہ سے زیادہ متاثر نہ ہوا۔ انشاءاللہ میرا وقت آئے گا اور جلد آئے گا۔ سارا ملک میرا ہو گا۔ اُس وقت یونیورسٹی میری ہو گی۔ اور یقینی معنوں میں مسلم یونیورسٹی ہو گی۔ اولڈ بوائز لاج نئی آن بان سے تیار ہو گا۔ اوپر کی منزل بھی تیار ہو گی۔ کرکٹ کا میدان بھی آباد ہو گا۔ ہم بڑھے اور چھوٹے بڈھے اور جوان اور نوعمر اور بچے سب ایک خاندان کے وہاں سے بیٹھ کر اپنے چمن کی سیر و تماشہ دیکھیں گے اور غیر کا اثر تو اثر صورت بھی کہیں نظر نہ آئے گی۔ ؎

شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری ✤ غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری

جو شخص اس طرح کے بیٹھ کر خواب دیکھ سکتا ہو۔ وہ کیوں خدا کی رحمت سے مایوس ہو۔

برادر عزیز اور علی گڑھ کے کھلنڈرو! مجھ کو آج بھی چھوٹے موٹے پیمانہ پر وہ صحبتیں میسر آجاتی ہیں جیسے تم کہتے ہو کہ تم محروم ہو۔ ہر جگہ جب دوروں میں نکلتا ہوں۔ تو علی گڑھ کے اولڈ بوائے میرے ہم خیال میری تحریک کے ساتھی مل جاتے ہیں۔ اُن سے خوب پرانی باتیں ہوتی ہیں۔ بہت سے پرانے دوست اور اولڈ بوائے بھی غریب ڈرتے ڈرتے آجاتے ہیں اور آنے کے بعد روپیہ بھی دے جاتے ہیں محبت کا اظہار بھی کر جاتے ہیں۔ گلے میں ہاتھ ڈال کے منہ بھی چوم جاتے ہیں اور آئندہ کے بارہ میں ہمت بھی بڑھا جاتے ہیں میرے لئے یہ جذبہ موجود ہے ؎

خدا آباد رکھے لکھنؤ کو بس غنیمت ہے ✤ نظر کوئی نہ کوئی اچھی صورت آہی جاتی ہے

بجائے لکھنؤ کے آپ بمبئی کو بدل دیجئے۔ سنٹرل خلافت کمیٹی کا دفتر سلطان مینشن میں ہے۔ اس گئے گذرے زمانہ میں بھی تک آباد ہے۔ میں تو اپنے کو پیر مغاں ابھی نہیں کہوں گا۔ مگر پھر بھی میخوار چھوٹے بڑے جمع ہیں شعیب قریشی صاحب اپنی

خوبصورت آنکھوں سرو قد اور مسکراتے ہوئے چہرے کے پیار کرنے اور پیار کرانے کو موجود ہیں۔ خوبصورت ہونے کے لحاظ سے حضرت یوسف علیہ السلام سے کچھ نسبت تھی، اس لئے سنت یوسفی کو پورا کرنے کے لئے آکسفورڈ سے آئے، سابرمتی اور تھانہ جیلوں کی یونیورسٹی میں پڑھ کر تعلیم کی تکمیل کی۔ آغا صفدر (رہ) اب دبلے ہوگئے ہیں۔ کچھ ذیابیطس کا اثر کچھ ۲۶ مہینہ میانوالی جیل کی مہمانی کا اثر۔ آدھ گھنٹہ ہر صبح ٹہیل کرتے ہیں۔ تاکہ پھر پہلے (رہ) ہو جائیں۔ سنا ہے مسعود بھی ان کے لڑکپن کے بھاری بھر کم پن کو دیکھ کر (رہ) کے لقب سے ممتاز کرنے کے لئے مجبور ہوا تھا۔ "وہ آرہے ہیں، وہ جارہے ہیں وہ کھلتے ہیں، وہ بولے۔ خود انھوں نے اپنے اس زمانہ کی زندگی اور اس نام کی وجہ تسمیہ خوبصورتی کے ساتھ بیان کردی ہے اور قابلِ ملاحظہ ہے۔

"وہ موجود ہیں۔ قمر احمد صاحب بی اے ایل ایل بی۔ متخلص بہ لازی ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء کے لا کلاس اور خفیہ مشاعروں کے ملک الشعراء ہر وقت دفتر خلافت میں موجود۔ خوب اپنے "رنگین قلم" سے ہم سب کو زندہ دل رکھتے ہیں۔ کچھ اور لطف دیکھنا چاہتا ہوں۔ تو ان کو پان کی ممانعت اور کمرے کی صفائی پہ تاکید کرکے چھیڑ کر عجیب و غریب منطق اور دلائل سنتا ہوں۔ کبھی خفگی ہوتی ہے۔ اور کبھی ہنسی۔ روز صبح ایک گھنٹہ بیٹھ کر اخبار خلافت کے لئے مجھ سے کاہل آدمی سے مضمون لکھاتے ہیں۔ اور آج یہ ایک غمزدہ کھلنڈرے کی کہانی بھی انہیں کے طفیل سے مکمل ہو رہی ہے۔ میں بولتا ہوں اور وہ لکھتے ہیں اور اکثر جگہ اصلاح بھی کردیتے ہیں۔ محمود (توام) بھی اکثر میرے ہم پیالہ و ہم نوالہ ہوتے ہیں۔ سیف الدین کچلو سے جو پہلے میرے برابر کے سکریٹری تھے کل میرے ماتحت تھے۔ اور آج میرے سردار ہیں۔ اُن سے ہر وقت کی صحبت اور محبت ہے حافظ علی بہادر خاں میری غیر حاضری میں اخبار خلافت کے ایڈیٹر کی حیثیت سے آگئے ہیں۔ عربی، فارسی ترکی انگریزی اُردو غرضیکہ ہفت زبان میں اُن سے بھی جلسے کی رونق ہے۔ سیٹھ یعقوب حسن بھی مجھ سے پہلے کے کالج کے اولڈ بوائے ہیں۔ برابر رونق محفل کا باعث ہوتے ہیں۔ داڑھی سفید تھی۔ جیل کی برکت سے اچھے خاصے عالم اور مفسر ہوگئے ہیں۔ قرآن پاک کی ایسی تفسیر تیار کی ہے کہ عالم و فاضل اور انگریزی داں اور معمولی تعلیم والے سب اس کی مدد سے خدا کے پُر طاقت کلام کو سمجھ کر اپنے دین دنیا کو سنبھالتے ہیں۔ چھوٹوں میں اور کرکٹ کھیلنے والوں میں اتفاق میرے سکریٹری موجود تھے۔ وہ تو ہمیشہ کے کھلنڈرے تھے۔ اور دفتر خلافت میں بھی کھلنڈرے رہے۔ اکثر میرے کچھ کہنے پر خفا ہو کر مجھ پر رعب جماتے تھے مگر میں ان کا بڑا تھا۔ ہنس کے کہدیا کرتا تھا کہ:-

"بازی بازی بارِیش بابا ہم بازی"

یہ سنکر وہ شرما کر ہنس دیتے تھے۔ اور مجھ پر رعب جمانے سے باز آتے تھے۔ میں ان کی قربانی اور بہادری کا قدر داں تھا۔ اور وہ بھی اس مستوں کے دائرہ کے لئے لطف کا سامان ہوتے ہیں۔ سعید الرحمن قدوائی ممتاز ہاؤس کے ممتاز "شورش" کرنے والے دو برس کی سخت قید کاٹنے کے بعد میرے پاس علی گڑھ ۹ رمارچ کو آگئے اور خدا کو میری زندگی منظور تھی، کہ اُن کو ایسے موقع پر بھیج دیا۔ ۹ رسے ہی میں مبتلائے ٹائیفائڈ ہو گیا تھا۔ خدا انصاری اور ڈاکٹر رحمان کا بھلا کرے۔ کہ وہ فوراً دہلی لے گئے اور اپنے گھر میں رکھکر مجھے موت کے منہ سے چھڑایا۔ خدا کو بچانا منظور تھا۔ ڈاکٹر انصاری اور ڈاکٹر رحمان

کی اعلےٰ طبی قابلیت کو بہانہ بنادیا اور عزیزی سعید کی خدمت کو ناہد علی اور عزیزہ بھی موجود تھے۔ اور ڈاکٹر محمد علی اپنی لمبی لمبی انگلیوں سے بخار کی سختی کی حالت میں یوڈلی کولون اور برف کے پانی سے سر کو منہ کو دھو کر مجھ کو آرام پہونچاتے تھے۔ مگر پھر بھی کیساں سعید الرحمٰن کی رات کی جگائی تھی جس نے میری جان بچائی۔ ناممکن تھا کہ کسی وقت میں نے بے چینی میں "ہوں" کیا ہو اور سعید موجود نہ ہو گئے ہوں۔ وہ میرے اب سکرٹری ہیں۔ داڑھی لمبی ہے۔ دیکھنے میں خشک ہیں 'حنفی' اور 'وہابی' کی بحث میں شرکت کے لئے ہر وقت تیار ہیں۔ مگر پھر بھی دل میں علی گڑھ کے سچے کھلنڈرے ہیں

راجکوٹ کی جیل میں داغ کا دیوان مل گیا تھا۔ اس میں ایک غزل کے دو شعر۔ اے عزیزو! اے کھلنڈرو! تمہارے اور میرے دونوں کے حسب حال ہے۔ پڑھو اور میری طرح لطف اٹھاؤ کاش آج بھی ہوشیار ہو جاؤ سچے بھائی چارے کو پہچانو۔ اور ہجر کے دنوں کو بھی شب وصل سے مبدّل کر دو۔ یہ تمہارے ہاتھ میں ہے سنو تمہارے اور تمہارے جیسے سر دامنگوں والوں کے لئے یہ شعر ہے ؎

دن گذار اب دل مجبور صد آفات کے ساتھ ٭ وہ مزے رات کے ناداں گئے رات کے ساتھ

اور آؤ میرے ساتھ شریک ہو اور مبرا کہا مانو تو تمہارے لئے یہ شعر ہے۔ ؎

چار مل بیٹھے جہاں پھر وہی رنگ اور ترنگ ٭ کچھ عجب لطف ہے رندانِ خرابات کے ساتھ

بس میں بہت کہہ چکا قمر احمد صاحب کا ہاتھ تھک گیا۔ اور مجھ کو ۱۵ منٹ کے اندر نہانا۔ کپڑے پہننا اور بمبئی کے ایک بڑے بزرگ کے پاس خلافت کا بھکاری بن کر جانا ہے۔ اس لئے ختم کرتا ہوں۔ معظم علی جو غریب اب مراد آباد میں ترک کی ہوئی بیرسٹری کے لئے مجبوراً دوبارہ گیا ہے۔ وہ مجھے دیکھ کر میرا ہی بتایا ہوا امتزاد کا ایک شعر جیل میں مجھے سنایا کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ میری غیر حاضری میں ہم سنٹرل خلافت کمیٹی کے کام کرنے والوں نے ایک ماٹو اپنے سامنے رکھنے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اوّل مرتبہ میں نے اس کو ناگپور کے خلافت والنٹر کے کپتان کی اچھی آواز سے سنا تھا ؎

وہ رند ہوں میں بعد فنا پیر مغاں نے از بہر تبرک ؎
رکھ چھوڑا ہے میخانہ میں کاسہ مرے سر کا پیمانہ بنا کر

خدا کرے یہ سچ ہو جائے اور شہادت کے جام کے بعد یہ تمغۂ امتیاز علی گڑھ کے ایک حقیر کھلنڈرے کو مل جائے۔ میری کیا۔ انشاء اللہ سارے علی گڑھ کی نجات ہو جائے گی۔ اخیر میں معافی کا خواستگار ہوں اور آغاز کا شعر پھر معافی کے طور پر آخر میں لکھتا ہوں ؎

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف ٭ آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے ؎

میں علی گڑھ کا دشمن نہیں ہوں۔ میں مسلم یونیورسٹی کا دشمن نہیں ہوں۔ شاید میں نے اور میری ہم خیال جماعت نے بھی کچھ خدمت اس کی کی ہے۔ میں اولڈ بوائز کا بدخواہ کیسے ہو سکتا ہوں۔ مسلمانوں کی سچی تعلیم کا بھی دشمن ہونا میرے لئے ناممکن ہے۔ میں جس شے کا دشمن ہوں وہ اور ہی شے ہے۔ اور اس کو سب جانتے ہیں۔ اور غالباً کروڑوں اللہ کے بندے ظاہر میں اور باطن میں میرے ہم خیال ہوں گے۔ میں خیال میں مست ہوں اور دن دہاڑے بڑی بڑی

خوابیں دیکھتا ہوں۔ آج کہنے کو تباہ و برباد و خانہ خراب ہوں پھر بھی انشاء اللہ خاں کی طرح ؎

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر ٭ غرض کچھ اور دھن میں اِن دنوں مے خوار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی ٭ تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں ٭

بس اور کیا کہوں۔ ایک علی گڑھ کا سچا عاشق ہوں۔ مگر محروم وصال۔ وصال و ہجر ہر حال میں مست ہوں۔ مگر دل میں درد رکھنے والا۔ کاش یہ درد اور ایسے ہی تکلیف و کرب کے ساتھ سب کھلنڈروں کے دل میں پیدا ہو جائے تو میری نجات ہے۔ داغ مرحوم کی غزل کے تین شعر ہیں جیل میں پڑھ کر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ دشمن سخت اور قوی ہے اور ہم حقیر اور کمزور اور ضعیف و نااہل ہیں پھر بھی دل کی طاقت کے واسطے یہ خیال موجود ہے۔ کہ ہمارا مالک اور آقا دشمن سے بھی قوی تر ہے وہ ہمیں سنبھال لے گا۔ ؎

ہر دل میں نئے رنگ سے ہے یاد کسی کی ٭ ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی ٭

تھامے ہوئے دل پھرتا ہے ہر گبر و مسلمان ٭ کیا یاد کیا یاد ہے کیا یاد کسی کی

اور میرے لئے لکھ گیا ہے ؎

کم بخت وہی داغ نہ ہو دیکھیو کوئی ٭ بے چین کئے دیتی ہے فریاد کسی کی ٭

شوکت علی خادم کعبہ

۱۹۲۵

([illegible]

روزنامہ ہمدرد دہلی (دور ثانی) کے مکمل فائل مطلوب ہیں۔ اگر کسی صاحب کے پاس ہوں اور وہ قیمتاً دینا چاہیں۔ تو مطلع فرمائیں۔ اگر قیمت مناسب ہوئی تو فوراً پیش کر دی جائے گی۔ لیکن شرط یہ ہے کہ فائل بالکل مکمل ہوں۔ کوئی پرچہ کم نہ ہو،

اس پتہ سے خط و کتابت کی جائے۔

محمد علی اکیڈمی
لاہور

خطوط و مقالاتِ محمد علی

نظر بندی کے زمانے میں، قید کے زمانے میں، رہائی کے زمانے میں محمد علی نے اپنے دوستوں اور عزیزوں اور پیر و مرشد مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ کو جو خطوط لکھے ان سے نہ صرف محمد علی کے کردار اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے اور بعض دلچسپ اور سبق آموز اسرار و رموز اور واقعات و احوال کا انکشاف ہوتا ہے، بلکہ آنے والے مؤرخ کے لیے جو مسلمانانِ غیر منقسم ہندوستان کی تاریخ حریت و استقلال لکھے گا، بہترین ماخذ بھی ہیں
خطوط کا بڑا حصہ غیر مطبوعہ اور کچھ مطبوعہ ہے لیکن نصف صدی سے پہلے کا!
یہی صورت مقالات کی بھی ہے جو ہمدرد (دورِ ثانی) سے تعلق رکھتے اور مسلمانوں کے خلفشار و انتشار کا آئینہ ہیں!۔

اقبال

علی برادران کی اسیری

پانچ سال کی نظربندی کے بعد علی برادران جب رہا ہو کر جیل سے سیدھے امرتسر پہنچے جہاں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہو رہا تھا۔ تو اقبال محمد علی کے استقبال کیلئے بطور خاص امرتسر گئے۔ اور یہ نظم مسلم لیگ کے اجلاس میں (حسب روایت سید نذیر نیازی صاحب) ترنم کے ساتھ سنائی جس نے حاضرین پر سکتہ کا عالم طاری کر دیا۔ یہ نظم بانگ درا میں "اسیری" کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرہ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند

مشک اذفر چیز کیا ہے اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافہ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند

"شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند"

بی اماں کے نام

(۱)

۱۷ محرم الحرام — جیل خانہ کراچی

مطابق ۳۰ ستمبر ۱۹۲۱ء — وقت ۸ ½ بجے صبح

لا غالب الا اللہ

پیاری بوا! خداوند کریم آپ کو زندہ و سلامت رکھے اور تمام دلی مراد بر لائے آمین۔ ۱۷ ستمبر کی صبح کو ۴ بجے جیلر آئے اور کہا
آپ تیار ہو جائیے آپ کو کسی دوسری جگہ لے جائیں گے۔ میں پہلے ہی یہ سمجھ رہا تھا۔ کوٹھری کا دروازہ کھلوا کر وضو وغیرہ کیا۔ اور نماز فجر
ادا کی پھر بستر پر لیٹا۔ کوئی سوا پانچ بجے جیل کے دروازے پر جیلر کے دفتر میں لایا گیا۔ وہاں ضلع کا مجسٹریٹ گھنسن نامی ڈپٹی انسپکٹر
جنرل ریلوے و خفیہ پولیس کھنگم نامی اور سپرنٹنڈنٹ جیل میجر ہال گیٹ نامی موجود تھے۔ مجسٹریٹ نے مجھ سے کہا کہ اب تم پر
ایک مستقل جرم کا الزام لگایا گیا ہے اس لئے میں ضمانت طلبی کی کارروائی بند کئے دیتا ہوں میں نے کہا کہ یہ طریقہ تو غالباً صحیح
نہیں ہے، قانون میں صاف درج ہے کہ ملزم کی حاضری کے بعد تفتیش شروع کر دی جائے۔ بند کرنے کا اختیار آپ کو
نہیں ہے اگر ہو تو قانون کا حوالہ دیجئے۔ حوالہ تو نہ دے سکا مگر کہا کہ میں اپنے اختیار سے اب یہ تمام کارروائی بند کرتا ہوں۔
اس پر میں نے کہا کہ میں آپ کے ضلع میں نہ پہلے کبھی تھا نہ اب رہنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مدراس جا رہا تھا، راستے میں سے
آپ نے روک لیا اور وجہ یہ بتائی کہ تم یہاں فتنہ و فساد برپا کرو گے۔ حالانکہ میں چند منٹ ہی بعد اپنی گاڑی میں سوار ہو کر مدراس
جانے کو تھا۔ اس الزام کی بنا پر بھی مجھ پر سمن نکالا جانا چاہیئے تھا۔ مگر آپ نے اس بہانے سے وارنٹ جاری کیا کہ اگر میں
گرفتار نہ کیا جاتا تو مجھے فتنہ و فساد سے باز رکھنے کی کوئی اور تدبیر نہ تھی۔ اور اب آپ یہ تمام کارروائی کالعدم کئے دیتے ہیں
نہ مچلکے مانگتے ہیں نہ جیل بھیجتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ جانتے تھے کہ نہ میں آپ کے ضلع میں رہنا چاہتا تھا نہ فساد برپا
کرنے کی نیت رکھتا تھا نہ اس سے پہلے کبھی اور فساد برپا کر چکا تھا نہ اس کی اس وقت فرصت ہی تھی۔ لیکن آپ کی گورنمنٹ
چاہتی تھی کہ میں گرفتار کر لیا جاؤں کیوں کہ میرے لئے کراچی سے وارنٹ نکل چکا تھا۔ مگر اب تک والٹیر نہ پہنچا تھا۔ بلا اس
وارنٹ کے میں گرفتار نہیں کیا جا سکتا اس لئے اس کے آنے تک یہ بہانہ ڈھونڈا گیا کہ میں فساد برپا کرنے والا تھا اور اس
کا روک تھام بلا میری گرفتاری کے ناممکن تھی اس لئے گرفتاری کا وارنٹ آپ نے نکالا اور بلا مچلکے لینے کی نیت کے مچلکے
طلب کئے ہیں۔ ایک حرف بھی تلخ و ترش کہنا نہیں چاہتا تھا مگر آپ خود غور کیجئے کہ آپ ضلع کے مجسٹریٹ ہیں نہایت اہم اور
فوری ضرورتوں کے لئے جن کا صاف صاف اظہار و تعین اسی قانون نے کر دیا ہے آپ کو گرفتار کر لینے کا اختیار دیا گیا ہے
مگر اس اہم اور فوری ضرورت کے اور بالکل ایک دوسری غرض سے آپ نے مجھے گرفتار کر لیا۔ آپ کو دعوے ہے کہ آپ

اس قانون کے محافظ ہیں اور لوگوں کو قانون شکنی کی سزا دینا آپ کا منصب ہے اور پھر آپ خود ہی اس قانون کو توڑتے ہیں۔ میں نے اپنے مشیر قانونی مسٹر سندر راؤ سیکرٹری کانگریس سے ملنا چاہا۔ مگر اول تو کہا کہ وہ کیسے مشیر قانونی ہو سکتے ہیں انہوں نے تو وکالت کانگریس کے حکم سے چھوڑ دی۔ میں نے کہا کہ آپ سے تو ۱۹ ستمبر ہی کو کہہ چکا ہوں کہ آپ کی عدالت میں مقدمے کی پیروی کرنا ہمارا شیوہ اور چلن نہیں ہے لیکن قانونی مشورے میں جس شخص سے لینا چاہوں اس سے لینے کا مجاز ہوں اور وکالت کرنے والے وکیل کی ضرورت نہیں۔ میں نے خود تو کبھی بھی وکالت نہیں کی لیکن کچھ نہ کچھ صلاحیت تو قانونی مشورہ دینے کی میں بھی رکھتا ہوں اور بارہا میں نے لوگوں کو قانونی مشورہ دیا ہے۔ اس پر جواب دیا کہ وقت نہیں ہے تمہاری گاڑیاں یہاں سے ۶ بجے روانہ ہو جائیں گی۔ محمد حسین سے بھی ملنے کی اور اس کو کراچی آنے کی ہدایت دینے کی اجازت نہیں دی۔ یہ سب تو اتمام حجت تھا ورنہ میرا وکیل خدا اور میری خدمت کے لئے اس کے دئیے ہوئے ہاتھ پاؤں کافی ہیں۔

میرے کاغذات جو کپڑوں کے صندوق میں تھے ہمراہ بھیج دئے گئے ہیں یہاں آ کر میں نے کہہ دیا کہ وہ امجدی کے نام لنگر خانہ کے پتہ سے رام پور بھیج دئیے جائیں چونکہ معمولی کاغذات متفرق محمد حسین کے بھرے ہوئے ہیں یا خلافت و سوراج فنڈ کی رسیدیں اور ان کا حساب و کتاب ہے اس لئے خیال تو نہیں ہے کہ کسی کو ان کے واپس کرنے کا حکم نہیں ہے دوسرے ان کے روکنے کا کوئی قاعدہ بھی نہیں ہے تاہم میں نے کہہ دیا ہے کہ اگر دیکھ لئے جائیں تو مجھے عذر نہیں۔ فہرست بھی بنوا دی ہے۔ کوئی پچاس کاغذات ہیں وہ ابھی تو رکھوا لیجئے گا۔ امجدی یا معظم کو دلوا دیجئے گا موٹر میں سوار ہو کر میں کوئی ۶ بجے اسٹیشن پر آیا چند لوگ جن کو کچھ بھنک پہنچ گئی تھی دو رویہ کھڑے تھے۔ ان میں جامعہ ملیہ علیگڑھ کے بھی میرے دو شاگرد عبدالحکیم و عبدالقیوم دو پنجابی بھائی تھے۔ فی امان اللہ کہتا ہوا رخصت ہوا۔ انہوں نے نصر من اللہ و فتح قریب کا نعرہ بلند کیا۔ اسپیشل میں دو کمرے فرسٹ کلاس کے تھے اور گاڑی تیسرے درجے کی تھی ایک فرسٹ میں میں اور انگریز انسپکٹر مسلح پولیس اور اس کا سارجنٹ اور ایک مسلح کانسٹبل اور دوسری میں ایک اور مسلح کانسٹبل اور پونہ کا انسپکٹر آرکلکر جو کراچی کا وارنٹ لایا تھا اور ریلوے کے اسسٹنٹ ٹریفک سپرنٹنڈنٹ کپتان گریشن تھے۔ آخر الذکر شوکت کے رائے بریلی کے شناسا نکلے، راستے بھر باتیں ہوتی رہیں۔ بے حد شریف اور لئیق انسان تھے، میرے پیر میں ایک چھالے کا ذرا سا زخم ہو کر اچھا ہو گیا تھا مگر جیل میں دوا نہ لگنے سے پھر ہرا ہو چلا تھا۔ آخر دن وہاں کے ڈاکٹر نے صاف کر کے پٹی باندھ دی تھی۔ خود ہی اس کو دیکھ کر کھر دا اسٹیشن روڈ کو تار دیا جہاں اس کا صدر مقام تھا اور ڈاکٹر کو بلا کر زخم کو صاف کرا کے پٹی بندھوا دی اور کئی پٹیاں وغیرہ ساتھ کرا دیں۔ اللہ کے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں۔ کھر دا روڈ پر کپتان گریشن اتر گئے وہاں سے گوموہ تک بہار کے ریلوے پولیس کے سپرنٹنڈنٹ کا ساتھ ہوا۔ بیچارہ گھبرایا ہوا تھا۔ کھر کپور اسٹیشن پر ریلوے ہی کے ملازموں کا کچھ ہجوم تھا۔ اور وہ اللہ اکبر کے بندے ماترم اور گاندھی اور ہم دونوں کی جے پکار رہے تھے۔ گھبرا کر پولیس والوں کو جو ساتھ کے تیسرے درجے کی گاڑی میں تھے اور پہرا اسٹیشن پر اتر کر پہرہ دیتے تھے، سنگین چڑھانے کا حکم دیا۔ گاڑی کے پٹ بھی بند کرا دئے اور اس طرح بوکھلا کر گاڑی کو چلوا دیا کہ دو کانسٹبل اور ایک ہیڈ کانسٹبل بیچارے اسٹیشن پر ہی چھوٹ گئے۔ ساتھ جو انگریز پولیس والے تھے اول تو وہ سمجھے کہ گاڑی شنٹ کر رہی ہے لیکن جب ایک دو میل سے زیادہ چلی گئی تو گھبرا کر انہوں نے زنجیر کھینچ کر گاڑی روکی جب سپرنٹنڈنٹ آیا تو ان پر الٹا جھلایا کہ
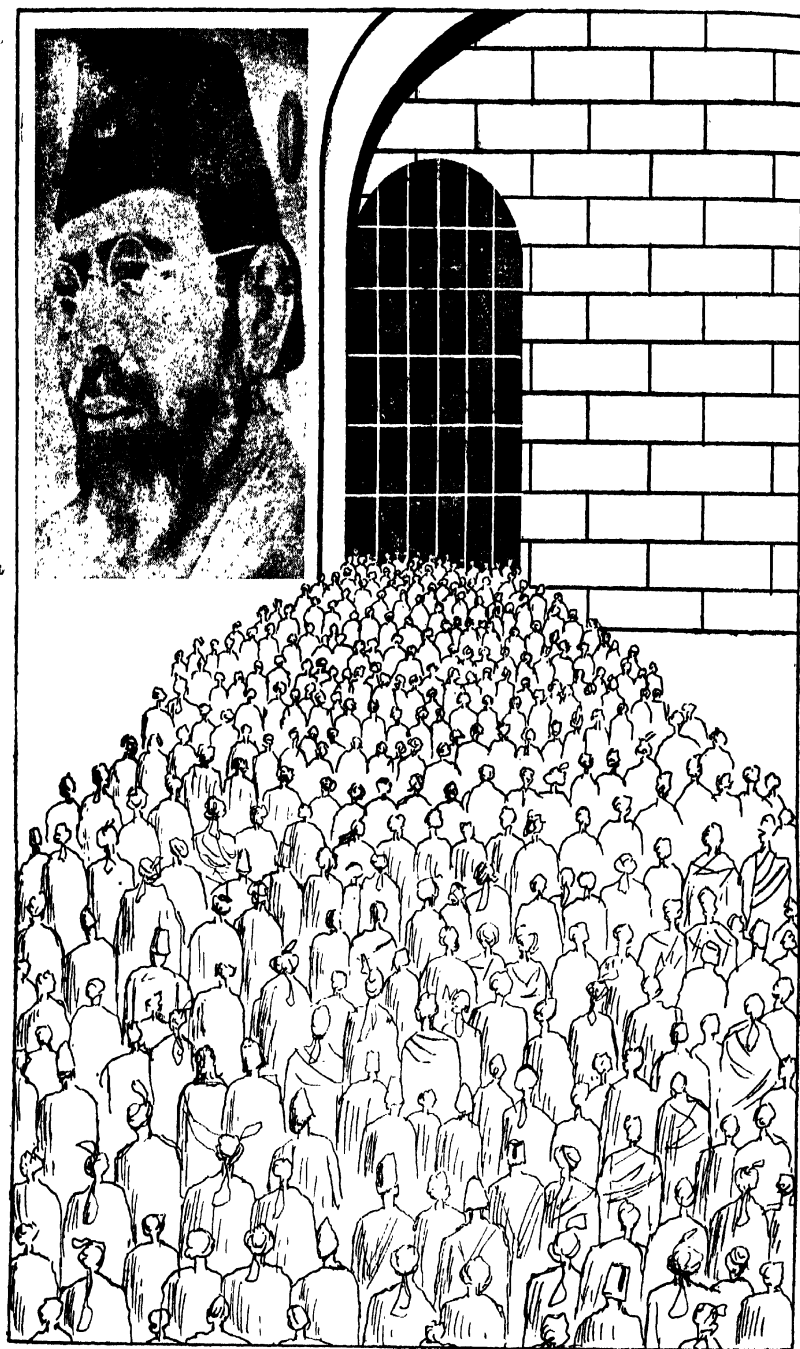
میری بلا اجازت گاڑی کیوں روکی۔ بیچارے اجازت کس طرح لیتے سپرنٹنڈنٹ صاحب تو علیحدہ گاڑی میں تشریف رکھتے تھے پھر کہا کہ تم نے بڑا غضب کیا کہ اس جگہ روک لیا یہاں تو ریلوے فیکٹری ہے تیس ہزار مسلمان رہتے ہیں لیکن تیس ہزار مسلمان اطمینان سے فیکٹری ہی میں رہے تین چار جو باہر آئے السلام علیکم کر کے چپ چاپ بیٹھ گئے اور جب وہ سپاہی جو چھوٹ گئے تھے ہانپتے ہوئے بلکہ گرتے پڑتے اور پریشان حال واپس آئے تو فی امان اللہ کہہ کر ان غریب مسلمانوں نے مجھے رخصت کیا۔ گومہ علی الصباح پہنچے۔ وہاں سے دوسرے شخص کا ساتھ ہوا۔ گیا، سہسرام وغیرہ سے ہوتے ہوئے مغل سرائے آئے وہاں بہار کا دوسرا سپرنٹنڈنٹ بھی رہ گیا اور آگے جا کر یا شاید وہیں ممالک متحدہ کا پولس سپرنٹنڈنٹ ساتھ ہوا۔ ریل کے بڑے افسر کی گاڑی ساتھ تھی ایسٹ انڈین ریلوے کا افسر گومہ سے دہلی تک آیا۔ ہر جگہ کھانے کا تار ریفریشمنٹ روم کو پہلے سے دے دیا جاتا تھا اور اس کی تاکید ہوتی تھی کہ چربی کا پکا ہوا نہ ہو بلکہ گھی یا مکھن کا ہو تاکہ سور کی چربی سے محفوظ رہ سکوں۔ ہر وقت کی نماز کسی نہ کسی اسٹیشن پر اُتر کر پڑھی مگر ممالک متحدہ سے یہ طریقہ شروع ہوا کہ گاڑی کسی بڑے اسٹیشن پر نہ ٹھیری۔ چنانچہ الہ آباد۔ کانپور علیگڑھ دہلی اور اسی طرح سندھ میں حیدرآباد وغیرہ مقامات سے یا تو ایک اسٹیشن ادھر انجن پانی لے لیتا تھا یا ایک اسٹیشن ادھر بقول شاعر۔ ع

"وطن سے نکلتے ہوئے دور دور ہم آئے"

اسپیشل کی اطلاع کسی کو نہ تھی تاہم ریلوے والے چھوٹے چھوٹے اسٹیشنوں پر واقف ہو گئے۔ یوں تو خدا کے کرم سے اور ہندوستانی بھائیوں کی محبت کے باعث ہم پر منوں پھول برسائے جا چکے ہیں، مگر ممالک متحدہ کے ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر جہاں گاڑی رُکی بھی نہیں اسٹیشن ماسٹر اور کلرک ہرے جھنڈے دکھانے کھڑے تھے۔ جب میری گاڑی سامنے آئی تو ایک نے جھنڈی کے نیچے سے پھول نکال کر اچھالے۔ عمر بھر یہ پھول یاد رہیں گے جہاں کہیں بھی گاڑی پہنچتی تھی مجھے دیکھ کر تھوڑے سے بہت آدمی جمع ہو جاتے تھے گرم جوشی کے ساتھ رخصت کرتے تھے پنجاب کے ایک اسٹیشن پر تو ایک ہندو بھائی نے جو ریل کے ملازم تھے اصرار سے دودھ پلایا۔ دودھ پی کر میں اپنا کٹورا دھو رہا تھا کہ ایک مسلمان بھائی نے جو وہیں کھڑے تھے کٹورا ہاتھ سے لے لیا میں سمجھا کہ وہ خود یہ خدمت کرنا چاہتے ہیں مگر وہ اولش بنا کر پی گئے۔ اکثر جگہ ریفرشمنٹ کے خانساماؤں نے بڑی محبت سے کھانا کھلایا۔ ایک جگہ تو میرے چاول کھانے سے عذر کرنے پر خانساماں گھر سے جلد جلد چپاتیاں پکوا لایا۔ غازی آباد پر مدراس کی پولیس کے لوگ اتر گئے اور چلتے وقت بڑی محبت سے سب نے رخصت کیا۔ انگریز انسپکٹر اور سارجنٹ بھی بھلے لوگ تھے۔ غازی آباد پر دہلی پولیس کا ایک انگریز انسپکٹر اور ایک سارجنٹ اور مسلح سپاہی ساتھ ہوئے اور وہی یہاں تک آئے۔ ان کے ساتھ بھی اچھی کٹی اور رخصت کے وقت سب نے بڑی محبت سے رخصت کیا۔ ذلک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ واسع علیم۔ تمام راستہ اچھی طرح کٹا۔ دہلی سے بھٹنڈا اور بھٹنڈے سے سماسٹہ اور وہاں سے کراچی یہ راستہ رہا۔ اکثر حصہ اُجڑا اور غیر آباد ہے۔ سماسٹہ سے نکل کر سارے راستے میں پہلے اور آخری شناسا کی صورت ایک اسٹیشن پر نظر آئی یہ بھی ہمارے جامعہ ملیہ اسلامیہ کا ایک شاگرد تھا جو تبلیغ کا کام کر رہا تھا۔ نصر من اللہ و فتح قریب کہہ کر اس غریب نے بھی رخصت کیا۔ بے شک الا ان نصر اللہ قریب۔ راستے میں خوب فرصت تھی اور جیل میں بھی سورۂ اعراف تک تلاوت ہو گئی ہے۔ اب حفظ

ذ پھر موقعہ ملا ہے ۔ سارے راستے درود شریف کی تسبیحیں پڑھتا ۔ اور یہ شعر دھراتا ہوا آیا ہوں ؎

صبا تو جا کے یہ کہیو مرے سلام کے بعد ،   تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد

اس پیامبر الٰہی (بانی امت والا) کی یاد میں مست ہوں جس کے لئے قرآن میں آیا ہے عزیزٌ علیہ ما عنتم حریصٌ علیکم بالمومنین رؤف الرحیم ط (دشوار گزرتا ہے اس پر جو تم کو تکلیف وہ ہو تمہاری بہتری کی اس کو حرص ہے اور مومنوں پر مہربانی اور رحم کرنے والا ہے) بس خدا کے نام کے بعد اس نام کی رٹ ہے اور ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

اللہ سے دعا ہے کہ اس کے نام پر اگر اس گنہ گار کو نام عطا ہوا ہے تو اس نام کی لاج رکھ لے اور صبر و استقلال عطا فرمائے ۔

اب میں رخصت ہوتا ہوں ۔ آج صرف یہی خط لکھا ہے نہ معلوم فرصت بھی ملتی ہے یا نہیں اس لئے احمدی کو مولانا عبد الباری صاحب کو اور سب عزیزوں اور دوستوں کے دیکھنے کے لئے بھجوا دیجئے گا یا اس کی نقلیں کرا کے بھجوا دیجئے گا ۔ قمر صاحب کو پیار ۔ منی اور ربانی بی کو پیار اور سب بچوں کو پیار ۔ سب کو سلام دعا ۔ شوکت ۔ کچلو وغیرہ سے نہ معلوم کب ملاقات ہو ۔ والٹیر سے ۲۲۵۲ میل کا سفر پورے تین دن رات میں ختم کر کے یہاں پہنچا ہوں ۔

(۲)

. . . .
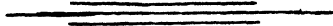
اور مجھے یقین[1] ہوگیا ہے کہ نیا حکم نہ یہاں کے افسران جیل کے ایما سے جاری کیا گیا ہے نہ خود محکمہ کے افسر اعلیٰ کے ایما سے اس لئے جب تک میرے ساتھ یہ افسر خلاف اخلاق شریفانہ سلوک نہ کریں گے میں بھی حسب معمول ان افسروں کے آنے پر کھڑا ہو جایا کروں گا۔ لیکن کراچی کی طرح اگر اسے عملاً تلاشی دینے کے مترادف سمجھا جاوے گا تو بغایت مجبوری اس قسم کے اخلاق کو مجھے یہاں بھی ترک ہی کرنا پڑے گا۔ اس پر مجھے یقین دلایا گیا کہ یہاں کے افسران جیل نے اس امر کی یادداشت باقاعدہ رکھ لی ہے اور گورنمنٹ کو اطلاع بھی دی جا چکی ہے کہ ہر بار تلاشی دینے میں مجھے عذر ہوتا ہے اور تلاشی طوعاً نہیں دی جاتی بلکہ کرہاً دی جاتی ہے گو نہ کوئی اور سختی استعمال کی جاتی ہے نہ میری جانب تشدد کے احتراز کے باعث کسی سختی کی ضرورت ہی پیش آتی ہے۔

میرے انکار کے باعث اگرچہ مجھے کوئی سزا نہیں دی گئی۔ البتہ جو قید تنہائی صرف ایک مہینے کے لئے بطور سزا کے کراچی میں دی گئی تھی اور بعد میں منسوخ کر دی گئی تھی وہ تلاشی دینے سے دوبارہ انکار کے جرم سے پہلے ہی یہاں دی جا رہی تھی اور اب تک برابر جاری ہے بلکہ بہ نسبت پہلے کے روز بروز زیادہ سخت ہوتی جاتی ہے۔ اب صرف دیکھنا یہ ہے کہ یہاں کے افسر جب تک میرے ساتھ خلاف اخلاق شریفانہ برتاؤ نہ کریں گے میں اپنے موجودہ رویہ پر انشاء اللہ قائم رہوں گا۔ جو خاص حالات شوکت کو پیش آئے ہیں ان سے میں واقف نہیں مگر مجھے یقین کامل ہے کہ جو رویہ انہوں نے اختیار کیا ہے وہ ضرور ان کے خاص حالات کے مناسب ہوگا اور یہ تو کوئی احمق ہی خیال کرے گا کہ قید ہونے کے اتنے عرصے بعد ان جیسے شہ زور نے کام کرنا جسمانی تکلیف اور زحمت سے بچنے کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ ہم دونوں کے حالات ممکن ہے کہ اور طرح یکساں نہ ہوں مگر ایک امر میں تو ضرور یکساں ہو سکتے ہیں اور انشاء اللہ آئندہ یکساں رہیں گے یعنی جب تک شوکت کو ملاقات اور خط وکتابت کی اجازت نہ ہوگی میں خود اپنی خوشی سے ملاقات اور اپنے ذاتی حالات کے متعلق خط وکتابت دونوں کو اپنے لئے ناجائز اور ممنوع سمجھوں گا۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے سب سے زیادہ آپ کے دیکھنے کا انتظار رہا کرتا تھا اور آپ ہی کی خیر وعافیت معلوم کرنے کا سب سے زیادہ متمنی ہوا کرتا تھا اور ہوں اور آئندہ بھی رہا کروں گا۔ اگر امجدی اور چھوٹے بچوں سے محض حسن اتفاق سے یہاں آتے وقت فروری میں سورت کے اسٹیشن پر ملاقات نہ ہو گئی ہوتی تو سزا یاب ہونے کے بعد سے کل کی ملاقات ہی سال بھر میں پہلی ملاقات ہوتی۔ مگر یار زندہ صحبت باقی۔ ہاں آپ کی عمر کے خیال سے اس سے کہیں زیادہ آپ کی نقاہت کو دیکھ کر مجھے خوف وہراس ہو تو یہ امر فطری ہے مگر بہ خدائے لایزال میرا دل گواہی دیتا ہے کہ خدا آپ کو اس وقت تک تو ضرور زندہ

[1] اصل خط میں سے شروع کا کچھ حصہ غائب ہے (مرتب)

وسلامت رکھے گا کہ ہم سب ان مرادوں کو پہنچیں اور اسلام اور ہندوستان کے دوبارہ عروج سے ہماری آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو چین ہو۔ لیکن میں ہر حال میں اپنے رب کی مرضی پر راضی ہوں۔ میری جنت یا تلواروں کی چھاؤں میں رہے، یا آپ کے قدموں کے نیچے ہے۔ تاہم مجھے یہ قبول ہے کہ آپ کو دیکھے بغیر آپ سے ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں مگر یہ ہرگز قبول نہیں کہ میں آپ کے دیدار سے سعادت اندوز ہوا کروں اور شوکت کی آنکھیں اس نظارہ کو ترسا کریں۔ وہ ہر حالت میں مجھ سے کہیں زیادہ آپ کی محبت اور اس انعام کے مستحق ہیں اور خدائے بزرگ کے احکام اور اس کے رسول اکرم کی سنت کی پابندی نہ کرنے کی ایک حسرت کو چھوڑ کر اگر میرے دل میں بڑی سے بڑی حسرت ہے تو یہی ہے کہ شوکت کی برابر میں آپ کی خدمت نہ کر سکا اور خدا سے دعا ہے کہ آئندہ اس کی توفیق دے۔ آمین ثم آمین۔

مشہور محدث وخدمت گزار رسول اللہؐ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے بھائی کا انتقال ہو گیا تو وہ نہایت درجہ غمگین وملول تھے۔ سوائے دربار نبوی کے تمام دنیا ان کی آنکھوں میں تیرہ و تار تھی، جس طرح مائیں اپنی اولاد کو رویا کرتی ہیں اُسی طرح ہمیشہ بھائی کا سوگ کیا کرتے تھے۔ مگر سب سے زیادہ اُن کو جس چیز کا غم تھا وہ یہ تھا کہ

اے دریغا آں سبق خوان نیاز　　　　یار من اندر دبستان نیاز
اہ آں سرو سہی بالائے من　　　　در رہ عشق نبیؐ ہم پائے من !

حیف او محروم دربار نبیؐ
چشم من روشن ز دیدار نبیؐ

میں اور میرا برادر دونوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے بہرہ اندوز ہوا کرتے تھے اور دونوں اُسی درسگاہ قدسیان میں ہم سبق تھے۔ افسوس کہ آج میں تو رسولؐ کے دیدار سے مشرف ہوں اور میرے بھائی اس دربار کی حاضری سے محروم رہے۔

آپ قیاس کر سکتی ہیں کہ مجھ سے کس طرح گوارا ہو گا کہ میں آپ کو دیکھوں اور شوکت اس نعمت سے لذت یاب نہ ہو۔ رہے بچے زہرہ اور حمیدہ کی طرف سے میں بے فکر ہوں گو زہرہ کے لئے ایک مشکل وقت قریب آ رہا ہے۔ آمنہ بی پہ جو کچھ گزر چکا تھا وہی کیا کم تھا کہ اب اس کی صحت کی خرابی نے اور پریشان کر دیا اور گلنار کا سوکھا ہوا بدن اور زہرہ دیکھ کر میں ڈر سا گیا۔ کون کہے گا یہ بچی دس برس کی ہے۔ بالخصوص جب اس کی عمر میں اس کی سب بہنیں ماشاء اللہ ہٹی کٹی لحیم شحیم تھیں مگر اول تو خدا مالک ہے پھر جس طرح زاہد صبر کر سکتا ہے اُسی طرح زہرہ صبر کر سکتی ہے اور جس طرح شاہد کو دیکھے بغیر شوکت صابر و شاکر ہیں انشاء اللہ اُسی طرح آمنہ کو دیکھے بغیر میں بھی صابر و شاکر رہ سکوں گا، جس طرح سلطانہ عذرا اور عابد نے اب تک گزاری ہے اُسی طرح حمیدہ اور گلنار بھی باقی دن گزار سکتی ہیں۔ رہی غریب بیوی تو شوکت صاحب تو ہمیشہ کے لئے اس رشتے کو وہ سال کی عمر سے پیشتر ہی خیرباد کہہ چکے تھے مجھے تو خدا کا اور شکر کرنا چاہئیے کہ جس بیماری میں بسم اللہ آپا مرحومہ امجدی کی تیماردار تھی اس سے امجدی صحت یاب ہو گئیں حالانکہ ان کی تیماردار اچھی خاصی ہنستی بولتی خود یکایک ایک ہی چند گھنٹوں کی علالت میں شوکت کو ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئیں۔ میں بھی چالیس اکتالیس کی عمر سے مہمان داخل گھر پر

آیا کرتا ہوں۔

پہلے بیتول کی قید، پھر رہائی ہوتے ہی اس قید سے زیادہ لمبا دیس نکالا اور علی گڑھ اور بمبئی اور ہم سفری سب کو ملا کر چھ سات مہینے کو چھوڑ دیا جائے۔ کہا جا سکتا ہے کہ جون ۱۹۱۹ء سے آج تک کا زمانہ علیحدگی ہی میں بسر ہوا اور ہم ار ستمبر ۱۹۲۱ء کو والٹیر کے اسٹیشن پر قید کی ابتدا کا خیال کیا جائے۔ تو تاہم یہی غنیمت ہے کہ امجدی زندہ ہے اور اس دنیا میں بھی ملاقات کی امید کا دروازہ ہنوز بند نہیں ہوا ہے ورنہ آپ منی غریب کس کس بچوں کو پالتیں۔

آپ میرا یہ خط امجدی کو بھی دکھا دیں اور میرے کل کے رخصتی الفاظ اُسے یاد دلا دیں کہ خدا پر بھروسہ رکھو اور وہی والٹیر کے اسٹیشن کا پیا ہیا نہ رویہ جواب تک قائم رکھا ہے قائم رکھو جس نے مجھے مطمئن کر دیا تھا کہ خدا کی مدد شامل حال ہے تو یہ عورت اپنے مسلمانوں اور ہندوستانی بھائی بہنوں کے سامنے کسی تھڑدلی کے اظہار سے نہ خود شرمندہ ہوگی نہ مجھے اور نہ اپنے بہادر بھائی اور اپنے شیر دل ہزاروں مرنے والوں کو شرمندہ کرے گی۔ قمر (بھابی کا لڑکا) کو نہ دیکھنے کا افسوس رہا مگر ہر نماز میں اپنے مرحوم بھائی اس اکیلے مددگار اور خورشید اور بانو کے لئے دعا کیا کرتا ہوں۔ خدا اس کو پروان چڑھائے اور منی اور بائی دونوں کے دلوں کو ٹھنڈا کرتا رہے۔ آمین ثم آمین۔ سب عزیز و اقارب، دوست احباب کو سلام و دعا۔ سرکار میں میرا آداب کہلوا دیجئے گا۔ نہ معلوم اب کے سال گرہ تک خود حاضر خدمت ہوتا ہوں یا مبارکباد کے تار سے بھی شرکت کی طرح محروم رہتا ہوں۔

اب آپ کا پہلا خط اس وقت آئے جب شوکت کو بھی آپ خط لکھوا سکیں اور ملاقات یا چھوٹنے پر ہوگی یا دونوں کو یکساں ملاقات کی اجازت ملے گی اور ویسے جو خدا کی مرضی۔ میرے یہ شعر اس وقت ہی کیا ہمیشہ حسب حال ہیں۔

ہم معنی ہوس نہیں اے دل ہوائے دوست
راضی ہو بس اُسی میں ہو جس میں رضائے دوست

طغرائے امتیاز ہے خود ابتلائے دوست
اُس کے بڑے نصیب جسے آزمائے دوست

یاں جنبشِ مژہ بھی گناہِ عظیم ہے!
چپ چاپ دیکھتے رہو جو کچھ دکھائے دوست

کیا صبر و عطا نہ کرے گا اگر ہمیں
ہے اعتبارِ وعدۂ صبر آزمائے دوست

جائز ہے وصل و ہجر کا کب امتیاز یاں
جو ہر جفائے غیر کو سمجھو وفائے دوست

ایک دروازہ ہے جس سے کوئی سائل بے مراد پائے واپس نہیں آتا بہ شرطیکہ سو دروازوں کا بھکاری نہ ہو اُسی پر بھروسہ کئے رہے اور اُس سے کسی حالت میں مایوس نہ ہو اور ہر کس و ناکس کی اس چوکھٹ تک رسائی ہے۔

مہاتما گاندھی کے نام

(۴)

۱۸ / اکتوبر ۱۹۲۱ء کراچی جیل

پیارے باپو۔ ایک عرصے سے قدرتاً طبیعت کا تقاضا تھا کہ اب آپ کو کچھ لکھوں، لیکن بہ وجوہ چند در چند تاخیر ہوتی رہی لیکن جب اخبارات میں آپ کے قلم سے نکلی ہوئی بعض تحریریں میری اہلیہ کی تعریف میں اُن کارروائیوں کے متعلق جو وہ والٹیر سے میری گرفتاری کے بعد کرتی رہی ہے پڑھیں، اب تو مجھے مجبوراً آپ کو عریضہ لکھنا پڑا، میرے لئے ایک سطر کا لکھنا بھی وقت طلب کام ہے جس کا آپ نے بھی خود علانیہ اعتراف کیا ہے۔ مجھے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ آپ نے مجھ پر کس قدر گہرا اثر ڈالا ہے، غالباً میں نے ایک مرتبہ آپ سے کہا بھی تھا کہ ہم میاں بیوی میں شادی سے قبل ہی عشق و محبت کی تڑپ پیدا ہو گئی تھی اور یہ ہندوستان میں ایک غیر معمولی بات ہے لیکن ہماری متاہل زندگی کے بعد ہم ایک دوسرے سے ہر سال جدا رہے، اس جدائی نے میری اہلیہ کو پہلے سے بھی زیادہ میرے لئے محبوب اور عزیز تر شریک زندگی بنا دیا اور گزشتہ عرصے میں جب میں نظر بند تھا اس وقت جو راہ اس نے اختیار کی تھی اُس وقت سے ۱۹۱۹ء تک پُرخطر زندگی میں تھی، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ والٹیر کے پولیس اسٹیشن پر وہ میری نظروں میں کس قدر عزیز اور محبوب تھی اس سے پہلے وہ میری نظروں میں نصف بھی نہ تھی، وہ ریلوے پولیس اسٹیشن میں داخل ہوئی اور نہایت فراخ دلی سے مجھ سے کہا کہ ہراساں نہ ہونا میری اور بچیوں کی فکر نہ کرنا، مجھے الوداع کہہ کر رخصت ہو گئی، اور نہایت استقلال کے ساتھ گاڑی میں سوار ہو کر چلی گئی، میں نے کئی مرتبہ .... کے متعلق پڑھی ہیں ان سب تحریروں میں تعریف و توصیف ہے جس کے متعلق میں قدرتاً انکار کرتا ہوں اگرچہ یہ مسرت بخش بیانات مجھ میں ایک سنسنی پیدا کرتی ہیں۔ میں نے کئی مرتبہ وہ تحریریں پڑھی ہیں جن میں آپ نے ہماری پیروکاری یا وکالت کر کے نکتہ چینیوں کو ہماری طرف سے جواب دیا ہے لیکن آپ نے جو کچھ ہماری وکالت یا تعریف کے متعلق تحریر فرمایا ہے ان سب سے زیادہ مسرت بخش میرے لئے یہ بات تھی کہ آپ نے میری عزیز اور جاں باز اہلیہ کی تعریف کی ہے، حقیقتہً میں اس قدر متاثر ہوا ہوں کہ اس رشک انگیز تعریف کا بھی میں خیال نہیں کرتا، مجھے توقع ہے کہ یہ آزمائشی امتحان جلد ختم ہو جائے گا اور وہ جلد سے جلد اپنا کام آزادی کے ساتھ جاری رکھ سکے گی اور آپ سے ایسی ہی رشک انگیز داد لیتی رہے گی تذکرۃً میں یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ شاید آپ نے میرا خط ٹائمز کے نام دیکھا ہوگا جس میں ان تمام واقعات کی حقیقت کھولی ہے جو مجسٹریٹ کے تفتیش کے دوران میں چوتھے روز ظہور پذیر ہوئے؛ آپ کو خود علم ہے کہ کرانیکل جیسے اخبارات تک نے بھی میری تقریروں کی اطلاعات کس بے ترتیبی کے ساتھ شائع کی ہیں، غالباً آپ سمجھ

سکتے ہیں کسی شخص کے لئے اُن حالات اور واقعات کے متعلق رائے قائم کرنا جن کی اطلاعات ایسے بادہوائی طریقے سے اخبار میں شائع ہوں کس قدر خطرناک ہے، یہ لوگ مختصر نویسی کے علم سے بے بہرہ اور معصوم ہوتے ہیں، لیکن واقعات کے سننے اور دیکھنے میں اس قدر محو ہوتے ہیں کہ وہ غیر معمولی طور پر زندہ دل بن کر اپنے فرائض کو بھی نظرانداز کر جاتے ہیں جس کے لئے وہ اخبارات کے نمائندے بن کر آتے ہیں اور جب میں جیل میں نہ تھا تو نہ میرے پاس اس قدر وقت ہی تھا اور نہ خیال ہی ہوتا تھا کہ میری تقریروں کی غلط رپورٹ جو روزانہ اخبارات میں شائع ہوا کرتی ہے اس کی تردید کرتا رہوں، لیکن اب میری قیدخانہ کی زندگی نے مجھے مہلت بخشی ہے وہ ایک ملزم کی زندگی کے لئے ضرورت ہے کہ وہ صبر و تحمل کا عادی ہو اب میں پہلے کی طرح اس قدر آزاد نہیں ہوں کہ غلط بیانیوں کو بغیر تصحیح شدہ چھوڑ دیا جائے لیکن یقینی طور پر کوئی وجہ نہیں ہے جو لفظ چھپ جائے لوگ اس پر اعتبار کریں۔ عدالتی کارروائی کے چوتھے روز کی غلط اور گمراہ کن رپورٹ جب میں پڑھتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کم از کم بعض لوگ ہمارے متعلق غلط فیصلہ کریں گے، میں نے ٹائمز کے ہی خط میں حوالہ دیا ہے کہ کرانیکل نے کس طرح خطرناک الٹ پلٹ کی ہیں، درجنوں جملے میرے بیان کے متعلق غلط شائع کر دئے ہیں میں اُن چند واقعات کا بھی اس موقع پر تذکرہ کر دینا چاہتا ہوں جس کی وجہ سے ہمیں عدالت کی توہین کرنی پڑی ہمارا حقیقی مقصد شرارت نہ تھا، عدالت میں تین روز تک کارروائی عمدگی سے ہوتی رہی جس طرح کہ وکیل استغاثہ صفائی کا الزام دے سکتا ہے، اس سے زیادہ عدالت اس توہین کا ملزم قرار نہیں دے سکتی: مولانا حسین احمد صاحب کے بیان سے یہ قصہ شروع ہوتا ہے، عدالت نے انکار کیا کہ وہ کسی قابل مترجم کو بلائے یہی وجہ تھی کہ کچلو نے بھی اصرار کے ساتھ اردو ہی میں بیان دیا کیوں کہ مجسٹریٹ نے اپنے ملزم کا بیان قلمبند کرنا چاہا جس کو مترجم کی ضرورت نہ ہو، اس کے بعد تو زمین و آسمان بالکل بدل گیا، اگرچہ ہمیں خود علم نہیں کہ یہ تبدیلی رات میں کیوں ہوئی خود عدالت ہی نے توہین کی، کچلو کا بیان جو بالکل میرے بیان کی ہی طرح تھا اس کے پہلے جملے پر اعتراض کیا گیا اور مجسٹریٹ نے اُسے قلم بند نہ کیا اس کے بعد شنکر اچاریہ سے اصرار کیا گیا کہ وہ بیان دینا چاہتے ہیں تو کھڑے ہوں۔ شنکر اچاریہ نے کہا کہ مذہب کی وجہ سے میں ایسا نہیں کر سکتا۔ ان وجوہ سے میرے اور مجسٹریٹ کے درمیان بات نے طول پکڑا۔ اس ردو قدح میں کوئی جذبہ نہ تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ آیا کہ وہ ایسے مقدس مذہبی شنکر اچاریہ ایسی حیثیت والے شخص سے اصرار کرتا ہی رہے گا کہ وہ قانونی عدالت کے اصول کا احترام کریں حالانکہ میں خود اب جس چیز کو وہ مقدس سمجھتا رہا ہے تذلیل کر رہا ہوں، جب کہ وہ قانونی عدالت کا اس قدر احترام کرتا ہے تو کیا خدا پر اُس کا ایمان نہیں ہے؟ جو کچھ اخبارات میں شائع ہوا ہے وہ صرف استفہام کا حصہ ہے کیا خدا پر تمہارا ایمان نہیں ہے؟ میرے اس اپیل کا جو اُس نے جواب دیا ایک نہایت ہی خراب لہجے میں حکم تھا کہ میں بیٹھ جاؤں لیکن جب میں نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کیا تو یہ توہین نے ہرگز بھی نہیں کہا تھا کہ مجھے دیکھنا ہے کہ تم کیا کر لو گے؟ میں نے تو یہ کہا تھا کہ تم طاقت استعمال کر سکتے ہو لیکن ایسا کوئی قانون نہیں ہے جس کے تحت میں کوئی ملزم بیٹھ جانے کے لئے مجبور کیا جا سکے، بیچارے شوکت نے تو مجسٹریٹ کو ملائم کرنے کی انتہائی کوشش کی اور یہ درخواست بھی کی کہ میرے دوران بیان میں مداخلت نہ کی جائے لیکن مجسٹریٹ نے صاف طور سے ارادہ کر لیا تھا کہ گزشتہ روز جو میں نے بیان دیا تھا اس کی طرح اب کوئی ایسی بات نہ ہوگی حامیان موالات مع دیگر حاضرین کے کچھ سنیں گے بھی نہیں، جب مولانا حسین احمد صاحب نے اپنا بیان دینا شروع کیا تو نہ عدالت کے مترجم نے اس کا ترجمہ کیا

(کیوں کہ وہ اپنی ناقابلیت کا اعتراف کر چکا تھا کہ وہ قانون اسلام کی تفسیر کا ترجمہ نہیں کر سکتا) اور نہ اس امر کی کوشش کی گئی کہ جو کچھ مولانا صاحب فرما رہے ہیں اس کو سمجھا جائے، کچھ نہ لکھا گیا۔ یہ بھی کافی نہ سمجھا گیا۔ اس کی لاپرواہی کافی گستاخی تھی لیکن اس پر بھی اس نے ایک یا دو مرتبہ براہ راست توہین کی، مثلاً یہ کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام قرآن یہاں پڑھ دیا جائے مولانا نثار احمد صاحب کے بے حد مختصر بیان کا بھی اچھا حشر نہ ہوا، قانونی کارروائی اور ضروریات کے پورا کرنے کے متعلق بھی مجسٹریٹ اس قدر بے پرواہ تھا کہ میرے باقی ماندہ بیان کے ملنے سے ہی قبل اس نے ہم کو سشن سپرد کر دیا اس بیان کے متعلق خود اس کی ہی خواہش پر میں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ مختصر نویس ٹائپ کرنے والا بھیج دے گا تو میں تحریری بیان دے دوں گا لیکن اس سب کا مطلب خرافات تھا کیوں کہ دوسرے ہی دن جب کہ ثبوت استغاثہ آدھا بھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ اُس نے وکیل سرکار کی درخواست پر موجود گواہوں کی طلبی کے لئے سمن جاری کرانے کے متعلق تھی، حکم دے دیا کہ کارروائی کو بلا ضرورت طول دینا لاحاصل ہے اور سشن کی کارروائی میں یہ گواہ طلب کئے جائیں تو کافی ہوگا، یہ کیسا تعجب خیز امر ہے کہ ایک مجسٹریٹ کارروائی سے قبل ہی نتیجہ نکال لے اور قبل اس کے کہ تفتیش ختم ہو خود جوڈیشل کمشنر کمرہ دیکھنے کے لئے سشن کی کارروائی کے واسطے دیکھنے کے لئے تشریف لاتے ہیں اور وکیل استغاثہ سے اس امر میں گفت وشنید کرتے ہیں۔ میں نے عدالت سے کہا کہ آپ نے بڑھئیوں کو بھی اسی طرح تختے تیار کرنے کے لئے حکم دے دیا ہوگا۔ جب کبھی اسلامی قانون کا حوالہ دیا جاتا تھا تو یہ بات مجسٹریٹ کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتی تھی اور وہ کہہ دیتا تھا کہ یہاں ہمیں فتووں سے بحث نہیں ہے شوکت نے۔ اس سے کہا کہ تم جو مجھ سے سفیر سی باتیں دریافت کرتے ہو اس سے فائدہ کیا ہے، مجھ سے تو یہ پوچھو کہ ایسے واقعات کے متعلق علمائی قانون کیا کہتا ہے۔ لیکن سب بیکار رہا حتیٰ کہ خود شوکت بھی زیادہ عرصے تک مقابلہ نہ کر سکا او . . . . و . . . . . وہ تمام منجر نمائش (کیسی عجیب تھی) لیکن آپ یقین جانیے کہ جب یہ تفتیش ختم ہو چکی اور مجسٹریٹ نے کچھ عرصے کے لئے علیحدگی اختیار کر لی تو وہ ایک مرتبہ اور نئے آدمی کے روپ میں دکھائی دیا، دوسرے مقدمے میں جو شوکت کے اور میرے خلاف تھا وہ پھر ویسا ہی انسان نظر آتا تھا جس طرح کہ وہ تیسرے روز تھا، میں نہیں کہہ سکتا کہ اُس نے پھر یہ روپ کس طرح اختیار کیا، لیکن آپ آخر روز کے اس واقعہ سے عدالت کی اصلی حالت کا (جس میں ملزمین بھی شامل ہیں) خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وکیل استغاثہ گھبراہٹ ہی میں دوڑا ہوا میرے پاس آیا اور دریافت کرنے لگا دیکھا آپ عدالت میں پھر تشریف لے جائیں گے ایک گواہ نے غلط اظہار دئے ہیں اور میں اُسے پھر طلب کرنا چاہتا ہوں۔ میں اس پر راضی ہو گیا اور میں نے کہا کہ جس طرح آپ کی مرضی ہو، جب سی آئی ڈی رپورٹر نے پھر حلف ادا کیا کہ وہ جو کچھ اظہار دے رہا ہے میری تقریر ہے تو میں نے بہ خندہ پیشانی مجسٹریٹ سے کہہ دیا کہ میں اپنے اس حق سے دست بردار ہوتا ہوں کہ گواہ پر دروغ حلفی کی بنا پر استغاثہ دائر کر دوں، حالانکہ اُس نے اپنے پہلے بیان میں ایک غیر دستاویز کو میری تقریر کا ہونا بیان کیا تھا اس پر مجسٹریٹ نے خوش ہو کر میرا شکریہ ادا کیا حقیقت تو یہ ہے کہ ہم نے مجسٹریٹ کو ہمیشہ اضطراری حرکتیں کرنے والا انسان پایا اور جس روز چپقلش ہوتی ہے اس روز اُس سے کہا تھا کہ میرا ہم وطن ایک ایسے غلیظ کام کے لئے مصروف ہو لیکن جس روز بیان دیا ہے اُس کے بعد وہ سنجیدہ اور غیور بن گیا، میں سمجھتا ہوں کہ اس وقت جن لوگوں سے اُس کو اطاعت شعاری کی داد ملنے کی توقع تھی انہوں نے اپنے غصے کا اظہار کیا کہ وہ

تاریخی شاہی مقدمے کو ضائع کر رہا ہے جس کے متعلق ارادہ تھا کہ "انصاف" کا مظاہرہ "جدید اصلاحات" کے تحت میں ہو، حالانکہ وہ قانون اور دیگر کارروائیوں کی توہین کر چکا تھا، یہی وجہ ہے کہ الہ آباد سے راس اسٹن اور ایک عالم اس حالت کو ترقی دینے کے لئے آرہے ہیں اور ایک قابل مترجم لاہور سے آرہا ہے لیکن یہ پوری کارروائی ایک تماشہ تھا اور کوئی بات اسے ترقی نہیں دے سکتی۔ ہم اپنے متعلق یہ کہہ دینا چاہتے ہیں کہ ہمارا مقصد نہ تو عدالت سے مقابلہ کرنا تھا اور نہ شرارت ہے ساتھ ہی اس کے ہم حیوانوں کی طرح گونگے بھی بننا نہیں چاہتے ہیں اور عدم تشدد کا مفہوم جہالت کبھی نہیں تھی تشدد ذمہ دار ہے اور ہر مسلمان فیصلے کے دن آنکھیں کھول دے گا جب کہ تشدد کے صحیح حدود خود اس کے اپنے ذاتی مقدمے میں قائم ہوں گے لیکن عدم تشدد کی ذمہ داری اس سے بھی زیادہ ہے اور وہ میں دیکھتا ہوں کہ اس کے مریدان کے اطاعت شعار غلاموں کو دھوکے میں ڈالے ہوتے ہیں، جو بزدلی کی حد درجہ آتا ہے۔ اچھا اب رخصت! دیوی داس اور دوسرے عزیزوں کو پیار اور بڑوں کی خدمت میں سلام نیاز، وہ چیک ڈر خلافت کمیٹی میں بھیج دینا چاہئے۔ میری والدہ اور اہلیہ کو مالی امداد کی ضرورت نہیں، ہم تو ایسے خطرناک فقیر ہیں کہ اپنے مقصد کے لئے ہر چیز ہضم کر سکتے ہیں۔ آپ کی محبوب اور زبردست شخصیت کو ہمارا سلام۔ (خط کی عبارت صاف نہ تھی بجنسہ نقل کر دی گئی۔ مرتب۔

شیطان کی چالوں سے اب ہو گئے سب واقف

اب ہوں گی الم نشرح ملعون کی سب گھاتیں

بیٹھا ہوا توبہ کی تو خیر منایا کر

ٹلتیں نہیں یوں جو ہر اس دیس کی برساتیں!

---

(۴)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۱ اپریل سنہ ۱۹۳۰ء

دارالخلافت ۔ لولین ۔ نزد بائیکلا برج
مزگاؤں بمبئی

برادرم ۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے تین کارڈ اور آج ہی جب کہ آپ کو عریضہ لکھنے والا تھا، ایک لفافہ، یہ سب مجھے موصول ہوگئے ۔ چوں کہ لکھنے پڑھنے کی اجازت نہیں ہے ۔ اس لئے ارادہ کیا تھا کہ جب گلنار کی شادی کی تاریخ مقرر ہو جائے گی تو آپ کو بلا لوں گا اور بلا لکھے پڑھے گفتگو میں سب کچھ کہہ دیا جائے گا، مگر گلنار کی شادی کی تاریخ شعیب کے اور ہم سب کے رفیق شفیق عبدالرحمن صدیقی زیادہ تر ان کی ولایت سے آمد پر موقوف ہے اور متعدد تاروں کے تبادلے کے بعد وہ یورپ سے ۔ اپریل کو توپیل پڑھے مکہ زیارت روضہ پاک اور حج بیت اللہ کے بعد ہندوستان پہنچیں گے، اور ہم سب اسی امید پر جی رہے ہیں کہ وہ ذوالحجہ ہی کی کسی تاریخ کو دہلی پہنچ جائیں گے کیونکہ محرم میں شادی نہ ہو سکے گی اور صفر میں حمیدہ مرحومہ کا انتقال ہوا تھا ۔ وہ زمانہ بھی ناموزوں ہوگا یوں تو کون عبدالرحمن کے آنے سے خوش نہ ہوگا بالخصوص جب کہ ان کی صحت بالکل غارت ہوگئی ہے ۔ اور وہ متعدد امراض میں گرفتار ہو گئے ہیں اور سخت تکالیف اور درد میں مبتلا ہیں ۔ لیکن ہم سب چاہتے ہیں کہ گلنار کی شادی جلد سے جلد ہو جائے اور صرف عبدالرحمن ہی کی وجہ سے یہ رکی ہوئی ہے، ورنہ مارچ ہی میں عقد کر دینے کا خیال تھا ۔ خط اب تک نہ لکھنے کی وجہ اب میں نے بیان کر دی ۔ مگر اب خط لکھ رہا ہوں تو باوجود آنکھوں کی بصارت اس درجہ تک کھو بیٹھنے کے جی نہیں مانتا کہ مفصل خط نہ لکھوں اور سب باتوں کا جواب نہ دوں اور کچھ شکایت بھی نہ کروں جو ایام سے مایں دل کو جلا رہی ہے ۔

پہلے اسراف کے متعلق سن لیجئے ۔ مولانا کو کسی قسم کا الزام دینا ہرگز ہرگز مکتوب الیہ کا مقصد نہ تھا ۔ وہ اس کی جرأت کر سکتا تھا، مولانا کی مالی ابتری اور اولوالعزمی کو دیکھ کر محض مخلصانہ نیازمندی کی بنا پر چند کلمات ادب کے ساتھ عرض کر دیے گئے تھے ۔ یہ سب اُس کا جواب ہے ۔ اب میرے پاس ہے ہی کیا جو گلنار کی شادی میں اسراف کروں گا ۔ برادرم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے پہلے بھی ان رسوم میں اسراف سے کام نہیں لیا تھا ۔ زہرہ اور آمنہ مرحومہ کی، نہ ان دو بچیوں کی کبھی کوئی رسم ادا کی جو اس اسراف کا الزام مجھ پر لگ سکتا ۔ چونکہ نہ عقیقہ میں، نہ بسم اللہ میں، نہ نشرح میں نہ منگنی میں کوئی رسم ادا کی تھی اور درحقیقت اس زمانے

کا اکثر حصہ قید و بند میں گزرا تھا، رسم ادا بھی کس طرح کرتا، صرف نکاحوں کے موقعہ پر میری اہلیہ نے کچھ خوشی منائی۔ وہ بھی نہ اس طرح کہ ناچ رنگ ہوا ہو یا سب گشت ہوئی ہو، یا کسی اور طریقہ پر برات نکلی ہو۔ جب سے پہلی دو بچیاں پیدا ہوئی تھیں، ان کی ماں عورتوں کے طریقہ پر ان کے لئے کچھ نہ کچھ میری نہایت ہی محدود تنخواہ میں سے بنائی یا خریدتی ہی رہتی تھی، اور وہ بھی زیور نہ تھا بلکہ معمولی روزمرہ کے استعمال کے کپڑے اور برتن بھانڈے، جب میں اکتوبر ۲۰ء میں یورپ سے واپس آیا تو ایک لڑکی ۱۸ کی تھی دوسری ۱۷ سے کچھ ہی کم ہوگی میں تو ایک ہی کا نکاح کرنا چاہتا تھا اور اُس کا بھی اس وقت نہیں۔ لیکن میری بیوی نے سب انتظام میرے ولایت سے آنے سے قبل ہی کر لیا تھا، اور انہوں نے کہا کہ تمہارے قید و بند کا اب زمانہ پھر آگیا، میں تنہا دو جوان لڑکیوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری اپنے سر لینا نہیں چاہتی، دو مسلمان نوجوانوں کو اس ذمہ داری میں شریک کرتی ہوں، آمنہ کی عمر ابھی اٹھارہ کی نہیں ہے جس سے قبل تمہارا ارادہ کسی لڑکی کے نکاح کا نہ تھا، لیکن اس کو ہسٹریا کا مرض ہوگیا ہے، اور حکیم اجمل خاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ نکاح کرنا ہی بہترین علاج ہے۔ دوسرے اتنا روپیہ کس کے پاس ہے کہ ہر سال ایک نکاح کیا جائے میں ان دلائل سے قائل ہوگیا اور نکاحوں کی اجازت دی مگر مجھ کو جامعہ ملیہ کے آغاز کے باعث ایک منٹ کی فرصت نہ تھی اس لئے نکاح سے دو تین روز پیشتر مہمان داخل آکر مرادآباد میں معظم صاحب اور عبدالسلام اور مسعود کے مکانوں میں بیٹھ رہا۔ سوائے مولانا عبدالباری رحمۃ اللہ علیہ کے کسی کو بھی مدعو نہ کیا انصاری وغیرہ دہلی سے بلا دعوت کے آگئے اور کچھ دے ہی گئے۔ مہمانوں کو معمولی کھانا کھلایا گیا۔ صرف رامپور سے برات آنے پر دہی رسم کا پلاؤ زردہ، قلیہ و قورمہ کھلا دیا گیا جو بظاہر نکاح کے کھانے کے لئے اسی طرح ضروری ہے جس طرح عید الفطر کے لئے سویاں اور شب برات کے لئے حلوے۔ میں نے اس شادی میں کوئی حصہ بجز شرکت کے لئے نہیں لیا اس لئے مجھے حق بھی نہ تھا کہ بیگم صاحبہ سے جن کے حسن انتظام کے ہم سب قائل ہیں، کچھ کہتا۔ یہ تھی میرے گھر کی پہلی رسم۔ آمنہ مرحومہ اور والدہ ماجدہ مرحومہ کی موتیں دوسری اور تیسری رسم تھیں، اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں نے اسراف سے اکرام لیا در حقیقت کوئی رسم ادا نہیں کی گئی اور جو کچھ کی بھی گئی تو خیرات نقد کی گئی اور جمعیۃ خلافت وغیرہ کی نذر کر دی گئی، یا محلہ کی مسجد میں برقی روشنی کا انتظام کر دیا گیا جو الحمد للہ اس وقت تک جاری ہے۔ آمنہ کا سارا زیور خلافت کو دے دیا گیا، یہی بڑی خیرات تھی چوتھی رسم حمیدہ مرحومہ کی شادی کی تھی جو بڑی دو بہنوں کی تقریباً آٹھ برس بعد ہوئی۔ اس کے لئے بھی باوجود ہماری قید و بند کے میری بیوی نے کچھ نہ کچھ کر ہی لیا تھا، مگر وہ انہیں کافی معلوم نہ ہوا، اور نہ معلوم مرحومہ کو اپنی آنے والی موت کا پہلے ہی سے کچھ اندیشہ تھا کیا (اور ہو بھی تو کیا عجب ہے کہ تین سال سے حرارت اور درد گردہ میں مبتلا تھی، اور ۲۷ء میں تو اسے دوبارہ پہاڑ پر لے جانا پڑا تھا، اور وہاں بھی بخار آگیا تھا، اور حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور انصاری دونوں کا اصرار تھا کہ شادی کے بعد ہی نسوانی علاج ہو سکے گا۔ کیونکہ اس نے گھر میں آئی ہوئی لیڈی ڈاکٹر کو فیس دے کر امتحان اور معائنہ کے بغیر رخصت کر دیا تھا) خود مرحومہ نے کسی نہ کسی طریقہ پر اپنی ماں پر ظاہر کر دیا تھا کہ وہ دھوم دھام چاہتی ہے۔ میرے پاس کچھ نہ تھا، ایک صاحب نے دسمبر میں تین سو روپے دئے، مدراس کانگریس میں اُسی کی عمدہ کھدر خرید لی تھی اور ایک دوست کی دوکان سے چینی کے برتن اور گلاس وغیرہ قرض لے لئے تھے اور بس۔ مگر اس کی ماں نے اپنے بھائی معظم کو لکھا کہ اپنے

اب ہے تر نہیں سے ۲۲ برس میں انہوں نے ایک بار کوئی دو ہزار روپیہ آمنہ مرحومہ کے مکان کے لئے زمین خریدنے کے لئے تھے، جو اب تک یوں ہی پڑی ہے اور ایک بار ۲۶ء میں اپنے اور میرے حج کے لئے دو ہزار لئے تھے۔ اب انہوں نے تین ہزار معظم کو لکھ کر منگوائے اور ساری خرید و فروخت خود کی اس بار چونکہ ماجد (ماجد علی خاں) جن کے ساتھ یہ شادی ہوئی تھی مالی مشکلات میں گھرے ہوئے تھے، اس لئے رامپور سے بھی سب عزیزوں کو نہ بلایا گیا۔ معظم کی بیبیاں اور میری بہن اور شوکت صاحب کی بچیاں ہی شریک ہوئیں، باہر سے بھی کسی کو مدعو نہیں کیا گیا، البتہ ایک شب کو دہلی سے کوئی سو پچاس احباب کو کھانے پر مدعو کر لیا گیا، یہی اسراف ہوا تھا۔ یا مرحومہ کے لئے کچھ کپڑا لیا گیا تھا۔ پہلے اسراف کا کفارہ یہ کیا گیا کہ جامعہ ملیہ کو پانسو، جمعیۃ خلافت اور جمعیۃ العلماء وغیرہ کو چند سو نقد دے دئے گئے۔ دوسرے اسراف کا کفارہ یہ کیا جا رہا ہے کہ مرحومہ کے کپڑے اور برتن بھانڈے غریب لڑکیوں کو اُن کے عقد نکاح کے موقعوں پر دئے جا رہے ہیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ گلنار کی شادی کی مجھے سب سے زیادہ خوشی ہے، کہ شعیب جیسے صالح مسلمان کے ساتھ، خاندان کی رسم کو توڑ کر رشتہ جوڑا جا رہا ہے اور خدا اس کی عمر دراز کرے، توکل تو خدا ہی پر ہے، لیکن اب اپنی محنت کا خیال کر کے کسی قدر مطمئن ہوں، کہ اُس رزاق حقیقی نے جو مسبب الاسباب ہے میری بیوی اور بچیوں کے لئے ایک یار و مددگار بھی پیدا کر دیا۔ مگر اب خوشیاں منانے کی ہمت ہی نہیں۔ دو جوان لڑکیوں کے نکاحوں کے اتنے جلد بعد ان کا انتقال ہو ہو گیا، کہ شادی و خانہ آبادی کے نام سے ڈر لگتا ہے۔ میں نے جو کچھ اسراف کیا ہے وہ والدۂ مرحومہ اور آمنہ مرحومہ کی قبروں کے بنوانے میں کیا ہے۔ کوئی قبہ نہیں بنوایا، سینے پر سوائے خاک اور گھاس کے کچھ نہیں، مگر ایک جگہ سنگ سبز کا فریم سا بنوا دیا ہے اور ایک جگہ سپید سنگ مرمر کا اور لوح مزار کو خود DISGN کیا ہے۔ آمنہ کی قبر پر "پیام مجلس اور دعائے اسیری" کا ایک شعر کندہ کرا دیا ہے ؎

تیری صحت ہمیں مطلوب تھی، لیکن اس کو
نہیں منظور، تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

جمیلہ کی قبر بھی سپید سنگ مرمر کی اسی طرح تیار کرائی جا رہی ہے اور اُس پر اسی زمانے کے کہے ہوئے یہ دو شعر انشاء اللہ کندہ ہوں گے ؎

ہوا محسوس جب یہ ہے خوشی تیری خوشی اپنی   نہ اپنی موت موت اپنی نہ اپنی زندگی اپنی
کبھی چھوڑا نہ دامن کو ترے پھر تو ہی بتلا دے   اسے بیچارگی تیری کہوں یا بے کسی اپنی

صبر کے سوا اب بھی چارہ نہیں، مگر اب یارائے ضبط کم ہے تو کیا کروں ؎

تو ناگفتہ دانی، گفتن چہ سود

نکاح پڑھانے کا مسئلہ میرے اختیار کا نہیں ہے (مکتوب الیہ نے لکھا تھا، کہ نکاح حضرت مولانا حسین احمد صاحب سے پڑھوایا جائے، تو بہت ہی مناسب ہے۔ آگے اس کا جواب ہے) شعیب کی جو مرضی ہوگی کیا جائے گا، گو میرا جی تو یہی چاہتا ہے کہ میرے صاحب السجن اور آپ کے پیر و مرشد ہی نکاح پڑھائیں، بہر حال انشاء اللہ مولانا کفایت اللہ صاحب صدر جمعیۃ علمائے ہند نکاح نہ پڑھائیں گے۔

محمد علی

(۵)

ساردا بل اسمبلی میں منظور ہو رہا تھا، جس سے ایک خاص عمر کے قبل لڑکیوں اور لڑکوں کی شادی جرم قرار پا رہی تھی۔ مکتوب الیہ نے لکھا تھا کہ اتنے زبردست فتنہ کا مقابلہ آپ ہی کی قیادت میں کیا جا سکتا ہے، آگے اس کا جواب ہے اور اس کے ضمن میں جمعیۃ العلماء سے اختلاف کا ذکر بھی کافی تفصیل سے آجاتا ہے۔ بعض محترم کارکنان جمعیۃ کا تذکرہ جس لب ولہجہ میں ہے۔ عام حالات میں اس کی اشاعت مناسب نہ تھی۔ لیکن ان معرکتہ الآراجلسوں سے متعلق کم ازکم ایک بیان خود مولانا کا لکھا ہوا پبلک کے سامنے آجانا ضروری تھا۔ لہجہ کی تلخی اور خشونت ایسے موقع پر نظر انداز کر دینے کے قابل ہے۔ (مولانا عبدالماجد صاحب)

بھائی، تم اگر نہ بھی لکھتے تب بھی میں شریعت حقہ کے احترام کو قائم رکھنے کی خاطر ان مفسدوں کا مقابلہ ضرور کرتا، جو اسمبلی میں جاکر اپنے تئیں مصلحین کہتے ہیں انہیں پر سورۂ بقرہ کی وہ آیات صادق ہیں کہ واذا قیل لہم لاتفسدوا فی الارض . . . . فما ربحت تجارتہم وما کانوا مہتدین۔ میں نے پربھنی (علاقہ نظام) ہی میں ایک لمبا چوڑا برقی پیام تیار کرنا شروع کر دیا تھا، مگر ٹائپسٹ نہ ملنے سے، اور خود علیل ہونے کے باعث اُسے ٹائپ کر کے بھجوانے نہ پایا تھا کہ اندور میں معلوم ہوا کہ کونسل آف اسٹیٹ نے بھی شاردا بل کو پاس کر دیا۔ تب تو خود ہی بیٹھ کر ٹائپ رائٹر ہی پر وائسرائے کو ایک طول طویل اور سخت خط لکھا، مگر وہ بدبخت منظوری دے ہی چکا تھا۔ اور عازم یورپ ہو گیا۔ میں بھوپال میں تھا کہ دہلی کے جلسے کی اطلاع ملی اور میرے پاس جمیل میاں کا تار آیا کہ داعیوں میں مفتی صاحب کا، ان کا اور میرا نام ہوگا، اجازت درکار ہے، ہفتہ کو تار ملا۔ ارجنٹ تار کے دام کہاں سے لاتا، ارادہ کیا کہ پیر کو معمولی تار دے دوں گا، مگر بھول گیا حالانکہ اُس دن کا خط بھی پیر تک پہنچ جاتا۔ بعد کو بمبئی سے گھومتا گھامتا احمد سعید کا خط آیا، کہ آپ کا پتہ معلوم نہ تھا اس لئے خلافت کی معرفت لکھا جا رہا ہے۔ بہرحال میں جواب دینا بھول گیا۔ مگر جلسے کی شرکت کے لئے دو دن پہلے ہی دہلی پہنچا۔ احمد سعید تعیّن عمر کی کمیٹی کے سامنے تائید کر چکنے کے بعد خود ہی میری جگہ داعی بن بیٹھے تھے۔ میں آتے ہی دو بار ان کے اور مفتی صاحب کے گھر گیا اور ایک بار دفتر جمعیت مگر نہ ملے۔ دوسرے دن جمعیۃ کا جلسہ تھا جس میں سیاست (سطحی) بہت کچھ تھی، مگر مذہب کا قطعی فقدان تھا۔ شام کو دوسرے جلسے کے متعلق جمیل میاں کے ہاں مشورہ تھا، مگر مفتی صاحب اور احمد سعید دیر میں آئے اور لوگ مشورہ کرتے رہے اور سب کی رائے یہ تھی کہ میں اُس جلسے کا صدر بنوں، وائسرائے کو ایک وفد کے ذریعے سے الٹیمیٹم دیا جائے، مسلمان اس ایکٹ سے مستثنیٰ نہ کئے جائیں تو کانپور میں کانفرنس منعقد کی جائے اور تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم پر عمل کر کے ہر کلمہ گو کو جو اس مداخلت فی الدین سے بیزار ہو دعوت دی جائے اور اس مصیبت پر خدا کا شکر ادا کر کے انتشار و افتراق کو دور کیا جائے۔ اس لئے باوجود میرے صدر جمعیۃ خلافت ہونے کے میں نے صرف خلافت کمیٹی کا جلسہ طلب نہ کیا کیونکہ وہ "معتدلین" نہ آتے، نہ شیعہ اور قادیانی شریک ہوتے، اتنے میں مفتی صاحب اور احمد سعید آ گئے پہلے

صدارت کے متعلق پوچھا گیا کہ آپ کے نزدیک کس کا صدر ہونا مناسب ہوگا۔ مفتی صاحب کا جواب بے حد عجیب
ہے، خود ہی داعیوں میں بھی شامل ہیں اور خود ہی فرماتے ہیں کہ "میں اس وقت تک اس کے متعلق بالکل خالی الذہن ہوں۔
مگر احمد سعید نے اس خلائے محض کے پُر ہونے کا بھی ثبوت دے دیا اور کہا کہ "مگر یہ جلسہ تو جمعیتہ العلماء کا بلایا ہوا ہے،
اس کا مستقل اور دوامی صدر اس کا بھی صدر ہوگا"۔ تب جا کر چند دہلی والوں نے جو اس وقت موجود تھے کہا کہ جلسہ تو اہل دہلی
کا طلب کردہ ہے۔ جمیل میاں بھی داعی ہیں، اہل دہلی نے مہمانوں کے لئے خود ہی چندہ کیا ہے، آپ کو اس لئے دے دیا
ہے کہ جمعیتہ علمار کی کمیٹی منتظمہ کا بھی جلسہ ہونے والا تھا، اپنے مہمانوں کے ساتھ ساتھ ہمارے مہمانوں کا بھی انتظام کر دیجئے گا
بالآخر دعوت نامے منگا کر دیکھے گئے تو صاف درج تھا کہ یہ جلسہ جمعیتہ کے جلسے سے بالکل الگ تھا، یہ دعوت نامہ خود مفتی صاحب
کا تحریر کردہ تھا۔ مگر احمد سعید صاحب کا تحریر کردہ دعوت نامہ جو جمعیت والوں کو بھیجا گیا تھا اس میں اسے جمعیت ہی کا جلسہ بتایا
گیا تھا۔ اس تضاد و تباین کا اقبال انہوں نے بھی کیا۔ بہر حال میرا نام صدارت کے لئے پیش کیا گیا اور بلا عذر تسلیم کیا گیا،
گو چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ دونوں علمائے کرام اسے کرہاً قبول کر رہے ہیں۔ آپ کو نہ معلوم وہ گندہ قصہ یاد ہے یا
نہیں کہ ایک ہیجڑا بنیئے کی دوکان پر سے اس کی غیر حاضری میں چنے ٹونگ رہا تھا۔ وہ پیشاب کر رہا تھا۔ پیٹھ پھیر کر دیکھا تو
یہ نظارہ نظر آیا۔ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ مرد ہے یا عورت، گھبرا کر چیخ اٹھا کہ سارے چنے ٹونگ گیا، سارے چنے ٹونگ
گیا......... مفتی صاحب نہ پورے دیندار نکلے نہ پورے دنیادار۔ جب ان سے کہا گیا کہ آپ محمد علی کا نام
صدارت کے لئے بہ حیثیت داعی جلسہ پیش فرمائیں اور جمیل میاں بہ حیثیت داعی دوئم اس کی تائید کر دیں گے تو فرمایا کہ
جمیل میاں پیش فرمائیں میں تائید کروں گا باوجود سب کے اصرار کے انہوں نے تحریک کرنے سے انکار کیا، مگر تائید کرنے کا
اقرار کیا۔ نواب اسمٰعیل خاں نے اس حیرت انگیز انکار و اقرار پر ایک سیدھا سوال کیا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے، تو کچھ نہ فرما سکے
جواب دیا تو یہ کہ تحریک پر اصرار کیوں ہے۔ اس کا جواب دیا گیا کہ جو سلوک مولانا محمد علی کے ساتھ جمعیتہ العلما کے جلسے میں حبیب الرحمن
لدھیانوی نے کیا، اور باوجود ان کے رکن جمعیت اور اس کی انتظامیہ اور عاملہ دونوں مجالس کے ـــــــ رکن ہونے
کے اپنی تقریر میں کہا کہ میں محمد علی کو تو جمعیت کا رکن ہی نہیں تسلیم کرتا، اور جس طرح مسلم لیگ کے جلسے میں جو گزشتہ اواخر مارچ
میں ہوا انہوں نے لیمیز اللہ الخبیث من الطیب کی آیۂ کریمہ پڑھ کر نہرو رپورٹ کے مخالفین کو "خبیث" کا لقب عطا فرمایا تھا
اور نہرو والوں کو "طیب" کا، اور جس طرح مقدم الذکر جماعت کے چلے جانے کے بعد ڈاکٹر محمد عالم کو صدر تجویز کر کے بلا رائے
لئے ہوئے کرسی صدارت پر بٹھا دیا تھا، اور اسی طرح ایک تجویز نہرو رپورٹ کے متعلق پاس کر لی تھی، اس سے خطرہ ہے
کہ جلسے کے لئے لوگوں کے آتے ہی حبیب الرحمن لدھیانوی اور ان کے بھائی نعیم خود آپ کا نام صدارت کے لئے پیش کر
دیں گے، اس لئے ضرورت ہے کہ آپ خود ہی بہ حیثیت داعی جلسہ محمد علی کا نام پیش فرمائیں تا کہ وہی بے لطفی پیدا نہ ہو جو
مراد آباد میں جمعیتہ العلمار کی صدارت کے لئے ان کا نام پیش کئے جانے کے باعث کانپور کے سالانہ جلسہ جمعیتہ العلما کی مجلس
استقبالیہ کو آج تک نصیب ہو رہی ہے........ اس کے بعد انہیں کی طرف سے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ صدر کا انتخاب تو
حاضرین جلسے کے ہاتھ میں ہے، تو ان سے عرض کیا گیا کہ یہ کلیہ نہیں ہے، خود جمعیتہ کے سالانہ جلسے کے لئے خلافت کانفرنس،

کانگریس، مسلم لیگ وغیرہ کے لئے پہلے ہی سے انتخاب کرلیا جاتا ہے تاکہ اس قسم کی ناگوار حالت نہ پیدا ہو جو کانگریس کو سورت میں ۱۹۰۶؁ء میں پیش آئی تھی دہلی میں جو آل انڈیا مسلم کانفرنس آپ نے منعقد کرائی تھی اس کے لئے آغا خاں کا انتخاب اُن کے ولایت سے چلنے سے بھی بیشتر کرکے ان کو مدعو کیا گیا تھا۔ آپ لوگ بہ حیثیت داعیان کے انتخاب کرلیجئے، اور اسی حیثیت سے جلسہ کا آغاز کل صبح فرما کر محمد علی سے صدارت کرائیے یہ معاملہ صرف فتوے دینے کا نہیں ہے، فتوے تو جمعیتہ العلماء دے ہی چکی ہے، اب مسلمانوں کو اس قانون سے مستثنٰی کرانے کی تدابیر پر غور کرنے اور ہر عقیدے اور ہر سیاسی روش کے مسلمان کو متحد کرکے شریعت کے احترام کرانے کا ہے۔ اس پر مفتی صاحب نے کہا کہ اچھا ہم تینوں داعی اس کا فیصلہ کر لیں گے کہ محمد علی کا نام میں پیش کروں یا جمیل میاں پیش کریں اور میں تائید کروں۔ چونکہ ہم نے اعلان کر دیا تھا کہ میں اسی شب کو مسجد جامع میں فلسطین، افغانستان، ساردا بل وغیرہ کے متعلق بالتفصیل تقریر کرنا شروع کروں گا اور دو تین روز تک اس سلسلہ کو جاری رکھوں گا تاکہ ایک عرصے سے میری دہلی کی غیر حاضری کے باعث اظہار خیالات کا جو موقعہ نہیں مل سکا ہے وہ مل جائے اور یہ ال خلاف توقع صرف صدارت ہی کے مسئلہ پر دیر تک بحث چھڑ جانے کے باعث ہمیں مولانا نثار احمد وغیرہ کو مسجد جامع کا جلسہ شروع کردینے کے لئے بھیجنا پڑا۔ اس سے اب ہم لوگ اٹھ کر مسجد جامع کو چلے گئے، جہاں دہلی کے مسلم رضاکاروں کی ایک جمعیت نے تین راتوں کے لئے جلسوں کا پوسٹر وغیرہ کے ذریعے سے اعلان اور روشنی وغیرہ کا انتظام کر دیا تھا اور مفتی صاحب وغیرہ کو جمیل میاں کے پاس چھوڑ گئے وہاں پہنچے تو دیکھا کہ مولانا عبدالحلیم صدیقی ناخواندہ مہمان کی حیثیت سے بیچ میں کود پڑے تھے اور جمعیتہ العلماء اور مفتی کفایت اللہ صاحب کی فضیلت میں گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹے سے نقد دے رہے تھے اور مولانا نثار احمد صاحب کو لب کشائی کا بھی موقعہ نہ دیا تھا۔ دوسرے دن بجائے مفتی صاحب کے جلسے کا بہ حیثیت داعی کے آغاز کرنے کے احمد سعید نے آغاز کر دیا اور یعقوب کی اور مولانا عبدالحلیم کی تقریریں ہونے لگیں، جس کے باعث یوں ہی فضا مکدر ہو گئی۔ اب حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے مفتی صاحب کا نام پیش کر دیا۔ نعیم نے بھی اسی طرح کی تقریر کی (میں اب نہیں کہہ سکتا کہ کس کس نے تقریر کی، مگر جہاں تک ایک مریض کا حافظہ کام دے رہا ہے لکھ رہا ہوں) بالآخر خواجہ غلام السبطین نے جو انتظامات جلسہ اور دعوت ناموں کے اجراء میں احمد سعید کے ساتھ شریک مقرر کئے گئے تھے رات کا فیصلہ مفتی صاحب کو یاد دلایا اور مفتی صاحب نے مبہم طریقہ پر اس کی ایک حد تک تصدیق کی مگر یہ نہ کہا کہ یہ ہم طے کر چکے ہیں کہ بہ حیثیت داعی ہم خود ہی صدر کو منتخب کریں گے۔ کہا تو یہ کہ مجھے اس وقت تک فرصت نہیں ملی کہ جمیل میاں سے طے کرتا کہ وہ محمد علی کا نام پیش کریں اور میں تائید کروں، یا میں خود تحریک کروں اور وہ تائید کریں۔ اب بحث اور بھی چھڑ گئی۔ ورکلاہی وہابیوں کی تائید ایک پکے وہابی مولانا ابراہیم سیالکوٹی نے اس طرح فرمائی کہ خود مجھ سے اپیل کیا کہ میں اپنا نام واپس لے لوں۔ میں نے مجبور ہو کر ایک تقریر کی اور اس کے آخر میں یہ کہہ کر اپنا نام واپس لے لیا کہ مجھ پر اس اپیل کے خلوص کا تو مطلق اثر نہیں ہوا، مگر جو حالات پیش آئے ہیں اس کے بعد اس جلسے کی صدارت کرنا میں اپنی توہین سمجھوں گا۔

(۶)

برادر ۔ جو ذہنیت ان دینداروں کی اور جو . . . . ان کے لفظ لفظ سے ظاہر ہو رہی تھی، اسے اس طرح ایک ایسے معاملے میں بھی دیکھ کر جس میں ہمیں اپنی شریعت کی حرمت برقرار رکھنے کے لئے غیروں کو بھی حامیٔ شریعت کی افکار اور اُن کے اعمال سے متاثر کرنا تھا، اور ہر عقیدے اور طبقے کے مسلمانوں کے اس امر میں اتحاد و اتفاق کو عالم آشکار کرنا تھا، میرا دل رو رہا تھا، میں نے جمعیۃ العلماء کی صدارت کا کبھی بھی خیال نہ کیا تھا، مگر جب مجھے معلوم ہوا کہ ایک خاص جماعت تو اس پر اصرار ہے اور بلا مجھ سے استمزاج لئے ہوئے انہوں نے چند ماہ پیشتر ہی میرا نام مجلس استقبالیہ کی طرف سے بھجوا دیا تھا، اور اس کے بعد سے علمائے کرام میں عجیب عجیب ریشہ دوانیاں ہو رہی ہیں، تو میں نے کانپور سے خط آنے پر اور مجلس استقبالیہ کے اصرار پر صرف اس کا وعدہ کیا تھا کہ خود انکار نہ کروں گا اور نہ خود کوئی کوشش کروں گا، اگر منتخب ہو گیا تو مسلمانوں کی مذہبی اصلاح اور جمعیۃ کی از سر نو ترتیب کے متعلق جو عرصہ دراز سے میرے خیالات ہیں انہیں بصد عجز و ادب جمعیت کے سامنے پیش کر دوں گا مگر جو کارروائی کہ مراد آباد میں ہوئی اور اس سے پیشتر جو مضامین اور خطوط الجمعیۃ میں شفیع داؤدی اور شوکت صاحب کے خلاف صوبۂ بمبئی کی جمعیۃ العلماء کے جلسہ کی صدارت کے بارے میں بطور پیش بندی کے شائع کئے گئے، اور جس طرح کانپور والوں کے ساتھ صریح اور مسلسل بے ایمانی کی گئی اور اب جس طرح بلا مقابلہ حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دھکے کر مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہو گئے، اس کے بعد میرے لئے ناممکن ہو گیا کہ ان حضرات سے کوئی توقع اصلاح کی رکھوں جب جلسہ شروع ہو گیا تو میرے پاس متعدد درخواستیں آئیں کہ جلسہ سے ہم سب اٹھ کر چل دیں۔ مگر میں نے انکار کیا اور سب کو روکا تاکہ حکومت کو اور ہنود کو اس نفاق و شقاق کا نظارہ نہ دکھایا جائے۔ سب بیٹھے رہے، البتہ یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ شام کے جلسے میں نہ آئیں گے۔ ہم نے کوئی احتجاج نہ کیا، اور جو بیان ان تمام واقعات کے متعلق تیار کیا گیا اُس کے حرف حرف کو صحیح اور درست کرنے کے بعد بھی خود میں نے اس کی اشاعت کو روک دیا۔ جن لوگوں نے جمعیۃ العلماء سے استعفے دئے ان کے استعفوں کو بھی اُس وقت نہ بھجوانے دیا۔ ہماری جماعت نے وائسرے کے پاس جو وفد بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا اُس میں بھی علاوہ مولانا حسین احمد صاحب اور دیوبند کے اکابر کے خود مفتی صاحب کو بھی شامل کیا۔ میں شام کے جلسے میں یوں بھی نہ آ سکتا تھا، کیوں کہ علیل ہو گیا تھا۔ مفتی صاحب ان تمام بے ہودگیوں کے بعد اشک شوئی کے لئے میری عیادت کے نام سے تشریف لائے، اور میں نے انہیں ناشتہ کرایا اور وفد میں جانے کے لئے نواب اسمٰعیل خان نے اُن سے کہا اور انہوں نے اقرار کیا، مگر دوسرے دن یہ لکھ کر علیحدہ ہو گئے کہ شام کو میر "جماعت"، "جمعیت" نہیں، اس لئے کہ اس نے اس کے خلاف کوئی قرارداد

نہیں کی۔ نے کہا کہ تم نہ جانا۔ تاہم میں نے ان سے احکام شریعت در بارہ نکاح حاصل کئے، اور گو مولانا حسین احمد صاحب اور مولانا عنایت اللہ صاحب کے بیانات نے جو بے حد مفصل اور مرتب تھے مجھے اس سے مستغنی کر دیا تھا، تاہم میں نے بار بار مفتی صاحب سے ان کے بیان کا تقاضا کیا اور ان سے باوجود اپنی علالت کے ملنے گیا۔ مولانا حسین احمد صاحب شاہجہاں پور جا رہے تھے، اور وہاں کئی روز وعظوں میں مصروف تھے، تاہم میرے اصرار پر تشریف لائے اور اسٹیشن سے سیدھے گورنمنٹ ہاؤس چلے گئے مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم نے آنے کا وعدہ فرمایا تھا مگر مرض الموت نے نہ آنے دیا تو طیب کو اپنی جگہ بھجوایا۔ لیکن مفتی صاحب اور ان کے حواریوں کا رویہ دیکھئے کہ مولانا عبد الحلیم صدیقی نے ایک تقریر کی جس میں ارشاد فرمایا کہ خدارا ہمیں گورنمنٹ کے آستانہ پر سر جھکانے کے لئے نہ لے جائیے ہم پر رحم کیجئے ز حالانکہ احمد سعید Age of Consent Committee کے سامنے غلط سلط شہادت دینے کے لئے بلا تامل چلے گئے تھے بہار گئے بہار نے ہم پر وائسرائے کی دست بوسی کی تہمت لگائی اور احمد سعید نے جھوٹ الجمعیۃ میں دروغ بافیوں کا عرصہ تک سلسلہ جاری رکھا جو بحقیقت آج تک جاری ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مسلمان ہم دونوں بھائیوں کو بے کار سمجھ کر سارا کام ہمیں پر چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ مگر یہ سن کر آپ کو بھی حیرت ہوگی کہ مفتی کفایت اللہ صاحب تو اسی جاہل مطلق نے جا کر سوتے سے جگایا تھا اور ہمدرد میں میرا ہی مضمون اواخر مارچ ۱۹۲۸ء میں اس بل کے خلاف شائع ہوا تھا اور اسی کو لے کر میں صدر جمعیۃ العلماء کی خدمت میں خود حاضر ہوا تھا، اور اس پر بھی ان کی غفلت کا وہ عالم رہا کہ نہرو رپورٹ کے معاملے میں تو یہ اس کی تائید میں درپردہ کوشش کر رہے ہیں مگر شریعت کی حرمت برقرار رکھنے کے لئے انہوں نے ساردا بل کے منظور ہو جانے تک اس قدر کم کام کیا کہ نہیں کرنے کے برابر ہے۔ بہر حال اب باوجود بصارت اور اعصاب کی اس حالت کے اور بخار جاڑے کے دو تین دن میں میں نے Age of Consent کمیٹی کی رپورٹ پڑھی اور ۲۵ ٹائپ کے صفحات کا تحریری بیان تیار کیا اور ساری رات اور سارے دن تو رہی جاگ کر اور آرام لئے یا کھانا کھائے بغیر اسے ٹائپ کر کے ایک دن پہلے وائسرائے کے سکرٹری کو دے آیا۔ مسلمانوں کی قوم میں ایک ٹائپسٹ بھی نہ ملا کہ اس کام کو کرتا۔ تین بجے شام نے یہ بیان وائسرائے کو ملا۔ بے چارے کو گھنٹہ بھر بھی اس کے دیکھنے کو نہ ملا ہوگا۔ دوسرے دن گیارہ بجے وفد پہنچا۔ جو جواب دیا اس کا جواب ہمارے تحریری بیان میں پہلے سے موجود تھا جب اس نے کہا کہ آپ کے بیان پر میں اس وقت تک صرف ایک سرسری نظر ڈال چکا ہوں تو میں نے اس اقبال سے فائدہ اٹھایا اور کہا کہ آج ہم آپ سے جواب لینا نہیں چاہتے، جب آپ اسے دوبارہ اچھی طرح پڑھ لیں گے تو آخری جواب اس وقت لیں گے۔ چنانچہ ۱۵ نومبر کو باوجودیکہ وہ اسی دن دکن کے دورہ پر جا رہا تھا، ڈیڑھ گھنٹہ اس سے مفصل اور صاف صاف گفتگو رہی۔ اور وہ قائل ہو گیا کہ ہم اپنے عقائد اسلامی پر قائم رہتے ہوئے اس قانون کو قبول نہیں کر سکتے، گو ہنود کے باعث اپنی مجبوری کا بھی اظہار کیا۔ (اس کو راز ہی میں رکھئے) دوسرے ہی دن نواب صاحب بھوپال سے ملا اور کہا کہ اگر محمد علی نے Z سے اس بات پر جیت لیا کہ میں نے جس بل کے پیش ہونے سے پیشتر اس کے پیش ہونے کی اجازت دی تھی اس کے بغیر کسی کے مذہب یا مذہبی رسوم و رواج کے متعلق کوئی مسودہ پیش ہی نہیں ہو سکتا، وہ صرف ہنود کے لئے تھی، تو میرے ہاتھ مضبوط ہو جائیں گے اور مسلمانوں پر اسی کا نفاذ کسی

دوسرے بل کے ذریعے سے نہیں ہونے دوں گا۔ میں وائسرائے سے ملنے سے پیشتر مفتی صاحب اور احمد سعید کے سامنے سب باہمیں مسلمانوں کو جتا کر گیا تھا کہ کیا کہنے جاتا ہوں اور واپس آکر مسجد جامع میں نماز مغرب سے قبل جو گفتگو ہوئی تھی سب دوہرا دی، اور دونوں کو گھر سے بلوا کر انہیں کے سامنے سب کچھ کہا۔ تاہم اُن کی حرکات ملاحظہ ہوں کہ ایک مجلس ناموس تحفظ شریعت بناتے ہیں جس میں نہرو دانی جماعت کے حبیب الرحمٰن لدھیانوی، نعیم اور ظفر علی خاں تک ہیں، لیکن میرا نام تک نہیں۔ ان کی بے سود ہڑتال کی میں نے مخالفت نہیں کی، گو اسے بے سود اور غیر مؤثر سمجھا، تاہم مجھے بدنام کیا گیا پھر جب اس سے بھی کام نہ نکلا تو جلوس نکالا۔ مجھ سے آکر ملے اور امداد چاہی تو میں نے اس جلسہ میں بھی ان کی صدارت میں تحریک پیش کی۔ گو انہوں نے میری رائے پر عمل نہ کیا اور جلوس کو چیف کمشنر اور ڈپٹی کمشنر کی کچہری تک نہ لے گئے۔ اس کے بعد ان حضرات کے پاس کچھ نہ تھا۔ میرے گھر آئے۔ میں نہ تھا۔ دوسرے دن میں اسمٰعیل خاں اور شفیع کو لے کر ان کے گھر گیا تو انہوں نے کہا کہ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں، تب میں نے وہی تدبیر بتائی جو میں اندر ہی کے قیام میں طے کر چکا تھا کہ اس قانون کی خلاف ورزی کی جائے، مگر اس طریقے پر نہیں جس سے شریعت بدنام ہو، یعنی محض خلاف ورزی کی خاطر بلا ضرورت گڈے گڑیا کا بیاہ کرنا، بلکہ جس لڑکے کو جس کی عمر ۱۶ یا ۱۷ سال کی ہو "تو نان" کے باعث نکاح کی ضرورت ہو، اور وہ اس حالت میں فرض یا کم سے کم واجب ہی ہوتا ہو، ایک ۱۵ یا ۱۶ برس کی تندرست اور بالغہ لڑکی سے اس کا نکاح کرا دینا، یا نا بالغہ کا نکاح اُس کے ولی کے حکم سے کرانا جب کہ اسے اپنی عمر یا سفر کے باعث اندیشہ ہو کہ اگر وہ مر گیا تو لڑکی یا اُس کا ومتاع خراب لوگوں کے ہاتھ میں پڑ جائے گا، اور اس لئے وہ اس کے سسر وغیرہ کے سپرد کرنا چاہتا ہے، یا ایسی حالت میں جب کہ لڑکی کی ماں زندہ نہیں ہے یا بڑی بہن کی شادی ہونے کے بعد وہ رخصت کر دی جائے گی اور اس کی تربیت کے لئے ساس کے سوا کوئی عورت میسر نہیں ہے، یا ولی اس قدر غریب ہے کہ بچی کی پرورش نہیں کر سکتا، اور سسر کے حوالے کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ صرف انہیں حالتوں میں نکاح پڑھوا کر اور رخصت کرا کے سار دا ایکٹ کی خلاف ورزی کی جائے۔

(یہاں تک مولانا کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے آگے خود لکھنا ممکن نہ ہوا، آگے کسی اور سے لکھوایا ہوا ہے۔)

یہاں تک ۱۱ اپریل کو لکھا جا چکا تھا، مگر اتنا لکھنے کے بعد اس قدر تھک گیا کہ دوسرے دن کے لئے مجبوراً ملتوی کرنا پڑا۔ لیکن دوسرے دن آنکھوں کے ، [illegible] کے پاس گیا اور اس نے بہت محنت کے ساتھ آنکھوں کا معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ بائیں آنکھ تو بالکل جا ہی چکی ہے اس سے بالکل مایوس ہو جانا چاہئے۔ لیکن سیدھی آنکھ کی حالت بھی نہایت خطرناک ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ نے حال ہی میں نگاہ پر زیادہ زور ڈالا ہے یا جوش کی حالت میں کسی سے باتیں کی ہیں اس لئے کہ خون کی ایک دو پھٹکیں تازہ نظر آ رہی ہیں۔ غالباً یہ اسی عریضے کے متعلق ڈاکٹر کا خیال تھا یا ایک اور خط کے متعلق جس کی نقل آپ کو بھیج رہا ہوں جو میں نے سپرو کو خود ہی بیٹھ کر مسلسل چھ گھنٹے میں ٹائپ کیا تھا۔ بہرحال ڈاکٹر کا بیان ہے کہ آنکھ کی Blood vessels دیواریں پھٹنے کے بعد اب اتنی کمزور ہو گئی ہیں کہ اب ہر وقت دوبارہ پھٹنے کا اندیشہ ہے اس وقت تک خدا کا بڑا فضل ہوا ہے کہ گو ہر طرف خون کی چند "پھٹکیں" موجود ہیں جو بصارت کو دھندلا کر رہی

ہیں مگر بیچ کے دائرے میں جسے Macula کہتے ہیں ایک پھٹک بھی موجود نہیں ہے اور جو کچھ ہے وہ اسی آنکھ کی بصارت
ہے اگر آپ نے لکھنے پڑھنے کا کام جاری رکھا یا تقریر کی تو نہیں کہہ سکتا کہ چند سکنڈوں یا چند منٹوں میں یا چند گھنٹوں میں
آپ بالکل اندھے ہو جائیں۔ آپ کی آنکھ کے لئے کوئی دوا نہیں ہے جو مفید ثابت ہو سوائے اصل مرض کے علاج کے جو
ذیابیطس ہے اور سال دو سال کے مسلسل آرام کئے ہیں تو کہوں گا کہ آپ نوکر کو بھی کمرے میں سے نہ پکارا کریں بلکہ اسے
کمرے ہی میں بیٹھے رہنے دیں تاکہ اشارے سے بلا سکیں۔ اس لئے کہ اس کو پکار کر بلانے سے بھی آنکھ کے کسی رکسی
blood vessels کے پھٹنے کا اندیشہ ہے اگر Hemorrhage ہو گیا اور خون کی پھٹک آنکھ کے سامنے آگئی تو
آپ بالکل اندھے ہو جائیں گے۔ کامل ایک گھنٹے کے امتحان کے بعد ہندوستان کے سب سے بڑے Eye
Specialist کی یہ رائے ہے۔ مجبور ہو کر سب کام چھوڑنا پڑا ہے۔ مگر ڈاکٹر نے جو مزید شرط لگائی ہے کہ تفکرات کو
دور رکھو اس کا کیا انتظام کر سکتا ہوں۔ بالخصوص اس زمانے میں جب کہ بظاہر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانان
ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے، وہ مسلمان جو ہماری قید و بند سے بھی متاثر ہو کر ہماری منت و سماجت
پر ہم سے متفق نہیں ہوتے تھے اور انگریزوں کی غلامی ترک کر کے ہندوؤں سے مصالحت کی طرف مائل نہیں ہوتے
تھے ان میں سے بعض باوجود ہماری آج کل کی منت و سماجت کے ہندوؤں کی غلامی کی طرف جھپٹے چلے جا رہے ہیں
اور صرف اس لئے کہ وہ آج ہندوؤں کے پروپیگنڈا سے مرعوب ہیں اور سوچ رہے ہیں کہ اگر ہندو اس جنگ میں جیت گئے تو
ہمارا کیا حشر ہوگا۔ اور ان شیاگرہی سورماؤں کو اپنی حفاظت کا سوائے اس کے کوئی طریقہ نظر نہیں آتا کہ علی برادران پر حملہ
کریں ان نبرد آزماؤں کو اس کا بھی خیال نہیں کہ وہ ایک مریض پر بھی جو ان کا جواب نہیں دے سکتا متواتر حملے کر رہے ہیں اور
اس کے خلاف گندے سے گندہ اور جھوٹے سے جھوٹا پروپیگنڈا کر رہے ہیں۔ اور لطف تو یہ ہے کہ حاملین شریعت
حقہ یعنی علمائے کرام ان نبرد آزماؤں کے قائد اور رہنما ہیں اور "الجمعیۃ" کے کالم اس کے لئے وقف ہو گئے۔ اب
ان جملہ ہائے معترضہ کو میں یہیں ختم کرتا ہوں اور اپنے عریضے کا سلسلہ دوبارہ شروع کرتا ہوں میری بتائی
ہوئی تدبیر پر خوب جرح و قدح کی گئی اور جو تدبیریں اور بتائی جا رہی تھیں یعنی شراب کی دوکانوں پر Picketing
وغیرہ اس پر بھی غور کیا گیا اور آخر کو یہی طے پایا کہ دہلی میں ہم سب مل کر متفقہ طور پر متذکرہ بالا قسم کا ایک نکاح پڑھوا
کر شاردا ایکٹ کی خلاف ورزی کریں اور جب ہم پر مقدمہ چلایا جائے تو عذر پیش کریں۔ اس قانون کا نفاذ
مسلمانوں کے خلاف نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے یہ ہماری شریعت کے خلاف ہے اور ایسے قانون کو مجالس مقننہ میں
پیش کرنے سے پہلے گورنر جنرل سے

(مکتوب اسی مقام پر ناتمام، اچانک
برادرم! ایک اپاہج بھائی سے ~~)

کہ اس عریضے کو اسی طرح ناتمام بھیج رہا ہوں میری آخری تحریر ہے۔ آخری تحریر اماں ...
۵ رکو کروں گا۔ براہِ کرم وہاں تشریف لے آیئے۔ کانپور آنے کا وعدہ فرمانے کے باوجود انتظار ہی رکھا یا

۷

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۲۰ ستمبر ۱۹۳۰ء — گیسٹ ہاؤس۔ بھوپال

برادرم محترم۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ[۱]

آپ کا محبت نامہ ۲ اگست، مجھے کوئی ۷-۸ اگست تک غالباً مل گیا تھا۔ لیکن چونکہ محض عیادت نامہ نہ تھا، بلکہ سیاست نامہ[۲] بھی تھا، اس لئے جواب کی ہمت اس وقت نہ کر سکا اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن کے حکم سے اس وقت تک انتظار کیا جبکہ خود گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھ کر خط لکھنے کے قابل ہو جانے کی امید تھی، جوں ہی حالت اس قابل ہوئی سیدھی آنکھ نے بھی تقریباً جواب دے دیا اور جس بیمار کو نئے نواب صاحب رامپور اور شوکت صاحب کی طلبی پر رام پور جانے سے ڈاکٹر صاحب نے روک دیا تھا، اور نواب صاحب بھوپال نے معذرت کا تار بھیج کر اس کی وجہ بیان کر دی تھی، اس کو دوسرے ہی دن بمبئی بھاگنا پڑا کہ ڈاکٹر چشم کو پھر آنکھ دکھائے، اور بالکل اندھا بننے سے بچ سکے۔ اسی دن سے آج تک آنکھ اس قابل نہیں ہے کہ کچھ بھی لکھ پڑھ سکوں، دوسروں کا محتاج۔

آپ نے میری صحت کے متعلق ۲ اگست کو لکھا تھا کہ "میری دعاؤں سے خدا کرے آپ کے افاقہ کی خبر سنائی دی۔ یقیناً میری بیماری میں افاقہ ہوا تھا، مگر نہ اس قدر کہ جتنا عام طور پر سمجھ لیا گیا۔ درحقیقت زیادہ تر حصہ خود شملے کی بلندی سے نزول تھا۔ سو کن پہنچتے ہی جب کہ ہوا اس قدر رقیق نہ رہی، اس سے زیادہ افاقہ ہو گیا، اور پہلی بار اتنی بھوک لگی کہ میں نے دوسروں کو چائے پیتے دیکھ کر خود بھی ایک پیالی چائے مانگی۔ باقی افاقہ پلنگ پر پڑے رہنے سے ہوا، شاید کسی قدر دواؤں سے بھی ہوا ہوگا۔ رہا دعاؤں کا معاملہ میں کب آپ کی دعا کی تاثیر کا قائل نہ تھا، البتہ اگر اب بھی صاحب فراش ہوں، تو ممکن ہے کہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔[۳] تو نہیں مگر شاید۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔[۴] کی مقدس ہستیوں کی آپ کی دعاؤں میں شرکت کا اثر ہو۔

اگر آپ کو افاقے کے متعلق غلط فہمی نہ ہوئی ہوتی، تو آپ ہرگز مجھ سے نہ پوچھتے، کہ میں ۱۵ اگست کو لکھنؤ آرہا ہوں یا نہیں[۵] "دستار رحال"، اب تو میرے مذہب میں گول میز کانفرنس ہی کی شرکت کے لئے جائز رہ گیا ہے جس کے متعلق

---

[۱] یہ پورا مکتوب، مولانا کے ہاتھ کا نہیں، کسی سے لکھوایا ہوا ہے۔ صرف آخر میں دستخط مولانا کے قلم کے ہیں اور افسوس کہ یہی مکتوب مولانا کا آخری مکتوب، مکتوب الیہ کے نام ہے۔ [۲] یہ وہ زمانہ ہے جب مولانا مشرق سے علیل ہیں اور ساتھ ہی خود اسلامی پریس میں ہر طرح کے مطاعن اور اتہامات کے ہدف [۳] ایک مقام کا نام [۴] ایک اور مقام کا نام [۵] غالباً مرکزی خلافت کمیٹی کا جلسہ تھا۔

ابھی عرض کروں گا۔ میں آج ہی معہ اپنی اہلیہ کے دہلی جانا چاہتا تھا تاکہ رختِ سفر باندھ سکوں، لیکن گذشتہ دو ہفتوں میں خون کا دباؤ کسی قدر بڑھا رہا، اور ضیقِ نفس بھی کسی قدر رہا۔ اس کے باعث ڈاکٹر عبدالرحمٰن صاحب نے پھر حکمِ امتناعی جاری کر دیا اور اب صرف میری اہلیہ دو ایک دن میں چلی جائیں گی۔ ارادہ تھا کہ رام پور جاتے وقت آپ کو تار دے کر کم از کم وہیں بلا لوں، اور نہ معلوم واپسی ہو یا نہ ہو[1]، چلتے وقت آپ سے مل لوں لیکن آپ سے اتنا قریب بھی اسی طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ بھوپال تشریف لائیں اور خلافت کمیٹی کے جلسے میں جو ۲ اور ۳ اکتوبر کو ہونے والا ہے کاش جا کر شریک ہوں نیز انشاءاللہ ۲۹، ۳۰ تک بمبئی چلا جاؤں گا، بشرطیکہ گول میز کانفرنس کے التواء کا حکم نہ آیا براہِ کرم ضرور آکر مل لیجئے اگر اب میں بزدل یا درغا ہوں اور آپ کے . . .[2] کی طرح ایسا ہندو پرست نہیں رہا جیسا کہ دو تین سال پہلے مجھ کو کہتے تھے تاہم چونکہ آپ کو نہ صرف . . .[3] سے بلکہ [4]. . . سے کچھ تعلق ہے۔ اس لیے بزدلوں اور غداروں سے ملنا بھی آپ کے مذہب میں ناجائز نہ ہوگا . . . . . . پائنیر[5] میں جو مضمون نکلا تھا وہ خود لغو تھا، اور اس کا لکھنے والا بھی لغو ہے ایک متعصب ہندو کا لکھا ہوا ہے جو ان بزرگوں کی طرح سے خوب جانتا ہے کہ جیسا اور سر محمد شفیع بھی خریدے جا سکتے ہیں، مگر محمد علی انمول ہے۔

آپ جس طرح مذہب کے بارے میں اب تک صراطِ مستقیم پر نہ پڑ سکے اور آپ کی زندگی میں اس کے پہلے حصے کی فلسفیت کے خلاف ابھی تک ردعمل جاری ہے، اور آپ سائنس کو حرام سمجھتے ہیں[6]۔ اسی طرح آپ اب تک سیاست میں بھی صراطِ مستقیم پر نہ پہنچ سکے۔ تہذیبِ مغربی کی بے ہودگیوں اور مغربی استعمار کے خلاف ابھی ردعمل جاری ہے اور وہ ہندو کی تنگ دلی اور تعصب کو ایک بڑی حد تک آپ کی آنکھوں سے چھپائے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نہ پائنیر کے مضمون نگار کی شیطنت[7] کو پہچان سکے اور نہ سنتیہ گرہیوں کی روزانہ دروغ بافی کو۔

میرے اسمبلی کے انتخاب کے متعلق آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے[8] اس سے مجھے اندیشہ ہوا کہ آپ نہ صرف زمینداروں وغیرہ پر اعتراض کر رہے ہیں، بلکہ مجھ سے بھی استفسار کر رہے ہیں کہ کیا واقعی تم اسمبلی میں شریک ہو گئے۔ حقیقتہً میرے قلب کی حالت نہ اس وقت ایسی تھی کہ میں سکون کے ساتھ ان چیزوں کے متعلق لکھ سکا، نہ اب پوری طرح اس قابل ہوا ہوں کہ سکون کے ساتھ ان کے متعلق کچھ لکھوا سکوں، آپ کو شاید یہ سن کر حیرت اور افسوس دونوں ہوں کہ میں نے اپنے دو دوستوں کو اس کی اجازت دی تھی، جہاں کہ بستر مرض ذرا اسی دیر میں بستر مرگ ہو سکتا تھا کہ اگر وہ چاہیں، تو مجھے اسمبلی کا ممبر منتخب کر سکتے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ میں اب اس رائے پر پہونچا تھا، کہ اگر نیا دستور اساسی ایسا بن گیا کہ اس میں اسمبلی کو حقیقی آزادی مل گئی تو میں بھی اس میں شریک ہو جاؤں گا، گو اس وقت تک میں مولانا . . . . . . صاحب کی طرح شرکت

---

[1] اپنی موت کے قریب کا احساس۔ [2] ایک مشہور بزرگ، قوم کا نام۔ [3] ایک مقام کا نام۔ [4] ایک اور مقام کا نام۔ [5] ۲۱ جولائی کے پائنیر میں مولانا پر ایک مفصل مضمون کسی کا نکلا تھا جس میں مولانا کو بہترین مگر ناکام ترین لیڈر دکھایا گیا تھا، مکتوب الیہ نے اپنے خط میں اس مضمون کی داد دی تھی [6] یہ صرف مولانا کا خیال تھا واقعہ یہ نہیں ہے۔ [7] یہ لفظ مکتوب الیہ نے رکھ دیا ہے۔ مولانا کا لفظ اس سے زیادہ کڑا تھا۔ [8] لیڈر، ٹریبیون وغیرہ ہندوؤں کے انگریزی اردو کے دو ایک رسالوں نے بھی یہ خبر پھیلانی شروع کر دی تھی کہ مولانا اسمبلی کی ممبری کے امیدوار ہیں، اور اس کے بعد صدا . . . . .

جائز نہیں سمجھتا۔ ایک زمانے میں مولانا حسین احمد صاحب میرے ہم خیال تھے اور جمیعۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ میں میرے کہنے سے، جیل سے چھوٹتے ہی انہوں نے ایک تحریک سوراجیوں کے نقطہ نظر کے خلاف پیش کرنا چاہی تھی، جس سے کفایت اللہ نے (آپ ...[1]... اور ...[2]... کی دروغ بافیوں پر تو معترض ہیں .... کفایت اللہ صاحب اور الجمیعۃ کی افترا پردازیوں کے متعلق نہ آپ نے کبھی کچھ لکھا اور نہ مولانا حسین احمد صاحب نے) ٹال دینا چاہا تھا۔ دو سال بعد ..... صاحب[3] اور ان کے ..... احمد سعید نے مولانا حسین احمد ہی سے ایک رزولیوشن تیار کرا کے جمیعۃ العلماء کے جلسۂ انتظامیہ میں پاس کرا ہی کے چھوڑا جس میں سر کے گرد ہاتھ گھما کر ناک پکڑی گئی تھی، اور اسمبلی اور کونسلوں میں شرکت کے جواز کا فتوی دارالافتاء سے شائع کیا گیا تھا، خیر یہ پرانی بحث ہے۔ میں مسلمان ممبران اسمبلی کی بے اصولیوں اور نفس پروریوں سے اتنا تنگ آ گیا تھا، کہ نواب اسمٰعیل خاں اور شفیع داؤدی صاحب کے اصرار سے اور جناح اور خلافت والوں کے کہنے سے میں نے لیے قبول کر لیا تھا کہ اگر دستور اساسی کی بنیاد حقیقی آزادی قرار پائی تو میں شریک ہو کر اُن کے دوش بدوش تحفظ اسلامی اور اتحاد ملل ہند کے لئے جد و جہد کروں گا، میں خود وائسرائے کو رائے دے چکا تھا کہ انتخاب گول میز کانفرس کے بعد کیا جائے لیکن شملے میں جب کہ میری حالت بہت خراب تھی، مجھے اطلاع ملی کہ انتخاب ابھی ہو گا۔ اس پر میں نے فیصلہ کیا کہ اگر میرے دوست ضرورت سمجھیں تو میرا انتخاب کرا دیں، لیکن چونکہ پہلا اجلاس گول میز کانفرس کے بعد ہو گا میری شرکت اس پر منحصر ہو گی کہ دستور اساسی آزادی پر مبنی ہو۔ یہ تھی کل حقیقت، لیکن آپ کے ستیہ گرہیوں نے اس پر اسپیکری وغیرہ کا قصہ تیار کر دیا۔

چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ حقیقت کو دیکھتے ہوئے بھی یہ مفتری افترا پردازی سے باز نہیں آتے، اور افسانہ گوئی کے بغیر رہ نہیں سکتے۔

انقلاب میں جو مکتوب شائع ہوا تھا، وہ میری درخواست کے ایک ماہ سے زائد کے بعد شائع ہوا۔ میں تو ہمدرد کو بند کر کے مہر سکوت اپنے ہونٹوں پر لگا چکا تھا، لیکن اس ملت مرحومہ کی مردم شناسی کو کیا کہا جائے، الجمیعۃ اور زمیندار وغیرہ کی افترا پردازیوں کے بعد مجبور ہو کر یہ خط سالک صاحب کو لکھنا پڑا اور اُن سے درخواست کی گئی کہ وہ اس میں فراہم کردہ مواد کو اپنے دو ایک مضمون میں شائع کر دیں، جو انہوں نے نہیں کیا[4]۔

اب شرکت (گول میز) کانفرنس کے متعلق کچھ مواد آپ کو بھیج رہا ہوں کہ آپ اسے اپنے کسی مضمون میں شائع کرا دیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرا اصلی خط وائسرائے کے نام کا شائع کیا جائے، تا آنکہ اشد ضرورت نہ ہو، مگر اس کا سارا مواد آپ حرف بحرف شائع کر سکتے ہیں اور یہ بھی لکھ سکتے ہیں کہ ان خیالات کا اظہار میں نے اُن حلقوں میں کر دیا ہے، جہاں سے دعوت آئی تھی۔

---

[1] و [2] دو روزناموں کے نام ہیں۔ [3] مفتی صاحب کا ذکر ہے، [4] مکتوب الیہ نے لکھا تھا کہ لوگ طرح طرح کے اتہامات لگا رہے ہیں آپ خود خاموش رہنا چاہتے ہیں تو مضائقہ نہیں، لیکن اپنے متعلق صحیح معلومات اپنے اس نیاز مند کے پاس کبھی کبھی بھیج دیا،

پاؤں میں پہلے ہی حس نہ تھا، اب حالت کچھ بدتر ہی ہے اور سردی میں ہر وقت گنگرین اور پایان کی قطع و برید اور اسی طرح موت کا اندیشہ رہے گا جس سے ڈاکٹر انصاری کے مرحوم و مغفور منجھلے بھائی صاحب کو دوچار ہونا پڑا۔

اب تک صاحب فراموش ہوں۔ کانفرنس کے روزانہ اجلاس میں نہ صرف ہندوؤں اور انگریزوں بلکہ سب سے زیادہ خود مسلمان بھائیوں سے ایک ایک نقطہ پر جنگ کرنی پڑے گی۔

ان تین محاذوں پر ...... جنگ کرنے میں ہر وقت دل کی حرکت یکایک بند ہو جانے کا اندیشہ ہے سب سے زائد یہ کہ اب لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ کامل نابینائی کا ماہر علاج چشم نے پورا الیقین دلایا ہے، کہ اگر میں سب کام چھوڑ کر نیپال جیسے ملک کو نہ بلا جاؤں، جہاں دنیا کی کوئی خبر نہ ملے لیکن اس پر بھی میں سمجھتا ہوں کہ میرا مذہبی فرض ہے کہ اس کانفرنس میں شریک ہوں اور۔ ہاں سلطان جابر اور رعایائے جابر دونوں کے سامنے کلمۂ حق کہہ کر سب سے افضل جہاد کروں[1] تاآنکہ اس کام میں مر جاؤں۔ اس لئے قرض دام لے کر، بھیک مانگ کر، اور جس طرح بھی ہو سکے گا تین چار ہزار روپیہ فراہم کر کے اپنی اہلیہ کو بھی ساتھ لے چلوں گا۔ اس لئے کہ وہ زندگی کی ساری منازل و مراحل میں میری رفیق سفر رہی، جب منزل مقصود کے لئے احرام سفر باندھوں، تو چاہتا ہوں کہ وہ موجود ہو[2]۔ ورنہ لندن کا بدترین موسم ہے، اور ہر متمول انگریز اور میسم انگلستان تک کو چھوڑ کر دوسرے ملکوں کو بھاگ جاتے ہیں۔ بہر حال وائسرائے کا دعوت نامہ اور میرا جواب ملفوف ہے۔ میرے خط بنام وائسرائے کو بہ طور خط کے نہ چھاپئے۔ اپنے مضمون میں آپ اس کے خیالات میرے ہی الفاظ میں شائع کر سکتے ہیں .... اس کے لئے بہتر اخبار ہوگا۔

جب آپ یہاں آئیں گے، تو آپ کو وہ خطوط دکھاؤں گا، جو مسلمانوں کی نمائندگی کے متعلق میں نے بستر پر سے بھی وائسرائے کو لکھے تھے۔ اب رخصت ہوتا ہوں۔ میری گستاخیوں کو معاف کیجئے اور میری کامیابی کے لئے دعا کیجئے اور جلد آکر مجھ سے مل جائیے۔ میری اہلیہ کا بھی سلام قبول کیجئے اور اپنے گھر میں ہمارا سلام شوق کہیئے۔ اور بچوں کو خوب پیار کیجئے

آپ کا گستاخ بھائی

محمد علی

[1] اشارہ ہے اس حدیث نبوی کی طرف جس میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہا جائے۔

[2] اللہ اللہ یہ دردناک پیشین گوئی کیسی صحیح اتری۔

کانگرس سے علیحدگی

جون ۱۹۲۸ء میں مولانا علاج کی غرض سے یورپ تشریف لے گئے۔ ان کی غیر حاضری میں نہرو رپورٹ مرتب ہوئی اور آل انڈیا پارٹیز نے اسے منظور کر لیا۔ مولانا مدراس کانگرس کے فرقہ وارانہ فیصلوں کو برقرار رکھنے کے حامی اور نہرو رپورٹ کے خلاف تھے ہندوستان میں واپس آتے ہی انہوں نے نہرو رپورٹ کی مخالفت کی اور دسمبر ۱۹۲۸ء میں جب کانگرس نے کلکتہ کے مقام پر نہرو رپورٹ کو قبول کر لیا تو مولانا کانگرس سے علیحدہ ہو گئے۔
یہ صدارتی خطبہ جو خلافت کانفرنس منعقدہ کلکتہ میں انہی دنوں میں مولانا نے زبانی دیا تھا۔ کانگرس سے علیحدگی کا اعلان ہے۔

برادرانِ ملت! آپ مجھے معاف کریں گے۔ اگر میں بہت ہی اختصار کے ساتھ چند واقعات اپنی پبلک زندگی کے ایک خاص غرض سے عرض کروں۔

بیس برس سے زیادہ کا عرصہ ہوا کہ مجھے آپ نے ملک کے سامنے آتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ خواہ علی گڑھ کالج کے پرانے طالب علم کی حیثیت سے، یا لیگ کے صدر کی حیثیت سے، اور آخر میں کانگرس کے ایک رکن اور پھر ایک صدر کی حیثیت سے، اس کے بعد خلافت یا کسی اور وفد کے ممبر کی حیثیت سے۔ اور آج خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے آپ کے سامنے آیا ہوں۔ لیکن میرے عزیز ترین دوستوں اور عزیزوں کو اس کا علم نہ ہوگا اور بڑے بھائی کو جو میری پرائیویٹ زندگی کے حال سے بھی واقفیت رکھتے ہیں، بھی اس کا علم نہ ہوگا کہ میں نے کسی جلسہ کی خواہ وہ پرائیویٹ ہو یا سیاسی یا ملکی، چھوٹا بڑا ایسا ہی جلسہ ہو کبھی صدارت نہیں کی اور کسی جماعت کا کوئی منصب یا عہدہ قبول نہیں کیا۔ پھر اپنے نوعمر ساتھیوں میں عہدے اور منصب کی خواہش کو دیکھا کرتا تھا جو جوانوں سے بہت سی رقابت کا باعث ہوتی ہے اور کام خراب کرتی ہے۔ میں نے جو کچھ تعلیم حاصل کی تھی اس سے سبق مل گیا تھا کہ اگر دنیا میں کوئی نام و نمود چاہتا ہے تو وہ صرف کام ہی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور کام کے لئے عہدہ کی ضرورت نہیں، جس جمعیت میں کام کرتا ہوں تو وہاں رکن کی حیثیت سے کام میں حصہ لینے سے عہدے داروں سے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے جب کسی دوست نے مجھ سے کہا۔ کہ فلاں عہدہ آپ کے لئے تجویز کرتے ہیں تو میں نے انکار کر دیا۔ مگر میں

"ہمدرد" — ۱۵۔ جنوری ۱۹۲۹ء

نے سوچ لیا تھا کہ چالیس برس سے پہلے جب کو رسول کریم پہلا خدائی فرمان اور رب کا پیغام غار حرا سے لے کر نکلے تھے۔ کسی مسلم نوجوان کو یہ حق نہیں کہ وہ کوئی منصب لے۔ لیکن یہ بھی اتفاقی امر تھا کہ میں نے جس منصب کے لیے کبھی کوشش نہیں کی اور نہ کر سکتا تھا کیوں کہ چھندواڑے کی نظر بندی کے زمانے میں کوئی سیاسی کام نہیں کر سکتا تھا۔ مجھ کو ایک منصب عطا کیا گیا تھا اور وہ اسی شہر میں مسلم لیگ کی صدارت تھی۔ جس کا سنگ بنیاد ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ کے اندر رکھا گیا تھا۔ اسی سال ۱۹۱۷ء میں مسز بسنٹ کو کانگرس کی صدارت عطا ہوئی اور گورنمنٹ نے انہیں کم خطرناک سمجھ کر آزاد کر دیا تھا۔ کیونکہ گورنمنٹ خوب سمجھتی تھی کہ جو لوگ ڈومینین اسٹیٹس پر قانع ہوتے ہیں۔ بہ نسبت ان کے کم خطرناک ہیں جو آزادی کامل کے خواہاں ہیں۔ پیشتر اس کے کہ حکم اقتناعی کی خبر مجھے ملے جو میرے حق میں صادر ہو چکا تھا۔ میں نے بلا خواہش اور اطلاع کے ایک غزل لکھی تھی۔ اس غزل میں ایک مقطع عرض کیا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تقریر سے پہلے اس مقطع کو پڑھ دوں۔ تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ جو توقعات آپ کو مجھ سے ہیں ان کو میں پوری کر سکتا ہوں یا نہیں میں حقیقت میں آپ کی توقعات پوری کرنے نہیں آیا ہوں۔ اور غلط توقع کو تو کبھی پوری کر ہی نہیں سکتا۔ جس وقت مسٹر مانٹیگو ہندوستان آئے ہوئے تھے تو میری آزادی اور رہائی کی تحریک جاری تھی تو مسٹر مانٹیگو کا دفتر ہندوستان کے دو لاکھ تاروں سے بھر گیا تھا۔ اس وقت میں یہ غزل تحریر کر رہا تھا۔

یوں قید سے چھٹنے کی خوشی کس کو نہ ہوگی
یہ صدر نشینی ہو مبارک تمہیں جوہر

پر تیرے اسیروں کی دعا اور ہی کچھ ہے
لیکن صلہ روز جزا اور ہی کچھ ہے

میں دنیا کے آزادوں کی طرح حریت کا دعوے دار بن کر آپ کے سامنے نہیں آ رہا ہوں۔ میں عبدیت کا طوقِ غلامی گلے میں ڈال کر خدا کا بندہ محمد رسول اللہ کی خاکِ پا بلکہ اس سے بھی کم تر ذرہ بن کر آپ کے سامنے آ رہا ہوں اور آپ کو بھی اسی رشتے میں منسلک کرنے آیا ہوں چاہے وہ آپ کو پسند ہو یا نہ ہو ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

میں اگر آپ سے یہ عرض کروں کہ میں آپ سے وہ باتیں کہنے والا ہوں جو آپ کی اکثریت کی پسند ہوں یا نہ ہوں۔ میں آپ کو غلط توقع نہ دلاؤں گا۔ جب میں کانگرس میں شریک ہوا تو میں نے اس کے خوش کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ آپ اگر مجھ سے یہ توقع رکھتے ہوں کہ میں وہی کہوں، جو آپ کی اکثریت کی پسند ہو۔ تو یہ صحیح نہیں ہوگا میرا بھروسہ نہ مسلم اکثریت پر ہے۔ نہ ہندوستان کی اکثریت پر ہے۔ میں مسلم اکثریت سے خائف ہوں نہ ہندو اکثریت سے۔ میرا بھروسہ اگر کسی پر ہے تو وہ توحید ہے میں اللہ کا غلام ہوں۔ میں جو کچھ بھی عرض کروں گا اسی کی خوشنودی کے لیے ہوگا۔ خداوند کریم کی رضا جوئی کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ آپ ماریں گے، دھتکاریں گے، گالی دیں گے، لیکن آپ کی خوشنودی کے لئے خدا کی رضامندی نہیں چھوڑ سکتا۔ ابھی چند روز ہوئے

کہ میں ذاتی حیثیت سے آل پارٹیز کنونشن میں شریک ہوا اور میں نے وہ تقریر کی جو ہندوستان کے ایک طبقے کے موافق نہ تھی لیکن آپ کو معلوم ہے کہ میں کس کس طرح سے رد کیا گیا۔ میری تقریر میں کس کس طرح سے روڑے اٹکائے گئے اشم شرم کے نعرے۔ میں نہیں کہنا چاہتا کہ آپ شرم شرم کے نعرے لگائیں۔ وہ بھی ہماری ہی شرم ہے۔ کیوں کہ وہ ہمارے بھائی ہیں لیکن میں کہنا چاہتا ہوں کہ میں کلمۂ حق سنانے کے لیے گیا تھا۔ کسی کی پرواہ نہیں کی۔ جس چیز کو میں ہندوستانیوں کے لیے ہندوؤں، پارسیوں، سکھوں، مسلمانوں اور انگریزوں کے لیے بندگانِ خدا کے لیے بُرا سمجھتا ہوں تو وہ آپ کی خدمت میں عرض نہ کروں گا۔ خدا کرے کہ ہم سب کلمۂ حق پر مجتمع ہو جائیں۔ میں غلطی پر ہوں۔ تو آپ میری رہنمائی فرمائیں اور اگر آپ غلطی پر ہوں گے تو میں درست مشورہ دوں گا۔ میں ایک رسی تو آپ کے گلے میں ڈالنا پسند کروں گا۔ باوجود مکمل آزادی کے دعوے کے میں آپ کو آزاد بنانا نہیں چاہتا۔ میں آپ کو بندگی کی طرف لانا چاہتا ہوں۔ میں نے اپنی نظربندی کے زمانے میں اپنے بڑے بھائی[1] کے جواب میں غزل لکھی تھی۔ وہ شاید حکومت پرستی کی وجہ سے ہم سے چھندواڑے میں ملنے تک نہ آئے۔ میرے ان بھائی نے جو ہندوستان کے بے مثل شاعر ہیں۔ ایک مطلع میں سب کا جواب دے دیا ؎

جورِ اعدا کے گلے تیری جدائی کے گلے

اس دلِ تنگ میں ہیں ساری خدائی کے گلے

میں نے ردیف بدل کر اس قافیے میں غزل لکھی تھی جس کا مطلع یہ تھا ؎

کبھی چکھے ہی نہیں آبلہ پائی کے مزے

خضر کیا جانے بھلا رہ نمائی کے مزے

پانچ سال کی مسلسل قید کو مدِ نظر رکھ کر بیتول جیل میں لکھا تھا ؎

کثرتِ شوق سے ہے ہجر بھی ہم رنگِ وصال	ہم نے لوٹے ہیں بہت تیری جدائی کے مزے
کثرتِ شوق تھی اور لذتِ بُعدِ منزل	ہر طرف خار تھے اور رہ نمائی کے مزے
طبعِ آزاد اسیری میں بھی پابند نہ تھی	قید میں ہم نے اٹھائے ہیں رہائی کے مزے

اور جس شعر کی طرف آپ کو متوجہ کرنا چاہتا تھا جس کے سبب سے بیتول جیل مجلس مشاعرہ بنا دی گئی تھی وہ یہ ہے ؎

میری مرضی ہوئی جب سے تیری مرضی میں گم

بندگی ہی میں ملے ہم کو خدائی کے مزے

میں آپ کو اسی بندگی کی طرف لے جانا چاہتا ہوں جس میں آپ کو ساری خدائی کے مزے مل جائیں۔ علمائے کرام مجھے معاف فرمائیں گے۔ میں ان گستاخوں میں ہوں جو سب سے زیادہ گستاخی ان کی شان میں کرتا ہوں۔ لیکن نہایت ادب سے میں ان بھائیوں سے عرض کرتا ہوں جو نہ تو عمامہ باندھتے ہیں نہ ٹخنوں سے اوپر ازار پہنتے ہیں۔ یا تو وہ بڑی بڑی مونچھیں رکھتے ہیں یا اعتدال پر آتے ہیں

[1] ذوالفقار علی گوہر

تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے چھینکنے میں کچھ پڑا یا ریزہ نکل پڑتی ہو۔ اور وہ لگی رہ گئی ہو۔ شکایت کرتے ہیں کہ تم نے ہم پر علماء کو مسلط کر دیا ہے وہ یہ جماعت ہے جو تحسبھم جمیعا و قلوبھم شتیٰ کی پوری تفسیر ہے۔ یہ حضرت مجھے کہتے ہیں کہ تم نے علماء کو ہمارے پیچھے لگا دیا۔ تم انہیں مسلم لیگ میں لے جانے ہو۔ جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر لڑتے ہیں ہمارے دنیاوی اختلافات کا باعث ہمارے مذہبی اختلافات ہیں۔ علمائے کرام سن لیں جو مجھے سننا پڑتا ہے۔ لیکن میں ان بھائیوں سے کیا کہوں۔ جو نہ سر پر عمامہ رکھتے ہیں اور نہ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہنتے ہیں اور نہ چہرے پر داڑھی رکھتے ہیں۔ جس طرح یہ علماء تہجد کے وقت آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتے ہیں اور وضو کے لئے گرم پانی تلاش کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ دوسری قسم کے شب زندہ دار لوگ یا اکل و شرب میں مشغول یا کسی اور شغل رقص و سرود میں منہمک یا لہو و لعب میں محو یا تاش و شطرنج میں شب زندہ دار۔ جب علی الصبح اٹھتے ہیں تو حمام کے لئے گرم پانی تلاش کرتے ہیں اور اہتمام یہ ہوتا ہے کہ کھونٹی بھی نہ چھٹنے پائے۔ شاید علمائے کرام اتنی سختی نہ کرتے جس قدر یہ کرتے ہیں کہ ٹائی کی گرہ آپ نہ ہو یا اگر سوٹ کا رنگ ایسا ہو تو ٹائی کا رنگ کیسا ہو۔ رومال کس قدر جیب سے نکلا ہوا ہو۔ تھوڑا نکلا ہو یا زیادہ۔ یا نیم دروں یا نیم بروں میں ان حضرات سے دریافت کرتا ہوں کہ علمائے تعصب سے کام لیا ہے۔ لیکن ہندوستانیوں کو ان کے اختلافات نے برباد کر دیا ہے یا تمہارے اختلافات نے۔ تم ہندوستان کو متحد کرنا چاہتے ہو اور اتحاد کے لئے اس پر راضی ہو کہ سر علی امام اور مالویہ ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہوں جس پر تین تین صلیبی نشان بنے ہوئے ہوں۔ ہم ہرگز نہیں کی آواز ہیں لیکن نہرو رپورٹ کے منوانے کے جو طریقے آج اختیار کئے جا رہے ہیں، وہ ہرگز صحیح نہیں ہیں۔ پہلی بسم اللہ ہی غلط ہے۔ طوق غلامی کو گردن میں ڈالنا قبول کر لیا گیا ہے کہ سر علی امام اور سر تیج بہادر سپرو مسٹر چنتامنی و دیگر امراء ایک متحد و متفق ہو جائیں گے۔ لیکن میں نہیں دکھاتا ہوں کہ ہندوستان میں اتنی نا اتفاقی کبھی نہیں پھیلی تھی جتنی کہ آج نہرو رپورٹ کے منوانے میں پھیلی ہے۔ میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ پہلے اجلاس میں سب سے بہتر تقریر پنڈت موتی لال نہرو کی تھی۔ جس میں انہوں نے کہہ دیا تھا۔ کہ یہ کتاب الہامی نہیں۔ صحف سماوی میں سے کوئی صحیفہ نہیں کہ آپ اس کے ایک ایک حرف سے متفق ہوں۔ ہم سے جو کچھ ہو سکا ہے بہتر ہے بہتر سمجھ کر آپ کے سامنے رکھ دیا ہے۔ ہمارا کام نہیں ہے کہ فیصلہ کریں یا آپ کو مجبور کریں۔ یہ آپ کے ہاتھ میں ہے جو آپ کریں گے وہ ہم قبول کریں گے۔ ایک ایسی کمیٹی کے لئے حقیقتاً یہی طریقہ بہتر تھا۔ لیکن جناب ہم کو قرآن کریم نے سمجھا دیا ہے کہ ایک مرض ایسا ہے جس میں علماء اور امی دونوں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ یعنی اقرار باللسان اور ہے اور اقرار بالقلب اور ہے۔

علماء کو ریاکار بتایا جاتا ہے کہ "چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند" میں سیاست دانوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا نہرو رپورٹ کے ارکان جوڑ توڑ نہیں کر رہے ہیں۔ کبھی مفاہمت کے نام سے اور کبھی مسلمانوں کی اکثریت کے نام سے کبھی پنجاب کے نام سے اور کبھی یہ کہہ کر کہ اکثریت کے لیے یہ بھی مناسب ہے۔ کمیٹیوں کو بنانے کے لیے کبھی مُردوں کو کفن سے لا کر ارکان بناتے ہیں۔ بلکہ ان کا بس چلتا تو گنگا جی سے راکھ لا کر گنتے کہ ایک جسد بے روح یہ بھی ہے۔ مختلف کمیٹیاں بنتی ہیں اور مسلمانوں کو مرعوب کیا جا رہا ہے بلکہ ہندوستان کی سب سے بڑی جماعت کانگرس کو بھی فریب دیا جائے گا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کی کارروائی باطل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ دیکھیں پنڈت موتی لال جیتتے ہیں،

یا پنڈت جواہر لال بازی آذر کے ہاتھ میں رہتی ہے یا ابراہیمؑ کے ہاتھ۔ بُت پرست جیتا ہے یا بُت شکن
مجھے اندیشہ ہے کہ جس طرح یہی چنتامنی، یہی راجہ محمود آباد اور یہی رنگا سوامی آئر نے پنڈت موتی لال نہرو کو جیل میں بھیجا تھا۔ محمد علی کے اخبار سے وہ ضمانت لی تھی جو کسی چور سے بھی طلب نہیں کی جا سکتی۔ محمد علی کا پریس بند کیا گیا۔ محمد علی اور اس کے بھائی نظر بند کئے گئے ان کو جیل میں ڈالا گیا اور ان کو قیدیوں کی ٹوپی پہنا کر کام لیا گیا۔ یہ تمام کام کس نے کیا تھا؟ کیا حکومت نے؟ انہی لوگوں نے جو آج درجہ نو آبادیات پر قانع ہیں۔ حکومت نے انہی مہاراجہ صاحب محمود آباد کے ذریعے موتی لال کو قید کر لیا تھا۔ انہی سر علی امام کی حکومت نے ہمارا اخبار بند کیا اور ہم نظر بند ہوئے۔ تجربے کے متعلق ایک انگریز کا قول ہے کہ تجربہ ان اسلحہ جات سے بنا ہوا ایک جنگی نشان ہے۔ جنہوں نے ہمیں زخمی کیا ہے۔ آج موتی لال نہرو وہی جامہ پہن رہے ہیں جو کل مہاراجہ محمود آباد صاحب اور سر تیج بہادر سپرو نے پہنا تھا۔ کل تم جواہر لال نہرو کو پھانسی کے تختے پر دیکھو تو سمجھ لو کہ اس کا قاتل اس کا باپ موتی لال نہرو ہے جو اہر لال جب آزادی مانگنے جائے گا تو حکومت کا دفتری اقتدار کہے گا، تم جو آزادی مانگتے ہو وہ بغاوت ہے۔ اور بغاوت کی سزا پھانسی کا تختہ ہے جس طرح راجہ صاحب محمود آباد نے میرے بھائی شیروانی کو قید کرنے کا سنگشن (منظوری) دیا تھا۔ اگر جواہر لال بھی پھانسی پر لٹکایا جائے گا تو موتی لال کا نام اس کے قاتل کی حیثیت سے لیا جائے گا۔ اس وقت یہ کہا جائے گا کہ یہ باغی ہیں، نوجوان ہیں، باپ سے بھی بڑا بننا چاہتے ہیں۔ موتی لال کو سیاست جواہر لال نے سکھلائی میں پہلا شخص ہوں جس نے جواہر لال کو سیکرٹری بنایا مگر شاید اب تو چنتامنی سیکرٹری ہیں۔ آج درجہ نو آبادیات مہاتما گاندھی جی نے بھی قبول کر لیا ہے اور ڈاکٹر انصاری نے بھی۔

جب مسٹر سین گپتا ایک تقریر کر رہے تھے، میں نے ایک جملہ کہا تو موتی لال صاحب بگڑ گئے اور صدر جلسہ ڈاکٹر انصاری ان کے آلہ کار ہیں۔ کٹھ پتلی ہیں جن کو وہ نچاتے ہیں میں نے کہا کہ آج آپ صدر ہیں۔ لیکن میں نے بھی پالٹیکس سیکھی ہے کوئی پارلیمنٹ ایسی نہیں جس میں دو ایک جملے انٹرپٹ کے نہ کہے جاتے ہوں۔ لیکن جب میں خود تقریر کرنے کھڑا ہوا تو مجھے بار بار روکا جاتا تھا۔ اور موتی لال کی زبان سے ایک لفظ نہ نکلا اور اس وقت ڈاکٹر انصاری کو کسی نے مشورہ نہیں دیا کہ مداخلت کرنے والوں کو روک دیا جائے۔

بھائیو! میں ان کی خدمت میں عرض کر رہا تھا کہ یہ غلامی کا طوق جسے این سین گپتا نے بنایا ہے کہ اس سے رنجشیں دور ہوں گی لیکن جو کچھ ہو رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے حکومت جب جواہر لال کو پھانسی پر لٹکائے گی۔ تو ان کے قاتل موتی لال ہوں گے جس طرح موتی لال کو قید کروانے والے مسٹر چنتامنی، مہاراجہ محمود آباد اور سر سپرو تھے۔ کسی کو شبہ ہے کہ گاندھی کو کس نے قید کرایا، ہندوؤں کو ہندوؤں نے، مسلمانوں کو مسلمانوں نے۔ اس وقت سوراج مانگا تھا۔ انڈی پنڈینٹ کا لفظ زبان سے نکالا تھا۔ تو گاندھی کو چھ برس کے لیے قید کیا گیا تھا تو کیا جواہر لال کو آزادی طلب کرنے میں پھانسی پر نہ لٹکایا جائے گا۔ مسٹر بپن چندر گپتا برطانوی تعلق کی کڑی نہیں توڑنا چاہتے اور کہتے ہیں یہی آزادی کامل ہے۔ اس کا جواب ایک ہے کہ جب ڈارون نے کہا کہ انسان بندر کی اولاد ہے۔ سب ثبوت مل گئے مگر دم دار انسان نہیں ملا۔ جو ثابت کر سکتے کہ یہ بندر ابھی تک اپنی دم تک نہیں چھوڑنے پایا ہے۔ اسے سائنس میں (MISSING LINK) کہتے ہیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ اس دُم کو بپن چندر پال نہیں ہلانے پائیں گے

بلکہ وائسرائے توڑتا مروڑتا رہے گا۔ برادرانِ ملت! آج آپ کو آپ کے ذریعے سے سارے ہندوستان کو بلکہ ساری دنیا کو میں ایسی بدیہی بات بتانا چاہتا ہوں جو میرا خیال تھا کہ دنیا تیرہ سو برس سے جان چکی تھی۔

مگر افسوس! باوجودیکہ ایک ذات گرامی جس کے نام نامی پر میرا نام رکھا گیا ہے۔ تیرہ سو برس پہلے ساری دنیا کو بتا چکی تھی مگر افسوس اس نام نامی پر ایک نام رکھنے والے محمد عالم صاحب کو اور افسوس اسی کے نواسے سر علی امام کی وہ بات سمجھ میں نہیں آئی کونسل اور میرزبوم وہی لفظ ہے جس کو بھومی اور جاتی کہتے ہیں۔ یہ دو چیزیں جانوروں کی پہچان کی ہیں۔ انسان کی پہچان کے لئے نہیں انگورہ کی بلی، رام پور کا ہاونڈ، جمنا پاری بھینس۔ اسلام نے تیرہ سو برس ہوئے کہ رسول اللہ کی معرفت تمام دنیا کو بتا دیا تھا کہ دنیا کے دو ٹکڑے ہیں۔ ایک وہ جو دنیا کو اس طرح برتنا چاہتا ہے۔ جس طرح بنانے والے نے برتانا چاہا۔ جو اپنی مرضی کو دخل نہیں دیتا۔ بنانے والے کی مرضی پر چلتا ہے اور دوسری جماعت بنانے والے کی مرضی پر نہیں چلتی، اپنی مرضی پر چلتی ہے اور حقیقت کا انکار کرتی ہے اور ہر بات میں اللہ کو جھٹلاتی ہے۔ اور کفر کی مرتکب ہوتی ہے دنیا کے دو ٹکڑے ہیں ایک اسلام اور دوسرا کفر۔ رسول اللہ نے فرمایا ہے کہ کُلُّ مُؤمِنٍ اِخْوَۃٌ۔ میں مہاتما گاندھی سے کیوں کہوں یا مالوی جی کو کیوں سمجھاؤں کہ کفر ایک ملت ہے اور اسلام ایک ملت ہے اور وہ کیوں کہتے ہیں کہ دنیا کی تقسیم یوں کی گئی ہے۔ کہ انگلش، جرمن، فرینچ، برہمن اور شودر۔ آپ سے ابھی عرض کر رہا تھا کہ یہ تخصیص کہ فلاں ترک ہے، فلاں افغانی ہے، فلاں ہندوستانی ہے، نیز ہندی کو کیا واسطہ ایرانی سے، ایرانی کو افغانی سے، عجمی کو عرب سے، فرینچ کو انگلش سے اور انگلش کو رشین سے کیا واسطہ، یہ وہ غلط اصول ہے جو زندگی کو نہ ماننے سے پیدا ہوتا ہے۔ انبیائے کرام نے اس کو دور کرنا چاہا۔ شکایت مالوی جی سے نہیں کہ وہ نہیں سمجھتے کہ یہ تقسیم تمہاری ترکی و افغانی کی اعرب و عجم کی اسلامی تفریق نہیں، بلکہ صحیح تفریق کفر اور اسلام کی ہے۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ اس کو رسول اللہ کے نواسے سر علی امام بھی نہیں سمجھتے اور آل پارٹیز کنونشن میں کہتے ہیں کہ مجھ کو جمعیت العلماء اور خلافت کمیٹی کی آزادی پسندی پر بھروسہ نہیں کہ یہ ہندوستان کی آزادی چاہتے ہیں۔ یہ تو چاہیں گے۔ کہ انگریزوں کے نکل جانے کے بعد افغان بادشاہ راج کرے۔ اور سنا ہے کہ مالوی جی نے ان کی پیٹھ ٹھونکی تھی۔

کاروانِ آزادی کا کوچ

کانگرس کی طرف سے مسلمانوں کے غیر مشروط اور شریفانہ تعاون کا صلہ کیا دیا گیا؟

نہرو رپورٹ!

یہ ہندوستان کا وہ آئین تھا، جسے کانگرس کی سرپرستی میں پنڈت موتی لال نہرو نے اپنے رفقاء کار کے اشتراک وتعاون سے تیار کیا تھا، اس وقت کے وزیر ہند برکن ہیڈ نے ایک چیلنج دیا تھا کہ ہندوستانیوں میں اتنی پھوٹ ہے کہ وہ اپنا ایک متحدہ اور متفقہ دستور بھی نہیں بنا سکتے، کانگرس نے یہ چیلنج قبول کر لیا، اور دستور سازی کا کام شروع کر دیا۔

پنڈت موتی لال نہرو، بہت بڑے ماہر آئین وقانون تھے، انہی کی صدارت میں دستور ساز مجلس مرتب کی گئی، مجلس خلافت کی طرف سے مسٹر شعیب قریشی اس کے رکن تھے۔

اب تک مسلمان غیر مشروط تعاون کر رہے تھے، اب تک وہ بغیر کسی مزد اور صلہ کے جہاد حریت میں شرکت کر رہے تھے، اب تک بغیر کسی مطالبہ کے ہندوستان کو برطانوی سامراج کے پنجہ سے چھڑانا چاہتے تھے، وہ پوری نیک نیتی کے ساتھ یہ سمجھ رہے تھے کہ مقدم کام یہ ہے کہ ہندوستان آزاد ہو، پھر باہمی مسائل طے ہوتے رہیں گے، حصوں کی تعیین، اور تقسیم ہوتی رہے گی، گھریلو مسائل کا تصفیہ ہوتا رہے گا۔

لیکن اب ہندوستان کا دستور حکومت بن رہا تھا، برطانوی وزارت کی منظوری اور ہندوستان میں نفاذ کے لئے ایک دستور تیار ہو رہا تھا، جس میں بتایا گیا تھا، کہ اکثریت کی حیثیت کیا ہوگی، اور اقلیت کی پوزیشن کیا ہوگی؟ اب ناممکن تھا کہ مسلمان خاموش رہتے، کوئی وجہ نہیں تھی کہ وہ سکوت سے کام لیتے جب تک حق اور حصہ کا سوال نہیں اٹھا تھا وہ چپ تھے لیکن جب حق کی تعیین ہونے لگی اور حصہ تقسیم ہونے لگا تو وہ کیوں خاموش رہتے؟ آج اگر خاموش رہتے تو کل انہیں بولنے کا حق کیوں ملتا؟

نہرو رپورٹ کے واضعین نے اگر بطور خود مسلمانوں کے حقوق اور مطالبات تسلیم کر لئے ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن ایسا نہیں ہوا، شعیب قریشی کے پیہم اور مسلسل اصرار کے باوجود نہیں ہوا، آخر وہ الگ ہو گئے، موتی لال نے خلیق الزمان وغیرہ سے کام چلا لیا، اور نہرو رپورٹ کو ہندوستان کا متفقہ دستور بنا کر پیش کر دیا۔

سب سے پہلے اس روش کے خلاف شوکت علی نے صدائے اختلاف بلند کی، پھر محمد علی کا نعرہ گونجا، ان دونوں بھائیوں

کی قیادت میں مسلمانوں نے نہرو رپورٹ کے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مسٹر جناح شروع میں خاموش تھے، بعد میں وہ بھی نہرو رپورٹ کے مخالفین کی صف میں شامل ہو گئے۔

علی برادران نے مجلس خلافت کی طرف سے نہرو رپورٹ میں ضروری ترمیمیں پیش کیں، وہ مسترد کر دی گئیں، مرحوم راجہ صاحب محمود آباد مسٹر محمد علی جناح، مسٹر (اب جسٹس) چھاگلا نے بڑی امید و آرزو کے ساتھ چند ترمیمیں خلافت کی ترمیموں سے بھی زیادہ نرم اور معتدل "نیشنل کنونشن" میں پیش کیں، وہ بھی نامنظور کر دی گئیں، اب مسلمانوں نے من حیث القوم نہرو رپورٹ کی مخالفت شروع کر دی۔

نہرو رپورٹ کا صلہ موتی لال کو یہ ملا کہ وہ کانگرس کے صدر بنا دیے گئے۔ گاندھی جی ان کے نقیب بن گئے، انہوں نے حکومت کو ایک سال کی مہلت دی کہ اگر اس اثنا میں نہرو رپورٹ ہندوستان میں نافذ کر دی گئی تو نہیں تو ہم درجۂ مستعمرات (جو نہرو رپورٹ کا نصب العین تھا) کے خیال سے دست بردار ہو کر منزل آزادی کامل کی طرف کوچ کریں گے، یہ واقعہ دسمبر ۱۹۲۸ء کا ہے۔

ایک سال کی مدت گزر گئی کانگرس کی صدارت باپ سے بیٹے کو ملی، جواہر لال نہرو نے صدر کانگرس کی حیثیت سے لاہور (دسمبر ۲۹ء) میں آزادی کامل کا پرچم لہرایا، نہرو رپورٹ زائد المیعاد قرار دی گئی، اور اعلان کر دیا گیا کہ اب ہم آزادی کامل حاصل کر کے رہیں گے۔

علی برادران نے مجلس خلافت کی طرف سے گاندھی جی سے کہا کہ وہ مسلمانوں کے مطالبات منظور فرما لیں، تاکہ اس جنگ حریت میں مسلمان ان کا ساتھ خلوص قلب سے دیں، لیکن انہوں نے کہا پہلے آزادی پھر بات چیت، مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ غیر مشروط طور پر اس جنگ میں ہمارا ساتھ دیں، اگر انہوں نے ہمارا ساتھ نہ دیا تو وہ نقصان میں رہیں گے، کیونکہ آزادی ہم تنہا حاصل کر لیں گے، ہمارا کوچ مسلمانوں کے اشتراک و تعاون کے بغیر بھی جاری رہے گا۔

لیجئے صاحب، وہ گھڑی بھی آ گئی، گاندھی جی نے وائسرائے سے اتمام حجت کر لیا وہ نہ پسیجے، اور "نمکین" سول نافرمانی شروع ہو گئی، لوگ خلاف قانون نمک بناتے تھے، اور گرفتار ہوتے تھے۔

ایثار و قربانی کا جب سوال ہوا، مسلمان کسی سے پیچھے نہیں رہتے، وہ سب سے آگے بڑھ جاتے ہیں، یہ جنگ شروع ہوئی تو ان کا دل بھی شرکت کے لئے مچلنے لگا، لیکن اس وقت کی مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ جماعت مجلس خلافت، اور اس وقت کے مسلمانوں کے قائد اعظم محمد علی اور شوکت علی کے حکم کی تعمیل میں انہوں نے اپنا جذبہ دبایا، اور شرکت سے باز رہے۔

"ترک تعلق کا اعلان" کے عنوان سے اگلے صفحات میں آپ جو زبردست اور معرکہ آرا مضمون ملاحظہ فرمائیں گے، وہ خلافت کمیٹی کی مجلس عاملہ کی طرف سے (جس کے صدر نواب اسمٰعیل خاں تھے) شائع ہوا تھا، یہ بیان مجلس خلافت کی پالیسی کا آئینہ ہے، یہ تمام تر محمد علی کا لکھا ہوا ہے۔ میں نے اس کا ترجمہ کیا ہے جو درج ذیل ہے

رئیس احمد جعفری

ترکِ تعلق کا اعلان

"مجلس عاملہ ضروری سمجھتی ہے کہ مہاتما گاندھی کی سول نافرمانی شروع کر دینے کے ارادہ سے ملک میں جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے، اُس پر کافی غور و فکر کر لینے کے بعد اپنے خیالات مسلمانانِ ہند کے سامنے پیش کر دے، مجلس کو یقین ہے کہ مسلمانانِ ہند مجلس عاملہ کی اس رسمی نمادقہ کو جو ہندوستان کی کامل آزادی، اور آزاد ہندوستان کے نظم و نسق میں مسلمانوں کو معقول و مؤثر حصہ ملنے کے سلسلہ میں کی گئی ہے: ذہن میں محفوظ رکھ کر اس تجویز پر غور کریں گے۔

خلافت اور ترکِ موالات کی تحریک کا آغاز

تمہیں یہ حقیقت ایک بار اور واضح کر دینی چاہیئے کہ تحریک ترک موالات کی محرک، جو مقتضیین تحریک خلافت کے دماغوں کی پیداوار ہے، اور جسے انہوں نے دس سال ہوئے مہاتما گاندھی کو ساتھ لے کر پورے ملک میں جاری کیا تھا؛ دراصل برطانیہ کی وہ وعدہ خلافیاں ہیں جو اس نے مسئلہ خلافت اور مظالم پنجاب کی تلافی کے سلسلہ میں کی تھیں، تحریک ترک موالات کے رہنماؤں کو بہت جلد محسوس ہو گیا کہ باشندگان ہند کی شکایات کا ازالہ صرف "سوراج" لینے سے ہی ہو سکتا ہے، کو تحریک خلافت کا مقصد ابتدا میں خلافت عثمانیہ کا تحفظ اور جزیرۃ العرب پر مسلمانوں کا قبضہ تھا، لیکن کارکنان خلافت نے فوراً بعد ہی اپنے مقاصد میں "حصول سوراج" بھی داخل کر لیا، جو مذکورہ دو مقاصد کے حصول کا ذریعہ بھی تھا، اور بجائے خود ایک مقصد عظیم بھی، دنیا گواہ ہے کہ تحریک ترک موالات کے علمبردار اور روح رواں کارکنان خلافت ہی تھے، اور اقلیت میں ہونے کے باوجود "تارک موالات" کی حیثیت سے جانی قربانیاں دینے والوں اور جیل جانے والوں میں، مسلمانوں کی تعداد بہت زیادہ غالب رہی۔

کانگرس کا اصولی تضاد

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ کانگرس تجویز ترک تعاون، جو آخر میں سب سول نافرمانی اور بندش محاصل پر منتج ہوئی، منظور کرنے میں بہت زیادہ پس و پیش کرتی رہی، لیکن کارکنان خلافت نے ایک لمحہ کے لئے بھی تامل نہیں کیا، اور خدا کا نام لے کر ترک موالات کے بحر طوفاں خیز میں کود پڑے، یہی نہیں، کانگرس نے ترک تعاون کی تجویز منظور کر لینے کے بعد، اُسے جلد ہی ترک بھی کر دیا، لیکن کارکنان خلافت نے اسے کبھی ترک نہیں کیا، اور گو انہوں نے مجالس قانون ساز کی ممبری چاہنے والوں کو جبراً نہیں روکا، پھر بھی یہ پابندی لگا دی کہ کوئی امیدوار خلافت کے نام پر انتخابات نہ لڑے، لیکن کانگرس نے تو اپنے امیدواروں کو باقاعدہ کانگرس کا "ٹکٹ" دے دیا۔

۱۹۲۷ء میں جمیعت خلافت اور کانگرس دونوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو حکومت خود اختیاری یا اقوام عالم میں ایک مساوی درجہ نہیں دینا چاہتی، اپنا اپنا نصب العین "کامل آزادی" قرار دیا، ان دونوں انجمنوں نے اپنا سابقہ "کریڈ" (منتہائے نظر) اس وجہ سے تبدیل نہیں کیا، کہ جو ہندوستانی، برطانیہ سے قطع تعلق کر لینا مناسب نہیں سمجھتے، وہ بھی کانگرس یا جمیعت خلافت میں شامل رہ سکیں، یاد رہے، کہ مہاتما گاندھی "کامل آزادی" کے حق میں نہیں تھے، وہ تو ہندوستان کے لئے "آزادی کامل" کا نصب العین بھی مناسب نہیں سمجھتے تھے، مدراس کانگرس کے بعد وہ جو کچھ اپنے اخبار میں لکھ رہے ہیں، اُس سے اُن کی رائے کا تضاد سمجھ میں آسکتا ہے۔

آزادی کے بجائے نوآبادی؟

ایک سال بعد یعنی ۱۹۲۸ء میں مہاتما گاندھی کے پیہم اصرار پر کانگرس نے "تجویز مدراس" سے روگردانی کر کے وہ دستور قبول کر لیا، جو نہرو کمیٹی نے مرتب کیا تھا، جس کی پہلی ہی دفعہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ پوری عمارت کی بنیاد "درجۂ مستعمرات" قرار دے دی گئی ہے، لیکن جمیعت خلافت نے اس رپورٹ کو یکسر نامنظور کر دیا، مرکزی خلافت کمیٹی کو، چند ماہ قبل، لکھنؤ کے اجلاس میں، یہ امید دلا کر نہرو کمیٹی کی تائید میں کر لیا گیا کہ آل پارٹیز کانفرنس میں ہندو مسلم تعلقات استوار ہو جائیں گے اور اسی مطلب کی ترمیمات اُس دستور میں داخل کر دی جائیں گی، لیکن جب کلکتہ کانفرنس میں تجویز آزادی کو پیش نظر رکھ کر نہرو رپورٹ میں ترمیم اور رد و بدل کی کوشش کی گئی اور جب تمام کوششیں ناکام ثابت ہوئیں تب جمیعت خلافت نے "مکمل آزادی" اپنا نصب العین معین کرتے ہوئے آزاد اور خود مختار ہندوستان میں مسلمانوں کو کافی اور مؤثر حصہ ملنے اور انہی امور سے متعلق مطالبات پر مشتمل تجویز منظور کر لینے کے بعد نہرو رپورٹ کو ناقابل قبول قرار دے دیا۔

خلافت کانفرنس ختم ہونے کے بعد ہی دہلی میں ایک آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقد کی گئی، جس طرح کلکتہ میں (کانگرس کی سرپرستی میں) ایک کنونشن منعقد کیا گیا تھا، اسی طرح دہلی میں مسلمانان ہند کی تمام سیاسی پارٹیوں کی ایک کانفرنس منعقد کی گئی لیکن اس کانفرنس میں اس امر کا بھی خیال رکھا گیا کہ جو پارٹیاں شریک ہو رہی ہیں، ان کو کسی ایسے عمل پر مجبور نہ کیا جائے جو اُن کے اپنے معینہ "مقاصد" سے ٹکراتا ہو، کلکتہ کنونشن کا بھی فرض تھا کہ اسی اصول پر کاربند رہتا لیکن اس نے اس کے بالکل برعکس طرز عمل اختیار کیا، اس کنونشن میں جو کانگرسی نمائندے شریک تھے، انہوں نے تو دوسری سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کی خاطر اپنا نصب العین ہی تبدیل کر دیا، اور "آزادی کامل" کے بجائے درجۂ مستعمرات پر ہی راضی ہو گئے، لیکن دہلی کانفرنس میں جو خلافتی نمائندے شریک تھے، وہ جمیعت خلافت کے معینہ نصب العین میں کسی قسم کی تبدیلی پر راضی نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے مطالبات کو دوسری سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کی امداد سے ایسے اسلوب اور الفاظ میں وضع کیا جسے بنیاد قرار دے کر "آزاد ہند" کے لئے بھی ایک دستور مرتب کیا جا سکتا تھا، اور "مستعمراتی ہند" کے لئے بھی، اس کانفرنس نے واضح الفاظ میں اعلان کر دیا، "کوئی دستور اساسی، خواہ وہ کسی کا وضع کردہ ہو یا کسی کے دماغ کی پیداوار ہو، مسلمانان ہند کے لئے اس وقت تک قابل قبول نہ ہوگا، جب تک وہ کانفرنس کے منظور کردہ اصولوں کے مطابق نہ ہو۔

ان کو بھی چھوڑ دیا

کانگریس کا اصولی "تضاد" اور جمعیت خلافت کی اصولی "یکسانیت" کا قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا، کانگریس نے کلکتہ میں ان لوگوں کو چھوڑ دیا جنہوں نے مدراس کے اجلاس میں تجویز آزادی منظور کی تھی، اور لاہور کے اجلاس میں ان کو چھوڑ دیا جنہوں نے کلکتہ میں درجۂ مستعمرات پر قناعت کر لی تھی، اس کے برعکس جمعیت خلافت آج بھی وہیں قائم ہے جہاں پہلے تھی، اس نے مدراس میں جو نصب العین منظور کیا تھا اس میں کلکتہ کے اجلاس میں کوئی کمی نہیں ہونے دی، اور جو فیصلہ کلکتہ میں کیا تھا اس میں لاہور کے اجلاس میں کوئی تغیر و تبدل نہیں کیا، اس نے مدراس میں جو "آزادی کامل" کی تجویز منظور کی تھی اُسے کلکتہ میں درجۂ مستعمرات سے تبدیل نہیں کیا، اور نہ لاہور میں اُن لوگوں کو چھوڑ دیا، جو درجۂ مستعمرات سے آگے جانا نہیں چاہتے تھے، جمعیت خلافت ہر شخص کو اپنے ساتھ شامل کر لیتی ہے. خواہ وہ اس کے منتہائے مقصود سے متفق ہو یا اس کا عقیدہ اپنے عقیدہ سے کمتر درجہ کا سمجھتی ہو، جمعیت خلافت اپنی رفتار میں سستی کر سکتی ہے، لیکن جب ایک مرتبہ اس کا قدم آگے بڑھ جاتا ہے تو وہ پیچھے نہیں ہٹاتی؛ وہ اُس درجہ میں "موم" نہیں بنی ہے، جیسا مہاتما گاندھی نے کانگریس کو بنا رکھا ہے، جمعیت خلافت اپنے مقاصد و نظریات کو پورے عزم اور تیز گامی کے ساتھ آگے بڑھاتی ہے، اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں سے گفتگوئے مصالحت کرنے کے لئے اپنا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتی ہے۔

کانگریس کا "تضاد عمل" ابھی اور بھی باقی ہے! وہ یکے بعد دیگرے ایسے عمل کرتی رہتی ہے جن میں تضاد و تخالف پایا جاتا ہے، ان تمام اعمال میں سب سے زیادہ "رجعت پسندانہ اقدام" وہ ہے جو مہاتما گاندھی اب اختیار کر رہے ہیں، انہوں نے تحریک ترک موالات کے ابتدائی دور میں بار بار کہا تھا، کہ "سوراج" کا اصل مفہوم "حکومت خود اختیاری" ہے، نہ اس سے کم، نہ اس سے زیادہ، سوراج کسی خاص دستور اساسی کا نام نہیں ہے، بلکہ اس اختیار و قوت کا نام ہے جسے حاصل کر کے جب ہم پسند کریں، اور جس طرح کا پسند کریں دستور اساسی مرتب کر لیں۔

اکثریت کی حکومت

کارکنان خلافت اس بات پر راضی ہو گئے تھے، کہ پہلے سوراج حاصل کر لیا جائے اور حصول سوراج کے بعد قوم پر چھوڑ دیا جائے کہ سب کی پسند کے مطابق کوئی دستور تیار کرے، یہ بالکل قدرتی بات تھی کہ اس زمانہ میں جب کہ نمائندہ اور جمہوری طرز حکومت کا دور ہے، ہندوستان میں بھی نمائندہ حکومت ہی قائم ہوتی اور تاریخ ہند میں پہلی مرتبہ اکثریت کی حکومت قائم ہوگی، اور مسلمان چونکہ اقلیت میں ہیں، اس لئے ان کو تحفظات کی ضرورت ہوگی، تاکہ وہ اپنے حقوق و مفاد کی حفاظت کر سکیں، پھر بھی کارکنان خلافت نے اعتماد کر لیا کہ جنگ آزادی میں فرقہ پروری خود بخود اپنی "واصل باقی" وصول کر لے گی، اس خیال کے ماتحت انہوں نے مسلم اقلیت کے لئے "تحفظات" کا مطالبہ کئے بغیر جنگ آزادی میں اپنی شرکت جاری رکھی، لیکن دوسرے مسلمان تو اس "اعتماد"، پر قناعت نہیں کر رہے تھے، ان کا خیال یہ تھا کہ ابھی سے بتا دیا جائے کہ جنگ آزادی فتح کر لینے کے بعد مسلمانوں کو کیا ملے گا؟

ہندوستان کے باشندے "تخیلات" پر اعتماد کرنے کے اس قدر عادی ہو گئے ہیں کہ بات بات پر "دستور سازی"

کا مطالبہ پیش کرتے رہتے ہیں، گویا ان کی رائے میں "مجالس مباحثہ" سے دستور مرتب ہوا کرتا ہے، اور جس چیز کی ان کو سب سے زیادہ ضرورت ہوا کرتی ہے، وہ "دو ٹوک اکثریت" ہے۔ وہ ایک عرصہ ہوا "تاریخ بنانے" کی اہلیت سے محروم ہو چکے ہیں اور اب تو تاریخ بنانے کا خیال بھی ان کے دماغ میں نہیں پیدا ہوتا، ان کی سمجھ میں یہ بات آتی ہی نہیں کہ دوسری اقوام کس طرح ہزاروں قیمتی جانوں کی قربانیاں دے کر دستور اساسی میں ایک معمولی سی دفعہ کے اضافہ یا اشتراک کا حق حاصل کیا کرتی ہیں! وہ بھول گئے کہ انہیں کس قسم کے دشمن سے سابقہ پڑا ہے، وہ اپنے دشمنوں سے بہ استثنائے خوشامد تملق، اور اپنی ضد، عناد پردازی بلکہ عناد اور کینہ توزی کے سوا تو کچھ نہیں سمجھتے ہیں کہ اکثر اوقات وہ دوستوں کو اپنا دشمن بنا لیتے ہیں، انہی افسوسناک حقائق کی بنا پر منتظمین تحریک خلافت و دستور سازی کا خیال ترک کر کے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے کہ پہلے ہندوستان کی داخلی طاقتوں کو نشوونما دی جائے تاکہ وقت آنے پر ملک اپنی قوت منوا سکے اور دنیا سے بھی تسلیم کرا سکے، اور پھر بعد ملک ہندوستان کے تمام افراد، تمام جماعتوں اور تمام فرقوں کی عام منظوری سے آزاد اور خود مختار ہندوستان کا دستور تیار کیا جائے۔

لیکن مہاتما گاندھی نے ایک عجیب بات یہ کی کہ اب سے دو سال قبل جبکہ وہ کانگریس کے صدر تھے، اپنے خطبۂ صدارت میں بمبئی ۱۹۲۵ء میں ایک عرصہ تک غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں اور پبلک کا ہم خیال ہوں کہ ہمیں مکمل تفصیلی طور پر جاننا چاہئے کہ وہ کس چیز کے حصول کی خاطر جنگ کر رہی ہے، پبلک کو لازمی طور پر "سوراجیہ" کی مکمل تعریف جاننا چاہیئے یعنی وہ اسکیم جسے سارا ہندوستان پسند کرتا ہے اور جس کے لئے اسے جنگ کرنی ہوگی۔"

مہاتما گاندھی نے آل انڈیا کمیٹی کے تقرر پر اظہار مسرت کیا تھا جسے پہلی آل پارٹیز کانفرنس نے ۱۹۲۴ء میں اسی مقدس کام کے لئے مقرر کیا تھا، اور امید ظاہر کی تھی کہ یہ کمیٹی ایک ایسی اسکیم تیار کرنے کے قابل ہو جائے گی جو تمام پارٹیوں کے لئے قابل قبول ہو"

لیکن سوء اتفاق کہا جائے یا کچھ اور کہ مہاتما گاندھی کی یہ امید بر نہیں آئی اور مذکورہ کمیٹی نے اس قسم کا کوئی کام انجام نہیں دیا جس کا اجلاس مہاتما جی کی صدارت میں دہلی میں چند دن تک ہوا مگر صرف بحث و مباحثہ ہی ہوا کیا، اس بحث کا نتیجہ کیا افسوسناک کہا جائے گا، مگر اس شکل میں نمودار ہوا کہ ہندو مسلم کشیدگی اور بڑھ گئی، بلکہ گاندھی جی کے ۲۱ روزہ فاقہ کے بعد جو چند مہینے پہلے کیا گیا تھا اور جس کا مقصد نیم مذہبی تنازعات کا خاطر خواہ فیصلہ بتایا گیا تھا، اس کے دوران میں اتحاد کانفرنس نے دہلی میں جو کچھ طے کیا تھا، اس جدید کمیٹی نے ان فیصلوں پر بھی سیاہی پھیر دی!

فرقہ وارانہ فسادات اور گاندھی جی کی خاموشی

مہاتما گاندھی کی ذات کے متعلق اتنا کہنا کافی ہوگا کہ انہوں نے اپنی صدارت کے زمانہ میں ہی نہیں مگر ملک کی فرقہ وارانہ فساد درست نہیں کی، بلکہ خود اپنی قوم کے ان افراد پر لعنت ملامت کرنے سے بھی قاصر رہے، جو فرقہ وارانہ فسادات کے ذمہ دار تھے، ان کے برعکس کارکنان خلافت نے اپنی قوم یعنی مسلمانوں کو سمجھانے بجھانے بلکہ زجر و توبیخ کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اس معاملہ میں بھی جمعیۃ خلافت اور کانگریس کے اعمال و کردار کس قدر ایک دوسرے سے مختلف رہا! جمعیت خلافت نے تو اپنے

صدر ڈاکٹر کچلو کو اس قصور پر صدارت سے علیحدہ کر دیا کہ وہ مہاسبھائی نقالی کے مرتکب ہوئے تھے، لیکن کانگریس کے صدر مہاتما گاندھی اپنے ہم قوموں کی بیہودگیوں پر اس طرح چپ سادھ گئے کہ گویا کچھ ہوا ہی نہیں تھا، کانگریس کے اجلاس کانپور میں مہاتما گاندھی کے رفقائے کار حتی کہ ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، اور ڈاکٹر محمود تک نے بڑی منت سماجت کی کہ اپنی خاموشی ترک کر کے فرقہ وارانہ فسادات کے ذمہ دار افراد کے بارے میں کچھ فرمائیں، لیکن وہ خاموش ہی رہے، بلکہ آئندہ سال تک خاموش رہنے کا فیصلہ کر بیٹھے، کلکتہ کے فسادات کے بعد بھی جب دوسرے اصحاب کی طرح حکیم اجمل خاں مرحوم مغفور نے مہاتما گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو اور مسز سروجنی نائیڈو کو دہلی آنے کی دعوت دی تاکہ کارکنان خلافت سے مشورہ اور گفتگو ہو جائے تو مہاتما گاندھی تو دہلی آئے ہی نہیں، اور پنڈت موتی لال نہرو نے صفائی سے کہہ دیا کہ چونکہ انتخابات ہونے والے ہیں اور مہاسبھا ان کے جان میں نہیں پھنسی، اس لئے فرقہ وارانہ فسادات کے معاملہ میں وہ کچھ نہیں کر سکتے۔

اب تو فرقہ وارانہ فساد، روزمرہ کا ایک واقعہ بن گیا ہے، حالات بد سے بدتر ہو چلے ہیں، اور دو سال کے اندر تو یہ تعین شکل اختیار کر چکے ہیں۔

ہندو مسلم مفاہمت اور کارکنان خلافت

امید کی پہلی شعاع اس وقت نظر آئی تھی جب کہ ۳ سال ہوئے سربر آوردہ مسلمانوں کی ایک کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی تھی، اور جس کے فیصلوں کو "تجاویز دہلی" کے نام سے موسوم کیا گیا تھا، جس کا خیر مقدم کانگریس کی مجلس عاملہ نے کیا تھا، اور جس کی تصدیق آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی بماہ مئی ۱۹۲۷ء میں پنڈت موتی لال نہرو کی تحریک پر کر دی تھی جس کی تائید ڈاکٹر مونجے، مسٹر کیلکر اور مسٹر جیکر جیسے مہاسبھائیوں نے بھی کی تھی، مگر مہاسبھا نے پرزور مخالفت کی تھی۔ چونکہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور مسلم لیڈروں میں ایک مفاہمت ہو گئی تھی اس لئے امید کی جاتی تھی کہ ملک کے دو فرقوں کے سیاسی اختلافات اب افسانہ ماضی بن کر ختم ہو جائیں گے، لیکن نیم مذہبی اختلافات اب بھی موجود تھے، اور وہی دینا پور اور بیتیا میں نقض امن کا سبب بنے، ان فسادات سے یہ بات ظاہر ہو گئی، کہ شاہ آباد اور گیا کے اضلاع میں دس سال قبل جو اندوہ ناک واقعات رونما ہوئے تھے اسی قسم کا فرقہ وارانہ جذبہ پوری قوت اور اتحاد عمل کے ساتھ کارفرمائی کر رہا ہے، ایک مرتبہ پھر کارکنان خلافت سمجھوتہ کے لئے آگے بڑھے اور کانگریس، اور ہندو مہاسبھا کے لیڈروں کو شملہ میں مدعو کیا، لیکن مہاسبھا والوں نے اس کانفرنس کو بھی اسی طرح ناکام بنا دیا جس طرح ۱۹۲۴ء کی اتحاد کانفرنس اور ۱۹۲۵ء کی اول آل پارٹیز کانفرنس کو ناکام کر دیا تھا، تب مسٹر سری نواس آئینگر صدر کانگریس نے، مخصوص رہنمایان خلافت کے مشورہ پر، کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس مدعو کیا، یہ اجلاس مذہبی تنازعات کا تصفیہ کرنے میں اسی طرح کامیاب ہوا، جس طرح بمبئی میں سیاسی اختلافات طے کرنے میں ہوا تھا، اس کے چند مہینے بعد مدراس میں کانگریس اور خلافت کمیٹی دونوں نے، دونوں سمجھوتوں (سیاسی اور مذہبی) پر مہر تصدیق ثبت کر دی، اس ضمن میں بھی مہاتما گاندھی نے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ ایک مرتبہ تو ان کے مذبذب طرز عمل سے لوگوں کو شبہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ان فرقہ وارانہ فیصلوں کے حامی و مؤید بھی ہیں یا نہیں، یہ تو رہنمایان خلافت ہی کا دل گردہ تھا جو انہوں نے مہاتما جی کی ایک مرتبہ اور مدد کی اور گاؤ کشی کا سوال ایسی شکل میں طے کر دیا کہ ایک طرف شریعت اسلامیہ کا اصول بھی قائم رہا اور دوسری طرف گاندھی جی کا ضمیر بھی مطمئن ہو گیا،

یہ تصفیہ پنڈت مدن موہن مالوی کو بھی ماننا پڑا، جو مجلس مضامین میں قدم قدم پر مخالفت کرتے رہے تھے، لیکن آخر میں انہی کے ہم قوم زائندوں نے رائے شماری کے وقت ان کو زبردست شکست دے دی، مجلس مضامین کے فیصلہ کی حمایت میں مالوی جی نے جب کھلے اجلاس میں تقریر کی تو رہنمایان خلافت نے خوب خوب داد دی، اور یہ خلافتی اصحاب مدراس سے فوراً ہی کلکتہ روانہ ہو گئے تاکہ وہاں مسلم لیگ کا جو اجلاس ہو رہا تھا اس میں مدراس تصفیہ کی تصدیق کرا لیں۔

یہ تمام واقعات صرف اس غرض سے دُہرائے گئے ہیں کہ لوگوں کو اُن کوششوں اور سعی وجہد کا صحیح علم ہو جائے جو کارکنان خلافت نے ایک باعزت اور قابل قبول ہندو مسلم سمجھوتہ کے لئے کانگریس کے توسل سے انجام تک پہنچائی تھیں، اس مفاہمت کا اثر حیرت انگیز طریقہ پر ظاہر ہوا، اور فرقہ وارانہ فسادات کلیتہً بند ہو گئے۔

سائمن کمیشن کا موثر طریقہ سے بائیکاٹ کیا گیا، اور ہندوستان میں تحریک ترک موالات کے شباب کے زمانہ سے کہیں بہتر اور اعلیٰ قسم کا اتحاد نظر آنے لگا جس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو لوگ لبرل اور اعتدال پسند خیالات کے تھے، وہ بھی تارکین موالات کے ساتھ اشتراک عمل کرنے لگے تھے،

سب کئے دھرے پر پانی پھیر دیا!

لیکن چند ہی مہینے بعد حالات پھر خراب ہو گئے، کیونکہ دہلی میں آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی اس میں تصفیہ مدراس کو مسترد کر دیا گیا، اس اجلاس میں ہی مہاسبھائیوں نے معاندانہ طرز عمل اختیار کیا، لیکن سب سے زیادہ افسوسناک رویہ پنڈت موتی لال نہرو کا تھا، وہی پنڈت نہرو جنہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں "تصفیہ مدراس" قبول کر لینے کی تحریک پیش کی تھی، اب وہی رویہ ہندو مہاسبھا کے لیڈروں کو بیوقوف بنانے کی کوشش کر رہے تھے، پہلی مرتبہ پنڈت جی نے ۲ سال قبل ہندوؤں کو اس امر سے بیوقوف بنا کر خوش کرنا چاہا تھا کہ صوبہ سرحد کو اس وقت تک اصلاحات نہیں ملنی چاہئیں جب تک اس صوبہ کی ۹۳ فیصدی مسلم آبادی پنجاب سے ملحق ہو کر اپنی اکثریت ختم کرنے پر آمادہ نہ ہو جائے۔

مسلم اقلیت کے لئے تحفظات

اب جبکہ ایک مفصل ومشرح دستور اساسی وضع کیا جا رہا ہے، مسلمانوں نے قدرتی طور پر ایسے تحفظات کا مطالبہ پیش کر دیا جن سے ان کے حقوق ومفاد کی حفاظت ہو سکے، یہی مسلمان تھے جنہوں نے تحریک ترک موالات کے زمانہ میں اس بات پر قناعت کر لی تھی کہ کوئی دستور اساسی وضع کرنے سے قبل ان کو ہندوستان کے لئے دستور اساسی وضع کرنے کا حق حاصل کرنا چاہیئے، لیکن حال کے تلخ تجربہ نے ان کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔

ہندوستان میں پہلی مرتبہ "اکثریت کی حکومت" قائم کی جا رہی تھی، اور بدقسمتی سے اس وقت فرقہ پرستی اپنی پوری قوت سے ملک کی فضا خراب کر رہی تھی، اور ملک میں مسلمانوں کی نہیں، ہندوؤں کی بھاری اکثریت ہے، اس لئے مسلمان "اکثریت کی حکومت" تو قبول کر لینے پر آمادہ تھے لیکن وہ قدرتاً مسلم اقلیت کے لئے تحفظات مانگنے لگے تھے، وہ آئینی ذرائع اختیار کر کے اکثریت والی قوم کی فرقہ پرستی کی بیخ کنی کرنے پر بھی تیار ہو گئے تھے، خواہ وہ ہندو اکثریت میں نمودار ہو یا مسلم اکثریت میں، اخلاقیات کا ایک سنہرا اصول ہے کہ "دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرو، جو تم چاہتے ہو کہ دوسرے تمہارے ساتھ کریں" اسی قسم کا ایک یہ بھی اصول

قانون سیاسیات میں ہی ہے" ایسی پوزیشن میں آجاؤ کہ دوسروں کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرسکو جس کا تمہیں خوف ہو کہ دوسرے تمہارے ساتھ کریں گے"۔ اگر کھیل میں دو کھلاڑی ہوں تو دونوں میں سے ایک بھی نہ کھیل سکے گا، مسلمان چند صوبوں اور چند ماتحت صوبوں میں اکثریت میں تھے، یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کی حکومت "وفاقی" قسم کی ہو نہ کہ "وحدانی" اور یہ کہ صوبوں کو کامل اندرونی آزادی ملنی چاہیئے تاکہ ان کو اطمینان رہے کہ جن صوبوں میں وہ اقلیت میں ہیں وہاں اس لئے محفوظ رہ سکیں گے کہ چند صوبوں میں ان کی اکثریت ہوگی، اور وہاں ان کو پوری آزادی حاصل ہوگی، بدقسمتی سے صوبۂ مغربی شمالی (سرحد) میں جہاں مسلمانوں کو وہی بھاری اکثریت حاصل ہے جو ہندوؤں کو صوبۂ مدراس میں ہے، انتخاب کا طریقہ رائج نہیں ہوا ہے، اور سندھ، جہاں مسلمانوں کی ۷۵ فی صدی آبادی ہے، گجرات، مہاراشٹر اور کرناٹک میں، جو صوبۂ بمبئی کے ماتحت حلقے میں مدغم کردیا گیا ہے، مسلمانوں کی خواہش ہے کہ صوبۂ مغربی وشمالی کو وہی طرز حکومت ملے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کو حاصل ہے۔ اور سندھ کو، چونکہ اس کی کوئی چیز اس کے ملحقہ علاقوں سے مماثل نہیں ہے، اس لئے ایک علیٰحدہ صوبہ بنادیا جائے، نیز پنجاب اور بنگال میں چونکہ مسلمانوں کو برائے نام اکثریت حاصل ہے، اس لئے ان صوبوں میں ان کو اس وقت تک کے لئے چند تحفظات دیئے جائیں جب تک کہ وہ اپنے کو پوری طرح منظم نہ کرلیں۔

لیکن پنڈت موتی لال نہرو باوجودیکہ ان تمام تحفظات کی تائید آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں کرچکے تھے، ایک مرتبہ پھر ہندو مہا سبھائی خوشامد میں مصروف ہوگئے، اور پنجاب اور بنگال کی برائے نام اکثریت کو عارضی تحفظات ملنے کی مخالفت کرنے لگے، خواہ وہ خفیف سی اکثریت بھی اقلیت میں کیوں نہ تبدیل ہوجائے، اور سندھ کی علیحدگی کی مخالفت میں دور از کار اور غیر منطقی خطرات ودلائل پیش کرنے لگے۔

اس طرح گویا مسلمان کہیں کے نہ رہتے، اور جب اکثریت کی حکومت پورے ملک میں قائم کی جاتی تو مسلم اکثریت جہاں کہیں بھی ہوتی، اس "بنیادی حق" سے محروم ہوجاتی، یہی نہیں، اگر کسی صوبہ میں مسلم اکثریت قائم ہوجاتی، جب بھی اُس صوبہ کے نظام حکومت اور انتظام کے سر پر مرکزی حکومت کے "ویٹو" کی تلوار لٹکتی رہتی، کیونکہ مرکز میں مسلمانوں کو موجودہ تناسب کے مطابق بھی حق نمائندگی نہیں مل رہا ہے، چھوٹی چھوٹی اقلیتوں کو ابھی منظوری سے "ویٹیج" (پاسنگ) کا معیار سٹ کرلینے کے حق سے محروم کیا جارہا ہے، اور "ویٹو" کے اُس حق سے بھی جو کانگرس نے ہمیشہ مسلمانوں کو دے رکھا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ جب مسلمان ممبروں کی ۲ ثلث اکثریت کسی بات کی یہ کہہ کر مخالفت کرے کہ اس سے مسلم مفاد کو صدمہ پہنچ جائے گا تو اس موقع پر یہ حقیقت نوٹ کرلینی چاہئے کہ مسلمان اپنے لئے کوئی رعایت نہیں طلب کررہے تھے، اور نہ اپنے ہی لئے خصوصیت سے کوئی تحفظات مانگ رہے تھے، بلکہ وہ اسی قسم کی مراعات، اُن ہندو اقلیتوں کو بھی دینے پر تیار تھے، جو مسلم اکثریت والے صوبوں میں ہوتیں، دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ ایک ہی قسم کے تحفظات، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو دینا چاہتے تھے اور ان تحفظات کی اصل غرض یہ تھی کہ کوئی اکثریت، خواہ وہ مسلمانوں کی ہو یا ہندوؤں کی، کسی اقلیت کے ساتھ، خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان، فرقہ پرستی کے جذبات کے ماتحت کوئی تعدی یا زیادتی نہ کرسکے، یعنی ہر فرقہ کی اقلیت دوسرے فرقہ کی اکثریت کے "فرقہ وارانہ اسلحہ" کی زد سے محفوظ ہوجائے۔

مہاتما گاندھی نے مسلمانوں کو چھوڑ دیا

پنڈت موتی لال کی چالبازیوں کے خلاف جب جب مسلمانوں نے آواز اٹھائی اُسے ہر بار نظر انداز کر دیا گیا، اور اب تو مہاتما گاندھی نے جنہوں نے نہرو رپورٹ کی تخلیق کی تھی، کلیۃً مسلمانوں کو چھوڑ دیا اور نہرو رپورٹ کو اپنا "نعرہ جنگ" بنا لیا، ابھی ۵ ہی سال گزرے ہیں جبکہ انہی مہاتما جی نے بلگام کانگریس کے خطبۂ صدارت میں ارشاد فرمایا تھا۔

"ہندو مسلم اتحاد ہماری زندگی کی سانس ہے، مسلمانوں کی بھاری اکثریت رکھنے والے صوبہ میں ہندو اُس صورت میں زندگی بسر کر سکتے ہیں جبکہ مسلمان اُن کا خیر مقدم کرنے اور اُن کے ساتھ مثل دوست کے مساویانہ سلوک کرنے پر راضی ہوں، اسی طرح جہاں مسلمان اقلیت میں ہوں، وہاں ان کو ہندو اکثریت کی دوستی پر عزت کی زندگی بسر کرنی ہو گی"۔ . . . . جب باہمی جھگڑے روزمرہ کی چیز بن جائیں تو اُن کو "سول وار" کہا جاتا ہے، اور پھر متخاصم فریقین ہی کو وہ جنگ "لڑنی" اور ختم کرنی پڑتی ہے . . . . . کوئی سوراجی حکومت، چاہے وہ کتنا ہی "عوام کی حکومت" کہلانے کا دعوےٰ کرے، جنگ و جدل کی بنیاد پر نہ تو قائم کی جا سکتی ہے اور نہ اپنا نظام حکومت چلا سکتی ہے . . . . . سوراج گورنمنٹ سے مراد ہے ایسی حکومت جو ہندوؤں، مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کی مشترکہ و آزاد رضامندی سے قائم کی جائے، اگر ہندو مسلمان سوراج کے خواہش مند ہیں تو ان کو اپنے اختلافات باہمی رواداری کے ساتھ دور کرنے ہی ہوں گے، ہمارا مقصد لازماً یہ ہونا چاہیئے کہ پہلی فرصت میں فرقہ وارانہ نمائندگی ختم کر دی جائے، ایک مشترکہ ادارۂ انتخابات ہو، اور وہ غیر جانبداری کے ساتھ صرف قابلیت و استحقاق کی بنا پر نمائندوں کا انتخاب کر دے، سوراجی ملازمتوں میں بھی بہترین قابلیت کے مرد اور عورتیں لی جائیں، لیکن جب تک وہ وقت نہیں آتا، اور جب تک فرقہ وارانہ رقابتیں یا ترجیحی حق کا مطالبہ، قصۂ ماضی نہیں بن جاتے، اُن اقلیتوں کو ان کی خواہش کے مطابق راستہ دیدینا چاہیئے، جو اکثریتوں کے ارادوں اور نیتوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہی ہیں، اکثریتوں کا فرض ہے کہ ایثار و قربانی کا نمونہ پیش کریں"۔

گاندھی جی کے یہ خیالات اُس وقت کے ہیں جبکہ دستور سازی کا کام شروع ہونے والا تھا، لیکن آج جو ان خیالات کی صدائے بازگشت، جو ان کے اخبار ینگ انڈیا کے ذریعہ سنی جا رہی ہے، کتنی عجیب اور دلچسپ ہے! وہ لکھتے ہیں:۔

"آزاد ہندوستان میں فرقہ وارانہ نمائندگی کی گنجائش نہیں نکل سکتی ملک اس کا متحمل ہو ہی نہیں سکتا . . . . اور کانگرس کو وقتی گنجائش نکالنے سے قطعاً انکار کر دینا ہو گا"۔

کیا اس صاف گوئی کے بعد بھی، بالخصوص جبکہ "اکثریت کی حکومت" قائم کی جا رہی ہو، اور فرقہ پرستی کا دور دورہ ہو، "عارضی گنجائش" کا نکالنے سے انکار کر دینا، گاندھی جی پر "فریب دہی اور بیوقوف سازی" کا الزام لگانا مشکل ہو گا؟ یہ حقیقت کتنی حیرت انگیز ہے کہ وہ خود ہی تو ایک اصول وضع کرتے ہیں کہ "جب باہمی جھگڑے روزمرہ کی زندگی کا جزو بن جائیں تو ان کو سول جنگ" کہا جاتا ہے اور جب دو پارٹیوں میں سول جنگ چھڑ جائے تو اسے متخاصم فریقین ہی مل کر ختم کر سکتے ہیں" یا

پھر اُن میں عقل سلیم پیدا ہو جائے کہ ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کر کے باہمی تصفیہ کر لیں"! اور جب کوئی دوسرا کلہاڑے کو کلہاڑا کہتا ہے تو گاندھی جی "حیرت زدہ" ہو کر اس کا منہ تکتے ہیں، اور انہی کے پیش کردہ اصول کے مطابق جب ایک ایسا فارمولا نکالا جاتا ہے جس سے فرقہ وارانہ تنازعات کا تصفیہ ہو جائے تو وہ اس کوشش کو "بیوقوف سازی" سے تعبیر کر کے "عارضی گنجائش" نکالنے سے بھی انکار کر بیٹھتے ہیں! ایک عرصہ سے مہاتما گاندھی اپنے کو "ایک چلا ہوا کارتوس" کہہ رہے تھے، لیکن اب تو وہ نہرو رپورٹ کے کارتوس میں "اڑا دینے والا" مسالہ بن گئے ہیں! اس الٹیمیٹم کا نتیجہ کیا ہوا؟ ایک مرتبہ پھر فرقہ وارانہ فسادات کا سارے ملک میں دور دورہ ہو گیا، اور آپ کی خود گاندھی جی کے صوبہ میں اس کا سب سے زیادہ زور رہا، دستور سازی کے اس خبط نے ہندوستان کو داخلی طور پر طاقت ور بنانے کی بجائے اس کی کمزوریوں میں اضافہ کر دیا۔

آزادیٔ ہند کی آرزو غیر مشتبہ ہے!

ان باتوں کے باوجود ہندوستانیوں کے دلوں میں آزادیٔ وطن کا جذبہ غیر مشتبہ صورت میں موجزن ہے، ایک قدامت پسند وائسرائے نے بھی اقرار کر لیا، کہ جہاں تک راعی اور رعایا کا تعلق ہے، موجودہ صورت حال اب جاری نہیں رہ سکتی، باہمی فرقہ وارانہ اختلافات سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ محکوم ملک برطانوی اقتدار سے باہر ہے، ان اختلافات سے تو صرف اتنی سی بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ مسلم اقلیت آقاؤں کی تبدیلی پر راضی نہیں ہے، بلکہ وہ ایک آزاد اور خود مختار ہندوستان کے نظام حکومت میں اپنا معقول اور اثر انداز حصہ طلب کر رہی ہے۔

گول میز کانفرنس اور گاندھی جی کا انکار

اس لئے وائسرائے نے برطانیہ کی نئی حکومت (وزارت) کو ہندوستان کا مطالبہ "گول میز کانفرنس" منظور کرنے پر آمادہ کر لیا، ہندوستانیوں کا کہنا یہ تھا کہ برطانیہ دنیا کی پوری آبادی کے پانچویں حصہ کی قسمت کا فیصلہ نہ کرے ہندوستان کے ۳۲ کروڑ باشندے کوئی مجرم تو نہیں جن کی زندگی، موت اور آزادی کی جدوجہد کا فیصلہ ایک اجنبی جج کرے، جس کے ساتھ اجنبیوں ہی کی ایک جماعت جوری بن کے بیٹھے، یہاں اس سے بحث نہیں کہ ہندوستانیوں کا یہ مطالبہ بربنائے استحقاق تسلیم کر لیا گیا یا برطانیہ کو عقل سلیم آگئی بہر حال اس سے اتنا تو ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے دل میں تبدیلی پیدا ہو گئی تھی، ہندوستان کو ایک موقع مل گیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا، کہ اپنی ہستی منوا سکے، اور دنیا اس کی قومی انفرادیت تسلیم کر لے، اب وہ دنیا سے تسلیم کرا سکتا ہے کہ آزادی اس کا پیدائشی حق ہے، اور یہ بھی کہ ہندوستان میں حق موروثی حاصل کر لینے کی صلاحیت پیدا ہوئی ہے یا نہیں، اس سوال کا فیصلہ کرنے کا اختیار غصب کر رکھا ہے، وہ کمیشن نہیں بھیج سکتے، ہندوستانی گول میز کانفرنس کا مطالبہ اس لئے بھی کر رہے تھے کہ ڈیڑھ سو برس کے "غلبۂ اغیار" نے ان کو جو عبرت ناک سبق سکھایا تھا کہ وہ ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں بلکہ سب کے لئے آزادی حاصل کریں، سب کو برابر کے مواقع دیں، اور برادرانہ تعلقات اس طرح قائم کریں جو درجۂ مساوات سے بھی بلند ہو، تا کہ "قوی" کمزوروں کو دبانے کے عوض ان کی امداد کرے، اور ایک عالم و فاضل صرف درس دے نہ کہ جہلا پر ہمیشہ فائق رہنے کی کوشش کرے، یہ وقت تھا کہ برطانوی ہند اور ریاستی ہند میں آخری فیصلہ ہو جاتا، اسی طرح ہندوؤں، اور مسلمانوں میں، پھر خود ہندو ہندو میں یعنی اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور پست اقوام میں، اچھوتوں اور چھوت چھات ماننے والوں میں بھی۔

احمد اور آپ

ہر کھانے کو
زیادہ قوت بخش اور لذیذ بناتے ہیں
احمد کے ٹماٹو کیچپ کی ایک بوتل
۲½ پونڈ ٹماٹروں سے بھرپور ہے

NAURUS
SYRUP
Ahmed's
MANGO
SQUASH
MED FOOD INDUST
احمد
فوڈ انڈسٹریز لمیٹڈ۔ کراچی ۱۶
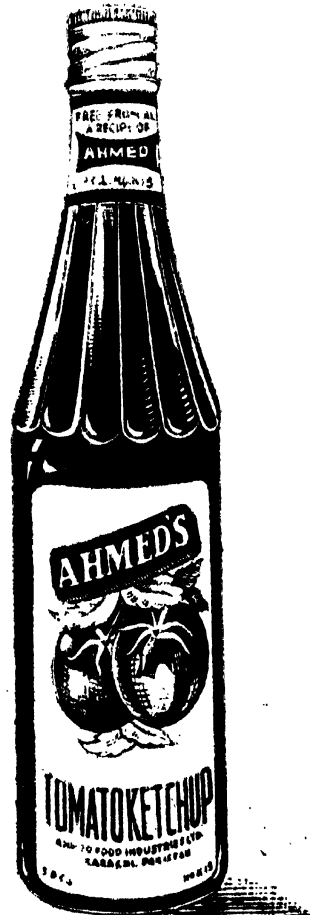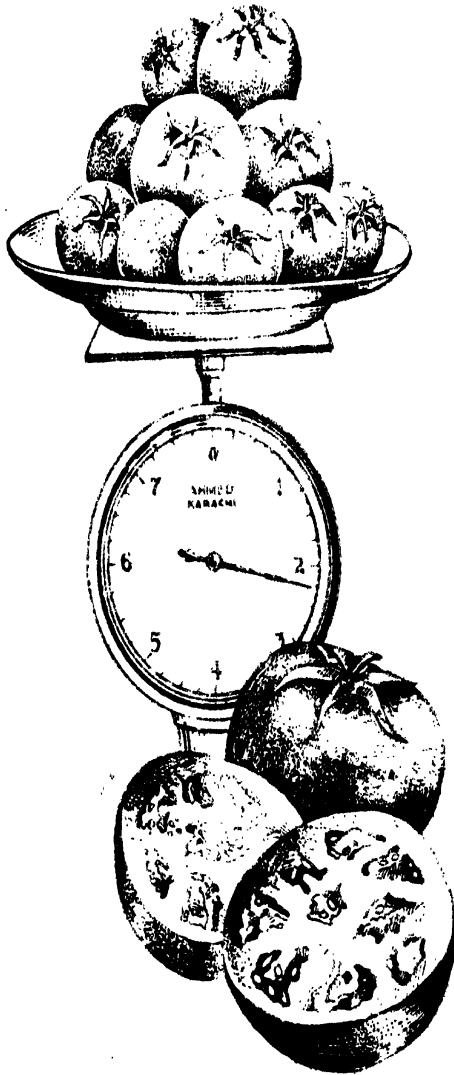
لیکن افسوس کہ ایسا ہونا مقدر نہ تھا! اور مہاتما گاندھی نے مسلمانوں کی وہ تمام درخواستیں نامنظور کر دیں جو وہ ایک ورستی مفاہمت کے لئے کر رہے تھے، اب گاندھی جی، فرقہ واریت کو "نظر انداز" کرنے ختم کرنا چاہتے ہیں، جس کا ایک مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ اکثریت کی فرقہ پرستی جاری رہے، اور ایک "مکمل آزاد" ملک میں "قومی" حکومت کا نام لے کر، اکثریت ہی اپنا حکم چلاتی رہے، اسے اس کی پرواہ نہ ہونی چاہیئے، کہ اقلیت کو کیا ملا اور کیا نہیں ملا، اس طریقہ سے فرقہ پرستی ختم نہیں ہو سکتی، بلکہ اقلیت والے اکثریت کے مطیع و منقاد بن جائیں گے، کیا تماشہ ہے کہ اصلی فرقہ واریت کو "قومیت" کا نام دے دیا گیا ہے، اور جن تحفظات کو فرقہ واریت کے خلاف، استعمال کیا جا سکتا ہے، انہی کو "فرقہ پرستی" کا نام دے دیا جاتا ہے!

کیا نہرو رپورٹ واقعی مسترد کر دی گئی؟

کہا جاتا ہے کہ اب نہرو رپورٹ ختم ہو چکی ہے، اور کانگرس بالکل صاف سلیٹ پر کلیتہ آزاد ہندوستان کا ایک دستور اساسی لکھنے والی ہے۔ کاش یہ سچ ہوتا! اگر نہرو رپورٹ "ختم شدہ" بھی سمجھ لی جائے تو اس کے خاتمہ کا واحد سبب یہ ہے کہ وائسرائے نے سائمن کمیشن کی رپورٹ پیش ہونے سے پہلے برطانوی اور ہندوستانی ممبروں کو بلا سے "جلد" درجہ نو آبادیات "دے دینے کا وعدہ کرنے پر مجبور نہیں کیا، اور وہ بظاہر ایسا کر سکتے بھی نہیں تھے۔ اور نہرو دستور کی اساس درجہ نو آبادیات "رکھی گئی ہیں، پس) چونکہ گول میز کانفرس سے قبل درجہ نو آبادیات کا اعلان نہیں ہو سکا اور چونکہ پنڈت جواہر لال نہرو، صدر کانگرس نے اپنے والد اور مہاتما گاندھی سے اس وعدہ کے ایفا پر اصرار شروع کیا جو انہوں نے ایک سال قبل کلکتہ میں کیا تھا، نہرو رپورٹ اپنی قدرتی موت مر گئی اور ایک دوسرا دستور وضع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا جانے لگا جو "کامل آزادی" کی بنیاد پر مرتب کیا جاتا۔

لیکن جو چیز کہ حقیقتاً ختم نہیں ہوئی اور بظاہر کبھی ختم ہونے والی بھی نہیں ہے وہ "پست ذہنیت" اور "تنگ نظری" ہے — اسی چیز نے تو نہرو کمیٹی سے مدراس کے سارے کئے دھرے پر پانی پھر وا دیا! لاہور کانگرس کی تمام کاروائیوں میں "کانگرس کی مجلس عاملہ اور آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اجلاسوں میں جو وقتاً فوقتاً منعقد ہوتے رہے، اور اس سارے لٹریچر میں جو گاندھی جی کے اخبار میں شائع ہوتا رہا، یا ان خطوط و مراسلات میں جو مہاتما جی نے اپنے احباب اور ازمودہ کار رفقا کو لکھے جن کو انہوں نے اب چھوڑ دیا ہے، کیا کہیں بھی یہ بتایا گیا ہے کہ نہرو رپورٹ اس لئے اور اس وجہ سے مسترد کر دی گئی کہ اس کے مرتبین اور مہاتما گاندھی کو پوری طرح احساس و یقین ہو گیا کہ اس میں جس نام نہاد "ہندو مسلم مفاہمت" کی اسکیم پیش کی گئی ہے وہ مسلمانوں کے لئے "غیر تسلی بخش" ہے یا کم سے کم یہی کہا گیا ہے کہ مسلمان اس اسکیم کو "غیر تشفی بخش" اور ناقابل قبول سمجھتے ہیں، اس لئے ایک اور کوشش کی جائے گی کہ معاملہ اس طرح سلجھایا جائے کہ اس مفاہمت کو مسلمان قبول کر لیں اور وہ برابر کی حیثیت سے ہندوستان کی جنگ آزادی میں شریک ہو سکیں؟

جب مہاتما گاندھی اور نہرو رپورٹ کے دوسرے موئدین دہلی میں اس غرض سے جمع ہوئے تھے کہ گول میز کانفرنس کی شرکت کے مینفسٹو پر دستخط کر دیں، تو صرف ایک یا دو مسلمانوں کو دہلی آنے کی دعوت دی گئی تھی، اور ان کو بھی "صاد کرنے" پر مجبور کیا گیا تھا، لیکن ۲۳ دسمبر کو جب آخری فیصلہ ہوا تو ان ایک یا دو مسلمانوں کو پوچھا بھی نہیں گیا، اور چونکہ وائسرائے سے نہرو

رپورٹ تمام و کمال منوانی نہیں جا سکتی تھی، اس لئے باہمی تفہیم کے تبادلہ خیال کے گفت و شنید کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ لاہور میں کانگرس کا عقیدہ فوراً تبدیل کر دیا گیا، اور مسلمانوں سے مشورہ لینے کی کوشش کئے بغیر ہی سول نافرمانی کی مہم شروع کر دی گئی (کوئی شبہ نہیں) ایک یا دو پرانے اور نامزدہ کار رفقاء کو مدعو کیا گیا، لیکن ان کی حیثیت "متبعین" کی سی رکھی گئی، جو اس جنگ آزادی میں پیچھے پیچھے چلنے والے سپاہیوں کی طرح ہوتے۔ یہ جنگ آزادی کیسی تھی؟ اگر وہ کامیاب ہو جاتی تو مسلمان "محکوم و محتاج" کی پوزیشن میں ہی رہ جاتے! یہ ہیں وہ اسباب جن کی بنا پر نہرو رپورٹ ختم ہوئی تھی! اس کے خاتمے سے مسلمانوں کو کیونکر اطمینان ہو سکتا تھا، جب کہ اس کے پس پشت وہی تنگ نظری اور پست ذہنیت صاف طور پر نظر آ رہی تھی؟

کانگریس کی تجویز کا دراصل مقصد یہ ہے کہ نہرو رپورٹ میں مسلمان اقلیت کے لئے جو تھوڑے بہت تحفظات رکھے گئے وہ بھی اب "ختم ہو گئے" اور آزاد ہندوستان کا جو دستور اساسی مرتب کیا جائے گا اس میں کوئی ایسی چیز نہیں رکھی جائے گی جس سے فرقہ واریت کی بو آتی ہو! قدرت کی انگلی نے جو نشانات بنا دئے بنا دئے، اور تقدیر کے قلم نے جو کچھ لکھ دیا لکھ دیا۔ اب اس میں ایک حرف کی بھی تبدیلی نہیں کی جائے گی! مسلمان اقلیت میں ہیں، اور بقول شخصے "پست قبائل کی تو پیشانی پر غلامی لکھی ہوئی ہے!"

آزادی کے عوض جبر

فروری ۱۹۲۸ء میں مہاتما گاندھی نے اپنے اخبار ینگ انڈیا میں لکھا تھا کہ تمام لوگوں کو اپنی پوری توجہ نہرو رپورٹ کو منظور کرانے پر مرکوز کر دینی چاہئے خواہ مسلمان اور سکھ اس سے کتنی ہی بے اطمینانی کا اظہار نہ کریں، اس مضمون میں انہوں نے رپورٹ میں کسی قسم کی ترمیم کے امکان سے انکار نہیں کیا تھا۔ البتہ "بزور شمشیر ترمیم کرانے کو ناممکن" لکھا تھا، ان کے الفاظ

"ترمیمات کی جائیں گی" اور کی جانی بھی چاہئیں لیکن وہاں جہاں از روئے انصاف مناسب سمجھی جائیں، البتہ یہ ترمیمات اس وقت نہیں کی جانی چاہئیں، بلکہ اس وقت جبکہ رپورٹ اتنی طاقت حاصل کرے کہ اپنے کو زبردستی منوا سکے، اور جب وہ اس منزل پر پہنچ جائے گی تو "قبول عام" کے لئے پیش کی جائے گی، اور تب اس میں ایسی ترمیمات کی جا سکیں، جو بالکل ناگزیر سمجھی جائیں، اور جن پر باہمی اتفاق آرا ہو گیا ہو۔"

یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ کس نے تلوار کھینچ کر اس نامراد اور نامسعود رپورٹ میں ترمیم کرنے پر زور دیا تھا؟ اور اگر حق و انصاف کی بنا پر اس میں ترمیم کی جا سکتی ہے، تو وہ کون سی "مختار کل" شخصیت ہوگی جو فرمان جاری کر دے کہ ترمیمات ابھی نہیں کی جانی چاہئیں، بلکہ اس وقت جبکہ رپورٹ اپنے کو زبردستی منوانے کی طاقت حاصل کر لے۔ کیا آزادی عمل اسی کا نام ہے؟ کیا امن یونہی قائم رکھا جاتا ہے؟ کیا یہ صوبائی تیمور اور چنگیز نہیں ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ نہرو رپورٹ کو، کروڑ مسلمانوں کے اوپر بزور شمشیر مسلط کیا جانا تھا یا جا رہا ہے، اس پر پہلے ہی سے تہیہ کر لیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی لکھتے ہیں۔ "میں اس قابل ترمیمات کر دینے کے امکانات سے انکار نہیں کرتا، لیکن ابھی نہیں" اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ترمیمات اس وقت داخل کی جائیں گی جبکہ ترمیم چاہنے والے، واضعین رپورٹ کے رحم و کرم کے خواستگار ہوں، اور حامیان رپورٹ

اتنی قوت حاصل کرلیں کہ جس شکل میں وہ خود پسند کریں، رپورٹ کو زبردستی تسلیم کراسکیں، بدقسمتی سے رپورٹ اتنی طاقت نہیں حاصل کرسکی، اور جمعیت خلافت نے اُسے طاقت حاصل کرنے میں کوئی امداد نہیں دی۔

دوسروں کے سہارے بہشت میں جانا

جو کچھ مہاتما نے ایک سال قبل کیا تھا، وہی کانگریس نے ایک سال بعد تجویز لاہور میں کہہ دیا، لیکن مہاتما گاندھی آج بھی بالکل وہی باتیں کہے جارہے ہیں، کانگریس کی تجویز کا جو مفہوم انہوں نے ینگ انڈیا میں لکھا ہے، اور جو مضمون انہوں نے مولانا شوکت علی کے خط کے جواب میں لکھا ہے، وہ ان کے ایک سال قبل والے "نعرۂ جنگ" کی تشریح ہے، جسے وہ نہرو رپورٹ کے نام سے موسوم کررہے تھے، اگر مسلمان اُسے قبول نہیں کرتے، تو ان کو الگ ہو جانے دو، ان کی ضرورت بھی نہیں ہے، ہندوستان کی آزادی اُن کی . . . مدد کے بغیر بھی حاصل کی جاسکتی ہے، زمانہ کا یہ انقلاب بھی کتنا حیرت انگیز ہے کہ کل کا چھٹا ہوا کارتوس" اتنی قوت حاصل کرے یا بلد حاصل کرسکے، جسے مہاتما جی مولانا شوکت علی کا جواب دیتے ہوئے، اپنے اخبار میں "ناقابل تسخیر طاقت" سے تعبیر کرتے ہیں! اگر آج مسلمان اپنی مرضی سے ساتھ نہ ہو جائیں گے، تو کل وہ کہیں کے بھی نہ رہیں گے، یہ بات بھی پیش گوئی ہے، مسلمانوں میں خود اپنی کوئی قوت نہیں ہے، وہ اپنے پیروں پر خود نہیں کھڑے رہ سکتے، ان کو مہاتما جی کے متبعین کا سہارا لینا ہوگا! اس لئے سوا اُن کے لئے کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے!

یہ تو حسن اتفاق ہے کہ مذکورہ خیالات صحیح نہیں ہیں، لیکن اگر وہ صحیح ہوتے بھی تو مسلمانوں کو غیروں کا سہارا لینے سے بہتر ہوتا کہ وہ خودکشی کرکے فنا ہو جاتے، جیسا کہ ایک فارسی کے ایک شاعر نے کہا ہے ؎

حقا کہ با عقوبت دوزخ برابر است
رفتن بپائے مردی ہمسایہ در بہشت

اتحاد کی ایک اور کوشش

خوش قسمتی سے صورت حال وہ نہیں ہے جس کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، جن لوگوں میں حقائق کے سمجھنے کی صلاحیت ہے، اور جو لوگ اس موقع کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہیں جو حسن اتفاق سے ہندوستان کو گول میز کانفرنس کی پیش کش سے حاصل ہو گیا ہے انہوں نے تہیہ کرلیا ہے کہ دنیا کے سامنے ایک متحدہ محاذ پیش کریں گے، والیان ملک نے بھی حال ہی میں اسی جذبہ کا اظہار اپنے پیمپھ میں ایک اہم تجویز کے ذریعہ کیا ہے جس میں تمام مفادات کے لئے اور مسلم قوم کے لئے تحفظات کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے، اسی طرح لبرل خیال کے ہندوستانی رہنما بھی فرقہ وارانہ سوالات کو نظر انداز کرنے کے بجائے اس کے حل کی تلاش میں مصروف ہو گئے ہیں، جب سر تیج بہادر سپرو نے کارکنان خلافت کو ایک کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت دی تو ان کے دلوں میں یہ خوف پیدا ہو گیا تھا، کہ کہیں لبرل اصحاب بھی مسلمانوں کے مطالبات کے ساتھ وہی سلوک نہ کریں جو مہاسبھا کررہی تھی یا جس کی رخ جھا دیکھی کانگریس کررہی تھی، اس خوف کے باوجود کارکنان خلافت نے لفت و شنید کا دروازہ بند نہیں کیا بلکہ دعوت شرکت بڑی خوشی اور فراخ دلی کے ساتھ قبول کرلی، مسلمانوں کے مطالبات پوری سنجیدگی کے ساتھ پیش کر دیے گئے، اور ان کی معقولیت ان تمام لوگوں نے تسلیم کرلی جن کی آنکھوں پر تعصب کی پٹی نہیں بندھی ہوئی تھی، اس سے فرقہ پرست حلقوں میں ایک سنسنی سی پھیل گئی جو

"قوم پروری" کا نام لے کر شروع ہی سے اس کوشش میں مصروف تھے کہ سپرو کانفرنس ملتوی ہو جائے ہمیں یقین رکھنا چاہئے کہ کانگرس کی طرح لبرل لیڈران، فرقہ پروری کا شکار نہیں ہو جائیں گے، اور سائمن کمیشن کی رپورٹ شائع ہونے سے پہلے ایک ایسی قابل قبول مفاہمت مکمل کر لیں گے جس میں سب کے مفاد محفوظ ہوں گے۔ اگر یہ ہو گیا تو گول میز کانفرنس میں ہندوستان کے نمائندے ایک متحدہ محاذ پیش کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور کامیابی کے ساتھ اپنے اس مطالبہ پر اصرار کر سکیں گے کہ ہندوستان کا پیدائشی حق تسلیم کر لیا جائے اور وہ حق سوائے مکمل آزادی کے اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور اگر ہندوستان کا یہ مطالبہ متحدہ طور پر پیش کر دینے کے بعد بھی تسلیم نہ کیا جائے تو اس کے بعد موقع ہو گا کہ کانفرنس سے واک آؤٹ کریں، اور ہندوستان کی ہستی اور کامل آزادی تسلیم کرائیں۔ اس حالت میں کسی کو بھی برطانیہ سے قطع تعلق کر لینے اور جنگ آزادی لڑنے میں کوئی عذر نہ ہو گا، بلکہ پھر تو ساری دنیا ہندوستان کے اس رویہ کو حق بجانب ٹھہرائے گی اور سارے ہندوستان میں ایک نئی زندگی اور تازہ دم پیدا ہو جائے گی۔

مہاتما گاندھی اور آزادی

۵ سال ہوئے خود مہاتما گاندھی نے اپنے خطبہ صدارت بلگام میں ارشاد فرمایا تھا:-

"میں علیحدگی کی ذمہ داری برطانوی قوم کے سر ڈالنا چاہتا ہوں، یہ برطانیہ ہی کا کام ہونا چاہئے کہ صاف صاف کہہ دے، کہ اسے ہندوستان سے کوئی حقیقی اتحاد نہیں قائم رکھنا ہے میری خواہش یہ ہے کہ آزادی قائم کرنے سے قبل ہم میں خود بخود آزاد ہو جانے کی پوری صلاحیت پیدا ہو جائے، جب برطانیہ یہ اعلان کر دے کہ اس کا اصلی مقصد ہندوستان کو اپنی مملکت میں مساوی درجہ دینے کا ہے، تب میں جو اسکیم بھی تیار کروں گا اس میں برطانیہ سے اتحاد قائم رکھنا ضرور شامل ہو گا۔ . . . . میں ہر کانگرسی سے درخواست کروں گا کہ وہ ہر حالت اور ہر صورت میں "آزادی" مل جانے پر اصرار نہ کریں کیونکہ جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ برطانیہ ہندوستان کو غلام بنانے ہی کے ارادہ سے تو بار بار انکار کرتا ہے مگر وہ درحقیقت چاہتا یہی ہے، اس وقت تک کامل آزادی پر اصرار کرنا بالکل غیر ضروری ہو گا۔"

یہ تھے مہاتما گاندھی کے ذاتی خیالات اُس وقت جب کہ لارڈ برکنہیڈ اور لارڈ ریڈنگ برسرکار تھے اور جبکہ حکومت ہند کے ایک رکن نے علانیہ فرما دیا تھا کہ اگست ۱۹۱۷ء میں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کے لئے درجۂ نوآبادیات کا حق ہرگز تسلیم نہیں کیا تھا، مہاتما گاندھی اب علیحدگی کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے رہے ہیں، اور آزاد ہو جانے کی پوری صلاحیت حاصل کئے بغیر "پوری آزادی قائم کر رہے" ہیں کہیں اس کا سبب یہ تو نہیں ہے کہ اب مسٹر بن اور لارڈ اروِن برسرِ عہدہ آ گئے ہیں؟

کوئی شبہ نہیں، جو شخص تحریک ترک موالات کو ۱۹۲۲ء میں باردولی میں یک بیک بند کر سکتا ہے، وہ اسی حیرت انگیز بوقلمونی کے ساتھ ۱۹۳۰ء میں سول نافرمانی کی مہم شروع بھی کر سکتا ہے، لیکن اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ ایک مرتبہ پھر "ٹھہرو" کا حکم نہ دے بیٹھے گا، جیسا کہ اس نے ۸ سال پہلے وائسرائے کو الٹیمیٹم دینے کے تھوڑے ہی دن بعد صادر فرما دیا تھا؟

پنڈت جواہر لال میں انقلاب؟

سمجھ میں نہیں آتا کہ جبکہ ہندوستانی والیان ریاست، لبرل اصحاب، ہندو مہاسبھا، مسلمان، اور خود آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے نصف ممبران یہ کہہ رہے تھے کہ تقاضائے عقل و مصلحت یہی ہے کہ گول میز کانفرنس کے نتیجہ کا انتظار کیا جائے اور دیکھ لیا جائے کہ وہ ہندوستان کے لئے کیا کرتی ہے، عین اُس وقت پنڈت جواہر لال نہرو میں ایک دم سے "انقلاب" کیوں حلول کر گیا اور انہوں نے اچانک اور بے چینی کے ساتھ اس کی ضرورت کیوں محسوس کر لی، کہ گاندھی جی پر دباؤ ڈال کر وہ چیز منوائیں، جو وہ دو برس سے ماننے سے گریز کر رہے تھے ــــ یعنی یہ کہ کانگرس کا عقیدہ تبدیل کر کے "مکمل آزادی" کر دیا جائے، یہی پنڈت جواہر لال نہرو تو تھے جنہوں نے اپنی صدارت کے زمانہ میں کانگرس کو اپنا "مقصد" آزادی قرار دینے پر آمادہ کر لیا تھا، اور یہی گاندھی جی تھے جنہوں نے اس وقت آزادی کو "مقصد" قرار دینے کا بھی مذاق اڑایا تھا! ایک وقت وہ بھی تھا جب کہ اپنے انتساب کے بعد مہاتما گاندھی نے کانگرس کی رہنمائی کی ذمہ داری پنڈت جواہر لال نہرو کے کندھوں پر ڈال دی تھی اور جنہیں گاندھی جی نے ان کی خواہش کے خلاف، دہلی مینفسٹو پر دستخط کر دینے کے لئے آمادہ کر لیا تھا، انہی جواہر لال نہرو کے خیالات میں یک بیک انقلاب پیدا ہو جانا، تعجب خیز نہیں تو اور کیا ہے!

مہاتما جی کا عصا

اب ذرا ہم اُس صورت حال پر ایک نظر ڈالیں جن کی موجودگی میں آج سول نافرمانی اور عدم ادائیگی محاصل کی مہم شروع کی جا رہی ہے، ہمیں خود مہاتما جی کے عصائے موقع کی موزونیت اور مہم کی معقولیت کی پیمائش کرنی چاہئے، ۵ سال ہوئے انہوں نے اپنے کانگرس کے خطبۂ صدارت میں کہا تھا:-

> دسمبر ۱۹۲۱ء میں ہم نے تشدد کا جواب سول نافرمانی سے دیا تھا اور حکومت کو دعوت دی تھی کہ جور و استبداد میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھے، لیکن آج ہم اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں، ہم سول نافرمانی کے لئے تیار نہیں ہیں، البتہ ہم اس کی تیاریاں شروع کر سکتے ہیں، سول نافرمانی کی تیاری کے معنے ہیں ڈسپلن ضبط نفس، عدم تشدد، پُرامن مقابلہ، قلبی اتحاد، اور اول و آخر خدا کے ان احکام کی بلا کسی قسم کے پس و پیش کی تعمیل جو ہمارے علم میں آ چکے ہوں، نیز انسانوں کے وضع کردہ ان توانین کی تعمیل جو احکام خداوندی سے مطابقت کھاتے ہوں، بدقسمتی سے ہمارے اندر وہ ڈسپلن یا ضبط نفس نہیں رہا جو ہمارے حصول مقصد کے لئے ضروری ہے، ہم یا تو تشدد پر اُتر آتے ہیں یا بُرائی کا مقابلہ کرتے وقت نفسانیت سے کام لینے لگتے ہیں، ہم میں کافی اتحاد و ارتباط بھی نہیں ہے، اور جن قوانین پر ہم عمل کرتے ہیں، خواہ وہ خدا کے بنائے ہوئے ہوں یا انسان کے، ان کی بدرجۂ مجبوری پابندی کرتے ہیں، نہ کہ برضا و رغبت ــــ موجودہ فضا سول نافرمانی کے لئے مناسب نہیں ہے اور سول نافرمانی ہی ایک غیر مرئی اور عدیم النظیر اسلحہ ہے جسے ایک مظلوم قوم استعمال کر سکتی ہے۔ اس اسلحہ کا بدل سوائے "تشدد" کے اور کوئی چیز نہیں ہے اور مجھے اندیشہ ہے، کہ موجودہ فضا میں تشدد سرایت کرتا جاتا ہے، ہندو مسلم فسادات کے ذریعہ ہم اسی کی ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں، جن

لیکن یہ ساری باتیں بیکار ہیں اگر مسلمان تعمیری کام کی طرف رجوع نہ ہوں بلکہ ہنگامہ آرائی کو پسند کرتے ہوں، اُن کو "آتشبازی کا تماشہ" دیکھنے والا نہیں بننا چاہئے، جمعیت خلافت کی مجلس عاملہ نے اپنے صدر کو اختیار دے رکھا ہے کہ جب کبھی ان کی رائے میں صورت حال ایسی نمودار ہو جائے کہ اس پر غور و فیصلہ کے لئے اجلاس خصوصی کا انعقاد ضروری ہو تو وہ خاص اجلاس مدعو کر سکتے ہیں جمعیتہ خلافت اس وقت مسلمانان ہند سے اپیل کرتی ہے کہ اراکین جمعیت کی موجودہ تعداد میں کم سے کم ۵ لاکھ ممبروں کا اور ۵۰ ہزار رضاکاروں کا اضافہ کر دیں، اس طرح جب وہ اپنی زندگی کا عملی ثبوت پیش کر دیں گے، تو وہ دوسروں کو بھی مجبور کر دیں گے، کہ ان کی انفرادیت تسلیم کر لیں، اور ان کے حقوق کا احترام کریں، اس لے بغیر ان کی حالت صرف "متابعین" کی سی رہ جائے گی، خواہ حکومت اجنبی ہو یا ہندوستانی، یہ تو خود مسلمانوں ہی کا فرض ہو گا کہ اپنے متعلق کوئی فیصلہ کریں، اور الفاظ کے بدلے عمل سے ثابت کریں کہ ان کو "آزادی" عزیز ہے یا غلامی ؎

ہمت بلند دار کہ نزدِ خدا و خلق

باشد بقدر ہمت تو، اقتدارِ تو

بیانِ واقعہ

گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے تھے، پہلی گول میز کانفرنس ان کی شرکت کے شرف سے محروم رہی تھی، اس اجتماع میں نمائندگان کانگرس کے علاوہ ہر سیاسی جماعت کے مندوب موجود تھے، لارڈ ارون (اب لارڈ ہالی فیکس) وائسرائے تھے، ان کے اصرار سے متاثر ہو کر، شخصی حیثیت سے محمد علی نے پہلی گول میز کانفرنس (سنہ ۱۹۳۰ء) میں شرکت منظور کر لی۔

بڑا نازک وقت تھا، ہندوستان کا ذرّہ ذرّہ محمد علی کا مخالف ہو رہا تھا، ہندو تو خفا تھے ہی، خود مسلمانوں کا نیشنلسٹ طبقہ شورِ اختلاف سے زمین و آسمان میں تزلزل پیدا کئے دے رہا تھا، اس وقت کے نیشنلسٹ مسلمان آج کے سے معتکف "بیت حزن" نہیں تھے، اس وقت ان کی چڑھی بارگاہ تھی، اور وہ اپنے حلق کی پوری طاقت اور اپنے قلم کا سارا زور محمد علی کے خلاف صرف کر رہے تھے۔

محمد علی کی زندگی اس وقت ابتلا کے سخت ترین دور سے گزر رہی تھی، مالی مشکلات کے سبب "ہمدرد" بند ہو چکا تھا، مسلم پریس کا بڑا حصہ ان کا مخالف تھا، اس لئے ان کے خلاف تو دفاتر طلسم ہوشربا تیار ہو رہے تھے، اور ان کے توضیحی، اور تشریحی، اور صفائی کے بیانات کے لئے، مخالف اخبارات میں کوئی گنجائش نہیں تھی، وہ محمد علی کا مذاق اڑا سکتے تھے، اس کی شخصیت پر ناروا، اور نازیبا حملے کر سکتے تھے، اس کے خلاف غلط بیانیوں، اور تہمت تراشیوں کا انبار تیار کر سکتے تھے، لیکن محمد علی کا جواب دعویٰ شائع کرنا کسی کو بھی گوارا نہیں تھا۔

صرف یہی نہیں، محمد علی کی جان ناتوان امراض و آلام کا مجموعہ بھی تھی، اس کی ایک آنکھ ناکارہ ہو چکی تھی، دوسری آنکھ کی بینائی جواب دے رہی تھی، گٹھیا کے اثرات بھی طاری تھے، ذیابیطس کے حملے بڑی شدت کے ساتھ ہو رہے تھے، دوستوں کا ـــــ اب دوست ہی کتنے رہ گئے تھے! ـــــ تقاضا تھا، کہ محمد علی آرام کریں، حکیموں، اور ڈاکٹروں کا حکم تھا کہ وہ کسی قسم کا ذہنی اور دماغی کام نہ کریں، عزیزوں کا اصرار تھا کہ وہ اتنے طویل سفر کا ارادہ ترک کر دیں، لیکن یہ کمزوریاں ایک مجاہد سے سرزد نہیں ہو سکتی تھیں، محمد علی ایک مجاہد تھا وہ دم توڑ رہا تھا، لیکن میدانِ جنگ میں جانے پر مچلا ہوا تھا!

ہندوستان کے مسلمان اس وقت تک پاکستان کے تخیل سے ناآشنا تھے، وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ہندو اکثریت کے دورِ حکومت میں ان کے حقوق محفوظ ہوں، تحفظِ حقوق کے سلسلہ میں، وہ نئی نئی تجویزیں اور تدبیریں سوچا کرتے تھے۔

اس وقت کی سیاسیات میں سب سے بڑا اور لاینحل مسئلہ، انتخاب کا تھا، مجالس آئین ساز اور بلدیات کا انتخاب مخلوط ہو یا جداگانہ؟ مشترک حلقہ ہائے انتخاب سے ہندو اور مسلمان کھڑے ہوں یا ہندو اپنے حلقہ سے، اور مسلمان اپنے حلقہ سے؟ جو قوم پرست تھے وہ کہتے تھے، مخلوط انتخاب رائج ہونا چاہئے جو فرقہ پرست تھے وہ جداگانہ انتخاب پر اڑے تھے، محمد علی نہ قوم پرست تھا نہ فرقہ پرست تھا، وہ صرف حق پرست تھا، وہ چاہتا تھا ہندو مسلمانوں کے حق پر ڈاکہ نہ ڈالیں، اور مسلمان ہندوؤں کا حق نہ غصب کر سکیں، اس لئے اس نے علالت اور بیماری کے باوجود، ذہنی اور دماغی اُلجھنوں کے باوجود، بستر علالت پر، پڑے پڑے۔ ایک اسکیم تیار کی، جو انتخاب کے معاملہ میں "حرف آخر" کہا جا سکتا تھا، اور آہ کہ یہی اس کی زندگی کا حرف آخر ثابت ہوا۔

کمزور دماغ اس بوجھ کو برداشت نہ کر سکا، وہ بستر علالت پہ لیٹے لیٹے یہ اسکیم ڈکٹیٹ کراتا رہا، اور یہ کام ختم ہوا تو اس کی زندگی کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی گل ہو گیا، دماغ کی رگیں پھٹ گئیں، اور تدبر و تفکر کا وہ سرچشمہ ہمیشہ کے لئے خشک ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ○

محمد علی کی اسکیم سے پہلے ان کے برادر بزرگ ضیغم اسلام مولانا شوکت علی کا تمہیدی نوٹ بھی درج کیا جاتا ہے، اس سے اس اسکیم کے ماحول کو سمجھنے میں اور زیادہ امداد ملے گی۔

رئیس احمد جعفری

ہوں بے ہراس یہ مجھے رکھیں کسی جگہ
ڈر ہو وہاں کہ تیری حکومت جہاں نہ ہو
قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

عرضِ حال
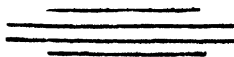
اس حقیقت سے ہر شخص واقف ہے کہ میرا بھائی اسلام اور ہندوستان کے مفاد کی خاطر نڈر اور انتھک کوششوں کے ساتھ ہمیشہ کام کرتا اور لڑتا رہا آخر میں اس کی بیماری نے تشویشناک صورت اختیار کر لی تھی، صحت جسمانی بد سے بدتر ہو چکی تھی، اور اس کے تمام دوست و اطباء اس کو متنبہ کر رہے تھے کہ وہ ہندوستان کو ایسی حالت میں نہ چھوڑے، جبکہ اس کی جان خطرہ میں ہو مگر اس نے کسی کی نہ سُنی اور انگلستان کو روانہ ہو گیا تاکہ وہ اس گول میز کانفرنس کی کاروائی میں شریک ہو جو ہندوستان و انگلستان اور اس کے ملحقین کے درمیان ایک صحیح اور باعزت سمجھوتہ کے لئے منعقد کی گئی تھی، محمد علی نے اپنے دوستوں اور طبی مشیر کاروں کی تنبیہ کا صرف یہ جواب دیا کہ ایک سپاہی کا فرض ہے کہ جب اس کا مذہب و ملک خطرہ میں ہو تو اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اپنے فرض منصبی کو پورا کرے خصوصاً ایسی حالت میں جبکہ اس کے چند ساتھی اس سے برگشتہ ہو گئے ہوں، اور ان کا ایک اہم گروہ اس کے مشورے سے انکار کر دے، اور اس لائحہ عمل کو قبول نہ کرے جس کو تمام مختلف الآرا مسلمانوں کی ایک زبردست اکثریت نے بالاتفاق منظور کر لیا ہو، محمد علی نے کہا کہ میں اپنی ساری زندگی کام کے لئے زندہ رہا، اور اس وقت اپنے آرام و صحت کی خاطر کام سے منہ موڑ لینا ایسا فعل مجرمانہ ہو گا، جو صرف نامردوں اور بزدلوں کے لئے موزوں ہے۔

وائسرے ہند لارڈ اروِن کے خلوص اور نیک نیتی پر اس کا یقین تھا اس لئے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ہندوستانی شہزادگان، لبرل جماعت، اچھوت جماعت، اور مسلم پبلک کی کثیر جماعت کے مطالبات کی تائید میں اپنی آواز بلند کرے، برطانوی پارلیمنٹ اور برطانوی لوگوں کی طرف سے اتحادِ عمل کی اس کو کچھ زیادہ امید نہ تھی پھر بھی اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب آخری مرتبہ ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کو برطانیہ کے سامنے پُرزور الفاظ میں صفائی کے ساتھ بیان کر دیا جائے تاکہ وہ پہلے ہندوستان جنت نشان کی تبدیل شدہ حالت کا صحیح طور سے اندازہ کر لیں، اس کے بعد بھی اگر وہ اپنی پرانی غلط پالیسی پر عامل رہیں اور ہندوستانیوں کے ساتھ بے اعتمادی کا برتاؤ کرتے رہیں تو ان کو اختیار ہے۔

بدقسمتی سے انڈین نیشنل کانگرس نے مہاتما گاندھی اور اُن کے ساتھیوں کی قیادت میں پُرانے رفقائے کار کی تنبیہوں اور مشوروں کو نظر انداز کرتے ہوئے تحریک سول نافرمانی پورے زور شور کے ساتھ جاری کر دی جو حکومت برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ سے کسی طرح کم نہ تھی، اور جس نے اپنے اُن ہم وطنوں کو بھی محفوظ نہ چھوڑا، جو اس سے اختلاف رائے رکھتے تھے، محمد علی بہادر

تھا اور اس کو اپنے یقین کامل پر پورا بھروسہ تھا، صداقت و حق گوئی کی راہ سے کوئی زبردست سے زبردست طاقت اس کا منہ نہیں موڑ سکتی تھی، ذاتی خطرات کی وہ ذرہ برابر پرواہ نہ کرتا تھا، اور اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ صلح و آشتی کے حصول میں اپنی جان تک کی پرواہ نہ کرے گا، اخبارات کا ایک فرقہ اور جماعتی پروپیگنڈا کرنے والوں کا ایک گروہ محمد علی پر لعن طعن کرنے میں برابر مشغول رہا، اس مسلسل مخالفت نے محمد علی کو مضبوط سے مضبوط تر بنا دیا، خدا کے فضل و کرم سے مسلم جماعت اس کے ساتھ تھی، اور وہ باوجود اپنے بہت سے کمزور اور نرم دل ساتھیوں کی مخالفت کے بہادری کے ساتھ تن تنہا لڑتا رہا، اور اپنی پالیسی کی جرأت، خوش مزاجی، اور عقلمندی کے ساتھ حمایت و تائید کرتا رہا، کام کی سختی نے اس کو ہلکان کر دیا، اور اس نے خوشی خوشی آخری وقت تک لڑتے ہوئے اپنی جان عزیز قربان کر دی، میرے خیال میں وہ اپنی موت سے ایسا کام کر گیا ہے جو اگر آج وہ زندہ ہوتا اور پر مغز لیکچر و خطبات دیتا ہوتا یا اخبارات میں بہترین مضامین لکھتا ہوتا تو تب بھی نہ کر سکتا۔

تمام حضرات سے میری گزارش ہے کہ وہ ان پیش کردہ چند صفحات کو جس میں محمد علی نے اپنے دلی مقاصد کا اظہار کیا ہے، صفائی قلب، احتیاط اور توجہ کے ساتھ پڑھیں، محمد علی اپنے خدا کو منہ دکھانے جا رہا تھا، اور اس کی جیسی طبیعت والا آدمی مرتے وقت جھوٹ نہیں بول سکتا، محمد علی بڑا زبردست انشا پرداز تھا، اور اس کا طرز تحریر پُر مغز و پُر مذاق، ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیشہ نہایت زوردار، اور دلچسپ بھی ہوتا تھا، مگر ان پیش کردہ صفحات میں بہت سے دوست محسوس کریں گے کہ اس کا طرز تحریر بہ غیر معمولی طریقہ سے سادہ اور دل سوز ہے اور تمام لوگوں کو موجودہ صورت حال کی سنجیدگی کو اچھی طرح محسوس کرنے کے لئے آخری مرتبہ متنبہ کر رہا ہے، برطانیہ اور برطانوی لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی ہندوستان کے ۳۵ کروڑ نفوس کی آئندہ بہتری و خوش حالی موجودہ صورت حال کی پیچیدگیوں کو رفع کرنے پر موقوف ہے۔

محمد علی نے مخلوط انتخاب کی موافقت کی تھی، اور ۱۹۲۷ء و ۱۹۲۸ء میں مسلمانوں کی اکثریت کو مشترکہ انتخاب کے (جو ان کے لئے محفوظ رکھا گیا تھا) ترک کرنے پر راضی کر لیا تھا، اس وقت بدقسمتی سے مہا سبھائی ہندوؤں کی طرف سے ہی نہیں بلکہ کچھ نام نہاد قوم پرست رفقائے کار کی طرف سے بھی غیض و غضب اور غیر رواداری کا اظہار کیا گیا، مگر محمد علی نے اس کی پرواہ نہ کی، اس نے اچھی طرح مسلمانوں کی اکثریت کے مشترکہ انتخاب کے مطالبہ کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا مسلم جماعت ہندوؤں کی (جو ہندوستان میں ۷۵ فی صدی ہیں) ایمانداری، راست بازی، اور انصاف پسندی پر اعتماد نہیں کر سکی، مسلمانوں کو ہندوؤں کی جماعت کے متعلق یہ شبہ ہوا کہ وہ فیاض طبیعت نہیں ہے، کیونکہ خود اپنے لاکھوں ہم مذہبوں کے ساتھ وہ جماعت ایسا برتاؤ کر رہی تھی اور ان کو ایسے حقوق کے دینے سے بھی انکار کر رہی تھی، جو کتوں، گھوڑوں، بکریوں اور بھینسوں تک حیوانوں کو دئے جاتے ہیں، ان حیوانوں میں گائے کو شامل کرنا تو محض بے کار ہے، کیونکہ وہ تو مقدس سمجھی جاتی ہے، اور سب لوگ اس کی پوجا کرتے ہیں۔

محمد علی یہ چاہتا تھا کہ وہ تعصب سے بھری فرقہ وارانہ ذہنیت کا خاتمہ کر دے، اس لئے اس نے صورت حالات کی مشکلات کا اندازہ کرتے ہوئے مشروط مخلوط انتخاب کی ایک ایسی صورت پیش کی جو ہر ہندو اور مسلمان کو مجبور کرے گی کہ

وہ اپنے انتخاب کے لئے دونوں مذاہب کے پیروں کے پاس جائے اور اس طرح پر آپس کی اخوت کو بڑھانے کے ساتھ ساتھ ایسے آدمی کو منتخب نہ ہونے دے جو کٹر متعصب اور فرقہ پرست ہو، اس طرح پر ایسے لوگ منتخب ہوسکیں گے جو ہندو اور مسلمان دونوں کے پسندیدہ ہوں گے، اس طریقہ سے اکثریت اور اقلیت دونوں مطمئن ہوسکیں گی، اور تنگ دلی فرقہ وارانہ تعصب کا جو آجکل اکثر قوم پرستی اور حب وطن کے جامہ میں نظر آتا ہے، سد باب ہوجائے گا، میں مہاتما گاندھی، انڈین نیشنل کانگریس، اور تمام ہندوؤں سے التجا کرتا ہوں، کہ وہ مادر وطن کے ایک بڑے بہادر اور قابل سپوت کی وصیت کو غور سے سنیں، اور اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں، جس نے میدان جنگ میں آخر وقت تک لڑتے ہوئے خوشی خوشی جان قربان کی ہے۔

بدقسمتی سے انگلستان میں اس کی صحت اس درجہ خراب ہوگئی تھی کہ وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور تھا، پھر بھی میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ وہ آخر وقت تک اپنے جسمانی درد و تکلیف کے باوجود اپنے فرض منصبی کی انجام دہی میں چاروں طرف مارا مارا پھرتا رہا، اگر اس نے احتیاط کے ساتھ ٹھنڈے دل سے کام کیا ہوتا تو ممکن ہے فائدہ زیادہ اور نقصان کم ہوتا مگر موجودہ بے چینی و غلط فہمی کے دور میں آرام و سکون اس کے لئے نا ممکن الحصول تھے، بہرحال جو کچھ اس سے ہوسکا وہ اس نے کیا، اور آخر میں ایک بہادر سپاہی کی طرح ہلتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہوگیا، اس کے آخری الفاظ میری گویائی سے کہیں زیادہ ہیں، اور میں پوری امید رکھتا ہوں کہ انگریز، سکھ، اور ہندو، ان کو غور سے پڑھیں گے میری دعا ہے کہ خدا محمد علی کے آخری پیغام سے ان تمام لوگوں کے دل نرم کردے اور ان کو اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ صحیح صلح کے لئے تیار ہوجائیں، مجھ کو بخوبی معلوم ہے، کہ وہ تمام محمد علی کی عزت کرتے تھے، اور اب اس کے مرنے کے بعد اور بھی زیادہ عزت کرتے ہیں، جہاں تک مسلمانان ہند یا مسلمانان عالم کا تعلق ہے ان کا تو وہ عزیز ترین محبوب تھا، مذہب اسلام کے ساتھ محمد علی کا شغف اور اس دین متین کی خاطر اس کی سرفروشانہ کوشش ہر مسلمان کے دل میں محمد علی کے لئے گھر بنا گئیں ہیں، مسلمانان ہند کے مفاد کی خاطر محمد علی کی اندرون ہند و بیرون ہند کوششیں ایسی تھیں جن کا انعام آج اس کو مل رہا ہے، سب لوگ اس سے محبت رکھتے تھے، اور آج اس کی جدائی پر ماتم کناں ہیں مجھ کو یقین کامل ہے کہ یہ پیش کردہ صفحات جو محمد علی نے اپنے خون سے لکھے تھے ہر شخص پر خاطر خواہ اثر کریں گے۔

ماہرین فن اطبا نے مجھ سے کہا کہ محمد علی کی موت قلب کے رک جانے یا گردہ کی تکلیف سے نہیں ہوئی بلکہ اس کا اصلی سبب یہ تھا کہ آخری یادداشت کے لکھانے میں اس کے دماغ پر اس قدر غیر معمولی زور پڑا کہ دماغ کی رگیں پھٹ گئیں، ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ دماغ میں کئی دن پہلے سے خون بہہ رہا تھا اور اس غیر معمولی کام کی وجہ سے فالج کا اثر ہوگیا، جس کے سبب صبح سات بجے اُٹھنے کے بعد سے وہ کچھ بات چیت نہ کرسکے، اور بالآخر ۴ جنوری کی صبح کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے، آخری مرتبہ بے ہوش ہونے سے قبل محمد علی دو گھنٹہ تک نواب سر عبد القیوم صاحب سے صوبۂ سرحد کی اصلاحات کے متعلق باتیں کرتے رہے، اور مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ کسی مفاہمت کو اس وقت تک تسلیم نہ کریں، جب تک کہ اس میں ہندوستان کے بہادر ترین فرزندان توحید یعنی صوبۂ سرحد کے بھائیوں کے مطالبات پورے نہ ہوں، اس کے علاوہ دو گھنٹہ تک سر شاہ نواز

بھٹو سے صوبہ سندھ کے متعلق باتیں کرتے رہے، اس صوبہ سے ان کو سب سے زیادہ محبت اس لئے تھی کہ ہندوستان میں اسلام یہیں سے داخل ہوا تھا، باقی دو گھنٹہ لاہور کی ایک بہن بیگم عزیز کے ساتھ گفتگو کرتے رہے، غرض اس طرح پردہ مرتے دم تک بہادر مجاہد کی طرح کام کرتے ہوئے رحلت کر گئے، خدا مرحوم کی روح کو جوار رحمت نصیب کرے، اور اس کے رفقاء کار کو اس بات کی توفیق دے کہ وہ اس کے آخری مشورہ کو قبول کریں۔

آج محمد علی بیت المقدس میں حرم شریف کی ارض پاک میں آرام سے سو رہا ہے، لکھو کھا بہادر عرب اپنے بہادر بھائی کی بہادر موت سے چوکنا ہو کر سرگرم عمل ہو گئے ہیں، مجھے اس بات کا پورا طرح یقین ہے کہ صلح کی خاطر محمد علی کے جان دینے نے انگریزی قوم کے دلوں پر بہت اچھا اثر کیا ہے، کیونکہ ان کو اچھی طرح علم تھا کہ محمد علی حکومت کا سرکش و باغی اس لئے تھا کہ وہ حکومت اسلام اور مادر وطن کے ساتھ غیر دوستانہ برتاؤ رکھتی تھی۔

اب میرے خیال میں انگریزی قوم کے افراد کے دلوں میں ایک حقیقی تبدیلی پیدا ہو گئی ہے، اور اس وقت میں کھلے الفاظ میں ان کی اس ہمدردی اور مہربانی کا اعتراف کرتا ہوں جو انہوں نے میرے بھائی کی موت کے وقت بیگم محمد علی، میرے اور ہمارے خاندان کے ساتھ برتی ہے، جب اجنبی قوم کی طرف اس طرح کا برتاؤ ہوا تو مجھے اپنے ہندوستان کے ہندو، سکھ، اور مسلمان بھائیوں کی طرف سے اور بھی کچھ زیادہ کی امید ہے، محمد علی آخر وقت تک ایک باعزت صلح کے لئے لڑتا رہا، اور اب میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ اس کام کو پورا کئے بغیر چین نہ لوں گا، اور اسی ذریعہ سے محمد علی کی روح پرفتوح کو آرام و سکون نصیب ہو سکے گا، میری ہر مسلمان مرد اور عورت سے درخواست ہے کہ وہ اس مشکل کام میں میری مدد کرے، خداوند تعالیٰ سب سے مضبوط اور طاقتور ہے، اور ہم اسی کے بھروسہ پر کام کر رہے ہیں وہ انشاء اللہ ہمیں فتح یابی نصیب کریگا۔

اب وقت آگیا ہے کہ تمام مختلف الرائے بھائی یکجہتی سے آگے بڑھیں، اور اندرون ہند و بیرون ہند اسلام کے علم کو بلند کریں، اس میں شبہ نہیں کہ سامنے خطرات موجود ہیں، مگر خطرات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے لئے ہی مسلمان پیدا کیا گیا ہے، اگر ہمت باندھ کر آگے بڑھیں تو خدائی امداد ہمیشہ ہمارا ساتھ دیگی اب الفاظ و تقاریر کا وقت نہیں ہے، کام اور متحدہ کام ہی میں ہماری نجات مضمر ہے، میں اپنے امیر و غریب سب بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ آگے بڑھ کر ہماری تاریخ کے اس نازک دور میں تنظیم المسلمین کے کام میں ہماری مدد کریں، اپنے امیر بھائیوں سے میں خاص طور پر کہوں گا، کہ وہ ہمارے اور ہمارے اسلام کے خطرہ میں گھرے ہونے کے وقت مبہوت نہ ہو جائیں، بلکہ خدا پر بھروسہ کر کے دامے درمے امداد کریں، خدا سب کی مدد کرے۔ آمین

شوکت علی خادم کعبہ

دریا گنج دہلی

۳۰ مارچ ۱۹۳۱ء

آخری مشورہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لندن، ہائڈ پارک ہوٹل، یکم جنوری ۱۹۳۱ء

جنابِ والا۔

جیساکہ میں نے کانفرنس کے اجلاس میں کہا تھا، میری صحت اتنی خراب ہے، کہ میں گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے سفر کرنے کے کسی طرح قابل نہ تھا، خاص کر جیساکہ میرے ڈاکٹر آپ کو بتا سکتے ہیں، اور اُن تردداتکو برداشت کرنے کے بالکل ہی قابل نہ تھا، ۱۹ دسمبر کو میں بیہوش ہوگیا، اور ۴ گھنٹہ سے زیادہ بے ہوش رہا، میری نبض کی رفتار ۱۰۰ ہ حرارت صرف ۹۷، جو اور بھی کم ہو کر ۹۵ رہ گئی تھی اور میرا تنفس ۳۰ تھا، اس حالت میں بھی جس کام کے لئے میں یہاں آیا تھا، اُس کے کرنے کی خواہش میرے اندر اس قدر قوی تھی، کہ میں نے لارڈ چانسلر کو ۸ بجے شام کو ناشتہ کی دعوت دی، یعنی شام کے وقت کو صبح کا وقت سمجھا! دوسرے دن انہوں نے کرم فرمایا، لیکن میرے بھائی نے اُن کو صرف دس منٹ کے لئے مجھ سے ملنے کی اجازت دی، اور اس مختصر وقت میں بھی نہایت دشواری کے ساتھ اپنے خیالات اُن پر ظاہر کرسکا۔

چونکہ میری یہ خواہش تھی کہ میں ہز مجسٹی کی گورنمنٹ اور پارلیمنٹ کے نمائندوں اور نیز ہندوستانی نمائندوں (جو میرے خیالات سے کسی حد تک واقف بھی تھے) کو اپنے خیالات سے مطلع کرنے کے لئے اُن خیالات کو حیطۂ تحریر میں لے آؤں، اسی لئے میں نے آپ سے یہ درخواست کی تھی، کہ آپ مہربانی فرماکر میرے پرانے دوست سرجوفری کاربیٹ جن سے میری دوستی چھندواڑہ میں شروع ہوئی تھی میرے پاس ہوں تاکہ اُن کی موجودگی میں اقلیتوں کے متعلق جن کی کمیٹی کا میں ممبر ہوں، میرے خیالات قلمبند کرلئے جائیں۔

سب سے پہلے میں یہ کہنا چاہتا ہوں، کہ ہندو مسلم سوال کا نام اقلیتوں کا سوال رکھنا بالکل غلط ہے، ہندوستان میں بلاشبہہ کچھ اقلیتیں ضرور ہیں، اور یقیناً ہم کو ان کے لئے ایسا انتظام کرنا چاہئے کہ وہ یہ محسوس کریں کہ آئندہ حکومت ہند، بعض ایک یا دو، اقوام کی حکومت نہ ہوگی، بلکہ تمام ہندوستانیوں کی حکومت ہوگی جس میں ذات اور عقائد کا امتیاز باقی نہ ہوگا، تاہم اپنی حکومت کے متعلق اہل ہند کی ذمہ داریوں کے راستے میں ایک مشکل ضرور ہے، اور وہ ان اقلیتوں کا سوال نہیں ہے۔ بلکہ ان گہرے اختلافات کا سوال ہے جو ہندو اور مسلمانوں کے درمیان موجود ہے، یہ حقیقت اس قدر واضح ہے کہ مجھے تاریخی حالات

بے شمار اور اعداد بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن میں ایک دو باتیں خاص طور پر زور دے کر بیان کر دینا چاہتا ہوں، جس سے یہ ظاہر ہو جائے گا کہ ہندو مسلمان کا سوال اقلیتوں کے سوال سے بالکل مختلف ہے، سب سے اول یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمان ہندوستان پر آٹھویں صدی کے آغاز سے ۱۹ ویں صدی کے وسط تک، کسی نہ کسی صورت میں اور ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں حکومت کرتے رہے، اسلام اور اتنے عرصہ تک کسی دوسری قوم نے ہندوستان میں حکومت نہیں کی، سکھوں کی ایک نسل نے تنہا پنجاب کے صوبہ پر کچھ روز حکومت کی، یہ حکومت محض ایک اتفاقی واقعہ تھا، میرا یہ مطلب نہیں کہ میں سکھوں کی شجاعت پر حرف رکھوں، درانحالیکہ میں پنتھ کے نظام کو بہت احترام کی نظر سے دیکھتا ہوں، اسی طرح مرہٹوں کی لوٹ مار، اور ان کی متحدہ دروبست ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کے ہم پلہ نہیں ہے، اس کے بعد خواہ فوجی فتوحات یا سیاسی چالاکیوں کے ذریعہ سے اسلامی حکومت آخر کار مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر برطانیہ کے ہاتھ میں گئی، سوائے بعض ہندوستانی ریاستوں کے جو عہد قدیم سے ہندوؤں کی مخصوص ریاستیں ہیں، اور جو اپنی نسل کا سلسلہ چاند سورج سے تبلاتے ہیں، ان ہندو ریاستوں کا تعلق مسلمانوں کی حکومت کے ساتھ جو کچھ بھی رہا ہو، لیکن اس میں تو ذرا شک نہیں کہ ان ریاستوں نے ہمیشہ اسلامی حکومت کے ساتھ گہری وفاداری کے عقائد وابستہ رکھے اور ان کو اپنے معاملات میں ایسی آزادی حاصل رہی جس سے برطانوی اقتدار کے زمانہ میں وہ محروم ہو گئیں ان کے علاوہ بعض ریاستیں وہ ہیں جو مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد پیدا ہوئیں، اور برطانوی حکومت نے اس کے وجود کو تسلیم کر لیا، بعض ریاستیں مثلاً حیدرآباد کمپنی سے ابتدائی معاہدوں کے وقت، بجائے خود کمپنی کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑی اور زیادہ طاقتور تھیں، لیکن وہ کمپنی کی وفادار اتحادی بن گئیں، بعض ایسی تھیں جو کمپنی سے چھوٹی تھیں، بہرحال اس بحث سے مجھے فی الحال کوئی تعلق نہیں۔

میں صرف یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ صحیح یا غلط طور پر مسلمانوں نے ہندوستان پر کسی نہ کسی صورت میں اور ملک کے کسی نہ کسی حصہ پر، آٹھویں صدی سے ۱۹ ویں صدی تک اس طرح حکومت کی کہ کسی دوسری قوم نے کبھی نہیں کی، اس واقعہ کا نہایت اہم نتیجہ جس سے ہم کو بحث کرنی ہے وہ احساس ہے، جو اسلامی حکومت کے اس طویل اور وسیع دور سے پیدا ہوا، ہندوستان میں مشکل سے کوئی قوم ایسی ہوگی جو عہد قدیم کے مسلمان حکمرانوں کے خلاف، صحیح یا غلط کوئی شکایت نہ رکھتی ہو، اور فطرت انسانی کا اقتضا جو ہر ملک کی تاریخ میں عیاں ہی ہے کہ بعض ہندوؤں اور بعض دوسری قوموں کے افراد کے دلوں میں مسلمانوں سے انتقام لینے کی خواہش موجود ہو، مگر مسلمانوں کے علاوہ دوسری قوموں مثلاً سکھ مرہٹہ، راجپوت وغیرہ کے خلاف اس قسم کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا، یہی احساس ہے جس سے ہم کو بحث کرنی ضروری ہے، اور جس کے متعلق ہمیں آئندہ کے لئے تحفظ کے ذرائع پیدا کرنے ہیں تاکہ ہندوستان کی آئندہ حکومت کا ایک ایسا دستور العمل بنایا جائے جس میں تمام قومیں محسوس کریں کہ وہ محفوظ، مساوی اور آزاد ہیں، دوسرا قابل غور سوال یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اس قسم کی اقلیت نہیں ہیں جس معنی میں کہ جنگ کے بعد یورپ میں یہ لفظ استعمال ہو رہا ہے، "جمعیت اقوام" یورپ کی اقلیتوں کا انتظام کرتی ہے، مگر ہمارے ہندوستانی فضلاء اور پروفیسر "جمعیت اقوام" سے اقلیتوں کے متعلق اصول کار عاریتاً لاتے ہیں، اور اسی کے طرز عمل اور طریقہ حکم برداری کی پیروی کرنا چاہتے ہیں، اور اس طرح جینوا میں بیٹھ کر ہندوستان کی رہنمائی کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ خود ہندوستان جینوا کی بہتر رہنمائی کر سکتا ہے، ایک ایسی قوم جو تنہا ہندوستان میں ، کروڑ سے زیادہ ہے، بآسانی اس معنی میں اقلیت نہیں کہلائی جا سکتی جس مفہوم میں یہ لفظ

جینوا میں استعمال ہوتا ہے، جبکہ ساری دنیا میں یہ قوم ۲۰ کروڑ کے قریب ہے اور اس کا مطمع نظریہ ہے کہ دنیا کی بقیہ اقوام کو اپنے طرزِ خیال اور اپنے نظریہ کا مقصد بنالے اور جو ایک عدیم المثال اخوت کی مدعی ہے، ایسی قوم کو اقلیت کے نام سے پکارنا محض لغو ہے۔

ان دو خاص نکات کو پیش نظر رکھ کر اب ہم کو چاہئے کہ اصل بحث پر غور کریں، گول میز کانفرنس کے ایک ہندو ممبر نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ دونوں قوموں کے درمیان وزیر اعظم ثالث بن جائیں، اس تحریر میں بلاشبہ وزیر اعظم کی تعریف و توصیف مضمر تھی، لیکن اُن کی پوزیشن کو اس تجویز نے بہت نازک بنا دیا اور اس لئے انہوں نے شکریہ کے ساتھ اس تجویز کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، مجھے یقین ہے کہ انہوں نے اس تجویز کے اندرونی منشا کو خوب سمجھ لیا ہوگا، اسی طرح ہم نے یہ تجاویز بھی سُنی نہیں کہ اس معاملہ کو "جمعیت اقوام" کے سپرد کر دیا جائے، اس کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ ہندوستان کے گندہ لباس کو ساری دنیا کی نظروں کے سامنے دھویا جائے، بحالت موجودہ ہم کو تو اس واقعہ نے کافی بددل کر دیا ہے کہ گول میز کانفرنس کو ہندوستانی فرقہ بندیوں کا "دھوبی تلاؤ" بنا لیا گیا یہ سوال تو درحقیقت ہندوستان ہی میں طے ہونا چاہئے تھا ہم نے دس برس تک ہر قسم کے گرم و سرد میں گاندھی جی کے ساتھ کام کیا اور یہ چیز ہم نے بار بار اُن کے سامنے پیش کی، لیکن ہندوؤں میں اپنی اور پنڈت موتی لال نہرو کی ہر دلعزیزی قائم رکھنے کے خیال نے کبھی سمجھوتہ نہ ہونے دیا، جب ۱۹۲۸ء میں باوجود ہماری پُرزور درخواست کے کانگرس نے ہندو مسلم سمجھوتہ نہ کرایا تو سر تیج بہادر سپرو نے، انتہائی کوشش کی کہ ہندو مسلمانوں کا سمجھوتہ ہو جائے اور سر پیٹر دھی اس کے بہت خواہشمند تھے، لیکن ہندو مہا سبھا نے گو کہ شروع میں یہ ظاہر کیا کہ وہ اعتدال پسندوں اور مسلمانوں کی اس خواہش میں شریک ہے، لیکن بہت سے جلسوں کو ملتوی کراتے کراتے آخرکار بمبئی کی کانفرنس میں حصہ لینے سے بالکل ہی انکار کر دیا، اور ڈاکٹر مونجے نے تو صاف طور پر اپنا یہ خیال ظاہر کر دیا کہ گول میز کانفرنس سے پہلے سمجھوتہ کی کوشش کرنے کے لئے وہ تیار نہیں، کانگرس نے ہندو مہاسبھا کی متابعت کی، اور گول میز کانفرنس میں شرکت ہی سے انکار کر دیا، حالانکہ دستور اساسی کے تیار ہونے سے پہلے یہ سمجھوتہ ضروری تھا، مہاسبھا کے تین ممبر گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے لیکن انہوں نے بھی باوجود ہندو مسلمان اعتدال پسندوں کی انتہائی کوششوں کے ایک سمجھوتہ نہیں ہونے دیا ہے، مجھے اس کے کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان لوگوں نے ہندو مسلمانوں کے درمیان سمجھوتہ کی گفتگوؤں میں اور نیز وزیر اعظم سے گفت و شنید میں کتنا وقت ضائع کیا ہے، میرے خیال میں خود وزیر اعظم اس کا بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں، مگر اب کہ ضابطہ کی ایک کمیٹی اس غرض کے لئے بنائی گئی ہے، یہ ضروری ہے کہ سمجھوتہ کی بحث کو صاف طور پر بیان کر دیا جائے۔

سب سے پہلے نہایت سنجیدگی کے ساتھ اور دوستانہ طریقہ پر میں وزیر اعظم کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں، کہ یہ سوال محض پنجاب یا بنگال کا نہیں ہے، جیسا کہ بظاہر وہ سمجھتے ہیں نہ یہ سوال ہے پنجاب میں ۱۰۱ کے بجائے سو کر دینے کا یا اسی قسم کے کسی تغیر کا، جیسا کہ وزیر اعظم کا خیال اُس وقت معلوم ہوتا تھا، جس وقت وہ چیکرس میں سمجھوتہ اور صلح کی کوشش کر رہے تھے، جیسا کہ میں نے عام کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے بتایا تھا، اصل سوال یہ ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں

پہلی دفعہ ہم اکثریت کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں مگر وہ لوگ جو ہزار سال سے تمام نام نہاد ہندوؤں کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھتے تھے، اب نہیں چاہتے کہ کوئی اکثریت ہندو یا ہندوستانی ایسی ہو جس کو وہ اسی طرح اپنے زیر اقتدار نہ رکھ سکیں، جیسا کہ ہزارہا سال تک رکھ چکے ہیں، مگر ایک فرق ضرور ہے وہ میں کہہ دوں، سر جان سائمن نے سر ویلنٹائن چرول کے حوالہ سے برہمنوں کے اقتدار کا ذکر کیا ہے اور وہ ذکر کسی قدر بعد از وقت ہے، برہمنوں نے کم از کم اتنا تو کیا تھا کہ عوام کو تعلیم دی ہے اور یہ خیال، غلط ہی سہی، اُن کو ضرور تھا کہ اُن کے ذریعہ سے عاقبت میں لوگوں کو نجات حاصل ہوتی ہے، مگر اب جو فرقہ اجارہ دار ہے اور چاہتا ہے کہ تمام ہندو قوم کی قسمت کا فیصلہ اپنے ہاتھ میں رکھے، جبکہ وہی قوم اکثریت رکھتی ہے، اس فرقہ سے نہ ڈاکٹر مونجے اور نہ راجہ نریندر ناتھ تعلق رکھتے ہیں، بلکہ وہ فرقہ بنیئے کا فرقہ ہے، جو نہ اپنی نجات عاقبت کو سمجھتا ہے، نہ اس دنیا میں کسی قوم کو تعلیم دینے کا خیال رکھتا ہے، میں شاید ہر ہندوستانی سے زیادہ اس کا خواہش مند ہوں کہ غیر ملکی اقتدار ختم ہو جائے، یعنی (اگر مجھے یہ کہنے کی اجازت) وہ اقتدار ختم ہو جائے جو ایک "دکانداروں کی قوم" نے ہماری قسمتوں پر حاصل کر لیا ہے، لیکن جیسا کہ میں نے گول میز کانفرنس کے دعوت نامہ کے جواب میں ہز اکسیلنسی وائسرے کو لکھا تھا میں ہرگز نہیں چاہتا کہ غیر ملکی "دکانداروں" کے بجائے خود اپنے ملک میں "دکانداروں" کے ایک ملکی فرقہ کو اپنی قسمتوں پر حاوی کر دیا جائے میرے خیال میں بہت سی سیاسی بے چینی کو مالی امداد ایک حد تک ذاتی اغراض کے لئے بمبئی اور گجرات کے بنیوں سے مل رہی ہے، اور گو کہ میں نے ہمیشہ ایک شلنگ چار پینس اور ایک شلنگ ۶ پینس کے نرخ تبادلہ کا مذاق اڑایا ہے۔ لیکن ان تو سیاسی جنگ، ہندوستان کی آزادی کے لئے اس قدر نہیں ہے، جس قدر کہ شرح تبادلہ کے لئے ہے، یہ جنگ بھی خواہ کتنی ہی بجا اور حق پر ہو مگر وسیع معنی میں یہ جنگ ہندوستان کی آزادی کی جنگ نہیں ہے۔

اب ہندو مسلم مسئلہ کو لیجئے، یہ کسی صوبہ کا سوال نہیں ہے، ہر صوبہ میں ہندو مسلمانوں کے محسوسات ایک دوسرے کے متعلق کم و بیش یکساں ہیں، تین نسلیں گزر چکیں، جب مسلمانوں کا اقتدار ہندوستان میں ختم ہوا تھا، انگریزوں نے یہ اقتدار زیادہ تر مسلمانوں سے حاصل کیا، اور کسی حد تک مرہٹوں سے، جو آخری زمانہ میں دہلی کے مغلیہ دربار کے سربراہ کار تھے، اور نیز کسی حد تک پنجاب کے سکھوں سے، جن کو خود انگریزوں نے پنجاب میں حکومت کرنے کی اس لئے اجازت دی کہ انگریز افغانستان سے جنگ کر رہے تھے، اب ہندوستان اس اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے، اور جیسا کہ دس سال پہلے ظاہر ہو چکا ہے، مسلمان اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے قربانیاں پیش کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہے، آج بھی کچھ مسلمان کانگرس میں شریک ہیں، لیکن یہ وہ لوگ ہیں جو یا تو اس مطالبۂ آزادی کی عادت سے مجبور ہو کر جو خود ہم نے دس برس پہلے پیدا کی تھی، کام کر رہے ہیں یا محض جنبش کا اتباع کر رہے ہیں، بہت سے مسلمان نافرمانی قانون کی تحریک سے اسی طرح الگ رہے جس طرح دس برس پہلے ترک موالات کی تحریک سے الگ رہے تھے، جبکہ ٹرکی کا معاملہ بھی الجھا ہوا تھا، اپنی اہمیت کو مبالغہ آمیز طور پر بیان کرنے کے بجائے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لوگ جن کا میں نے ذکر کیا جن میں سے بہت سے گول میز کانفرنس کے نمائندے بنائے گئے ہیں (خواہ ہز مجسٹی کی گورنمنٹ یا حکومت ہند، یا صوبوں کی حکومت نے ان کو نامزد کیا ہو) وہ نہیں ہیں جنہوں نے اپنے اثر سے مسلمانوں کو کانگرس کی شرکت سے روکا ہو، جیسے کہ دس سال پہلے انہوں نے روکا تھا۔

گوکہ یہ کہنا اچھا نہیں معلوم ہوتا مگر ہم کو کہنا پڑتا ہے کہ وہ ہم ہی تھے جن کو تقریباً ہر صوبہ میں لڑائیاں لڑنی پڑی تھیں، اور ہماری ہی کوششوں سے بہت سی جگہ مسلمان کانگریس کی شرکت سے باز رکھے جا سکے، ہم نے ان کو سمجھا دیا کہ گزشتہ تحریک گو کہ قومی تحریک تھی مگر موجودہ تحریک میں (مجھے افسوس ہے کہ میں اُن کی غیر موجودگی میں یہ بات کر رہا ہوں) گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو دونوں نے ہندو مہاسبھا کو خوش کرنے کے لئے اپنا سر جھکا دیا ہے، اب کہ ہم لوگ یہاں آئے ہیں، میں تنہا اپنی پارٹی کا نمائندہ ہوں، حالانکہ میں نے اس زمانہ میں جب یہاں آمد سے پہلے میں ہندوستان میں بیمار پڑا ہوا تھا، اور نمائندوں کا آخری انتخاب کیا جا رہا تھا، ہز ایکسلنسی وائسرائے سے اس باب میں بہت طویل خط و کتابت کی، تنہا میں ہی اپنی پارٹی کا نمائندہ منتخب ہو سکا، اور مسلمانوں میں سب سے زیادہ مجھ ہی سے اور بلا شبہ میرے بھائی سے لاکھوں مسلمان ہمارے واپس جانے کے بعد سوال کریں گے کہ ہم اُن کے لئے گول میز سے کیا لائے، ہم یہاں سے محض جداگانہ حق انتخاب ان کے لئے یا حرف "وپلیچ"، لے کر نہیں جانا چاہتے ہیں، اور اگر ہم کو یہ چیزیں نہ ملیں تو میں وزیر اعظم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان سول نافرمانی کی تحریک میں بلا تکلف شریک ہوں گے، ہم یا دوسرے مسلمان نمائندے کچھ ہی کریں اور کچھ ہی کہیں۔

ہندوستان کی آزادی "محض جداگانہ انتخاب" میں مضمر نہیں، گو کہ اس حیثیت سے کہ ۱۹۰۶ء میں میں اُن لوگوں میں سے تھا جنہوں نے "جداگانہ انتخاب" کے اصول کو پیدا کیا، میں اُس چیز کو ہاتھ سے دینے والا آخری شخص ہوں گا۔

مجھے عرض کر دینا چاہئے کہ "جداگانہ انتخاب" کا فائدہ کیا ہے، جداگانہ حلقۂ انتخاب مسلمانوں کو اس کا موقع دیتا ہے کہ وہ اپنے مقدمہ میں اپنی پسند کا وکیل مقرر کر سکیں، ہر عدالت میں فریق مقدمہ کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مقدمہ میں اپنی پسند کا وکیل مقرر کرے گو کہ کبھی کبھی گورنمنٹ کے خرچ سے بھی وکیل مقرر کیا جاتا ہے، مگر فریق مخالف کو کبھی اس کی اجازت نہیں ہوتی، کہ وہ دوسرے فریق کے لئے وکیل منتخب کرے، اگر جج آزاد اور منصف مزاج ہو تو ایک معتمد وکیل بالکل کافی ہوتا ہے، اور لارڈ مارلے اور منٹو نے ہمارے لئے اسی کا انتظام کیا تھا، اُس وقت لارڈ مارلے کے ذہن میں یہ خیال نہ تھا کہ ہندوستان میں پارلیمنٹ کے اصول پر برطانوی حکومت قائم کی جائے، اس وقت سرکاری ممبروں کا اجتماع موجود تھا حکومت ہند میں برطانوی اکثریت موجود تھی، اور وہ اسی لئے قائم رکھی گئی تھی کہ ہندوستان میں اس بات کو ظاہر کر دے کہ پارلیمنٹ کے قائم کرنے کا کوئی خیال نہیں ہے ہر قوم اپنا معاملہ جج کے سامنے پیش کرتی تھی، اور جج فیصلہ کرتا تھا، ہم جج پر کچھ اثر تو ڈال سکتے تھے، مگر نہ اس کی رہنمائی کر سکتے تھے، نہ ان کو مشورہ دے سکتے تھے، اس لئے صرف ایک معتمد وکیل کی ضرورت تھی، اور اس کا انتخاب ہم جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے ذریعہ سے کرتے تھے۔

لیکن اس حالت میں بھی، اتفاقیہ طور پر، قصداً نہ سہی، لارڈ منٹو نے نہ صرف موجودہ ضرورت کا انتظام کیا تھا، بلکہ آئندہ کے لئے بھی کچھ فکر کی تھی، جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب صرف مسلمانوں کی مزید امداد کے لئے بنائے گئے تھے، تاکہ جو کمی ہندو اکثریت کے مقابلہ میں رہ جائے اس کو پورا کریں لارڈ مارلے نے مشترک انتخاب میں مسلمانوں کو اُن کے حصہ سے محروم

نہیں کیا تھا، یہی خطرناک غلطی تھی، جو ہمارے ہندوستانیوں نے اصرار پر ۱۹۱۶ء میں بمقام لکھنؤ کی گئی جبکہ ہم دونوں بھائی چھندواڑہ میں نظربند تھے، اور لکھنؤ مسلم لیگ و کانگرس کی سیاسیات میں کوئی حصہ نہ لے سکتے تھے، آخرکار پہلی دفعہ "جداگانہ انتخاب" کا طریقہ مسلمانوں کی نیابت کا تنہا ذریعہ رہ گیا۔

دوسری خطرناک غلطی اُس وقت یہ کی گئی (جس کے لئے اب مسلمان ۱۴ برس سے رو رہے ہیں) کہ پنجاب اور بنگال کی مسلم اقلیت کو قلیل اکثریت سے بدل دیا گیا، اگر ہمارے دوستوں کی نظر مستقبل پر ہوتی تو وہ پنجاب کو کافی اور بنگال کو ارادی اور کمزور اقلیت نہ بنا دیتے، ان ہی غلطیوں کا ازالہ کرنے کے لئے گول میز کانفرنس منعقد ہو رہی ہے، اس نکتہ پر غلط فہمی کو راہ نہ دیجئے۔ اس نکتہ کو ہز مجسٹی کی گورنمنٹ اور وزیراعظم پہلے سے خوب سمجھ لیں، اس نکتہ سے مجھے اپنی بحث شروع کرنی چاہئے تھی، لیکن مجھے خوشی ہے کہ زمین کو سنگ بنیاد کے لئے صاف کر دینے کے بعد اب میں اس نکتہ پر پہنچا ہوں، اس بحث میں میں زیادہ وقت نہ لوں گا، اصل مسئلہ ہمارے سامنے یہ ہے کہ اُن صوبوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے خواہ قلیل ہو یا کثیر ان کو پورے حقوق دیئے جائیں اور ایسے صوبوں میں جہاں ان کی اقلیت ہے ان کے حقوق کو محفوظ کیا جائے اور ہندو قوم کے ساتھ منصفانہ طرزِ عمل اختیار کرنے کی غرض سے ہونا چاہئے کہ یہی عمل ہندو قوم کے ساتھ کیا جائے جس بات کی ضرورت ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر قوم کو ہر صوبہ میں جہاں وہ تعداد میں زیادہ ہو پورے حقوق دیئے جائیں، اور جہاں وہ تعداد میں کم ہے اُس کے تحفظ کا انتظام کیا جائے، مسلمان جو کچھ چاہتے ہیں وہ یہ ہے (اور یہی ۱۴ پوائنٹ کا لب لباب ہے، حق انتخاب جداگانہ اصل چیز نہیں ہے) کہ ہر جگہ فیڈرل گورنمنٹ ہو، تاکہ مرکزی حکومت جہاں ہندوؤں کی مستقل اکثریت ہوگی، اُن کو ہر موقع پر دبا نہ سکے، اور یہ کہ صوبوں کی فیڈرل گورنمنٹ میں مسلمانوں کو ہر جگہ ہندوستانی نائبین کی کل تعداد کم از کم ایک تہائی جگہیں دی جائیں، نیز یہ کہ پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلمانوں کی قلیل اکثریت ہے اور جہاں اُس اکثریت پر بنیوں، اور سکھوں اور ہندو زمینداروں کے اثرات حاوی ہیں، جیسی کہ بنگال میں حالت ہے، یہ اکثریت محفوظ کر دی جائے (ذاتی طور پر اگر صرف آئندہ ۲۰ برس کے لئے ایسا کر دیا جائے تو میں مطمئن ہو جاؤں گا) علاوہ بریں سرحدی صوبہ اور بلوچستان میں جہاں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہے، پوری اصلاحات مسلمانوں کو دی جائیں جو اب تک برطانوی فوجی اور سول اور نیز ہندوؤں کی قدرتی تنگ نظری کے باعث نہیں دی گئی ہیں) اور سندھ کو آسام کی طرح ایک علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے اور ان صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت اسی طرح محفوظ ہو جائے جس طرح ہندوؤں کی اکثریت دیگر صوبوں میں ہوگی، اگر نئے دستور کے ماتحت ان چند صوبوں میں مسلم اکثریت قائم نہ کر دی گئی، میں عرض کرتا ہوں، دھمکی نہیں دیتا، مگر نہایت ادب سے اور دوستانہ طور پر متنبہ کرتا ہوں کہ ہندوستان میں خانہ جنگی ہو جائے گی، اس حقیقت کے سمجھنے میں غلطی نہ کیجئے، یہ چار پانچ صوبے ہیں، جہاں مسلمانوں کو وہی قوت حاصل ہو جو ہندوؤں کو تمام دوسرے صوبوں میں حاصل ہوگی، اور ہندوؤں کا وہی تحفظ کیا جائے جو مسلمان اپنی اقلیت کے لئے مانگتے ہیں۔

پنجاب اور بنگال میں جہاں مسلم اکثریت صرف بقدر ۶ اور ۵ کے ہے یہ بالکل ناممکن ہے، سکھوں یا یورپین لوگوں کو اُن کی تعداد سے زیادہ کچھ حقوق دئے جا سکیں، اور نہ ان کو اس کی ضرورت ہے جیسا کہ میں ابھی واضح کروں گا "ویٹیج" دینے کا تمام منصوبہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ صرف دو صوبوں میں مسلمانوں کی قلیل اکثریت سے اُن کو محروم کر دیا جائے، ان دونوں

صوبوں میں رائے دینے کا حق چاہیے دونوں صوبوں کے لئے مساوی ہو یا نہ ہو، مگر مسلمانوں کی آبادی کے تناسب کے مطابق ہونا چاہیئے، رائے دینے کے حق کا سوال کوئی مذہبی یا شرعی مسئلہ تو ہے نہیں جس میں انتہائی سختی برتی جائے (خود کونسل آف اسٹیٹ کے موجودہ حق رائے دہندگی کو دیکھ لیجئے) ہر حال میں مسلمانوں کی جگہیں ۲۰ سال کے لئے اُسی آبادی کی نسبت سے محفوظ کر دی جائیں، اس لئے کہ وہ ہندو ساہوکاروں کے مقروض ہیں، اور نو دولت سکھوں کے بہت زیادہ زیر اثر ہیں، نہرو رپورٹ میں عام طور پر ہر بالغ کو حق رائے دہندگی دینے کی تجویز محض مسلمانوں کو بیوقوف بنانے کے لئے پیش کی گئی تھی، ایک سچے مسلمان سے زیادہ بالغوں کے اس حق کا حامی کوئی نہیں ہو سکتا مگر خوش قسمتی یا بدقسمتی سے بالغ مرد بھی ہوتے ہیں اور عورتیں بھی، لیکن آئندہ بیس برس تک کم از کم مسلمان عورتیں بالغہ ہو کر بھی ووٹ دینے گھر سے باہر نہ جائیں گی، خواہ کتنے اچھے پردہ کے انتظامات کیوں نہ کئے جائیں اور خواہ صرف پردہ نشین افسران ہی ان کی پرچہ اندازی کی نگرانی کیوں نہ کریں اس لئے ظاہر ہے کہ آریوں، اور پنجاب کے ہندو اور سکھوں کے مقابلہ میں مسلمان عورتیں نقصان میں رہیں گی، لہذا بالغوں کا عام حق رائے دہندگی اس وقت بالکل ناقابل توجہ ہے، پنجاب اور بنگال کے ان دو صوبوں میں مسلمانوں کے اس مطالبہ کے خلاف کہ کونسلوں میں ان کی تعداد ۵۲ اور ۵۵ فی صدی ہو، کوئی امر قابل توجہ نہیں ہو سکتا۔

سکھوں نے اپنی حکومت کے قلیل زمانہ میں پنجاب میں اس قدر زمین پر قبضہ کر لیا ہے، اور آج تک دیہات کے لوگوں پہ اُس کا اتنا زیادہ دباؤ ہے کہ اُن کو ہرگز کسی مزید تحفظ کی ضرورت نہیں ہے، بارہا انہوں نے خود لکھا ہے کہ اگر مسلمان "فرقہ بندی" کو "قوم پرستی" کے مقابلہ میں ترک کر دیں گے تو وہ "فرقہ بندی" کو چھوڑ کر عام انتخاب کے نتائج پر رضا مند رہیں گے، اُن کے اس بیان کو اگر گمراہ کن جذبات سے پاک کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوتی ہے، کہ اُن کو مسلمانوں کی طرح تحفظ کی ضرورت ہی نہیں ہے، اور اس لئے اُن کے حقوق سے زیادہ اُن کو کچھ دینے کا سوال غیر ضروری اور محض مہا سبھا کی من گھڑت ہے۔

یہی بات بنگال کے اینگلو انڈین اور یورپین لوگوں کے متعلق کہی جا سکتی ہے، محض بنگال کی کونسل میں چند جگہیں زیادہ یا کم حاصل کر کے وہ تجارت پر اپنے اُس اثر کو قائم نہیں رکھ سکتے جو انہوں نے جان کمپنی کے زمانہ سے حاصل کر لیا ہے، ہم کو کسی اور طریقہ پر اُن کے تحفظ کا انتظام کرنا چاہیئے، اور میں یہ تجویز کرتا ہوں کہ گورنر صوبہ کے لئے جو مستقل ہدایات مرتب کی جائیں ان میں یہ لکھ دیا جائے کہ ہندوستان میں کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس کا مقصد یورپین لوگوں سے انتقام لینا ہو، خواہ ہندوستانیوں کے محسوسات اُن کے خلاف کچھ ہی ہوں، ۵ یا ۶ فیصدی کی زیادتی سے ان کا کوئی فائدہ نہ ہوگا بلکہ وہ بالکل بے اثر رہیگی البتہ دونوں میں سے ایک میں مسلمانوں کی اکثریت باقی نہ رہے گی۔

صوبۂ سرحد کے متعلق میں کچھ نہیں کہتا، اس لئے سرحدی کمیٹی اس سوال پر غور کر رہی ہے، مگر میری تجویز یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ہندوؤں اور سکھوں کو اُن دونوں کی آبادی سے دگنا بلکہ تگنا حق نیابت دے دیں تاکہ ہندو اور سکھ یہ محسوس کریں کہ وہ صوبہ ان ہی کا اپنا صوبہ ہے جس طرح مسلمانوں کا ہے، اور یہ کہ حکومت میں ان کو معقول حصہ ملتا ہے، یہی احساس مسلمانوں کے اندر ڈاکٹر مونجے کے صوبہ میں پیدا کرانے کی ضرورت ہے جہاں مسلم آبادی صرف ۴ فیصدی ہے، اور مدراس

میں جہاں وہ صرف ۷ فیصدی ہیں، یا اڑیسہ میں جہاں علیحدہ صوبہ بننے کے بعد مسلمان تعداد میں بہت کم رہیں گے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ مسلمانوں کے خلاف یا موافق تمام صوبوں میں یکساں جذبات ہیں، اور جب کہ پنجاب میں جہاں اس کی قلیل اکثریت ہے مسلمانوں کے جذبات اس قدر تلخ ہیں تو ڈاکٹر مونجے کے صوبے میں کیا حال ہوگا جہاں اسلامی آبادی بہت قلیل ہے، اور جہاں ہندو حکومت مسلمانوں پر قائم ہوگی، خطرہ یہ ہے، کہ انتقام کا خیال ہمارے نوجوانوں کے دلوں میں بہت زیادہ ہے جن کو ہندوستان کی غلط تاریخ اکثر سیاسی اغراض کے لئے پڑھائی گئی ہے۔

البتہ ہندوستانی ریاستوں میں جہاں تاریخ نہیں پڑھائی جاتی ہے مگر جہاں والیان ریاست کی انسانیت باوجود اپنی کمزوریوں کے بہتر تاریخ بنانے میں مسلمانوں کے حقوق کا زیادہ تحفظ کیا جاتا ہے، اور باوجود جمہوریت پسند ہونے کے میں اس حقیقت کا ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔

بر سبیل تذکرہ مجھے اس حقیقت کا ذکر کر دینا چاہیئے کہ اقلیتوں میں مسلمانوں کی ہر دلعزیزی لگ بھگ ۱۲ سو برس کی ملک گیری کے بعد کیونکر زیادہ ہو سکتی ہے کچھ مسلمانوں سے اس لئے ناراض ہیں کہ کسی زمانہ میں انہوں نے ایران کو فتح کر لیا تھا، کچھ اس سے ناخوش ہیں کہ انہوں نے بر عظیم، شام، اور مصر کو تسخیر کیا تھا اور جنگ صلیبی میں فلسطین کو اپنے قبضہ سے نکلنے نہ دیا یا بہر حال جس کسی نے بھی ہندوستان پر حکومت کی، وہ خواہ مسلمان ہو یا انگریز اس کو اپنی پرانی رعایا کے اصل یا فرضی شکایتوں کا سامنا کرنا ہی پڑیگا، اور یہ امر تعجب انگیز ہے کہ مسلمان اب بھی کم اپنی رعایا کے محبوب ہیں، انگریز تو اپنے خلاف اس جذبہ انتقام کا اندازہ کر سکتے ہیں اور جدید دستور کے بنانے کیلئے انہیں کم از کم ایک عرصہ کے لئے اس جذبہ انتقام کا لحاظ رکھنا چاہئے۔

اب میں اقلیتوں کے تحفظ کے سوال سے بحث کروں گا، ہم شرطوں میں اکثر شرطیں اقلیتوں کے تحفظ کے لئے ہیں مثلاً یہ شرط کہ کونسلوں میں کوئی ایسا قانون جس کے خلاف ہندو یا مسلم اقلیت کے ¾ نائبین اور جس کو یہ ¾ اقلیت اپنے مفاد کے خلاف سمجھے پیش اور منظور نہ ہو سکے گا، یہ ایک تاریخی شرط ہے جو کانگرس نے اس وقت لگائی تھی جب ۱۸۸۷ء میں مسٹر بدرالدین طیب جی نے جو کانگرس میں شریک ہونے والے دوسرے نامور مسلمان تھے، سر سید احمد خاں کو شرکت کی دعوت دی تھی، ایک ایسی شرط جس کو ہندوستان کی اس پارلیمنٹ (کانگرس) نے جس کے پاس کوئی طاقت نہ تھی اور جو صرف بحث مباحثہ کر سکتی تھی خوشی سے منظور کیا تھا، اب بھی اُس پارلیمنٹ کو منظور کرنا چاہئے جب کہ اس کی طاقت تسلیم کی جاتی ہے، اور اس کو اختیارات دیئے جانے والے ہیں، میں تو مصر ہوں کہ اس شرط کے الفاظ کانگرس ہی کے دستور العمل سے نقل کئے جائیں۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ شرط کسی مذہب کے تحفظ کے لئے نہیں ہے بلکہ قومی مفاد کے تحفظ کے لئے پیش کی جاتی ہے، مذہب قانون سے بالاتر ہے، مجھے افسوس ہے کہ میں اجلاس کانفرنس سے چلا آیا تھا، جب وزیر اعظم نے فیڈرل کمیٹی کی رپورٹ کے متعلق دریافت کیا کہ آیا ہمیں یہ نکتہ نوٹ کر لینا چاہئے، کہ کوئی قانون کسی مذہب یا کسی مذہب کے رسم و رواج کے متعلق پیش نہ کیا جائے گا، جب تک گورنر منظوری نہ دے، اب بھی اس شرط کی وجہ سے کافی خرابی پیدا ہو چکی ہے، ساردا ایکٹ کے متعلق پاس نہ ہونے کے بعد بھی گورنر سے منظوری نہیں لی گئی بلکہ منظوری صرف مسودۂ قانون کے لئے دی گئی تھی، جو ابتداً پیش کیا

گیا، مجھے کوئی اعتراض نہیں اگر ہندو یا کسی دوسرے "مائل بہ ترقی" مذہب کے لوگ اپنے مذہب کے متعلق قانون بنانے چاہیں، مگر میرا مذہب تو ایسا "مائل بہ ترقی" نہیں ہے وہ تو خدا کے بنائے ہوئے قانون رکھتا ہے، میں نے یہ حقیقت اُس بیان میں واضح کردی تھی، جو ۱۷ نومبر ۱۹۲۹ء کو علما، اور لیڈروں کے ایک وفد کے ساتھ میں نے ہز ایکسلنسی وائسرائے کے سامنے پیش کیا تھا اور جس کی ایک نقل میں اس تحریر کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

اس قدر اہم معاملات جیسا کہ یہ ہے، عجلت کے ساتھ طے نہ ہونے چاہئیں اور جب پھر موقع آئے گا تو میں یہ طے کرانے کی کوشش کروں گا، کہ کم ازکم مسلمانوں کا مذہب انسانوں کی قانون سازی سے بالاتر رکھا جائے چاہے قانون ساز جماعت برطانوی پارلیمنٹ ہو یا ہندوستانی، بغیر اس کے کوئی مسلمان کسی دستور اساسی کے ساتھ وفاداری کا وعدہ نہیں کرسکتا۔

اب میں صرف ایک لفظ "ویٹیج" کے متعلق کہوں گا جو مسلمانوں کو حاصل ہے، اور وہ ہر ایسے صوبہ میں حاصل کرنا چاہتے ہیں، جہاں اُن کی اقلیت بہت کمزور ہے، کسی صوبہ میں اس "ویٹیج" سے ان کو اکثریت حاصل نہیں ہوتی جیسا کہ شکسپیئر نے یہودیوں کے متعلق کہا تھا کہ قوت برداشت اس فرقہ کا تمغۂ امتیاز ہے، مگر "ویٹیج" ہر جگہ مسلمانوں کے وزن میں کسی قدر اضافہ کرتا ہے اور اس اضافہ کی ضرورت کو مجھ سے زیادہ کوئی محسوس نہیں کرسکتا جبکہ میں دیکھتا ہوں کہ بیماری کی وجہ سے میری غیر حاضری میں اقلیتوں کی کمیٹی اور دوسری جگہوں پر میری جماعت کی کوئی نمائندگی باقی نہیں رہی "ویٹیج" سے صرف اتنا ہوگا کہ یہ ایسی قوم جس کی نمائندگی اس قدر کم ہو یہ احساس پیدا ہو جائے گا کہ حکومت میں ہمارا ابھی کچھ نہ کچھ حصہ ہے، اس کے سوا اور کچھ نتیجہ نہیں ہوگا، وہی "ویٹیج" جو مسلمان مانگتے ہیں وہ ہندوؤں کو بھی ہر ایسے صوبہ میں دینے کے لئے جہاں اتنی ہی کم ہندو اقلیت ہو لیکن بنگال یا پنجاب میں جہاں ہندو اقلیت درحقیقت بہت زیادہ منظم اور سیاسی حیثیت سے بہت زیادہ قوی ہے، اور بہت دولتمند اور بہت تعلیم یافتہ ہے، وہاں "ویٹیج" کا مطالبہ بہت لغو ہے، یہی پنجاب میں سکھوں کے متعلق کہی جاسکتی ہے۔ اب قطع نظر تمام دوسرے مباحث کے معاشرتی حیثیت سے ہندو ہیں اور سیاسی حیثیت سے ہندو قوم کے ساتھ مل کر کام کرتے رہتے ہیں، سندھ میں بھی ہندو اقلیت زیادہ منظم، زیادہ دولت مند اور مسلمانوں سے زیادہ سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے، باوجودیکہ مسلمان بڑے بڑے زمیندار ہیں، پھر بھی اُن کو "ویٹیج" دینا چاہتا ہوں، اتنا کہ بڑے سے بڑے حریص کی حرص کو تشفی دے سکے!

یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ میں اس معنی میں فرقہ پرست ہوں جو معنی فرقہ پرستی کے، یورپ میں سمجھے جاتے ہیں، باوجودیکہ بیس برس پہلے میں انتخاب جداگانہ کی تجویز کے مصنفوں میں سے ایک تھا، میں نے محسوس کیا ہے، کہ اب اس کا وقت گزر گیا اور یہ کہ اب ہندوستانی قوم پرستی کے مفاد کی خاطر ہم کو مشترک حلقہ ہائے انتخاب بربنائے رقبہ قبول کرلئے جائیں لیکن انگلستان کی طرح ہم کو مشترک حلقہ ہائے انتخاب بربنائے رقبہ محض لغویت ہوگی فرض کیجئے کہ نواب عبدالقیوم یا ڈاکٹر مونجے کے صوبہ میں جہاں اقلیتوں کی تعداد صرف ۴، اور ۷، فیصدی ہے ان کو اپنے صحیح نمائندوں کے انتخاب کرانے کا کوئی موقع نہیں مل سکتا چاہے ان کے لئے بیگہ کونسل میں محفوظ ہوں، اگر ۹۶ فی صدی اور ۹۳ فی صدی اکثریت کے ہاتھ میں اقلیتوں کے نمائندوں کا انتخاب چھوڑ دیا گیا، محض بیکار اور کمزور اشخاص جو صرف مذہبی مسائل سے مسلمان یا ہندو کہے جاتے ہوں سیاسی نقطۂ نظر رکھنے والے ہندو مسلمان

اکثریت کے ووٹ سے منتخب کئے جائیں گے۔ اس لئے میں نے بہت سے دوستوں سے مشورہ اور گفتگو کرنے کے بعد ایک دوسری تجویز پیدا کی ہے، یہ تجویز یقیناً اکثریت کی اُس تجویز سے جو سائمن رپورٹ میں پیش کی گئی ہے، زیادہ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ دونوں موقعوں کے لئے جگہیں محفوظ کردی جائیں مگر کوئی امیدوار منتخب نہ سمجھا جائے جب تک کہ وہ

(۱) اپنی قوم کے کم از کم ۴۰ فیصدی ووٹ حاصل نہ کرلے اور

(۲) کم از کم دوسری قوم کے کل ڈالے ہوئے ووٹوں میں سے ۵ فیصدی حاصل نہ کرلے۔ اگر اُس کی قوم اس مقام پر دس فی صدی یا اس سے کم ہو لیکن اگر وہ قوم اس سے زیادہ ہو تو امیدوار کے لئے ۱۰ فی صدی ووٹ دوسری قوم کے حاصل کرنا ضروری ہوں گے، اس طرح تین مقاصد حاصل ہوں گے، اول تو ہر امیدوار کو دونوں قوموں کے پاس اپنی ٹوپی ہاتھ میں لے کر جانا ہوگا، جیسا کہ منٹو مارلے المفارم کے وقت ہوتا تھا مگر اب نہیں ہوتا تھا مگر اب نہیں ہوتا کہ اس طرح دونوں قوموں کی وہ بے عنوانیاں باقی رہیں گی، جو مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کے باعث پیدا ہوگئیں، جس نے ہندوستان کی سیاسیات اور معاشرتی زندگی کو بھی تباہ کردیا، دوم یہ کہ کوئی شخص کسی قوم کا نائب منتخب نہ ہوگا جب تک کہ وہ اُس قوم کی ایک خاصی تعداد کی نیابت نہ کرتا ہو، چاہے وہ اکثریت کا نمائندہ نہ ہو جیسا کہ اب جداگانہ انتخاب میں ہوتا ہے۔

تیسرا مقصود بھی کچھ کم اہم نہیں ہے وہ یہ کہ کوئی شخص جو دوسری قوم سے کچھ نہ کچھ تعلقات نہ رکھتا ہوگا، منتخب نہ ہو سکے گا، چاہے وہ خود اپنی قوم کے سب ووٹ حاصل کرلے اس طرح پہلی دفعہ "فرقہ بندی" کا خاتمہ ہو جائے گا، اور صحیح "قوم پرستی" پیدا ہو سکے گی، یہ تجویز یقیناً دوسرے طریقوں سے بہتر ہے لیکن اگر کسی قوم کا کوئی امیدوار اس شرط کو پورا نہیں کر سکتا تو پھر وہ شخص منتخب ہوگا جس کے حق میں اُسی قوم کے ووٹ آئے ہوں جس کے لئے وہ جگہ محفوظ ہے یہ گویا موجودہ انتخاب جداگانہ کا تصفیہ ہوگا جو بدقسمتی سے ابھی تک ناگزیر ہے، میں جداگانہ انتخاب کا اس سے زیادہ حصہ جدید دستور اساسی میں جس کے بنانے کی کوشش کی جارہی ہے، نہیں چاہتا مگر بغیر ان شرائط کے مسلمان ہرگز مشترکہ انتخاب کو منظور نہ کریں گے۔ جس میں ایک بیکار آدمی یا ایسا آدمی جو خود غرضی کی وجہ سے کسی قوم کے ساتھ مل گیا ہو، اکثریت رکھنے والی قوم کے ۹۶ فیصدی ووٹ سے کامیاب ہو سکتا ہے، چاہے خود اسی کی تمام قوم اُس کے خلاف ہو، اس سے زیادہ لغویت اور کوئی نہیں ہو سکتی۔

میں اس تحریر کو ہز ایکسلنسی وائسرائے اور وزیر ہند دونوں کے سامنے پیش کرچکا ہوں، اور وہ اس تجویز کی معقولیت اور جدت سے بہت زیادہ متاثر ہوئے تھے، میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے اس امر کے ظاہر کرنے کا بھی حق ہے کہ سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر سرینواس شاستری بھی اگر زیادہ نہیں تو اسی قدر متاثر ہوئے ہیں۔

ان الفاظ کے ساتھ میں اس بیان کو ختم کرتا ہوں وزیر اعظم اور سر جوفری کاربٹ کی مہربانی سے میں باوجود ڈاکٹروں کی مخالفت کے لکھ چکا ہوں، میرے ڈاکٹر میری اس نافرمانی سے بہت آزردہ ہوئے ہیں لیکن اگر میں ایسا نہ کرتا تو میں شاید اُن کی مزید نافرمانی کرتا اور خود کانفرنس میں جاکر کمیٹی کے سامنے اس معاملہ کو رکھتا، چاہے میں اس کام میں مر ہی جاتا، میں ممبران کمیٹی سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس طویل تحریر کو نظر انداز نہ فرمائیں، اور کچھ نہ کچھ توجہ ضرور کریں

بیگم محمد علی کے خطوط لندن سے!

کانگریس اور خلافت میں ٹھن چکی ہے!

کانگریس اب ایک خالص ہندو جماعت بنتی جا رہی ہے۔ علی برادران اس سے قطع تعلق کر چکے ہیں اور مسلمانوں کی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے انگریز اور ہندو سے جنگ کر رہے ہیں۔ اسی زمانے میں گول میز کانفرنس حکومت برطانیہ کی طرف سے لندن میں منعقد ہوتی ہے مسلم مندوبین میں ایک محمد علی بھی ہیں!

محمد علی موت و زیست کی کشمکش میں گرفتار ہیں، معالج آرام اور علاج کا مشورہ دے رہے ہیں لیکن وہ لندن کے لیے رخت سفر باندھ رہے ہیں، تاکہ سلطان جابر کے سامنے کلمۂ حق کہنے کا فریضہ ادا کر سکیں۔ محمد علی کی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی۔ گول میز کانفرنس میں ایک معرکۃ الآرا تقریر کرنے کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

میں نے اپنی کتاب "سیرت محمد علی" میں محمد علی کے احوال و سوانح کے سلسلے میں گول میز کانفرنس اور دوسرے مسائل کا ذکر بھی کیا ہے، یہاں ان کے اعادے سے اجتناب کیا ہے صرف ایک نئی چیز پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، یعنی اپنی بیٹی کے نام لندن سے بیگم محمد علی کے خطوط۔ یہ بالکل غیر مطبوعہ خطوط ہیں اور ان سے بہت سے نئے امور پر روشنی پڑتی ہے۔ درحقیقت اس کتاب کا مقصد ہی وہ مواد پیش کرنا ہے جو مستقبل کے مؤرخ کے لیے ماخذ کا کام دے سکے اور

مدت سے جسے دورِ زماں میٹ رہا ہے!

★

(۱)

۹۲ ہمرٹن روڈ لندن
S.W.10

۱۱ نومبر سنہ ۱۹۳۲ء

پیاری زہرہ دعا

تمہارا خط اس ہفتہ نہیں آیا۔ نہیں معلوم کیا بات ہے۔ ہر ہفتہ خط لکھتی رہیں۔ ناغہ نہ کرنا۔ تمہارے ابا کی طبیعت پھر دو تین روز خراب رہی کیونکہ یہاں آنے کے بعد لوگوں سے ملنا ملانا رہتا ہے۔ کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ اس وجہ سے تھک جاتے ہیں۔ [illegible] کانفرنس شروع ہے۔ وہاں جانا ہوتا ہے۔ صبح دس بجے وہ وہاں جاتے ہیں۔ اور مجھے یہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ ایک بجے واپس آجاتے ہیں۔ میں یہاں گلنار کے پاس رہتی ہوں۔ اور اگر وہ کہیں باہر پھرنے جاتی ہے تو میں بھی چلی جاتی ہوں۔ چونکہ تمہارے ابا اچھے ہوتے تو کہیں لے جاتے اور کچھ دکھاتے۔ لیکن وہ بیمار ہیں شعیب کو کام سے فرصت نہیں ملتی۔ بیگم صاحبہ سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ اکثر دوپہر کا کھانا اور شام کی چائے ان کے ساتھ پیتی ہوں صبح کی چائے اور رات کا کھانا گھر پر کھاتے ہیں۔ دال، بھات، پوری ترکاری۔ زاہد اور شوکت صاحب بھی مل جاتے ہیں۔ تمہارے ابا تم کو اور طارق کو پیار کہتے ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے تم کو خط لکھا تھا۔ امید ہے کہ ملا ہوگا اور اس میں سب پورا حال لکھا تھا۔ آج دہلی کی لڑکی رشیدہ آرہی ہے۔ اور ان کی بہن زہرہ کلکتہ والی چائے پر گلنار کے پاس۔ میرے نام رشیدہ کا خط آیا تھا۔ تو میں نے رات کو ٹیلیفون کیا تھا کہ تم ضرور آکر ملو۔ اور میں بھی گلنار کے پاس ہوتی ہوں وہیں آکر چائے پیو۔ تو وہ آرہی ہیں۔ اور آج رات مہاراجہ بڑودہ نے کھانے پر صاحب کو بلایا ہے اور مہارانی بڑودہ نے مجھے بلایا ہے۔ وہاں جانا ہے۔ اگر تمہیں کوئی خاص چیز منگانا ہو تو مجھے لکھو کہ میں تمہارے لئے کیا لے کر آؤں۔ میرا تو بڑا کوٹ لینے کا ارادہ ہے۔ اگر صاحب کی دوا سے روپیہ بچا تو۔ لیکن تم بھی لکھنا کہ تم کو کیا چاہئے۔ اور طارق کے لئے کیا لاؤں۔ طارق کو خوب پیار۔ تمہارے ابا کی بیماری نے مجھے بھی تھکا دیا۔ چونکہ کوئی آدمی نہیں کام کرتے کرتے تھک جاتی ہوں۔ خط لکھنے کو بھی فرصت نہیں ملتی ہے۔ لیکن تھوڑا سا اس لئے لکھ دیتی ہوں کہ اگر نہیں جائے گا تو تم پریشان ہو جاؤ گی اب رخصت ہوتی ہوں۔ سب کو سلام دعا کہہ دینا۔ تمہارے ابا تم کو طارق کو پیار کہتے ہیں۔ خدا حافظ۔

تمہاری والدہ امجدی

(۲)

ہائڈ پارک ہوٹل نائٹس برج لندن
S.W.1

۲۷ نومبر ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ دعا

تمہارے صرف دو خط آئے ہیں۔ تم نے اپنے میرٹھ جانے کا لکھا تھا۔ اس کے بعد سے کوئی خط نہیں آیا ہے۔ میں تم کو برابر ہر ہفتہ خط لکھ رہی ہوں۔ تمہارے ابا کی طبیعت اچھی ہے۔ لیکن پیروں پر اور رانوں پر ورم بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے دو روز سے پلنگ پر ہیں۔ آرام کر رہے ہیں۔ برابر سب جگہ سے بلاوے آ رہے ہیں۔ لیکن کوئی ساتھ نہ ہونے کی وجہ سے نہیں جا سکتی ہوں۔ تمہارے ابا کی طبیعت درست ہوتی ہے تو کہیں چلی جاتی ہوں۔ اگر انگریزی جانتی ہوتی تو خود بھی جا سکتی تھی۔ ییات کی امی نادرہ ایک روز میرے پاس آئی تھی اور پھر ہم سب کو بلایا تھا۔ میں، صاحب، شوکت صاحب اور زاہد گئے تھے کھانے پر۔ لیکن گلنار نہیں گئی تھی۔ پھر رشیدہ دہلی والی اور زہرہ دونوں کو گلنار نے چائے پر بلایا تھا۔ غلطی سے وہ یہ سمجھیں کہ میں نے بلایا ہے۔ میں نے ٹیلیفون میں کہہ دیا تھا۔ کہ میں بھی روز وہیں ہوتی ہوں۔ ہم دونوں وہاں مل جائیں گی۔ وہیں آ کر تمہارے ساتھ چائے پیو۔ لیکن وہ میرے یہاں چلی گئی۔ میں ان سے پوری طرح بات بھی نہ کر سکی۔ کیونکہ صاحب کی طبیعت اس روز اچھی نہیں تھی۔ پھر وہ دونوں مجھے اور گلنار کو لینے آئیں تھیں۔ میں دوسری جگہ چائے پر گئی تھی۔ وہ صاحب اندر رہ چکے ہیں۔ وہاں بیگم بھوپال بھی گئی تھیں۔ پھر وہاں سے واپسی پر میں رشیدہ کے پاس گئی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے کھانے اور چائے دونوں پر بلایا تھا۔ کھانا کھایا ہندوستانی۔ پھر رات کو واپسی ہوئی گلنار کو وہاں چھوڑ کر صاحب کو لے کر گھر واپس ہوئی۔ اب کل سے ہم اس ہوٹل میں آ گئی ہیں۔ کیونکہ وہ جگہ بہت دور تھی۔ ایک تو موٹر کا خرچہ زیادہ پڑتا تھا۔ دوسرے آنے جانے میں ایک گھنٹہ لگ جاتا تھا اور پھر صاحب کے دل کے لئے بھی اچھا نہیں تھا کہ اتنی دیر موٹر میں لگے۔ مجھے آرام تھا چونکہ کھانے کا پوری ترکاری دال بھات مل جاتا تھا۔ اب پھر پیرس کی طرح چائے اور ٹوس پر گزر ہو گی۔ لیکن یہاں صاحب کو آرام ملے گا۔ یہاں خرچ بھی زیادہ ہو گا۔ لیکن مجبوری ہے کیا کیا جائے۔ نواب صاحب کی جگہ سے بھی بہت دور ہے۔ اور جہاں ان کو کانفرنس میں جانا ہوتا ہے وہ بھی دور۔ یہاں اب دونوں جگہ قریب ہیں اور سب طرح آرام ہے۔ میں تو لندن سے بیزار ہو گئی ہوں۔ خدا کرے کہ یہ کام جلدی ہو جائے اور کامیابی ہو تو واپس اپنے گھر جاؤں۔ تم اور طارق بہت یاد ہوتے ہو۔ بیگم صاحبہ سے بھی قریب قریب روز ملاقات ہو جاتی ہے۔ چونکہ گلنار اوپر کے کمرے میں رہتی ہے۔ صاحب جب کانفرنس میں جاتے ہیں تو مجھے وہاں چھوڑ جاتے ہیں۔ گلنار کھانا، چائے بیگم صاحبہ کے ساتھ ہی کھاتی ہے۔ تو میں بھی اکثر کھانے پر چائے پر وہیں ہوتی ہوں۔ قریب قریب روز، ایک روز دو روز بعد ملاقات ہو جاتی ہے۔ گلنار اچھی ہے اور شعیب بھی اچھی ہے دونوں آداب عرض کرتے ہیں۔ شعیب کو کام بہت ہے دن بھر دیکھنے کو بھی نہیں ملتا۔ گلنار اپنے کمرے میں بیٹھی رہتی ہے یا میں جاتی ہوں تو ہم دونوں ہوتے ہیں۔ کبھی بیگم صاحبہ کے پاس چلی جاتی ہے بہن پیاری بیگم کا بھی خط آیا ہے۔ وہ سب

خیریت سے ہیں۔ اب رخصت ہوتی ہوں۔ زاہد، شوکت صاحب سب خیریت سے ہیں۔ میری طرف سے باجی و بجی کو آداب، قمر کو پیار۔ عذرا اسفندری صفیہ کو دعا۔ عثمان فاروق کو دعا۔ یہ سن کر خوشی ہوئی کہ فاروق عثمان نوکر ہو گئے طارق کو خوب پیار۔ خدا حافظ

تمہاری دعاگو والدہ

---

(۳)

ہائیڈ پارک نائٹس برج لندن
S.W.1

۱۴ر دسمبر ۱۹۶۷ء

پیاری زہرہ خدا تم کو زندہ و سلامت رکھے۔

تمہارا خط آیا۔ خیریت معلوم ہو کر خوشی ہوئی۔ تم نے جو خط غلطی سے زاہد کا میرے خط میں رکھ دیا تھا وہ خط جب آیا ہے تو زاہد موجود تھے۔ صاحب نے کھولا تو زاہد کا نام دیکھ کر فوراً زاہد کو دے دیا اور زاہد سے کہہ دیا کہ تمہارے نام کے لفافہ میں ہمارا خط آئے گا تم مجھے بھیج دینا۔ جب زاہد چلے گئے۔ تو تھوڑی دیر بعد کوئی ایک گھنٹہ کے میرے نام کا خط مل گیا۔ تمہارے ابا کو فکر ہو رہی تھی کہ نامعلوم ہمارے نام کا کیا لکھا ہوگا۔ اور وہ اس کے ہاتھ میں جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا اب برابر خیال رکھو کہ پہلے خط رکھ کر پتہ لکھ دیا کرو۔ اس ہفتہ تمہارے ابا پلنگ پر ہی رہے۔ آرام لینے کی غرض سے۔ دوسرے ورم بھی ہیں۔ تو چلنے کو ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔ لیکن یہاں جب سے آئے ہیں لوگ بہت آتے رہتے ہیں اور ٹیلیفون پر بھی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ زیادہ آرام نہیں لیتے۔ جیسے کہ ان کی عادت ہے اب چار یا پانچ روز سے اس ڈاکٹر کا علاج شروع کیا ہے جس کے علاج کو مہاراجہ الور نے بھیجا تھا۔ ان سے وہی پھل کھانے کو بتائے ہیں اور سات روز تک پلنگ پر رہنے کو کہا ہے اور اُسی ڈاکٹر کا علاج آج سے میرا بھی شروع ہوا ہے۔ سب کھانا بند۔ نمک بالکل بند۔ صبح چائے کے وقت پھل اور شام کو پھل اور ایک وقت کھانا مچھلی یا مرغی کا گوشت۔ روٹی ٹوس نہیں۔ وہی بتائی ہے جو صاحب کو بتائی تھی۔ زاہد ساتھ گئے تھے اور وہی جایا کریں گے۔ اس ہفتہ بلوا دے تو بہت تھے لیکن صرف تین جگہ گئے تھے ایک کسی عورت کے یہاں چائے تھی۔ ۲ دسمبر کو کل ۳ر کو ایک بہت بڑا دفتر ہے یا مکان ہے گرل گائیڈ کا وہ دیکھنے گئی تھی۔ گلنار بھی ساتھ تھی۔ پھر ایک بجے لنچ پر وزیر اعظم کے یہاں گئے تھے۔ شوکت ماموں، زاہد تھے۔ سب عورت مرد کوئی پندرہ یا سولہ تھے۔ آج ڈاکٹر کو دکھانے گئی تھی۔ اور اب چار بجے ایک جگہ چائے پر جانا ہے۔ اس لئے بہت بڑا خط نہیں لکھ سکتی ہوں۔ اچھا کیا عیسا باد شریف پڑھوا دیا۔ ہر جگہ تم اور طارق بہت یاد ہوتے ہیں۔ کل وزیر اعظم کی لڑکی نے خوب خاطر کی اور چلتے وقت سب سے اپنی کتاب پر نام لکھوائے۔ میں نے بھی لکھا لیکن میرا نام دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ کوئی نہ کوئی عورت یا مرد ایسا مل جاتا ہے کہ میری ترجمانی کر دیتا ہے تم اپنے ابا کی وجہ سے پریشان نہ ہونا۔ انشاءاللہ وہ ضرور اچھے ہو جاویں گے۔ اس ڈاکٹر کے علاج سے۔ تم بھی ورزش کرو اور روٹی اور چاول کھانا چھوڑ دو تو ضرور دبلی ہو جاؤ گی۔ گلنار اچھی ہے برابر آتی رہتی ہے تم کو آداب عرض

کرتی ہے۔ شعیب بھی اچھے ہیں۔ دعا کہتے ہیں۔ طارق کو ہم سب کی طرف خوب پیار۔ بہن کا خط بھی آیا تھا وہ خیریت سے ہیں ان کے بھائی سے بھی ملاقات ہوئی جو یہاں پڑھتے ہیں۔ مظفر کے خط بھی آرہے ہیں اس کی رخصت دسمبر کی ۱۲ سے جنوری کی ۲ یا ۱۲ تک ہے۔ اس کو صاحب خرچ بھیج کر بلا رہے ہیں۔ باقی سب خیریت ہے اب رخصت ہوتی ہوں سب کو دعا سلام پیار کہہ دینا۔ چمن ماموں کو بھی خیریت لکھ دینا۔ میں نے ان کو خط نہیں لکھا ہے۔ ابراہیم چچا سے میں کہہ آئی تھی کہ جب تک ہم یہاں سے واپس ہوں انا کی تنخواہ جندریا کی اور دہلی میں چمن ماموں اور خانسامہ کی تنخواہ اور کھانے کا خرچہ مکان کا کرایہ یہ سب تم کو معلوم ہے جو جاتا ہے اس کا حساب کر کے ذاکر صاحب کے پاس بھیج دیا کرنا۔ جب سے وہ لکھ کر منگائے کوئی ڈھائی سو روپیہ کے چیک صاحب نے ان کو میرے ہاتھ بھجوا دئے تھے وہ روپیہ اب تک ختم ہو چکا ہوگا۔ اس مہینے میں ان کو روپیہ کی ضرورت ہوگی تو میرے حساب میں یہ ان کو جب تک ہم واپس ہوں جاتا رہے ضرور ضرور خدا حافظ (تمہاری دعاگو والدہ امجدی)

میں خط پورا کر چکی تھی کہ تمہارا ۲۴ کا خط ملا۔ اس لئے اس کا بھی جواب لکھے دیتی ہوں۔ کل ایک جگہ چائے پہ گئی تھی تو ڈاک کا وقت نکل گیا آج اس کو پورا کر رہی ہوں ہوائی جہاز سے بھیجا جائے گا۔ ایک جگہ سے ابھی آئی ہوں اور دو جگہ رات کو جانا ہے ایک نواب کردا ای کی بہن کے یہاں اور ایک جگہ اور۔ میں نے جو علاج شروع کیا ہے تو آج بہت تھک گئی ہوں۔ تم طارق کو بہت محنت نہ کرنے دو۔ زندہ رہے گا تو پڑھ لے گا۔ ابھی اس کو آرام کرنے دو بہت روز بیمار رہا ہے۔ اور تمہارے پڑھانے سے میں بہت گھبراتی ہوں کیونکہ تم اس کو مارتی ہو۔ میری طرف سے پیار۔ تمہاری خالہ کا بھی خط آیا تمہارے ابا کی تقریر کی تعریف لکھی ہے۔ اور یہ بھی لکھا تھا کہ زہرہ کا خط آیا ہے۔ رام پور کے حالات بھی سب معلوم ہوئے۔ اگر میں اس کے علاج سے دبلی ہو گئی تو تم کو بھی سب بتا دوں گی اور ورزش کراؤں گی۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ یہ تم کو درد کی کوئی بیماری نہیں ہے صرف سوج پڑھتا ہے اس وجہ سے درد رہتا ہے۔ فقط تمہاری بی

منداره کی نسبت معلوم ہو کر بہت صدمہ ہوا اگر اس کو نوکری کرنا نہیں تھی تو آنے کی کیا ضرورت تھی اور اس کو ہمارے پاس کیا ۵۰ سے کم ہوئے اتنے انعام ملے اور کپڑے اتنے روپیہ کے بنائے۔ پھر بھی اگر وہ اتنی تنخواہ پر رضامند نہ تھا تو ہم سے کہہ دیتا کہ میری گزر نہیں ہوگی۔ تو اور زیادہ دیتے۔ ہم نے تو اس کو اپنے گھر کا آدمی سمجھ کر رکھا تھا۔ صفیہ نے کہا کہ وہ بیکار ہے اور نوکری کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے رکھ لیا تھا۔ تم پورا حال معلوم کر کے لکھنا اور اگر وہ نوکر ہو گیا ہے تو کسی اچھے آدمی کی فکر رکھنا۔ علی حسن کو اس کا باپ لے گیا۔ کسی، لاوارث لڑکے یا لڑکی کی میرے لئے تلاش رکھنا کیونکہ یہاں سے جانے کے بعد فوراً ہی ضرورت ہوگی۔ علی حسن سے مجھے بہت محبت ہو گئی تھی۔ لیکن اس کا باپ نہ معلوم اس سے کیا کرے گا۔ یہاں رہتا تو آدمی ہو جاتا۔ خود بھی خراب ہو رہا ہے اس لڑکے کو بھی خراب کریگا۔ خیر اس کو اختیار ہے تم ضرور لڑکے یا لڑکی کا خیال رکھنا نہ بہت بڑا ہو اور نہ چھوٹا۔ تمہارے ابا دوسرے ہفتہ خط لکھیں گے اس ہفتہ نہیں لکھ سکے میرا اماں کو چھنڈیا کو سلام۔ اخلاصی کو دعا۔ بھائی جان کو صاحب خط لکھوا دیتے ہیں اس وجہ سے میں نے نہیں لکھا ہے۔ میرا آداب عرض کر دینا۔ ماجد کو دعا۔ بچوں کو پیار۔ ننو کو بھی دعا۔ اور تمہارے ابا کہتے ہیں کہ

خط صاف ہاتھ روک کے لکھا کرو۔ ہوائی جہاز سے کیا بھیجتی ہو کہ خط بھی ہوائی جہاز کر دیتی ہو۔ کل تمہارے ابا کا فاقہ تھا۔ آج پھل کا رس پیا ہے۔ سوجن ہے۔ اس کی وجہ سے پلنگ سے ڈاکٹر اٹھنے نہیں دیتے ہیں۔ ویسے طبیعت اچھی ہے۔ تم دعا کئے جاؤ اور پریشان نہ ہوا کرو کہ جس کام کے لئے آئے ہیں بیماری کی حالت میں اس میں کامیابی ہو اور ہم سب زندہ و سلامت خوشی خوشی اپنے گھر واپس جائیں آمین!

---

(۴)

۔۸۶

لندن ۱۹ دسمبر ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ دعا پیار

تم زندہ سلامت رہو۔ اس ہفتہ تمہارا خط نہیں آیا نہ معلوم کیا بات ہے۔ اُس ہفتہ تو گلنار کے خط میں خط رکھ کر آیا تھا۔ اس سے خیریت معلوم ہوگئی۔ قاسم صاحب کی بابت جو تم نے لکھا تھا کہ وہ بیمار ہیں اور علاج کے لئے رخصت پر آرہے ہیں۔ اچھا کیا تم نے ان کو مکان میں رہنے کے لئے لکھ دیا۔ اگر ہم آ بھی جائیں گے تو اتنی جگہ ہے کہ سب رہ سکتے ہیں۔

تمہارے ابا کا وہی حال چلا جاتا چونکہ کمزور ہو گئے اگر تھوڑا کام کرتے ہیں یا کانفرنس میں کسی روز چلے جاتے ہیں تو ورم بڑھتا ہے۔ ورم ابھی تک چلا جا رہا ہے۔ پیشاب بڑھانے کی دعا بھی دی۔ ڈاکٹر یہی کہتے ہیں کہ آرام کرنا چاہئے۔ جب سے اس ہوٹل میں آئے ہیں برابر آرام کر رہے ہیں۔ کہیں آتے جاتے نہیں ہیں۔ صرف کبھی بہت ضرورت ہوتی ہے تو کام پر چلے جاتے ہیں۔ وہ بھی یہاں سے لفٹ میں گئے۔ ٹیکسی میں بیٹھے وہاں جا کر لفٹ میں اوپر چلے گئے۔ مظفر آ گئے ہیں۔ اچھی طرح ہیں۔ کمزور بہت ہو رہا ہے۔ دبلا ہو گیا ہے۔ صحت اچھی نہیں رہتی ہے۔ امتحان سب پاس ہو گیا۔ بیگم صاحبہ بھوپال اور لڑکیاں ہم ہر کو جا رہی ہیں۔ گلنار بھی ساتھ جاتی لیکن ابھی کام شعیب کا ہے۔ اس وجہ سے وہ بھی نہیں جا سکتی ہیں۔ اگر شعیب جاتے تو وہ بھی چلی جاتی۔

نواب صاحب بھوپال ابھی نہیں جا رہے ہیں۔ وہ جب کانفرنس ختم ہو جائے گی تو جائیں گے۔ سُن رہے ہیں کہ جنوری کی شروع تاریخ میں ختم ہو جائے گی۔ خدا کرے جلد ہو جائے۔ میں تو بہت گھبرا گئی ہوں۔ صاحب کی علالت کی وجہ سے اور اگر وہ اچھے ہوتے تو کچھ نہیں تھا کہیں جاتی بھی ہوں تو دل نہیں لگتا۔ مجبوراً چلی جاتی ہوں۔ اس ہفتہ میرا وزن بہت کم ہو گیا۔ ورزش برابر کر رہی ہوں۔ زیادہ وقت ورزش کرنے کو نہیں ملتا۔ پھر بھی دو وقت کرتی ہوں۔ تھوڑا کچھ گوشت مچھلی کھا لیتی ہوں اور تھوڑے سے پھل۔ بہت اچھی طبیعت معلوم ہوتی ہے۔ تم بھی ہلکا سونے کی کوشش کرو۔ میں اس ہفتہ کئی جگہ گئی۔ ۱۵ کو رات کو ڈنر تھا۔ پرنس آف کناٹ برٹش انڈیا یونین جو اسی ہوٹل میں تھا۔ تو میں صاحب کو بھی لے گئی تھی۔ ہر وقت پڑے پڑے ایک ہی خیال دل میں رہتا ہے۔ آج تک کہیں نہ جا سکے۔

١٦ کو مانوں کا کلب - ۴ بجے چائے پر گئے تھے - رات کو ایک یہودی کے یہاں ڈنر تھا وہاں گئے۔ وہاں پھر ۱۱ بجے وہاں سے لارڈ ریڈنگ کے یہاں ریسپشن تھا، گئے - وہاں پرنس آف ویلیز بھی آئے تھے - وہاں سے ۱۱ بجے واپس آئے -
اس رات کو ۳ بجے دل کا دورہ صاحب کو ہوا - مہاراجہ الور کے دو ڈاکٹر یہاں رہتے ہیں ان کو بلا کر دکھایا انہوں نے جو دوا دی پی رہے ہیں - اس سے آرام ہوا صبح کو اسی ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا اس نے کہا کہ کسی کو آنے جانے نہ دو اب کل سے آج طبیعت بہتر ہے - تم گھبرانا نہیں - میں کل حال تم کو لکھ دیتی ہوں -
١٧ کی رات کو مہاراجہ صاحب الور کے ہاں دعوت تھی - کوئی ٥٠٠ آدمی کی - نہ میں جا سکی اور نہ صاحب جا سکے مجبور تھی -

١٨ کو یہاں کی مسجد کی طرف سے لوگوں کی چائے تھی - آج ١٩ کو ۴ بجے برٹش انڈیا یونین چائے ہے - وہاں جاؤنگی کل ٢٠ کو نواب صاحب بھوپال کے یہاں چائے - وہاں جاؤں گی - صاحب بے چارے نہیں جا سکتے ہیں باقی سب خیریت ہے - اب رخصت ہوتی ہوں - باقی بی کو میری طرف سے اور صاحب کی طرف آداب عرض کر دینا - اور کہہ دینا کہ مہاراجہ صاحب اندور پیرس کے بھی باہر رہتے ہیں اور ان سے کسی کو ملنے کی اجازت بھی نہیں ہے اور نہ ان کے اختیار میں کچھ ہے - کہ وہ کسی کے لئے کچھ کر سکیں - سب کو دعا سلام بھائی جان کو میرا اور مظفر کا آداب - تم کو اور طارق کو مظفر پیار کہتا ہے - ننو کو دعا - اچھو کو آداب - خدا حافظ

تمہاری والدہ امجدی

اسی خط کی پشت پر

پیاری زہرہ بہت سی دعائیں و پیار

مجھے تو کبھی خط سے آپ نے یاد بھی نہ کیا - بہرحال شکایت نہیں - میں چند دنوں سے پانچوں نہیں بلکہ ہزاروں سوار دلوں میں ہوں - مگر بڑی خوشی یہ ہے کہ آپا گلنار کو مل لیا اور تم سے نہ ملنے کا افسوس بھی اسی قدر ہے - دولہا بھائی کی طبیعت خراب ہونے کے سبب طبیعت اور پریشان رہتی ہے - خدا کرے کہ وہ جلد صحت یاب ہو جائیں - بھائی جان کو انشاء اللہ آئندہ ہفتہ لکھوں گا - میری صحت تو خیر مگر اپنی خیریت سے مطلع کرنا - طارق میاں کو بہت بہت پیار - بھائی جان کی خدمت میں دست بستہ آداب - رضیہ بی - صادق بھائی و خاندان اور نمو و صاحب و متعلقین کو سلام و دست بستہ سلام کہہ بھیجیں -

زیادہ پیار
دعاگو مظفر

(۵)

ہائیڈ پارک نائٹس برج لندن
S.W.1

۲۶ دسمبر ۱۹۳۰ء

پیاری زہرہ دعا

تم زندہ سلامت تندرست رہو۔ تم پر جو اپنے باپ کی وجہ سے پریشانی گزری ہوگی اس کا بھی مجھے اندازہ ہے لیکن کیا کیا جائے اخبار والے نہیں مانتے لکھ دیتے ہیں میری رائے نہیں تھی۔ اب سنو کہ کیا ہوا میں ہر ہفتہ تم کو خط لکھ رہی ہوں اور کل حال جو ان کا ہوتا ہے لکھتی رہی ہوں۔

۱۶ کو یہاں سے کانفرنس میں گئے، وہاں سے واپس آئے تو کوئی ملنے آیا تھا۔ اس سے باتیں کرتے رہے پھر سو گئے۔ رات کے تین بجے دل کا دورہ ہوا ڈاکٹر کو ٹیلیفون کیا مہاراجہ الور کے دو ڈاکٹر یہاں رہتے ہیں۔ مقبول اپنے ساتھ لے کر آئے وہ مقبول جن کے یہاں شملہ جاتے ہوئے سوسن پر کھانا کھایا تھا دوا دی۔ میں پہلے وہ دوا رومال میں دے چکی تھی جو ڈاکٹر رحمٰن نے چلتے وقت دی تھی کہ کہیں ایسا ہو تو سونگھانا۔ اس سے کچھ آرام آیا سو گئے دن کے دس بجے تک سوتے رہے۔ پھر ڈاکٹر کو ٹیلیفون کر کے بلایا ڈاکٹر مانک تہمینہ بائی کے شوہر انہوں نے کہا کہ بیگم صاحبہ میں نے ایسی حالت کسی روز صاحب کی نہیں دیکھی۔ میں اتنے روز سے علاج کر رہا ہوں کسی کو کمرے میں نہ آنے دو اور نہ کسی سے بات کرنے دو اور نہ لکھنے پڑھنے کا کام۔

۱۷ کو مہاراجہ الور کے یہاں ڈنر تھا۔ وہاں نہیں جا سکے۔ شوکت صاحب چلے گئے۔ ۱۹ کو ہندوستان کی ڈاک لکھواتے رہے۔ خود بولتے جاتے تھے اور سیکرٹری لکھ رہے تھے لیکن پھر بھی حالت یہ تھی کہ آواز پر کمزوری معلوم ہوتی تھی۔ بھائی کو خط لکھوا رہے تھے۔ بی اماں کو آداب بہن کو دعا۔ خیر وہ خط پورا ہوا۔ مجھے ایک جگہ چائے پر جانا تھا لیکن نہیں گئی۔ اور اسی سنہ مہاراجہ الور نے چائے پر بلایا تھا تو صاحب نے کہا کہ اسی ہوٹل بلکہ اسی منزل پر دوسری طرف ہے چلی جاؤ۔ میں وہاں گئی۔ وہاں سے واپس آئی۔ تو خط پورا کرا چکے تھے۔ لیکن اسی کا پورا کرنا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ ٹیلیفون کر کے ڈاکٹر کو بلایا تو وہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے دوسرے ڈاکٹر جو دل کا علاج کرتا ہے۔ اس کی برابر رائے لی جا رہی تھی۔ ایک مرتبہ پہلے اس کو دکھا دیا گیا تھا۔ اس کو بلایا دونوں نے دیکھا اور مجھے کہا کہ ہم نرس کو بھیجتے ہیں۔ ایک نرس دن میں اور ایک رات میں رہے گی اور ان کو پلنگ سے ہلنے نہ دو۔ غرض یہ کہ نرس آ گئی رات بڑی تکلیف رہی اور بڑی مشکل سے رات کٹی۔ صبح کو غفلت ہو گئی۔ گلنار آ گئی۔ میں اور وہ بیٹھے دیکھتے رہے اس وقت تک نہ شوکت ماموں آئے تھے نہ زاہد۔ زاہد کے پیر میں کچھ تکلیف ہو گئی تھی۔ شعیب کو تو نواب صاحب کے کام سے فرصت ہی نہیں ملتی ہے۔ کبھی رات کو تھوڑی دیر کو یا کبھی دن کو آ گئے۔ وہ رات ایسی کٹی کہ جیسے شملہ پر کٹی تھی۔ وہاں تم بھی تھیں یہاں نرس اور میں اکیلی اور جب قوت تھی اور اب کمزوری۔

میں نے گلنار سے کہا کہ میرا تو ان کی حالت دیکھ کر دل گھبرا جاتا ہے۔ تم جا کر ڈاکٹر رحمٰن کو بھیجو۔ جب ڈاکٹر رحمٰن

آئے تو انہوں نے کہا کہ بھائی دعا کرو اور میں بھی دعا کرتا ہوں تو میں اور گھبرا گئی اور باہر کمرے کے نکل کر آئے کہ شوکت صاحب کو ٹیلیفون کر دوں اتنے میں ڈاکٹر آ گئے اور انہوں نے رات کو رپورٹ دیکھی اور نبض دیکھی تو نبض کا پتہ نہیں۔ اس نے گھبرا کر شوکت صاحب کو ٹیلیفون کیا کہ تمہارے بھائی کی یہ حالت ہے جلد آؤ۔ یہ بیچاری ایک عورت کیا کرےگی۔ پھر وہ آئے۔ زاہد، شعیب، مظفر سب آ گئے۔ میری بری حالت ہو گئی۔ میں دوسرے کمرے میں آ کر رونے لگی۔ پھر دل کا ڈاکٹر رحمٰن اور مانک سب کی رائے ہوئی کہ کیا کیا جائے۔ ڈاکٹر رحمٰن نے کہا کہ حالت نازک ہے لیکن میری رائے ہے کہ جلاب کی دوا دی جائے۔ دوا انجکشن دی۔ ایک دل کے لئے اور ایک پیشاب کے لئے تو پیشاب آیا اور کہا کہ ۸ گھنٹے خطرے کے ہیں۔ یہ گزر جائیں

رات کو پھر ڈاکٹر آئے تو کچھ حالت بہتر بتائی۔ اس وقت وہ چلے گئے۔ رات کو شوکت صاحب اور میں دونوں برابر کے کمرے میں رہے اور جا کر دیکھتے رہے۔ دوسرا کمرہ اور لیا۔ صبح ہوئی تو اجابت ہونا شروع ہوئی۔ دن رات میں ۱۲ اجابتیں ہوئیں تو پھر ڈاکٹر آئے تو کہا کہ نبض اب کل سے آج بہتر ہے اور کل سے ٹوس اور ابلی پھلی سے لگی ہے۔ لیکن کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ سب ڈاکٹروں کی یہ رائے ہے کہ نرسنگ ہوم میں بھیج دیا جائے۔ شاید دو چار روز میں بھیج دیں گے۔ اب ان میں اتنی قوت نہیں ہے کہ خدا نہ کرے دل کا دورہ ہو اور اس کی برداشت کر سکیں۔ وہ مانتے نہیں۔ ذرا طبیعت ٹھیک ہوتی ہے تو باتیں کرتے ہیں۔ ہم نے جا کر کہہ دیا کہ آپ کی یہ حالت ہو گئی تھی۔ خدا نے بچا دیا تو کہہ رہے تھے۔ نہ معلوم میری بیٹی زہرہ کی کیا حالت ہو گئی ہو گی۔ آج کئی مرتبہ کہہ چکے ہیں کہ میں خط اپنے ہاتھ سے زہرہ کو لکھوں گا۔ میں نے کہا کہ میں تو لکھ رہی ہوں اگلے ہفتے لکھنا۔

ہم سب وہاں زیادہ نہیں جاتے ہیں کہ یہ باتیں کریں گے۔ لیکن وہ نرس سے باتیں کرتے رہتے ہیں مظفر کی وجہ سے مجھے بہت آرام ملا کہ میں اکیلی نہیں رہی اور سب تو آتے جاتے رہتے تھے لیکن وہ ہر وقت میرے پاس رات کے دس ۱۱ بجے تک رہتا ہے۔ میں نے تو دو روز کھانا نہیں کھایا نہ اس نے کھایا نہ وہ مجھے چھوڑ کر کہیں جاتا تھا ۲۲ ہر کو دوپہر کو میری بری حالت ہونے لگی۔ بھوک کے مارے تو یہاں ایک مسلمان کی دوکان ہے، ہوٹل ہے کھانے کی۔ وہاں ہندوستانی کھانا ملتا ہے۔ میں پہلے کبھی ہی ہفتہ ایک مرتبہ وہاں جا کر کھانا کھا آتی تھی وہاں سے ٹیلیفون کر کے دو آدمی کا کھانا منگایا اس وقت گلنار، شعیب آئے تو انہوں نے بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ اور زاہد تھے۔ ہم سب نے مل کر کھایا۔ اور خدا کا شکر ادا کیا۔

تمہارا وہ خط جس میں تم نے روپیہ کا لکھا تھا، تمہارے ابا کے نام تھا وہ ان کو نہیں دکھا سکے۔ صرف کہہ دیا کہ زہرہ کا خط آیا ہے وہ خیریت سے ہے تو رونے لگے کہ ارے میری بیٹی کا نہ معلوم کیا حال ہو گا۔

صاحب نے مجبوری کو بھوپال سے چچا کو خط لکھ دیا تھا اگر میرا روپیہ نہیں بھی تھا تو کیا تھا۔ میرا روپیہ جب جمع ہوتا تھا اور برسوں رہا تو تمام خاندان کے خرچ میں آتا تھا اور اب مجھے ضرورت ہے تو دو ہزار نہیں ہم ہزار نہیں صرف تین چار سو کا کسی کو ہمارا اعتبار نہیں تو میں نے بھی بھائی جان کو خط لکھ دیا ہے اور تم بھی ان سے کہہ کر کوشش کر کے دہلی کو روپیہ

بھجوادینا۔ سب حساب میں لکھتی ہوں ۔ کرایہ مکان ۴۰ روپے ۔ تنخواہ چمن ماموں ۱۵ روپے ۔ تنخواہ خواصہ ۲۰ روپے ۔ خوراک چمن ماموں ۲۱ روپے۔ خانسامہ ۱۲ روپے ۔ جہتر بہشتی ۲ روپے ۔ تیل جلانے کا ایک روپیہ ۔ جیب خرچ زہرہ طارق ۱۵ روپے۔ تنخواہ انا ۶ روپے ۔ تنخواہ جھنڈیا ۳ روپے ۔

یہ کل میزان ایک سو تیئس روپیہ کا ہوتا ہے تو ایک سو دو روپیہ تو ہر مہینے یعنی کم ذمیر سے برابر دینا چاہیے ۔ جب تک میں واپس ہندوستان آؤں ذاکر کے نام ایک سو دو روپیہ ہر مہینے بھیج دیا یا ایک دم تین مہینے کا حساب کرکے ان کو بھیج دینا ۔ وہ جیسا بھائی جان مناسب سمجھیں ۔ لیکن پہلی کو ان کو مل جانا چاہئیں ۔ بھائی جان سے کہہ دینا کہ آپ کہیں سے قرضہ کرانتظام کر دیجئے ۔ میں وہاں آکر سب ادا کر دوں گی اور چھوٹے لال کو بلاکر میرا ابھی حساب لینا کہ میرا کتنا روپیہ ہے ۔ میں یہاں سے بھیج دیتی بلکہ صاحب کہہ رہے تھے میں نے بیماری کی وجہ سے نہیں بھیجا کہ ہم یہاں پر دیس میں ہیں ہم کیسا کریں گے ۔

قاسم کے دو خط صاحب کے نام آئے لیکن وہ زیادہ بیمار ہو گئے ۔ جواب نہ لکھ سکے ۔ میں اکیلی کیا کروں ۔ کیسے اتنے خط لکھوں ۔ تم ان کو لکھ دینا کہ بھائی تمہاری علالت کی وجہ سے فکر ہے اور میں تو خود بیمار ہو رہا ہوں ۔ تم بڑی خوشی سے مکان میں آکر رہو اگر ہم آئیں گے تو ہم بھی رہ سکتے ہیں ۔ خدا حافظ

دعاگو تمہاری والدہ امجدی

(۶)

لندن

۹ جنوری ۱۹۳۱ء

پیاری زہرہ پیار

میں زندہ ہوں لیکن مردوں سے بدتر نہ معلوم میری قسمت میں کیا لکھا ہے کہ اب تک زندہ رہی ۔ جن کی دنیا کو ضرورت تھی وہ مجھ کو اور تم کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے ۔ اسی کا ہر وقت خوف رہتا تھا وہ سامنے آکر رہا ۔ میری ایک بھی دعا قبول نہ ہوئی ۔ ان کا دل ہی ہندوستان جانے کو نہیں چاہتا تھا ۔ جب کبھی جانے کا نام آتا تو کہتے تھے کہ میں ابھی نہیں جاؤں گا ۔ جب پورا کام ہو جائیگا اس کے بعد پیرس جاؤں گا ۔ علاج کراؤں گا ۔ اور ... جاؤں گا ۔ میں یہ سن کر اور ان کی کمزوری اور کام دیکھ کر گھبراتی تھی میری ایک بات نہیں سنتے تھے ۔ اس لئے مجبور دیکھتی رہتی تھی ۔ جب ۲۰ کو زیادہ بیمار ہو گئے تھے اور ہوش آگیا تو میں نے ڈاکٹر سے کہا کہ آپ انہیں کہئے کہ ہندوستان جلد چلے جائیں اور جو ان کی حالت ہے وہ ان کو بتا دو ۔

ڈاکٹر مانک نے ایک روز کہا کہ بھائی محمد علی تمہاری حالت ایک شیشہ کے گلاس کی طرح ہے کہ اگر اس کو احتیاط سے رکھا جائے تو برسوں رہ سکتا ہے لیکن اگر اس کو زمین پر رہا ۔ دردو تو ٹوٹ جائے گا ۔ آپ کی حالت ایسی نہیں ہے کہ اس قدر سفر کریں لیکن شوکت صاحب زاہد چلے جائیں گے ۔ یہ اکیلی بیگم صاحبہ کیا کریں گی ۔ ڈاکٹر علاج کرے گا لیکن نئے گردے کہاں سے لائیگا ۔ آپ کے گردے کام نہیں کر رہے ہیں ۔ صرف دل کا ... سوال نہیں ہے اور تمہارا علاج سوائے آرام کے کچھ نہیں ہے ۔ ایک

تو یہ کہ اگر آپ کام نہیں چھوڑیں گے تو آپ جلد اچھے نہیں ہو سکتے ہیں اور سوائے اس کے کہ ڈاکٹر رو پیہ لے اور کچھ حاصل نہیں ہوگا آپ کا اچھا ہونا آپ کے ہاتھ میں ہے اور آپ آرام کیجئے اور یہاں کی سردی بھی آپ کے لئے اچھی نہیں ہے۔ میں تو آپ کو یہی رائے دیتا ہوں کہ آپ ہندوستان جلد چلے جائیے اور آپ اکیلے جانے کے قابل نہیں ہیں۔ کوئی ڈاکٹر ساتھ ہونا چاہئے تو اس کے بعد کہا کہ اچھا ڈاکٹر اگر آپ کی یہی رائے ہے تو میں ۱۶ کو یا پھر ۲۳ کے جہاز سے چلا جاؤں گا۔ ۲۱ کے بعد سے کمزور بہت ہو گئے تھے۔ لیکن پھر برابر طاقت آ رہی تھی اور یہ خیال نہیں تھا کہ اس قدر جلدی ہو جائے گی۔

جب ایک ہفتہ گزر گیا تو کہا کہ تم اس کمرے میں آکر کیوں نہیں رہتے ہو۔ میں نے کہا کہ نرس ہوتی ہے۔ اس کو اچھا نہیں معلوم ہوتا تو کہا کہ اب مجھے رات کو نیند خوب آجاتی ہے اور رات کی نرس کی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے بھی کہا کہ اب کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ رات کی نرس بند کر دی گئی دن کی آتی تھی۔ چہرے پر یہ معلوم ہوتا تھا ایسی حالت رہی تو جلد تندرست ہو جائیں گے۔ ڈاکٹر بھی خوش تھا۔

۲۹ کو کہا کہ میری ایک لڑکی یہاں ہے اور اس کی سالگرہ ۳۱ کو پوری ہوتی ہے۔ اور میں نے آج تک کچھ نہیں کیا ہے۔ یہ خوشی تو میں ضرور کروں گا اور سب کو بلا کر کھانا ہندوستانی شفیع کے ہوٹل سے منگا کر کھلا دوں گا لیکن پہلے مہاراجہ اور اور نواب بھوپال سے معلوم کر لوں کہ انہوں نے کہیں باہر جانا تو نہیں ہے۔ مہاراجہ صاحب کو خط لکھا انہوں نے منظور کر لیا ان کے خط میں لکھا تھا کہ ایک مرتے ہوئے کی یہ آخری آرزو ہے کہ آپ میرے ساتھ آکر کھانا کھائیں نواب صاحب چونکہ اور لوگوں کو پہلے سے دعوت دے چکے تھے۔ وہ نہ آسکے۔ مہاراجہ صاحب کے یہاں سے ۴ آدمی تھے۔ پھر ٹیلیفون کر کے سب کو دعوت دی۔ مہاراجہ جام صاحب چونکہ بیمار تھے نہ آسکے۔ صاحب اسی روز باہر جا رہے تھے۔ زاہد کی کچھ طبیعت خراب تھی وہ بھی نہیں آئے۔ مظفر دن بھر رہا۔ اور کام کرتا رہا۔ خود کھانے کے لئے ٹیلیفون سے کہہ۔ بادشاہ کے سیکرٹری اور وزیر ہندان کی بیوی سندری شعیب غرض یہ کہ سب ۲۰ آدمی ڈنر پر تھے برابر کے کمرے میں میز لگائی گئی۔ خود گئے صوفے پر بیٹھے رہے۔ کھانے کے بعد مہاراجہ صاحب نے تقریر کی۔ ان کا شکریہ تو ادا کیا۔ خوب خوشی خوشی خود بھی اپنی کشتی میں کھانا کھاتے رہے۔

جب سب لوگ چلے گئے تو پھر اپنے کمرے میں آگئے۔ چونکہ گلنار کی کچھ طبیعت خراب ہو گئی تھی وہ نہ آسکی تھی۔ تو جب صبح ہوئی تو کہا کہ گلنار نہیں آئی۔ میں نے کہا آتی ہو گی وہ آئی تو اس سے خوب باتیں کرتے رہے اس نے کہا کہ ابا ہم آپ کو مرنے نہ دیں گے اور دل کے مرض والے جلدی نہیں مرتے ہیں۔ تو کہا کہ بیٹی مجھے تو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ میں مرنے والا ہوں اب بھی اتنی قوت ہے کہ ہاتھی سے لڑ سکتا ہوں اور خدا کا شکر ہے کہ مرتے مرتے بچ گیا۔ میری بیٹی زہرہ کتنی پریشان ہو گی۔ یہ خبر میں نے سن کر گلنار سے کہا کہ بیٹی تیرے لڑکا ہو گا تو محمد علی نام رکھیں گے اور لڑکی ہو گی تو فاطمہ۔ غرض یہ کہ ہنستے رہے۔

یکم کو ۸ بجے ایک جگہ جانا تھا مجھ سے کہا کہ وہاں ضرور جانا میں چلی گئی۔ نرس تھی۔ ۲ بجے کی دوپہر کو گلنار کا ٹیلیفون آیا کہ میں سینما دیکھنے جا رہی ہوں تم بھی چلو تو کہا کہ ضرور چلی جاؤ میں بالکل اچھا ہوں۔ میں وہاں گئی۔ وہاں سے واپس آئے تو ۴ بجے

تھے دوسرے روز ڈاک کا روز تھا تو میں تم کو اور بھائی جان کو خط لکھنے لگی - تمہارا بھی کامیابی کا خط آیا تھا وہ مجھے دیا اور کہا کہ میری بیٹی زہرہ کو لکھ دو کہ ۲۰ کو تو میری بری حالت ہو گئی تھی لیکن بچ گیا اور میں آج بہت تھک گیا ہوں ورنہ خود خط لکھتا میں نے کہا کہ میں نے سب لکھ دیا ہے - اسی روز جب کہ میں گئی ہوئی تھی لکھواتے رہے - ڈاکٹر بیٹھے تھے ان سے کہا کہ اب میرے دل کی حالت دیکھ لو اور پھر بعد میں بھی دیکھ لینا - ڈاکٹر نے بعد میں دیکھا تو حالت اچھی تھی - کہا کہ اب میں خوش ہوں کہ میں نے اپنا سب کام ختم کیا اس کے بعد اس کو دیکھتے رہے اور اس کی غلطی نکالتے رہے - دوسری کاپی منگائی تھی کہنے لگے کہ افسوس میں نے اس قدر محنت بھی کی اور وہ کاپی اب تک نہیں آئی کہ میں ہندوستان بھیجتا میں نے کہا کہ آپ نے آج بہت کام کیا ہے اب آپ آرام کیجئے، رات کو ۱۱ بجے سو گئے - جس طرح روز اُٹھتے تھے دو تین مرتبہ - اسی طرح دو تین مرتبہ اٹھ کر پیشاب کیا - صبح ۸ بجے مجھے آواز دی کہ اب اٹھئے میرا منہ دھلوا دیجئے - میں نے منہ دھلوا دیا خوب دانت صاف کئے - منہ ہاتھ اپنے ہاتھ سے دھویا اور پھر میں نے جلاب کی دوا دی - پٹیپن لگا دیا کہا کہ مجھے بھوک بہت لگی ہے - خود گھنٹی دی - نوکر آیا اس سے کہا کہ کافی اور ٹوس لا - وہ لایا کافی پیتے رہے اور ٹوس کھاتے رہے اتنے میں ۹ بج گئے - نرس آگئی میں نے کہا کہ اب نرس آگئی میں غسل خانہ ہو آؤں کہا کہ جاؤ میں آگئی تو کہا کہ ابھی تک لڑکے زاہد اور مظفر نہیں آئے - ٹیلیفون کر کے بلاؤ - ان سے مجھے بہت کام لینا ہے - میں نے ٹیلیفون کیا - زاہد نے کہا کہ میں ابھی آتا ہوں - اخبار اور ڈاک آگئی اس کو دیکھتے رہے - میں نے کہا کہ جس قدر لوگ ہندوستان سے آئے ہیں - انہوں نے سب نے جہاز میں انتظام کر لیا - آپ نے ابھی تک نہیں کرایا ہے تو کہا کہ زاہد آجائے تو ۱۶ کے جہاز سے اور ۲۳ کے جہاز سے انتظام کرتا ہوں - زاہد آئے تو ان سے کہا کہ ٹیلیفون کر کے انتظام کرو - چونکہ ہفتہ کا دن تھا - انہوں نے کہا کہ آج نہیں ہو سکتا ہے - اس لئے کہ بارہ بج گئے - سب دفتر بند ہو گئے - تو کہا کہ اچھا پرسوں - لیکن اتنی دیر میں مظفر عزیز آگئے - ان سے باتیں کرتے رہے - میں نے کہا کہ پان ہے کھلا دوں تو کہا کہ ہاں - خود کہنے لگے کہ مجھے بھی پان دو - میں نے پان دیا - کھاتے رہے -

جب مظفر چلے گئے تو پھر ٹیلیفون کر کے حیدر آباد کے مہدی یار جنگ کو بلایا - ان سے باتیں ایک گھنٹہ کرتے رہے - دن کے ۲ بج گئے - ہندوستانی ہوٹل سے مونگ کی کھچڑی منگائی - نرس نے کہا کہ آپ نے اپنے کھانے کو دیر کر دی اب کھا لیجئے - وہ کھچڑی لے کر آئے اس کو کھاتے رہے مکھن ڈال کر اس کے بعد مجھے کہا کہ یہ کھچڑی تم کھا لو - یہاں ہوٹل کا کھانا کھاتی نہیں ہو اور میری وجہ سے باہر کھانے کو نہیں جاتی ہو - دن بھر بھوکی رہتی ہو میں نے کہا کہ میں نے تو کبھی مونگ کی کھچڑی نہیں کھائی اور خالی کاہے سے کھاؤں - تو کہا کہ تمہارے پاس چٹنی اچار ہے - اس سے کھاؤ - اور پھر گھنٹی دے کر نوکر کو بلایا اور کہا کہ مکھن گرم کر کے لاؤ - میں پلنگ کے قریب بیٹھی تھی کھاتے رہے اور باتیں کرتے رہے - میں نے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی - اس وقت کچھ مجھے رونا سا آگیا - اور میں کہنے لگی کہ دیکھو آپ کام کرنا نہیں چھوڑتے اور ڈاکٹر خوف دلاتے ہیں - اور جب آپ کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو میری عجب حالت ہوتی ہے - تو کہا کہ ہاں میں جانتا ہوں اور میں نے کہا کہ سوائے آپ کے میرا تو کوئی نہیں تو کہنے لگے کہ

مرحومہ گلنار بیگم ب قریشی

مولانا مہ علی کی چھوٹی صاحبزادی

مولانا شوکت علی گول میز کانفرس میں

خاندان علی برادران

صاحبزادے طارق علی خان اور انکے بچے زہرہ بیگم زاہد علی زاہد شوکت علی

مولانا محمد علی کا تابوت

ایک تاریخی تصویر

مولانا محمد علی ★ بی امان ★ مولانا شوکت علی

مصر اور فلسطین میں
مولانا محمد علی کے جنازے کا جلوس
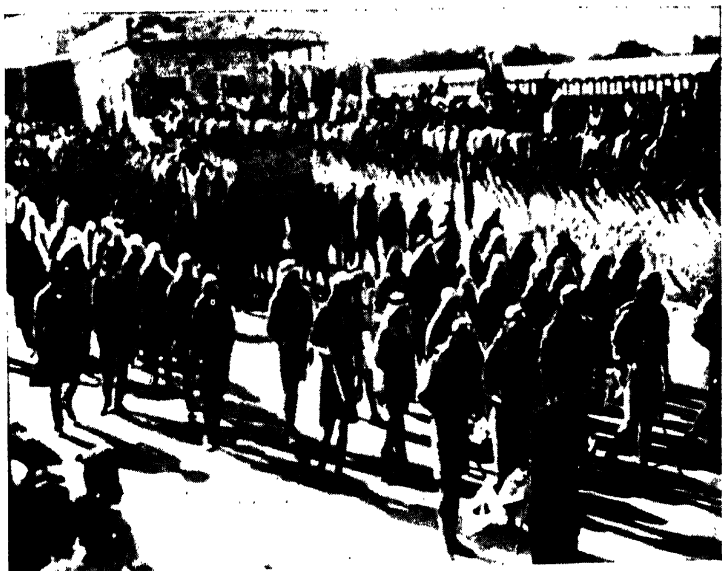
''جوہر'' —— ''علی برادران''

غمزدہ بھائی

یہ نہ کہو تمہارے بھائی ہیں۔ میں اٹھ کر ہاتھ دھونے چلی گئی۔ اس عرصہ میں ڈاکٹر آ گئے۔ دونوں بھائی اور ایک یہاں کے مسٹر نہرا ہیں وہ بھی آئے ہوئے تھے۔ مجھ سے کہا کہ چاہیے منگاؤ۔ چائے آئی سب پیتے رہے۔ ڈاکٹر سے کہا کہ میرے لئے ایک اچھی موٹر لو اتنے لوگ ہم ہیں۔ زہرہ طارق سب آسکیں۔ مسٹر نہرا نے کہا کہ آپ نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا کہ بیگم صاحبہ سے جھنڈا اٹھوانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ بھائی ابھی ہندو مسلمان کا معاملہ تو ٹھیک ہونے دو۔ میں ہی تھا کہ کوکنڈہ میں جھنڈا اٹھایا تھا۔ اور میں ہی ہوں گا جو ہندوستان کا جھنڈا اٹھاؤں گا۔ ابھی اس کا موقع نہیں ہے۔ اتنے میں ۵ بج گئے۔ کہا کہ بھائی مجھے معاف کرنا کر میں تھک گیا ہوں۔ اب سو جاؤں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں آپ آرام کیجئے۔ ڈاکٹر اور وہ سب چلے گئے۔

تھوڑی دیر میں مظفر آیا۔ اس نے چائے پی۔ نرس باہر چلی گئی۔ میں کمرے میں بیٹھی رہی۔ دو گھنٹے ہو گئے۔ ۷ بج گئے اس وقت نرس نبض دیکھنے لگی تو ایک دم بڑے زور کی گلے سے آواز نکلی کر ان کی دونوں آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور اٹھنا چاہتے ہیں اور الٹا ہاتھ اٹھا رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر پہچانا تو ہاتھ پھیلا دیا۔ میں نے اپنے ہاتھ میں ہاتھ دبایا۔ تو مسکرائے گویا یہ کہ وہ پہچانتے تھے لیکن زبان نہیں چلتی تھی۔ بہت کوشش کرتے تھے۔ میں اور نرس تھے۔ میں گھبرائی۔ نرس سے کہا کہ ٹیلیفون کرو۔ اس نے ٹیلیفون کیا۔ گلنار کو شعیب زاہدہ سب آ گئے۔ ڈاکٹر آ گیا۔ انجکشن دیا پھر بڑا ڈاکٹر آیا مہاراجہ انور نے اتنی دیر میں تین پھیرے کئے۔ دل کا ڈاکٹر جو تھا اس نے نو بجے آکر دیکھا تو اس نے کہا کہ آپ سب کو دھوکے میں رکھنا بیکار ہے۔ ان پر فالج ہوا ہے۔ ایک ہاتھ ایک پیر بیکار ہے۔ ہم انجکشن دیتے ہیں۔ حالت انکی اچھی نہیں ہے شاید صبح تک ٹھیک ہو جائے۔ سب کی طرف دیکھتے رہے۔

آخر یہ کہ دو بجے تک یہ حالت رہی اور پھر سانس تیز چلنے لگی۔ اور شعیب اور گلنار کو بھیج دیا تھا۔ زاہد مظفر اور دو تین لڑکے اور تھے۔ رحمٰن سندھی میں یٰسین پڑھتے رہے۔ رات بھر آنکھ بھی بند ہو گئی۔ صبح سوا نو بجے ہم سب کو اکیلا چھوڑ کر چلے گئے۔

شوکت صاحب اسٹیشن پر تھے وہ اس وقت تک نہ آسکے ۵ منٹ چلے گئے ہوں گے۔ کہ جب وہ آئے دن بھر سب بیٹھے رہے۔ قرآن پڑھتے رہے۔ تمام لوگ یہاں کے آتے رہے۔ کیونکہ دن کو ہوٹل سے نہیں جاتے ہیں۔ رات کو بارہ بجے ان کو دوسری جگہ لے گئے جہاں غسل دیا جانے والا تھا۔ اور صندوق تیار ہو رہا تھا رات بھر شوکت صاحب رہے۔ صبح کو غسل مظفر، رحمٰن سندھی سب تھے۔ مل کر شام کو نماز ہوئی۔ میں اور گلنار بھی گئی تھیں اور عورتیں بھی تھیں۔ یہاں کے سب بڑے لوگ ہندو مسلمان انگریز آئے تھے۔ کانفرنس کے سب تھے۔

اسی روز رات کو شعیب یہاں گلنار کو ساتھ ساتھ لئے آئے تھے۔ صبح کو چلی گئی تھی۔ تین روز تک یہی کیا۔ پھر ہوٹل چھوڑ دیا۔ اب بھی گلنار کے ساتھ رہتی ہوں۔ میں تو رو بھی نہ سکی۔ اس لئے ایک تو ہوٹل، پرایا شہر دوسرے گلنار کی آج کل حالت ایسی ہے اس کی وجہ سے بھی نہیں روتی۔ اپنے دل پر مارتی ہوں۔ دوسرے تمہاری تنہائی کا خیال پریشان کر رہا ہے۔ پہلے تو ہندوستان لانے کا خیال تھا۔

پھر تیسرے روز فلسطین سے تار آیا کہ کیا ہم کو آپ اجازت دیں گے۔ ہم سب یہ چاہتے ہیں کہ یہاں دفن کیا جائے۔ میں نے اپنی رضامندی ظاہر کی۔ کیونکہ ایسی جگہ قسمت والے کو ہی ملتی ہے۔ کل میں اور گلنار دیکھنے گئے تھے۔ پانچ، دو دن اور رات ایک دو آدمی بیٹھے قرآن شریف پڑھتے رہتے تھے۔ بڑی قسمت والا ایسی جگہ پہ ہے۔ کیونکہ جہاز والے جھگڑا کر رہے تھے۔ اسی جہاز میں ہم سب ۱۶ کو سوار ہو جائیں گے۔ اور میں شوکت صاحب زاہد پورٹ سعید پر اتر جاویں گے لیکر اور پھر جہاز یا ریل سے بیٹھ کر وہاں پہنچنے کے بعد دفن ہو جاویں گے تو پھر یہ ارادہ ہے کہ زیارتیں کرتے ہوئے واپس ہندوستان ہوں گے۔ گلنار سیدھے بھوپال جائیں گے میں دہلی آکر سامان وغیرہ کا جو کچھ سب کی رائے ہوگی وہ کر کے مکان چھوڑ دیں گے۔ اگر قاسم رکھنا چاہتے ہیں تو میں بھوپال گلنار کے پاس چلی جاؤں گی۔ وہاں رہوں گی۔ اور اگر زندہ رہی تو آکر زبانی کہانی سنا دوں گی۔

پیاری تم صبر کرنا۔ سوائے صبر کے کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس وقت نہ فاتحہ دلا چکی ہوں۔ اگر فاتحہ دلواؤں تو کس کو دوں۔ صرف کچھ روپیہ خیرات کر دیا۔ تین پونڈ ہے۔ امید ہے کہ تم فاتحہ دلوا رہی ہوگی اور دلواتی رہنا طارق کو پیار۔

تمہاری بدنصیب والدہ

امجدی

---

(۷)

لندن ۱۵ر جنوری ۱۹۳۱ء

پیاری زہرہ آپا پیار

میری بہن میں نہیں جانتی ہوں کہ تم اس وقت کس قدر پریشان ہوگی مگر سوائے صبر کے انسان کیا کر سکتا ہے۔ بی تمہیں مفصل خط لکھ رہی ہیں۔ میں نے تو پہلی جنوری کو ہی ان سے بات کی تھی۔ ۳۱ر دسمبر کو میری سالگرہ کی خوب خوشی کی دعوت تھی۔ تیسری تاریخ کو خوب اچھے خاصے تھے۔ شام کو ۵ بجے تک سب سے باتیں کیں اور سو گئے۔ پھر سوتے کے سوتے رہ گئے۔ بات کرنا نصیب نہ ہوئی۔ ۷ بجے دورہ ہوا، فالج گرا۔ صبح ساڑھے نو بجے ختم ہو گئے۔ یہ تو سب سمجھتے تھے کہ یہ دو تین مہینہ سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتے۔ مگر کوئی بھی یقین نہ کر سکتا تھا کہ یہ ایک دم یوں میری بی کو اور ہم سب کو چھوڑ کر چلے جاویں گے۔ مگر ان کی موت موت نہیں، شہادت ہے۔ وہ شہید ہوئے۔ انہوں نے ہمیشہ خدا کی راہ میں کام کیا اور اسی میں ختم ہو گئے۔ ان کی موت یادگار رہے گی۔ خدا کے گھر اُن کا بڑا رتبہ ہے۔ یعنی مسجد اقصیٰ میں دفن ہو گئے کسے ایسی جگہ نصیب ہوتی ہے۔ ہم کو صبر کرنا چاہیے اور خوش ہونا چاہئے۔ انہوں نے ہمیشہ تکلیف اٹھائی۔ اب ہمیشہ کے لئے آرام سے سو گئے۔ خدا نے ان کی خدمت قبول کی۔ دنیا میں ہی معلوم ہو گیا۔ اب کیا لکھوں۔ ۱۶ کے جہاز سے روانہ ہو رہی ہوں۔ امینہ کو پیار۔ فقط

گلنار

ضمیمہ

خلافت اور کانگریس

خلافت اور کانگریس !

ایک زمانہ تھا کہ یہ دونوں ہم معنی الفاظ تھے، ہندو ذوق و شوق سے خلافت کے ممبر بنتے تھے، اور مسلمان پروانہ وار کانگریس سے اپنی عقیدت و الفت کا اظہار کرتے تھے۔

خلافت کمیٹی، مسلمانوں کی بنائی ہوئی تھی، اس کی تخلیق علی بھائیوں کے یگانہ اور منفرد جذبۂ کار کا نتیجہ تھی، یہ اس قوم کا مرکز تھی جو ہندوستان میں ایک اقلیت تھی، کانگریس مجموعۂ اقوام و ملل تھی، اس میں ساری ہندو قوم شریک تھی، اسے مسلمانوں کی تائید حاصل تھی۔ ہندوستانی عیسائی اس کی پشت پناہ تھے، سکھ اس کے نام پر ہر قربانی کے لئے آمادہ تھے، پارسی بھی اسی مرکز سے اپنے تئیں وابستہ سمجھتے تھے۔

بایں ہمہ حالت کیا تھی ؟

کانگریس چند عافیت پسندوں کا Debating hall (مجلس مباحثہ) تھی، اور خلافت سرفروشوں اور جاں بازوں کا مرکز تھی، وہ خلافت کے رہنما اور کارکن ہی تھے جنہوں نے خلافت فنڈ سے روپیہ لے کر گاندھی جی کو سارے ہندوستان کا دورہ کرایا، جنہوں نے آڑے وقتوں میں کانگریس کی مالی امداد کی جنہوں نے کانگریس کو سرگرم فعال، اور جاں باز لوگوں کا اڈہ بنا دیا۔ جنہوں نے کانگریس کو صحیح معنیٰ میں "قومیت متحدہ" کا سنگم بنا دیا، جنہوں نے کانگریس کے ہر حکم پر ہر قربانی کا مظاہرہ کیا۔

کیا اس حقیقت سے کوئی انکار کر سکتا ہے کہ خلافت کے کارکنوں نے ان مسلمانوں کو ذلیل و رسوا کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا، جو کانگریس کے مخالف تھے، مگر کانگریس کے سب سے بڑے رہنما گاندھی جی، کانگریس کے سب سے بڑے دشمن مدن موہن مالوی کے خلاف نکتہ چینی بھی نہیں برداشت کر سکتے تھے ؟ کیا اس واقعہ کی تردید کی جا سکتی ہے کہ جب قربانی اور فدویت کے مظاہرہ کا وقت آیا۔ تو مسلمان سب سے پیش پیش تھے، انہوں نے اپنی مسلم یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی مگر گاندھی جی بنارس ہندو یونیورسٹی کو اپنا کیمپ نہ بنا سکے، کیا یہ آفتاب سے زیادہ روشن اور تابناک حقیقت نہیں ہے، کہ جب قول کی منزل ختم ہوئی اور عمل کا دور شروع ہوا، تو اقلیت میں ہونے کے باوجود، وہ سب سے زیادہ مسلمان ہی تھے، جنہوں نے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں کو، اپنے گھر کے عیش و آرام پر ترجیح دی ؟ جنہوں نے صرف بیان دینے اور تقریر کرنے پر اکتفا نہ کیا، بلکہ پولیس کے ڈنڈے اپنے سروں پر . . . . ، اور فوج کی گولیاں اپنے سینوں پر کھائیں جنہوں نے مردانہ وار پھانسی

کے تختہ کو لبیک کہا، پھر کیا یہ بھی ایک ناقابل تردید واقعہ نہیں ہے کہ جب ترک تعاون کا مسئلہ پیش ہوا، تو وہ کانگرس تھی جو اُسے قبول کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی، اور وہ خلافت تھی، جس نے سرفروشی کی پوری شان کے ساتھ اس تحریک کو اس شدت کے ساتھ اٹھایا کہ بالآخر کانگرس بھی اس کی ہمراہی پر مجبور ہو گئی!

پھر جب ترک خطابات کا، استرداد مناصب و اعزاز کا، بیرسٹری اور وکالت چھوڑ دینے کا، سرکاری عدالتوں کے مقاطعہ کا، بدیشی مال کے بائیکاٹ کا معاملہ سامنے آیا، تو وہ مسلمان ہی تھے جنہوں نے، ؎

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق

کا سماں ایک بار پھر دنیا کو دکھا دیا، اور وہ گاندھی جی کے پیرو اور ہم قوم تھے جو ؎

عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی

کا نمونہ پیش کر رہے تھے۔

ان حقائق میں سے کسی حقیقت کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کسی واقعہ کی تردید نہیں کی جا سکتی، کسی سچائی کو جھٹلایا نہیں جا سکتا، گاندھی جی ہوں، یا جواہر لال، کوئی بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ ہندوستان میں، آزادی کی تڑپ، آزادی کے لئے مرنے کا سودا، آزادی کے لئے سب کچھ قربان کر دینے کا جذبہ، آزادی کے لئے، ہر خطرہ کو دعوت دینے کی ہمت، آزادی کیلئے ہر مصیبت ہر آفت کے لئے خندہ جبینی کے ساتھ استقبال کرنے کا ولولہ، صرف مسلمانوں کا حصہ تھا، پھر، ہندوؤں میں لہر اٹھی، پھر وہ آگے بڑھے، اور مسلمانوں کے اس قافلے سے جا ملے، جو منزل حریت کی طرف گام فرسا تھا۔

دنیا کے ہر ملک میں، جب کبھی بھی آزادی کی تحریک اٹھی، تو سب سے پہلے اقلیتوں کا مسئلہ وہاں سنگِ گراں بن کر حائل ہوا، اور اس مسئلہ کے باعث بڑی بڑی نزاکتیں اور اُلجھنیں پیدا ہو گئیں، لیکن وہ ہندوستان کے مسلمان تھے، جنہوں نے خلافت کی رہنمائی میں ہر اندیشہ اور وسواس سے بے نیاز ہو کر اکثریت کا ساتھ دیا، کوئی مطالبہ نہیں کیا، کسی قسم کا تحفظ نہیں چاہا کوئی پاسنگ نہیں طلب کیا، کسی قسم کی مراعات کے طالب نہیں ہوئے، حالانکہ وہ یہ کر سکتے تھے، کیونکہ ابھی کچھ ہی عرصہ پہلے تک سارا ہندوستان ان کی مملکت تھا، اس وسیع دیس پر انہی کی حکومت تھی، اس زبردست براعظم پر انہی کا پرچم لہرا رہا تھا، اس قطعۂ ارضی کا ٹکڑہ ہر صوبہ، ہر شہر، ہر قصبہ، ہر گاؤں، ہر دیہات، انہی کی ملکیت تھی، وہ حاکم تھے اور سارا ہندوستان محکوم، وہ مالک تھے، اور سارا دیس مملوک، وہ راعی تھے، اور اس ملک کا ہر فرد رعیت، لیکن انہوں نے تمکنت اور خود پسندی کا یہ خیال اپنے دل سے نکال دیا، اور غیر مشروط طور پر ہندوؤں کے ساتھ ہو گئے، یہ جانتے ہوئے ساتھ ہو گئے کہ ہندوستان میں بادشاہت نہیں قائم ہو گی جمہوری نظام کی حکومت ہو گی، اور جمہوریت میں اکثریت سب کچھ ہوتی ہے، اور اقلیت کچھ نہیں، ہندو اکثریت میں ہیں، اور وہ اقلیت میں، گویا انہوں نے اعتراف کر لیا تھا کہ وہ ہندوستان کی حکومت ہندوؤں کو سونپنے پر تیار ہیں، اور خود ملک کی ایک باعزت، خوددار، اور ایثار پیشہ اقلیت کی زندگی بسر کرنے پر آمادہ، انہوں نے کوئی شرط نہیں پیش کی، آزادی کا نعرہ سنا اور سب کچھ لٹا دینے، اور اپنے تئیں برباد کر دینے کے لئے، آگے بڑھنے لگے، سرسید کے دور کی احتیاط پسندیاں ختم ہو گئیں، سرکار دولتمدار کے سروں، اور خان بہادروں کو روپوش ہو جانا پڑا، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے لئے پبلک لائف میں

کوئی جگہ نہیں رہ گئی، یہ سارا کرشمہ تھا مجلس خلافت کا، علی بھائیوں کا، خلافت کے مردان حق آگاہ کا!

صرف یہی نہیں، جب مالوی جی، اور دوسرے ذمہ دار ہندوؤں کی طرف سے، اس شبہ کا اظہار کیا گیا کہ مسلمان وحدت اسلامیہ، اور پان اسلامزم کے علمبردار ہیں، اس کا پورا اندیشہ ہے کہ حصول آزادی کے بعد، افغانستان ہندوستان پر حملہ کر دے، اور مسلمان اپنے جوش مذہبی سے مجبور ہو کر اپنے دینی بھائیوں کا ساتھ دیں، اور ہندوستان انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو کر افغانوں یا بالفاظ دیگر مسلمانوں کا غلام پھر بن جائے، تو اسی محمد علی نے جس کا جذبۂ دینی ہر گز کسی مقدس سے مقدس مسلمان سے کم نہیں تھا، بالفاظ واضح اعلان کر دیا، کہ ہاں میں مسلمان ہوں، اور اسلام کے لئے میرے خون کا آخری قطرہ وقف ہے، میں وحدت اسلامیہ کا قائل ہوں، اور پان اسلامزم میری زندگی کا مقصد ہے، لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ میں اس دیس کو آزاد کرانا چاہتا ہوں، تو میرا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میں کسی کی غلامی میں رہنا نہیں چاہتا، خواہ وہ انگریز ہوں یا افغان! اگر افغانوں نے میرے وطن پر حملہ کیا تو میں ان سے بھی اسی طرح لڑوں گا جس طرح انگریزوں سے لڑ رہا ہوں، میرے دل میں افغانوں کی محبت ہے لیکن میں انہیں اپنا آقا نہیں بنا سکتا، ان کی غلامی نہیں قبول کر سکتا، گویا دوسرے الفاظ میں، مجلس خلافت اور اس کے رہنماؤں نے صرف یہی نہیں کیا کہ جنگ آزادی میں غیر مشروط طور پر شریک ہوئے ہوں، بلکہ یہ بھی کیا کہ بعض فتنہ گروں نے جو شکوک و شبہات پیدا کر دئے تھے، ان کی تردید بھی پوری بہادری اور سچائی کے ساتھ کر دی۔

سب جانتے ہیں، مسلمان کتنے مذہب پرست ہیں، سب کو علم ہے، تحریک خلافت تمام تر مذہبی تحریک تھی کوئی اس سے ناواقف نہیں کہ علی برادران کی رگ رگ میں مذہب رچا اور بسا ہوا تھا، لیکن جوش رواداری میں سب اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ سوامی شردھانند جیسے کٹر آریہ سماجی لیڈر کا دلی کی جامع مسجد میں جانا، اور اس کے منبر پر بیٹھ کر تقریر کرنا بھی انہوں نے گوارا کر لیا۔

محمد علی کی مذہبیت کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر معاملہ کو مذہبی رنگ میں دیکھتے تھے، مذہب کا تصور ان سے کسی حالت میں جدا نہیں ہوتا تھا، وہ ایک مسلمان لیڈر تھے، اور ان کی قیادت کی بنیاد صرف مسلمان تھے، لیکن جب کبھی ملک میں فرقہ وارانہ بدمزگی ہوئی، جب بھی ہندو مسلم فساد ہوا، جب کبھی مسلمانوں اور ہندوؤں میں آویزش ہوئی، انہوں نے خود اپنی قیادت کے محضر قتل پر دستخط کئے، انہوں نے خود اپنی ہر دلعزیزی کے دامن پر دھبہ لگایا، انہوں نے خود اپنے معتقدوں اور نیازمندوں کو اپنا دشمن بنایا، اور بے تامل مسلمانوں کو ان کی غلطی پر، غلط روی پر، ٹوکا، ملامت کی، سرزنش کی، اور اس سلسلہ میں مسلمانوں کی گالیاں کھائیں، دوستوں کی دشمنی مول لی، ہوا خواہوں، اور جاں نثاروں کی بدگمانی کے شکار ہوئے، وہ کبھی اسے گوارا نہ کر سکے کہ مسلمان زیادتی کریں اور وہ پردہ پوشی کریں، اس کے برعکس، ایسے مواقع پر ہندوؤں نے جوابی رواداری کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا، گاندھی جی سے بڑھ کر حق کا پرستار کون ہوگا، لیکن وہ اکثر سکوت سخن شناس سے کام لیتے رہے، موتی لال سے بڑھ کر نیشنلسٹ کون تھا لیکن انہوں نے کبھی اپنی زبان حق ترجمان کو جنبش نہیں دی۔

پھر وہ دور آیا، جب مہاسبھائی کانگریسیوں پر، اور تبلیغ و تنظیم کے علمبردار خلافتیوں پر غالب آ گئے، اس طرف گاندھی جی نے پبلک لائف سے کنارہ کشی کر لی، لیکن شوکت علی نے اور محمد علی نے، ان مسلمانوں کا مقابلہ کیا، جو مسلمانوں کو تحریک آزادی سے

منحرف کرکے، باہمی جنگ وجدال اور بے سود تکرار میں اُلجھائے رکھنا چاہیے، یہ مقابلہ معمولی نہیں تھا، اس مقابلہ میں انہوں نے جذبات کا ساتھ نہیں دیا، اس لئے اپنی ہر دلعزیزی گنوادی، اپنا اقتدار ختم کر دیا، اپنی قیادت کا جنازہ نکال دیا۔

یہ وہ واقعات ہیں جن کی بنا پر ہر عامی سے عامی اندازہ لگا سکتا ہے کہ ملک کی بیداری میں کانگریس کا کتنا حصہ ہے، اور خلافت کمیٹی کا کتنا؟

یہ بھی معلوم ہوسکتا ہے کہ نازک ترین مراحل پر کانگریس نے کیا کیا، اور خلافت نے کیا کیا؟ یہ حقیقت بھی واضح ہوسکتی ہے کہ خلافت کی فردِ عمل کیا تھی اور کانگریس کے نامہ اعمال میں کہاں سیاہی تھی اور کہاں سفیدی۔

غرض ہندوستان کی تاریخ حریت اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوگی کہ ملک میں آزادی کا جذبہ خلافت نے پیدا کیا، برطانوی استعمار کا اقتدار خلافت نے ختم کیا، آزادی کے لئے غیر مشروط تعاون کانگریس سے کرنے والی صرف مجلس خلافت تھی۔

رئیس احمد جعفری
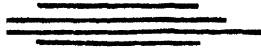
تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت کی ملاقاتیں
ہر آن تسلّی ہے ہر لحظہ تشفی ہے
ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں،

ضمیمہ ۱۵

سید حسن ریاض کے قلم سے

تحریکِ خلافت
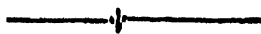
ترکی جرمنی کا طرف دار کیوں ہوا؟

اٹلی اور ترکی کے درمیان نہ مخاصمت تھی نہ کوئی وجہ مخاصمت۔ طرابلس الغرب کی تمام آبادی مذہباً مسلمان تھی۔ اور نسلاً عرب، بربر اور ترک جو تھوڑے سے اطالوی وہاں تھے۔ انہیں حکومت ترکیہ سے کوئی شکایت نہ تھی۔ وزیر خارجہ اٹلی نے اطالوی ایوان میں دسمبر ۱۹۱۰ء کو یہ اعلان کیا "ہم سلطنت ترکیہ کی سالمیت چاہتے ہیں۔ اور یہ کہ طرابلس ہمیشہ ترکی رہے"۔ کوئی سبب ایسا نہیں تھا کہ ان دونوں ملکوں کے تعلقات خراب ہوتے۔ مگر اٹلی نے ستمبر ۱۹۱۱ء میں یکایک اپنے اس ارادے کا اعلان کر دیا کہ وہ طرابلس پر قبضہ کرے گا۔ اٹلی کو ٹیونس پر فرانس کا قبضہ سخت ناگوار تھا۔ ساحل افریقہ سے قریب تر ہونے کی وجہ سے وہ ٹیونس کو اپنا حق دار اپنے کو سمجھتا تھا۔

فرانس نے اطالویوں کی یہ شکایت رفع کرنے کے لئے رضامندی دے دی۔ کہ اٹلی طرابلس پر قبضہ کر لے۔ اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ کہ برطانیہ نے اطالویوں کے اس جارحانہ اقدام کو باضابطہ منظور کیا۔ مگر اس پر اس نے سکوت اختیار کیا۔ اور اس طرح اٹلی کو مدد بھی دی۔ کہ مصر کی غیر جانب داری کا اعلان کر کے ترکوں کو براہ مصر طرابلس کے میدان جنگ پر فوجیں بھیجنے سے روک دیا جس کا اس کو کوئی حق نہ تھا؛ مصر ابھی تک ترکوں کی سیادت و سلطنت میں تھا۔ ترکوں نے مجبوراً مقامی عربوں کی تنظیم کر کے طرابلس کی مدافعت کی اور بڑی بہادری اور کامیابی سے۔

مگر ۱۹۱۲ء کے آغاز میں یونانیوں کے مشہور فتنہ وزیر اعظم موسیو زیلوس کی کوشش اور تدبیر سے ترکوں کے خلاف یونان، بلغاریہ اور سرویہ کا اتحاد قائم ہوا۔ اور پھر اس اتحاد میں مانٹینیگرو بھی شریک ہو گیا۔ سلطنت ترکیہ کی مسیحی آبادی کی حفاظت حقوق کے بہانے سے جو یورپ کی عیسائی سلطنتوں کا عرصہ دراز سے معمول تھا۔ ان سب نے ترکوں کو جنگ کا الٹیمیٹم دے دیا۔ ترکوں نے یہ دیکھ کر کہ ایک ساتھ دو محاذوں پر جنگ کرنا دشوار ہے۔ فوراً اٹلی سے معاہدہ صلح کر لیا۔ اور طرابلس سے اپنی فوجیں واپس بلانے پر رضامند ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے عملاً طرابلس پر اٹلی کا قبضہ تسلیم کر لیا۔ اٹلی نے اس کے جواب میں جزائر بحیرہ ایجین سے اپنی فوجیں ہٹانا منظور کیا۔ مگر اس نے یہ وعدہ ایفا نہ کیا۔

بلقان میں جنگ شروع ہو گئی محض اس وجہ سے ترکوں کو مسلسل شکستیں ہوئیں۔ کہ ان کی افواج میں کثرت سے مقامی عیسائی تھے جن کی ہمدردیاں حملہ آوروں کے ساتھ تھیں۔ دشمن کے خفیف دباؤ پر یہ بھاگنے لگتے تھے اور اپنے گھروں ہی میں جا کر دم لیتے تھے۔ پھر یہ بھی تھا کہ ترکی فوج کی تنظیم اچھی نہ تھی۔ ترکوں کا دستوری انقلاب ۱۹۰۸ء میں ہوا تھا۔ نوجوان ترکوں کو دول یورپ کی دراندازیوں کی وجہ سے اتنی مہلت

نہ ملی تھی۔ کہ فوج اور ملکی انتظامات میں وہ تمام اصلاحات نافذ کرتے جو مدنظر تھیں۔ سب سے بڑی مصیبت یہ تھی۔ کہ بڑے ترک افسروں میں اور عمال میں ابھی بہت سے وہ تھے۔ جو دول یورپ کی سازشوں میں شریک تھے۔ ان سے رشوتیں لے کر اپنے ملک کو نقصان پہنچاتے تھے۔ جنگ بلقان میں ترکوں کا سخت نقصان ہوا۔ وہ تو آخر میں مفتوحہ علاقے کی تقسیم پر خود بلقان ریاستوں میں جھگڑا ہو گیا اور پھر جنگ اس لئے ترکوں نے دوبارہ ایڈریانوپل۔ دیموتیکا اور قرق کلیسا فتح کر لیا۔ ورنہ اسی وقت یورپ میں ان کے پاس کچھ نہ رہا تھا۔

اسی میں یورپ کی پہلی عالمگیر جنگ آگئی (۱۹۱۴ء) برطانیہ کی یہ شرارتیں کہ ترکی فوجوں کو مصر سے نہ گذرنے دیا، طرابلس پر اٹلی کے حملے کا مسرت آمیز سکوت سے خیر مقدم کیا۔ ٹرکی کے وہ دو کروزر ضبط کر لیے جو اس نے انگلستان سے نئے خریدے تھے۔ اور جن کی قیمت ادا کر دی تھی۔ فرانس کا یہ پاجی پن کہ اپنے ٹیونس کے قبضے کے خلاف اٹلی کی حاسدانہ سوزش رفع کرنے کے لئے اس نے طرابلس پر اٹلی کے حملے کی تائید کی۔ روس صدیوں کا دشمن۔ بازنطینی روایات و سلطنت کی وراثت کا دعویدار اور قسطنطنیہ پر قبضے کا طالب۔ ان حالات میں اس کی کوئی صورت نہ تھی۔ کہ جنگِ عظیم اول میں ترک انگلستان۔ فرانس اور روس کے حلیف بنتے۔ غیر جانبدار رہنا اس وقت ہرگز ممکن نہ تھا۔ سلطنت عثمانیہ کچھ نہ رہی تھی۔ مگر ابھی یورپ کی سیاست میں اس کا اتنا دخل تھا۔ کہ ہر فریق اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا۔ چونکہ طرابلس اور بلقان کی جنگوں میں جرمنی کا طرزِ عمل ترکوں کے خلاف نہ تھا۔ فتح ایڈریانوپل پر قیصر جرمنی نے سلطان محمد خامس کے نام تہنیت و تبریک کا تار بھیجا تھا۔ جنگ بلقان میں ترکی فوج کی کمزوریاں ظاہر ہونے کے بعد حکومت ترکیہ نے جب فوج کی از سرِ نو تنظیم کا اہتمام کیا تو حکومت جرمنی نے اس میں تعاون کیا۔ اور اس کام کے لئے جنرل فان ڈر گولٹز کو ٹرکی بھیجا۔ اس طرح ترک جرمنی کے حلیف بن کر جنگِ عظیم میں شریک ہو گئے۔ اور اس کا انھوں نے اعلان کر دیا۔

اس کے ساتھ ہی برطانیہ نے اپنی سیادت میں مصر کی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اور جزیرہ قبرص کا اپنی سلطنت کے ساتھ الحاق کیا۔ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے آغاز تک ترکوں کے قبضے سے جو ممالک اور علاقے گئے وہ یہ ہیں۔ مقدونیہ۔ ایپی رس۔ البانیہ۔ تھریس کا بڑا حصہ۔ بحیرہ ایجین میں کریٹ قبرص اور بہت سے دوسرے جزیرے افریقہ میں طرابلس الغرب۔ ان پر دولت عثمانیہ کی راست حکومت تھی۔ بلغاریہ، بوسنیہ، سرزیگووینہ اور مصر پر اس کا شہنشاہانہ اقتدار تھا۔ یہ اتنے عظیم نقصانات تھے۔ کہ ان کے ضعف اور حق تلفی سے ایک ایک سلطنت بن سکتی تھی۔

مسلمانانِ ہند پر اس واقعے کا اثر

جس وقت ٹرکی جنگِ عظیم میں شریک ہوا۔ مسلمانانِ ہند بے قرار ہو گئے۔ اس سے پہلے ٹرکی کے ہر ہر ملک کا جاتا ان کے دلوں پر ایک ایک زخم چھوڑ گیا تھا۔ اب نئے اندیشے پیدا ہوئے۔ جزیرۃ العرب، اماکن مقدسہ، خلافت! اگر جرمنی کو شکست ہوئی تو مسلمانوں کا دنیا میں کہیں ٹھکانہ نہ رہے گا۔

علامہ شبلی پہلے ہی اس صورتِ حال پر نوحہ کر چکے تھے:۔

مراکش جا چکا، فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے۔ کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک۔

یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے۔ اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک۔

ٹرکی اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی واحد آزاد و خود مختار سلطنت تھی۔ اور خلافت کی وجہ سے اس کے ساتھ یہ امید قائم کہ کسی وقت مسلمانان

عالم کے لئے مرکزیت کی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی۔

وطن کے ساتھ ویسی ہی محبت کے باوجود جو سب کو ہوتی ہے۔ مسلمانوں کا مزاج ہمیشہ آفاقی رہا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مسلمان دنیا کے ہر حصے میں موجود ہیں۔ اور بغیر زبان سے اعلان کئے ہر مسلمان اپنے کو اس عالمگیر قوم کا جزو سمجھتا ہے۔ اور امور عالم سے اس کو گہری دلچسپی رہتی ہے۔ برطانیہ جانتا تھا کہ مسلمانان ہند ٹرکی کے لئے فکر مند اور مضطرب ہوں گے۔ اور مسلمانان ہند سے برطانیہ کو اس جنگ میں مدد لینی تھی۔ وزیر اعظم برطانیہ مسٹر لائڈ جارج نے اعلان کیا: "اور نہ ہم اس لئے جنگ کر رہے ہیں۔ کہ ٹرکی کو تھریس اور ایشیائے کوچک کی زرخیز زمینوں سے محروم کر دیں جس کی آبادی اکثریت کے ساتھ ترکی النسل ہے۔" مسلمانوں کا دعویٰ یہ تھا۔ کہ پورا جزیرۃ العرب جس میں عراق۔ عرب شام فلسطین شامل اور تمام اماکن مقدسہ واقع ہیں۔ براہ راست خلیفۃ المسلمین کی سیادت و تحویل میں رہنا چاہئے۔

جنگ میں جرمنی کو شکست ہوئی اور اس کے تمام حلیفوں کو شکست ہوئی۔ ہنگامی معاہدہ صلح پر دستخط ہوئے۔ اس ہنگامی معاہدۂ صلح میں ٹرکی کے لئے یہ شرائط تھیں۔ اپنی تمام افواج برخاست کرے گا۔ اس کے جنگی جہاز فاتحین ضبط کریں گے۔ ملک کی ریلوں کی نگرانی اور کنٹرول کا اتحادیوں کو حق ہوگا۔ ایشیائے کوچک اور عرب میں سرحدوں کے تعین کے علاوہ اندرون ملک کا انتظام ٹرکی ہی کے اختیار میں رہےگا

مسلمانان ہند کی پریشانی

بے شک جہاں کہیں مسلمان تھے۔ وہ ٹرکی کی اس مصیبت کو عالم اسلام کی مصیبت سمجھ رہے تھے۔ اور نہایت سراسیمہ اور پریشان تھے لیکن ہندوستان کے مسلمان سب سے زیادہ۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ وہ ڈیڑھ سو برس سے انگریزوں کی حکومت میں مبتلا تھے۔ اس لئے اس سے واقف تھے کہ اس کی مضرتیں اور مصائب کیا ہیں۔ برطانیہ کے وعدوں پر اعتماد کر کے انہوں نے اس جنگ میں انگریزوں کی پوری مدد کی تھی۔ اور احکام شریعت کے خلاف مسلمان ترکوں اور خلیفہ کے مقابلے میں وہ انگریزوں کی طرف سے لڑے تھے۔ اور اب یہ خواب شیریں خواب پریشان ثابت ہو رہا تھا۔ کہ کبھی مسلمان باہم متحد ہو کر خلیفۃ المسلمین کی قیادت میں دنیائے اسلام کو یورپ کے تسلط سے آزاد کرائیں گے

کیا کسی نے ہندوستان کے عام مسلمانوں میں اتحاد اسلامی کا پروپیگنڈا کیا تھا؟ کیا کسی نے ان کو یہ اونچی سیاست سمجھائی تھی۔ کہ خلافت کے خاتمے کے بعد اسلام کی مرکزیت ختم ہو جائے گی۔ اور مسلمان امور عالم میں کسی متحدہ اقدامی عمل کے قابل نہ رہیں گے؟ نہیں۔ نہ مسلمانان ہند کے پاس اخبارات تھے، نہ انجمن تھی۔ نہ لیڈر تھے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی تھی۔ اور وہ ابھی عوام تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ محمد علی اور شوکت علی ۱۹۱۵ء سے سامنے آئے تھے اور ۱۹۱۴ء سے نظر بند تھے۔ دو دو ورق کے چند اردو اخبارات نکل رہے تھے جن پر زمانہ جنگ میں یہ پابندی عائد رہی کہ ان مسائل پر جو جنگ سے متعلق تھے کچھ نہ لکھیں۔ یہ ان کی استطاعت سے باہر تھا۔ کہ ٹرکی اور خلافت کے ساتھ مسلمانوں میں یہ گرویدگی اور شیفتگی پیدا کر دیں۔ جو ان سے ظاہر ہوئی۔ مگر قرآن کا یہ اعلان دو فرمان مسلمانوں کی روح میں پیوست ہے "کل مؤمن اخوۃ" یہ انہیں بتانے کی ضرورت نہیں کہ مسلمان کو مسلمان کے ساتھ ہمدردی ہونی چاہئے جس اسلامی فطرت کے تقاضے نے محمد علی، شوکت علی اور حسرت موہانی کو اپنی اپنی جانوں پر کھیلنے کے لئے آمادہ کیا تھا۔ وہی ہر عام مسلمان کے دل میں کام کر رہی تھی۔

محمد علی، شوکت علی اور حسرت موہانی ابھی نظر بند ہی تھے۔ کہ ہنگامی صلح کا اعلان ہوا۔ انگریزوں نے قسطنطنیہ پر ظالمانہ فوجی قبضہ کیا جسے کیپی چولیشن کہتے ہیں جس کے تحت فاتح کو نجی سکونتی مکانات تک تصرف کا حق حاصل ہو جاتا ہے اور موصل پر انہوں نے جارحانہ پیش قدمی شروع کر دی۔ اس پر ہندوستان میں جا بجا احتجاجی جلسے ہوئے جن میں قابل ذکر یہ ہیں۔ مدراس میں بصدارت سیٹھ یعقوب حسن (۱۷ جنوری ۱۹۱۹ء)

لکھنؤ میں بصدارت مولانا قیام الدین عبدالباری فرنگی محل ۲۶، ۲۷ جنوری ۱۹۱۹ء لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم کانفرنس ۲۱، ۲۲ ستمبر ۱۹۱۹ء دہلی میں بصدارت مسٹر فضل الحق ۲۳، ۲۴ نومبر ۱۹۱۹ء۔

لکھنؤ کی آل انڈیا مسلم کانفرنس میں خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اور دہلی کا جلسہ خلافت کانفرنس کے نام سے منعقد ہوا۔ اس دوران میں مسٹر گاندھی اور مسلمان عمائد کے درمیان مسئلہ خلافت میں اشتراک عمل کے لئے گفتگو ہو چکی تھی۔ مسٹر فضل الحق نے اپنے خطبہ صدارت دہلی میں ہندوستان کی غیر مسلم اقوام سے تائید حاصل کرنے کی مصلحت پر زور دیا۔ کانفرنس کے رزولیوشنوں میں مشہد مقدس (ایران) اور دوسرے مقامات مقدسہ پر اتحادی افواج کی زبردستیوں اور مظالم پر احتجاج کیا گیا۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ :۔

ا ۔ وہ جشن صلح میں شریک نہ ہوں اور اس کے خلاف جلسے کریں۔

ب ۔ مسٹر گاندھی کے مشورے کے مطابق مسلمان حکومت سے عدم تعاون کریں۔

ج ۔ اگر صلح کانفرنس کا فیصلہ مسلمانوں کی منشاء کے مطابق نہ ہو تو ولایتی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔

د ۔ مسٹر گاندھی اور ان دوسرے ہندو لیڈروں کا شکریہ ادا کیا گیا جنہوں نے تحریک خلافت میں مسلمانوں کے ساتھ اشتراکِ عمل منظور کیا تھا۔

مسلمانانِ ہند کے وفود

اس سال دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس کا اجلاس امرتسر میں منعقد ہوا۔ اور وہیں مسلم لیگ اور خلافت کانفرنس کا۔ ٹھیک انہی دنوں میں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات برطانوی پارلیمنٹ میں منظور ہوئیں اور اس تقریب میں سیاسی نظر بند رہا کئے گئے۔ محمد علی اور شوکت علی بیتول جیل سے نکل کر سیدھے امرتسر پہنچے۔ محمد علی نے اپنی کانگریس کی تقریر میں کہا "میں جیل سے واپسی کا ٹکٹ لے کر آیا ہوں۔" اور یہ فقرہ تمام ہندوستان میں مشہور ہو گیا۔ یہاں ہندو اور مسلمان لیڈروں کے درمیان دوسرے مسائل کے ساتھ خلافت کے مسئلے پر خصوصی گفتگو ہوئی۔

خلافت کانفرنس کے جلسے میں سلطان ٹرکی کے ساتھ بحیثیت خلیفہ اظہار عقیدت کیا گیا۔ یہ قرار پایا کہ ۱۵ جنوری ۱۹۲۰ء تک مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے متعلق مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنے کے لئے بسرکردگی مسٹر محمد علی ایک وفد انگلستان بھیجا جائے۔ خلافت فنڈ قائم کیا جائے۔ اور اس کے لئے دس لاکھ روپیہ جمع ہو۔

اس سے پہلے کہ مجوزہ وفد انگلستان روانہ ہو۔ ایک دوسرا وفد ۱۹ جنوری ۱۹۲۰ء کو وائسرائے سے ملا۔ یہ مندرجہ ذیل اشخاص پر مشتمل تھا۔ مسٹر گاندھی، سیٹھ چھوٹانی خلافت کمیٹی کے پہلے صدر، مولانا ثناء اللہ امرتسری۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی کفایت اللہ۔ مولانا حسرت موہانی مسٹر سید حسن ایڈیٹر انڈی پینڈنٹ الہ آبادی۔ مولانا عبدالباری فرنگی محل حکیم اجمل خاں۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری۔ مولانا محمد علی۔ مولانا عبدالماجد بدایونی۔ سید ظہور احمد سیکرٹری مسلم لیگ۔ مولانا فاخر الہ آباد۔ مولانا سید سلیمان ندوی۔ آغا محمد اشرف قزلباش۔ راجہ صاحب محمود آباد۔ پنڈت موتی لال نہرو، مسٹر محمد علی جناح۔ میر وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور مسٹر جناح وقت پر نہ پہنچ سکے۔ مگر دونوں نے تار کے ذریعے اتفاق رائے ظاہر کیا۔

ایڈریس جو وفد نے وائسرائے کو پیش کیا۔ مولانا محمد علی نے لکھا۔ اس میں سلطنتِ ترکیہ کی سالمیت اور خلیفہ کی حیثیت سے سلطان ٹرکی کی حاکمیت برقرار رکھنے کی ضرورت جتائی گئی۔ اور اس پر اصرار کیا گیا کہ "یہ لوازم اسلام میں سے ہے۔ کہ دینی اور دنیوی حیثیت سے خلافت کا وجود مسلسل قائم رہے۔" وفد نے یہ بھی کہا کہ اگر حکومت برطانیہ نے اپنے تمام وعدے حرف بحرف پورے نہ کئے تو اس کو ایسا سخت اخلاقی دھکا لگے گا۔ کہ بڑے سے بڑے زرخیز علاقے اور عظیم ترین سیاسی نفع سے بھی اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ اور پھر اخلاقی وقار کی بربادی اس کو اس درجہ سے گراں گزرے گی۔ کہ اس اعلان شاہی کی قلعی کھل جائے

گی جو جناب والا کے پیشرو والسرائے نے ٹرکی کے ساتھ جنگ شروع ہونے پر کیا تھا۔"

والسرائے کا جواب مایوس کن تھا۔ اس پر مسلمان لیڈروں نے ایک بیان شائع کیا جس میں کہا: "اگر معاہدۂ صلح کی شرائط مسلمانوں کے مذہب اور جذبات کے خلاف ہوئیں تو حکومت برطانیہ کے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری اس کا تحمل نہ کر سکے گی۔ اس کے ساتھ مطالبہ کیا کہ جزیرۃ العرب ان حدود کے ساتھ جو اسلامی روایات کی رو سے معین ہیں اور اسلام کے مقدس مقامات خلیفہ کے اختیار و انتظام میں رہنے چاہئیں اور وہ تمام وعدے پورے کئے جائیں جو مسلمانوں سے وزیر اعظم برطانیہ نے کئے ہیں۔"

خلافت کانفرنس کا تیسرا اجلاس فروری ۱۹۲۰ء میں بمقام بمبئی منعقد ہوا تاکہ مجوزہ وفد (برائے انگلستان) کو سند نیابت دے کر رخصت کرے۔ اس کانفرنس کے متعلق مولانا محمد علی نے اپنی ایسیکس ہال لندن کی تقریر میں فرمایا۔

"میں آپ کو بتاؤں گا کہ ہم کون ہیں۔ اور کس کی نیابت کر رہے ہیں۔ ہمیں اس ملک میں آل انڈیا خلافت کانفرنس نے بھیجا ہے۔ اس وقت یہ ہندوستان کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ نمائندہ انجمن ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ بڑی اور اہم سیاسی انجمنیں ہیں۔ لیکن وہ انجمن جس کی ہم نیابت کر رہے ہیں۔ ان سے زیادہ بڑی اور جامعیت کے اعتبار سے افضل ہے۔ خلافت کانفرنس کے اس اجلاس میں جس نے یہ وفد بھیجا ہے۔ بیس ہزار ہندو اور مسلمان شریک ہوئے۔ اور اس کی کارروائی ۵ بجے شام سے شروع ہو کر دوسرے روز ۴ بجے شب تک جاری رہی۔ ہر روز ان کے جلسوں کا مجھے جو تجربہ ہے۔ اس کی بناء پر میں کہہ سکتا ہوں کہ ایسا جوش جو اس اجلاس کی کارروائیوں میں تھا۔ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔"

بمبئی کے اجلاس خلافت کانفرنس میں وفد پر اظہار اعتماد کا رزولیوشن منظور ہوا۔ ایک نہایت اہم اور مفصل بیان شائع کیا گیا جس میں مسلمانان ہند کے مطالبات ضابطے کے ساتھ معین کئے گئے۔ اور مندرجہ ذیل الفاظ میں حکومت برطانیہ کو متنبہ کیا گیا:

"اس مطالبے میں اگر کوئی کمی کی گئی تو اس سے نہ صرف مسلمانوں کے عمیق ترین مذہبی جذبات کو صدمہ پہنچے گا بلکہ ان اعلانات اور مواعید صادقہ کی بھی بے حرمتی اور خلاف ورزی ہو گی جو اتحادی اور ان کی حلیف دول کے نمائندہ ماہرین سیاست نے اس وقت کئے تھے جب وہ مسلمان قوم اور مسلمان سپاہ کی تائید و مدد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہ مطالبہ صرف مسلمانوں ہی کا نہیں ہے۔ بلکہ ملک کی پوری ہندو آبادی اس میں ان کے ساتھ شریک ہے۔ اگر غلط فیصلہ کیا گیا۔ تو اس کے نتائج اچھے نہ ہوں گے۔"

❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖ ❖

فرانس امریکہ اور انگلستان کے اخبارات ترکوں کے خلاف بہت سخت لکھ رہے تھے۔ ان کا تقاضا تھا۔ کہ مشرق کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے کر دیا جائے انگلستان اور امریکہ کے با اثر سیاسی حلقے اس پر مصر تھے۔ کہ ترکوں کو قسطنطنیہ سے نکالو اور ٹرکی کے ٹکڑے کر کے اس کو چوتھے درجے کی چھوٹی سی ریاست بنا دو۔ مسلمانوں کا اضطراب بڑھا۔ اور فکر و تردد انتہا کو پہنچا۔ ہندوستان کی سیاست میں خلافت کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہو گیا۔ اوائل مارچ ۱۹۲۰ء میں خلافت کا وفد انگلستان روانہ ہوا۔ اس کے ارکان مندرجہ ذیل حضرات تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی، ابوالقاسم صاحب، سید حسین ایڈیٹر انڈیپنڈنٹ، مولانا محمد علی امیر وفد اور حسن محمد حیات سیکرٹری۔ محمد شعیب قریشی اور عبدالرحمن صاحب صدیقی پہلے سے انگلستان میں تھے۔ یہ دونوں وہاں وفد میں شریک ہو گئے۔

وزیر ہند کی طرف سے مسٹر فشر نے ۲۶ مارچ ۱۹۲۰ء وفد سے ملاقات کی۔ اس کے بعد وفد مسٹر لائیڈ جارج سے ملا۔ مولانا محمد علی نے بڑی بے باکی سے مسلمانان ہند کے مطالبات پیش کئے۔ لیکن جب نفرت عداوت سے دل کج ہو گیا ہو۔ اور نخوت کی چربی آنکھوں پر چھائی ہوئی ہو۔ تو انصاف

اور مقبولیت سب کے لئے دل اور بہرے کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ لائڈ جارج نے نہایت بے حیائی سے کہا۔ "ترکوں کے ساتھ ان سے مختلف اصولوں پر معاملہ نہیں کیا جا سکتا جو مسیحی ملکوں کے ساتھ برتے گئے ہیں۔ ٹرکی کو ترکی سرزمین پر دنیوی اختیار برتنے کی اجازت ہوگی مگر وہ علاقے اس کے قبضے میں نہیں چھوڑے جائیں گے جو ترکی نہیں ہیں۔"

اس طرح وزیراعظم برطانیہ نے مسلمانان ہند کے مطالبات منظور کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ مسلمانان ہند کو اس سے سخت مایوسی ہوئی ۱۹ مارچ ۱۹۲۰ء کو ہندوستان میں لائڈ جارج کے جواب پر یوم غم منایا گیا۔ لوگوں نے روزہ رکھا۔ دعائیں کیں اور ہڑتال کی۔

معاہدۂ سیورے

وفد نے اتحادیوں کو اور تمام یورپین اقوام کو مسلمانوں کے نقطۂ نظر اور مطالبات سے اچھی طرح آگاہ کر دیا۔ اور ایسے مسکت دلائل کے ساتھ کہ اگر اس فیصلے میں انصاف کا دخل ہوتا تو مسلمانان ہند کا ہر دعوے اور ہر مطالبہ مانا جاتا۔ مگر ایک جنگ میدان میں ہوئی تھی۔ اور دوسری صلح کانفرنس میں ہو رہی تھی۔ دونوں جگہ زبردستی کی فتح تھی۔ اس لئے وفد کو ناکامی اور مایوسی ہوئی۔ وفد ابھی انگلستان ہی میں تھا کہ اتحادیوں کے نمائندے سان ریمو (پیرس) میں مجتمع ہوئے اور ترکی معاہدہ صلح کی شرائط انہوں نے مرتب کیں۔ اس معاہدۂ صلح کا نام معاہدہ سیورے مشہور ہے۔ اور اس کی شرائط حسب ذیل تھیں:-

۱۔ سلطان اتحادیوں کی حمایت کے ساتھ قسطنطنیہ میں حکومت کرے گا۔

۲۔ اتحادیوں کو حق ہے کہ آبنائیوں پر قبضہ کر لیں اور یہ بھی کہ ایشیائی ٹرکی کے کسی حصے پر قابض ہو جائیں۔

۳۔ آرمینیہ کی ایک نئی دولت قائم کی جائے گی۔ جس میں مندرجہ ذیل صوبے داخل ہوں گے۔ مشرقی اناطولیہ، ارض روم، وان، تبلیس، ترابزون اور اردنجان اس دولت کی حدود ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مدد سے قائم کی جائیں گی۔

۴۔ ٹرکی عرب کے متعلق اپنے تمام دعوؤں سے دست بردار ہو گا۔

۵۔ شام کی حکم برداری فرانس کو، عراق اور اردن کی برطانیہ کو دی جائے گی۔ عدلیہ اٹلی کو، سمرنا اور مغربی اناطولیہ یونان کو عنایت کیا گیا۔

اس ذلیل متعصبانہ اور متشددانہ صلح نامے کے خلاف تمام دنیا کے مسلمانوں نے نفرت اور غصے کا اظہار کیا۔ حتیٰ کہ اس سلطان کی حکومت بھی احتجاج کئے بغیر نہ رہی۔ جو اتحادیوں کی توپوں اور بندوقوں کے حصار میں لاچاری کے ساتھ ترکی اور اسلامی روایات کو بدنام کر رہا تھا۔ اس گورنمنٹ نے احتجاج کیا۔ مگر پھر برطانیہ اور دوسری دول کے دباؤ سے ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو معاہدۂ سیورے پر دستخط کرنے کے لئے مجبور ہوئی۔ بالآخر یہی معاہدہ سیورے ترکی تلوار کے لئے سنگ فساں ثابت ہوا۔

ہندوستان میں ایجیٹیشن

معاہدہ سیورے ہندوستان میں ۱۴ مئی کو شائع ہوا۔ اس کی شرائط ایسی بری تھیں کہ وائسرائے ہند کو بھی یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ان پر مسلمانان ہند سے تعزیت کریں۔ اور تلقین صبر فرمائیں۔ اس کے لئے انہوں نے مسلمانان ہند کے نام ایک پیغام شائع کیا۔ پیغام نے مسلمانوں کے زخموں پر نمک کا کام کیا۔

۲۸ مئی کو بمبئی میں خلافت کانفرنس کا جلسہ ہوا۔ اس میں مسٹر گاندھی کے مجوزہ عدم تعاون کے پروگرام پر غور و بحث کے بعد قرار پایا کہ مسلمانوں کے مقاصد کی تکمیل کا واحد ذریعہ عدم تعاون ہے۔ خلافت کمیٹی نے یکم اگست ۱۹۲۰ء کو تمام ملک میں ایک عام ہڑتال کرائی۔ مسٹر گاندھی کو تحریک عدم تعاون کا لیڈر قرار دیا۔ انہوں نے اپنے تمام تمغے حکومت کو واپس لئے اور باضابطہ عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی۔

وفد خلافت اکتوبر میں یورپ سے واپس آیا۔ اس وقت سے مسٹر گاندھی اور علی برادران نے ملک کا دورہ شروع کیا۔ اس دورے کا مقصد یہ تھا کہ

لوگوں کے بڑھتے ہوئے جوش و خروش میں ضبط و تنظیم پیدا کی جائے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا تھا جہاں خلافت کمیٹی کی شاخ نہ تھی، بڑے شہروں میں، چھوٹے شہروں میں، قصبات میں اور دیہات میں۔ بانی، مستعدی، چستی اور درستی کے اعتبار سے اس وقت خلافت کمیٹی ہندوستان میں بے نظیر تھی۔ کانگریس قدیم اور عظیم ضرور تھی۔ لیکن عوامی پیمانے پر تنظیم کے اعتبار سے خلافت کمیٹی کے مقابلے میں اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ سچ یہ ہے۔ کہ عوامی تنظیم میں کانگریس کو خلافت کمیٹی سے بڑی مدد ملی۔ اور ہر قسم کی مدد۔ خلافت کا کام کرنے کے لئے مسلمانوں میں سے آدمی فوج در فوج نکلے۔ کوئی گھر نہیں رہا تھا جس کا کوئی نہ کوئی آدمی خلافت کمیٹی کا رکن نہ ہو۔ جوان، بوڑھے، عورتیں، بچے، جذبات و خیالات میں سب خلافتی تھے۔ خلافت کے سرمائے میں ہر جیب سے روپیہ آتا تھا۔ سرکاری نوکری، زمیندار کی، خطاب یافتہ کی، تاجر کی۔ کاشتکار کی، مزدور کی، سرمایہ دار کی۔

بیشک مسلمانوں میں بعض وہ بھی تھے جو تحریک خلافت کے مخالف تھے۔ مگر اصول اور اعتقاد کی بنا پر شاذ۔ ذاتی مجبوریوں اور مفاد کی بنا پر زیادہ۔ لیکن خلافت کی تائید میں رائے عامہ اس قدر طاقتور اور پرزور تھی۔ کہ کوئی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کہ جلسوں میں یا اخبارات میں اس کی مخالفت کرے۔ البتہ اس کی مثالیں بہت تھیں۔ کہ حکومت کے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔ مگر چھپ کر خلافت کمیٹی کے سیکرٹری کے پاس چندے بھی بھیجتے ہیں۔ اور معذرت بھی کرتے ہیں۔ کہ مجبوریاں اور لاچاریاں ہیں۔ ان کی وجہ سے کھل کر سامنے نہیں آ سکتے۔ خلافت کے لیڈر، خلافت کے ورکر، خلافت کے والنٹیر دکھاوے کے نہیں تھے۔ خود غرض نہیں تھے۔ ذاتی مفاد اور اغراض کے بندے نہیں تھے۔ اپنے جوش، کوشش، جدوجہد اور اعتقاد کے اعتبار سے بالکل مجاہد تھے۔ اگر انہیں کوئی میدان جنگ میسر آ جاتا تو یہ مسلمانوں کی قدیم مجاہدانہ روایات زندہ کر دیتے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

عدم تعاون کی کامیابی

دسمبر ۱۹۲۰ء میں جب کانگریس نے بھی بڑے پس و پیش کے بعد عدم تعاون کا رزولیوشن منظور کر دیا تو خلافت کمیٹی اور کانگریس کے اشتراک سے عدم تعاون کی تحریک زلزلے اور طوفان کی طرح چلی۔ الیکشن میں ووٹ نہ دو۔ اس اپیل کا ایسا اثر ہوا۔ کہ بیلٹ بکس خالی پڑے رہے اور پولنگ بوتھ ویران۔ جن خلافتی اور کانگریسی امیدواروں نے اپنے الیکشن کی کوششوں پر ہزاروں روپیہ خرچ کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنے نام واپس لے لئے۔ عدالتوں اور کالجوں کے بائیکاٹ میں گو اتنی کامیابی نہیں ہوئی جتنی الیکشن کے بائیکاٹ میں، مگر پھر بھی بہت ہوئی۔ لوگوں کے دلوں سے انگریزی عدالتوں کا وقار جاتا رہا۔ بہت سے وکیلوں اور بیرسٹروں نے پیشہ ترک کر دیا اور تحریک میں شریک ہو گئے۔ بہت سے طلبہ نے تعلیم ترک کی اور قومی تحریک میں کام کرنے لگے۔ بعض جامعہ ملیہ اور دوسری قومی تعلیم گاہوں میں داخل ہو گئے جو اسی زمانے میں قائم ہوئی تھیں۔ جیل جانے اور گولیاں کھانے میں مسلمانوں کا قدم ہندوؤں سے بہت آگے تھا۔ سچ یہ ہے۔ کہ تحریک عدم تعاون کی تمام قوت مسلمانوں کے طبعی جوش و جذبے سے تھی۔

ناگپور کے رزولیوشن میں کانگریس نے خلافت کے ساتھ سوراج کو بھی عدم تعاون کے مقاصد میں داخل کر لیا۔ اور مسلمانوں نے اخلاص اور جوش کے ساتھ اسے قبول کیا۔ لہذا داخلی سیاست کی حد تک کانگریس اور خلافت کمیٹی کا پروگرام بالکل ایک رہتا تھا۔ مگر ترکوں اور یونانیوں کی جنگ کے معاملے میں خلافت کمیٹی اس میں کچھ اضافہ کرتی تھی۔ مظلومین سمرنا کی امداد کے لئے چندہ کیا جاتا تھا۔ غیر مسلم بائیکاٹ کے پروگرام کے مطابق ولایتی کپڑے جلاتے تھے۔ مسلمان اپنے ولایتی کپڑے سمرنا کے مظلومین کو بھیجتے تھے۔

وہ جنگیں جو انا طولیہ اور تھریس میں ہو رہی تھیں، مسلمانوں ہند کو اپنے گھروں کے صحن میں محسوس ہوتی تھیں۔ اور ان کے اچھے برے نتائج سے وہ اتنے ہی متاثر تھے۔ جتنے خود ترک ہوں گے۔ مگر غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہندوستانی مسلمان میدان جنگ میں ترکوں کے دوش بدوش تو نہیں لڑ سکتے تھے۔ البتہ ترکوں کی فتح کے لئے دعائیں کرتے تھے۔ ہر جمعہ کے دن سے پہلے ہندوستان کی مسجدوں اور میدانوں میں لاکھوں مسلمان اس مقصد کے لئے جمع ہوتے تھے۔ جس کی اسلام میں بڑی اہمیت ہے۔ اور ان عظیم اجتماعات میں پر زور رزولیوشن پاس کرکے اور پرجوش تقریریں کرکے اتحادیوں پر اور خصوصاً برطانیہ پر اخلاقی دباؤ ڈالتے تھے۔ کہ معاہدہ سیورے کو تبدیل کرو اور یونانیوں کی طرف داری بند کرو۔

اسکولوں، عدالتوں اور برطانوی مال کے بائیکاٹ کے علاوہ سب سے اہم اور برطانیہ کے لئے دشتناک پرنس آف ویلز کی آمد کے سلسلے میں تقریبات کا بائیکاٹ تھا۔ خلافت کمیٹی اپنے ناگپور کے اجلاس میں رضاکاروں کی بھرتی کا فیصلہ کر چکی تھی۔ وہ بھرتی ہو رہے تھے۔ اور حکومت ان کے متعلق یہ کہتی تھی۔ "وہ فوجی وضع کے ہیں۔ قواعد پریڈ کرتے ہیں۔ اجتماع و نظم و ترتیب کے ساتھ مارچ کرتے ہیں۔ اور وردیاں پہنتے ہیں۔" کانگریس کے والنٹیئر بھی تھے۔ مگر وہ یونہی بھگت قسم کے۔ تہواروں اور میلوں میں مانگنا اشنان پر لوگوں کی خدمت اور کانفرنسوں اور جلسوں میں انتظام کرتے تھے۔ پرنس آف ویلز کی آمد کے ساتھ رضاکاروں کی بھرتی اور تنظیم و تربیت نے ایک تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ خلافت اور کانگریس نے رضاکاروں نے باہم مل کر ہڑتالیں کرائیں اور ولایتی کپڑے سے بائیکاٹ کے پروگرام کی تعمیل کے لئے سرگرمی سے کام کیا۔ ۵ نومبر ۱۹۲۱ء کو کانگریس کمیٹی نے اپنے دہلی کے اجلاس میں صوبوں کو یہ اختیار دے دیا کہ سول نافرمانی شروع کریں۔ اور سول نافرمانی کرنے والوں کے لئے اس نے اعتقادی اور عملی شرائط بھی مقرر کر دیں۔ خلافت کمیٹی اور کانگریس کا پروگرام بالکل ملا جلا چل رہا تھا۔ سول نافرمانی کے لئے دونوں انجمنوں کے رضاکار مل گئے۔ اور ایسے جوش و ہمت سے انہوں نے سول نافرمانی کی کہ ان سے جیل خانے بھر گئے۔ چند مہینے کے اندر اسیروں کی تعداد تیس ہزار تھی۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤

مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کو کراچی کے مقدمے میں پہلے ہی سزا ہو چکی تھی۔ وہ جیل میں تھے۔ پرنس آف ویلز ۱۷ نومبر ۱۹۲۱ء کو بمبئی پہنچے۔ اس پر بمبئی میں ہنگامے اور فسادات شروع ہو گئے اور تین روز تک جاری رہے۔ حکومت پر پرنس آف ویلز کے خیر مقدم کی تقریبات کے بائیکاٹ کی اس قدر ہیبت تھی۔ کہ وہ پنڈت مدن موہن مالوی اور مسٹر جناح کی تحریک سے سمجھوتے کے لئے تیار ہو گئی۔ مگر مسٹر گاندھی نے ایسی شرائط پیش کیں جنہیں قبول کرنا واقعی ممکن نہ تھا۔ پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ بڑے جوش اور قوت کے ساتھ کیا گیا۔ اور نہایت کامیاب رہا۔ مسٹر گاندھی نے اس کے بعد وائسرائے کو خط لکھا اور اس میں بعض شرائط پیش کیں۔ اور یہ دھمکی دی کہ اگر یہ پوری نہ کی گئیں تو جارحانہ سول نافرمانی شروع کی جائے گی۔

یکم فروری کو انہوں نے یہ خط لکھا اور ۵ فروری کو یہ واقعہ پیش آگیا کہ گورکھپور کے قریب موضع چوری چورا میں کانگریس کا جلوس نکلا۔ تھانے میں ۲۱ کانسٹیبل اور ایک سب انسپکٹر تھا۔ جلوس والوں نے اور اس مجمع نے جو جلوس کے ساتھ ہو گیا تھا، تھانے میں آگ لگا دی۔ تھانے کے سب آدمی جل کر مر گئے۔

اس پر بردولی میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ ہوا۔ اس میں فیصلہ کیا کہ عدم تعاون کی تمام سرگرمیاں بند کر دی جائیں۔ اور وہ بند ہو گئیں۔ تمام ہندوستان کو اس پر حیرت ہوئی۔ کانگریس کے بڑے بڑے لیڈروں نے اس پر اعتراض کیا۔ پنڈت موتی لال نہرو اور لالہ لاجپت رائے نے جیل سے مسٹر گاندھی کو خطوط لکھے، کہ تم نے ایک گاؤں کے تھوڑے سے آدمیوں کے قصور پر تمام ملک کو سزا دے دی۔

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤

میدانِ جنگ میں ترکوں کی فتح

۲۶ اگست ۱۹۲۲ء کو ترکوں نے یونانیوں پر آخری حملہ کیا اور یونانیوں کو شکست ہوئی۔ وہ بھاگ کر سمرنا میں ٹھہرے۔ سمرنا میں وہ ٹھہر گئے۔ اور تھریس پر ابھی ان کا قبضہ تھا۔ برطانوی افواج قسطنطنیہ اور اناطولیہ میں مقیم تھیں۔ مگر غازی مصطفےٰ کمال پاشا نے بجائے جنگی اقدام کے یہ مناسب سمجھا۔ کہ میدانِ جنگ اور میدانِ سیاست میں ان کو جو بازیافت ہوئی تھی اس کو مستحکم کر لیں۔

انگلستان کو جنگ میں فتحیاب ہوا تھا۔ مگر نکالا ان سے اس کے اعضاء شل تھے۔ لائڈ جارج کے میلانِ جنگ و فساد سے اہلِ انگلستان بیزار تھے۔ اس لئے لائڈ جارج کی پالیسی پر سخت نکتہ چینی ہونے لگی۔ اور ان کو مخلوط گورنمنٹ میں تزلزل پیدا ہو گیا۔ مگر اپنی عزل سے پہلے ہی لائڈ جارج کی سمجھ میں آ گیا۔ کہ ترک بستر علالت سے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اور انہوں نے ۲۹ ستمبر ۱۹۲۲ء کو مدانیہ میں ترکوں کے ساتھ معاہدہ التوائے جنگ پر دستخط کر دیئے۔ اس معاہدے کی رو سے برطانیہ نے یہ اپنے ذمے لے لیا کہ تھریس میں یونانیوں کو غیر مسلح کر کے ان کے وطن واپس بھیج دے۔ مگر قسطنطنیہ اور اناطولیہ میں معاہدہ لوزان تک برطانوی افواج مقیم رہیں۔

صلح کانفرنس میں ترکوں کی فتح

بالکل لاچار ہو کر انگریزوں نے ۲۱ نومبر ۱۹۲۲ء کو لوزان میں صلح کانفرنس منعقد کی۔ اس میں برطانیہ، فرانس، اٹلی اور قوم پرور ترک شریک ہوئے۔ ابتداء میں روس نہ تھا۔ لیکن قسطنطنیہ اور آبناؤں کی مستقبل کی بحث میں اس کو بھی شرکت کا موقع دیا گیا۔ کئی مہینے یہ صلح کانفرنس جاری رہی۔ عصمت پاشا نے جو اس وقت قوم پرور گورنمنٹ میں وزیر خارجہ تھے، ترکی مقاصد کی بڑی قوت سے حفاظت کی۔ میدانِ جنگ میں وہ جیسے اچھے جنرل تھے۔ ویسے ہی صلح کانفرنس میں اچھے وکیل ثابت ہوئے۔

سلطنت عثمانیہ ختم ہو گئی۔ مسلمانانِ ہند کے اس مطالبے میں سے کچھ نہ ملا، کہ جزیرۃ العرب غیر مسلموں کی مداخلت سے محفوظ رہے۔ اور خلیفۃ المسلمین کے پاس اتنی طاقت ہو کہ وہ منصب خلافت کی حفاظت کر سکیں۔ مگر پھر بھی معاہدہ لوزان، معاہدۂ سیورے سے ہزار گنا بہتر تھا۔ کہ کچھ علاقہ بچ گیا جس میں ترکوں نے اپنی قومی آزاد اور خود مختار حکومت قائم کر لی۔

غازی مصطفےٰ کمال بہت بڑے مدبر اور سیاس تھے یا نہ تھے، اس پر گفتگو ہو سکتی ہے، مگر وہ بہت بڑے جنرل تھے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔ معاہدہ لوزان اور ترکی کی آزادی و استقلال ان کی بے نظیر حربی قابلیت کا شاہکار ہے۔ اور ان کی شجاعت، ان کا انتخاب مردانِ کار اور تنظیمی صلاحیت ہمیشہ تاریخ کے عجائبات میں شمار ہوگی۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا، کہ نہ فوج، نہ اسلحہ، نہ روپیہ، ریل کی پٹڑیاں اکھاڑ اکھاڑ کر گلائی گئیں اور ان سے اسلحہ جات بنائے گئے۔ باربرداری کا کوئی انتظام نہ تھا۔ ترک مرد اور عورتیں گولے اور بارود کے بورے اپنے کندھوں پر رکھ کر پہاڑوں اور میدانوں کو عبور کرتے تھے۔ اور میدانِ جنگ میں پہنچاتے تھے۔ اس پر مزید مصیبت یہ کہ دشمن یونانیوں کے علاوہ اپنا ہی بادشاہ اور اس کے تمام وسائل دشمنوں کی تائید میں، اور ان آزادی خواہ ترکوں کی مخالفت میں استعمال ہو رہے تھے۔ صد آفرین مصطفےٰ کمال پاشا اور ان کے رفقاء کو، کہ ان حالات میں انہوں نے ان سے جنگ کی جن کی مدد پر اتحادیوں کی پوری طاقت تھی۔ کامیاب ہوئے اور لوزان کی صلح کانفرنس میں فاتح کی حیثیت سے بیٹھے۔ صلح کانفرنس خود انہی کی تلوار سے پیدا ہوئی تھی، ورنہ اتحادی تو اس پر مصر تھے۔ کہ معاہدۂ سیورے ترکوں کی قسمت کا آخری فیصلہ ہے۔

❖ ❖

خلافت اور سلطنت کا خاتمہ

معاہدہ صلح لوزان پر دستخط ہونے کے بعد ترکوں کو بیرونی دشمنوں کی دراندازیوں سے نجات مل گئی۔ اب ان کو داخلی استحکام اور ملکی تنظیمات کی اصلاح کی طرف متوجہ ہونا تھا۔ سب سے بڑی پیچیدگی یہ تھی۔ کہ انگورہ میں نیشنل اسمبلی قائم ہو گئی تھی۔ مصطفےٰ کمال پاشا اس کے صدر تھے۔ ایک عارضی قانون منظور ہو چکا تھا۔ جس میں تسلیم کیا گیا تھا، کہ اختیار حاکمیت لوگوں (عوام) کے لئے ہیں۔ اور قانون وضع کرنے کا اختیار اور انتظامات عاملہ نیشنل اسمبلی کو حاصل ہیں۔ مگر سلطان موجود تھا۔ اور وہی خلیفہ بھی۔ ایک ذات کے اندر دین اور دنیا کے تمام اختیارات مجتمع تھے۔

اس الجھن کو دفع کرنے کے لئے مصطفےٰ کمال پاشا نے قومی اسمبلی سے ایک قانون منظور کرایا۔ جس کی رو سے سلطنت منسوخ کی گئی اور سلطان وحیدالدین کو ایک جہاز پر بٹھا کر ترکی سے نکال دیا گیا، مگر خلافت ابھی باقی رہی۔ نیشنل اسمبلی نے عبدالمجید آفندی کو جو شاہی خاندان ہی سے تھے صرف خلافت کے لئے نامزد کیا۔ کچھ عرصے تک ترکی میں خلافت اور حکومت الگ الگ رہیں۔ عبدالمجید آفندی بعہدہ خلافت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مگر یہ ناقابل عمل ثابت ہوا۔ اور اس میں دشواریاں پیش آئیں۔

بالآخر ۲ مارچ ۱۹۲۴ء کو جمہوری پارٹی کا ایک اجلاس منعقد کیا گیا، جس میں عہدہ خلافت منسوخ کیا گیا۔ ۳ مارچ کو یہی رزولیوشن نیشنل اسمبلی میں پیش اور منظور ہوا۔ اس طرح ترکی میں خلافت ختم ہوئی۔ خاندان عثمان کے تمام ارکان جلاوطن کئے گئے۔ ۳ اور ۴ اپریل کی درمیانی شب میں خلیفہ عبدالمجید آفندی کو حکم ہوا۔ کہ ترکی سے چلے جائیں۔ اور صبح ہونے سے قبل ایک بیٹے، ایک بیٹی اور دو بیبیوں کے ساتھ ترکی سے نکل گئے۔

اس حادثے پر تمام دنیائے اسلام میں کہرام مچ گیا۔ کچھ عرصے تک ہندوستان کی خلافت کمیٹی نے اس کے لئے کوشش کی کہ حجاز میں خلافت قائم کی جائے۔ مگر یہ بھی نہ ہو سکا۔ اس تحریک سے خود خلافت کمیٹی کے اندر نفاق پیدا ہو گیا۔ خلافت کمیٹی کو تین کاری ضربیں لگیں۔

پہلی یہ کہ چوری چورا کے حادثے پر مسٹر گاندھی نے عدم تعاون کی تحریک بند کر دی۔

دوسری یہ کہ ترکی خلافت سے دست بردار ہو گیا۔

اور تیسری یہ کہ خلافت کمیٹی میں نفاق پڑ گیا۔ خلافت کمیٹی ان کی تاب نہ لا سکی۔ اور کمزور ہو گئی۔

WITH COMPLIMENTS

of

Cos Ltd.

RACHI